انوارِ قاسمیؒ

ریاض

امام العصر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ
بانی دار العلوم دیوبند
کے مکمل حالاتِ زندگی تحقیق و تاریخ کی روشنی میں

تالیف
پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن صاحب شیرکوٹیؒ

ناشر
مکتبہ دار العلوم کراچی

اَنوارِ قاسمی

جس میں

امام العصر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ

(. بانی دار العلوم دیوبند)

کے مکمل حالاتِ زندگی تحقیق و تاریخ کی روشنی میں جمع کئے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے ناظرین صحیح اور تفصیلی اندازہ قائم کرسکیں گے کہ اپنے زمانے کا یہ جلیل القدر اور عظیم المرتبہ مصلح ابرِ رحمت بنا کر جس مقصد عظیم ...... اعلاء کلمۃ اللہ ترویج عقائد حقہ اور تحفظ دین متین ...... کی خاطر ہدایت کی پیاسی دنیا کی طرف بھیجا گیا تھا اس نے اس کے ہر ہر گوشہ کو سیراب فرما دیا اور اپنے مختصر سے زمانہ حیات میں اس منصب جلیل کے تمام تقاضے پورے کر دینے کے بعد اپنی عظیم یادگاریں چھوڑ کر آغوشِ رحمتِ الٰہی میں چلا گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

تالیف

پروفیسر محمد انوار الحسن قاسمی شیرکوٹی

ناشر

مکتبہ دار العلوم کراچی

باہتمام : شرافت علی
طبع جدید : شوال ۱۴۳۵ھ بمطابق اگست 2014ء

ملنے کے پتے

مکتبہ دارالعلوم کراچی
(احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی)
فون نمبر : 021-35042280
استقبالیہ : 021-35049774-6
ای میل : mdukhi@gmail.com

- ادارۃ المعارف احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
- مکتبہ معارف القرآن احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور
- ادارہ اسلامیات اردو بازار کراچی
- دارالاشاعت اردو بازار کراچی

انوار قاسمی

امام العصر حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ بانی دار العلوم دیو بند
کے مکمل حالات زندگی تحقیق و تاریخ کی روشنی میں

تالیف: پروفیسر مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹی رحمہ اللہ

تبصرہ: مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

البلاغ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ

مؤلفہ: پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی۔ ناشر: ادارۂ سعدیہ مجددیہ، ے ۱۸/۳۷ چیمبرلین روڈ، لاہور۔ $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$ کے ۵۸۸ صفحات کتابت و طباعت متوسط، کاغذ سفید، قیمت مجلد: ۱۲ روپے

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کی اُن عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے اس خطے کی تاریخ پر نہایت دُور رَس اثرات مرتب کیے ہیں، اور اپنی علمی و عملی کاوشوں سے تاریخ کے دھارے کو اسلام کے حق میں موڑا ہے، وہ ان خدامست بزرگوں کے قافلہ سالار ہیں جن کی جدوجہد چونکہ خالص اللہ

کے لئے تھی، اس لئے انہوں نے نام و نمود کے ادنیٰ شائبے سے بھی اپنا دامن بچایا، اور کبھی اپنے عظیم الشان کارناموں کو لوگوں کے سامنے متعارف کرانے کی کوشش نہ کی چنانچہ اُن کے علمی و عملی کارنامے جس شرح و تفصیل کے ساتھ سامنے آنے چاہئے تھے، اتنی تفصیل کے ساتھ سامنے نہ آسکے۔

ماضیٔ قریب کے مؤرخین میں سے حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ نے تین جلدوں میں ''سوانح قاسمی'' مرتب فرمائی جو عرصہ ہوا منظرِ عام پر آچکی ہے، لیکن مولانا گیلانیؒ ایک ایسے قلم کے بادشاہ ہیں جس کی ''قلمرو'' موضوع کی سرحدوں سے ناآشنا ہے، اس لئے ان کی تالیف عام معلومات کا تو بیش بہا خزانہ ہے لیکن وہ شخص اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا جو صرف حضرت نانوتویؒ کی سوانح اور کارناموں کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہو۔

اب محترم پروفیسر محمد انوار الحسن صاحب نے اس موضوع پر قلم اُٹھا کر بلاشبہ سوانح قاسمی کا حق ادا کر دیا ہے، انہوں نے موضوع کے مناسب دائرے میں رہ کر جس تحقیق، عرق ریزی اور محنت و جستجو کے ساتھ حضرتؒ کی سوانح مرتب کی ہے، اس پر ہر علم دوست کی طرف سے تحسین کے پھول نچھاور ہونے چاہئیں، اس وقت ان کی تالیف کی پہلی جلد زیرِ تبصرہ ہے جس میں موصوف نے حضرت نانوتویؒ کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، پہلے سے چوتھے حصے تک اور اس کے بعد دسویں حصہ میں انفرادی زندگی کے سوانح جمع کئے ہیں، جس میں ولادت، نسب، تعلیم، استرشاد، گھریلو زندگی، عبادات اور وفات کے مفصل اَحوال بیان ہوئے ہیں، اور پانچویں سے نویں حصے تک حضرتؒ کی مصلحانہ زندگی کے حالات ہیں جن میں جہاد ۱۸۵۷ء، دارالعلوم دیوبند کی تاسیس، تدریس، سماجی خدمات اور اسلام پر عیسائیوں اور آریوں کے حملوں کا دفاع شامل ہے۔

۱۸۵۷ء کے جہاد پر مؤلف نے تقریباً سو صفحات لکھے ہیں، اور ان میں جہادِ

شاملی وغیرہ سے متعلق معلومات کا ایسا وافر ذخیرہ مہیا کردیا ہے جو اب تک اس بسط و تفصیل کے ساتھ ہماری نگاہ سے نہیں گزرا تھا۔

فاضل مؤلف نے حالات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں نہایت محنت سے کام لیا ہے، اور بعض مقامات پر علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کی تحقیقات سے دلائل کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے علاوہ مؤلف نے ان کے بیسیوں متعلقین، اعزہ و احباب، اساتذہ اور تلامذہ کے حالات بھی اس کتاب میں جمع کردیئے ہیں، اور اس طرح یہ کتاب صرف مولانا نانوتویؒ کی نہیں، ان کے قرن کے بہت سے علماء، اولیاء اور مسلمان رہنماؤں کی تاریخ ہے۔

کتاب کے مطالعہ کے دوران چند تجاویز اور مشورے بھی ذہن میں آئے۔

۱:- حضرت مولانا کی سوانح میں ان تین تعلیمی تحریکوں کا تقابلی مطالعہ بھی ہونا چاہئے جو علی گڑھ، ندوہ اور دیوبند میں پروان چڑھیں، اس بات کا حقیقت پسندی اور انصاف کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ان تحریکات کی فکری بنیادیں کیا تھیں؟ ان سے اُمتِ مسلمہ کو کیا فوائد اور کیا نقصانات پہنچے؟ اور اب نئے حالات کی روشنی میں اُس نظامِ تعلیم کا نقشہ کیا ہونا چاہئے جو ان تینوں کے صالح اجزاء کو سموئے ہوئے ہو؟ اس بحث کے بغیر ہماری نظر میں سوانح قاسمی بڑی حد تک تشنہ رہے گی، کتاب کی دُوسری جلد میں یہ کمی پوری ہوجائے تو بڑا اچھا ہو۔

۲:- فاضل مؤلف نے جس تحقیق و جستجو سے بکھرے ہوئے واقعات اور حالات کو یکجا کیا ہے، وہ تو قابلِ داد ہے، لیکن اُن کے قلم میں بھی پھیلاؤ بہت زیادہ ہے، بعض غیرضروری باتوں پر ضرورت سے زیادہ زور دے دیا گیا ہے، بہت سی غیرمتعلق باتیں جن کی طرف ایک سطر میں اشارہ کافی تھا، ان کی تفصیلات نے کئی کئی صفحات گھیر لئے ہیں، اور بہت سی باتیں جو مختصر جملوں میں جامعیت کے ساتھ بیان کی

جا سکتی تھیں، انہیں بغیر کسی قابلِ ذکر فائدے کے کئی کئی عنوانات کے تحت پھیلا کر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرزِ تحریر سے کتاب زیادہ ضخیم بھی ہو جاتی ہے اور موجودہ زمانے میں قارئین کے لئے اُکتاہٹ کا سبب بھی بننے لگتی ہے، اگر فاضل مؤلف اپنے اسلوب میں ایجاز و اختصار پیدا کرنے کی کوشش فرمائیں تو وہ اکابر علمائے دیوبند کے کارناموں کو سامنے لانے کے لئے بڑا کام کر سکتے ہیں۔

۳:- فاضل مؤلف کو صاحبِ سیرت اور تمام علمائے دیوبند سے غیر معمولی عقیدت ہے، یہ عقیدت بعض مقامات پر جذب میں تبدیل ہو گئی ہے، اور اس جذب کے عالم میں بعض جملے ایسے نکل گئے ہیں جو ''انوارِ قاسمی'' جیسی سنجیدہ، علمی اور محققانہ کتاب کے شایانِ شان نہیں، مثلاً صفحہ: ۴۰۹ پر دارالعلوم دیوبند کے ثمرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> یہاں سے بڑے بڑے نامور فاضل، مفسر، محدث، فقیہ ..... اور معلّم پیدا ہوئے، جن میں سے کچھ حضرات درج ذیل ہیں جن کا ثانی دُنیا نے پیدا نہیں کیا، مثلاً شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ ..... مولانا اشرف علی صاحبؒ ..... (اور بہت سے نام شمار کرانے کے بعد لکھا ہے) مولانا محمد علی حیدر آبادی، مولانا انظر شاہ، کمترینِ خلائق محمد انوار الحسن شیر کوٹی وغیرہ وغیرہ۔
>
> (ص: ۴۰۹، ۴۱۰)

صفحہ: ۵۴۶ بھی اس کی ایک مثال ہے۔

۴:- فاضل مؤلف کا اندازِ بیان مجموعی طور پر سادہ، عام فہم اور واضح ہے، لیکن بعض مقامات پر جہاں عقیدت نے عبارت آرائی کا ذوق پیدا کیا ہے وہاں اُسلوبِ بیان کی لطافت بُری طرح مجروح ہوئی ہے، (اس کی ادنیٰ سی مثال صفحہ: ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴ اور ۵۴۸، ۵۴۹) اگر اس طرح کی عبارتوں سے فاضل مؤلف

اجتناب فرمائیں تو ان کی تحریریں زیادہ مؤثر اور مفید ہو جائیں گی۔

بحیثیتِ مجموعی ''انوارِ قاسمی'' اپنے موضوع پر علمی حیثیت سے درجہ اَوّل کی کتاب ہے، اس نے تاریخ وسیرت کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے، اور علمی حلقوں کی طرف سے اس کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی ہونی چاہئے، خدا کرے کہ کتاب کی جلد دوم بھی جو صاحبِ سوانح کے علمی کارناموں پر مشتمل ہوگی، جلد منظرِ عام پر آجائے۔

(محرم الحرام ۱۳۹۰ھ)

فہرست مضامین

مضمون　　　　صفحہ

عرض مصنف ناصیۂ کتاب ۵۱
کتب حوالہ ۵۲
استدراکات ۵۴
مطبوعہ فرمے دیکھ کر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کا تاثر ۵۵
انوارِ قاسمی ۵۶
تحریک انقلاب دینی اور تاسیس دار العلوم ۵۶
اظہارِ تشکر ۵۶
آخری التماس ۵۷
خاتمۂ حسنہ ۵۷
مقدمہ انوارِ قاسمی ۵۹
قطعہ تاریخ طبع انوارِ قاسمی ۶۵
انتسابِ کتاب ۶۶
یادگارِ قاسمؒ ۶۷

انوارِ قاسمیؒ کا پہلا مرحلہ

خاندانی اور وطنی حالات ۶۷
پیدائش ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء ۶۸

مضمون　　　　صفحہ

نام نامی ۶۸
تاریخی نام ۶۹
وطن نانوتہ ضلع سہارنپور ۶۹
نانوتے کی وجہ تسمیہ ۷۰
آب وہوا ۷۰
نہر جمن کی کھدائی تاریخ کی روشنی میں اور آب وہوا کی خرابی ۷۰
نانوتہ کی آبادی حجۃ الاسلام کے زمانے میں ۷۱
نانوتے کا محل وقوع ۷۱
ریلوے لائن ۷۲
نانوتے کی جغرافیائی پوزیشن پر تفصیل نظر ۷۲
نانوتہ ۷۲
علم وفضل ۷۳
پیداوار ۷۳
حجۃ الاسلام کے والد محترم شیخ اسد علی کے حالات ۷۵
تعلیم ۷۵
کھیتی ۷۶
شیخ اسد علی کی حقہ نوشی اور سادگی ۷۶
شیخ اسد علی صاحب کی شادی ان کی زوجہ محترمہ اور ان کے خسر ۸۰
شجرہ بسلسلہ اولاد مولوی محمد ہاشم صاحب تا شیخ اسد علی ومولوی وجیہہ الدین صاحب نانوتوی ۸۱
خوش بخت حبیبہ ۸۲
مولانا محمد قاسم کے نانا مولوی وجیہہ الدین کی علمی قابلیت ۸۲

مضمون صفحہ

حجۃ الاسلامؒ کے حقیقی ماموں ۸۳

حجۃ الاسلام کے نانا مولوی وجیہہ الدین کا انتقال ۸۳

شیخ اسد علی حجۃ الاسلام کے والد محترم کی وفات ۸۴

شیخ اسد علی کی اولاد ۸۶

حجۃ الاسلام کے دادا شیخ غلام شاہ کا ذکر خیر ۸۷

سلسلہ نسب حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ۸۸

حجۃ الاسلام صدیقی النسب شیخ تھے ۸۹

حجۃ الاسلام کے نسب نامے پر ایک تنقیدی محققانہ نظر ۹۰

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے جد امجد قاضی میراں بڈے (بڑے) کی نانوتے میں آمد اور خاندان کی ابتدا ۹۲

قاضی میراں بڑے کی اولاد پر مصائب کا طوفان ۹۴

حجۃ الاسلام کے بعض خاندانی ہم زمانہ علمائے جلیل القدر ۹۸

نیچے کی طرف سلسلہ نصب از قاضی میراں بڑے صاحب تا ۹۹

ذکر خیر حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی ۱۰۲

مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی ۱۰۸

تصنیفات ۱۰۸

مولانا محمد منیر صاحبؒ نانوتوی ۱۱۰

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے ۱۱۱

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ۱۱۲

تلامذہ ۱۱۴

نکاح اوّل ۱۱۴

مضمون صفحہ

نکاح ثانی ۱۱۴
نکاح ثالث ۱۱۴
مذکورہ اکابر کے تعلقات کی کڑیاں ۱۱۶
سرزمین ضلع سہارنپور ومظفرنگر ۱۱۸
گنگوہ ضلع سہارنپور ۱۱۸
خاص سہارنپور (یو۔پی) ۱۱۸
نانوتہ ضلع سہارنپور ۱۱۹
انبیہٹہ ضلع سہارنپور ۱۱۹
دیوبند ضلع سہارنپور ۱۱۹
رائے پور ضلع سہارنپور ۱۲۰
جھنجھانہ تھانہ بھون ضلع مظفرنگر ۱۲۰
کاندھلہ ضلع مظفرنگر ۱۲۱
بڈھا ضلع مظفرنگر ۱۲۱
کیرانہ ضلع مظفرنگر ۱۲۱

دوسرا حصہ عہد طفلی تحصیل علم واساتذہ

معلم اوّل ۱۲۳
دوسرے استاد اور حجۃ الاسلام کا مکتب اوّلیں ۱۲۵
حجۃ الاسلام کی پاکیزگی تحریر ۱۲۵
حجۃ الاسلام دیوبند میں تیسرے استاد مولانا مہتاب علی کی شاگردی میں اور ان سے عربی کا آغاز ۱۲۶
دیوبند میں حجۃ الاسلام میں قریبی رشتہ داریاں ۱۲۷
مولانا مہتاب علیؒ سے مختصر سا تعارف ۱۲۸

مضمون　　　　صفحہ

حجۃ الاسلام سہارنپور میں مولانا محمد نواز صاحب سہارنپوری چوتھے استاذ کی شاگردی میں ۱۲۹
پانچویں استاد مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی کی شاگردی میں ۱۳۰
گرامی نامہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی بنام راقم الحروف محمد انوار الحسن ۱۳۱
حجۃ الاسلام مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ تحصیل علم کے لئے دہلی میں ۱۳۳
حجۃ الاسلام کے چھٹے استاد حضرت مولانا مملوک علی صاحب ۱۳۳
دہلی کو روانگی ۱۳۵
حجۃ الاسلام کی ترتیب حصول تعلیم ۱۳۶
دہلی میں قیام و تحصیل علم کا مزید تجزیہ ۱۳۷
مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا ساتھ ۱۲۶۱ھ ۱۳۹
عہد طالب علمی کے علمی مباحثے ۱۳۹
حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی ۱۴۰
ساتویں استاد کی شاگردی میں ۱۴۰
حجۃ الاسلام کا عربک کالج میں داخلہ ۱۴۱
عربک کالج کے دوسرے استاد ۱۴۳
مولانا قاسم العلوم کے مادر علمی عربی دہلی کالج کا تعارف ۱۴۵
عربی کالج دہلی کی ابتداء ۱۴۵
مولانا مملوک علیؒ کا تقرر ۱۴۵
انگریزی کلاس کا اجرا ۱۴۶
نواب اعتماد الدولہ کا وقف ۱۴۶
کالج کی خصوصیت ۱۴۷
ٹیچر عیسائی ہو گئے ۱۴۷

مضمون ..... صفحہ

۱۸۵۷ء ۱۴۸
۱۸۵٦ء ۱۴۹
دہلی کالج ۱۸۷۷ء ۱۴۹
مرحوم دہلی کالج کے قدیم طلبہ ۱۴۹
حجۃ الاسلام ۱۵۰
حجۃ الاسلامؒ کے آٹھویں استاد حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری ۱۵۰
نویں استاد مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی صدرالصدورؒ ۱۵۱
ہمارا خیال ۱۵۲
مفتی صدرالدینؒ دہلوی ۱۵۴
مختصر حالات اساتذہ ۱۵۹
علمائے نانوتہ کے باوا آدم مولانا مملوک علی صاحبؒ کے مختصر سوانح ۱۵۹
مولانا مملوک علی صاحب دارالبقا میں ۱٦۳
فیصلہ ۱٦۵
مولانا مملوک علی صاحب سرسید کی نظروں میں ۱٦۵
مولانا مملوک صاحب بحیثیت محدث و معلم فنون ۱٦٦
بیٹے کی زبانی باپ کی فضیلت ۱٦۸
مولانا مملوک علی صاحب مولانا رشید احمد صاحب کی نظر میں ۱٦۹
مولانا مملوک علی صاحب مولانا کریم الدین کی نظر میں ۱٦۹
حلیہ ۱۷۰
اخلاق ۱۷۱
تصنیف نہ کرنا اور وعظ نہ کہنا ۱۷۱

مضمون   صفحہ

تصنیف.. ۱۷۱

عجز.. ۱۷۳

مولانا مملوک علی صاحب اپنے ایک شاگرد مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی والد شیخ الہند کی نظر میں.. ۱۷۳

مولانا مملوک علی کے اخلاق وعادات.. ۱۷۷

ذاتی مکان.. ۱۷۸

وفات.. ۱۷۸

مولانا مہتاب علی صاحب عثمانی دیوبندی.. ۱۷۹

اولاد.. ۱۸۰

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری.. ۱۸۱

مرض اور وفات کا تعین.. ۱۸۲

خدمت حدیث بالخصوص بخاری کا حاشیہ.. ۱۸۳

تقریظ از مفتی صدر الدین صاحب بر حاشیہ بخاری.. ۱۸۴

تدریس طلبہ.. ۱۸۵

خلاصہ.. ۱۸۹

حضرت شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلوی ابن شیخ ابو سعید صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ مجددی..... ۱۹۱

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی سند حدیث.. ۱۹۶

حجۃ الاسلامؒ کے علمی آباء واجداد اولاد کا شجرہ طیبہ.. ۲۰۰

شجرہ نسب خاندان شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ.. ۲۰۱

فیض ولی اللہی.. ۲۰۲

حجۃ الاسلام کی سند حدیث کے مختلف اساتذہ.. ۲۰۲

مضمون ..... صفحہ

تجزیۂ سند ۲۰۳

سند حدیث مولانا محمد قاسم صاحب تا امام بخاری ۲۰۴

امام بخاری رحمہ اللہ سے حضور پر نور ﷺ تک سند حدیث ۲۰۶

امام بخاریؒ اور ان کے حالات پر ایک نظر ۲۰۷

یمن کی بندرگاہ کے قریب ایک محدث سے سند حدیث کا لینا ۲۰۸

قاسم العلوم کو بخاری شریف سے خاص نسبت تھی ۲۰۹

قاسم العلومؒ نے بخاری شریف براہ راست رسول اللہ ﷺ سے پڑھی ۲۱۰

نائب رسول ﷺ کا رسول ﷺ سے براہ راست پڑھنا ۲۱۱

قاسم العلوم کا دور طالب علمی ختم ہو گیا ۲۱۳

تیسرا حصہ: روحانیت

جبینِ عقیدت آستانہ امدادیہ پر علم ظاہر سے علم باطن کی طرف ۲۱۴

بیعت قاسمی تقریباً ۱۲۶۶ھ ۲۱۴

حضرت حاجی صاحب سے قدرتی روابط ۲۱۵

بیعت رشیدی ۱۲۶۶ھ میں ۲۱۷

بیعت کے بعد روحانی کیفیت ۲۱۹

پیر و مرشد کی خانقاہ مسجد پیر والی اور وہاں ذکر اللہ کی کیفیت ۲۲۰

پیر محمد والی مسجد واقع تھانہ بھون کا منظر حکیم محمد عمر چرتھاولی ضلع مظفر نگری کے الفاظ میں ۲۲۰

ریاضت و مجاہدہ ۲۲۳

عالم نزع میں پاس انفاس ۲۲۳

بیعت کے بعد اذکار و اشغال کی کثرت کے نتائج ۲۲۴

اخفائے حال اور یاد ذوالجلال ۲۲۴

مضمون　　　صفحہ

شراب معرفت کے خم کے خم خموشی سے لنڈھائے جاتے ہیں........ ۲۲۵
ولایت کا فطری ملکہ........ ۲۲۶
ولایت کا مقصد انسانیت قاسم العلوم اعلیٰ انسان تھے........ ۲۲۷
قاسم العلوم میں اسوہ نبوت کا نمونہ اور انسانیت کا اعلیٰ مقام........ ۲۲۸
اخفائے حال اور کشف تمام کی ایک مثال........ ۲۲۹
مثنوی مولانا روم........ ۲۳۰
درس مثنوی اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ........ ۲۳۱
درس مثنوی میرٹھ میں اور قاسم العلوم کا رقص روح........ ۲۳۲
قاسم العلومؒ نے حضرت حاجی صاحب سے مثنوی کا درس لیا ہے........ ۲۳۲
آمد بر سر مطلب........ ۲۳۳
درویشی و زہد........ ۲۳۳
طالب علمی کے بعد فقر و درویشی کا دور اور بخاری کے چھ سیپاروں کی حاشیہ آرائی........ ۲۳۳
قاسم فقیر ہو گیا فقیر ہو گیا، مفتی صدر الدین پکار اُٹھے........ ۲۳۶
قناعت........ ۲۳۶
بے سر و سامانی میں سنت نبوی........ ۲۳۷
لباس........ ۲۳۸
بے سر و سامانی کی کہانی خود اپنی زبانی........ ۲۳۸
فقر اختیاری نہ کہ اضطراری........ ۲۳۹
دولت سے استغناء اور بے پروائی........ ۲۳۹
نواب رامپور کلب علی خان سے ملنے سے احتراز........ ۲۴۰
غریبوں سے محبت اور انکساری کا کمال........ ۲۴۱

مضمون — صفحہ

الحاصل ۲۴۲
تقویٰ ۲۴۲
تقوے کی لغوی تحقیق ۲۴۳
شریعت میں تقوے کی حقیقت ۲۴۵
ہمارے نزدیک تقوے کی حقیقت ۲۴۶
قاسمی تقویٰ ۲۴۶
علم پر عمل ۲۴۷
قاسمی تقوے کی دوسری مثال ۲۴۷
قاسمی تقوے کی تیسری مثال ۲۴۸
قاسمی تقوے کی چوتھی مثال ۲۴۹
قاسمی تقوے کی پانچویں مثال ۲۵۰
ثمرہ تقویٰ ۲۵۰
رضائے الٰہی ۲۵۲
صفات ولی ۲۵۲
روحانی برکات ۲۵۳
روحانیت میں قدرت ربانی کی کارفرمائی کا محرک ۲۵۴
قاسم العلوم کی روحانی کمندیں اور کرامتیں ۲۵۶
کرامت کی تعریف ۲۵۶
استدراج ۲۵۶
کرامت کی تین قسمیں ۲۵۶
تصرف ۲۵۷

مضمون ...... صفحہ

کرامت حسی ۲۵۷
کرامت معنی ۲۵۷
کاملین کا کرامت سے اجتناب ۲۵۷
کرامت کا اخفا ۲۵۸
غلبہ عبودیت ۲۵۸
وفات کے بعد کرامت کا اظہار درست ہے ۲۵۸
کرامت کے لئے ایک اہم شرط ۲۵۸
جس فعل کا اعضائے ظاہری سے کرنا ناجائز ہے باطنی قویٰ سے بھی ناجائز ہے ۲۵۹
ولی سے کسی ناجائز امر کا صدور ۲۵۹
کرامت قاسمی کا پہلی مثال ۲۵۹
دوسری مثال ۲۶۰
تیسری مثال ۲۶۰
کرامت کی چوتھی مثال اور نماز اوابین ۲۶۱
پانچویں مثال ۲۶۲
چھٹی مثال ۲۶۳
ساتویں مثال ۲۶۳
آٹھویں مثال ۲۶۵
حصول خلافت ۱۲۶۶ھ ۲۶۵
عطیۂ خلافت پر پیرومرشد حاجی امداداللہ صاحب کی تحریری سندات ۲۶۶
سند اوّل ۲۶۶
سند دوم ۲۶۷

مضمون	صفحہ
مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی روحانی تکمیل کی ذمہ داری قاسم العلومؒ کے کاندھوں پر	۳۶۷
مولانا ذوالفقار علی صاحب کی روحانی تربیت حضرت قاسم العلوم کے حوالے	۳۶۹
حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ کی تربیت قاسم العلوم کے ذمے	۳۶۹
اخذ بیعت پر حاجی صاحب کا سخت تقاضا	۲۷۰
قاسم العلوم پر اپنی نسبت منکشف نہیں ہوئی	۳۷۰
قاسم العلوم کے مریدین اور اخذ بیعت	۳۷۱
دیوان محمد یٰسین دیوبندی مرحوم ملقب بہ اللہ دیا کا بیعت کرنا	۲۷۲
مولانا احمد حسن صاحب امروہوی حلقہ بیعت میں بلکہ مسند خلافت پر	۲۷۲
مولوی محمد نظر خان کا اشتیاق بیعت اور قاسمی ورشیدی لطیفہ سنجی	۲۷۳
بیعت کیجئے ورنہ میری اپنی شکر واپس کر دیجئے	۲۷۴
مریدی اور پیری کی ایجنسی	۲۷۴
حاجی محمد اسحاق خان خورجوی	۲۷۵
منشی رحیم الدین صاحب	۲۷۵
شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ حلقہ ارادت میں	۲۷۵
شیخ الہند قاسم العلومؒ کے خلیفہ مجاز بھی تھے	۲۷۶
مولانا الحاج مولوی محمد روشن خان صاحب مرادآبادی مرید قاسم العلوم	۲۷۶
مولانا محمد صدیق صاحب مرادآبادی قاسمی خلیفہ بھی تھے اور مرید بھی	۲۷۷
قابل حیرت	۲۷۸
امیر شاہ خان صاحب ساکن مینڈھو بھی مرید تھے	۲۷۸
منشی فضل حق صاحب گنگوہی کی دیوبند کے مریدین کے متعلق شہادت	۲۷۹
حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی	۲۷۹

مضمون صفحہ

قاسمی مریدین کی تعداد سرسیدؒ کے نزدیک ۲۸۰
طریقہ تربیت واصلاح وتزکیہ اخلاق ۲۸۱
حکیمانہ اصلاح ۲۸۱
حکیمانہ مگر مشفقانہ اصلاح ۲۸۲
مرشدانہ سالکانہ اصلاح ۲۸۳
روحانی اصلاح یعنی تصرف کے ذریعہ علاج کی ایک اور مثال ۲۸۴
قاسم العلومؒ فرشتے سیرت ملکوتی خصلت انسان تھے ۲۸۵
قاسم العلومؒ سرسیدؒ کی نظر میں ۲۸۵
ولایت قاسمی پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں ۲۸۶
عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نظر میں ۲۸۶
مولانا ذوالفقار علی کے خیال میں ۲۸۷
تذکرہ حاجی امداد اللہ صاحب پیرومرسد ۲۸۸
تھانہ بھون ۲۸۹
والدہ اور بھائی بہن ۲۸۹
تعلیم ۲۸۹
بیعت ۲۹۰
حاجی صاحب کا مقام ولایت ۲۹۰
ہجرت مکہ اور جہاد آزادی ۲۹۱
رشید وقاسم سرفہرست ۲۹۱
تمام علمائے ہند بریلی اور دیوبند کو حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد کے مطابق رشیدؒ وقاسمؒ کا اتباع ضروری ہے ۲۹۱

مضمون	صفحہ
حاجی صاحب کے معتمد اور امانت دار	۲۹۳
قاسم العلوم کی نظروں میں پیر و مرشد حاجی صاحب کا احترام	۲۹۴
وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ	۳۰۰
مولانا محمد قاسم صاحبؒ حاجی امداد اللہ صاحب کی زبان تھے	۳۰۲
ولی کامل مولانا محمد قاسم صاحبؒ بقول حاجی صاحب	۳۰۳
شجرہ روحانی چشتیہ صابریہ منظومہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ	۳۰۵
شجرہ طیبہ روحانی حضرت قاسم العلومؒ	۳۰۵
شجرہ قاسمی مجددی نقشبندی تا سرکار دو عالم ﷺ	۳۱۱

چوتھا حصہ: فکرِ معاش، ملازمت اور عائلی زندگی

مضمون	صفحہ
قاسم العلومؒ مطبع احمدی دہلی میں	۳۱۴
مطبع احمدی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے حالات	۳۱۵
قاسم العلومؒ کا علمی شاہکار زندگی	۳۱۶
بخاری کا حاشیہ اور راقم الحروف کا خواب	۳۱۷
کوچہ چیلاں سے پانچ سال بعد ۱۲۷۳ھ/۵۷-۱۸۵۶ء میں	۳۱۸
مطبع احمدی کے بعد نانوتے میں قیام	۳۱۹
حج کو روانگی اور واپسی	۳۱۹
حج سے واپسی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء پر پھر نانوتے اور مطبع مجتبائی میرٹھ میں	۳۲۰
درس مسلم شریف	۳۲۱
منشی ممتاز علی صاحب سے قدرے تعارف	۳۲۱
قاسم العلومؒ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء سے ۱۲۸۵ھ/۶۹-۱۸۶۸ء تک مطبع مجتبائی میرٹھ میں	۳۲۲
قاسم البرکات ۱۲۸۶ھ/۷۰-۱۸۶۹ء میں مطبع ہاشمی میں	۳۲۳

مضمون	صفحہ
قاسم العلومؒ ۱۲۸۶ھ/۷۰-۱۸۶۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی میں بھی	۳۲۴
مطبع مصطفائی دہلی میں	۳۲۵
۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں قاسم العلومؒ علیگڑھ میں	۳۲۶
تنخواہ	۳۲۸
توکل	۳۲۹
ہدایا و تحائف	۳۲۹
تقسیم تحائف	۳۲۹

قاسم العلومؒ کی ازدواجی زندگی

مضمون	صفحہ
دیوبند میں شادی	۳۳۱
سال نکاح ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۹ھ	۳۳۲
سامان جہیز	۳۳۳
شب اوّل میں نوافل اور جہیز کا سامان سلطان ترکی کے چندے میں	۳۳۳
قاسم العلومؒ کی زوجہ محترمہ ام رحم کی سیرت پر ایک نظر	۳۳۵
شوہر کی اطاعت اور مہمان نوازی	۳۳۵
استغنا اور دنیا سے بے رغبتی	۳۳۵
اہلیہ صاحبہ کا صبر اور شوہر کی دلجوئی	۳۳۶
ساس کی خدمت میں شوہر کی خوشنودی	۳۳۶
قاسم العلومؒ کی اہلیہ کی دینداری اور ذکر الٰہی	۳۳۷
اہلیہ محترمہ کا برادری میں احترام	۳۳۸
قاسم العلومؒ کو والدین کی خدمت کا زبردست احساس	۳۳۸
قاسم العلومؒ کے والد شیخ اسد علی کی وفات	۳۳۹

مضمون	صفحہ
قاسم العلومؒ کی اولاد	۳۳۹
بی بی اکرامن (اکرام النسا) اور بی بی رقیہ کی شادیاں	۳۴۲
نورنگاہ مولانا محمد قاسم صاحب مولانا حافظ محمد احمد صاحب	۳۴۴
مدرس	۳۴۴
وفات	۳۴۵
سراپا حافظ صاحبؒ	۳۴۵
حافظ صاحب کی بہترین یادگار آپ کے فرزند اکبر مولانا محمد طیب صاحبؒ	۳۴۷
سراپا	۳۴۷
سوانح	۳۴۸
ملک میں تقریروں کا سلسلہ اور تصانیف	۳۴۸
شجرہ اولاد مولانا محمد قاسم صاحبؒ	۳۴۹
الحاصل	۳۵۰

پانچواں حصہ: ۱۸۵۷ء کا جہاد حریت

مضمون	صفحہ
شمشیر بکف مولانا محمد قاسمؒ	۳۵۱
مسلمانوں کی مالابار اور سیلون میں آمد	۳۵۲
ملتان پر حملہ	۳۵۲
دیبل پرانے کراچی پر محمد بن قاسم کی چڑھائی	۳۵۲
محمد بن قاسم کے حملے کی وجہ	۳۵۳
سبکتگین اور جے پال کی جنگ اور محمود غزنوی کے حملے	۳۵۴
شہاب الدین محمد غوری ۱۱۷۵ء سے ۱۲۰۳ء تک	۳۵۴
خاندان مغلیہ ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک	۳۵۵

مضمون — صفحہ

سوری خاندان ۳۵۵
پھر مغلیہ خاندان اور ہمایوں ۳۵۵
سلطنت مغلیہ کا خاتمہ سن ۱۸۰ء ۳۵۷
مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ۳۵۷
مختلف مسلمان حکومتوں کی مدت حکومت کا خلاصہ ۳۵۷
انگریزوں کی سلطنت اور ان کی فتوحات ۳۵۹
سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں ۳۵۹
میر جعفر کی غداری رابرٹ کلایو کی سازش اور نواب سراج الدولہ کی شہادت ۳۶۰
انگریزوں کی کمینہ حرکتیں ۳۶۳
۱۸۵۷ء کا جہاد حریت اور اس کے اسباب ۳۶۳
دیسی ریاستوں پر قبضے سے بیروزگاری ۳۶۴
مسلم اور ہندو مذہبی احساسات کی پامالی ۳۶۴
فوج میں خنزیر اور گائے کی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کی تقسیم ۳۶۶
میرٹھ چھاؤنی سے فوجوں نے علم حریت بلند کیا ۳۶۶
شاہ ظفر کی شمولیت ۳۶۷
۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی پر مجاہدین حریت کا قبضہ ۳۶۷
بہادر شاہ کی مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی پوزیشن ۳۶۸
لارڈ کیٹنگ گورنر جنرل ۳۶۸
۱۸۵۷ء کی دہلی ۳۶۸
دہلی اور دیگر علاقوں پر بہادر شاہ کا جھنڈا ۳۶۹
۱۸۵۷ء میں دہلی شہر کا نقشہ ۳۶۹

مضمون ..... صفحہ

انگریزوں کے قتل سے پرہیز ۳۷۰

لکھنؤ ہنگامہ آزادی اور بیگم محل کی سرگرمیاں اور شہزادہ برجیس قدر کی تخت نشینی ۳۷۰

۲ مئی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ میں جنگ آزادی کا آغاز ۳۷۰

مولانا احمد اللہ شاہ سپہ سالار ۳۷۱

جنگ آزادی کا تیسرا مرکز کانپور ۳۷۱

جنگ آزادی کا چوتھا مرکز جھانسی تھا ۳۷۲

تمام ہندوستان میں حریت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے ۳۷۲

۱۸۵۷ء ۳۷۳

بجنور مجاہدین کے قبضے میں ۳۷۳

شیرکوٹ ضلع بجنور اور ماڑے خان ۳۷۳

شیرکوٹ کی پہلی لڑائی ۲۸ جولائی ۱۸۵۷ء ۳۷۵

شیرکوٹ کی دوسری جنگ ۵/ اگست ۱۸۵۷ء ۳۷۵

چودھریوں کا بجنور پر حملہ اور محمود خان پر چڑھائی ۳۷۵

ماڑے خان اور ہندوؤں کا قتل ۳۷۵

دہلی میں جنرل بخت خان کی آمد اور جہاد کا فتویٰ ۳۷۹

نقل استفتا از اخبار الظفر دہلی اردو ۳۸۰

جواب ۳۸۰

جنگ حریت میں تھانہ بھون

ضلع مظفر نگر کی حالت ۳۸۰

حاجی امداد اللہ صاحبؒ امیر تھانہ بھون ۳۸۲

مضمون ..... صفحہ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور جناب مولانا رشید احمد صاحبؒ حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے شرعی مشیر ۳۸۳
نانوتہ، گنگوہ، تھانہ بھون، شاملی مظفر نگر اور کیرانے میں باہمی رابطہ ۳۸۴
حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ فطری طور پر بہادر اور دلیر مجاہد تھے ۳۸۵
نشانہ بازی ۳۸۵
جہاد شاملی ضلع مظفر نگر کا پس منظر اور سبب ۳۸۶
جہاد کا فوری سبب ۳۸۷
مولانا رحمت اللہ صاحب کی زندگی ۳۹۱
مولانا رحمت اللہ کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دہلی میں آمد ۳۹۱
جہاد شاملی ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء مطابق ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ بروز پیر بوقت ظہر ۳۹۶
جہاد حریت کی پہلے سے تیاری کا اور ثبوت ۳۹۷
قاضی عنایت علی کے حالات ۳۹۹
قاضی عنایت علی بحیثیت وکیل ۴۰۳
تھانہ بھون میں جہاد حریت تحقیق کی روشنی میں ۴۰۵
تھانہ بھون میں بے انتہا اشتعال ۴۰۶
جہاد کے لئے مجلس مشاورت ۴۰۷
اسپنکی کی پیشکش ۴۰۷
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا والدین سے جہاد کے لئے اجازت حاصل کرنا ۴۰۹
جہاد کی ابتدا اور شیر علی کے باغ کی سڑک پر تھانہ بھون سے حملہ ۴۱۰
قاضی عنایت علی کا اسلحہ اور کارتوس کی بہنگیوں پر قبضہ ۴۱۱
شاملی کا جہاد ۱۲ ستمبر تا ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء ۴۱۲

مضمون ..... صفحہ

شاملی کی فوجی اہمیت ۴۱۳
جہاد شاملی کا دوسرا پس منظر ۴۱۵
مولانا محمد قاسم صاحب کا کارنامہ ۴۱۸
حافظ صاحب کی شہادت اور تھانہ بھون میں تدفین ۴۱۹
حافظ صاحب کے مزار کا محل وقوع ۴۲۱
جہاد شاملی کے بعد تھانہ بھون کی ویرانی اور تباہی ستمبر ۱۸۵۷ء ۴۲۲
حافظ محمد ضامن صاحبؒ کے حالات زندگی ۴۲۵
پیدائش ۴۲۵
عادات و اخلاق ۴۲۶
حافظ صاحب کا حلیہ ۴۲۶
تعلیم و تربیت ۴۲۷
بیعت ۴۲۸
وجد اور اخفائے حال ۴۲۹
اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ ۴۲۹
شہادت کا کشف ۴۳۰
شہادت سے آٹھ دس روز پہلے حافظ صاحب کا خط ۴۳۰
شہادت کی تیاری ۴۳۰
تاریخ شہادت ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء بروز پیر بوقت ظہر بمقام شاملی ۴۳۱
مرثیہ حافظ محمد ضامنؒ شہید از مولانا محمد قاسم صاحبؒ ۴۳۲
جلال کبریائی کا ظہور ۴۳۳
حافظ صاحب کے گھر کی ویرانی ۴۳۴

مضمون صفحہ

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی مکہ مکرمہ کو ہجرت ۴۳۶
کرامت ۴۳۷
بالہام غیبی مکہ مکرمہ کو ہجرت ۴۴۰
اسی طرح خدا کا حکم ہے ۴۴۰
حاجی صاحب مولانا گنگوہی سے جیل میں ملے ۴۴۱
حاجی صاحب کا کشف خاص ۴۴۲
۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں مکہ مکرمہ میں ورود اور وفات ۴۴۲
حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی پر کیا گذری ۴۴۴
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ملاقات ۴۴۵
حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا جہاد حریت میں حصہ ۴۴۸
قاضی عبدالرحیم کا حادثہ ۴۴۹
جہاد پر آمادہ کرنا قاسم العلومؒ کا کارنامہ تھا ۴۵۰
قاسم العلوم فطری مجاہد تھے ۴۵۰
ایام فتنہ میں بے خوفی ۴۵۱
نشانہ بازی ۴۵۱
جہاد شاملی میں حضرت قاسم العلوم کی سرگرمیاں ۴۵۲
حضرت قاسم العلوم پر مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی بحیثیت نگران اور معاون جہاد ۴۵۲
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے گولی کا لگنا اور محفوظ رہنا ۴۵۴
کرامتِ قاسمی ۴۵۴
دوسرا حادثہ ۴۵۴
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے گولی لگی ۴۵۶

مضمون — صفحہ

جہاد کے بعد روپوشی ۴۵۷
حاجی صاحب سے ملاقاتیں ۴۵۷
دیوبند میں مولانا محمد قاسم صاحب کی تلاش ۴۵۷
پولیس کے سوال کا منطقی مگر صحیح جواب ۴۵۸
روپوشی میں پابندی سنت ۴۵۹
موضع چکوالی میں قیام ۴۶۰
ایسٹ انڈیا کی جگہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت ۴۶۲
قاسم العلوم کے والدین کی حالت ۴۶۳
قدرت کی مختلف شانیں ۴۶۳
مولانا محمد مظہر صاحبؒ اور مولانا محمد منیر صاحبؒ ۴۶۴
کوئی ہمارے اسماعیل کو تو دیکھے ۴۶۵
دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ۴۶۵
قاسم العلومؒ اور فریضہ حج ۴۶۷
پہلا حج ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء ۴۶۷
دوسرا حج ۱۲۸۶ھ ۴۶۷
تیسرا حج ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء ۴۶۷
پہلے حج کی تفصیلات روانگی ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹/نومبر ۱۸۶۰ء بروز جمعرات ۴۶۸
سہو کتابت ۴۶۸
بیاض یعقوبی یا روزنامچہ سفر خشکی ۴۶۸
یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۱۸۶۰ء ہفتہ سفر دریا ۴۷۰
۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ یکم جنوری ۱۸۶۰ء منگل ۴۷۱

صفحہ	مضمون
۴۷۲	یکم رجب ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۸۶۱ء اتوار
۴۷۳	یکم شعبان ۱۲۷۷ھ ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء
۴۷۳	یکم رمضان ۱۲۷۷ھ ۱۴ مارچ ۱۸۶۱ء
۴۷۳	۲۰ شوال ۱۲۷۷ھ یکم مئی ۱۸۶۱ء بدھ
۴۷۳	۲۳ ذیقعدہ ۱۲۷۷ھ ۳ جون ۱۸۶۱ء بروز پیر مکہ محترمہ میں آمد
۴۷۴	حج ۹ ذی الحجہ مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۱ء
۴۷۴	حفظ قرآن کریم
۴۷۵	مدینہ منورہ کو روانگی اور ہندوستان کو واپسی براہ بمبئی جمادی الاخریٰ ۱۲۷۸ھ
۴۷۶	قاسم العلوم کا دوسرا حج بتاریخ ۹ ذوالحجہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ء
۴۷۷	حضرت قاسم العلوم کا تیسرا حج روانگی ۹ شوال ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء واپسی ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ
۴۸۲	۱۲۹۴ھ میں کاروان حجاز
۴۸۳	حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی کرامت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی زبانی
۴۸۴	بمبئی سے روانگی
۴۸۵	مولانا محمد قاسم صاحب کا سفر حج میں فقر و درویشی کا رنگ
۴۸۶	جہاز میں حجۃ الاسلام کا مشغلہ
۴۸۶	قیام مکہ اور واپسی

چھٹا حصہ: چشمہ فیض قاسمی دارالعلوم دیوبند

صفحہ	مضمون
۴۸۹	سعادت عظمیٰ
۴۸۹	تحریک دارالعلوم کا پس منظر
۴۹۱	قطعہ تاریخ وفات دیوان محمد یٰسین صاحب عرف خادم اللہ دیا خاص قاسم العلوم
۴۹۳	ذکر خیر حاجی عابد حسین صاحب

مضمون	صفحہ
پیدائش ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء	۴۹۳
حاجی صاحب کے پیرو مرشد	۴۹۴
حاجی صاحب کو حاجی مہاجر مکی سے خلافت کا حصول	۴۹۴
حاجی محمد عابد صاحب کا تقویٰ اور پابندی نماز با جماعت	۴۹۵
تعمیر جامع مسجد دیوبند کا عظیم الشان کارنامہ	۴۹۶
حاجی صاحب کے دوسرے صفات	۴۹۶
صائب رائے حاجی صاحب	۴۹۶
طالب علم سے معافی	۴۹۶
اہتمام دارالعلوم دیوبند	۴۹۷
حج اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت	۴۹۷
وفات	۴۹۷
ذکر خیر حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ	۴۹۸
پیدائش	۴۹۸
اہتمام دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء	۴۹۸
ترقی دارالعلوم اور تعمیرات	۴۹۹
حج اور وفات	۵۰۱
دارالعلوم دیوبند کے عناصر اربعہ	۵۰۲
محرک	۵۰۲
بیان منشی محمد فائق صاحب	۵۰۲
بیان پر تبصرہ	۵۰۴
منشی فضل حق صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان	۵۰۴

مضمون صفحہ

حاجی نذیر احمد مصنف تذکرہ العابدین کا تاسیسی تاریخی بیان دارالعلوم کے متعلق ۵۰۵
حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا گرامی نامہ اور بانیان مدرسہ ۵۰۹
مدرسہ دیوبند کے لئے سب سے پہلے چندہ دینے والا ۵۱۰
حضرت قاسم العلومؒ نے دارالعلوم دیوبند کو دارالعلوم بنایا ۵۱۱
قاسم العلوم کا لقب ۵۱۲
حضرت قاسمؒ اور تاسیس دارالعلوم ۵۱۲
قاسم العلوم کی گمنامی پسندی اور شہرت سے نفرت ۵۱۳
حضرت قاسم العلومؒ بانی دارالعلوم دیوبند ۵۱۶
حاجی محمد عابد صاحب کی مخالفت ۵۱۶
دارالعلوم کا سنگِ بنیاد ۵۱۷
درسگاہ نودرہ ۵۱۸
تجزیہ ۵۲۰
بانی کے عقائد ۵۲۱
حکومت برطانیہ میں بانی دارالعلوم دیوبند حضرت قاسمؒ کی شکایت ۵۲۲
مشورہ قاسم العلومؒ کا اور عمل میرا ۵۲۴
دارالعلوم کے اصولِ وضوابط ۵۲۵
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے آٹھ الہامی اور اساسی اصول جن پر دارالعلوم کی انتظامی بنیاد رکھی گئی ۵۲۶
وہ اصول جن پر مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں ۵۲۶
باہمہ اور بے ہمہ ۵۳۰
سرسید کے نزدیک بانی دارالعلوم حضرت قاسم العلومؒ ۵۳۱

مضمون ..... صفحہ

دارالعلوم کی بتدریج ترقی ۵۳۵
سب سے پہلے استاد ملا محمود دیوبندی اور سب سے پہلے شاگرد مولانا محمود حسن ۵۳۵
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی آمد ۵۳۵
اولین مہتمم ۵۳۷
سب سے پہلی مجلس شوریٰ ۵۳۷
سالانہ آمد صرف ۵۳۷
پہلا سالانہ انعامی جلسہ ۵۳۷
فارسی وحساب اور قرآن کی تعلیم ۵۳۸
وفات حضرت قاسم العلوم ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء ۵۳۸
حافظ محمد احمد صاحب ۱۳۱۲ھ سے ۱۳۴۷ھ تک ۵۳۸
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے بڑے بھائی ۵۳۹
اہتمام حکیم الاسلام مولانا محمد طیب ۵۴۰
علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ۵۴۰
دارالعلوم کے سرپرست حضرات ۵۴۰
شیخ الحدیث مولانا محمد یعقوب صاحب ۵۴۱
مولانا سید احمد صاحب دہلوی ۵۴۱
حضرت مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا ۵۴۱
حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ ۵۴۱
حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ ۵۴۲
ستم ظریفی ۵۴۲
حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ ۵۴۳

صفحہ　　　　　　　　　　　　مضمون

دارالعلوم دیوبند میں علوم وفنون کی تعلیم ۵۴۳

طلبہ کی تعداد ۵۴۴

نظام دارالعلوم ۵۴۵

دارالعلوم دیوبند کا مسلک ۵۴۶

تقلید امام اعظمؒ ۵۴۶

علمائے دیوبند کا روحانی مسلک ۵۴۶

علمائے دیوبند کے عقائد ۵۴۶

رسول مدنی ﷺ کی محبت اور عظمت ایمان ہے ۵۴۷

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت درود عین ثواب ہے ۵۴۸

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے ۵۴۸

میلاد شریف اور علمائے دیوبند ۵۴۸

علم غیب اور علمائے دیوبند ۵۴۹

علمائے دیوبند کا رنگ اعتدال ۵۴۹

تکفیر سے تابمقدور احتیاط اور باہمی رواداری ۵۵۰

ایصال ثواب ۵۵۱

علمائے دیوبند کی وسیع الخیالی ۵۵۲

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اختلاف کو ہوا دینے سے سخت نفرت کرتے تھے ۵۵۲

علمائے دیوبند غیر جانبدار علما کی نظر میں ۵۵۳

حضرت مولانا شیر محمد صاحب شرقپوری ۵۵۴

دارالعلوم دیوبند علامہ رشید رضا کی نظر میں ۵۵۵

دارالعلوم دیوبند شیخ الاسلام فلپائن کے خیال میں اہلسنت والجماعت کا مدرسہ ہے ۵۵۶

مضمون	صفحہ
علمائے جامع ازہر قاہرہ (مصر) کے علما کا خیال	۵۵۶
حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا فرمان دارالعلوم کی امداد ضروری سمجھو	۵۵۹
میدان سیاست اور آزادیٔ ہندوپاک میں علمائے دیوبند کی جد جہد	۵۶۰
حضرت قاسم العلوم کا مقصد انگریزوں کو نکال کر خالص مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا تھا	۵۶۱
شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا نظریہ حکومت	۵۶۱
حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی اور سیاست ہند	۵۶۲
حضرت گنگوہیؒ کا جواب	۵۶۳
حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ	۵۶۳
شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی	۵۶۴
مولانا عبید اللہ صاحب سندھی فاضل دیوبند	۵۶۵
سب شاہ ولی اللہ کی راہ پر	۵۶۶
صوبہ سرحد میں اسلامی حکومت	۵۶۶
حضرت مجدد الف ثانیؒ	۵۶۶
حضرت شاہ ولی اللہؒ	۵۶۷
حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ	۵۶۸
حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ شہید	۵۶۸
علمائے دیوبند کا نظریہ	۵۶۹
کانگریسی مسلمان	۵۶۹
جمعیۃ العلمائے ہند کو مخلصانہ مشورہ	۵۷۲
دارالعلوم دیوبند	۵۷۲
مضبوط پاکستان	۵۷۳

مضمون — صفحہ

پاکستان کا جنگی جہاز اور دوارکا ۵۷۳
الحاصل ۵۷۴
دارالعلوم دیوبند کے ثمرات ۵۷۵
دیگر عربی مدارس کے بانی حضرت قاسم العلومؒ ۵۷۷
مظاہر العلوم سہارنپور ۵۷۷
مدرسہ قاسم العلومؒ مرادآباد ۵۷۹
غیر مسلموں کا چندہ ۵۸۱
غیر مسلموں سے کتابیں اور اخبار ۵۸۱
ہندو طلبہ دارالعلوم میں ۵۸۱
دارالعلوم کی شہرت دوسرے ممالک میں ۵۸۲
الغرض ۵۸۲
قاسم العلومؒ معلم واستاد کی حیثیت میں ۵۸۳
سب سے پہلے شاگرد عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ ۵۸۳
مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے قدرے بخاری پڑھی ۵۸۳
مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے پھر صحیح مسلم پڑھی ۵۸۴
مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے پھر صحیح مسلم پڑھی ۵۸۴
تدریس کی رفتار میں اور تیزی نیز ہر قسم کی کتب کی تعلیم ۵۸۵
آمد معانی عارف باللہ کی زبانی ۵۸۶
زبان قاسمی سے طلبہ کو پڑھانے کا ذکر اور میرٹھ میں مثنوی کا درس ۵۸۶
قاسم العلوم کے دیوبند کے دوسرے ممتاز تلامذہ ۵۸۷
حالات مولانا علاء الدین صاحب صاحبزادہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ۵۸۹

مضمون	صفحہ
قاسم العلومؒ کی درسگاہ چھتے کی مسجد	۵۸۹
حکیم مولوی رحیم اللہ صاحب بجنوری	۵۹۱
حکیم رحیم اللہ صاحب سے قدرے تعارف	۵۹۲
ذکر خیر شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا	۵۹۴
شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار اور قاسم العلومؒ کی بلندی نظر	۵۹۴
وفات اہلیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ	۵۹۶
تصنیفات	۵۹۷
تحریک جمعیۃ الانصار	۵۹۷
مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ	۵۹۹
شاگردی کا اقرار	۵۹۹
مولانا فخر الحسن صاحب بحیثیت مقرر	۶۰۰
تصنیفات قاسمی کی اشاعت اور ترویج میں مساعی جمیلہ	۶۰۰
حجۃ الاسلام کی اشاعت	۶۰۱
انتصار الاسلام کی اشاعت	۶۰۱
مباحثہ شاہجہان پور کی اشاعت	۶۰۲
سوانح قاسمی	۶۰۲
رد عقائد سرسید بسلسلہ عدم وجود جسمانی فرشتگان و جنات	۶۰۳
ذکر خیر مولانا احمد حسن صاحب امروہوی	۶۰۵
ملازمت	۶۰۶
رامپور اسٹیٹ ضلع مراد آباد میں رفاقت	۶۰۷
مولانا احمد حسن صاحب اور ان کی خوش لباسی	۶۰۸

مضمون	صفحہ
مولانا احمد حسن صاحب پر روحانی تصرف	۶۰۸
مولانا احمد حسن صاحبؒ کو قاسم العلومؒ سے مناسبت	۶۰۹
مولانا احمد حسن صاحب جمعیۃ الانصار کے پہلے جلسہ مرادآباد میں بحیثیت صدر جلسہ	۶۰۹
تصنیفات	۶۱۰
وفات مولانا احمد حسن صاحبؒ	۶۱۱
لطیفہ	۶۱۲
مولانا منصور علی مرادآبادی وحیدرآبادی	۶۱۴
مولانا عبدالعلی صاحبؒ	۶۱۶
الحاصل	۶۱۷
مولوی محمد اسماعیل صاحب رئیس علی گڈھ	۶۱۹
مولانا حافظ محمد احمد صاحب فرزند قاسمی کا باپ سے تلمذ	۶۲۱
زبان قاسمیؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ	۶۲۲
علوم میں بلند پروازی	۶۲۴
علیم وتدریس اقلیدس	۶۲۶
ریاضی واقلیدس میں ماہرانہ نظر	۶۲۶
آخری دور کے شاگرد مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسر امروہوی	۶۲۹
مختصر سوانح زندگی	۶۲۹
پیدائش تعلیم	۶۳۰
حضرت قاسم العلومؒ سے شرف تلمذ	۶۳۰
مولانا احمد حسن صاحبؒ	۶۳۱
وفات	۶۳۳

مضمون	صفحہ
پھر مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسر کی طرف	۶۳۳
روایات قاسمی	۶۳۴
مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہوی حضرت نانوتوی کے سلسلہ بیعت	۶۳۵
عورتوں کا حضرت نانوتوی سے بیعت کرنا	۶۳۶
مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے عہد طالبعلمی میں دارالعلوم کی عمومی حالت	۶۳۶
مدرسہ اسلامیہ امروہہ کا آغاز	۶۳۷
حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کا طلبہ کو صبح کی نماز کے لئے جگانا	۶۳۷
کچھ بیعت نانوتویؒ کے متعلق مزید معلومات	۶۳۸
ملا عنایت اللہ صاحب سہارنپوی تھانیدار مرید حضرت قاسم العلومؒ	۶۳۸
مولانا حافظ تجمل حسین صاحب بہاری	۶۳۹
حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی	۶۳۹
مولانا سید احمد صاحب دہلوی مرید قاسمی	۶۳۹
پھر مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی طرف	۶۴۰
مولانا خلیل الرحمٰن صاحب شاگرد قاسمیؒ	۶۴۰
مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ پھلاودی شاگرد قاسم العلومؒ	۶۴۱
حضرت قاسم العوم کے نومسلم شاگرد مولانا سعید بن سردار کھڑک سنگھ (پنجابی)	۶۴۲
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی قاسمی شاگردوں میں	۶۴۳
قاسمی العلوم والخیرات والبرکات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند اوران کی خصوصی علمی اولاد	۶۴۴

آٹھواں باب: اصلاح امت مسلمہ لسانی، قلمی اور عملی جہاد

مضمون	صفحہ
تحریک نکاح بیوگان ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۷ء	۶۴۵

مضمون ..... صفحہ

سورہ والعصر کا پیکر قاسم العلوم ۶۴۶
۱۔ نکاح بیوگان کی تحریک ۱۲۸۳ھ ۶۴۷
عورت کے وجود اور اس کی شخصیت کے مختلف مناظر ۶۴۸
موجودہ یورپ میں عورت کا مقام ۶۴۹
ہندو مذہب اور عورت ۶۴۹
اسلام اور عورت ۶۵۰
نکاح بیوگان ہندو مذہب میں سخت پاپ ہے ۶۵۱
اسلام اور نکاح بیوگان ۶۵۱
ولادت کے تقاضے ۶۵۳
ضبطِ تولید اور برتھ کنڑول ۶۵۳
اللہ پر بے اعتمادی ۶۵۴
نکاح بیوگان کے نظریے میں مسلمانوں کی عددی ترقی ۶۵۴
پاکستان کا وجود ۶۵۴
ہندوستان کے ہندوؤں کی بوکھلاہٹ ۶۵۵
نکاح بیوگان پر قاسم العلوم کا جہاد لسانی مسلانوں اور عورتوں کی فتح عظیم ہے ۶۵۵
نتائج تبلیغ قاسمی بسلسلہ نکاح بیوگان ۶۵۷
محترمہ امینہ کا نکاح ثانی شیخ اسد علی صاحب کی زندگی میں ۶۵۹
۴۔ مولانا محمد قاسم صاحب کے بہنوئی کا ماہ انتقال ۶۶۲
تحریک نکاح بیوگان ۱۲۸۳ھ ۶۶۳
بنیاد دار العلوم دیوبند ۱۵/ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء ۶۶۳
اصلاح امت کا دوسرا اقدام ۶۶۵

مضمون .... صفحہ

۲۔ غم و شادی کی فضول رسموں کی اصلاح ۶۶۵

جہاد عملی، اصلاح امت کا تیسرا اقدام ۶۶۷

۳۔ وراثت میں لڑکیوں کی حق رسی ۶۶۷

جہاد لسانی و عملی اصلاح امت کا چوتھا اقدام ۶۶۸

۴۔ تعزیہ داری اور ماتم کا دیوبند سے استیصال ۶۶۸

دیوانِ محمد یٰسین عرف اللہ دیا کا تائب ہونا ۶۷۰

اندرونی خلفشار یعنی شیعیت ۶۷۱

شیعوں کا تائب ہونا، مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودی کی ایک معتبر روایت ۶۷۲

پورقاضی کے شیعوں کا مقابلے سے فرار ۶۷۴

پورقاضی کے شیعوں کا سنیت کی طرف رجوع ۶۷۴

اصلاح امت مسلمہ کا چوتھا اقدام ۶۷۶

۴۔ اہل حدیث کو فہمائش، قلمی اور لسانی جہاد ۶۷۶

حضرت قاسم العلوم اور تراویح ۶۷۷

اصلاح امتِ مسلمہ کا پانچواں اقدام ۶۷۹

مکتبہ فکر بریلی کے لئے فہمائشی جدوجہد، قلمی اور لسانی جہاد ۶۷۹

اصلاح امت مسلمہ کا چھٹا اقدام ۶۸۲

۶۔ سرسید بانی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کو فہمائش اور اصلاحی خطوط ۶۸۲

سرسید سے خط و کتابت کا زمانہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۶ء ۶۸۶

نواں باب: دفاع اسلام و مسلمین

ردعیسائیت، قلمی، قدمی، مالی اور لسانی جہاد ۶۸۸

عیسائیت کا ہندوستان میں غلبہ ۶۸۸

مضمون — صفحہ

عیسائیت کی تبلیغ اور مبلغین عیسائی ۶۸۹
علمائے اسلام جنہوں نے عیسائیت کا مقابلہ کیا ۶۸۹
ردعیسائیت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کا حصہ ۶۹۱
(۱) پادری تاراچند سے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۲-۷۳ء میں مناظرہ اور اس کا فرار دارالخلافہ دہلی میں مولانا محمد قاسم صاحب کا نعرہ حق ۶۹۱
پادری تاراچند کا تعارف ۶۹۲
مولانا محمد قاسم صاحب اور تاراچند ۶۹۲
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا بیان ۶۹۳
مولوی منصور علی سے دہلی میں ملاقات ۶۹۳
قاسم العلوم کی فتح ۶۹۳
مباحثہ شاہجہانپور سال اول ۶۹۵
قاسم العلوم کا عیسائیوں سے دوسرا مناظرہ ۶۹۵
نانوتے سے دیوبند کو پاپیادہ روانگی ۴ مئی کو دہلی میں تار کی آمد ۶۹۶
دہلی سے قاسم العلوم کی ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو بعد عشاء روانگی اور ۶ مئی بروز شنبہ بعد عصر شاہجہانپور میں ورود ۶۹۷
سرائے شاہجہانپور میں ارادہ قیام ۶۹۷
صبح ۷ مئی ۱۸۷۶ء پاپیادہ قاسم العلوم کی چاندا پور کو شاہجہانپور سے روانگی ۶۹۷
میلہ خداشناسی میں قاسم العلوم کی پہلی غلغلہ انداز تقریر ۷ مئی ۱۸۷۶ء ۶۹۸
میلہ خداشناسی میں قاسم العلوم کی تجویز اور میلہ خداشناسی میں ۷ مئی کو عصر سے مغرب تک علمائے اسلام کی تبلیغی تقریریں ۶۹۹
میلہ خداشناسی میں ۸ مئی کو صبح کے وقت ۹ بجے سے پہلے قاسم العلومؒ اور علمائے اسلام کے مواعظ ۶۹۹
مولانا محمد قاسم صاحب کی دوسری تقریر ۸ مئی ۱۸۷۶ء کو نو بجے صبح ۷۰۰

مضمون		صفحہ

قاسم العلوم کی دوسری تقریر کا اثر ۷۰۰
۳۔ قاسم العلوم کی میلہ خداشناسی میں تیسری تقریر در تثلیث پر فاضلانہ بیان ۷۰۱
۴۔ قاسم العلوم کی میلہ خداشناسی میں تیس منٹ کی چوتھی تقریر مسئلہ تقدیر پر اعتراضات کا محققانہ جواب ۷۰۱
میلہ خداشناسی کا اختتام مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور اسلام کی سربلندی اور پادریوں کی شکست۔ ۷۰۲
پادریوں کا اعتراف شکست ۷۰۳
پادری نولس کو قبول اسلام کی دعوت اور قاسم العلوم کا ادائی حق تبلیغ ۷۰۳
ہندوؤں کی زبانی قاسم العلوم کی فتح ونصرت کی کہانی ۷۰۴
نولس پادری کی شکست ماسٹر جوئل عیسائی کی زبانی ۷۰۵
پادری اینک کا اقرار شکست اور قاسم العلوم سے تاثر ۷۰۶
قاسم العلوم اوتار ہوں کھتریوں نے کہا ۷۰۶
مباحثہ شاہجہانپور عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ میں ۷۰۸
مباحثہ شاہجہانپور سال دوم ۷۰۹
۱۷ مارچ ۱۸۷۷ء کو شاہجہانپور میں ورود قاسمی ۷۰۹
مولانا عبدالغفور صاحب کے مکان پر قیام ۷۰۹
قاسم العلوم پاپیادہ میدانِ مباحثہ کی طرف ۷۱۰
غیر مسلموں کی کمزوری ۷۱۰
قاسم العلوم کی فتح، پادریوں کی ہٹ دھرمی پر پیارے لال کا اعتراف ۷۱۰
مسلمانوں کی دوسری فتح اور قاسم العلوم کی جرأت ایمانی ۷۱۱
۱۔ ۱۹ مارچ بعد عصر میلہ خداشناسی میں قاسم العلوم کا پہلا غلغلہ انگیز وعظ ۷۱۲
۱۹ مارچ بعد عصر کے وعظ کے عنوانات ۷۱۲

مضمون صفحہ

۲۔ قاسم العلوم کی دوسری تقریر پادری محی الدین پشاوری کے اعتراضات کے جواب میں ۷۱۲
قاسم العلوم کی فتح اور ہندو مصنف کا ذاتی فیصلہ ۷۱۵
مسلمان کامیاب اور پادری لاجواب اور ذلیل ہوئے ۷۱۵
۱۹ مارچ ۱۸۷۷ء بعد مغرب قاسم العلوم کی مصروفیت اور جائے قیام پر مذاکرہ ۷۱۵
پادری نولس کی گھبراہٹ منشی صاحب کا اعتراف ۷۱۶
قاسم العلوم کی اخلاقی فتح اور پادریوں کی شکست ۷۱۷
موتی میاں کی مہمان نوازی ۷۱۷
۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء مباحثے کا دوسرا دن ۷۱۸
پادریوں کی ایک اور قلابازی ۷۲۰
پادری اسکاٹ کی تقریر ۷۲۰
مولانا محمد قاسم کی مجلس مباحثہ میں چوتھی تقریر ۷۲۰
پادری اسکاٹ کی بھد ۷۲۱
تقریر قاسمی پر مکتا پرشاد کے ریمارکس ۷۲۱
مولانا محمد قاسم صاحب کی پانچویں جوابی تقریر ۷۲۱
مولانا محمد قاسم صاحب کی چھٹی تقریر ۷۲۲
پادری اسکاٹ کی زبان پر قاسم العلوم کی فضیلت کا اقرار ۷۲۳
غلبہ اہل اسلام ۷۲۳
دوسرے دن ۲۰ مارچ کو تیسرا جلسہ ۷۲۴
مولانا محمد قاسم صاحب کا سفر ناظرہ بزر قرض ۷۲۴
تقریر پادری اسکاٹ ۷۲۴
تقریر پنڈت دیانند ۷۲۵

مضمون — صفحہ

مولانا محمد قاسم صاحب کی میلے میں پانچویں تقریر کہ نجات اسلام میں ہے ۔ ۷۲۵

مسلمانوں کی فتح پادریوں کا فرار اور ان کی شکست ۷۲۷

مولانا محمد قاسم صاحب کی چار بجے کے بعد میلے میں ساتویں تقریر ۷۲۷

پادری صاحبان کتابیں چھوڑ کر بھاگ گئے ۷۲۸

مولانا محمد قاسم صاحب کا قیام موتی میاں کے یہاں ۷۲۸

قاسم العلوم پادری اسکاٹ کی نظر میں ۷۲۸

مولانا محمد قاسم صاحب کی تجویز پر منشی اندرمن کو گفتگو کے لئے دعوت نامہ ۷۲۹

بہشت کے متعلق موتی میاں کے مکان پر مولانا محمد قاسم صاحب کا آٹھواں بصیرت افروز بیان ۷۲۹

مولانا محمد قاسم کے سر پر سرسوتی بول رہی تھی، لالہ لیکھراج کا بیان ۷۲۹

پٹھان جیتے ہندوؤں کا قول ۷۳۰

۲۱ مارچ کو واپسی ۷۳۰

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور دیانند سرتی ۷۳۲

حج سے واپسی پر پانچ ماہ بعد شعبان ۱۲۹۵ھ میں وفات سے ایک سال ۱۱ ماہ پہلے مناظرہ رڑکی ۷۳۲

تفصیلات مناظرہ رڑکی ۷۳۳

تجویز قاسمی ۷۳۴

مولانا محمد قاسم صاحب کی بیماری کا نقشہ خود ان کے قلم کی زبانی ۷۳۴

اہل رڑکی کا جواب ۷۳۵

شاگردان قاسمی کی روڑکی کو روانگی ۷۳۵

مولانا محمد قاسم صاحب سے مناظرہ کی خواہش ۷۳۵

یکتائے روزگار مولانا محمد قاسم دیانند سرتی کا اقرار ۷۳۶

رڑکی والوں کا خط قاسم العلوم کے نام ۷۳۶

مضمون صفحہ

مکتوب قاسمی رڑکی کے مسلمانوں کے نام ۷۳۶
رڑکے مسلمانوں کا جواب خط ۷۳۶
اوائل شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق اگست ۱۸۷۸ء میں حضرت قاسم العلوم کی رڑکی کو روانگی ۷۳۷
پنڈت جی کا مناظرے سے گریز ۷۳۷
کرنل کا اشتیاق ملاقات ۷۳۷
مولانا محمد قاسم صاحب کا استقبال ۷۳۸
مولانا اور کرنل کی گفتگو ۷۳۸
انگریز کرنل اور کپتان کو تبلیغ اسلام ۷۳۸
کرنل اور پنڈت جی ۷۳۹
مولانا محمد قاسم صاحب کا چیلنج ۷۳۹
چھاؤنی میں مناظرے کی ممانعت ۷۴۰
پنڈت جی کی بزدلی اور گفتگو سے گریز ۷۴۰
پکارے گلے کہہ دو کہ سامنے آئیں مولانا محمد قاسم صاحب کا اعلان ۷۴۰
مولانا فخر الحسن کی بازار میں تقریریں ۷۴۰
پنڈت جی کو وعظ میں شرکت کی دعوت ۷۴۱
پنڈت دیانند کا رڑکی سے فرار ۷۴۱
مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا بر سر بازار رڑکی میں ۲۰، ۲۱، ۲۲ شعبان ۱۲۹۵ھ کو تین روز مسلسل وعظ ۷۴۱
عیسائیوں، ہندوؤں اور انگریز افسروں میں اسلام کی منادی ۷۴۱
مسلمانوں نیم بسملی ۷۴۱
اسلام لائے بغیر نجات ممکن نہیں مولانا کا اتمام حجت ۷۴۲
۲۳ شعبان ۱۲۹۵ھ کو مولانا کی رڑکی سے دیوبند کو روانگی ۷۴۲

مضمون ... صفحہ

۲۸ شعبان ۱۲۹۵ھ کو مولانا نانوتہ اپنے وطن میں ... ۷۴۲
رڑکی سے واپسی پر منگلور میں دو روز قیام ... ۷۴۴
مولانا محمد قاسم صاحب کی دیانند کے تعاقب میں میرٹھ کو روانگی ... ۷۴۴
دیانند کا میرٹھ سے فرار ... ۷۴۵
قاسمی مشن کی تکمیل اور جام عمر لبریز ... ۷۴۷

دسواں باب

محبوب حقیقی سے ملاقات کی بنیاد تیسرے حج کے بقیہ حالات

آخری حج ۱۲۹۷ھ کے بعض حالات ... ۷۴۸
حج بدل والد محترم شیخ اسد علی کی طرف سے ... ۷۴۹
تاریخ روانگی ... ۷۴۹
فتوحات قاسمی ... ۷۴۹
اٹاوہ میں کچھ قیام ... ۷۵۰
کرامت قاسمی ... ۷۵۰
کرامت قاسمی کا ایک صاف مظاہرہ ... ۷۵۱
میں تو قاسم ہوں اور اللہ دیتا ہے ... ۷۵۱
عدن اور جدہ میں جہاز کا پہنچنا ... ۷۵۲
حاجی امداد اللہ صاحب کا استقبال کو آنا ... ۷۵۲
قاسمیؒ ردیف مولانا محمد منیر ... ۷۵۳
غسل قاسمی دخول مکہ سے پہلے ... ۷۵۴
حضرت قاسم العلوم کی جائے قیام مکہ معظمہ میں ... ۷۵۴

مضمون　　　　　　　　　　صفحہ

لطیفہ ۷۵۴
مسئلہ وحدۃ الوجود اور حاجی صاحب ۷۵۵
مکہ معظمہ کے اشغال ۷۵۵
مدینہ منورہ کو روانگی ۷۵۵
سبز گنبد اور شوق دید مدینہ ۷۵۶
مدینہ منورہ میں ورود ۷۵۷
اپنے شیخ الحدیث شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی مہاجر مدینہ کی خدمت میں ۷۵۷
مدینہ منورہ میں بیس روز قیام اور مقامات مقدسہ سے شرف اندوزی ۷۵۸
قاسم العلوم اور عشق رسول ﷺ ۷۵۹
مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کو واپسی ۷۶۱
حاجی صاحبؒ نے قاسم العلوم کے متعلق کیا فرمایا ۷۶۱
قاسم العلوم کا مرض موت ۷۶۳
سفر حج سے واپسی ربیع الاول ۱۲۹۵ھ مارچ ۱۸۷۸ء ۷۶۴
حج سے واپسی پر تقریباً پندرہ روز بعد ملا جلال اور دیگر کتابوں کا درس ۷۶۵
ضیق النفس اور کھانسی میں برابر دینی خدمات ۷۶۵
کھانسی کے باوجود درس وتدریس ۷۶۷
حج سے واپسی کے پانچ ماہ بعد شعبان ۱۲۹۵ھ میں اور وفات سے ایک سال ۱۱ ماہ پہلے دیانند سے مناظرہ ۷۶۸
رمضان ۱۲۹۵ھ نانوتہ میں ۷۶۸
مشاغل رمضان ۷۶۸
شوال ۱۲۹۵ھ مناظرہ میرٹھ ۷۶۹

مضمون	صفحہ
محرم ۱۲۹۶ھ میں قاسم العلوم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے زیر علاج	۷۶۹
ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ میں مظفر نگر برائے علاج	۷۶۹
رمضان ۱۲۹۶ھ میں قیام نانوتہ	۷۷۰
نانوتے میں عمر کی آخری تقریر ۱۲۹۶ھ میں کے رمضان میں	۷۷۰
مضمون تقریر	۷۷۰
تمام رمضانوں کے مہینے نانوتے میں گذارنا	۷۷۰
رمضان ۱۲۹۶ھ کے بعد شوال میں علالت کا سلسلہ	۷۷۱
وفات سے نو ماہ پہلے شوال ۱۲۹۶ھ میں مطابق اپریل ۱۸۷۸ء میں دیوبند آمد اور شفا	۷۷۱
شیخ الہندؒ کے لئے دعا	۷۷۲
مولانا محمد اسماعیل کی دیوبند میں ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ میں آمد	۷۷۲
کیا آپ نے نانوتہ کی سکونت ترک کردی	۷۷۲
شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء کے بعد دیوبند میں قیام اور معالجہ	۷۷۲
علاج کی طرف خاص توجہ	۷۷۳
یونانی، ڈاکٹری اور ویدک علاج	۷۷۳
علاج حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی	۷۷۴
ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا علاج اور مظفر نگر میں قیام	۷۷۴
وفات سے کچھ عرصہ پہلے	۷۷۴
سہارنپور کا دوسرا سفر اور مولانا احمد علی صاحب کی عیادت	۷۷۵
وفات سے بیس دن پہلے ۱۵ ربیع الآخر ۱۲۹۷ھ ۲۷ مارچ ۱۸۸۰ء کو ہفتہ کے روز سہارنپور کو روانگی	۷۷۵
وفات سے نو دن پہلے سہارنپور میں درد ذات الجنب یا نمونیہ	۷۷۶
وفات سے آٹھ دن پہلے دیوبند کو واپسی	۷۷۶

مضمون	صفحہ
فصد اور جونک سے علاج	۷۷۷
طبیعت کی بحالی کے تین دن وفات سے چھ دن پہلے	۷۷۷
دہلی سے طبیب کی آمد	۷۷۸
منگل ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/ ۱۳/ اپریل ۱۸۸۰ء وفات سے دو دن پہلے	۷۷۸
منگل کی ظہر تک جواب دینا مگر جوش کا نہ ہونا	۷۷۸
منگل کی شام اور سکوت تمام	۷۷۹
حالت نزع کا گمان	۷۷۹
تشنج کا اثر	۷۸۰
مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے خطوط اور متوسلین کو اطلاع	۷۸۰
احباب و اقارب کا اجتماع	۷۸۰
وفات سے ایک دن پہلے بدھ کی رات سے جمعرات کی رات تک	۷۸۱
وفات سے ایک دن پہلے ۳ جمادی الاولیٰ کو بدھ کے روز	۷۸۱
آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے	۷۸۲
قاسم العلومؒ کو رسول خدا ﷺ سے رابطہ نہانی	۷۸۲
حضرت قاسم العلوم مقام خودی میں	۷۸۳
بدھ کا پورا دن بے ہوشی میں	۷۸۴
ذکر اللہ کے سانس	۷۸۴
آخری شب	۷۸۵
جمعرات کی صبح اور بیماری کی رپورٹ	۷۸۵
رسول اللہ ﷺ انتظار میں	۷۸۶
رسول اللہ ﷺ قاسم العلوم کو لینے کے لئے	۷۸۶

مضمون ..... صفحہ

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مکان سے اپنے مکان ۷۸۷
پاس انفاس ۷۸۷
آخری وقت ۷۸۸
ملک الموت کی آمد اور قاسم العلوم کی رقت ۷۸۸
بلغم کا خروج اور روح کی پرواز لمبے سانس کے ساتھ ۷۸۸
۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء بروز پنجشنبہ تقریباً ۳ بجے بعد ظہر وفات ۷۸۸
تجہیز و تکفین، غسل اور نماز جنازہ ۷۸۹
کمبل پوش فقراء کی جنازے میں شرکت ۷۸۹
کرامت قاسمی ۷۹۱
دار العلوم میں غسل میت اور وقف قبرستان ۷۹۲
نماز جنازہ قاسم العلوم میانِ عصر و مغرب ۷۹۳
نماز جنازہ میں ہجوم اور تدفین بعد مغرب ۷۹۳
غم وفات ۷۹۶
حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا مکتوب بنام مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دار العلوم ۷۹۶
بانی دار العلوم قاسم العلوم ۷۹۷
حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی پر کیا گذری ۷۹۷
حضرت عارف باللہ کا غم پنہاں ۷۹۸
حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کا غم بے پایاں ۷۹۸
بانی دار العلوم قاسم العلوم ۷۹۹
مولانا ذوالفقار علی صاحب پر کوہ غم گر پڑا ۷۹۹
مولانا فخر الحسن گنگوہی کی بے قراری ۸۰۰

صفحہ	مضمون
۸۰۱	سرسید مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تاثرات
۸۰۱	بے مثل قاسم العلوم
۸۰۳	قاسمی سراپا
۸۰۳	اخلاق وعادات
۸۰۸	تاریخی مادے اور مرثیے
۸۰۸	کیا چراغ گل ہوا ۱۲۹۷ھ
۸۰۸	وفات سرور عالم کلیہ نمونہ ہے ۱۲۹۷ھ
۸۰۸	رضی اللہ عنہ مما دائما ۱۲۹۷ھ
۸۰۹	مصیبت پر آئی مصیبت ۱۲۹۷ھ
۸۰۹	مادہ تاریخی منظوم از مولانا فضل الرحمٰن صاحب
۸۱۰	مرثیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ
۸۱۱	ایک عہد ساز شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ
۸۱۱	بشارت عظمیٰ
۸۱۳	مولانا نانوتوی کی متوازی حملوں کے خلاف چومکھی لڑائی
۸۱۵	حضرت نانوتوی صدیق فطرت انسان تھے
۸۱۶	حضرت نانوتوی کی ختم نبوت کی تقسیم
۸۱۷	ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت زمانی کے ساتھ جمع کرنے کا استدلال
۸۱۹	سو آپ کی ختم نبوت مرتبی کے دو دور ہوئے
۸۲۱	کیا عوام کا عقیدہ ختم نبوت غلط ہے؟
۸۲۴	حضرت نانوتوی کی دوسری تالیفات میں اس عقیدہ کی صدائے بازگشت
۸۲۵	قادیانیوں کے دجل وفریب کا ایک نیا پیرایہ

مضمون	صفحہ
عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ میں نسبت صدیقیؓ کا اثر	۸۲۷
ہندوستان میں تحفظ دین متین کے لئے مناظروں کی راہ	۸۲۸
کیا یہ کہنا درست ہے کہ علم سے کچھ نہیں بنتا	۸۳۰
۱۔ مناظر اسلام حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری	۸۳۱
۲۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اقامت سنت کے محاذ پر	۸۳۲
۳۔ مناظر اسلام حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری	۸۳۵
رامپور سے نواب صاحب دیوبند سے مناظرہ کی استدعا	۸۳۶
سہارنپور فرنگی اور ندوۃ العلماء میں پھلے اثرات	۸۳۶
امام العصر حضرت مولانا انورشاہ ختم نبوت کے محاذ پر	۸۳۶
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی دفاع صحابہ کے محاذ پر	۸۳۷
حضرت نانوتوی فقر و تصوف کے بوریہ نشین کے طور پر	۸۳۸
حضرت نانوتوی فقر و تصوف کے بوریہ نشین کے طور پر	۸۳۹
آپ کے روحانی مقام کی اور ایک شہادت	۸۴۰
وفات نبی ﷺ اور حضرت نانوتویؒ	۸۴۳
مماتیوں کا ایک دھوکہ	۸۴۴
الا من خطف الخطفۃ کی چند مثالیں	۸۴۴

تک دارالعلوم کی خدمت کا موقع عنایت فرمائے، حق تو یہ ہے کہ دادا کے لگائے ہوئے باغ کی انہوں نے جس شان سے آبیاری کی وہ انہی کا حصہ ہے، آخر میں ہم حضرت قاسم العلوم کی اولاد کا شجرہ پیش کرتے ہیں جو یہ ہے:

شجرہ اولاد مولانا محمد قاسم صاحبؒ

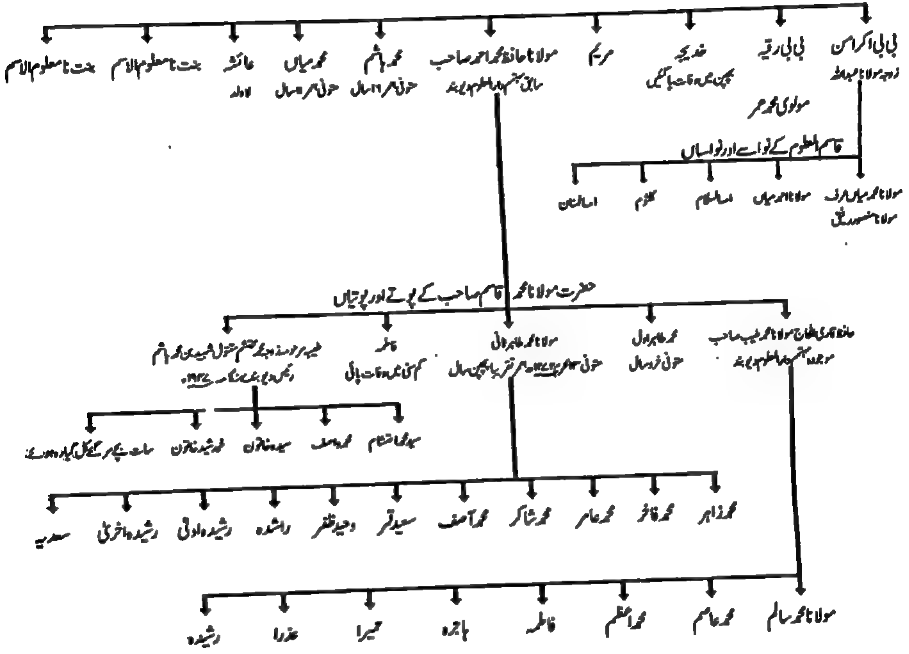
بی بی اکرامن
زوجہ مولانا عبداللہ
بی بی رقیہ
مولوی محمد عمر
خدیجہ
بچپن میں وفات پا گئیں
مریم
مولانا حافظ محمد احمد صاحب
سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند
محمد ہاشم
متوفی عمر ۱۶ سال
محمد میاں
متوفی عمر ۲۰ سال
عائشہ
لاولد
بنت نامعلوم الاسم
بنت نامعلوم الاسم
قاسم العلوم کے نواسے اور نواسیاں
مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور علی
مولانا احمد میاں
ام السلام
کلثوم
ام الحسان
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پوتے اور پوتیاں
حافظ قاری الحاج مولانا محمد طیب صاحب
موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند
محمد طاہر اول
متوفی خورد سال
مولانا محمد طاہر ثانی
متوفی ۱۳۷۲ھ عمر تقریباً پچپن سال
فاطمہ
کم سنی میں وفات پائی
طیبہ مرحومہ زوجہ محترم مقتول شہید سید محمد ہاشم
رئیس دیوبند سانحہ ۱۹۴۷ء
سید محمد احتشام
محمد یوسف
سیدہ خاتون
خورشید خاتون
سات بچے مر گئے کل گیارہ ہوئے
محمد زاہد
محمد فاخر
محمد عامر
محمد شاکر
محمد آصف
سعید قمر
وحید ظفر
راشدہ
رشیدہ اولیٰ
رشیدہ اخریٰ
سعدیہ
مولانا محمد سالم
محمد عاصم
محمد اعظم
فاطمہ
ہاجرہ
حمیرا
عذرا
رشیدہ

ہم نے اس شجرے میں حضرت قاسم العلومؒ کے پوتوں اور ان کی اولاد کا بھی ذکر کر دیا ہے، معاملہ ایک نسل اور آگے تک بڑھ گیا ہے جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں، مزید نسل کا حال سوانح قاسمی از گیلانی کی جلد اول صفحہ ۵۰۴ تا ۵۰۶ پر ملاحظہ فرمائیے جن کے حواشی میں

انوارِ قاسمی

عرضِ مصنف

ناصیۂ کتاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

انوارِ قاسمی کی پہلی جلد جو آج آپ کے سامنے ہے یہ محض فضلِ خداوندی ہے کہ اس نے یہ کام مجھ بے بضاعت سے لے لیا ورنہ اس جلیل القدر ہستی پر قلم اٹھانے کا نہ حوصلہ تھا، نہ علمی طاقت اور نہ زبانی طاقت لیکن درحقیقت یہ سب کچھ باغِ قاسمی کی خوشہ چینی کا ثمرہ ہے کہ میرے قلم سے یہ ضخیم کتاب منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہو رہی ہے۔

۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ تذکرہ اولیاء دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے میں نے رسالہ ''دارالعلوم'' میں مضامین لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس کی سترہ اٹھارہ قسطیں شائع ہوئیں مقصد یہ تھا کہ علمائے دیوبند نے جو خدمات اردو ادب کی انجام دی ہیں ان پر ایک کتاب مرتب ہو جائے۔ چنانچہ اسی کی پہلی جلد جو حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسمؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب، مولانا ذوالفقار علیؒ اور مولانا فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہم اجمعین پر مشتمل تھی مرتب بھی کر لی تھی اور بقدر حصۂ حاجی صاحب قدس سرہ کی کتابت

بھی ہو گئی تھی۔ پھر کچھ ایسے ناگزیر حالات پیش آ گئے کہ اس کو "حیاتِ امداد" کی شکل دینا پڑی۔ بحمدہ یہ حصہ بصورت سوانح شائع ہو گیا۔ اسی طرح حضرت قاسم العلوم کے بارے میں محض ادبی حالات پر روشنی ڈال کر خاموش ہو جانے کو دل نہ مانا، پس بتوفیق الٰہی کمر ہمت باندھی اور تاریخ کی روشنی میں پوری تحقیق کے ساتھ ایک مکمل اور جامع سوانح مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا۔ خاندانی حالات اور عملی خدمات کی تفصیلات سے فارغ ہو کر قاسم العلوم کی علمی تحقیقات و تصنیفات پر بھی سیر حاصل بحث اپنی مقدور کے مطابق کرنے کا عزم کر لیا۔ خیال تھا کہ پوری سوانح علمی و عملی یکجا ہو مگر طباعت کے دوران میں ادارہ سعدیہ مجددیہ جس کے اہتمام سے کتاب چھپ رہی تھی اس کے سرپرست حضرت مولانا ابوالخلیل خان محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ سراجیہ مجددیہ (کندیاں ضلع میانوالی) اور ناظم ادارہ سعدیہ مجددیہ مولانا محبوب الٰہی صاحب منگلوری نے بعض وجوہ سے دو جلدوں میں شائع کرنے کی تحریک کی اس لئے مضمون کو ایک خاص حد پر پہنچا کر پہلی جلد مکمل کر دی گئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ حضرت قاسم العلومؒ کے علمی اور تحقیقی کارناموں سے متعلق دوسری جلد بھی جلد ہی ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی کی جائے گی۔ وھو الموفق۔

کتبِ حوالہ:

انوار قاسمی کی ترتیب میں جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ سوانح قاسمی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب۔ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ بمطبع صادق الانوار بہاولپور

۲۔ مذہب منصور حصہ دوم مرتبہ مولانا منصور علی خان صاحب مراد آبادی شاگرد قاسم العلومؒ۔

۳۔ سوانح عمری مولانا محمد قاسمؒ از مولانا محمد یعقوبؒ۔

۴۔ مناظرہ دوم شاہجہانپور و مناظرہ رڑکی مرتبہ مولانا فخر الدین صاحب گنگوہی تلمیذ قاسمی۔

۵۔ تذکرۃ الرشید مؤلفہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ میرٹھی۔

۶۔ سوانح مخطوطہ منسوب بہ منشی فضل حق صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند۔

۷۔ بیاضِ یعقوبی ومکتوباتِ یعقوبی مرتبہ منشی امیر احمد صاحبؒ۔

۸۔ سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم ومغفور۔

۹۔ الخلیل سوانح حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری قدس سرہ مرتبہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی۔

۱۰۔ حیات شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ مرتبہ مولانا میاں اصغر حسین صاحبؒ۔

۱۱۔ مقدمہ اوجز المسالک علی مؤطا امام مالک مرتبہ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ۔

۱۲۔ حیات جاوید از مولانا الطاف حسین حالی۔

۱۳۔ رپورٹ موتمر الانصار مرتبہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ۔

۱۴۔ ارواحِ ثلاثہ مجموعہ روایات۔

۱۵۔ سیر دہلی واطراف وجوانب از مولانا عبد الحئی صاحب مصنف گل رعنا۔

۱۶۔ مقدمہ بخاری از حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ۔

۱۷۔ رودادہائے دار العلوم دیوبند۔

۱۸۔ ''القاسم'' کا دار العلوم نمبر مرتبہ مولانا محمد طاہر صاحب نبیرہ حضرت قاسم العلوم قدس سرہ۔

۱۹۔ تاریخ ہندوستان از پروفیسر عبد القادر اسلامیہ کالج لاہور۔

۲۰۔ اتحاف النبلا مصنفہ نواب صدیق حسن صاحبؒ۔

۲۱۔ تذکرہ علمائے ہند۔

۲۲۔ نزہۃ الخواطر۔

۲۳۔ قصص الاکابر۔

۲۴۔ آبِ حیات مصنفہ قاسم العلوم قدس سرہ۔

۲۵۔ ہدیۃ الشیعہ۔

۲۶۔ مکتوباتِ قاسم العلومؒ۔

۲۷۔ سرکشی بجنور از سر سید۔

۲۸۔ محسن مہجوران از حکیم ضیاء الدین رام پوری۔

۲۹۔ جمیل الکلام و ملفوظاتِ اشرفیہ۔

۳۰۔ اخبارِ کوہستان لاہور کے مختلف نمبر۔ وغیرہ

استدراکات:

کتاب کا بیشتر حصہ طبع ہو جانے کے بعد بعض فروگذاشتیں علم میں آئیں جن کا ظاہر کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ احسن القواعد کے مصنف مولانا محمد احسن صاحب نہیں۔ ان کے شاگرد مولانا نجف علی خان ہیں۔ استاد کے نام پر کتاب کا نام رکھا ہے۔

۲۔ سیر سید حضرت مولانا مملوک علی صاحب حلقہ تلامذہ میں شامل نہیں۔

۳۔ عربی کالج دہلی اور دہلی کالج الگ ادارے ہیں۔ ہماری مراد ان ناموں سے عربک کالج دہلی ہے جہاں مولانا مملوک علی صاحب درس دیتے تھے۔

۴۔ دار العلوم دیوبند کا سالانہ بجٹ اب تین لاکھ نہیں بلکہ نو، دس لاکھ تک پہنچ گیا ہے۔

۵۔ شاگردانِ قاسمی میں حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ کے حالات دو جگہ منتشر ملیں گے کیونکہ کچھ حالات کا علم بعد میں ہوا۔

۶۔ مولانا مملوک علی صاحب کا تقرر عربی کالج دہلی بحیثیت نائب مدرس ۱۸۲۵ء میں پچاس روپیہ ماہوار پر ہوا تھا اسی سال مدرسہ غازی الدین کو عربی کالج دہلی کا نام دیا گیا تھا بعد میں مولانا موصوف کی تنخواہ سو روپیہ بلکہ اس سے بھی متجاوز ہو گئی تھی۔

۷۔ سوانح مخطوطہ کو اگر کتاب میں کسی منشی فضل حق کے سوا کسی اور صاحب سے منسوب دیکھیں تو ناظرین تصحیح فرما لیں۔

۸۔ محمد یٰسین نام کے دو بزرگ تھے۔ ایک نانوتہ میں دوسرے دیوبند جن کی عرفیت اللہ دیا تھی۔

نوٹ: جہاد شاملی سے متعلق کچھ مصور قلمی خاکے میں نے شامل کردیئے تھے جو اگرچہ تاریخی حیثیت رکھتے تھے مگر ادارہ سعدیہ مجددیہ کے متبع شریعت ارکان کے توجہ دلانے پر کتاب سے حذف کردینے پر مجھے آمادہ ہو جانا پڑا۔ یہ حضرات جانداروں کی تصویریں کتابوں میں داخل کرنا بھی جائز نہیں سمجھتے۔

مطبوعہ فرمے دیکھ کر حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کا تاثر:

جب کتاب کے اکثر فرمے چھپ گئے تو میں نے درخواستِ مقدمہ نگاری کے ساتھ حضرت استاد محترم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کی خدمت میں بھیجی تو حضرت حکیم الاسلامؒ نے کتاب کی تعریف میں درج ذیل الفاظ میں فرمایا:

> ”کتاب ملتے ہی پہلے میں نے سطر بے تابی سے شروع کیا، ہر ہر سطر سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور بڑھتا گیا، مضامین ماشاء اللہ محققانہ اور مستند طرز ادا اتنی بلیغ کہ اپنی کیفیت عرض کرتا ہوں کہ کتاب شروع کر کے ختم کئے بغیر طبیعت نہیں مانی۔ عبارت نہایت شگفتہ، واضح اور عام فہم ہے۔ ترتیب نہایت موزوں، شروع میں سرسید مرحوم کا مقالہ علاوہ ایک تاریخی دستاویز ہونے کے وقت کے تقاضے کے بھی عین مطابق ہوا اور یہاں کی فضا کے لئے تو بہت ہی مناسب اور موزوں بات ہوئی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ حق تعالیٰ آپ کے اس زریں خدمت کو قبول فرمائے اور مخلوق کو اس سے متنفع ہونے کی توفیق بخشے۔“

(محمد طیب غفی عنہ از بمبئی جون ۱۹۶۷ء یوم چہار شنبہ)

اسی مکتوب گرامی میں آپ نے کتاب کے نام ”یادگارِ قاسم“ سے اختلاف فرمایا اور لکھا کہ:

> ”ذرا سا خلجان نام کے بارے میں ہے۔ یادگارِ قاسم کے بجائے اگر ٹائٹل پر نام کچھ اور یعنی ”سوانح قاسمی“ یا ”حیات قاسمی“ یا اور کوئی موزوں نام، اندر اگر ”یادگار قاسم“ کا لفظ طبع ہو چکا ہے تو ٹائٹل پر کوئی اور نام اس کے منافی نہ ہوگا۔“

انوارِ قاسمی:

آپ کی اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے میں نے "یادگارِ قاسم" کے بجائے اس کا نام "انوار قاسمی" رکھ دیا جو حضرت والا نے پسند فرمایا اور اپنے دوسرے مکتوب میں تحریر فرمایا:

> "انوارِ قاسمی نام بہت پسند آیا۔ آخر انوار ہی کا تو رکھا ہوا ہے۔"

لہٰذا جس جگہ کتاب کا نام "یادگارِ قاسم" مذکور ہو اس کو ناظرین انوارِ قاسمی تصور کریں۔

تحریک انقلاب دینی اور تاسیس دارالعلوم:

تاسیس دارالعلوم دیوبند کی اصلی غرض و غایت اسلام کے تحفظ کے ساتھ ساتھ انگریزی اقتدار سے اہل ہند کیلئے راہ نجات کی تلاش بھی تھی جسے ہم تحریک دیوبند کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان دونوں مقصدوں میں باہمی ارتباط کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے جس انداز میں کلام کیا ہے امید ہے کہ ناظرین بنظرِ تامل ملاحظہ فرمائیں گے۔ دارالعلوم کی بتدریج ترقی کے ساتھ ساتھ علمائے دیوبند کی علمی، مذہبی، ادبی اور سیاسی خدمات بھی درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی نظر آئیں گی اور عقائد مذہبی اور عزائم سیاسی بھی روشن سے روشن تر ہو کر سامنے آتے جائیں گے۔ اس مقام کا اس نظر سے مطالعہ کرنے سے صاف نظر آئے گا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ایک عظیم الشان مصلح و مجدد کا مقام رکھتے ہیں۔ اگر قدرت اس نازک وقت میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو نہ پیدا فرماتی اور اپنے دین کو بچانے کیلئے ان کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد نہ ڈلواتی تو شاید ہی آج ہندو پاک میں اسلام کے حق میں آواز اٹھانے والا کوئی فرد نظر آتا۔

اظہارِ تشکر:

۱۔ راقم الحروف حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا بغایت ممنون ہے کہ آپ نے انوار قاسمی کی تالیف کے سلسلہ میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود میری گراں قدر مدد فرمائی۔ جن امور میں مجھے تشنگی محسوس ہوتی رہی ان میں آپ میری تسکین کا

سامان بہم پہنچاتے رہے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانہ سے حضرت قاسم العلومؒ کی بعض نادر و نایاب تصانیف ارسال فرمادیں جن کے بغیر میرے لئے بعض مقامات پر ایک قدم چلنا بھی دشوار تھا نیز میری درخواست پر کتاب کیلئے ایک پر حقائق مقدمہ بھی بطیب خاطر تحریر فرما کر ارسال کردیا۔ فجزاہ خیر الجزاء۔

۲۔ نیز راقم الحروف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا بھی بے حد شکر گذار ہے کہ آپ نے بھی بزرگانہ شفقت کو کام میں لاتے ہوئے مجھے بعض بڑی قیمتی معلومات فراہم کیں مثلاً آپ ہی کی رہنمائی سے مجھے معلوم ہوسکا کہ حضرت قاسم العلومؒ کو مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں روحانیت و شفقت کے پیکروں کی عمر دراز فرمائے۔ آمین

آخری التماس:

آخر میں قارئین اور بعض ناقدین اہل ہند سے اپنی بے بضاعتی اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے خاص ظروف و احوال کے پیش نظر میرے بعض افکار سے اختلاف رائے فرماتے ہوئے اگر ایسی تاریخی حقیقت سے جو تقاضائے ایمان بھی ہے اغماض نہ فرمائیں اور اپنے اکابر متقدمین کا جو نظریہ حکومت و سیاست حکومت مغلیہ کے زوال کے بعد سے ہمیشہ رہا ہے اور جس کیلئے وہ عہد بعہد مساعی بھی فرماتے رہے ہیں اسے کسی وقت کے تقاضے یا مصلحت اندیشی کی بھینٹ نہ چڑھائیں۔ مانتا ہوں کہ عدم استطاعت کی صورت میں زہر و سکوت اور خطرات میں تاویلات مباح ہیں مگر حقیقت کو حقیقت ہی تسلیم نہ کرنا ہرگز جائز نہیں۔

خاتمۂ حسنہ:

اپنی گذارشات کو ختم کرتے ہوئے ایک بار پھر اس خدائے قدوس کا ہزاران ہزار شکر ادا کرتا ہوں جس نے اپنی طرف سے توفیق کو میرا طریق بنایا اور اس عظیم الشان اور جلیل القدر ہستی کے سوانح لکھنے کی میرے قلم ناتواں کو طاقت عطا فرمائی جو نہ صرف بانی دار العلوم ہے بلکہ

قاسم العلوم بھی ہے اور امید کرتا ہوں کہ اس ناچیز خدمت گار کی اس سعی و محنت کو بارہ گاہ خداوندی میں منظور فرمایا جائے گا۔

فالحمد للہ علی جمیع نعمائه خصوصاً علی ھذا الانعام والصلوۃ و السلام علی جمیع رسله خصوصاً علی خاتما نبیائه الکرام

محمد انور الحسن قاسمی شیر کوٹی

۲۲ ربیع الاول ۱۳۸۸ھ

۱۹ جون ۱۹۶۸ء

مقدمہ انوارِ قاسمی

از

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز بانی دارالعلوم دیوبند کی سوانح نگاری کے جذبات حضرت کے وصال کے بعد متصلاً ہی متوسلین کے قلوب میں موجزن ہونے لگے تھے، لیکن حوادث زمانہ نے ان کی عملی شکل نہ بننے دی، سب سے پہلے یہ جذبہ حضرت مرشدی ومولائی شیخ مولانا محمود حسنؒ جانشین خاص حضرت قاسم العلوم کے قلب مبارک میں پیدا ہوا۔ مواد بھی فراہم ہوگیا خود ان کے ذاتی مشاہدات اور خود پر گذرے ہوئے حالات الگ تھے لیکن بعض خاص حوادث کے سبب یہ جذبہ شرمندہ عمل نہ ہوسکا۔ مواد بھی ضائع ہوگیا اور ذہنی سرمایہ بھی حضرت کے ساتھ ہی دوسرے عالم میں پہنچ گیا۔ پھر حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ تلمیذ خاص حضرت نانوتوی نے سوانح نگاری کا تہیہ فرمایا جس نے عملی صورت بھی اختیار کر لی اور احوال وملفوظات کے تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات بھی مرتب ہوگئے جیسا کہ ان کی تحریرات سے پتہ چلتا ہے لیکن دست برد زمانہ سے یہ ذخیرہ بھی نذرِ حوادث ہوگیا اور بعد کے لوگوں کیلئے حسرت و قلق کا سرمایہ چھوڑ گیا۔ اس کے بعد حاجی فضل حق صاحب مہتمم ثالث دارالعلوم دیوبند متوسل خاص حضرت قاسم الخیرات نے ایک تفصیلی سوانح مرتب فرمائی لیکن حوادثِ وقت نے اسے بھی

ضائع کردیا۔ اس کے کچھ اوراقِ پریشان بعض عزیزوں کے یہاں سے دستیاب ہوئے جن سے اس سوانح کا پتہ چلا مگر افسوس کہ وہ منصۂ شہود پر نہ آسکی۔ اس کے کچھ غیر مرتب اور بوسیدہ اوراق کے اقتباسات جن میں اساسی حصہ ندارد تھا سوانح قاسمی کا جزو بنادیئے گئے جن سے استفادہ میں قدرے مدد مل گئی۔ بالآخر سوانح نویسی کی یہ سعادت حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے اس بچے کھچے منتشر مواد کو جمع کر کے سوانح قاسمی تین جلدوں میں مرتب فرمائی۔ جس سے سوانح قاسمی کا کتابی صورت میں وجود ہوگیا۔

حضرت مولانا گیلانی کی یہ یادگار تصنیف ان کے رواں دواں قلم کا ایک شاہکار ہے جسے متعلقین نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے زخموں کیلئے یہ یادگار مرہم بن گئی لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سوانح جہاں جامع ہے وہیں طوالت و تکرار سے بھی خالی نہیں حتیٰ کہ بعض جگہ طول مخل پیدا ہوگیا ہے جس کی بڑی وجہ جسے مولانا مرحوم خود بھی فرمایا کرتے تھے یہ ہے کہ:

> ”سوانح قاسمی کے سلسلہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی مطبوعہ یادداشت بنام سوانح قاسمی ایک جامع متن کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں سب کچھ آگیا ہے میں نے اس کو پھیلا کر بیان کردیا ہے، شرح کے معنی ہی پھیلاؤ اور طول کے ہیں ورنہ وہ شرح نہ رہے۔“

اس لئے قدرتاً کتاب میں طول اور پھیلاؤ کا رنگ غالب آگیا ہے اور ایک ایک جملہ کی کئی کئی جگہ تشریحات مکرر آتی چلی گئی ہیں، لیکن اس طوالت کا سبب مولانا کی ذات گرامی نہیں ہے بلکہ کام کی نوعیت ہے وہ مجبور تھے کیوں کہ یہ تالیف ایک شرح کی حیثیت سے لکھی گئی ہے جس کیلئے تطویل اور تکرار لازم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مولانا صرف ایک مورخ اور عالم ہی نہ تھے بلکہ ایک صاحب دل اور صاحب حال بزرگ بھی تھے جنہیں اپنے اکابر کے ساتھ عاشقانہ ارتباط تھا اس لئے تذکرہ اکابر میں ان کے قلم مورخانہ سے زیادہ والہانہ انداز کا ہوجاتا تھا اور جگہ جگہ روشنائی میں ڈوبنے کے ساتھ ان اکابر کی روشنی میں بھی ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا جس سے تاریخ میں تاریخ سے زیادہ غم و وارفتگی کے اثرات نمایاں ہونے لگتے تھے اس لئے اس سوانح میں بھی رنگ محویت شامل ہوتا چلا گیا جو اس طول و تکرار میں اور بھی زیادہ مدد و معاون ہوگیا۔ چنانچہ اس سوانح کے

کتنے ہی مقامات پر یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہے بلکہ عشق کی وارفتگیوں میں گم ہوکر احوال ومواجید کی داستان سنا رہے ہیں یا بالفاظ دیگر سوانح میں گم نہیں بلکہ صاحبِ سوانح میں گم ہیں اور ایک ایک چیز کے ایک ایک لغو کو بار بار مزے لے لے کر بہ رنگ ذکرِ محبوب دوہرا تہرا رہے ہیں۔

ھو المسک ما کررتہ یتضوع

اس لئے اس اندازِ بیان میں جہاں ان کے قلم کی ادیبانہ بے ساختگی نمایاں ہے وہیں یہ بھی صاف نمایاں ہے کہ وہ اس بے خودی میں اپنے ناظرین اوراق سے زیادہ خود بھی لطف اندوز ہو رہے ہیں جس کا احساس انہیں اس محویت کے بعد صحو ہونے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ متعدد مقامات پر کسی ایک ہی واقعہ کو باندازِ مختلف تکرار کے ساتھ لکھتے لکھتے کئی کئی صفحے کے بعد یہ عبارت بھی جگہ جگہ ملتی ہے کہ:

> ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا اور کیا کہنے لگا؟ اور کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اب پھر اصل واقعہ کی طرف لوٹتا ہوں۔“

اس سے قدرتی طور پر ایک ایک واقعہ کے کئی کئی ٹکڑے ہوتے ہیں پھر ان ٹکڑوں کو ملانے اور باہم مربوط کرنے کیلئے تکرار کلام بھی ناگزیر تھا جسے وہ اپنے والہانہ اور فنائیانہ انداز سے نباہتے گئے۔ اس لئے تاریخ نویسی اکابر کے ساتھ یہ رنگ فنا و ربودگی ان کی تاریخ نویسی کا ایک ایسا جوہر ہے جو ان کی تاریخی تعبیرات میں خوشبو بگلاب کی طرح رچا ہوا ہے جسے نہ ان کی تاریخ سے جدا کیا جاسکتا تھا نہ تاریخ کو اس سے مگر یہ ظاہر ہے کہ یہ رنگ فنا اور وہ بھی تذکرہ محبوبین میں کتنا ہی ارفع و اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ اہل دل عشاق کے حق میں تو غذائے روح اور تسکین قلب کا سامان ہے لیکن ایک خالص تاریخ کے متلاشی اور صرف واقعات کے جویا کیلئے کشش کے بجائے کشمکش کا ذریعہ بھی ثابت ہوسکتا ہے اور ایسا ہوا بھی۔

بنابریں اس عارفانہ سوانح کے ساتھ ایک مورخانہ سوانح کی پھر بھی ضرورت باقی رہی جس میں تاریخی واقعات کا تسلسل واقعہ نویسی ہی کی حد تک قائم رہے اور تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے حقیقی دلچسپی کا ذریعہ ثابت ہو۔ زیادہ سے زیادہ اس سے ایک شخصیت کی سوانح عمریاں ایک سے زیادہ ہوجاتی ہیں لیکن سوانح نگاری کے دائرہ میں یہ تصور عیب ہے نہ غیر

دستوری۔ بسا اوقات دنیا میں ایک ایک مرکزی شخصیت کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اور کسی جامع شخصیت کی جامع حیات زندگی کے خاص خاص پہلوؤں کو مرکز بنا کر مختلف انداز کی مختلف سوانح عمریاں لکھنے کا دستور ہمیشہ رہا ہے جو نہ صرف مستحسن بلکہ بسا اوقات ضروری سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف صاحب سوانح کی جامعیت کھلتی ہے وہیں دوسری طرف سوانح نگاروں کے فہم و فراست اور ذوق و وجدان کے مختلف رنگ بھی عالم آشکارا ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ سوانح خواتوں کے مختلف مذاقوں کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچتا ہے۔ اس لئے اگر قاسمی سوانح عمریاں بھی کئی ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ یہ کوئی برائی نہیں ہے بلکہ ایک جامع ترین شخصیت کے بوقلموں حالاتِ زندگی کے شایانِ شان بھی ہے۔ چنانچہ حضرت والا کی زندگی پر کئی سوانح عمریاں لکھی گئیں اور مزید لکھنے کے منصوبے بھی بنتے رہے۔ گو وہ پردہ ظہور پر قضاء و قدر سے نمایاں نہ ہو سکیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ خالص تاریخی نقطۂ نظر سے حضرت والا کی ایک مربوط سوانح عمری مرتب ہو۔ حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

ہمارے محترم دوست اور بھائی پروفیسر محمد انوار الحسن صاحب شیر کوٹی کو جنہوں نے یہ خواب شرمندۂ تعبیر کر دکھایا۔ ان کے ذہن میں منجانب اللہ یہ جذبہ ابھرا اور انہوں نے سوانح قاسمی کو خالص تاریخی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کا مبارک عزم باندھا۔ موصوف کو اپنے علمی مشاغل کے ساتھ فنِ تاریخ سے ایک قدرتی لگاؤ اور طبعی شغف ہے لیکن وہ تاریخی چیزوں کو عام زبان زد افسانوں یا افواہی روایتوں سے بالاتر ہو کر خالص تاریخی نقطۂ نظر سے لکھنے کے عادی ہیں، تاریخ میں ان کے یہاں حوالہ جات، استناد اور وجوہ ثبوت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس انداز پر وہ اکابر و اسلاف دیوبند کی کئی سوانح عمریاں مرتب فرما چکے ہیں اور کئی سوانح عمریاں ان کے زیر قلم ہیں۔

سید الطائفہ حضرت اقدس مولانا شاہ حاجی امداد اللہ قدس سرہ کی سوانح عمری بنام ”حیات امداد“ شائع فرما چکے ہیں جو تاریخی طور پر اس استناد و تحقیق کا نمونہ ہے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی سوانح حیات بنامِ ”تجلیات عثمانی“ ان کے قلم حقیقت رقم سے نکل کر منصۂ شہود پر آچکی ہے۔ حضرت الاستاذ الاکبر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی سوانح کا مواد فراہم کر چکے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اپنے اس خاص تاریخی رنگ میں اس

سلسلہ کی سب سے زیادہ خاص اور سنہری کڑی کو نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ موسسِ دارالعلوم دیوبند کی سوانح عمری ہے جو بنام ''انوار قاسمی'' اس وقت آپ کے سامنے آرہی ہے جس کے لئے وہ عرصہ دراز سے کوشاں تھے۔ یہ تاریخی اور علمی ذخیرہ ممدوح کی کئی سال کی عرق ریزی اور محنت وکاوش کا ثمرہ ہے جس سے آج ہمیں مستفید ہونے کا مبارک موقع مل رہا ہے۔ اس تاریخی ذخیرہ میں جہاں انہوں نے سوانح قاسمی مولفہ مولانا گیلانی سے استفادہ کیا ہے (مگر نقد وتبصرہ کے ساتھ) وہیں بہت کافی مواد خود ان کی اپنی ذاتی کاوش اور تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے جس کیلئے انہوں نے بہت سے صفحات واوراق کھنگالے ہیں اور کافی دادِ تحقیق دی ہے۔

ممدوح نے اس سوانح کو دو جلدوں میں ترتیب دیا ہے جس کی پہلی جلد میں حضرت والا کی ذاتی زندگی اور عائلی زندگی کے حالات، خاندان کے مفصل احوال، مولد ومنشاء (نانوتہ) کی جغرافیائی پوزیشن، اس کے راستے اور ریلوے لائن وغیرہ کے نقشے۔ خاندان کے بعض بزرگوں کے حالات حضرت کے اساتذہ وشیوخ کی نشاندہی جس کے بغیر سوانح مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ تلامذہ کے جستہ جستہ واقعات جو تکمیل سوانح کیلئے لازمی تھے۔ حضرت کی اسانیدِ حدیث، جہاد شاملی کے تحقیقی گوشے وغیرہ کافی تحقیق استناد کے ساتھ پیش کئے ہیں جو اس تفصیل سے اب تک کسی مطبوعہ سوانح عمری میں درج نہیں ہوئے۔ اس لئے یہ سوانح تاریخی استناد کے ساتھ ایک مخصوص جامعیت اور افادیت لئے ہوئے ہے جو اپنی نوعیت میں یقیناً یگانہ ہے۔

اس سے بڑھ کر فاضل مصنف نے جو لامثالی رنگ میں ایک مثالی قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ حضرت والا کے علوم وحکمت کا تعارف ہے جس میں حکمتِ قاسمیہ کی نوعیت نمایاں کی ہے۔ تصانیفِ قاسمیہ کی تعداد ان کے موضوعاتِ بحث ان کی فلسفیانہ اور عارفانہ مباحث کی حیثیت اور اس حکمت کے بنیادی اصول وفروع کی استدلالی نوعیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اب انوارِ قاسمی ہی حضرتؒ کی حقیقی سوانح حیات ہے اور جس سے نمایاں ہوتا ہے کہ صاحب سوانح نے وقت کے تقاضوں کو کن عارفانہ نگاہوں سے دیکھا اور کس طرح بطور پیش بندی ان کیلئے اسرار غیب کا ذخیرہ جمع فرمایا۔ اسلامی اصول ومبانی کو کن کن عجیب وغریب عنوانوں اور عرفانی اندازوں سے اہل عصر کی سائنس اور فلسفہ زدہ عقلوں کے سامنے پیش کر کے

ان پر حجۃ قائم کی؟ بالفاظِ دیگر فلسفہ و سائنس جن جن جدید اسلحہ سے مسلح ہو کر اسلام کے سامنے آیا۔ اس کے مقابلہ میں اسی انداز کے کس قدر منہ توڑ اور موثر حربے اور کاٹ کرنے والے تیر بہدف اسلحہ اس حکمت میں فراہم فرمائے؟ یہ تمام علمی ذخیرہ اس سوانح کی دوسری جلد میں پیش کیا گیا ہے جو عنقریب مکمل ہو کر سامنے آنے والی ہے۔

بہر حال پہلی جلد میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے اس مردِ خدا کو کیا دیا اور دوسری جلد میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس مردِ خدا نے مخلوق خدا کو کیا دیا؟ سوانح کی خصوصیت کے پیش نظر، مدح سرائی یا مبالغہ آمیزی سے الگ ہو کر یہ کہنا بجانہ ہوگا کہ سوانح قاسمی کے سلسلہ میں آپ کی علمی سوانح کا میدان ابھی تک خالی تھا بلکہ حضرت والا کی اس علمی سوانح کو دنیا کے سامنے رکھنے اور کھول کر پیش کرنے کا ایک زبردست قرضہ فضلاء دار العلوم کی گردن پر تھا جسے اب تک کسی نے نہیں چکایا تھا۔ اس کی پہلی قسط صرف پانچ نسخوں کی حد تک مولانا مناظر احسنؒ نے ادا کی جو درحقیقت ادائیگی نہ تھی بلکہ ادائیگی کا اعلان تھا اور یہ قسط فراہم بھی نہ ہونے پائی تھی چہ جائیکہ ادا ہوتی کہ انہیں داعیٔ اجل نے پکار لیا۔ اس لئے اس کی پہلی قسط سمیت دوسری قسط کا قرضہ مولانا انوار الحسن صاحب نے چکا دیا ہے۔ جس کے لئے وہ پوری جماعت کی طرف سے شکریہ و تبریک کے مستحق ہیں۔ ابواب ''انوارِ قاسمی'' کھولنے کیلئے بھی انوار ہی کی ضرورت تھی جو خدا نے مہیا فرما دیئے اور یوں انوار، انوار میں مل گئے۔

فجزی اللہ الانوار ربنا و عن جمیع اھل انوار العلم احسن الجزاء

حق تعالیٰ مؤلف ممدوح کی اس علمی اور تاریخی خدمت کو قبول فرمائے اور ملک و ملت کیلئے اسے نافع بنائے۔

''ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد''

فالحمد اللہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

محمد طیب
مہتمم دار العلوم دیوبند
۱۰ محرم الحرام ۱۳۸۸ھ

قطعہ تاریخ طبع انوار قاسمی

از ناظم ادارہ سعدیہ مجددیہ

انوارِ قاسمی سے منور ہیں شرق و غرب
انوار کی سطور، یہ انوارِ قاسمی
عبدالغنی(۱) و حضرت امداد(۲) سے ہوئے
نور علیہ نور یہ انوار قاسمی،
دیکھیں اسے جو چاہتے ہیں روشنی دل
ہے نور شمع طور یہ انوارِ قاسمی
دارالعلوم کے ہیں جو بانی بہ دیوبند
ہے ان کا ہی ظہور یہ انوارِ قاسمی
تاریخ طبع کی سنو! ہر طبع کے لئے
ہے جان باسرور یہ انوارِ قاسمی
۱۳۸۸ھ

محمد محبوب الٰہی عفی عنہ
۱۷ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ

---

(۱) شاہ عبدالغنی مجددیؒ شیخ حدیث مولانا محمد قاسمؒ

(۲) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قاسمؒ

انتسابِ کتاب

نذرانہ عقیدت حکیم الاسلام کی خدمت میں

میں سوچتا رہا کہ دستورِ زمانہ کے مطابق اس کتاب کو کس کے نام سے نسبت دوں اس آرزو کی تکمیل کیلئے میری نظر انتخاب جس کی طرف جاتی لوٹ کر آ جاتی۔ آخر وہ ایک ایسی یادگار سلف اور نمونہ خلف ہستی کا انتخاب کر کے آئی جو ملت کیلئے سرمایہ افتخار اور مذہب کیلئے فخر روزگار، وارث قاسم، صاحب مکارم جس کو زمانہ حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ اس انتخاب سے دل باغ باغ ہو گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا کہ نگاہ کا یہ انتخاب خوب خوب ہے سبب پوچھا تو مردایک چشم بول اٹھی کہ وہ اپنے دادا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کی سی سیرت طیبہ کے مالک اور علوم قاسمی کے وارث ہیں اس لئے یہ کتاب ان سے منسوب ہونی چاہئے اور پھر وہ آپ کے استاد بھی تو ہیں جن کے سامنے قدوری اور ہدلیۃ النحو کے ابواب کھلتے تھے میں بھی وہاں اراد پڑھاتے دیکھتی تھی۔ جن کے منہ سے دم تقریر پھول جھڑتے تھے اور سب ہی تلامیذ ان کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ نورانی چہرہ اور اس پر بشاشت کے آثار، روشن آنکھیں اور ان میں معرفت ربانی کے انوار، عالمانہ نکتہ آرئیاں اور ساتھ ساتھ ظرافت آشکار، ثقافت اسلامیہ کی جیتی جاگتی تصویر، دارالعلوم دیوبند کی پیشانی کی تنویر، جانشین انور وشبیر۔ دل نے نگاہ کی باتوں کے سامنے سر جھکا دیا اور اس انتخاب پر آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا اور بولا اگر حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب شادی نہ کرتے جیسا کہ انہوں نے ابتداء میں ٹھانی تھی تو ہم مولانا محمد طیب صاحب کے عالم آب و گل میں نہ آنے کا دعویٰ بارگاہ کبریا میں کرتے خیریت ہوگئی کہ وہ دنیا میں آنے اور دنیائے اسلام کی آنکھوں میں نور بن کر سمائے۔ لہٰذا یہ یادگار قاسم کی خدمت میں پیش ہے۔

(مصنف)

یادگار قاسمؒ

انوارِ قاسمیؒ کا پہلا حصہ

خاندانی اور وطنی حالات

اس نئی روشنی کی دنیا میں جہاں برقی قمقمے سیر طور کا مخفف دے رہے ہوں میں گذشتہ تیرھویں صدی ہجری کا ایک پرانا چراغ مگر آفتاب و مہتاب سے زیادہ روشن دیدۂ بینا کے سامنے لے کر آیا ہوں۔ اس چراغ کو پرانا کہنا زمانے کی نسبت سے ہے ورنہ حق تو یہ ہے کہ عہد ماضی کے اس روشن سورج کے سامنے زمانہ حال کی ساری شمعیں اور قمقمے ماند اور پھیکے ہیں۔ یہ وہ علم کا روشن آفتاب ہے جس کی ضیاباریوں نے بہت سے چاند اور ستارے منور کئے۔ میری مراد اس آفتاب سے نشاۃ ثانیہ کے مصلح حجۃ الاسلام بانی دارالعلوم دیو بند حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہیں جن کے گلشن علم کے سدا بہار پھول مشام جاں کو ہمیشہ مہکاتے رہیں گے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ
تازہ خواہی داشتن گرد اغہائے سینہ را

انوار عالم ارواح سے جب یہ روحانیت کا پیکر عالم اجسام کو روانہ ہوا تو فرشتوں نے کوثر کے پانی سے اس کو نہلایا، سر پر علم کا تاج رکھا درویشی کا جامہ زیب تن کیا، قرآن و سنت کا ہار گلے میں ڈالا، ریاضت و عبادت کا کاجل آنکھوں میں لگایا۔ رحمت کے فرشتے جلو میں تھے دنیا کی سرحد تک آئے اور الوداع کہ کر رخصت ہوئے۔ سدھارو اللہ کا دین زندہ کرنے لئے

سدھارو۔

پیدائش ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء:

اس مقدس ہستی نے نانوتہ ضلع سہارنپور (یو۔ پی) کی سرزمین کو اپنے وجود سے شرف بخشا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر المدرسین اول دار العلوم دیوبند نے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم کی سوانح عمری لکھی ہے جو کہ بتیس صفحات پر چھپی ہوئی ہے تحریر فرمائی ہے۔ آپ کی پیدائش تحریر فرماتے ہیں:

> ”مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) احقر سے چند ماہ بڑے تھے۔ ان کی پیدائش شعبان یا رمضان سنہ بارہ سواڑتالیس (۱۲۴۸ھ) ہے اور نام تاریخی خورشید حسین۔“

(سوانح قاسمی صفحہ نمبر ۲)

سال پیدائش کا علم تو تاریخی نام خورشید حسین سے ثابت ہوا کہ اس کے عدد ۱۲۴۸ ہوتے ہیں لیکن شعبان یا رمضان کے مہینوں کے متعلق خود سوانح نگار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بھی صحیح طور پر معلوم نہیں۔ کیونکہ خود اس سوانح کے حاشئے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”جناب مولوی صاحب کی پیدائش (۱) کا سن تاریخی نام سے معلوم تھا اور مہینہ اور تاریخ محفوظ نہ تھا۔ مہینہ یا تو ربیع الثانی یا جمادی الثانی تھا اور تاریخ محفوظ رہی نہیں اور جن جن صاحبوں پر اس کے معلوم ہونے کا گمان تھا ان سے پوچھا ہر کسی نے مختلف بیان کیا۔ ایک صاحب نے پندرھویں شعبان کہا مگر میرے ماموں صاحب جناب حکیم صاحب نے اس کی تائید کی اور ایک نے انتیسویں رمضان اور ایک نے ۲۷ محرم اور یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔“ ۱۲ محمد یعقوب (حاشیہ ص ۲)

بہر حال حجۃ الاسلام کا سال پیدائش تو متعین ہے لیکن ماہ پیدائش معلوم نہیں۔ شعبان و رمضان کا مہینہ قیاس ہے اس لئے انگریزی سن بھی ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء ہے۔

نام نامی:

جیسا کہ زبانی زد خاص و عوام ہے آپ کا نام نامی محمد قاسم تھا۔ ”تصفیۃ العقائد“ کے

ایک خرابنام سرسید مرحوم لکھتے ہیں:

"کمترین ہیچ مدان محمد قاسم بعد سلام مسنون گذارش پرواز ہے۔"

تاریخی نام:

جیسا کہ ابھی اوپر گذرا کہ آپ کا تاریخی نام خورشید حسین تھا خود حجۃ الاسلام اپنے ایک مکتوب بنام حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری (منہاران ضلع سہارنپور) میں اپنے تاریخی نام کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

> شخصے دراں جلسہ و آشنایان احقر بود او بے ساختہ بتعظیم (من) برخاست و اہل مکان را از مولویت من خبر داد. ایں خبر از و باوشاں رسید. مگر چوں نام من نگفتہ پس از استفسار خورشید حسین (تاریخی نام) گفتم. (فیوض قاسمیہ صفحہ٦)
>
> اس مجلس میں ایک شخص میرا واقف تھا وہ بے ساختہ میری تعظیم کیلئے کھڑا ہو گیا اور صاحب خانہ کو میرے مولوی ہونے کی خبر کردی، لیکن چونکہ میرا نام اصل نہیں بتایا تھا اس لئے پوچھنے کے بعد میں نے تاریخی نام خورشید حسین کہہ دیا۔"

بات یہ تھی کہ حجۃ الاسلامؒ ایک شیعہ کے مکان پر پہنچے جہاں مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی شیعوں کے عالم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں اس نے اپنے اصلی نام کو چھپانے کی غرض سے کہ افشا نہ ہو اپنا تاریخی نام خورشید حسین بتایا تھا اور مولوی حامد حسین شیعی سے کچھ سوالات کئے تھے جن کا مولوی حامد حسین جواب نہ دے سکے۔

وطن نانوتہ ضلع سہارنپور:

حضرت حجۃ الاسلام اپنے وطن نانوتہ کے متعلق جو کہ تحصیل دیوبند ضلع سہارنپور میں واقع ہے۔ اپنی کتاب "قبلہ نما" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "بست وسوم (۲۳) شعبان کورڑکی سے روانہ ہوا اور ایک دن منگلور (ضلع سہارنپور) دو تین دن دیوبند ٹھہر کر ستائیسویں کو اسی قصبۂ ویرانہ میں پہنچا جس کو نانوتہ کہتے ہیں اور اس خاکسار کا وطن یہی ہے۔"
>
> (قبلہ نما ص ۴)

نانوتے کی وجہ تسمیہ:

لالہ نند کشور پرشاد مصنف تاریخ سہارنپور مصنفہ ۱۸۶۸ء میں نانوتہ کے نانوتہ نام رکھنے کی وجہ کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''نانو'' نام کی کوئی قوم جو گوجر یا راجپوت تھی اس کے نام پر یہ قصبہ نانوتہ مشہور ہوا۔ بہر حال اس کا نام آغاز ہی سے نانوتہ پڑ گیا ابوالفضل نے آئین اکبری میں صوبہ دہلی کی آٹھ سرکاروں میں سرکار سہارنپور کو بھی شامل کرتے ہوئے اس کے ذیلی پرگنوں میں نانوتہ کے نام سے ایک پرگنہ کا ذکر کیا ہے۔''

(حاشیہ سوانح قاسمی از مولانا گیلانی جلد ا ص ۵۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قصبہ نانوتہ ایک پرانا قصبہ ہے اور اکبر بادشاہ سے بھی پہلے کا ہے۔

آب و ہوا:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنی مصنفہ سوانح قاسمی کے حاشیے پر تحریر فرماتے ہیں:

> ''نانوتہ ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ اول آب و ہوا ایسی خراب نہ تھی اب نہر کے سبب آب و ہوا وہاں کی نہایت خراب ہو گئی اور آبادی میں بھی کمی آ گئی۔''

نہر جمن کی کھدائی تاریخ کی روشنی میں اور آب و ہوا کی خرابی:

سوانح قاسمی مولفہ مولانا گیلانی کے حواشی میں آب و ہوائے نانوتہ کے متعلق لکھا ہے کہ مولوی ذکا احمد نے تاریخ عروج سلطنت انگلیشیہ میں لکھا ہے کہ:

> ''لارڈ آک لینڈ کی منظوری سے نہر جمن کھودی گئی اور دہلی اور کرنال کے اضلاع میں اس نہر کے سبب سے وبائی بخار ایسا پھیلتا تھا کہ کرنال سے چھاؤنی کو منتقل کرنا پڑا۔ مگر ۱۸۴۷ء میں لارڈ ہارڈنگ کے زمانے میں پانی کی نکاسی کا معقول انتظام کیا گیا۔''

(سوانح قاسمی گیلانی جلد ا ص ۵۷)

نانوتہ کی آبادی حجۃ الاسلام کے زمانے میں:

سوانح قاسمی مولانا گیلانی کے حواشی میں حسب ذیل نوٹ نظر سے گذرا جس سے حجۃ الاسلامؒ کے زمانے میں نانوتے کی آبادی کا پتہ چلتا ہے:

> "حضرت مولانا رفیع الدین صاحب اولین مہتمم دارالعلوم دیوبند کے چھوٹے بھائی مولانا فصیح الدین سہارنپور کے جغرافئے میں صفحہ بیس (۲۰) پر اس قصبے کی آبادی ۱۸۶۵ء میں چار ہزار آٹھ سو ستاسی (۴۸۸۷) تحریر فرماتے ہیں۔"

(سوانح گیلانی صفحہ ۵۲)

اس مردم شماری اور آبادی سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی آبادی کسی بڑے گاؤں کے برابر تھی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے بیان سے واضح ہے کہ آب وہوا کی خرابی سے یہ آبادی گھٹتی چلی گئی۔ پھر حجۃ الاسلام کے بیان سے بھی واضح ہے کہ:

> "ستائیسوں کو اسی قصبہ ویرانہ میں پہنچا جس کو نانوتہ کہتے ہیں۔"

اس جملے سے نانوتہ کی ویرانی کا صاف پتہ چلتا ہے۔

نانوتے کا محل وقوع:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنی مصنفہ سوانح قاسمی کے حاشئے میں نانوتہ کے محل وقوع کے متعلق فرماتے ہیں:

> "(نانوتہ) دیوبند سے بارا کوس غرب میں اور سہارنپور سے پندرہ کوس جنوب میں اور گنگوہ سے نوکوس مشرق میں اور دہلی سے چار منزل (یعنی) ساٹھ کوس شمال میں ہے۔"

بایں طور

مغرب

گنگوہ سے نوکوس مشرق میں

شمال سہارنپور سے دس کوس جنوب میں **نانوتہ** دہلی سے ساٹھ کوس شمال میں جنوب

دیوبند سے ۱۲ کوس مغرب میں

مشرق

ریلوے لائن

گنگوہ سے نانوتہ مسافر دہلی کو پیدل چلنا پڑتا تھا بعد ازاں سہانپور سے بڑی لائن دیوبند، اور غازی آباد ہوتی ہوئی دہلی پہنچنے لگی۔ لیکن ایک چھوٹی لائن سہارنپور سے نانوتہ تھانہ بھون، شاملی، کاندھلہ ہوتی ہوئی شاہدرہ سے جاملی ہے۔ اسی چھوٹی لائن پر نانوتہ حضرت حجۃ الاسلام کا وطن ہے۔ اس لائن کو ایس۔ ایس۔ لائٹ ریلوے لائن (Saharnpur Shadraa Light Railway Line) سہارنپور شاہدرہ چھوٹی لائن کہتے ہیں۔

نانوتے کی جغرافیائی پوزیشن پر تفصیلی نظر:

نانوتے کی جغرافیائی صورت حال پر ہمارے خیال میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے حقیقی ماموں زاد بھائی حکیم دیوان عبدالسمیع کے بیٹے حکیم اکبر احمد عشرتی نے مکتوبات یعقوبی (مکتوبات مولانا محمد یعقوب صاحب بنام منشی محمد قاسم نیانگری) کے دیباچے میں نہایت محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ اب ہم اپنے قلم کی باگ ان کی تحقیق کی طرف موڑتے ہیں۔ مولانا گیلانی کی نظر سے غالباً حکیم امیر احمد عشرتی کا یہ تحریری نوٹ اوجھل رہ گیا ہے۔ ورنہ ہمارے نزدیک اس سے بہتر اور کوئی بیان شاید نہیں ہوسکتا لکھتے ہیں:

نانوتہ:

یہ امر کہ کس نے اور کس وقت میں آباد کیا اس وقت لکھائی دشوار ہے مگر یہ کہنا کہ یہ قصبہ بہت پرانا پختہ تعمیرات کا ہے کچھ بے جانہ ہوگا۔ یہ قصبہ تحصیل دیوبند ضلع سہارنپور میں دہلی سے جانب شمال اسی (۸۰) میل کے فاصلے پر واقع ہے جس کے حدود اربعہ یہ ہیں:

گنگوہ غرب ۱۲ میل
شمال سہارنپور ۱۸ میل نانوتہ جنوب تھانہ بھون ۹ میل
دیوبند مشرق ۱۶ میل

اس قصبے کے تین طرف ہوکر شرق غرب نہر جمن گذرتی ہے۔ شاہدرہ دہلی سے سہارنپور تک ریلوے لائن گئی ہے۔ درمیان میں نانوتے کے نام سے اسٹیشن قائم ہے بغرض رفع حوائج ضروریہ ہمہ اقسام ایک مختصر سا بازار واقع ہے۔ سنیچر کے روز پیٹھ (خصوصی بازار عارضی) لگتی ہے۔ اس میں ڈاک خانہ، تھانہ واقع ہیں۔ اس کا بہت بڑا حصہ کوٹ کے نام سے منہدم اور مسمار پڑا ہے۔ اس قصبے میں پیشتر پانچ قوموں کا زمیندارہ تھا۔ شیخ، سید، پٹھان، گوجراں و گوراں کا رقبہ اس سے کم ہوتے ہوتے اس وقت صرف مف سما ۱۷ بسوع (۵۷۰) بیگہ پختہ جس کی مالگذاری تقریباً

(۶۵۶۸) روپیہ ہے۔ اس قصبہ کے ۸۵۲ کھاتہ کھیوٹ ہیں۔ اس وقت پرانے زمینداروں کا لیز رقبہ بنیوں کا زمیندارہ ہوگیا اور جو باقی ہے تلف ہوتا جاتا ہے۔ سید صاحبان کے تین گروہ ہیں، بخاری، ترمذی، سبزواری، پیشتر سب اہل تسنن تھے۔ زمانہ شاہ فرخ سیر سے شیعہ ہونے شروع ہوئے۔ اس وقت سے جملہ صاحبان شیعہ ہیں پٹھان کاکرزئی، شیروانی سب سنی المذہب ہیں۔ چند بزرگانِ دین مثل سید احمد مرحوم معروف بہ دادا میراں جی وغیرہ کے پرانے مزارات ہیں۔

علم وفضل:

اس قصبے کے شیخ سیدوں کا علم وفضل وطبابت دور دور مشہور تھا۔

پیداوار:

یہ قصبہ نہایت شاداب ہے۔ پورا طرف باغات آم قلمی ودیسی عمدہ عمدہ اقسام کے اور لوکاٹ بکثرت ہیں۔ لیکن ترشاہ بہت کم ہیں۔ خاص قصبہ مقاوضات قصبہ میں عمدہ عمدہ اقسام کا چاول پیدا ہوتا ہے جس میں سے دو قسمیں بے مثل ہیں کہ جن کا جواب ٹانڈہ وغیرہ میں بھی نہیں اوکھ (بعض جگہ ایکھ اور پنجاب کہا) یعنی گنا کئی قسم کا ہوتا ہے اور پونڈہ بہت اچھا، خوش مزہ ملائم ہوتا ہے۔ کپاس، مرچ، بارہ، ارہر کی پیداوار کم ہے۔ گیہوں، چنا اچھا ہوتا ہے۔ مکا، جوار، کابلی چنا سفید کی پیداوار بدرجہ اوسط قصبے کی پرانی یادگاروں میں علاوہ چند مکانات کے سید زید صاحب مرحوم صوبہ دار اجین کا محل پرانی یادگار ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (دیباچہ مکتوبات یعقوبی از حکیم امیر احمد عشرتی: ص ۶)

نانوتے پر حکیم عشرتی صاحب کا یہ نوٹ اس قدر جامع ہے کہ جس شخص نے نانوتہ نہ بھی دیکھا ہو تو اس عبارت سے اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے لیکن نانوتے کی موجودہ پوزیشن (۱) یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد زمینداریاں تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ ہندو اور مسلمان جو پہلے زمیندار تھے ان دونوں کا یکساں حال ہے۔ لیکن مسلمان ہندوستان میں ملازمتوں سے بھی محروم ہیں۔ اس لئے خود کاشت زمینوں میں جن کے نام کاشت ہے تھوڑی بہت ان کی زمینیں بچ گئی ہیں۔ نانوتہ کی حالت بھی اب وہ نہیں جس کا نشان حکیم امیر احمد عشرتی نے دیا ہے۔ یہاں ہم نانوتے کا جغرافیائی محل وقوع اور ایس۔ ایس۔ لائٹ ریلوے لائن (s.s. Light Railway Line) کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو سہارنپور سے منانی، رامپور منہاران، نانوتہ، جلال آباد، تھانہ بھون، شاملی، کاندھلہ، لونی ہوتی ہوئی شاہدرہ اور پھر دہلی چلی جاتی ہے۔

---

(۱) مولانا محمد طیب صاحب راقم الحروف کے نام گرامی نامے میں تحریر فرمایا ہے کہ نانوتے کی آبادی اب تقریباً چھ سات ہزار ہے۔ تھانہ، ڈاک خانہ، بازار اور حالیہ سرکاری مدرسہ وغیرہ سب موجود ہیں۔ عمارات پختہ ہیں اسٹیشن سے نانوتے کی آبادی جانب غرب ہے۔ (مکتوب مورخہ ۱۵/محرم ۱۳۸۵ھ)

نقشہ ریلوے لائن

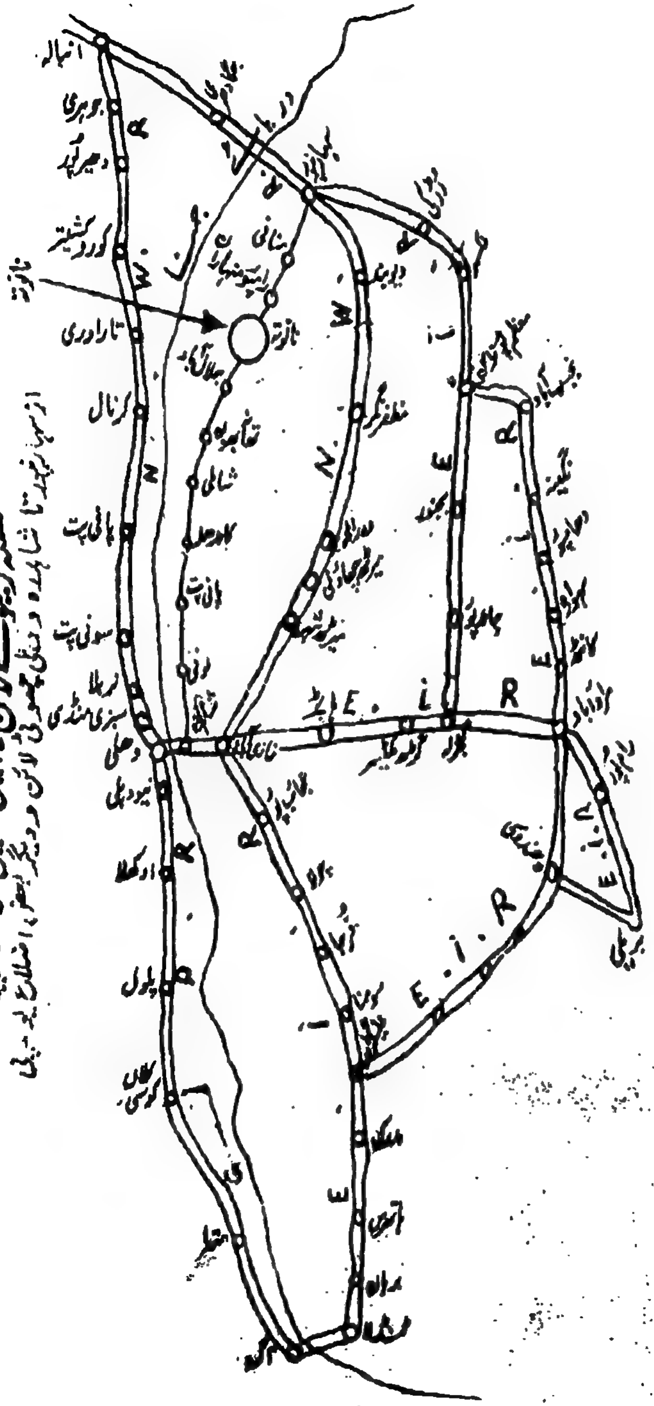
انبالہ
جوہری
کوروکشیتر
تاراوری
کرنال
پانی پت
سونی پت
نریلا
سبزی منڈی
دہلی
نیو دہلی
اوکھلا
پلول
کوسی کلاں
متھرا
آگرہ
ٹنڈلہ
سہارنپور
نانوتہ
دیوبند
مظفرنگر
میرٹھ
شاہدرہ
غازی آباد
مرادآباد
بریلی
جمنا
N. W. R
E. I. R

نقشہ ریلوے لائن۔ ایس۔ ایس۔ لائٹ ریلوے
از سہارنپور تا شاہدرہ و دہلی چھوٹی لائن و دیگر بعض اضلاع یو۔ پی

حجۃ الاسلام کے والد محترم شیخ اسد علی کے حالات

حجۃ الاسلامؒ کے والد محترم کا نام شیخ اسد علی تھا اور آپ صدیقی خاندان میں سے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنی مؤلفہ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”مولوی صاحب کے والد شیخ اسد علی صاحب ہر چند جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہ نامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے پڑھنے کے زمانے کی (ہمارے سامنے) حکایتیں بیان فرمایا کرتے تھے مگر حال ایسا تھا کہ گویا علم سے کچھ مناسبت ہی نہیں رکھتے تمام عمر کھیتی کی اور ویسے ہی عادات اور ڈھنگ موٹے قصبات کے سے تھے مگر نہایت ہی صاحب مروت و اخلاق، کنبہ پرور، مہمان نواز، نمازی پرہیزگار تھے۔“

(سوانح قاسمی صفحہ ۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی یہ چند سطریں حضرت حجۃ الاسلامؒ کے والد محترم کی تعلیم وضع قطع اور بود و باش، اخلاق حسنہ اور پرہیزگاری کی پوری آئینہ دار ہیں۔ بالخصوص دہلی میں تعلیم حاصل کرنے کا واضح ثبوت ہیں۔

تعلیم:

اس زمانے میں گلستان، بوستان، انوار سہیلی، سکندر نامہ اور شاہ نامہ آخری تعلیم ہوتی تھی کیونکہ سلطنت مغلیہ میں تمام دفتری کام فارسی میں ہوتے تھے اس لئے شاہی زبان ہی میں تعلیم کا معیار بلند سمجھا جاتا تھا رفتہ رفتہ انگریزی اقتدار میں فارسی کی قدر گھٹتی رہی۔ پھر بھی اس دور میں فارسی میں جس شخص نے شاہ نامہ فردوسی پڑھا ہو وہ اعلیٰ تعلیم کا حامل سمجھا جاتا تھا۔

الحاصل تعلیم دہلی میں حاصل کی اور مولانا مملوک علی صاحب کے زمانے میں تعلیم حاصل کی۔

کھیتی:

حضرت حجۃ الاسلام کے والد نے تمام عمر کھیتی کی اور یہ اس دور میں شرفا کا امتیازی نشان تھا کہ وہ نوکری کو پسند نہ کرتے تھے۔ اب وہ ہل خود جوت کر کھیتی کرتے تھے یا حالی موالی رکھ کر اس جملے میں کہ ”تمام عمر کھیتی کی“ دونوں ہی احتمال ہیں۔ پہلے اور اب بھی جو شرفاء چھوٹے درجے کے زمیندار ہوتے تھے خود اپنے آپ ہل چلاتے اور بوتے کاٹتے تھے۔ شیخ اسد علی صاحب بھی خود کھیتی بوتے جوتتے معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ”آمدنی اراضی کی مکتفی خرچ کو نہ ہوتی تھی۔ جناب حاجی امداد اللہ صاحب سے شکایت کی کہ بھائی میرے تو ایک ہی بیٹا تھا اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں کہ کماتا تو ہمارا افلاس دور ہو جاتا۔“ (سوانح صفحہ ۱۱)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کا کام خود ہی کرتے ہوں گے کیونکہ اراضی کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ گھر کے اخراجات کے لئے کافی ہوتی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنا پورا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ وہ خود کھیتی نہیں کرتے تھے اس تکلف کی بظاہر کیا ضرورت تھی۔

شیخ اسد علی کی حقہ نوشی اور سادگی:

آپ کی سادگی کے متعلق مولانا نے یہ جملہ لکھ کر کہ عادات اور ڈھنگ موٹے قصبات کے سے تھے۔ مزید ایک جگہ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب بڑے سیدھے آدمی تھے اور حقہ بہت پیتے تھے۔ بلکہ جب حجۃ الاسلام عالم و فاضل ہو چکے تھے تو عارف باللہ نے ایک واقعہ حقہ سے متعلق یہ بھی لکھا ہے:

> ”مولوی (محمد قاسم) صاحب کو حقے سے نفرت تھی ایک بار حقہ بھرنے کو کہا۔ مولوی صاحب باپ کے تابعدار حقہ بھر کر سامنے لا رکھا۔ جب لوگوں نے سنا بہت ملامت کی۔

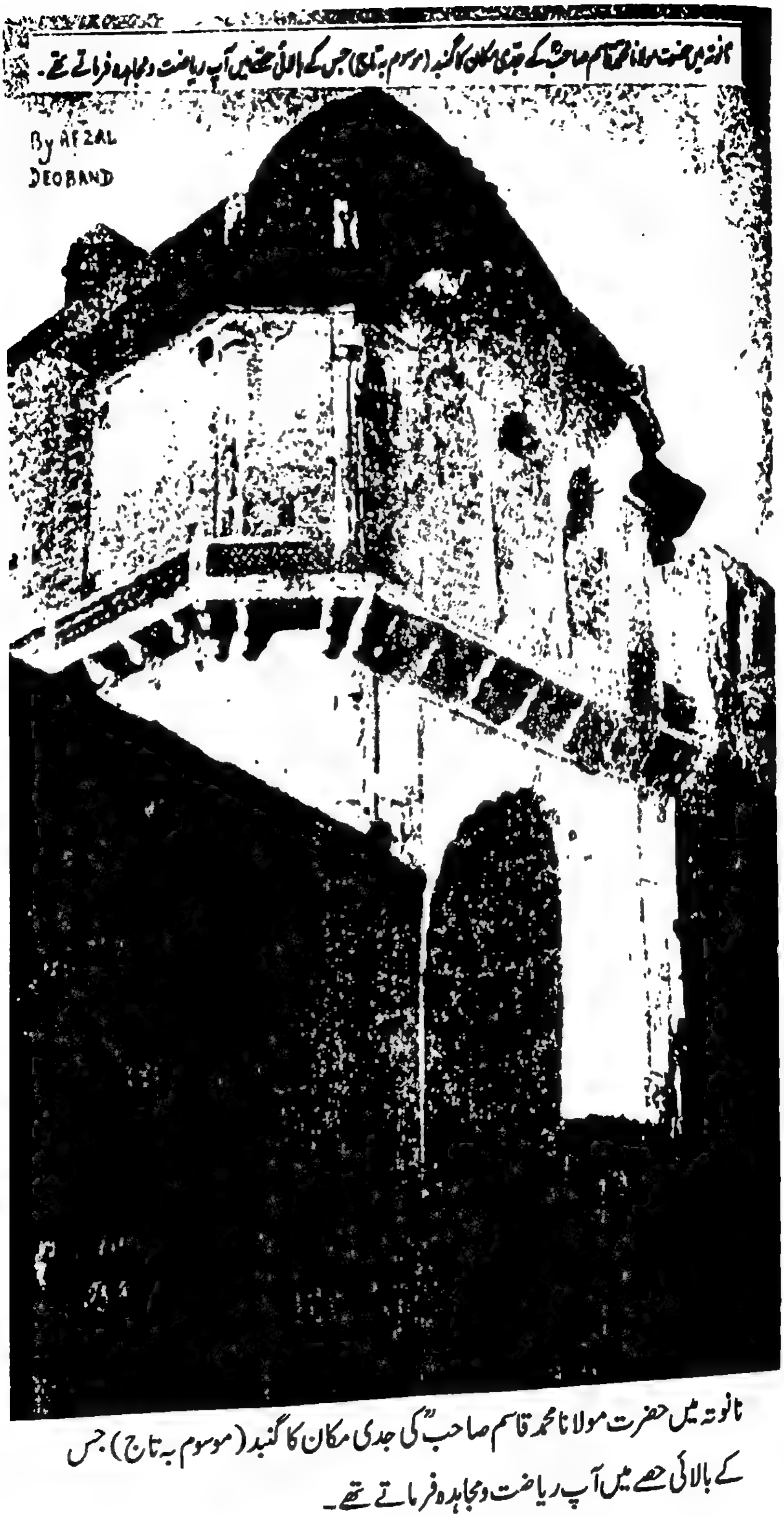
نانوتہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے جدی مکان کا گنبد (موسوم بہ تاج) جس کے بالائی حصے میں آپ ریاضت ومجاہدہ فرماتے تھے۔
By AFZAL
DEOBAND

نانوتہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی جدی مکان کا گنبد (موسوم بہ تاج) جس کے بالائی حصے میں آپ ریاضت ومجاہدہ فرماتے تھے۔

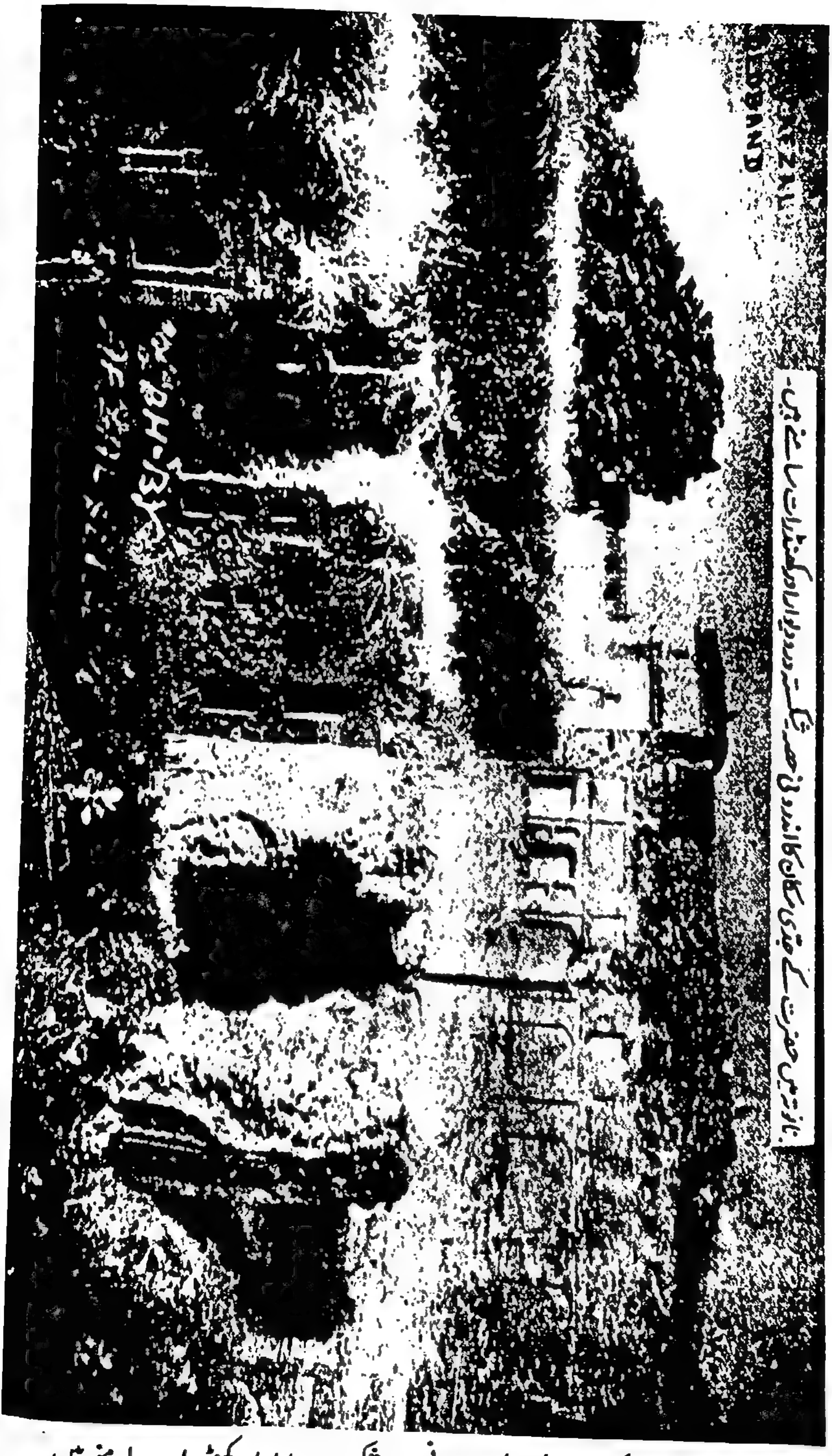
نانوتہ میں حضرت کے جدی مکان کا اندرونی حصہ شکستہ درودیوار اور کھنڈرات سامنے ہیں۔
AFZAL
DEOBAND

نانوتہ میں حضرت کے جدی مکان کا اندرونی حصہ شکستہ درودیوار اور کھنڈرات سامنے ہیں۔

کہا میں کہ کر خود نادم ہوا۔ پھر کبھی مولوی صاحب سے نہ کہا۔ اس بات پر تکدر رہتا تھا۔‘‘

(سوانح قدیم صفحہ ۱۵)

انوار شیخ اسد علی نے اگر اپنے بیٹے مولانا محمد قاسم صاحب سے حقہ بھروالیا تو کیا ہوا۔ لوگوں نے ملامت کی تو غضب کیا۔ آخر باپ کو اولاد سے خدمت لینے کا حق تو حاصل ہے اگر وہ پاؤں بھی دبواتے تو کیا مضائقہ تھا۔ البتہ حقہ مکروہ سی چیز ہے۔ اس لئے بیٹے کا تکدر بھی بجا اور اگر ہر چلم پر حقے کو تازہ کرلیا جائے تو شاید کراہت بھی جاتی رہے۔ تو شیخ اسد علی صاحب مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ہر دفعہ حقہ تازہ بھی کرالیا کرتے اور چلم بھروانے کو بھی کہتے تو اس میں شیخ اسد علی صاحب کی بظاہر مجھ ناچیز کو کوئی گستاخی نظر نہیں آتی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید کیا فرمایا کرتے تھے:

’’اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو جاؤ مولانا شیخ محمد سے پوچھو اور اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی امداد اللہ صاحب کے پاس جاؤ اور اگر حقہ پینا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔‘‘

پھر شہادت کے بعد آپ کو خواب میں دیکھا گیا تو فرمایا ہاں حقے کا ذکر آیا تھا لیکن کوئی خاص بات نہیں ہوئی درگذر سے کام لیا گیا۔ بہر حال میں حقے کے متعلق صرف یہ لکھ کر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں نے شیخ اسد علی صاحب مرحوم کو حضرت حجۃ الاسلامؒ سے حقہ بھروالینے پر ملامت کی تو کیا انہوں نے ملامت میں انصاف سے کام لیا ہے؟ حجۃ الاسلامؒ کو حقہ بھرنے اور والد صاحب کی خدمت سے تکدر نہ تھا بلکہ والد صاحب کے مطلقاً حقہ پینے پر تکدر تھا کہ علمائے ربانی کی نظروں میں حقہ اور تقدس دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس میں تو مجھے بالکل شک نہیں کہ حقہ نوش محققین کی جماعت کو اگر تمام دن روٹی نہ ملے اور حقہ ملتا رہے تو زندگی میں دلچسپی رہتی ہے اور گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ گُڑ کی ترنم خیز آواز میں جو موسیقیت اور زیر و بم پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بعض محقق دھواں چھوڑتے وقت جو ایک آواز بھی ہا کی نکالتے ہیں وہ سو بوتلوں کے نشے سے کم نہیں ہوتی۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ حقہ تقدس کے خلاف ہے اور مقدس حضرات سے حقہ بھروانے کا کام لینا اس دور کے بزرگوں کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکنا تعجب کی بات نہیں ہے۔ اب ذرا حقے کو چھوڑ کر شیخ اسد علی صاحب کے دوسرے حالات کی طرف چلنا چاہئے جو

ان کی عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔

شیخ اسد علی صاحب کی شادی ان کی زوجہ محترمہ اوران کے خسر:

شیخ اسد علی صاحب کی شادی مولوی وجیہ الدین صاحب نانوتوی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کا نام بی بی حبیبہ تھا شیخ وجیہہ الدین صاحب سہارنپور میں وکالت فرماتے تھے۔ اس زمانے میں وکالت کیلئے انگریزی کا جاننا ضروری نہ تھا۔ شیخ اسد علی صاحب اور شیخ وجیہہ الدین دونوں مولوی محمد ہاشم صاحب کی ساتویں پشت میں جا ملتے ہیں لیکن ایک ہی پشت میں بعض اوقات دو شخصوں کا عمر میں فرق اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ ایک باپ کی عمر کے برابر پہنچ جاتا ہے اور دوسرا بیٹے کے برابر جس طرح کسی کا ایک بھائی دوسرے بڑے بھائی سے بیس یا بائیس سال بعد پیدا ہو تو ظاہر ہے کہ چھوٹا بھائی باوجود ایک ہی پشت کے اولاد کے مرتبے پر جا پہنچتا ہے۔ شیخ اسد علی صاحب اور شیخ وجیہہ الدین ایک ہی خون اور نسل کے فرزند ہیں جو مولوی محمد ہاشم کے شجرہ طیبہ کی شاخیں ہیں۔ مولوی محمد ہاشم صاحب کے متعلق حضرت عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ مولوی محمد ہاشم زمانِ شاہجہان میں مقرب بادشاہی ہوئے اور نانوتے میں مکان بنائے اور چند دیہات جاگیر تھے جو تبدل حکومات کے سبب ان کی اولاد کے پاس نہ رہے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۴)

انہی مولوی محمد ہاشم مرحوم کے دو لڑکے تھے جن میں ایک کا نام میاں عبد السمیع اور دوسرے کا نام مولوی غلام محی الدین تھا۔ شیخ عبد السمیع صاحب کی اولاد میں شیخ اسد علی صاحب تھے اور مولوی غلام محی الدین صاحب کی نسل میں مولوی وجیہہ الدین وکیل تھے۔ اس سلسلے میں پوری بصیرت کیلئے یہ شجرہ ملاحظہ فرمائیے:

شجرہ بسلسلہ اولاد مولوی محمد ہاشم صاحب تا شیخ اسد علی و مولوی وجیہہ الدین صاحب نانوتوی:

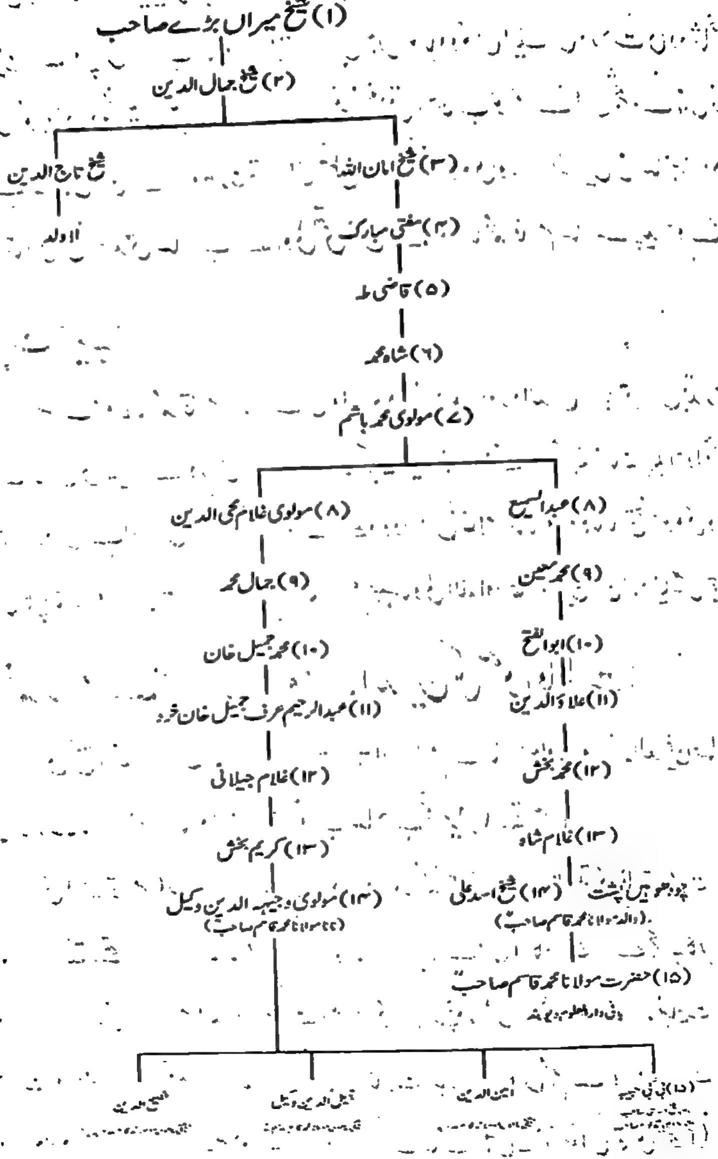
(۱) شیخ میراں بڑے صاحب
(۲) شیخ جمال الدین
(۳) شیخ امان اللہ
شیخ تاج الدین
لاولد
(۴) مفتی مبارک
(۵) قاضی طہٰ
(۶) شاہ محمد
(۷) مولوی محمد ہاشم
(۸) عبدالسمیع
(۸) مولوی غلام محی الدین
(۹) محمد معین
(۹) جمال محمد
(۱۰) ابوالفتح
(۱۰) محمد جمیل خان
(۱۱) علاؤالدین
(۱۱) عبدالرحیم عرف جمیل خان خرد
(۱۲) محمد بخش
(۱۲) غلام جیلانی
(۱۳) غلام شاہ
(۱۳) کریم بخش
چودھویں پشت
(۱۴) شیخ اسد علی
(والد مولانا محمد قاسم صاحبؒ)
(۱۴) مولوی وجیہہ الدین وکیل
(۱۵) حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ
بانی دارالعلوم دیوبند
(۱۵) بی بی
امین الدین
جلیل الدین وکیل

(نسب نامہ مرتبہ مفتی محمود احمد صدیقی نانوتوی)

اس شجرے کو پیش نظر رکھ کر غور فرمایئے کہ شیخ اسد علی صاحب اور ان کے خسر شیخ وجیہہ الدین صاحب دونوں شیخ میراں بڑے سے نیچے کی جانب چودھویں پشت میں واقع ہوئے ہیں اور دونوں مولوی محمد ہاشم صاحب کی پشت، نسل اور خون میں جا کر مل گئے ہیں جو شیخ قاضی میراں بڑے سے نیچے کی جانب ساتویں پشت میں ہیں اور شیخ اسد علی صاحب اور مولوی وجیہہ الدین سے اوپر کی جانب ساتویں پشت میں ہیں گویا دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں اور ایک ہی خون کی دو نسلیں ہیں۔ شجرے کے غیر متعلق اصحاب کو ہم نے اس شجرے میں ظاہر نہیں کیا ہے کہ ہمیں ان سے سروکار نہ تھا۔ الحاصل انہی شیخ مولوی وجیہہ الدین کی صاحبزادی بی بی حبیبہ کی شادی شیخ اسد علی صاحب سے ہوئی تھی جن سے مولانا محمد قاسم صاحب پیدا ہوئے۔

خوش بخت حبیبہ:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی والدہ بی بی حبیبہ اور والد شیخ اسد علی کس قدر خوش قسمت تھے کہ ان کی پیٹھ سے اور ان کے بطن سے ایک ایسا امام وقت اور مجتہد زمانہ پیدا ہوا جس کا نام آج تک روشن ہے اور کس قدر خوش قسمت تھے وہ دادا شیخ غلام شاہ اور وہ نانا شیخ مولوی وجیہہ الدین جن کا پوتا اور نواسہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسمؒ جیسا ولی اللہ اور عالم دین بن کر دنیا میں چمکا۔

مولانا محمد قاسمؒ کے نانا مولوی وجیہہ الدین کی علمی قابلیت:

انہی شیخ اسد علی کے خسر اور حضرت حجۃ الاسلام کے نانا مولوی وجیہہ الدین صاحب کے متعلق عارف باللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولوی (محمد قاسم) صاحب کے نانا مولوی وجیہہ الدین صاحب نانوتوی فارسی بہت عمدہ جانتے تھے۔ اردو کے شاعر تھے اور کچھ کچھ عربی سے بھی آگاہ تھے بڑے تجربہ کار اور پرانے آدمی۔ ہنگام آمدن حکومت انگریزی سہارنپور میں وکیل ہوئے اور نہایت عزت اور احترام اور تمول سے گذران کی۔ نہایت طباع اور خوش فہم تھے اور چند پشت اوپر مولوی محمد ہاشم صاحب مرحوم میں ہمارے نسب جا ملتے ہیں۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۴)

حجۃ الاسلامؒ کے حقیقی ماموں:

ان چند سطروں میں حضرت عارف باللہؒ نے حضرت حجۃ الاسلامؒ کے نانا کے متعلق سب کچھ ہی تو بتادیا ہے۔ شجرے سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ حجۃ الاسلامؒ کے تین ماموں امین الدین، جمیل الدین اور فصیح الدین تھے جن میں سے جمیل الدین صاحب بھی اپنے باپ کا پیشہ یعنی وکالت کیا کرتے تھے۔ حضرت عارف باللہ نے سوانح قاسمی میں دو ماموں یعنی امین الدین اور فصیح الدین صاحبان کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”ہمارے وطن نانوتہ میں ایک قضیہ پیش آیا۔ شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہو گئے تھے اور ہماری جائیداد کے شریک تھے۔ ان سے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا اور شیخ تفضل حسین مولوی صاحب کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہو کر مر گئے۔“ (سوانح قاسمی حضرت عارف باللہ صفحہ ۵)

دوسرے ماموں شیخ امین الدین کا ذکر حضرت عارف باللہ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے حضرت حجۃ الاسلام کی اولاد میں سب سے بڑی لڑکی بی بی اکرامن اور ان سے چھوٹی لڑکی بی بی رقیہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”بی بی اکرامن سے چھوٹی لڑکی بی بی رقیہ ہیں ان کا نکاح مولوی پیر جی محمد صدیق سے کیا ہے۔ یہ مولوی (محمد قاسم) صاحب کے ماموں مولوی امین الدین صاحب مرحوم کے نواسے ہیں اور اولاد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ہیں۔“

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۳)

حجۃ الاسلام کے نانا مولوی وجیہہ الدین کا انتقال:

جس سال رجب ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں مولانا مملوک علی صاحبؒ حج کو تشریف لے گئے ہیں اسی سال حجۃ الاسلامؒ کے نانا مولوی وجیہہ الدین نے وبائی بخار میں وفات پائی ہے۔ عارف باللہؒ نے مولانا مملوک علی صاحب کی حج کو روانگی رجب ۱۲۵۸ھ اور واپسی ایک سال کے بعد تحریر فرمائی ہے اور اسی سال حجۃ الاسلام کے نانا مولوی وجیہہ الدین اور ان کے آگے پیچھے اور بہت سے لوگوں کو وبائی بخار میں وفات پانے کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے

کہ رجب ۱۲۵۸ھ اور رجب ۱۲۵۹ھ کا درمیانی عرصہ گویا ان کی وفات کا سال ہے۔
(سوانح قاسمی وحاشیہ صفحہ ۶)

شیخ اسد علی حجۃ الاسلامؒ کے والد محترم کی وفات:

ہم حجۃ الاسلامؒ کے والد محترم کا ذکر کرتے چلے آرہے تھے کہ اس ضمن میں ان کی شادی اور ان کے خسر مولوی وجیہ الدین اور ان کے نسبتی بھائیوں کا ذکر خیر درمیان میں قاسمی حالات کی کڑیوں میں مل گیا۔

خود شیخ اسد علی صاحب کا سلسلہ حیات کہاں تک چلا گیا ہے اور ان کی وفات کب ہوئی افسوس کہ اس سلسلے میں راقم الحروف تحقیق کے باوجود معین تاریخ وفات کے بارے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ ہم آپ کو ان کی وفات کے اطراف و جوانب کے قریب لئے چلتے ہیں۔ شیخ اسد علی صاحب حضرت حجۃ الاسلامؒ کی تکمیل تعلیم کے بعد بقید حیات ہیں اور حجۃ الاسلامؒ کی شادی کی فکر میں ہیں۔ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ”مولوی (محمد قاسم) صاحب نکاح نہ کرتے تھے اور جناب بھائی اسد علی حضرت کے والد کو ادھر تو ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا ادھر یہ فکر ہوئی کہ دیوبند رشتہ کیا تھا آخر جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہوئے مگر یہ شرط کی کہ تمام زوجہ کے نفقے اور اولاد کی پرورش کیلئے کچھ کما لانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں۔ بے چاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی، نکاح ہو گیا۔“
>
> (سوانح عارف باللہ صفحہ ۱۲)

معلوم ہوا کہ شیخ اسد علی صاحب حجۃ الاسلامؒ کے نکاح کے وقت زندہ تھے بعد ازاں عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”جس زمانے میں نکاح ہوا اور والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کر ہی لیں گے اور بعد گذرنے کتنی مدت کے کچھ نہ کیا تب مایوس ہو گئے۔“

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۱۳)

ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب حجۃ الاسلامؒ کی شادی کے بعد کافی

مدت تک زندہ رہے ہیں۔ کیونکہ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”جناب بھائی اسد علی صاحب کی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور مولوی صاحب سے بہت خوش انہوں نے انتقال کیا۔“ (صفحہ ۱۴)

معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلام کی شادی کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلامؒ کے والد صاحب آپ کے یہاں نرینہ اولاد کے متمنی تھے۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”بعد نکاح والد اکثر مکدر رہتے تھے اور آرزو کرتے تھے کہ کوئی پوتا ہوتا تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی۔ اول کئی لڑکیاں ہوئیں جن میں سے دو زندہ اب بھی ہیں۔ ایک بزرگ نے کہا کہ تم یہ آرزو کرتے ہو اور مولوی صاحب کو ناخوش رکھتے ہو ان کو مکدر نہ کرو اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کرے گا۔ تب سے مولوی صاحب کی اکثر مزاج داری کرتے اور مہمانوں کی خدمت اور تواضع سے کسی طرح نہ گھبراتے تب اللہ تعالیٰ نے میاں احمد کو پیدا کیا اور میاں ہاشم پیدا ہوئے آج ان کی عمر آٹھ برس کی ہے۔ یہ نام مولوی صاحب کے والد کا رکھا ہوا ہے۔“ (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۱۵)

عارف باللہ کی یہ آخری عبارت ہے جس کے بعد حجۃ الاسلامؒ کے والد کا ذکر خیر ان کی کتاب یعنی سوانح قاسمی میں نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب اپنے پوتے میاں ہاشم کی پیدائش کے بعد تک زندہ ہیں۔ جس وقت حضرت عارف باللہ نے سوانح قاسمی حجۃ الاسلامؒ کی وفات کے بعد لکھی ہے اس وقت میاں محمد ہاشم کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہے۔ ان تمام عبارتوں کو باہم ملا کر جبکہ میاں محمد ہاشم کا نام شیخ اسد علی صاحب نے ہی رکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اسد علی صاحب انتقال زیادہ سے زیادہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وفات سے چھ سات سال پہلے ہی ہوا ہے کیونکہ مولانا کی وفات پر میاں محمد ہاشم کی عمر سات آٹھ سال کی تھی۔ اور ان کا نام شیخ اسد علی صاحب نے آٹھ سال پہلے رکھا تھا۔ یہ یقینی امر ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا انتقال ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو ہوا جیسا کہ عارف باللہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اس روز ۱۵/ اپریل ۱۸۸۰ء تھی جیسا کہ سر سید مرحوم نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۴/ اپریل ۱۸۸۰ء میں درج کیا ہے۔ لہٰذا شیخ اسد علی صاحب کا انتقال

۱۲۸۹ھ کے درمیان اغلباً ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء کے لگ بھگ ہوا ہے۔ اور میاں محمد ہاشم ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

شیخ اسد علی کی اولاد:

شیخ اسد علی صاحب کی اولاد کے متعلق حضرت عارف باللہ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”مولوی صاحب (یعنی مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کے اور کوئی بھائی نہ تھا۔ ایک بہن دیوبند میں زندہ موجود ہیں اور ان کے والد اور دادا صاحب کے بھی کوئی بھائی نہ تھا۔ بھائی پیدا ہوئے لیکن لڑکپن میں مرگئے اور چچا جوانی میں مرگئے اور دادا کے بھائی تھے وہ کسی لڑائی میں جوان عمر شہید ہوئے اور اوپر جو بھائی تھے ان کے اولاد پسری یہاں کوئی نہیں رہی۔ دکن میں ان کے اولاد ہوئی۔ بقاعدہ معروف وہ بھی گویا ایک ہی تھے۔ غرض کہ چار پشت تک مولانا متفرد ہوئے۔“ (صفحہ ۵)

حضرت عارف باللہ کی مندرجہ بالا عبارت سے صرف یہ معلوم ہوا کہ سوانح نگاری کے وقت حضرت قاسم العلومؒ کی ایک بہن (مساۃ امینہ) زندہ تھیں جو دیوبند میں حضرت حجۃ الاسلام کی وفات کے بعد موجود تھیں لیکن اس کا یہ مطلب اور مفہوم نہیں ہے کہ شیخ اسد علی صاحب کے اور کوئی لڑکی نہ تھی۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نبیرہ (پوتے) حجۃ الاسلام نے اس سلسلے میں جو معلومات مجھے بہم پہنچائی ہیں وہ ۱۷ شعبان ۱۳۸۴ء کے مکتوب گرامی میں بقلم مولانا عبدالحق صاحب پیش کار اس طرح درج ہیں:

> ”محترمی و مکرمی زید بعدکم
>
> سلام مسنون جناب کے مطلوبہ امور میں سے تین کے متعلق معلومات روانہ کرچکا ہوں۔ بقیہ معلومات مندرجہ ذیل ہیں:
>
> ۱۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کا نام بی بی حبیبہ تھا۔
>
> ۲۔ حضرت کی دو بہنیں تھیں۔ ایک کا نام امینہ تھا دوسری کا نام معلوم نہیں۔
>
> ۳۔ حضرت کی پہلی بہن امینہ کی شادی پہلے شیخ احمد سے ہوئی ان کے ایک لڑکا ہوا ضیاء

احمد، ضیاء احمد کے ایک لڑکا ہوا اور ایک لڑکی ہوئی۔ لڑکے کا نام حسن احمد اور لڑکی کا ام ہانی۔ شیخ احمد کے انتقال کے بعد امینہ کی دوسری شادی شیخ نیاز احمد سے ہوئی ان کے ایک لڑکا شیخ رفیق احمد پٹواری اور ایک لڑکی صفیہ تولد ہوئی۔ شیخ رفیق احمد کے ایک لڑکا شفیق احمد تھا جو لاولد فوت ہو گیا۔ صفیہ کے دو لڑکے ہیں۔ مولوی محمد فاضل اور حافظ محمد عاقل دونوں حیات ہیں اور دونوں صاحب اولاد ہیں۔ مولوی فاضل کے دو لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں۔ حافظ محمد عاقل کے تین لڑکے اور چند لڑکیاں ہیں۔“

اس تفصیل سے شیخ اسد علی صاحب کی اولاد یا حجۃ الاسلام آپس میں جو بھائی بہن تھے۔ ان کا شجرہ یہ ہوتا ہے:

شجرہ اولاد شیخ اسد علی صاحب مرحوم

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مسماۃ امینہ بنت نامعلوم الاسم

حجۃ الاسلامؒ کے دادا شیخ غلام شاہ کا ذکر خیر:

حجۃ الاسلامؒ کے دادا شیخ غلام شاہ صاحب کا ذکر خیر بھی ضرورت اور برکت سے خالی نہیں۔ حضرت عارف باللہ نے ان کا ذکر صرف اس قدر فرمایا ہے:

”ان (اسد علی) کے والد شیخ غلام شاہ تھے۔ احقر نے ان کی بھی زیارت کی تھی۔ تھوڑے پڑھے ہوئے تھے مگر ذاکر مشاغل تھے۔ درویشوں کی خدمت کرتے، تعبیر خواب میں مشہور تھے جناب مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم) نے ایام طفلی میں خواب دیکھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ان کے دادا نے یہ تعبیر فرمائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے اور نہایت شہرت ہو گی۔ یہ تعبیر آن کی بہت درست ہوئی۔ اور میری بہن نے خواب میں دیکھا کہ ایک ترازو چھوٹی (جیسے لڑکے کھیلا کرتے ہیں) آسمان سے گری ہے اور اس پر ابابیل جانور سیاہ رنگ کے بہت لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر چھڑاتے ہیں تو چھوٹتے نہیں (یہ) سن کر (مولانا محمد قاسم صاحب کے دادا شیخ غلام شاہ نے) یوں فرمایا کہ قحط ہو گا۔ چنانچہ وہ قحط جس میں باندیاں بک

گئیں واقع ہوا غالباً پانچا کا اس کو کہتے ہیں

(سوانح عارف باللہ صفحہ ۲۰۳)

یہ ہے وہ مختصر سا خاکہ حضرت حجۃ الاسلام کے دادا مرحوم شیخ غلام شاہ صاحب کا یہاں تک شیخ اسد علی صاحب مرحوم سے متعلق معلومات کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد ہم اب آپ کو حضرت حجۃ الاسلام کے شجرہ نسب کی تفصیلات حضرت ابوبکر صدیقؓ تک اور وہاں سے اوپر آدم علیہ السلام تک پیش کرتے ہیں

سلسلہ نسب حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ:

ہم حجۃ الاسلام کے ذکر میں ان کے والد، دادا، والدہ، نانا اور ماموؤں کے ذکر خیر پر مجبور تھے۔ اب ہم حضرت حجۃ الاسلام کا نسب نامہ مکتوبات یعقوبی کے دیباچے سے جس کو عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے ماموں زاد بھائی حکیم دیوان عبدالسمیع کے بیٹے حکیم امیر احمد عشرتی نے تحریر کیا ہے نقل کرتے ہیں جو یہ ہے:

''مولانا محمد قاسم بن شیخ اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین ابن ابوالفتح بن محمد مفتی بن مولوی محمد ہاشم بن شاہ محمد بن قاضی طہ بن مفتی مبارک بن قاضی امان اللہ بن قاضی جمال الدین بن قاضی میران بڈے (بڑے) بن قاضی مظہر الدین۔ قاضی مظہر الدین کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے خواجہ یوسف سے ملتا ہے اور خواجہ یوسف کا چار واسطوں سے شیخ رکن الدین سمرقندی سے اور وہ پوتے ہیں شیخ اسماعیل شہید کے اور وہ بیٹے ہیں شیخ نور الدین قتال کے اور ان کا سلسلہ نسب بارہ واسطوں سے شیخ قاسم سے ملتا ہے اور وہ پوتے ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اول رسول مقبول علیہ السلام کے اور وہ گیارہ واسطوں سے اولاد میں نضر بن کنانہ ملقب بہ قریش کی اور وہ اٹھارہ واسطوں سے اولاد ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اور وہ بیٹے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اور وہ آٹھ واسطوں سے اولاد ہیں حضرت ہود علیہ السلام کی اور وہ چار واسطوں سے اولاد ہیں حضرت نوح علیہ السلام کی اور وہ پوتے ہیں حضرت ادریس علیہ السلام کے اور وہ سات واسطوں سے اولاد ہیں حضرت شیث علیہ السلام کی اور وہ بیٹے ہیں حضرت آدم علیہ

الاسلام کے۔" واللہ اعلم (دیباچہ بیاض یعقوبی صفحہ ۲)

(اس نسب نامے میں قاضی مظہر الدین سے اوپر کو حضرت ابوبکر صدیقؓ تک تمام آباء و اجداد کا نام نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے افراد کا نام درج نہیں ہے۔ لیکن سوانح قاسمی از مولانا گیلانی مرحوم کے حاشئے میں حجۃ الاسلام کی ایک قلمی یادداشت کے حوالے سے جو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں محفوظ چلی آتی ہے۔ لکھا ہے کہ اس میں حجۃ الاسلام نے اپنا نسب نامہ مولوی محمد ہاشم سے اوپر کو اس طرح درج کیا ہے۔ جو کہ مولوی محمد ہاشم سے شروع ہوتا ہے اور وہ حجۃ الاسلام کی آٹھویں پشت میں ہیں:

> "محمد ہاشم بن شیخ شاہ محمد بن قاضی طہٰ بن شیخ مفتی مبارک بن امان اللہ بن جمال الدین ابن قاضی شیخ میراں بڑے بن قاضی مظہر الدین بن نجم الدین بن نورالدین بن حسام الدین بن ضیاء الدین بن نورالدین بن نجم الدین بن نورالدین بن رکن الدین بن رفیع الدین بن ضیاء الدین بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف بن شیخ جلیل بن صدر الدین بن رکن الدین سمرقندی بن صدر الدین حاجی بن اسماعیل شہید بن نورالدین قتال بن شیخ محمود بن بہاء الدین بن عبداللہ ابن زکریا بن شیخ نور بن سراج الدین بن شیخ سادھن صدیقی بن وجیہ الدین بن مسعود بن عبدالرزاق ابن قاسم بن محمد بن ابی بکر (الصدیق) بن ابی قحافہ۔"

حجۃ الاسلام صدیقی النسب شیخ تھے

اس سلسلہ پر نظر ڈالنے سے یہ قطعی اور یقینی نتیجہ نکل آتا ہے کہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب صدیقی النسل شیخ تھے۔ لیکن حجۃ الاسلام ان نسلی امتیازات پر قطعاً فخر نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ نے اپنے آپ کو جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے کہیں اپنی کسی تحریر میں صدیقی نہیں لکھا۔ البتہ اپنے آپ کو شیخ زادہ ضرور لکھا ہے۔ اور وہ بھی عجز و انکساری کے ساتھ۔ چنانچہ اپنے ایک مکتوب بنام پیر جی محمد عارف صاحب میں سر سید مرحوم کے بارے میں عقائد کے متعلق تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اجی حضرت امیروں کے ذہن و عقل و فہم کا ادراک کے ہزاروں گواہ ہوتے ہیں

غریبوں کے فہم وفراست کا کہیں ایک بھی نہیں سنا۔ اس صورت میں کیونکر کہہ دیجئے کہ سید صاحب ایک غریب سے شیخ زادے کی مان جائیں۔" (تصفیۃ العقائد صفحہ ۵)

حجۃ الاسلامؒ کے نسب نامے پر ایک تنقیدی محققانہ نظر:

ہم نے ابھی حجۃ الاسلامؒ کا شجرہ نسب آپ کی شخصیت سے لے کر حضرت آدم علیہ السلام تک پیش کیا ہے۔ یہ نسب نامہ حکیم امیر احمد عشرتی کے دیباچہ مکتوبات یعقوبی سے لیا گیا ہے اس نسب نامے کو یقین کے ساتھ عدنان کے بعد آخر تک درست کہنا صحیح نہیں۔ حکیم امیر احمد صاحب نے مذکورہ بالا شجرہ اپنے خاندانی شجرے سے جو یکے بعد دیگرے چلا آرہا ہے نقل کیا ہے اور بقول محشی سوانح قاسمی مصنفہ گیلانی:

"یہ شجرہ آج کل نانوتے میں منشی اقبال احمد بن منشی ظفر احمد صاحب صدیقی کے یہاں محفوظ ہے۔"

بلکہ یہ شجرہ اب مولانا قاری محمد طیب صاحب نے چھپوا بھی دیا ہے۔ جس کو مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی نے مرتب کیا ہے جو میرے پیش نظر ہے۔

بہر حال حجۃ الاسلامؒ سے ابوبکر صدیقؓ تک اور حضرت صدیقؓ سے اوپر عدنان تک تو نسب نامے کو درست کہا جاسکتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد اور حضرت ابوبکرؓ کے اجداد میں عدنان کا نام آتا ہے اور جیسا کہ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا نسب مبارک بیان فرماتے تو عدنان سے آگے نہ بڑھتے بلکہ یہاں پہنچ کر رک جاتے اور فرماتے:

کذب النسابون

ترجمہ: نسب دانوں نے غلط کہا۔

(طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۲۸)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ نسب دانوں کو عدنان کے بعد تحقیق نہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود بھی پہلے اس آیت کو تلاوت فرماتے:

وعاداً و ثمود والذین من بعدھم لایعلمھم الا اللہ (القرآن)

ترجمہ: عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے ان کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اور بعد ازاں ابن مسعودؓ فرماتے:

کذب النسابون

ترجمہ: نسب دانوں نے جھوٹ کہا۔

یعنی نسب دانوں کا یہ دعویٰ کرنا کہ ہمیں تمام انساب کا علم ہے غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور بس۔

علامہ سہیلی کا قول ہے کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی اپنے یا کسی اور کے سلسلہ نسب کو حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچائے تو کیا یہ درست ہے تو آپ نے اس کو ناپسند فرمایا۔ سائل نے پھر سلسلہ نسب کو حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچانے کے متعلق دریافت کیا تو اس کو بھی امام مالکؒ نے پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا اور فرمایا:

من اخبره به

ترجمہ: اس کو کس نے خبر دی۔

(روض الانف صفحہ ۱۱ جلد ۱)

امام بخاریؒ نے بھی آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا سلسلہ نسب بخاری میں صرف عدنان تک پہنچایا ہے۔ البتہ اپنی تاریخ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام تک بیان کیا ہے اور حدیث و تاریخ میں سند کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ہمارا مقصد اس تحقیق سے صرف یہ ہے کہ حکیم امیر احمد عشرتی نے جو شجرہ اپنے خاندان کا پیش کیا ہے اور حجۃ الاسلامؒ کے جدامجد میراں بڑے سے ابوبکر صدیقؓ تک اور بعد ازاں نضر بن کنانہ تک درج کیا ہے۔ نضر بن کنانہ کے بعد کا شجرہ یہ ہے:

نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان

عدنان کے بعد مذکورہ بالا تحقیق کے مطابق اوپر کی طرف آدم علیہ السلام تک نسب کی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اپنا سلسلہ نسب عدنان تک بیان فرما کر رک جاتے تھے۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے جدامجد قاضی میراں بڈے (بڑے) کی نانوتے میں آمد اور خاندان کی ابتدا

گذشتہ اوراق میں ہم نے حجۃ الاسلامؒ کا جو شجرہ پیش کیا ہے اس میں ان کے اجداد میں قاضی میراں بڑے صاحب چودھویں پشت میں واقع ہوئے ہیں۔ یہی سب سے پہلی شخصیت تھی جو نانوتہ میں سب سے پہلے آکر آباد ہوئی اور صدیقی شیخوں کے خاندان کی بنیاد انہی سے پڑی۔ اس سلسلے میں بھی نہایت مفصل اور مدلل بیان ہمیں حکیم امیر احمد عشرتی مرحوم کا ملتا ہے اس لئے ہم پھر آپ کو مکتوبات یعقوبی کے دیباچے کی طرف لئے چلتے ہیں۔ عشرتی صاحب لکھتے ہیں:

> "عمدۃ الملوک والسلاطین یمین الملک شاہزادہ نظام خان المعروف سلطان سکندر لودی نور اللہ مرقدہ نے حضرت مولوی محمد یعقوب صاحب (اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب) کے اجداد میں سے جناب قاضی مظہر الدین صاحبؒ کو جن کا مزار مبارک جہان آباد میں ہے ۸۷۱ھ میں سمرقند سے طلب فرما کر شرف حضوری بخشا۔ علاوہ دیگر اعزاز ہائے فراواں کے عہدہ قضا جہاں آباد (دہلی) ارزانی فرمایا۔ چونکہ مقام نانوتہ قریباً وسط کاٹھا میں واقع ہے اور یہاں کے اہل ہنوز اقوام راجپوت و گوجر و روڑہ وغیرہم کا بہت جتھا تھا اور یہ لوگ نہایت سخت و سرکش، متعصب بدخواہ مسلمان تھے پس ان لوگوں کی خودسری مٹانے اور اس علاقے کو مطیع و منقاد کرنے کی جہت سے جناب

> قاضی مظہر الدین کے صاحبزادوں میں سے صاحبزادہ قاضی میران بڑے صاحب کو واسطے اقامت وسکونت قصبہ نانوتے کے ارشاد شاہی ہوا اور علاوہ املاک وجاگیرات کے عہدہ قضا وہاں کا مرحمت فرمایا گیا۔"
>
> (دیباچہ مکتوبات یعقوبی صفحہ ۲)

اس عبارت سے واضح ہے کہ نانوتہ میں سب سے پہلے جنہوں نے بود و باش آکر اختیار کی وہ قاضی میراں بڑے تھے۔

اس مقام پر ہم قدرے میراں بڑے صاحب کے متعلق کچھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کو حکیم امیر احمد عشرتی کے شجرے میں میراں بڈے لکھا گیا ہے۔ مفتی محمود احمد صاحب صدیقی نانوتوی مفتی مہو چھاؤنی و رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند نے جو نانوتے کے صدیقیوں کا شجرہ مرتب کیا ہے اور جو حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی ہدایت پر الجمعیۃ پریس دہلی میں سولہ صفحات پر چھپا ہے ہم اس شجرے سے جناب میراں بڑے صاحب اور صدیقی خاندان کے حسب ذیل حالات پیش کرتے ہیں:

> "سب سے پہلے جو صاحب خراسان سے ہندوستان وارد ہوئے وہ قاضی مظہر الدین صاحب ہیں۔ ان کے حالات ہمارے لئے حیز خفا میں ہیں۔ بجز اس کے کہ خراسان سے آپ یہاں قاضی بن کر آئے اور ۸۷۸ھ میں بعہد سلطان بہلول لودھی شاہجہان آباد (دہلی) میں وفات پائی۔
>
> قاضی میراں بڑے ولد قاضی مظہر الدین یہ صدیقی شیخ زادگان نانوتہ کے وہ مورث اعلیٰ ہیں جو نانوتہ میں متوطن ہوئے۔ ان قاضی میراں کا نام میراں ہی ہے۔ صوبہ خراسان میں اس زمانے کے اعیان واشراف میں یہ نام برتا جاتا تھا۔ چنانچہ امیر تیمور کے شاہزادے کا نام میراں شاہ المتوفی ۸۰۶ھ ہے۔ یہ قاضی میراں حافظ قرآن ہونے کے ساتھ بڑے پائے کے علماء وصلحا میں سے ہیں۔ قلمی نسب نامہ سے ان کے ترجمہ (حالات) کے سلسلے میں جستہ جستہ جملے ملاحظہ ہوں:
>
> "صاحب فضل کمال در علوم ظاہری معارف باطنیہ عذیم المثال بودند۔

در کشف و کرامات عدیم المثال و در عبادت و ریاضت مستقیم الاحوال۔
در علوم شرعیہ مجتہد زمان و در معارف باطنیہ سلطان سریر عرفان متصور بودند۔"

غرضیکہ ان کے معارف علمیہ کی خبر پاکر ۸۶۴ھ میں سلطان بہلول لودھی نے آپ کو دعوت دی۔ سلطان نے مراحم خسروانہ سے نوازتے ہوئے فرمان عطا و جاگیر کے ساتھ نانوتے کی قضا و خطابت اس تصریح کے ساتھ نامزد فرمائی کہ قصبہ مذکورہ میں متوطن ہوجائیں۔ سلطان بہلول کے بعد سکندر لودھی نے بھی آپ کو طلب فرماکر فرامین (احکامات) مذکورہ کی تجدید فرمائی۔ قاضی (میراں بڑے) صاحب کا سال ولادت ۸۰۵ھ ہے اور وفات ۱۴/رجب ۹۰۲ھ بعہد سکندر لودھی۔ عمر ستانوے (۹۷) سال ہوئی۔ آپ کی قبر نانوتہ میں بستی کے قریب ہی موجود ہے جو شیخ زادگان کا قدیمی عام قبرستان ہے جس کو بھیکا والا کہا جاتا ہے۔ شیخ بھیکا ولد محمد علی نے تقریباً عہد عالمگیری میں ایک باغ لگایا جس کے اندر یہ مقبرہ واقع ہوگیا تھا۔ باغ کا تو اب نشان نہیں مگر ابھی تک یہ قبرستان بھیکا والا سے موسوم ہے۔

(ذاتی تحقیقات مفتی محمود صاحب) آپ (میراں بڑے) کے پانچ صاحبزادے تھے۔ ۱۔ نظام الدین عرف عباد اللہ۔ ۲۔ عبد الغنی۔ یہ دونوں صاحبان بغرض تحصیل علم پورب کی طرف تشریف لے گئے اور پھر وہیں بس گئے۔ جن کا بکثرت سلسلہ نسب، کڑہ مانک پور و قصارہ و غازی پور زینہ میں موجود ہے سب سے چھوٹے صاحبزادے ۳۔ کمال الدین جو بنگال میں لکھنوتی (اس زمانے میں ڈھاکے کو لکھنوتی بولا جاتا تھا) چلے گئے۔ وہاں کے حالات ان کے کچھ معلوم نہیں۔ ۴۔ قاضی حبیب اللہ۔ ۵۔ شیخ جمال الدین یہ دونوں صاحبزادے نانوتہ میں رہے۔ انہی دونوں کی اولاد کا نانوتہ میں سلسلہ ہے۔ اول الذکر ثانی الذکر سے بڑے تھے۔ اس لئے اپنے والد کے بحیثیت قاضی جانشین ہوئے۔" (شجرہ شیخ زادگان نانوتہ مرتب مفتی محمود صاحب صفحہ۲)

قاضی میراں بڑے کی اولاد پر مصائب کا طوفان:

امیر احمد عشرتی دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

”بعد زوال حکومت لودھیان قاضی میراں بڈے کی اولاد پر مصائب جانکاہ پیش آئے۔ ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ انہیں اقوام ہنود کا ٹھانے جو بوجہ قدیمی تعصب مذہبی کے مسلمانوں سے عموماً اور متوسلان حکومت لودھیان سے خصوصاً خصومت شدید رکھتے تھے اولاد قاضی میراں بڑے کے استیصال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ رکھ چھوڑا۔ یہاں تک کہ صغیر سن بچوں تک کو قتل کر دیا۔ اپنے نزدیک انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا کہ کوئی متنفس بھی کسی وقت میں مدمقابل ہو سکے۔ لیکن قدرت خداوندی اس امر کی مقتضی تھی کہ اولاد قاضی میراں بڈے کا سلسلہ مٹنے نہ پائے کیونکہ اس کو ان سے مولانا محمد یعقوب مرحوم اور مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم وغیرہم جیسی صورتیں جلوہ ظہور میں لانی مقصود تھیں۔

پس ایک عرصہ دراز بعد انقلاب زمانہ نے دوسرا دور پلٹا یعنی شدہ شدہ دور حکومت شاہ اورنگزیب عالمگیر بادشاہ خلد آشیان کا آپہنچا۔ اس وقت میں ایک صاحب نے اولاد قاضی میراں بڈے سے جو نہایت زبردست خوش الحان حافظ قرآن تھے فریادی بن کر لشکر عالمگیر میں پہنچے اور ایک سردار لشکر کے یہاں رہ کر متلاشی وقت رہے اور کسی فرد بشر پر انکشاف نہ فرمایا کہ میں کون ہوں اور کس واسطے آیا ہوں حتی کہ ۱۰۶۸ھ کا مہینہ رجب ختم ہو کر شعبان شروع ہو گیا اس وقت بادشاہ نے سرداران لشکر کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا:

> ”چونکہ رمضان المبارک قریب ہے اور صعوبت سفر شبانہ روز بدستور قائم ہے آئندہ سامان قیام بظاہر معلوم نہیں ہوتا ہم کو نماز تراویح میں کلام مجید کا سننا ضروری امر ہے اس لئے مناسب ہے کہ بہت جلد ایسا حافظ تلاش کیا جائے جو مابدولت کو صرف ایک شب میں کلام مجید کامل سنا دیوے۔“

چنانچہ بغور استماع ارشاد شاہی تلاش شروع ہو گئی باوجودیکہ اس وقت ہزارہا حافظ قرآن موجود تھے لیکن کسی کی ہمت و جرأت نہ ہوئی کہ شاہ عالمگیر کا پیش امام ہو کر ایک شب میں پورا قرآن شریف سنا دیوے۔ یہاں تک کہ شعبان قریب ختم اور رمضان شروع ہونے پر ہوا۔ اس وقت دوبارہ تاکید شدید ہوئی جس سے لشکر میں سخت اضطراب و بے چینی پیدا

ہوئی۔ ہر شخص خائف تھا کہ بوجہ نہ ملنے ایسے حافظ کے دیکھئے کیا عتاب شاہی نازل ہوتا ہے۔ اس حالت سراسیمگی میں جبکہ ۲۸ شعبان ۱۰۶۸ھ کو نواح گوالیار چنبل کے کنارے لشکر عالمگیر پڑا ہوا تھا تو ان حافظ صاحب نے اپنے سردار سے عرض کی کہ آپ اس قدر کیوں پریشان ہیں۔ میں ایک شب کی تراویح میں بادشاہ کو کلام مجید سنا دوں گا۔ آپ اطلاع کر دیجئے کہ حافظ آ گیا ہے۔ چنانچہ یکم تاریخ کو آپ نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ پورا کلام مجید بلا عائد ہوتے متشابہ کے بادشاہ کو سنا دیا۔ بادشاہ نہایت خوش ہوئے اب وہ موقع جس کی حافظ صاحب کو دشمنوں سے انتقام لینے کی تلاش تھی ہاتھ آیا۔ شاہ عالمگیر سے گذشتہ واقعات راجپوتان و گوجران کاٹھا کے ظلم و ستم کا بیان کر کے دادخواہ ہوئے چنانچہ فی الفور بحکم شاہی ایک دستہ فوج ہمراہ حافظ صاحب آیا اور ان سب کا قلع قمع کیا۔“ (دیباچہ مکتوبات یعقوبی صفحہ ۴)

یہ تو حکیم امیر احمد صاحب عشرتی کا بیان ہے لیکن مولانا محمود صاحب مفتی شجرہ مطبوعہ میں حافظ صاحب کا نام اور تاریخی پس منظر جو بیان کرتے ہیں وہ یہ ہے:

”حافظ غلام حسین عہدہ عالمگیری میں بڑی ممتاز شخصیت کے مالک ہیں آخر رمضان ۱۰۶۸ھ میں اورنگزیب اپنی شاہزادگی کے زمانے میں جب دکن سے بعزم دہلی واپس ہوئے تو شاہزادہ داراشکوہ کی جانب سے راجہ جسونت سنگھ وغیرہ امرا نے مزاحمت کی اور بڑے خون خرابہ ہونے کے بعد اورنگزیب کو شاندار فتحیابی نصیب ہوئی۔ پھر براہ رمضان داراشکوہ سے بھنڈ کے قریب چنبل ندی سے گذرتے وقت بہت بڑی جنگ ہو کر اورنگزیب فاتح اور کامیاب ہوا اور اطمینان کا سانس لیا تو رمضان کی ۲۸ تاریخ تھی۔ ارشاد ہوا کہ سفر اور جنگی حالات کی وجہ سے امسال ختم قرآن تراویح نہ ہو سکا اگر یہاں ہمارے لشکر میں کوئی ایسا حافظ ہو جو آج شب میں پورا قرآن ہم کو سنا دے تو یہ حافظ غلام حسین پیش ہوئے اور تعمیل ارشاد میں پورا قرآن سنا کر شاہزادے کی دلی تمنا کو پورا کیا۔ حکم ہوا کہ اپنی کوئی ضرورت ہو تو عرض کرو۔ بتلایا گیا کہ نانوتہ بستی میں وہاں کے مناسب جامع مسجد نہیں اور محلے کے چوک میں ایک بڑے کنویں کی ضرورت ہے۔ فوراً

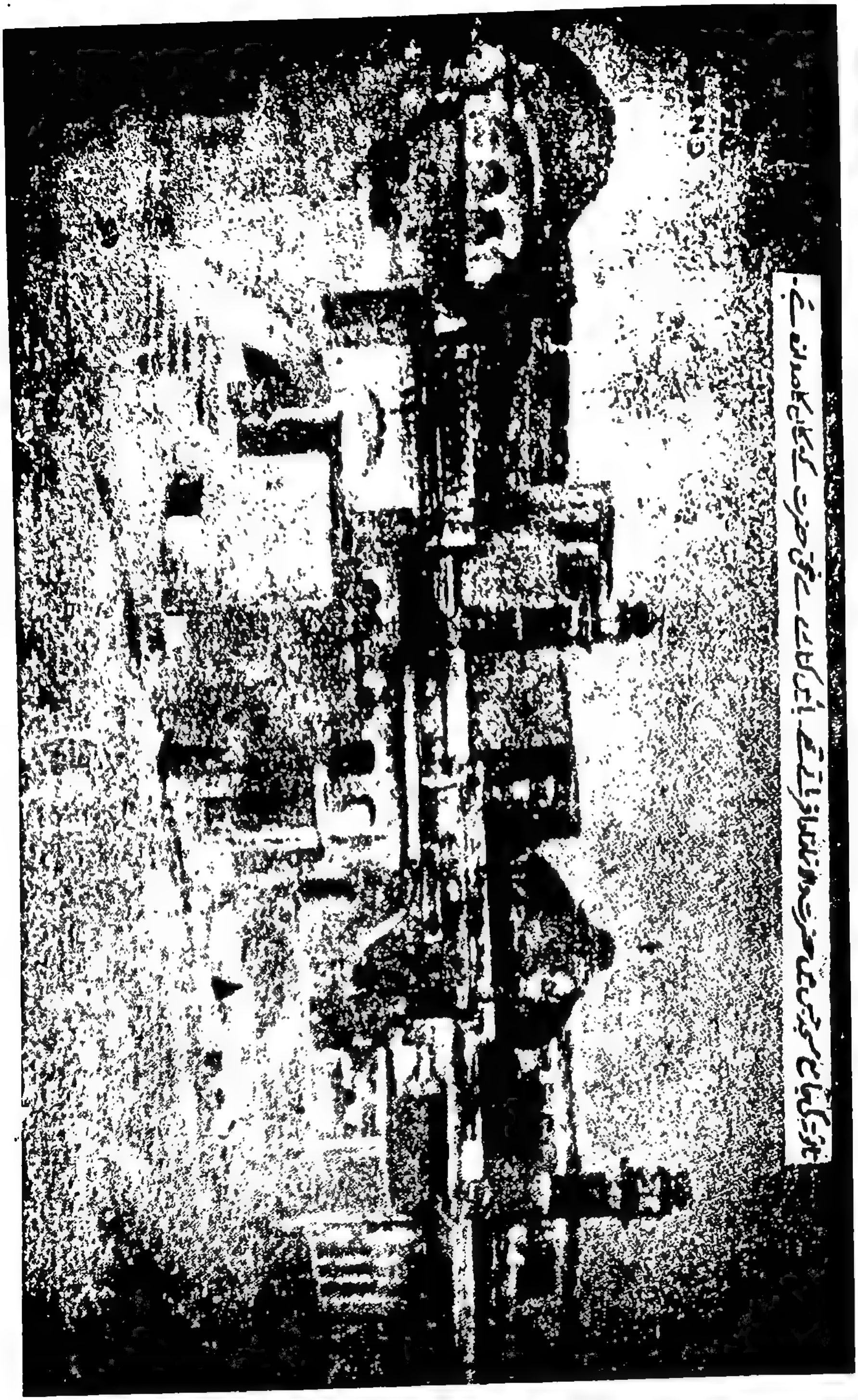

نانوتہ کی جامع مسجد جس میں حضرت والا نماز ادا فرماتے تھے۔ بائیں کنارے سے ملحق
حضرت کے مکان کا دروازہ ہے۔

اس کیلئے احکام جاری ہو گئے۔ خوبصورت جامع مسجد بن گئی بہت شاندار چاہ پختہ تیار ہوا اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ خود حافظ صاحب کیلئے ہماری جانب سے مسجد کے قریب ایک شاندار حویلی بھی تیار ہو۔ مسجد اور کنواں موجود ہیں افسوس کہ پچھلے دنوں وہ تاریخی حویلی نادان وارث عورتوں سے غیروں نے خرید کر اس کے ملبے سے بڑی شاندار جدید انداز کی عمارت بنالی ہے۔ ان حافظ غلام حسین کے صاحبزادے شاہ لطف اللہ جن کی ۱۱۷۳ھ میں بیعنامے پر شہادت دیکھی گئی بڑے صالحین میں سے گذرے ہیں۔“

(شجرہ مطبوعہ الجمعیۃ پریس مرتبہ مفتی محمود نانوتوی صفحہ ۴)

حکیم امیر احمد کے بیان سے مولانا مفتی محمود صاحب کا یہ بیان نہایت مضبوط قابل قبول اور مستند ہے۔ حکیم صاحب کے بیان میں اجمال ہے اور مفتی صاحب کے بیان میں تفصیل ہے۔ حکیم صاحب کے بیان میں حافظ صاحب کا نام نہیں۔ لیکن مفتی صاحب کے بیان میں حافظ صاحب کا نام، تاریخی پس منظر، رمضان کی ۲۸ تاریخ کی آمد، عالمگیرؒ کا تراویح کیلئے اضطراب نیز سن ہجری سب کچھ ہے۔ حکیم صاحب کے بیان میں شاہ عالمگیر سے حافظ صاحب کا امداد طلب کرنا اور راجپوتوں کے مقابلے میں ان کے ظلم و ستم کے خلاف دادخواہی کا ذکر ہے اور مفتی صاحب کی تحقیق میں جامع مسجد اور کنویں کی خواہش کا اظہار ہے ہوسکتا ہے دونوں ہی باتیں ہوں۔ البتہ جامع مسجد، کنواں اور حویلی جو حافظ صاحب کو بنوا کر دی گئی نہایت ہی مستند ثبوت ہیں۔

حجۃ الاسلام کے بعض خاندانی ہم زمانہ علمائے جلیل القدر:

ہم حجۃ الاسلامؒ کے خاندان کے سلسلے میں قارئین کیلئے معلومات فراہم کر رہے تھے۔ چنانچہ گذشتہ صفحات اور سطور میں حجۃ الاسلام کے خاندانی متقدمین علماء، صلحاء، مفتی اور قاضی بزرگوں کا ذکر بھی آچکا ہے۔ لیکن آپ کے خاندانی بھائیوں میں بعض ایسی عظیم المرتبہ ہم زمانہ ہستیاں بھی ہیں جن کا ذکر اس مقام پر معلومات میں اضافے کا سبب ہوگا۔ یہ سب حضرات حجۃ الاسلام کے ہم زمانہ ہیں۔ چنانچہ ان میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی سابق صدر مدرس و شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور متوفی ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ مولانا محمد احسن

صاحب احسن نانوتویؒ متوفی ۱۳۱۲ھ مصنف احسن القواعد و سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج بریلی برادر خرد مولانا محمد مظہر صاحبؒ اور مولانا محمد منیرؒ صاحب نانوتویؒ ہیڈ مولوی گورنمنٹ سکول و پروفیسر بریلی کالج مصنف سراج السالکین برادر خورد مولانا محمد مظہرؒ صاحب۔ یہ تینوں بھائی حقیقی ہیں اور ایک سے بڑھ کر عالم، متقی اور صاحب فضیلت۔

ان کے علاوہ حجۃ الاسلام کے خاندانی ہم عصر بھائیوں میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نانوتوی اولین صدر مدرس و شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کی ہستی ہے۔ ہم انہی کی ذات کو عارف باللہ لکھتے چلے آتے ہیں۔ آپ حجۃ الاسلام کے نہ صرف خاندانی رشتے کے بھائی تھے۔ بلکہ آپ کے ہم زلف، استاد بھائی، استاد زادہ، پیر بھائی اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ صدر شعبہ علوم شرقیہ دہلی کالج کے فرزند ارجمند اور ولی کامل تھے۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد ہم بیاض یعقوبی کے دیباچے سے جو حکیم امیر احمدؒ عشرتی نانوتوی نے تحریر کیا ہے ایک ایسا شجرہ پیش کرتے ہیں جس سے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کا مذکورہ بالا ہستیوں سے خاندانی تعلق ظاہر ہو سکے۔

نیچے کی طرف سلسلہ نصب از قاضی میراں بڑے صاحب تا:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ، مولانا محمد منیر صاحب و تا مولانا محمد احسن صاحبؒ۔ قاضی میراں بڑے والد قاضی جمال الدین والد قاضی امان اللہ والد مفتی مبارک والد قاضی طٰہٰ والد شاہ محمد والد مولوی محمد ہاشم والد شیخ محمد مفتی والد

اس شجرے سے قاری کو خاندانی رشتہ داری کا ایک گونہ گو اندازہ ہو جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بھانجے اور مولانا مملوک علی صاحب کے نواسے ہوتے ہیں۔ اب ہم ان حضرات کے کچھ حالات پیش کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان کے حالات سوانح قاسمی کے اجزاء ہیں۔

سہ دری جامع مسجد نانوتہ میں حضرت والا کا حجرہ جس میں مذاکرات علمیہ وتدریس ہوتی تھی۔

ذکرِ خیر حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے قریب کے رشتہ دار ہم جد خاندانی تائے زاد بھائیوں میں جیسا کہ مذکورہ شجرے میں بتایا گیا ہے حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ، مولانا محمد احسن صاحب اور مولانا محمد منیر صاحبؒ تینوں علی الترتیب ایک دوسرے سے عمر میں بڑے ہیں اور تینوں حقیقی بھائی ہیں اور تینوں حجۃ الاسلام سے عمر میں بڑے ہیں۔ ان کے والد حافظ لطف اللہ صاحب بڑے ہی خوش نصیب انسان تھے کہ خود تو حافظ تھے ہی لیکن تینوں بیٹے بھی عالم، فاضل، حافظ، حاجی، زاہد و عابد، مصنف اور صاحبان عزت و وجاہت تھے۔

ان تینوں بھائیوں میں مولانا محمد مظہرؒ صاحب سب سے بڑے تھے۔ آپ نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نانوتے کے مکتب میں حاصل کی، قرآن کریم پڑھا اور حفظ کیا۔ پھر دہلی میں مولانا مملوک علی صاحبؒ نانوتوی سے علوم وفنون کی کتابیں اور حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سہارنپوری محدث اور حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ بن شاہ ابوسعید صاحبؒ دہلوی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ مفتی صدر الدینؒ آزردہ دہلوی اور مولانا رشید الدین صاحبؒ شاگرد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بھی بعض فنون کی کتابیں پڑھی ہیں۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب متوفی ۱۲۶۲ھ نواسہ حقیقی شاہ عبدالعزیزؒ سے بخاری شریف پڑھی۔

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد پڑھانے میں مصروف ہوگئے۔ اجمیر اور آگرے کے کالجوں میں پروفیسر رہے، جب ۱۸۵۷ء کی تحریک جنگ آزادی کا علم بلند ہوا تو ملازمت ترک کر کے جہاد میں شریک ہوگئے۔ تھانہ بھون اور شاملی کے جہاد میں امداد اللہ صاحبؒ کی امارت میں حضرت حجۃ الاسلام کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو روپوش ہوگئے اور روپوشی کے اثنا میں علمی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی پر عام

معافی کا اعلان ہوا تو کھل کر علمی امور میں حصہ لینے لگے۔

(انوار العارفین مصنفہ مولانا محمد حسین صاحب مراد آبادی)

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے مزید حالات معلوم کرنے کا مجھے بہت احساس تھا۔ اس لئے راقم الحروف نے اس سلسلے میں موجودہ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کو ایک عریضہ لکھا۔ آپ نے جواب میں حسب ذیل گرامی نامہ میرے نام ارسال فرمایا:

مکتوب گرامی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی بنام راقم الحروف انوار الحسن۔

> ”عنایت فرمائم سلمہ بعد سلام مسنون!
>
> عنایت نامہ پہنچا۔ یہ ناکارہ مختلف امراض بالخصوص ضعف بصر کا شکار ہے لوگ نزول آب بتاتے ہیں اس لئے تتبع کتب سے معذوری ہے۔ مظاہر العلوم کی بنیاد حضرت مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپور مشہور عالم نے یکم رجب ۱۲۸۳ھ میں رکھی اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہ یکم شوال (۱۲۸۳ھ) کو صدر مدرس بنا کر بلائے گئے مظاہر العلوم کی ابتدا میں تو شرکت نہیں لیکن مکتب کو مدرسہ بنانا حضرت نور اللہ مرقدہ ہی کے نامہ اعمال میں ہے۔ حضرت کا وصال ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ میں مغرب کے بعد ہوا ہے۔ تاریخ ولادت تو معلوم نہیں لیکن وفات کے وقت تقریباً ۷۰ سال کی عمر معروف ہے۔ مولانا کے مختصر حالات اس ناکارہ نے موطا مالک کی شرح ”اوجز السالک“ کے مقدمے میں لکھے ہیں۔ وہاں مدارس عربیہ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ دل چاہے تو ملاحظہ فرمالیں۔ مولانا محمد احسن صاحب کا انتقال رمضان ۱۳۱۲ھ میں ہوا ہے۔ مولانا محمد منیر صاحب کا مدفن نانوتہ میں ہے۔ ان سب حضرات کے مختصر حالات مکتوبات حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہ کے حصہ اول کے شروع کے ٹائٹل پر لکھے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلے میں قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اور حافظ عبد السلام صاحب متصل جامع مسجد قصبہ نانوتہ

ضلع سہارنپور سے معلومات زیادہ حاصل ہوسکیں گی۔ حافظ صاحب نانوتے کے اکابر سے کچھ تحقیقات کر کے لکھ سکیں گے۔ گرامی نامہ پر تاریخ روانگی ہونی چاہئے تھی تاکہ معلوم ہو کب کا چلا ہوا ہے۔ پاکستان کے خطوط میں بعض مرتبہ بہت تاخیر ہو جاتی ہے۔

فقط والسلام

محمد زکریا ۱۵ر رجب ۱۳۸۴ھ“

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی کے اس مکتوب میں ”اوجز المسالک“ شرح موطا امام مالکؒ کا حوالہ ہے۔ چنانچہ مجھے لائل پور سے یہ شرح دستیاب ہوگئی۔ اس میں مولانا محمد مظہر صاحب کے حالات مقدمہ ”اوجز المسالک“ میں مولانا محمد زکریا صاحب نے جو تحریر فرمائے ہیں وہ یہ ہیں:

اما الشیخ محمد مظہرؒ فھو ابن الشیخ لطف علی بن الحافظ محمد حسن بن غلام شرف الطبیب الاتی فی ترجمة مولانا مملوک علیؒ قدس سرہ وھو الامام الزکی العارف باللہ الفقیہ المحدث اخذ العلوم من الشیخ الاجل استاذ المشائخ الکرام مولانا مملوک علیؒ النانوتوی و مولانا الشیخ صدر الدینؒ صدر الصدور فی الدھنی و مولانا الشیخ رشید الدینؒ الدھلوی وقرء بعض کتب الحدیث علی المحدث الأکبر الشیخ الاجل الشھیر فی الافاق مولانا الشاہ محمد اسحاقؒ و کان وجع الخلائق فی الفقہ متجراً فاضلاً کاملاً اماما جامعا للعلوم الشرعیة والعقلیة واللغویة وولی ریاسة التدریس بالمدرسة العالیة مظاھر العلوم لبسھارنپور من اول بناء المدرسة وکانؒ قبل ذالک مصححاً فی مطبعة تو لکشور واخذ عنہ الکثیرون الفقہ والاصول والکلام والنحو والاعراب و المعانی و المنطق و من مفاخرہ ان الشیخ العلامہ بحر العلوم النانوتوی اخذ عنہ بعض الکتب الابتدائیة و

تحلی باجازة السلوک و الارشاد عن قطب العالم المحدث الگنگوهی قدس الله سره العزیز. و کان تلاءً للقران و کان الغالب علی السانه ورد اسم الذات و کان یحتر زمین التکلفات الباردة سیما عن استعمال الشمسیة و کان یقال فی شانه انه صدیقی نسبا و فاروقی خلقا و سیفی کرة نصر بالرعب قلما یجتری احد بالتکلم فی حضرته و کان من زهاد العلماء و کبار الصالحین من ائمة الفقة والحدیث السلوک والعلوم الالیة و کان جامعاً بین العلوم والفنون و کان یهتم باستعمال الطیب عند تلاوة القران فی التراویح توفی بعد المغرب لیلة اربع و عشرین من ذی الحجة سنة اثنین و ثلثمائة بعد الف و کان اذذاک قریبا من سبعین سنة علی ما افاده خلص خدامہؒ و کانؒ فی مرض وصاله یمس جبینه بیده مراراً یتتبع عرقه علامة موت المومن حتی اذا قرب وصاله عرق جبینه فاستنار اساریر وجهه سروراً بذالک نور الله مرقده و برد مضجعه و کان له اخوان الشیخ محمد احسن مولف احسن المسائل فی ترجمة کنز الدقائق و الشیخ المنیر.

(مقدمہ ”اوجز المسالک“ شرح موطاء امام مالک از مولانا محمد زکریا صاحب صفحہ ۴۴)

ترجمہ: لیکن شیخ محمد مظہر تو وہ ہیں ابن شیخ لطف علیؒ بن حافظ محمد حسن بن غلام شرف طبیب جن کا ذکر مولانا مملوک علی قدس سرہ کے بیان میں آئے گا۔ اور وہ (مولانا محمد مظہر) امام، زکی، عارف باللہ، فقیہ اور محدث تھے۔ انہوں نے شیخ بزرگ، مشائخ کرام کے استاد مولانا مملوک علیؒ صاحب نانوتوی اور مولانا شیخ صدر الدینؒ دہلی کے صدر الصدور اور مولانا شیخ رشید الدین دہلویؒ سے علم حاصل کیا۔ اور بعض حدیث کی کتابیں محدث اکبر دنیا میں مشہور شاہ محمد اسحاقؒ سے پڑھیں۔ مولانا محمد مظہر صاحبؒ فقہ میں مرجع خلائق تھے اور بڑے عالم، فاضل، کامل، امام تھے۔ علوم شرعیہ اور عقلیہ اور ادب کے جامع

تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے ابتدائے اجراء سے صدر مدرس رہے اور اس سے پہلے مطبع نولکشور (لکھنو) میں بحیثیت مصحح (کتابوں کی تصحیح کرنے کی ڈیوٹی پر مقرر) تھے۔ اور ان سے بہت سے لوگوں نے فقہ، اصول فقہ اور کلام، نحو، اعراب، معانی و منطق کے علوم پڑھے اور اِن کے لئے قابل فخر امور میں سے یہ ہے کہ شیخ علامہ، بحر العلوم (مولانا محمد قاسمؒ) نانوتوی نے ان سے بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں اور سلوک اور ارشاد کی اجازت قطب عالم محدث گنگوہی قدس اللہ سرہ سے حاصل کی۔ اور قرآن کی بہت تلاوت کیا کرتے تھے۔ اور ان کی زبان پر اسم ذات کا وظیفہ چھایا ہوا تھا اور مولانا مظہرؒ فضول کے تکلفات سے بہت پرہیز کرتے تھے بالخصوص چھتری کے استعمال سے اور ان کی شان میں یہ کہا جایا کرتا تھا کہ وہ نسب میں صدیقی اور اخلاق میں فاروقی تھے اور حملہ آوری میں سیفی تھے۔ بہت بارعب تھے۔ ان کے سامنے کم ہی کوئی شخص کلام کرنے کی جرأت کرتا تھا۔ بڑے زاہد عالم اور بڑے صالح، فقہ، حدیث، تصوف اور علوم عقلیہ کے امام تھے۔ اور علوم (عقلیہ ونقلیہ) کے جامع تھے اور تراویح میں قرآن کریم کی تلاوت کے مواقع پر خوشبو کے استعمال کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔ ۲۴/ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ میں بعد نماز مغرب وفات پائی۔ اس وقت (مولانا مظہر صاحبؒ کی عمر) تقریباً ستر برس کی تھی۔ جیسا کہ ان کے مخلص خادموں نے کہا ہے اور مرض وفات میں بار بار اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھتے تھے۔ ان کا پسینہ مسلسل جاری تھا جو کہ مومن کی موت کی نشانی ہے تا آنکہ جب ان کے وصال کا وقت قریب ہوا تو ان کی پیشانی پسینہ پسینہ ہوگئی اور ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ۔ اور ان کے بھائی تھے جن میں ایک شیخ محمد احسن تھے جن کا احسن المسائل ترجمہ کنز الدقائق ہے اور دوسرے بھائی شیخ منیر تھے۔

(مقدمہ اوجز المسالک صفحہ ۴۳)

یہ ہیں وہ حالات جو ہمیں اوجز المسالک سے حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے دستیاب ہوئے ہیں۔ بہر حال مولانا اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم تھے۔ آغاز مدرسہ مظاہر

العلوم سے مدرسے کے صدر مدرس رہے اور آپ کے ہی کے نام پر اس مدرسے کا نام مظاہر العلوم ہوا۔ اور آپ ہی کی کوششوں سے یہ مکتب ایک بڑا مدرسہ بن گیا جہاں آپ آخر تک صدر مدرس رہے۔

آپ کا سلسلہ بیعت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے تھا، بہت متقی تھے۔ آپ کے تقوے کی یہ بڑی سند ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی تو اول اینٹ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ محدث سہارنپوری نے اور بعد ازاں مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اور پھر مولانا محمد مظہر صاحبؒ سے بھی ایک اینٹ رکھائی گئی۔ (روئداد دارالعلوم دیوبند) آپ نے سلوک کے مراتب اور روحانی فیوض مولانا گنگوہی سے حاصل کئے۔ اگرچہ حضرت گنگوہی سے عمر میں بڑے تھے لیکن جب حضرت گنگوہی سے گنگوہ ملنے جاتے تو بے اختیار ان کے قدموں پر بوسہ دے کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے۔ (تذکرۃ الخلیل صفحہ ۳۵) مولانا محمد مظہر صاحب دنیا سے لاولد تشریف لے گئے۔ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۶ء کو بعد نماز مغرب وفات پائی اور سہارنپور ہی میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی

مولانا محمد مظہر صاحبؒ کے دوسرے منجھلے بھائی مولانا محمد احسن صاحب تھے۔ مولانا محمد حسین صاحب مرادآبادی اپنی کتاب انوار العارفین میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولوی محمد احسن حافظ قرآن و واعظ فرشتہ بیان و عالم فروع و اصول تھے۔ علم معانی و کلام میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ مفسر کلام اللہ و محدث حدیث رسول اللہ ﷺ اور جامع جمیع علوم ہوئے۔ آپ نے احیاء العلوم کا ترجمہ کیا تھا۔ دہلی کالج میں عربی علوم کی تکمیل کے بعد بنارس کالج میں مدرس اول مقرر ہوئے تھے۔ چار سال وہاں رہے۔ اس کے بعد بریلی چلے گئے اور بریلی کالج میں شعبہ عربی و فارسی کے صدر مقرر کر دیئے گئے۔ مولانا محمد احسن علمی سرگرمیوں کے قائل تھے وہ عملی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے گریز کرتے تھے۔ چنانچہ جنگ آزادی کے بعد انہوں نے اپنے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر کے ساتھ شریک ہو کر علمی مشاغل میں پُر جوش حصہ لیا۔''

تصنیفات:

آپ بھی حافظ قرآن تھے اور حج سے مشرف ہوئے تھے۔ اور اپنے زمانے کے تلبد ذی استعداد عالم و فاضل اور مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد تھے۔ کتابیں تصنیف کرنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ آپ کے علمی کارناموں میں حسب ذیل یادگاریں ہیں:

۱۔ ''سلک مردارید'' ترجمہ اردو ''عقد الجید'' مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی۔

۲۔ ''کشاف'' ترجمہ اردو ''انصاف'' مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ۔

۳۔ ''احسن القواعد'' مشہور فارسی گرامر جو اپنے نام کے ساتھ معنون کی اور اسی کتاب کی وجہ سے زیادہ شہرت پائی۔

۴۔ فقہ کی مشہور کتاب ''درمختار'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

۵۔ ''خیر متین'' اردو ترجمہ حصن حصین وظائف کی مشہور کتاب۔

۶۔ ''مفید الطالبین'' عربی ادب کی ابتدائی کتاب جو مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی رہی۔

۷۔ ترجمہ اردو ''احیاء العلوم'' مصنفہ امام غزالیؒ۔

یہ ہیں آپ کے تصنیفی کارنامے جن سے آپ کا علمی ذوق اور تصنیفی شوق کا پتہ چلتا ہے آپ نے بریلی میں مطبع صدیقیہ قائم کیا۔ صدیقی ہونے کے باعث ''صدیقیہ مطبع'' نام رکھا۔ آپ نے بریلی میں ایک عربی مدرسہ بھی مصباح التہذیب کے نام سے جاری کیا جس کا نام بعد میں مصباح العلوم رکھ دیا گیا تھا۔

آپ کی پیدائش نانوتے میں ہوئی لیکن وفات رمضان ۱۳۱۲ھ میں دیوبند میں ہوئی۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے قبرستان میں آپ کی قبر کے قریب دیوبند میں دفن ہیں۔ مولانا محمد احسن صاحب دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے ہیں اور آپ کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر صاحب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے ہیں۔ چونکہ نانوتے میں علاج کا کوئی خاص ذریعہ نہ تھا اس لئے علاج کیلئے دیوبند اپنے بھائی کے پاس آئے ہوں گے اور چونکہ یہیں انکا انتقال ہوگیا اس لئے دیوبند ہی دفن کردئے گئے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب والد محترم علامہ شبیر احمد عثمانی نے مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قطعۂ تاریخ وفات میں ان کی قبر کا نشان اس طرح دیا ہے مولانا ذوالفقار علی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایمان نجسپ آسودہ تر مابین دو یاران خویش
قاسم بزم مودت احسن شائستہ خو

راقم الحروف نے ان کی قبر کی زیارت کی ہے۔ آپ کے لڑکے کا نام مولوی حافظ محمد اسماعیل صاحب تھا جو ضلع میرٹھ میں قانون گو تھے۔

مولانا محمد منیر صاحبؒ نانوتوی

مولانا منیر صاحبؒ نانوتوی بھی مولانا محمد مظہر صاحبؒ اور مولانا محمد احسنؒ صاحب کے چھوٹے بھائی تھے اور حجۃ الاسلام کے ہم جد تھے۔ مولانا محمد منیر صاحبؒ نے بھی مولانا مملوک علی صاحبؒ، مولانا احمد علی صاحبؒ اور شاہ عبدالغنی صاحبؒ محدث دہلوی سے تعلیم پائی تھی۔ قرآن کریم کے بھی حافظ تھے۔ حج بھی کیا تھا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے صرف ایک سال بڑے تھے۔ کیونکہ مولانا محمد منیر صاحبؒ ۱۲۴۷ھ میں بمقام نانوتہ پیدا ہوئے اور حجۃ الاسلام ۱۲۴۸ھ میں آپ بڑے فاضل و عالم تھے۔ آپ نے تعلیم سے فراغت کے بعد پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور گورنمنٹ سکولوں میں ہیڈ مولوی رہے۔

ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا محمد منیر صاحب نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر کا ساتھ دیا۔ آپ مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب شاملی ضلع مظفر نگر میں علم جہاد بلند ہوا تو حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے مولانا محمد منیر صاحب کو اسی فوج کے دستے میں رکھا جس کے امیر الجیش مولانا محمد قاسم صاحبؒ تھے۔ حاجی صاحب امیر جہاد کو چونکہ حجۃ الاسلام سے بہت محبت تھی اس لئے مولانا محمد منیر کے فرائض منصبی میں یہ فریضہ بھی تھا کہ آپ مولانا محمد قاسم صاحب کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کیونکہ مولانا محمد قاسم صاحب جوش جہاد میں خطروں کے اندر گھس جاتے اور جان کی پروانہ کرتے تھے حاجی صاحب کے الفاظ یہ تھے کہ

> ''ان کو کبھی تنہا نہ چھوڑنا اور اچھی طرح خبر گیری کرنا کیوں کہ انہیں خود اپنی جان کا خیال نہیں رہتا۔''

چنانچہ ایک طرف وہ جہاد میں سرگرم تھے تو دوسری طرف مولانا محمد قاسم صاحب کی

حفاظت ونگرانی پر۔ ایک دفعہ مولانا محمد منیر صاحب ان کی خاطر سخت خطرے میں گھر گئے لیکن اس جرأت و دلیری سے کام لیا کہ اپنے آپ کو اور مولانا کو صاف بچا کر نکال لائے۔ کئی مرتبہ مولانا محمد منیر صاحب زخمی بھی ہوئے لیکن نہایت مردانگی سے مقابلہ کیا۔ شاملی میں جب مجاہدین کو شکست ہوگئی تو مولانا محمد منیر صاحب بھی اپنے بھائی مولانا محمد مظہر صاحبؒ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ساتھ ادھر ادھر پھرتے رہے اور حکومت کے ہاتھ نہ آئے۔ آخر ۱۸۶۱ء میں بریلی چلے گئے اور وہاں بقول امیر احمد صاحب عشرتی نانوتوی گورنمنٹ سکول میں ہیڈ مولوی ہوگئے اور انوار العارفین کے مصنف مولانا محمد حسین صاحب مرادآبادی کے قول کے مطابق بریلی کے کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ چونکہ آپ کے بھائی مولانا محمد احسن صاحب نے جہاد آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا اور وہ بریلی کالج میں پروفیسر تھے اس لئے غالباً انہی کی کوشش سے ان کو بھی بریلی کالج میں ملازمت مل گئی تھی۔ علاوہ ازیں مولانا محمد احسن صاحب کے مدرسہ ”مصباح التہذیب“ کی ترقی میں بھی اپنے بھائی کے معاون بن گئے جس کا نام بعد میں ”مصباح العلوم“ ہوگیا تھا اور جو دونوں کی یادگار ہے۔ مطبع صدیقی جو بریلی میں مولانا محمد احسن صاحبؒ نے جاری کیا تھا اس میں بھی بھائی کے معاون رہے۔ آپ بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں ایک سراج السالکین ہے۔ آپ کے صاحبزادے حافظ محبوب الرحمٰن تھے۔

دار العلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے:

مولانا محمد منیر صاحبؒ کو یہ شرف بھی حاصل رہا ہے کہ آپ ۱۳۱۲ھ میں جبکہ دار العلوم دیوبند کے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی تھے ایک سال تک مہتمم دیوبند رہے ہیں غالباً اسی ۱۳۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا کیونکہ دار العلوم دیوبند کی روئداد میں ۱۳۱۱ھ کے بعد آپ مہتمم نہیں نظر آتے بلکہ آپ کے بعد ۱۳۱۲ھ میں مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ بن مولانا محمد قاسم صاحبؒ مہتمم بنادیئے گئے تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ

آپ مولانا مملوک علی صاحبؒ کے فرزند ارجمند ہیں۔ جو ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں اپنے والد محترم سے تعلیم حاصل کی، درس نظامی پورا کیا۔ حدیث شاہ عبدالغنی صاحبؒ دہلوی سے پڑھی۔ بعد ازاں اولاً آپ اجمیر شریف میں تیس روپیہ کے ملازم ہو کر تشریف لے گئے۔ اجمیر کے پرنسپل نے کہا کہ مولوی تو بہت اچھا ہے لیکن کم عمر ہے آپ کی ذہانت کے پیش نظر اجمیر کے پرنسپل نے آپ کو خبر کئے بغیر ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کی سفارش کر کے یہ منصب دلایا۔ لیکن آپ نے اس ملازمت کو قبول نہیں فرمایا بعد ازاں آپ سو روپیہ ماہوار پر بنارس بھیجے گئے۔ وہاں سے پھر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر محکمہ تعلیم بن کر سہارن پور تشریف لے آئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء شروع ہو گیا۔ اس عرصہ میں نانوتہ رہے۔ گورنمنٹ نے چھ ماہ کی تنخواہ نو سو روپیہ بھیجی لیکن آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نے اس عرصے میں کام نہیں کیا ہے۔ پھر ملازمت پر بلایا گیا تو اس سے بھی بے پروائی ظاہر فرمائی۔ بالآخر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند کی صدر مدرسی کیلئے چالیس روپیہ ماہوار پر دیوبند بلا لیا۔ اس عرصے میں مختلف مقامات سے اعلیٰ ملازمتوں کی بڑی بڑی تنخواہوں پر پیش کش کی گئی لیکن قبول نہ فرمائی اور وفات تک دیوبند سے متعلق رہے۔ (دیباچہ مکتوبات یعقوبی از امیر احمد عشرتی صاحب)

آپ اپنے زمانے کے بہت بڑے اولیاء اور علماء میں سے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے تعلقات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”اور حقیر کے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب کے (علاوہ قرب نسب) بہت سے روابط اتحاد تھے۔ ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن، ایک نسب ہم زلف ہوئے، ایک استاد سے

ایک وقت میں علم حاصل کیا۔ اور بعض کتابیں میں نے مولانا (محمد قاسم) سے پڑھیں۔
ایک پیر (حاجی امداد اللہ صاحب) کے مرید ہوئے۔ ہم سفر دو سفر حج کے رہے اور ایک
زمانہ دراز تک ساتھ رہے۔"

(سوانح قاسمی مصنفہ مولانا محمد یعقوب صاحب صفحہ ۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ پہلا ایڈیشن)

آپ بلند پایہ محدث، بلند مقام فقیہ، حاذق حکیم اور بہت بڑے عارف باللہ، سالک و مجذوب ولی اور صاحب کشف تھے۔ بروایت علامہ شبیر احمد عثمانی رمضان شریف کی تعطیل میں دیوبند سے نانوتے تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اب دیوبند آنا نہ ہوگا۔ چھٹیاں ختم ہو گئیں اگلے روز دیوبند کی تیاری تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے موذن سے فرمانے لگے کہ ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ دیوبند کی واپسی نہ ہوگی۔ اب ہم کل کو دیوبند جا رہے ہیں۔ یہ فرما کر گھر پہنچے۔ لڑکی نے کہا کہ پڑوس سے لڈو آئے ہیں اور پیش کئے۔ بس کھانا تھا کہ ہیضہ ہوا اور ۳ ربیع الاول کی شب میں ۱۳۰۲ھ کو دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ کی قبر نانوتے میں سہارنپور کو جانے والی سڑک کے کنارے شمال کی جانب ہے۔

۱۔ آپ کی یادگاروں میں ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اپنے مرید منشی محمد قاسم صاحب نیانگری کو تحریر فرمائے ہیں۔ جن میں تصوف اور دیگر علوم کا خزینہ چھپا ہوا ہے اور جو مکتوبات یعقوبی کے نام سے اشرف المطابع تھانہ بھون میں ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ ایک ہزار کی تعداد میں چھپی تھی اور اب نایاب ہے۔ یہ مکتوبات ستر کی تعداد میں ہیں۔ آخر میں آپ کی بیاض ہے جس میں مختلف تاریخی نوٹس، تعویذ، نقش، وظیفے اور بہت سے نادر نسخے ہیں۔ اسی کے اول میں حکیم امیر احمد عشرتی کا دیباچہ ہے۔ مکتوبات اور بیاض کا یہ نسخہ ۲۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ علاوہ ازیں آپ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی مختصر سوانح عمری بنام سوانح قاسمی تحریر فرمائی ہے جو مطبع مجتبائی دہلی میں چھپی۔ یہ آپ نے امت مسلمہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اگرچہ کتاب مختصر ہے لیکن معلومات سے پُر ہے۔

۳۔ آپ نے ضیاء القلوب مولفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا ترجمہ بھی عربی میں کیا

تھا لیکن چھپ نہ سکا اور ضائع ہو گیا۔ جیسا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے اپنے ملفوظات افاضات یومیہ میں فرمایا ہے۔

تلامیذ:

امیر احمد صاحب عشرتی کے دیباچے اور دار العلوم دیوبند کی روئداد اور اپنے ذاتی علم کی بنا پر یہ حقیقت پیش کی جاتی ہے کہ آپ کے شاگرد یوں تو پنجاب، پشاور، یوپی وغیرہ میں بہت سے ہیں۔ لیکن مشہور شاگردوں میں جنہوں نے دار العلوم دیوبند میں تعلیم پائی خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا، مولانا احمد حسن صاحب امروہویؒ، مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ہیں اور آپ کے پیرو مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ تھانوی ثم مہاجر مکی ہیں۔ آپ کے حالات میں ہم نے مستقل سوانح تحریر کی ہے، جو اگر خدائے تعالیٰ کو منظور ہوا تو کسی وقت طبع ہوگی۔

نکاح اول:

آپ کی پہلی شادی محترمہ عمدۃ النسا بنت شیخ کرامت حسین دیوبندی سے شعبان ۱۲۶۶ھ میں بعوض پانچ سو روپیہ مہر ہوئی۔ جن سے معین الدین، قطب الدین، علاء الدین، جلال الدین، فاطمہ اور خدیجہ پیدا ہوئے۔ نکاح سے چھبیس سال بعد تک زندہ رہیں اور نکاح کے وقت ان کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ بایں حساب تینتالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مرحومہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی سالی تھیں۔

نکاح ثانی:

آپ کا دوسرا نکاح ۱۲۹۳ھ میں محترمہ بی بی اکرامن ساکنہ انبیہٹہ بیوہ منشی عبدالحق پسر مولوی محمد صابر دیوبندی سے بروز شنبہ بعوض مہر فاطمی (۱۵۰) روپیہ بوقت صبح انبیہٹہ میں ہوا۔ ان سے بڑی لڑکی مسمات برکت دو سال کی ہو کر وفات پا گئی۔ ایک لڑکا ہمراہ ہی انتقال کر گیا جس کا نام فرید الدین تھا۔ ایک لڑکی ام سلمہ تھی۔ بی بی اکرامن کا انتقال بمرض ہیضہ

۱۴/ ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ کو ہوا۔ اسی رات فرید الدین کا انتقال ہوا۔

نکاح ثالث:

تیسرا نکاح مولانا محمد یعقوب صاحب کا، مولوی محمد احسن صاحب کی صاحبزادی آمنہ سے ہوا، جن کے بطن سے نظام الدین پیدا ہوا اور چھ ماہ کی عمر میں انتقال کر گیا۔

(بیاض یعقوبی صفحہ ۱۵۲۔۱۵۳)

حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا حضرت حجۃ الاسلام سے خاندانی اور نسلی اتحاد پر حسب ذیل تحریری بیان بھی نہایت معلوماتی اور بصیرت افروز ہے۔ آپ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”میرا نسب اور مولانا (محمد قاسم صاحب) کا شیخ غلام شاہ کے پردادا میں ملتا ہے اس طرح محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم۔
>
> محمد یعقوب بن مملوک علی بن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم۔
>
> اور میاں شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش میرے والد اور شیخ کرامت حسین دیوبندی کے نانا ہوتے تھے جوانی میں دکن گئے۔ وہاں نکاح کیا تھا وہاں ایک بیٹا مولوی محمد ہاشم نام تھا۔ یہاں اولاد پسری تھی۔ اس سبب سے میرے والد کے نانا ان کے چچا ہوتے ہیں اور انواع رشتے جیسے برادری میں ہوا کرتے ہیں۔ (مولانا محمد قاسم صاحب اور مجھ محمد یعقوب کے) باہم مرتبط ہیں۔

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۴ مطبوعہ مجتبائی)

حسب ذیل اور گذشتہ شجرے پر پھر نظر ڈالئے۔ اس سے دونوں کے سلسلہ نسب پر روشنی پڑتی ہے:

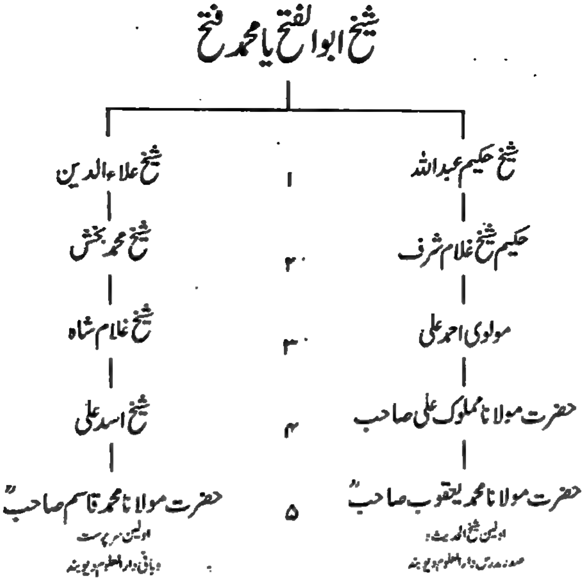
شیخ ابوالفتح یا محمد فتح
شیخ حکیم عبداللہ
شیخ علاء الدین
۱
حکیم شیخ غلام شرف
۲
شیخ محمد بخش
مولوی احمد علی
۳
شیخ غلام شاہ
حضرت مولانا مملوک علی صاحب
۴
شیخ اسد علی
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ
اولین شیخ الحدیث و
صدر مدرس دارالعلوم دیوبند
۵
حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ
اولین سرپرست
و بانی دارالعلوم دیوبند

بایں حساب حضرت حجۃ الاسلام اور حضرت عارف باللہ دونوں کا خون چھٹی پشت میں شیخ ابوالفتح یا محمد فتح میں۔ (بحسب اختلاف نام شجرہ از امیر احمد عشرتی و حضرت عارف باللہ) جا کر مل جاتا ہے۔

مذکورہ اکابر کے تعلقات کی کڑیاں:

حضرت حجۃ الاسلام کا رشتہ مولانا محمد یعقوبؒ سے ہم جد ہونے کے سوا یہ تھا کہ دونوں کی شادی دیوبند میں ایک ہی جگہ ہوئی تھی۔ گویا دونوں ہم زلف تھے۔ رہے مولانا محمد مظہر صاحبؒ، مولانا محمد احسن صاحبؒ اور مولانا محمد منیر صاحبؒ تو ان کے ساتھ حجۃ الاسلام کی قریبی رشتہ داری کے ڈانڈے ملانے کے لئے ہم آپ کے سامنے حکیم امیر احمد عشرتی کی یہ تحریر پیش کرتے ہیں لکھتے ہیں:

۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم میری والدہ کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب احقر کے والد کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے۔

۳۔ حضرت مولوی محمد مظہر صاحب و مولوی محمد احسن صاحب و مولوی محمد منیر صاحب

مرحومین میری والدہ کے ماموں تھے۔ (دیباچہ مکتوبات یعقوبی صفحہ۲)

ان تینوں جملوں کو پڑھئے اور گذشتہ شجرہ نسب پر غور کیجئے اور تعلقات قریبہ آپ خود قائم کیجئے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ، حضرت مولانا محمد مظہرؒ، حضرت مولانا محمد احسنؒ اور حضرت مولانا محمد منیرؒ آسمان نانوتہ کے چاند اور ستارے تھے اور ان سب کو جس آفتاب نے روشنی بخشی وہ نانوتہ کا نیر اعظم حضرت مولانا مملوک علیؒ تھے اللہ تعالیٰ نے ضلع سہارنپور میں نانوتہ، دیوبند، گنگوہ، انبیہٹہ اور خود سہارنپور کو اور ضلع مظفر نگر میں تھانہ بھون، کاندھلہ، کیرانہ، جھنجھانہ اور بڈھانے کو وہ شرف بخشا ہے کہ تمام ہندوستان میں دہلی کے سوا یہ شرف اور کسی خطے کو علما پروری اور علما سازی میں نصیب نہیں ہوا۔ ہم کچھ مشہور بزرگوں، علماء اور اولیاء کا ذکر کرنا یہاں مناسب سمجھتے ہیں۔

سرزمین ضلع سہارنپور و مظفرنگر

اگر تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے تو سرزمین ضلع سہارنپور اور مظفرنگر علمی اور روحانی قدروں کیلئے نہایت ہی زرخیز زمین تھی اور ہے اور اس میں بھی بالخصوص ضلع سہارنپور جس کی تحصیل دیوبند کو قدرت نے خاص علمی اور روحانی سربلندی عطا کی۔ حضرت حجۃ الاسلام بھی ضلع سہارنپور کے قابل فخر فرزند تھے اور اس سلسلے میں حسب ذیل حضرات کی ایک فہرست پر نظر ڈال کر دیکھئے کہ یہ سب حضرات انہی دو ضلعوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے صرف مشہور مشہور جلیل القدر ہستیوں کو اس فہرست میں درج کیا ہے جو بآسانی ہمیں معلوم ہوسکی ہیں یا معلوم ہیں۔

گنگوہ ضلع سہارنپور:

۱۔ حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ متوفی ۲۳ جمادی الاخری ۹۴۵ھ (تذکرہ الرشید جلد اول)

۲۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب ایوبی گنگوہیؒ متوفی ۸ یا ۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱/ اگست ۱۹۰۸ء بروز جمعہ ساڑھے بارہ بجے دن۔ (تذکرہ الرشید جلد دوم)

۳۔ مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہیؒ شاگرد مولانا محمد قاسم صاحبؒ۔

خاص سہارنپور (یو۔ پی):

۱۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری محشی بخاری شریفؒ متوفی ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ بروز شنبہ بمقام سہارنپور بعمر ۷۲ سال۔

۲۔ حضرت مولانا سعادت علی فقیہ مشہور سہارنپور

۳۔ مولانا فیض الحسن صاحبؒ ادیب سہارنپوری سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور استاد

شبلی۔ (سوانح قاسمی قدیم صفحہ ۲۹)

نانوتہ ضلع سہارنپور:

۱۔ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ صدر شعبہ علوم وفنون شرقیہ دہلی عربی کالج متوفی ۱۱/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ بمرض یرقان۔

۲۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (متوفی ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ)

۳۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ (متوفی ۱۳۱۲ھ)

۴۔ مولانا محمد احسن صاحبؒ (متوفی ۱۳۱۲ھ)

۵۔ مولانا محمد منیر صاحبؒ

۶۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (متوفی یکم ربیع الاول ۱۳۰۲ھ شب شنبہ)

انبیہٹہ ضلع سہارنپور:

۱۔ حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب ولی کامل

۲۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ایوبی انصاری محدث سابق شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم مہاجر مدنی ومحشی ابوداؤد پیدائش صفر ۱۲۶۹ھ سات مرتبہ حج کیا آخری حج ۱۳۴۴ھ میں کیا اور بعد ازاں ہندوستان واپس نہیں آئے۔ وفات ۱۸ ربیع الآخر ۱۳۴۶ھ بروز چہارشنبہ مدینہ منورہ مدفون جنت البقیع مدینہ منورہ۔

۲۔ مولانا صدیق احمد صاحب مفتی۔

دیوبند ضلع سہارنپور:

۱۔ مولانا ذوالفقار صاحب شارح حماسہ، متنبی، قصیدہ بردہ بانت سعاد سبعہ معلقہ مصنف تذکرہ البلاغت والد شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ رفیق مولانا محمد قاسم صاحبؒ (پیدائش ۱۲۳۷ھ وفات ۱۵ رجب ۱۳۲۲ھ)

۲۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (پیدائش

۱۸۵۱ء وفات ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء)

۳۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب ؒ مفتی دار العلوم دیوبند (وفات ۱۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۹ء)

۴۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند (وفات ۱۹۳۰ء)

۵۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب ؒ عثمانی شیخ الاسلام پاکستان و استاذ العلماء (پیدائش ۱۰/محرم ۱۳۰۵ھ وفات ۲۱ صفر ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۹ء)

۶۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب ؒ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند (متوفی ۱۹۲۸ء)

۷۔ مولانا محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دار العلوم دیوبند۔

رائے پور ضلع سہارنپور:

۱۔ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری ؒ (متوفی ۱۳۳۷ھ)

جھنجھانہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر:

۱۔ حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی ؒ ضلع مظفر نگر مرشد حاجی امداد اللہ صاحب ؒ۔

۲۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ؒ تھانوی (پیدائش ۲۲/صفر ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۴ء وفات ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۶ء)

۳۔ حافظ محمد ضامن صاحب شہید تھانوی ضلع مظفر نگر (یوم شہادت جہاد شاملی ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ)

۴۔ مولانا شیخ محمد محدث تھانوی (پیدائش ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۰ھ وفات ۷ ربیع الآخر ۱۲۹۶ھ)

۵۔ مولانا محمد اعلیٰ تھانوی ؒ

۶۔ حکیم الامت حضرت اشرف علی صاحب تھانوی ؒ (پیدائش ۵ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ وفات ۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ)

کاندھلہ ضلع مظفر نگر:

۱۔ مفتی الٰہی بخش صاحبؒ (وفات ۷ شوال ۱۲۴۹ھ)

۲۔ مولانا مظفر حسین صاحبؒ (وفات مدینہ منورہ میں ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء قریب مزار حضرت عثمانؓ)

۳۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی سابق مدرس دار العلوم دیوبند حال مدرسہ اشرفیہ لاہور

۴۔ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ (پیدائش ۱۲۸۷ھ وفات ذوقعدہ ۱۳۳۴ھ)

۵۔ مولانا محمد زکریا صاحب موجودہ شیخ الحدیث مظاہر العلوم علمہ (پیدائش ۱۱ رمضان ۱۳۱۵ھ)

کاندھلے ہی کی ہستیوں میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ تھے جو تبلیغی جماعت کے بانی تھے اور آج دنیا میں ان کا تبلیغی کارنامہ مقام معراج کو پہنچا ہوا ہے۔ آپ مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی کے چھوٹے بھائی اور مولانا محمد زکریا صاحب محدث سہارنپوری کے چچا تھے۔

بڈھانہ ضلع مظفر نگر:

۱۔ مولانا عبدالقیوم صاحبؒ بڈھانوی ضلع مظفر نگر (داماد شاہ محمد اسحاق صاحبؒ محدث دہلوی) (وفات ۱۲۹۹ھ مدفون بڈھانہ۔

۲۔ مولانا عبدالحیٔ صاحبؒ والد مولانا عبدالقیوم صاحب مذکور (داماد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ)

کیرانہ ضلع مظفر نگر:

کیرانہ ضلع مظفر نگر بھی نہایت ہی علما خیز خطہ ہے۔ یہاں حضرت مولانا صاحبؒ پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں انہوں نے بہت زبردست حصہ لیا۔ عیسائیوں سے

زبردست مناظرے کئے اور ان کے دانت کھٹے کردئے۔ آپ زبردست کتابوں کے مصنف ہیں اور آپ کی معرکہ آرا کتاب اظہار الحق مختلف زبانوں میں شائع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مکہ مکرمہ کو ہجرت فرماگئے۔ وہاں مدرسہ صولتیہ کی بنیاد ڈالی جو آج تک جاری ہے۔ حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا رحمت اللہ دونوں مکہ مکرمہ میں ساتھ رہے اور مرنے کے بعد بھی دونوں جنت المعلی قبرستان مکہ مکرمہ میں دفن ہیں۔

خاندانی حالات اور وطنی معلومات سے بقدر ضرورت فارغ ہوکر اب ہم حضرت حجۃ الاسلام کے عہد طفلی اور طالب علمی کے حالات وسوانح کی طرف چلتے ہیں۔

دوسرا حصہ:

عہد طفلی تحصیل علم واساتذہ

پیدائش سے پانچ چھ سال تک کے حالات کسی شخص کے بھی ہوں بعض انبیاء ومرسلین کو چھوڑ کر نہ معلوم ہوتے ہیں اور نہ کسی خاص ذکر کے قابل ہوتے ہیں۔ اس لئے حجۃ الاسلام کا یہ عہد جیسا بچوں کا ہوتا ہے گذر گیا۔ اب وہ وقت آگیا کہ آپ کی تعلیم کا آغاز ہو۔ اور بسم اللہ کرادی جائے۔

معلم اول:

آپ کی بسم اللہ کس نے کرائی اس بات کا دور دور تک کچھ پتہ نہیں چلتا البتہ وجدان یہ کہتا ہے کہ آپ کے ہونے والے پیرومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے کرائی ہوگی۔ قاعدہ ہے کہ کسی بزرگ کے ذریعہ تعلیم کا افتتاح کرایا جاتا ہے۔ حاجی صاحبؒ کی نانہال نانوتے میں تھی اور ان کی ہمشیرہ محترمہ بھی نانوتہ میں بیاہی گئی تھیں اس لئے حاجی صاحبؒ اکثر وہاں آیا جایا کرتے تھے اور وہاں کے کتنے ہی مرد اور عورتیں حاجی صاحب سے مرید بھی تھے اس لئے ہوا یوں ہوگا کہ حاجی صاحب سے بسم اللہ کرائی گئی ہوگی۔ جیسا کہ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی بسم اللہ نانوتے میں آپ کے نانا حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ نے پانچ سال کی عمر میں کرائی تھی۔ پھر چونکہ حاجی صاحبؒ اکثر اپنی نانہال تشریف لاتے تھے اور قیام بھی فرمایا کرتے تھے اس لئے حضرت حجۃ الاسلام کو ان کے آمد و قیام کے مواقع پر کئی مرتبہ ابتدائے تعلیم سے پڑھنے کا موقع ملا ہوگا۔ چنانچہ حجۃ الاسلامؒ نے خود اپنی تصنیف ”مصابیح التراویح کے دیباچے میں اپنے اشعار درج کرتے ہوئے حاجی صاحبؒ کو اپنا استاد اور پیر دونوں تسلیم کیا ہے اور مصابیح

التراویح کے مضامین کو حاجی صاحب کا فیض ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

دلم بانکاتے گر آویختہ   ہمانا کہ از سوئے حق ریختہ
مگر نیست ایں نور افلاک من   نہ ایں تازہ گلہا است از خاک من
کہ نادانے از دست بخت زبوں   بسر مشت خاک است بہر شگوں
ز خاک کف پائے استاد و پیر   و زاں سایہ رشکِ مہر منیر
کہ ماند زمانے بدست و سرم
بہ چشمم رسد نور و گل و دو برم

پہلے شعر میں حجۃ الاسلام نے اپنی کتاب کے مضامین کو القائے ربی ظاہر کیا ہے مگر تیسرے شعر میں فرمایا ہے کہ یہ مضامین استاد اور پیر کی خاکِ پا کا فیض ہے اور اسی رشکِ مہر منیر کے جلوے کا ایک پرتو ہے۔ ہو سکتا تھا کہ پہلے مصرع میں استاد و پیر سے دو شخصیتیں مراد ہوں مگر دوسرے مصرع میں وزاں سے صرف واحد کی طرف اشارہ ہے جس سے واضح ہے کہ استاد و پیر ایک ہی شخصیت ہے اور وہ ہیں حاجی صاحبؒ۔ خواہ کچھ بھی ہو حاجی صاحبؒ نے حجۃ الاسلام کو کسی وقت بھی ان کے تحصیل علم کیلئے دہلی جانے سے پہلے نانوتے میں آمد و رفت کے عرصے میں ضرور پڑھایا ہے۔ اور یہ ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی مبنی بر حقیقت دستاویز ہے۔ کیونکہ ایران و ہندوستان کے علاقوں میں عام و خاص طور پر روحانی معلم کو پیر و مرشد اور ظاہری علوم کے معلم کو استاد کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؒ اپنے بیٹے جاوید کو جاوید نامہ میں مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا ترا بخشد خدا سوز و گداز

حاجی صاحبؒ کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی بسم اللہ حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ نے کرائی ہو کہ وہ اس وقت تمام نانوتے میں صرف ایک ہی ہستی تھے جو نہ صرف عالم اجل تھے بلکہ دہلی عربی کالج مرحوم کے شعبہ علوم شرقیہ کے صدر تھے اور اس دور کی بڑی بڑی ہستیاں ان کی شاگرد تھیں۔ الغرض وجدان یہ کہتا ہے کہ ان دونوں میں سے خواہ کسی نے بھی بسم

اللہ کرائی ہو لیکن آپ نے حاجی صاحب سے بھی علمی استفادہ کیا ہے۔

دوسرے استاد اور حجۃ الاسلام کا مکتب اولیں:

دستورِ زمانہ کے مطابق نانوتے کے مکتب میں آپ کو بٹھا دیا گیا جہاں آپ نے قاعدہ بغدادی اور پھر تیسواں سیپارہ اور پھر تمام قرآن کریم اور کچھ اردو کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جیسا کہ پہلے سے دستور چلا آتا ہے۔ یہ مکتب کس کا تھا۔ اس میں کون صاحب پڑھاتے تھے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ عارف باللہؒ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جناب مولوی (محمد قاسم) صاحب لڑکپن سے ذہین طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش، جری، چست و چالاک تھے۔ مکتب میں اپنے سب ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن شریف بہت جلد ختم کرلیا۔ خط اس وقت سب سے اچھا تھا۔ نظم کا شوق اور حوصلہ تھا اپنے کھیل اور بعض قصے نظم فرماتے اور لکھ لیتے۔ چھوٹے چھوٹے رسالے اکثر نقل کئے۔ جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب جو ربط نسب کا تھا حضرت مخدوم کی نانہال ہمارے خاندان میں تھی اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھی اکثر نانوتہ تشریف لاتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت و اخلاص فرماتے۔ جز و بندی کتاب کی حضرت سے ہم دونوں نے سیکھی اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کی جلدیں باندھیں۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۵)

اس تحریری بیان سے مکتب میں پڑھنا، قرآن شریف جلد ختم کرنا ثابت ہوتا ہے ظاہر ہے کہ سب سے پہلے نانوتے کے مکتب میں تعلیم پائی۔ اور دہلی جانے سے پہلے پہلے ہی وہ خوشخطی بھی خوب سیکھ چکے تھے جس کے سبب چھوٹے چھوٹے رسالے خود ہی لکھ لیا کرتے تھے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں کہ:

حجۃ الاسلام کی پاکیزگی تحریر:

> ''مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ دو باتیں مجھے بہت ناپسند ہیں ایک تو تقریر میں لغت بولنا دوسرے تحریر میں شکستہ لکھنا۔ مقصود تقریر و تحریر سے افہام ہے اور

یہاں ابہام ہوجاتا ہے۔ ہمارے اکثر بزرگوں کے خط نہایت صاف تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا خط تو نہایت صاف تھا۔ نقطے وشوشے تک سب پورے پورے ہوتے تھے۔" (قصص الاکابر حصہ دوم بحوالہ الہادی ماہ رجب ۱۳۵۷ھ صفحہ ۳۱)

یہ بھی معلوم ہوا کہ شاعری کا خداداد چسکا زندگی کی ابتدا ہی میں تھا۔ بلکہ نانوتے کے اس مکتب میں طالب علمی کے زمانے میں شاعری کرتے لگے تھے۔ بہر حال حاجی صاحب کے بعد دوسرے استاد نانوتے کے مکتب کے استاد تھے۔

حجۃ الاسلام دیوبند میں تیسرے استاد مولانا مہتاب علی کی شاگردی میں اور ان سے عربی کا آغاز:

نانوتے کے مکتب سے آپ کو دیوبند بھیج دیا گیا۔ وہاں بھیجے جانے کی وجہ وہی ہے جو گذشتہ اوراق میں گذری۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> "ہمارے وطن میں ایک قضیہ پیش آیا شیخ تفضل حسین شیعہ مذہب ہوگئے تھے اور ہماری جائداد کے شریک تھے۔ ان سے اور مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کے دادا شیخ غلام شاہ سے فساد ہوا اور شیخ تفضل حسین مولوی صاحب کے ماموں میاں فصیح الدین کے ہاتھ سے زخمی ہوکر مرگئے۔ ہر چند کہ اس مقدمے میں خیریت رہی اور حاکم کی طرف سے کچھ سزا نہ ہوئی مگر بنائے مخاصمت کچھ پہلے سے تھی اب زیادہ ہوگئی۔ یہ خوف ہوا کہ مبادا کوئی صدمہ مخالفوں کے ہاتھ سے ان (مولانا محمد قاسم صاحب) کو پہنچے اس لئے دیوبند بھیج دیا۔ یہاں مولوی مہتاب علی صاحب کا مکتب تھا شیخ کرامت حسین مرحوم کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انہوں نے عربی شروع کرائی۔"

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۶۰۵)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلام کا نانوتے کے مکتب سے سلسلہ تعلیم ختم کرادیا گیا اور آپ کو دیوبند بھیج دیا گیا تاکہ خاندانی جھگڑوں سے محفوظ رہ سکیں۔ نانوتے کے مکتب میں آپ کی استعداد اس قابل ہوگئی تھی کہ آپ کو عربی نصاب اور عربی تعلیم شروع کرادی

جائے۔ عام طور پر عربی کا آغاز فارسی کی گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، سکندر نامہ یا کم وبیش فارسی کتابیں پڑھا کر کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نانوتے کے مکتب میں آپ نے تقریباً فارسی کی اتنی کتابیں پڑھ لی تھیں کہ دیوبند پہنچ کر مولانا مہتاب علی سے عربی کا آغاز ہو جائے۔

دیوبند میں حجۃ الاسلام کی قریبی رشتہ داریاں:

گذشتہ اوراق سے آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ ضلع سہارنپور کے مختلف خاندانوں مثلاً صدیقی، عثمانی، فاروقی اور انصاری حضرات کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ حاجی امداد اللہ صاحب فاروقی النسل تھے لیکن ان کی والدہ نانوتے کی صدیقی النسل تھیں اور پھر حاجی صاحبؒ کی ہمشیرہ نانوتے میں حجۃ الاسلام کے صدیقی خاندان میں بیاہی گئی تھیں، اسی طرح مولانا مملوک علی صاحبؒ کی صاحبزادی یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب کی ہمشیرہ مسماۃ مبارک النساصدیقی النسل انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے انصاری خاندان میں شاہ مجید علی صاحب سے بیاہی گئی تھیں جن سے مولانا خلیل احمد صاحب مشہور محدث پیدا ہوئے۔ دیوبند میں بھی حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کی قریب کی رشتہ داریاں تھیں۔ بقول عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ:

> ”میاں شیخ محمد بخش کے بھائی شیخ خواجہ بخش میرے والد (مولانا مملوک علی صاحب) اور شیخ کرامت حسین دیوبندی کے نانا ہوتے تھے۔“ (سوانح قاسمی عارف باللہ صفحہ ۴)

حجۃ الاسلام کے دادا شیخ محمد بخش کے بھائی خواجہ بخش کی صاحبزادی کی شادی دیوبند کے محلہ دیوان والوں کے یہاں ہوئی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی مصنفہ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

> ”جس زمانے میں پہلی دفعہ حضرت والا (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کی تشریف آوری دیوبند میں ہوئی تو انہی شیخ خواجہ محمد بخش کے نواسے شیخ کرامت حسین کا دیوبند میں دور دورہ تھا۔ دیوان محلہ کے سرکردہ خاندان بھی شیخ کرامت حسین تھے۔“

(سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۱۷۹)

انہی شیخ کرامت حسین کے یہاں حجۃ الاسلام نے قیام کیا۔ شیخ کرامت حسین ایک

بڑے جتھے کے آدمی تھے۔ عالیشان محل میں رہتے تھے جو دارالعلوم دیوبند کے بالکل سامنے ہے۔ اسی کا ایک عالیشان دروازہ دارالعلوم کے بالکل قریب شمال رویہ سٹیشن کو جانے والی سڑک پر ہے جو محل کی عظمت کا نشان ہے۔ یہی وہ شیخ کرامت حسین صاحب ہیں جن کی مہمان نوازی کی شہرت تواتر اور شہرت کا درجہ رکھتی ہے حتی کی بعض اوقات راستہ گذرنے والی براتوں کو بھی کھانا کھلاتے تھے۔ اس لئے کسی اور جگہ بھیجنے کے بجائے مولانا محمد قاسم صاحب یہاں زیادہ محفوظ رہ سکتے تھے اسی لئے دیوبند بھیجے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً آٹھ نو سال تھی۔ حضرت عارف باللہ کی تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ شیخ کرامت حسین کے گھر پر شیخ نہال احمد پڑھتے تھے۔ یہ شیخ نہال احمد شیخ کرامت حسین کے بیٹے، باپ کے جانشین رئیس دیوبند ہوئے۔ انہی کی نشست گاہ میں جو بعدازاں شیخ نہال احمد کی نشست گاہ کہلائی یہ مکتب اور مدرسہ قائم تھا جس میں مولانا مہتاب علی صاحب پڑھاتے تھے۔ یہیں حجۃ الاسلام مولانا مہتاب علی صاحب سے پڑھتے تھے۔ پہلے یہی دستور تھا کہ کسی رئیس یا امیر کبیر آدمی کے مکان یا بیٹھک میں مدرسہ کھول یا جاتا تھا۔ راقم الحروف نے بھی اپنے وطن شیر کوٹ ضلع بجنور میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب سے بسم اللہ کی اور بعدازاں لالہ سری رام، لال بہادر اور چھیل بہادر کایستھوں کی بیٹھکوں میں کھلے ہوئے مکتبوں میں ابتدائی تعلیم پائی۔ الغرض شیخ کرامت حسین کی بیٹھک میں پڑھتے رہے۔ یہ بیٹھک کہاں واقع تھی مولانا مناظر احسن گیلانی نے استاد محترم مولانا محمد طیب صاحب کی یادداشت کا حوالہ دیتے ہوئے سڑک کے سامنے موجودہ بیٹھک جواب مولانا محمد طیب صاحب کی نشست گاہ ہے اس کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

> ”جہاں اس وقت میری مردانہ بیٹھک ہے۔“

مولانا مہتاب علیؒ سے مختصر سا تعارف:

مولانا مہتاب علی صاحبؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا کے تایا یعنی مولانا ذوالفقار علی صاحب شارح دیوان حماسہ، دیوان متنبی، قصیدہ بردہ و بانت سعاد کے بڑے بھائی عثمانی خاندان کے چشم و چراغ اور عالم بزرگ تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مولانا مہتاب علی صاحب دیوبند کے خاص استاذ ہیں اور دیوبند میں خاص اثر رکھتے ہیں۔ حاجی

محمد عابد صاحب دیوبند سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ الحاصل مولانا مہتاب علی صاحب بھی آپ کے اساتذہ میں سے ایک ہیں۔ آپ بڑے ہی ظریف الطبع تھے۔ سوانح قاسمی گیلانی مرحوم میں مولانا محمد طیب صاحب کی عبارت کا ان الفاظ میں حوالہ دیا گیا ہے:

> ''مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم جو مولانا (حضرت نانوتوی) کے استاد تھے ظریف شخص تھے اور براہ فراست ہر ایک شاگرد کا اس کے حسب حال اس کا نام رکھتے تھے چنانچہ مولانا مرحوم (حضرت نانوتوی) کا نام ''علم کی بکری'' رکھا تھا۔''

(سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۱۹۲ جلد اول)

چونکہ بکری پتے اور چارہ کھانے میں تیز ہوتی ہے اور جو اس کے کھانے کی غذا اس کے سامنے آجاتی ہے بڑی تیزی سے چر لیتی ہے۔ اس طرح مولانا بھی ہر کتاب کو بکری کی طرح پڑھ ڈالتے تھے۔ مگر آٹھ نو سال کی عمر میں مولانا مہتاب علی صاحب کی طرف سے یہ خطاب محل نظر ہے۔

حجۃ الاسلام سہارنپور میں مولانا محمد نواز صاحب سہارنپوری چوتھے استاد کی شاگردی میں:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجۃ الاسلام دیوبند میں مولانا مہتاب علی کی شاگردی میں تھوڑے ہی عرصہ رہے اور بعد ازاں سہارنپور اپنے نانا مولانا محمد نواز صاحب سے عربی اور فارسی پڑھی۔ حضرت عارف باللہ دیوبند میں مولانا مہتاب علی سے پڑھنے کے بعد فوراً لکھتے ہیں:

> ''پھر سہارنپور اپنے نانا کے پاس رہے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری سے کچھ پڑھا۔ فارسی اور عربی کی کتابیں اول کی کچھ حاصل کیں۔ اس زمانے میں احقر کے والد مرحوم (مولانا مملوک علی صاحب) حج کو تشریف لے گئے۔ احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظ قرآن شریف پورا ہو گیا تھا مگر صاف نہ تھا صاف کرتا تھا مولوی (محمد قاسم) صاحب سہارنپور سے وطن (نانوتہ) آئے اور ان کے نانا کا انتقال (اس سال

> کے وبائی بخار میں) مع بہت سے لوگوں کے ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا۔ مولوی صاحب جیسے پڑھنے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے ہر کھیل جوڑ توڑ نام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولوی صاحب نے جب اس کا قاعدہ معلوم کر لیا پھر یاد نہیں کسی سے مات کھائی ہو۔ بہت ہوا تو برابر رہے بلکہ ہر کھیل کا جو مرتبہ کمال ہوتا تھا وہاں تک اس کو پہنچا کر چھوڑتے۔'' (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ٦)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دیوبند سے حجۃ الاسلام سہارنپور پہنچ گئے۔ یہاں کچھ عرصہ رہے اور سہارنپور سے نانوتہ تشریف لے آئے۔ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ تک حجۃ الاسلام نانوتہ رہے اب حجۃ الاسلام کی عمر گیارہ سال چھ ماہ کی ہو چکی تھی۔ (درآنحالیکہ آپ کی پیدائش شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ کی ہے)

پانچویں استاد مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی کی شاگردی میں:

مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی کا تفصیلی ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ آپ کا انتقال ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو ہوا اور اس وقت آپ کی عمر ستر سال کی تھی۔ اس حساب سے آپ کی پیدائش کا سن ۱۲۳۲ھ متعین ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد مظہر صاحبؒ حجۃ الاسلام سے سولہ سال بڑے تھے۔ اور حجۃ الاسلام کی عمر دس سال کی ہو چکی تھی تو مولانا محمد مظہر صاحب کی عمر چھبیس سال کو پہنچ چکی تھی۔ اسی اثنائے قیام نانوتہ میں آپ نے مولانا محمد مظہر صاحب کی بھی شاگردی اختیار کی ہے اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث اوجز المسالک شرح موطا امام مالک کے مقدمے میں مولانا محمد مظہر صاحب کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ومن مفاخره ان الشیخ العلامه بحر العلوم النانوتوی اخذ عنه بعض الکتب الابتدائیة.
>
> ترجمہ: اور مولانا محمد مظہر صاحب کیلئے قابل فخر باتوں میں سے یہ ہے کہ شیخ علامہ بحر العلوم (مولانا محمد قاسم صاحب) نانوتوی نے ان سے بعض ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں۔

راقم الحروف نے اوجز المسالک کے مقدمے میں جب یہ عبارت پڑھی تو اس کی تصدیق کے لئے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کو عریضہ لکھا اور کچھ مزید معلومات بھی حاصل کرنا چاہیں جن کے جواب میں حضرت نے حسب ذیل گرامی نامہ ارسال فرمایا:

گرامی نامہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی

بنام راقم الحروف محمد انوار الحسن

عنایت فرمائم سلمہ۔ بعد سلام مسنون

کئی دن ہوئے گرامی نامہ پہنچا تھا۔ یہ چیزیں اس ناکارہ کیلئے بھی بڑی دلچسپی کی تھیں اور ان چیزوں کے تتبع میں لطف آتا تھا۔ مگر اب تو آنکھوں نے ایسا معذور کردیا کہ کسی چیز کے بھی تتبع کا موقعہ نہیں رہا۔

حضرت (مولانا محمد قاسم صاحب) نانوتوی کا مولانا محمد مظہر صاحب سے پڑھنا یہ میں نے مولانا ثابت علی صاحب مرحوم مدرس مظاہر علوم سے خود سنا تھا مولانا مرحوم حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ مظاہر علوم کے ابتدائی دور میں طالب علم بن کر آئے تھے یہیں سب کچھ پڑھا۔ معین مدرسی فارسی سے چڑھتے چڑھتے سالہا سال حدیث کی تدریس کے بعد یہیں وصال ہوا۔ وہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کے قصے بہت کثرت سے سنایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا فیض الحسن صاحب ادیب سہارنپوری کا انتقال ۱۳۰۴ھ میں ہے۔ ولادت کا حال معلوم نہیں ہے۔ مولانا (فیض الحسن صاحب) کی بہت سی تصانیف مشہور معروف ہیں۔ شرح حماسہ، شرح معلقات، فیض القاموس، شرح خطبہ قاموس جو لاہور کے زمانہ قیام میں تصنیف کیں اس کے آخر میں

تم یوم الجمعة ۱۲۹۹ھ فی بلدة لاہور

لکھا ہے۔ مولانا کا ایک رسالہ "نسیم فیض" اشعار فارسی میں ہے۔ اس کے ختم پر مولانا

کی تصانیف کی بہت لمبی فہرست لکھی ہے۔ مفتی (الٰہی بخش) کاندھلوی صاحب کا خاتمہ مثنوی (مولانا روم) بہت سے مطبعوں میں چھپا ہے۔ مدرسے میں مختلف مطابع کے موجود ہیں۔ اس میں ایک کانپور کا مطبوعہ بھی ہے۔ اس پر تصریح تو حاجی صاحب کے حاشیے کی ہے نہیں لیکن ٹائٹل پر بامداد اللہ الولی موٹے قلم سے لکھا ہے۔ ایک ضروری امر یہ ہے کہ اس ناکارہ کو کئی سال سے ماہ مبارک میں ڈاک کا بالکل وقت نہیں ملتا اور امسال تو آنکھوں نے بھی معذور بنا رکھا ہے۔ اس لئے اس ناکارہ کو آئندہ کوئی والا نامہ تحریر فرمائیں تو رمضان بعد فقط والسلام

محمد زکریا

مظاہر علوم

۲۰ شعبان ۱۳۸۴ھ

(مطابق ۲۵ دسمبر ۱۹۶۴ء)

یہ گرامی نامہ راقم الحروف نے تمام ہی درج کر دیا ہے کہ تاریخی دستاویز کے علاوہ تبرک بھی ہے اور بعض دیگر مفید معلومات پر بھی محتوی ہے۔ بہر حال یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے مولانا محمد مظہر صاحب کی بھی شاگردی کی ہے اور یہ غالباً اس سال جبکہ آپ سہارنپور سے مولانا محمد نواز صاحب سے پڑھ کر نانوتہ تشریف لائے تھے یعنی ۱۲۵۹ھ میں۔ لیکن کونسی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی کا لفظ بتاتا ہے کہ شرح مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، علم الصیغہ وغیرہ پڑھی ہوں گی۔ کیونکہ اس سال کے بعد آپ پھر حضرت مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں جا کر آپ نے کافیہ سے تعلیم کا آغاز فرمایا۔

حجۃ الاسلام، مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ تحصیل علم کیلئے دہلی میں

حجۃ الاسلام کے چھٹے استاد حضرت مولانا مملوک علی صاحب:

حضرت مولانا مملوک علی صاحب وہ ہستی ہیں جو سب سے پہلے دہلی تعلیم حاصل کرنے کیلئے نانوتے سے اپنے زمانے میں تشریف لے گئے اور دہلی میں تعلیم حاصل کر کے پھر وہیں دہلی میں سرکاری مدرسے میں علوم شرقیہ کے صدر بنے۔ آپ کی پشت پناہی اور سرپرستی کے نتیجے میں کتنے ہی حضرات نے تعلیم کیلئے دہلی کا رخ کیا۔ چنانچہ مولانا محمد مظہر صاحب، مولانا محمد احسن صاحب، مولانا محمد منیر صاحب ساکنین نانوتہ مولانا مملوک علی صاحب کی سرپرستی کے باعث دہلی میں تعلیم کے حاصل کرنے کیلئے نکلے۔ مولانا مملوک علی صاحب خود اپنے ذاتی شوق علم اور والد صاحب کے احساس کے باعث دہلی تحصیل علم کیلئے نکلے تھے اور ان کے ساتھ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے والد صاحب بھی گئے تھے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی کی جلد اول میں بہتر صفحے سے تقریباً ستانوے صفحات تک پچیس صفحات میں نانوتے میں علمی ہلچل کے تین اسباب بتائے ہیں:

۱۔ مولانا سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید سے بیعت اور عقیدت مندی اور ان کی اس علاقے میں آمد۔

۲۔ حاجی امداد اللہ صاحب کے مرشدانہ اثرات۔

۳۔ اقتصادی کمزوریوں کے باعث مولانا مملوک علی صاحب کی تنخواہ اور عہدے کا نظروں میں آنا۔

جہاں تک مولانا مملوک علی صاحب کا معاملہ ہے تو وہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور مولانا سید احمد صاحب شہید ۱۲۰۱ھ کی پیدائش ہیں دونوں میں صرف تین سال کا فرق ہے۔ اس لئے مولانا سید احمد شہیدؒ کی وجہ سے نانوتے میں تحصیل علم کی ہلچل ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ رہے حاجی امداد اللہ صاحب تو وہ مولانا مملوک علی صاحب سے کئی سال چھوٹے ہیں اور ان کی پیدائش ۲۲ صفر ۱۲۳۳ھ ہے۔ لہٰذا یہ بات بھی باور کرنے کے قابل نہیں اس لئے مولانا مملوک علی صاحب کا دہلی جانا ان کے والد کے عالم ہونے اور خود مولانا کے جذبہ شوق کا نتیجہ تھا اور اگلی نسل کیلئے تعلیمی جوش کی فراوانی مولانا مملوک علی صاحب کی وجہ سے تھی۔ رہا اقتصادی کمزوری کا معاملہ تو نانوتے میں سب شیوخ صاحب حیثیت زمیندار تھے کوئی خال خال غریب ہوا تو دوسری بات ہے۔ اس لئے تیسری وجہ بھی رغبت علم کا سبب نہیں معلوم ہوتی۔

بہر حال مولانا محمد قاسم صاحب ابھی نانوتے میں زیر تعلیم تھے کہ مولانا مملوک علی صاحب نے شاہ محمد اسحاق صاحبؒ محدث دہلوی اور شاہ محمد یعقوب صاحبؒ محدث دہلوی نبیرگان شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے دہلی سے حجاز کو ہجرت کرنے کے باعث خود بھی حجاز جانے کا ارادہ کرلیا اور چپکے چپکے تیاری کرتے رہے۔ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''۱۲۵۷ھ میں حضرت جناب مولانا محمد اسحاق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی نے کہ دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کا کیا۔ ذیقعدہ میں شاید روانہ ہوگئے۔ دہلی میں اندھیر ہوگیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا۔ یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی حج کا دھیان ہوا۔ خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کرتے رہے آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہ قدر دانی آدھی تنخواہ بھی دی تو رجب ۱۲۵۸ھ میں وطن سے روانہ ہوئے اور اول ذی الحجہ کو مکہ پہنچے۔ زیارت حرمین سے فارغ ہوکر برس دن میں پھر دہلی پہنچے۔ اس وقت یہ سفر طے ہونے میں عجب سمجھا۔ رخصت کے دن پورے ہوچکے وطن نہ آسکے ذی الحجہ میں جب چھٹی سالانہ ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب کو دہلی ساتھ لے گئے۔'' (حاشیہ صفحہ ۶ سوانح قاسمی)

گویا شاہ محمد اسحاق صاحب اور شاہ محمد یعقوب صاحب سے ایک سال بعد حج کیلئے تشریف لے گئے اور ۱۲۵۹ھ میں واپس ہو کر سیدھے اپنی ملازمت پر دہلی پہنچے۔ پھر سالانہ تعطیل جو چاند کی ذوالحجہ کو واقع ہو رہی تھی اس میں نانوتہ تشریف لائے اور مولانا محمد قاسم صاحب کو اختتام تعطیل پر دہلی ہمراہ لے گئے۔ حضرت عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

دہلی کو روانگی:

> ”جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن آئے تب مولوی صاحب سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا بعد اجازت والدہ کے دہلی روانہ ہوئے ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ کے آخر میں وطن سے چلے اور دوسری محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے۔ چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان۔ والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعطیلات کا پوچھنا معمول تھا۔ یاد رہے کہ مولوی صاحب سب میں عمدہ رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ہمارے مکان سے قریب مولوی نوازش علی کی مسجد میں طالب علموں کا مجمع تھا ان سے پوچھ پاچھ بحث شروع ہوئی مولوی (محمد قاسم) صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کو غلبہ ہوتا بلکہ ہم میں سے جو کوئی مغلوب ہوتا مولوی صاحب سے مدد چاہتا یا مولوی صاحب خود اس کو مدد دیتے۔ پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی یہ معقول کی مشکل کتابیں میر زاہد، قاضی، صدرا شمس بازغہ ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تک نہ کرتے۔ والد مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو کچھ سمجھتے نہیں معلوم ہوتے۔ جناب والد مرحوم نے فرمایا کہ میرے سامنے طالب علم بے سمجھے چل نہیں سکتا اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چل نہیں سکتا اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا۔ وہ طرز عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں اور یہی حال جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا تھا۔ مولوی صاحب سے اسی زمانے سے دوستی اور ہم سبقی رہی آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم کی

خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے متعرض نہ ہو جو میں ان کو پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا۔ از بسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا۔ طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی یہ کب عاری تھے۔ ہر بات کا جواب باصواب تھا۔ آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اول انگریزی تھے نہایت افسوس ہوا۔ پھر مولوی صاحب نے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی کچھ مزدوری کرلی اور کتابیں معمولی تمام کر چکے تھے حدیث شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں پوری کی۔ اس عرصے میں والد مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بمرض یرقان قبل السابع انتقال ہو گیا۔ ایام مرض والد مرحوم کے ممتاز نہ تھے گیارہ روز کل مرض رہا مگر چار پانچ روز بہت غفلت اور کرب رہا۔ لخلخہ سنگھانا اور پنکھا کرنا ہر وقت تھا ہم سو جاتے تھے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب برابر بیٹھے رہتے تھے۔" (سوانح قاسمی عارف باللہ صفحہ ۷۔۸)

اس عبارت سے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وہ ساری روئداد تعلیم سامنے آجاتی ہے جو نانوتے سے نکل کر مولانا مملوک علی صاحب کے ہمراہ دہلی پہنچنے پر ترقی پذیر ہوئی ہے۔ مناسب ہی نہیں بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں حصول تعلیم کی مختصر سوانح اور سرسری بیان کردیں۔

حجۃ الاسلام کی ترتیب حصول تعلیم:

حجۃ الاسلام کی اب تک تحصیل علم کی تربیت کا خلاصہ اس قدر رہا کہ ابتدائی تعلیم اور تعلیم کا آغاز وطن نانوتہ میں ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد دیوبند پہنچے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن

صاحبؒ کے عمِ اکبر (تایا) مولانا مہتاب علی سے عربی تعلیم کی ابتدا کی اور مہتابی مکتب میں پڑھتے رہے۔ پھر اپنے نانا کے یہاں سہارنپور آئے اور وہاں مولانا محمد نواز سہارنپوری سے عربی اور فارسی پڑھتے رہے اور پھر نانوتے تشریف لائے اور دہلی جانے تک کامل ایک سال یہیں پڑھتے رہے اور مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھی اس سال ان کی معیت نانوتے میں حاصل رہی۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کے آخر میں مولانا مملوک علی صاحب کی حج سے واپسی پر دہلی روانہ ہوئے۔ ۲ محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے اور ۴ محرم الحرام ۱۲۶۰ھ سے تعلیم کا آغاز کافیہ سے ہوتا ہے۔ اس عرصے میں تمام علوم وفنون کی کتابیں مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھی ہیں اور ان کی قابلیت کی شہرت تمام طلبہ میں پھیل چکی ہے۔ سب سے تعلیم میں آگے رہتے ہیں۔ مولانا مملوک علی صاحبؒ کا انتقال ذوالحجہ ۱۲۶۷ھ میں ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں حجۃ الاسلام کو پورے آٹھ سال اپنے استاذ محترم کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے۔

دہلی میں قیام و تحصیل علم کا مزید تجزیہ:

اس مقام پر حضرت عارف باللہؒ نے حجۃ الاسلام کے دہلی پہنچنے کے بعد چند امور کی طرف جو توجہ دلائی ہے قدرے اس کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ جب حجۃ الاسلام مولانا مملوک علی صاحبؒ کے ہمراہ دہلی پہنچے تو استاد محترم چونکہ رشتہ دار تھے اور خود ہمراہ لائے تھے اس لئے سرپرست نے اپنے مکان ہی پر آپ کو رکھا۔ جس محلے میں مولانا مملوک علی صاحب دہلی میں رہتے تھے اس میں مولانا نوازش علی صاحب کی مسجد تھی۔ مولانا نوازش علی کون بزرگ تھے ان کے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سوانح قاسمی میں بحوالہ آثار الصنادید مصنفہ سرسید مرحوم لکھتے ہیں:

> ”از بسکہ طبیعت ہدایت وارشاد کی طرف مائل ہے اور ساکنین شہر شاہجہان آباد (دہلی) اکثر بہ شوق اہتداء واسترشاد وعظ کہنے کے واسطے اپنے اپنے گھر میں ان (مولانا نوازش علیؒ) کو تکلیف دیتے ہیں۔ خلق وحلم میں یگانہ روزگار ہیں اور قناعت وتوکل میں شہرہ آفاق ہیں۔“ (آثار الصنادید حصہ سوم صفحہ ۷۲)

انہی محلے کے مولانا نوازش علیؒ کی مسجد کے قرب کے باعث حجۃ الاسلامؒ نماز پڑھنے

کے لئے جاتے تھے۔ دہلی میں جہاں جہاں بھی کوئی عالم صاحب رہتے وہاں وہاں ان کے گھر پر طلبہ تحصیل علم کرتے اور اس طرح کے درس دینے والوں کی دہلی میں کمی نہ تھی۔ سلطنت مغلیہ کا وہی دارالخلافہ تھا اسی لئے علوم کی تسکین و تحصیل کا وہی مرکز تھا۔ مولانا نوازش علیؒ کی مسجد میں بھی طلبہ رہتے تھے۔ جب ابتدا میں آپ کی ملاقاتیں ان سے ہوئیں تو طلبہ نے علمی مسائل چھیڑے۔ یکے بعد دیگرے حجۃ الاسلام سے بھی طلبہ نے مسائل علمی کا تذکرہ چھیڑا تو بقول عارف باللہؒ:

> ''(مسجد نوازش علیؒ میں) طالب علموں کا مجمع تھا۔ پوچھ پاچھ بحث شروع ہوئی۔ مولوی صاحب (مولانا محمد قاسمؒ) کی باری آئی۔ تو سب پر غالب آئے۔ اور جب گفتگو ہوتی سب پر غالب ہوتے۔'' (سوانح قاسمی عارف باللہ صفحہ ۲۸)

بلکہ قاسم العلوم اب ان کے قائد اور علمی مسائل کے لیڈر بن گئے چنانچہ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''ہم میں کوئی مغلوب ہوتا مولوی صاحب سے مدد چاہتا یا مولوی (محمد قاسمؒ) صاحب اس کی خود مدد کرتے۔ پھر تو مولوی صاحب ایسے چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی۔'' (صفحہ ۲۸)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ جو طلبہ مولوی نوازش علیؒ کی مسجد میں رہتے تھے وہ بھی مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے اثنائے بحث میں مدد لیتے تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اول تو پرائیویٹ گفتگوؤں میں ان سے آگے بڑھ گئے اور پھر وہ طلبہ جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ساتھ مولانا مملوک علیؒ صاحب پڑھتے تھے وہ سب قاسم العلومؒ سے پیچھے رہ گئے اور علمی قابلیت میں ان کے ساتھ مسابقت کی کسی کو گنجائش نہ رہی۔

ان حقائق کی روشنی میں قاسم العلومؒ کا عہد تحصیل علم نہایت درخشندہ اور روشن نظر آتا ہے گویا آپ ٹاپ موسٹ (اولین درجے کے) طالب علم تھے جو سب سے آگے چلے اور سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اور ایسے چلے کہ منطق اور فلسفے کی کتابیں نوکِ زبان تھیں کہ عبارت پڑھتے اور دماغ برق کی طرح سمجھنے میں ساتھ دیتا۔

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا ساتھ ۱۲۶۱ھ:

البتہ ۱۲۶۱ھ میں ایک اور طالب علم جو آگے چل کر قطب الارشادؒ کے مقام پر پہنچا اور حجۃ الاسلام کا ہمدرس ہوا وہ مولانا رشید احمدؒ صاحب گنگوہی تھے جو نہایت ذہین، فطین، سلیم اور ذکی تھے۔ ان دونوں حضرات کا ساتھ ۱۲۶۱ھ سے ہوا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب مصنف تذکرۃ الرشید لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد قاسم العلومؒ تو ۱۲۶۰ھ میں استاد الکلؒ (مولانا مملوک علی صاحب) کے ہمراہ دہلی آئے تھے مگر حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحبؒ) قدس سرہ ۱۲۶۱ھ میں دہلی پہنچے۔ آپ کو مولانا مملوک علی صاحبؒ کی خدمت میں آنے کا اتفاق ہوا اور آپ سبق میں شریک ہوئے۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحبؒ چندروز کے بعد ایسے ہم سبق بنے کہ آخرت میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔''

(تذکرہ جلد اول صفحہ ۲۷۔۲۸)

عہد طالب علمی کے علمی مباحثے:

یہ دونوں طلبہ حضرات میدان تحصیل میں علم کے گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے آگے بڑھے۔ دونوں میں عہد طالب علمی میں علمی بحثیں ہوتیں اور اساتذہ ذوق وشوق سے سنتے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''یہ طالب علمی کا سارا زمانہ گنگوہی و نانوتوی آفتاب و ماہتاب کا قریب قریب یکجا اور یکجہتی کے ساتھ گذرا۔ کبھی کسی مسئلہ میں دونوں حضرات کی باہم بحث بھی ہو جاتی۔ اور گھنٹوں تک رہا کرتی تھی۔ ان دونوں مشہور طالب علموں کا مباحثہ کچھ ایسا نہ ہوتا تھا جس کو دلچسپی کی نظر سے نہ دیکھا جاتا۔ اساتذہ بڑے شوق اور تعجب سے اس بحث کو سنتے اور سرتاپا کان ہو کر اس جانب متوجہ ہو جاتے تھے کبھی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے اور خاص و عام کا مجمع ہو جایا کرتا تھا۔ جانبین سے وہ وہ نکتہ سنجیاں اور باریک بینیاں ہوتی تھیں کہ باید وشاید۔ ایک بار ایک استاد نے دونوں کی گفتگو سن کر یوں فیصلہ فرمایا کہ قاسمؒ ذہین آدمی ہیں اپنی ذہانت سے قابو میں نہیں آتا ورنہ اس مسئلے میں رشید

احمد حق پر ہے۔" (تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۳۰ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی)

آپ نے اندازہ لگایا کہ دونوں کی بحثیں کس قدر دلچسپ ہوتی تھیں اور یہ بھی استاد صاحب کی رائے معلوم کی کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کتنے ذہین آدمی تھے۔ کسی مسئلے کا بھی کوئی پہلو لے کر مخالف کو سرگرداں وحیراں بنا دیتے تھے۔

اب ذرا اور آگے چلئے کہ تفسیر وفقہ، اصول، ادب، منطق وفلسفہ کی تمام کتابیں حجۃ الاسلامؒ نے مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھیں اور چند سال میں علوم وفنون کی کتابوں کو لپیٹ کر رکھ دیا سب اخراجات بھی استاد محترم ہی اٹھاتے تھے۔ کھانا بھی وہیں کھاتے تھے۔ حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ابن مولانا مملوک علی صاحبؒ کا ساتھ تھا۔

صاحب فرائد الدہر جو مولانا مملوک علی صاحبؒ کے دیکھنے والوں میں سے ہیں لکھتے ہیں:

> "مولانا مملوک علی صاحبؒ سوائے درس وہی طلبائے مدرسہ (عربی کالج) کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلبہ میں نصف شب تک منقسم ہیں۔"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلام گھر پر پرائیویٹ پڑھتے تھے۔ اس زمانے کے علماء اپنے سرکاری فرائض کے ساتھ گھروں پر طلبہ کو مفت تعلیم دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ مفتی صدر الدین صاحبؒ مدرسہ دار البقا میں بھی پڑھاتے تھے اور صدر الصدوری کے فرائض بھی سرکاری طور پر انجام دیتے تھے۔ علاوہ ازیں دیندار طلبہ کا طبقہ سرکاری عربک کالج میں پڑھنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ ماحول ہی ایسا تھا جس پر ہم عربک کالج کے عنوان میں اشارے کریں گے۔ مولانا آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ جیسے حضرات نے اس کالج میں پڑھ کر دنیاوی فوائد حاصل کئے ہیں۔

حضرت شاہ عبد الغنی صاحب محدث دہلوی

ساتویں استاد کی شاگردی میں:

حدیث کے سوا ہر قسم کے علوم وفنون کی کتابوں سے فراغت کے بعد اسی دوران میں

حجۃ الاسلامؒ نے حضرت شاہ عبدالغنیؒ بن شاہ ابوسعید مجددی دہلویؒ سے حدیث پڑھی۔ دہلی سے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ اور شاہ محمد یعقوب صاحبؒ جو دونوں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نواسے تھے اور اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ ۱۲۵۷ھ میں مکہ مکرمہ اور پھر مدینہ منورہ کو ہجرت فرما چکے تھے۔ اب حدیث کا دربار شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے دم سے لگتا تھا۔ لہٰذا مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب دونوں نے حدیث شاہ عبدالغنی سے پڑھی۔ حضرت عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

”حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم کی خدمت میں پڑھی۔“

(سوانح از عارف باللہ صفحہ ۷)

دراصل حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی یہ عبارت ترتیب تعلیم پر صاف روشنی نہیں ڈالتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح کو جب مولانا مملوک علی صاحب عربک کالج جاتے ہوں گے تو قدرے فنون کی بڑی کتابیں پڑھنے کے بعد دونوں حضرات شاہ عبدالغنی صاحب کی خدمت میں مولانا مملوک علی صاحب کی اجازت کے بعد پڑھنے جاتے ہوں گے۔

مولانا منصور علی خان صاحب جو حجۃ الاسلام کے خاص شاگردوں میں سے ہیں لکھتے ہیں:

”مولانا (شاہ عبدالغنی صاحب) مرحوم، مولانا محمد قاسم صاحب کے استاد حدیث تھے سوائے ابوداؤد کے صحیحین (بخاری و مسلم) و سنن ثلثہ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ان ہی سے پڑھے تھے۔“ (مذہب منصور مصنفہ مولانا منصور علی خان صفحہ ۱۸۱) بحوالہ سوانح قاسمی مصنفہ مولانا گیلانی صفحہ ۲۵۴

بہر حال حجۃ الاسلام نے دورہ حدیث جو آخری اور انتہائی تعلیم کا درجہ ہے۔ ابوداؤد کے سوا حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ بن شاہ ابوسعید دہلوی سے پڑھا۔

حجۃ الاسلام کا عربک کالج میں داخلہ:

حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ نے اب تک مولانا محمد قاسم صاحب کو پرائیویٹ طور پر پڑھایا تھا لیکن سرکاری کالج سے نسبت کے پیش نظر انہوں نے ان کو کالج میں داخل

کرادیا، حضرت عارف باللہ کے مذکورہ بالا پر پھر غور کیجئے:

> ’’والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے معترض نہ ہو جو میں ان کو پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا۔ ازبسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا۔ طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی یہ کب عاری تھے۔ ہر بات کا جواب باصواب تھا۔ آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا۔ سب اہل مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ صاحب کو کہ اس وقت میں مدرس اول انگریزی تھے نہایت افسوس ہوا۔‘‘ (صفحہ ۸)

اس عبارت سے واضح ہے کہ علوم شرقیہ اور فنون نیز علوم شرعیہ جب پورے کر چکے تھے تو مولانا مملوک علی صاحبؒ نے ان کا مدرسے سے تعلق قائم کر دیا۔ برائے نام تعلق تو کالج سے رہے لیکن پڑھانے کا ارادہ خود مولانا مملوک علی صاحب کا تھا۔ یعنی مدرس ریاضی سے یہ فرمایا کہ کالج میں داخل ہونے کے باوجود اگر وہ کلاسوں میں حاضر نہ ہوں یا آپ کی کلاس میں دھیان نہ دیں تو آپ اعتراض نہ کریں میں خود پڑھالوں گا اور ادھر حجۃ الاسلامؒ سے فرمایا کہ اقلیدس خود دیکھ لو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس مضمون کو بھی حاصل کرنے میں گوئے سبقت لے گئے۔ اساتذہ اور طلبہ کو اپنی ذہانت اور جلد حساب میں مہارت حاصل کر کے حیران کر دیا۔ مگر امتحان سالانہ نہ دیا اور چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے۔ کیونکہ آپ کا مقصد تعلیم مدرسہ سے دنیا کمانا نہ تھا۔ حالانکہ اسی عربی کالج کے طلبہ جج، صدر الصدوری اور ڈپٹی کلکٹر تک پہنچے اور شمس العلماء بنے لیکن آپ نے پروانہ کی۔ عربی کالج کے صدر یعنی ہیڈ ماسٹر کو بھی بہت افسوس ہوا۔ یہ ہیڈ ماسٹر کون تھے اس سلسلے میں بابائے اردو مولانا عبدالحق اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج میں لکھتے ہیں:

> ’’مسٹر ٹیلر نے دہلی کالج میں تیس برس تک ہیڈ ماسٹری کی اور دو تین سال پرنسپل رہے۔‘‘

(مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۵۷)

مسٹر ٹیلر ۱۸۵۷ء میں مارے گئے۔ لہٰذا اس حساب سے وہ ۱۸۲۴ء سے دہلی کالج کے ہیڈ ماسٹر رہتے آئے تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے زمانے میں یہی مسٹر ٹیلر ہیڈ ماسٹر تھے۔ جن کو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے کالج چھوڑ دینے کا افسوس ہوا۔

عربک کالج کے دوسرے استاد:

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عربک کالج کے بھی کوئی استاد حساب کے ضرور تھے جن سے کچھ پڑھا ہوگا لیکن عارف باللہ کی اس عبارت سے کہ مدرس ریاضی سے فرمایا کہ ان کے حال سے متعرض نہ ہو جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاضی بھی مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھی اور اقلیدس خود دیکھ لی اور حساب و اقلیدس مین ماہر ہوگئے۔ حتیٰ کہ منشی ذکاء اللہ صاحب جو مشکل سوال لے کر آئے تھے وہ بھی حل کر ڈالے اور یہ مشکل سوال جیسا کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے ماسٹر رام چندر نے دیئے تھے جو عیسائی ہوگئے تھے دراصل یہ ششماہی امتحان ہوگا۔ جس کے بعد سالانہ امتحان ہوتا مگر آپ نے اس سے پہلے ہی کالج چھوڑ دیا۔ بالفرض اگر مان لیا جائے کہ مدرس ریاضی بھی اِن کے استاد تھے۔ تو یہ کون تھے پتہ نہ چل سکا۔ ۱۲۶۶ یا ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اب اگر ہم عربک کالج کے اساتذہ کا جائزہ لیں تو "مرحوم دہلی کالج" مصنفہ بابائے اردو مولانا عبدالحق کی کتاب کی طرف رجوع کریں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "دہلی کالج میں ۱۸۴۲ء میں تعلیم کے دو شعبے تھے پہلے میں انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے علاوہ جدید یورپ کے علوم پڑھائے جاتے تھے اور دوسرے میں قدیم مشرقی زبانیں یعنی عربی، فارسی، سنسکرت پڑھائی جاتی تھیں۔ کالج میں بیس پروفیسر ملازم تھے۔ دہلی کالج کی نگرانی میں دو دوئم درجے کے کالج ہیں۔ ایک میرٹھ میں دوسرا بریلی میں۔ اساتذہ مولوی مملوک علی، مولوی سید محمد، مولوی سدید الدین، مولوی جعفر علی تھے۔"

بہرحال مولانا مملوک علی صاحب کے علاوہ ان تین حضرات میں سے کوئی بھی استاد

ہوسکتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی کے مدرسین میں ماسٹر رام چندر بھی بڑے مشہور ماسٹر تھے جو ۲۸/ فروری ۱۹۴۴ء میں کالج کے شعبہ مشرقی میں پچاس روپیہ مشاہرے پر یورپین سائنس کے مدرس ہوگئے۔ (مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۶۹) یہ بھی مولانا کے کلاس میں استاد ہونے چاہئیں لیکن ان سے مولانا نے نہیں پڑھا، اسی لئے مدرس ریاضی سے مولانا مملوک علی صاحب نے فرمادیا تھا کہ آپ ان سے تعرض نہ کریں۔ اول اس لئے کہ ہندو تھے دوسرے اس لئے کہ یہ عیسائی ہوگئے تھے اور عیسائی ہونے کی وجہ سے ہندو طلبہ بھی ان سے نفرت کرنے لگنے تھے۔ لہٰذا ارواح ثلاثہ کی حسب ذیل روایت کو ہم نہایت مستند جانتے ہیں جو حکیم الاسلام استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحبؒ نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی زبانی بیان فرمائی ہے:

> ”مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ مولانا نانوتویؒ دہلی میں مولانا مملوک علی صاحب سے جب تعلیم پاتے تھے تو وہاں کے کالج میں (تعلیم کے آخری سال) نام مولانا کا داخل تھا مگر بطور خود پڑھتے لیکن امتحانات کی شرکت لازمی تھی چنانچہ جب امتحان کا زمانہ آیا تو رام چندر جو بڑا مہندس تھا اور ہندو سے کرسٹان ہوگیا تھا ہندسہ کا استاد تھا اس نے مولانا کو بھی داخل ہندسہ کرنا چاہا لیکن مولانا مملوک علی صاحبؒ نے اس سے فرمایا کہ قاسم درس میں تو داخل نہ ہوگا مگر امتحان میں ضرور شریک ہوگا۔ اور یہ محض اپنی کمال فراست اور تجربے کی بنا پر فرمایا تھا۔ نیز مولانا نے گوارا نہ کیا کہ میرا استاد غیر مسلم ہو اور اس سے کراہت کی۔ بہرحال جب امتحان کا زمانہ قریب آگیا تو مولانا مملوک علی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اقلیدس کے مقالے اور اشکال دیکھ لینا امتحان دینا ہوگا۔ چنانچہ حضرت مولانا نے صرف ایک شب میں اقلیدس دیکھی اور چودہ پندرہ شکلیں دیکھی تھیں کہ اس سے جی گھبرا گیا تو چھوڑ دی اور پھر نہیں دیکھی۔ کالج میں اس کی شہرت تھی کہ فلاں طالبعلم ہندسہ میں بے پڑھے امتحان دے گا۔ حتیٰ کہ رام چندر کو بھی اس کا علم ہوا۔ تب اس نے اپنے مایہ ناز شاگرد مولوی ذکاء اللہ صاحب کو جو فن ہندسہ میں صاحب تصانیف بھی تھے بلا کر چند مشکل سوالات سمجھا دئے اور حضرت کی خدمت میں بطور امتحان بھیجا۔ انہوں نے سوالات کئے اور حضرت مولانا نے فرفر جوابات دینے شروع کئے اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ چند سوالات میں بھی کرتا ہوں۔ چنانچہ کئے

مگر وہ جواب سے عاجز رہ گئے۔" (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۲ از روایات الطیب)

مولانا قاسم العلوم کے مادر علمی عربی دہلی کالج کا تعارف:

یہ بات ماننے کے بعد کہ مولانا مملوک علی صاحبؒ نے حضرت حجۃ الاسلامؒ کو عربک کالج میں داخل کرا دیا تھا ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے اس کالج کا جس کو عارف باللہ نے سرکاری مدرسہ کہا ہے تعارف کرا دیں۔ مدرسہ غازی الدین، عربی مدرسہ، عربک اسکول، عربک اورینٹل کالج اور دہلی کالج سب اسی کے نام تھے۔

عربی کالج دہلی کی ابتدا:

جب سلطنت مغلیہ کا زوال ہوا اور مسلمانوں کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی تو ۱۷۹۲ء میں نواب غازی الدین خان فیروز جنگ ثانی خلف نظام الملک آصف جاہ نے دہلی میں مدرسہ غازی الدین کا اجرا کیا جس میں عربی فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ ۳۳ سال تک یہ اسی طرح چلتا رہا۔ ۱۸۲۴ء میں مدرسہ غازی الدین میں صرف نو طالب علم تھے اور مولوی عبداللہ ان کو تعلیم دیتے تھے ۱۸۲۵ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا۔ مسٹر ٹیلر پرنسپل مقرر ہوئے۔ چند مولویوں کی تنخواہ ایک سو بیس قرار پائی اور دو مولوی پچاس کے رکھے گئے باقی پچیس اور تیس تیس کے مقرر ہوئے۔

مولانا مملوک علیؒ کا تقرر:

مولانا مملوک علی صاحبؒ بھی غالباً اسی ایک سو بیس کی تنخواہ پر ۱۸۲۵ء میں ہی ملازم ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ورنہ ۱۸۴۲ء میں تو عربی کالج میں آپ کا ہونا یقینی ہے۔ جب مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو وہ اپنے ہمراہ دہلی لائے ہیں تو ۱۸۴۴ء تھا گویا ان کو ملازمت میں داخل ہوئے اور کالج کی پروفیسری کرتے ہوئے انیس سال ہو چکے تھے یا دو سال جبکہ ۱۸۴۲ء میں ان کی ملازمت کا آغاز مانا جائے۔ مگر دو سال کی ملازمت کے بجائے انیس سال قرین قیاس ہیں۔

انگریزی کلاس کا اجرا:

۱۸۲۸ء میں سرچالس مٹکاف برٹش ریذیڈنٹ کمشنر کی سفارش پر کالج میں ایک انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا اور لوکل فنڈ کے تعلیمی بجٹ سے دوسو پچاس روپیہ کالج کو عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کیلئے منظور کیے گئے۔ ہندو اور مسلمانوں دونوں میں بے چینی پھیل گئی۔ دونوں سمجھنے لگے کہ یہ ہمارے مذہب پر زبردست حملہ ہے۔ جب لڑکے انگریزی مدرسوں میں داخل ہوئے اور انہوں نے وہاں عیسائیت کا پروپیگنڈا دیکھا تو سمجھا کہ تعلیم کے نام پر ہمارے مذہب پر ڈاکہ ڈالنے کی یہ تدبیر کی گئی ہے مولانا حالی نے خود کہا ہے:

> ”دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب وروز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج تعلیم یافتہ لوگوں کو جاہل محض سمجھتے تھے۔ بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہیں گذرتا تھا ڈیڑھ برس میں دہلی رہا اس عرصے میں کالج کو جا کر نہیں دیکھا۔ بعد میں بعض واقعات ایسے پیش آئے کہ لوگوں کو یہ کہنا پڑا کہ ان کی بدگمانی اور خیال غلط نہ تھا۔“

(بحوالہ فرنگیوں کا جال از امداد صابری صفحہ ۱۷۰)

نواب اعتماد الدولہ کا وقف:

۱۸۳۰ء میں نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خان بہادر وزیر شاہ اودھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے کہا کہ میں ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم اس کالج کی امداد کیلئے برٹش گورنمنٹ کی تحویل میں دیتا ہوں جو نواب غازی خان مرحوم میرے ہم وطن نے دہلی میں عربی وفارسی علوم کی ترقی و تعلیم کے واسطے قائم کیا تھا جو میرے مذہبی علوم، اخلاق کے سرچشمے ہیں اور میں وصیت کرتا ہوں کہ رقم موصوفہ کا منافع ان علوم کے طلبہ اور اساتذہ پر خرچ کیا جائے (کانفرنس گزٹ علی گڑھ ۱۵/نومبر ۱۸۳۰ء) اسی ۱۸۳۰ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا اور وصیت پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ اہل دہلی نے اس رقم سے علیحدہ کالج بنانے کی درخواست کی لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ اہل دہلی نے انگریزی کو کالج سے نکالنے کی پرزور کوشش کی۔ چنانچہ انگریزی جماعت مشرقی مدرسے سے برائے نام علیحدہ کر دی گئی جبکہ پرنسپل اور نگران کمیٹی ایک ہی تھی۔

کالج کی خصوصیت:

اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تمام علوم اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ لیکن ایک جماعت سرکار اور انگریزی پرست پیدا ہوگئی جو مغربی علوم کی بالادستی چاہتی تھی ان کے پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کے ایک ریزولیوشن کے بعد لارڈ بینٹنگ گورنر نے سب مشرقی علوم عربی، فارسی، سنسکرت کا خاتمہ کردیا۔ ایسا کرنے پر سخت غم وغصہ کا اظہار ہوا۔ نہ صرف ہندو مسلمانوں میں بلکہ مسٹر شیکسپیئر نے بھی جو مشرقی علوم کے حامی تھے استعفیٰ دے دیا۔

شیکسپیئر کے بعد لارڈ میکالے کا تقرر رہا۔ یہ سخت متعصب تھا۔ اس کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کا اضطراب اور بڑھ گیا جن کی وجہ دیسی زبانوں کا خاتمہ، وظائف کی بندش، مشرقی مدارس کو گرانا تھا۔ لارڈ بینٹنگ کی جگہ گورنر لارڈ آکلنڈ آئے تو ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک چھٹی بنام کمیٹی کے ذریعہ مشرقی تعلیم کی تکمیل وترقی کی ترجیح کا فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ بعد ازاں جو رقم بچے اس کو انگریزی پر صرف کیا جائے۔ ۱۸۳۵ء میں تقریباً مدراس میں عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم اردو میں ہوئی تھی لیکن بعد ازاں مختلف حکمت عملیوں سے مشرقی علوم کو گرایا گیا۔ یہاں تک کہ مختلف زبانوں کے طلباء کی تعداد حسب ذیل رہ گئی:

۱۔ انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد	۱۹۹
۲۔ عربی پڑھنے والوں کی تعداد	۳۹
۳۔ فارسی پڑھنے والوں کی تعداد	۵۷
۴۔ سنسکرت پڑھنے والوں کی تعداد	۲۵

ٹیچر عیسائی ہوگئے:

کچھ عرصہ کے بعد ماسٹر رام چندر سائنس ماسٹر جو اردو میں سائنس پڑھاتے تھے اور لالہ چمن لال فرسٹ سب اسسٹنٹ سرجن عیسائی ہوگئے۔ اس پر بے حد شور مچا۔ ماسٹر جی کو ۱۱ جولائی ۱۸۵۳ء کو بپتسمہ ملا۔ بعد ازاں طلبہ کالج سے بہت بدظن ہوگئے اور داخلہ جو ہو رہا تھا رک گیا۔ مگر پھر بھی کالج چلتا رہا۔

۱۸۵۷ء:

کچھ سال بعد ہنگامہ آزادی برپا ہوا۔ کالج کھلا ہوا تھا صبح کے وقت پڑھائی ہو رہی تھی ساڑھے آٹھ بجے کچھ لوگ ہانپتے ہوئے جماعتوں میں بے تحاشا گھس گئے۔ یہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء پیر کا دن تھا۔ انہوں نے اپنے لڑکوں سے کہا گھر چلو غدر مچ گیا۔ یہ سنتے ہی لڑکے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اتنے میں میگزین کا چپراسی آیا اور کمانڈنٹ کا خط مسٹر ٹیلر کے نام لایا۔ لکھا تھا کہ شورش برپا ہو گئی ہے اور حالات لحہ بہ لحہ خراب ہے آپ فوراً مع انگریزی اسٹاف کے یہاں آجائیں اور میگزین میں پناہ لیں۔ پرنسپل ٹیلر، رائش ہیڈ ماسٹر، اسٹوارٹ سیکنڈ ماسٹر، اسٹینر تھرڈ ماسٹر بوکھلا گئے اور میگزین میں پناہ لی۔

ہندوستانیوں نے میگزین کا محاصرہ کر لیا۔ میگزین میں پانچ چھ افسر دو تین سارجنٹ تھے مقابلے پر اتر آئے۔ ہندوستانی سیڑھیوں کے ذریعہ میگزین کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ انگریزوں نے بے بس ہو کر میگزین کو آگ لگا دی۔ سینکڑوں ہندوستانی جل کر مر گئے اور یہ انگریز بھی۔ مسٹر ٹیلر اور مسٹر اسٹینر میگزین سے سلامتی کے ساتھ نکل بھاگے۔ رائس وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ٹیلر صاحب کالج کے احاطے میں بہ مشکل پہنچے اور اپنے بوڑھے خانساماں کی کوٹھڑی میں گھس گئے اس نے انہیں مولوی محمد باقر کے یہاں پہنچایا جو محمد حسین آزاد کے والد تھے دونوں کی دوستی تھی۔ انہوں نے ایک رات ٹیلر کو اپنے امام باڑے میں رکھا لیکن دوسرے دن ہندوستانی لباس پہنا کر رخصت کیا۔ بہرام خان کی کھڑکی کے پاس جب پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا اور لٹھوں سے مار ڈالا۔ مولوی محمد باقر صاحب کو پھانسی لگی۔ محمد حسین آزاد ایران بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور معافی عام کے بعد آئے۔ دن کے بارہ بجے کچھ دیر کے بعد کالج کا کتب خانہ لوٹا گیا۔ انگریزی کتابیں جلا دی گئیں اور عربی فارسی کی کتابیں علما کو دے دی گئیں۔ ہنگامہ آزادی فرد ہو جانے اور انگریزوں کے مکمل قبضے کے بعد ۱۸۶۴ء میں دہلی کالج دوبارہ کھلا۔ مگر اب آسمان و زمین دوسرے تھے۔ بالآخر ۱۸۷۷ء تک یہ کالج اپنے نئے نقشے پر چلتا رہا۔

۱۸۵۶ء:

دسمبر ۱۸۵۵ء اور دسمبر ۱۸۵۶ء کے اختتام پر طلبہ کی تعداد علی الترتیب ۳۷۲ اور ۳۴۵ تھی۔

دہلی کالج ۱۸۷۷ء میں مرحوم بن گیا:

یہ کالج ۱۸۷۷ء تک تو چلتا رہا لیکن خدا جانے گورنمنٹ کو کیا سوجھی کہ مذکورہ سن میں اس کو توڑ کر اس کا تمام سٹاف لاہور گورنمنٹ کالج میں بھیج دیا گیا اور دہلی کالج کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈبو دیا گیا۔ ڈاکٹر لائیٹنر جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل تھے اور پنجاب گورنمنٹ میں ان کا بہت رسوخ تھا وہ گورنمنٹ کالج کو ترقی دینا چاہتے تھے اس لئے ان کی خواہش پوری ہوئی۔ اس طرح دہلی اپنے عزیز کالج سے محروم کردی گئی۔ کالج ٹوٹنے کے بعد یہاں اینگلو عربک سکول ہوا جو بعد ازاں مشن کالج بن گیا۔ (ماخوذ از مرحوم دہلی کالج مصنفہ مولانا عبدالحق)

اس سلسلے یں مزید تفصیلات مرحوم دہلی کالج سے معلوم کی جاسکتی ہیں جو انجمن ترقی اردو اردو روڈ کراچی نے چھاپی ہے۔ اور جو ۱۸۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

مرحوم دہلی کالج کے قدیم طلبہ:

اس کالج سے ہندوستان کے بڑے بڑے نامور تعلیم حاصل کر کے نکلے جن میں خصوصیت سے شمس العلماء ڈپٹی مولوی نذیر احمد، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، ماسٹر رام چندر، موتی لال دہلوی، پنڈت من پھول مولوی ذکاء اللہ کے ہم جماعت، ماسٹر پیارے لال مولانا صہبائی کے شاگرد جن کے متعلق غالب نے ان کے دہلی سے بدل جانے پر لکھا ہے:

> ”فقیر اسد اللہ خان غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم اندوہ ہوا ہے وہ میرا جی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں ہے۔“

ان کے علاوہ پیرزادہ محمد حسین ایم۔ اے سیشن جج، خواجہ محمد شفیق ایم۔ اے، میر ناصر علی ایڈیٹر صدائے عام، مولوی کریم الدین وغیرہم اسی دہلی کالج کے ابنائے قدیم ہیں۔

حجۃ الاسلام:

غرض ہمارے مولانا محمد قاسم صاحب بھی برائے نام اس کالج میں داخل کر دیئے گئے تھے لیکن پڑھتے خود رہے یا مولانا مملوک علی صاحب سے پرائیویٹ طوز پر لیکن اس طور کے کالج میں امتحان دیئے بغیر ہی چھوڑ کر بھاگ نکلے حالانکہ اقلیدس اور ریاضی میں تھوڑے سے دنوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

حجۃ الاسلامؒ کے آٹھویں استاد حضرت مولانا احمد علی صاحب

محدث سہارنپوری:

یوں تو حدیث کی کتابیں جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں حجۃ الاسلامؒ نے شاہ عبدالغنیؒ سے پڑھیں لیکن ابوداؤد نہیں پڑھی تھی۔ اس کی وجہ خواہ کچھ ہو لیکن یہ کتاب پڑھنے سے نہیں چھوڑی تاکہ صحاح ستہ پورا ہو جائے اور نقص نہ رہ جائے۔ پھر یہ کس سے پڑھی، مولانا منصور علی صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ''اور ابوداؤد جو باقی تھی اس کو اپنی شہرت کے زمانے میں بغل میں دبا کر جناب مولوی احمد علی صاحب ''محدث سہارنپوری کی خدمت میں جا کر پڑھ لیا۔''

(مذہب منصور صفحہ ۱۸۲ بحوالہ سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۲۵۴)

اسی بات کی سند مولانا گیلانی نے ان اوراق میں لکھی ہوئی پائی ہے جس کو وہ سوانح مخطوط (غیر مطبوع) کہتے چلے آتے ہیں۔ یہ سوانح مولانا فخر الحسنؒ صاحب گنگوہی نے لکھی تھی لیکن ناقص حالت میں اس کے کچھ اوراق دار العلوم دیوبند کے خزانے میں محفوظ ہیں۔ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ بھی حضرت قاسم العلومؒ کے خاص شاگرد ہیں۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے:

> ''حدیث شریف شاہ عبدالغنی صاحبؒ قدس اللہ سرہ العزیز دہلوی اور مولانا احمد علی صاحب مرحوم سہارنپوری سے پڑھی۔''

(سوانح مخطوط صفحہ ۹ بحوالہ سوانح قاسمی مولانا گیلانی صفحہ ۲۵۴)

یہ یقینی ہے کہ مولانا قاسم العلومؒ کے استادوں میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ سہارنپوری بھی تھے۔ اوراس کی صحت درجہ تواتر پر پہنچی ہوئی ہے۔ حضرت عارف باللہ اپنے ایک خط بنام منشی محمد قاسم صاحب نیانگری مرید خاص کو ان کے خط کے جواب میں کہ انہوں نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی وفات کا حال پوچھا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

> ''تم نے حال انتقال جناب مولانا محمد قاسم صاحبؒ مرحوم کا پوچھا ہے؟ مولوی صاحب سہارنپور (مولانا احمد علی صاحبؒ کی بیماری پر مزاج پرسی کیلئے) تشریف لے گئے تھے۔ یہ سہارنپور کے رہنے والے محدث فقیہ مشہور تھے۔ ہمارے استاد تھے۔''

(مکتوب نمبر۴ بیاض یعقوبی صفحہ۱۰۳، ۱۰۴ مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ)

ہمارے کے لفظ میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ تینوں حضرات شامل ہیں۔

نویں استاد مفتی صدرالدین صاحب آزردہ دہلوی صدر الصدورؒ:

حجۃ الاسلام کے اساتذہ میں جناب مفتی صدرالدین صاحب کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ حیرانی تو یہ ہے کہ خود قاسم العلومؒ صاحب اپنی کسی تحریر میں اپنے کسی استاد کا نام نہیں لیتے۔ البتہ اپنے پیرومرشد کا اسم گرامی جابجا لکھا ہے۔ مگر مفتی صدرالدین صاحبؒ کا نام آپ کے استادوں میں لوگوں کی زبان پر آتا ہے۔ مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

> ''جیسے مولانا گنگوہیؒ نے کچھ کتابیں پڑھی تھیں اسی طرح مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بھی مان لیا جائے کہ مفتی صاحب سے مستفید ہوئے تھے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۶۷)

مولانا محمد میاں صاحب مصنف علمائے حق لکھتے ہیں:

> ''حجۃ الاسلامؒ اور امام ربانیؒ (مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی) کے دوسرے استاد جناب مولانا مفتی صدرالدین صاحبؒ تھے۔ یہ بھی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مشہور و معروف تلمیذ اوراس خاندان کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔''

(حصہ اول صفحہ ۷۰)

حجۃ الاسلامؒ کے استادوں میں مفتی صدرالدینؒ صاحب کا ہونا کچھ شہرت کے ذریعہ

معلوم ہوا ہے بعض صاحبان اس حقیقت کو بھی استاد ہونے کی دلیل بتاتے ہیں جو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''اور صحاح ستہ (مولانا گنگوہیؒ نے) قریب قریب کل حرفاً حرفاً شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھا۔ باقی کتابوں میں کلاً یا جزءاً آپ کو دیگر علما سے تلمذ رہا۔ انہی علمائے آخر میں مولانا مفتی صدر الدین صاحبؒ اور قاضی احمد الدین صاحبؒ پنجابی ہیں۔''

(تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۳۵)

اور چونکہ مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی دونوں یکجا ساتھ پڑھتے تھے۔ لہٰذا مفتی صدر الدین بھی استاد تھے۔ مگر اس حساب سے قاضی احمد الدینؒ صاحب بھی استاد ہونے چاہئیں مگر ایسا نہیں ہے۔

ایک اور دلیل مفتی صدر الدین صاحبؒ کے استاد ہونے کی یہ واقعہ بھی بیان کرتے ہیں جو مولانا عاشق الٰہی صاحب نے لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> غدر کے بعد حضرت (مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی) کو دہلی تشریف لانے کا اتفاق ہوا تو مفتی صدر الدین صاحب سے ملنے تشریف لے گئے۔ مفتی صاحب نہایت ہی شفقت و محبت سے ملے اور سب حالات پوچھنے لگے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو پوچھا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مطبع میں تصحیح کرتے ہیں آٹھ یا دس روپے تنخواہ ہے تو مفتی صاحب نہایت تعجب کے ساتھ ران پر ہاتھ مار مار کر فرمانے لگے ''قاسم ایسا سستا قاسم ایسا سستا۔'' پھر فرمایا کہ ''فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے۔''

(تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۳۳)

ہمارا خیال:

ہمارا خیال یہ ہے کہ مفتی صدر الدین صاحب بھی حجۃ الاسلام کے استاد تھے۔ میاں قاسم کا لفظ ایک استاد ہی شاگرد کو محبت کے لہجے میں کہہ سکتا ہے۔ پھر دہلی کے ہر قابل شخص سے علمی استفادہ کرنا دونوں حضرات کی فطرت تھی۔ مفتی صدر الدین صاحبؒ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں دار البقا کے مدرسے میں جو جامع مسجد کے پاس تھا تعلیم دیا کرتے تھے اور علوم عقلیہ میں

بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا گیلانیؒ سر سید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”مفتی صدر الدین صاحب بذات خود صدر الصدوری کے سرکاری فرائض کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری کئے ہوئے تھے اور دلی کی جامع مسجد کے ساتھ دار البقا کے نام سے عہد شاہجہانی میں جو شاہی مدرسہ قائم کیا گیا تھا اور دستبرد زمانہ سے گویا بے نام و نشان ہو چکا تھا۔ بیچارے مفتی صاحب مرحوم نے بقول سر سید احمد خان زر خطیر صرف کر کے از سر نو اس مدرسے کو مرتب کیا۔ اس مدرسے میں بھی مفتی صاحبؒ کی طرف سے تنخواہ پانے والے علما کی معقول تعداد تھی۔ جن میں حاجی محمد جونپوری جو شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگردوں میں تھے اور ملا سرفراز ماہر ریاضیات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے سوا بھی مولوی عبد الخالق، نواب قطب الدین خانؒ، مولوی نصیر الدین شافعیؒ، مولوی رستم علی خان، مولوی روشن علی، رکن الدین، مولوی منور الدین، مولانا ابو الکلام کے نانا اور شاہ محمد اسحاق صاحبؒ کے دوسرے شاگردوں کی بھی کافی تعداد دلی میں موجود تھی۔“ (سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۲۲)

نواب صدیق حسنؒ صاحب خود مفتی صدر الدین صاحبؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی سند میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> ”جملہ کتب معقول رسید از منطق و حکمت و از علم دین اکثر از بخاری و چیز از تفسیر بیضاوی و فقہ و اصول و عقائد و کلام و عربیہ از فقیر اکتساب نمودند۔“

نواب صدیق حسنؒ صاحب اپنے دہلی جانے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”او اخر سنۃ تسع وستین و مائتین والف درود آنجا اتفاق افتاد۔“

اور جو آپ کو سند ملی ہے۔ وہ ۱۲۷۱ھ میں مفتی صدر الدین صاحبؒ سے ملی ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن صاحبؒ اپنی مصنفہ کتاب اتحاف النبلا میں اپنے استاد مفتی صدر الدین صاحبؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

> در عصر خود یگانہ روزگار و نادرہ عصر بود ریاست درس و تدریس معقولات بالخصوص افتاء ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی و امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوان

بروے منتہی شدہ۔ در جمیع علوم از صرف ونحو ومنطق وحکمت وریاضت ومعانی وبیان و ادب وانشاء وفقہ وتفسیر وحدیث ید طولیٰ داشت وہمہ علوم را درس می گفت۔

طلبہ مدرسہ دار البقا زیر مسجد جامع دہلی غالباً طعام ولباس بلکہ بعضے ماہوار ہم از جناب اومی یافتند وتحصیل علم نزد او ودیگر علمائے شہری کردند۔ (اتحاف النبلا صفحہ ۲۶)

ترجمہ: اپنے زمانے میں یکتائے روزگار اور نادرہ عصر تھے معقول کی کتابوں کے پڑھانے میں بالخصوص دہلی کے مغربی ومشرقی وشمالی علاقوں کی فتویٰ نویسی میں، مدرسوں کے امتحان اور صدارت حکومت ودیوان کے اعلیٰ مدارج ان پر ختم تھے۔ تمام علوم صرف و نحو، منطق، فلسفہ، ریاضیات، معانی ومیان وادب وانشاء اور فقہ وتفسیر وحدیث میں کمال رکھتے تھے اور سب علوم پڑھاتے تھے۔

جامع مسجد دہلی کے نیچے مدرسہ دار البقا کے طلبہ اکثر کھانا اور کپڑا بلکہ بعض طلبہ ماہانہ نقد وظیفہ انہی کی ذات سے لیتے تھے اور ان سے اور دیگر علما سے علم حاصل کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس شخص نے شاہجہانی مدرسہ کو از سر نو زندہ کر کے مدرسین رکھے اور اپنی ذات سے طلبہ کو وظائف اور طعام ولباس کا انتظام کیا ہو وہاں طلبہ کا اجتماع کیوں نہ ہوگا اور اچھے اچھے مدرسین کا ان کے پڑھانے کیلئے معقول انتظام کیوں نہ ہوگا۔

الغرض مولانا محمد قاسم صاحب مفتی صدر الدین صاحب کے بھی شاگرد رہے ہیں۔ اور جو مدرسین ان کے یہاں تھے ان میں سے بھی بعض ان کے استاد ہوں گے لیکن کسی کا ان میں سے تعین مشکل ہے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مولف مولوی رحمٰن علی صاحب نے مفتی صدر الدین کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ایوب صاحب، قادری نے کیا ہے۔ اور خود بھی مترجم نے مفتی صاحب پر ایک نوٹ لکھا ہے۔ وہ دونوں ہم مزید معلومات کیلئے درج ذیل کرتے ہیں۔

مفتی صدر الدینؒ دہلوی

ان کی اصل کشمیر سے ہے وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم نقلیہ کی تحصیل شاہ عبد العزیز، شاہ عبد القادر اور شاہ محمد اسحاق سے کی اور علوم عقلیہ مولوی فضل امام خیر آبادی سے حاصل کئے۔

اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی کے صدر الصدور اور مفتی مقرر ہوئے۔ صاحب مروت واحسان تھے۔ مدرسہ دار البقا کے اکثر طلبہ کو جو جامع مسجد دہلی کے نیچے تھے۔ کھانا اور لباس دیتے تھے ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانے میں فتویٰ جہاد کے اتہام میں منصب اور جائداد منقولہ وغیر منقولہ ان سے چھین لی گئی۔ اور جائداد منقولہ جو نیلام ہو چکی تھی نہ ملی۔ اس کے بعد بھی درس دیتے تھے۔ موزوں طبع تھے۔ عربی، فارسی اور اردو میں اشعار کہتے تھے۔ ان کا تخلص آزردہ تھا۔ دور دور سے لوگ آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے کثرت درس کی وجہ سے تصنیف کی طرف توجہ کم تھی۔ رسالہ ”منتهى المقال في شرح حديث لا تشد الرحال ” در النضود فی حکم مرأۃ المفقود اور بہت سے فتووں کے جوابات ان سے یادگار ہیں۔ دو سال فالج کے مرض میں مبتلا رہے۔ اکیاسی سال کی عمر میں بروز پنجشنبہ ۲۴/ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء میں فوت ہوئے مولوی ظہور علی المخاطب بہ شمس الشعراء نے ان کی تاریخ وفات یوں کہی ہے:

چہ مولانائے صدر الدین کہ در عصر   امام اعظم آکر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر   بعدل و داد چو نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت   کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم   وداع او سوئے دار الجناں بود
ظہور افسوس آن استاد ذی قدر   پدر وارم ہمیشہ مہربان بود
چراغش ہست تاریخ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود
۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء

(تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۲۴۷۔۲۴۸)

مترجم ایوب صاحب قادری حاشئے میں لکھتے ہیں:

”مفتی صدر الدین بن شیخ لطف اللہ کشمیری ۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ مفتی اور صدر الصدور کے عہدوں پر ممتاز رہے انگریزی سرکار میں بڑی عزت تھی جب جنرل

آکڑلونی راجپوتانہ کا پریذیڈنٹ مقرر ہوا تو اس کے ہمراہ رہے۔ چار سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی آکڑلونی مفتی صاحب پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ یہ بھی اس کے کلید دانش تھے۔ طلباء کو گھر پر درس دیتے تھے۔ مدرسہ دار البقا کو از سرِ نو جاری کیا۔ طلبہ کے جملہ مصارف کے کفیل ہوتے تھے۔ دہلی میں مفتی صدر الدین آزردہ کی امتیازی حیثیت تھی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتوائے جہاد پر دستخط کئے اس کی وجہ سے گرفتاری، عزل، منصب اور ضبطی جائداد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد رہائی ہوئی۔ نصف جائداد واگذاشت ہوئی۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سر سید احمد خان بہادر نے آثار الصنادید میں ہر زبان کا نمونہ کلام درج کیا ہے۔ خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے۔ ریختہ گو شعراء کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ قریب تین لاکھ روپیہ کی مالیت کا کتب خانہ ۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گیا۔ اس کے حصول کیلئے لارڈ لارنس کے پاس لاہور پہنچے۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ مرزا غالبؔ، مومنؔ، مصطفیٰ خان شیفتہؔ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ سر سید احمد خان بہادر، نواب یوسف خان والی رام پور، نواب صدیق حسن خان قنوجی، مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی محمد منیر نانوتوی، مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی فقیر محمد جہلمی وغیرہ مفتی صاحب کے شاگرد تھے۔ لاولد فوت ہوئے۔" (تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۲۴۸)

محمد ایوب صاحب قادری اور تذکرہ علمائے ہند اور اتحاف النبلا کے تذکروں سے مفتی صاحب کے موٹے موٹے حالات تقریباً سب ہی آگئے ہیں۔ قادری صاحب کی تحقیق میں بھی حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہیں۔

نزہۃ الخواطر میں مفتی صدر الدین صاحب کے حالات یہی ہیں جو قادری صاحب نے درج کئے ہیں۔ البتہ ایک اور حقیقت بھی انہوں نے واضح کی ہے وہ وظیفہ خوار طلبہ کی تعداد کے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں:

فلما ثارت الفتنة العظيمة بالهند ثم غلبت الحكومة الانكليزية على الخارجين عليها انهموه بافتاء البغي والخروج فاخذوه

> **ونهبوا امواله ثم اطلقوه فلازم بيته و قصر همته على الدرس والافادة و كان يوظف خمسا و عشرين نفسا من طلبة العلم فى "مدرسة دار البقاء" عقيب الجامع الكبير بدهلى و يحسن اليهم كانة ويضيفهم ومجالسهم ويفرئهم فى علوم متعدوة.**

(نزہۃ الخواطر جلد ۷ صفحہ ۳۲۱)

ترجمہ: جب ہندوستان کا بڑا فتنہ بلند ہوا اور اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں پر حکومت انگریزی غالب آ گئی تو مفتی صدرالدین صاحب پر لوگوں نے بغاوت کے حق میں فتویٰ دینے کا الزام لگایا۔ حکومت نے ان کو گرفتار کیا اور انکا مال لوٹ لیا پھر آزاد کر دیا تب مفتی صاحب نے گھر سے پاؤں نہ نکالا اور صرف پڑھانے اور فائدہ پہنچانے پر اپنی ہمت صرف کر دی۔ اور دہلی جامع مسجد کے پیچھے مدرسہ دارالبقا میں پچیس طلبہ کو وظیفہ دیتے تھے اور سب کے ساتھ حسن سلوک کرتے اور ان کی ضیافت کرتے، ان کے ساتھ مجلس لگاتے اور ان کو مختلف علوم پڑھاتے تھے۔

غرض یہ ہے کہ مفتی صاحب نہایت فاضل، محقق، اعلیٰ پائے کے مفتی، ماہر علوم عقلیہ ونقلیہ، عربی، فارسی اور اردو کے زبردست شاعر، عربی اور فارسی کے بہترین انشاء پرداز طلبہ کے مونس و غمخوار، علم دوست، کتابوں کے عاشق، اتنے بڑے عاشق کہ ان کے کتب خانے میں تقریباً تین لاکھ کی مالیت کی کتابیں تھیں جن کو انگریز بندروں نے ان سے چھین کر ان کے دل و جگر کے ٹکڑے علیحدہ کر لئے۔ ہر سال یوں تو بہت سے طلبہ کا ہجوم ہوتا لیکن غریب طلبہ کو وظیفے دیتے اور عام طلبہ کی ضیافتیں کرتے جن میں نواب صدیق حسن خانؒ صاحب جیسے طلبہ بھی تھے۔ مفتی صاحب صدر الصدور تھے یہ عہدہ سلطنت مغلیہ کے زمانے سے چلا آتا تھا۔ آپ مقدمات کے فیصلے کرتے تھے گویا چیف جسٹس تھے۔ رشوت خوار بالکل نہ تھے۔ لیکن ہنگامہ آزادی سے پہلے چونکہ گورنمنٹ کے ملازم تھے اس لئے متقین علما اس بات کو پسند نہ کرتے تھے اور شکوک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ شاہ محمد اسحاق صاحبؒ دہلوی سے کتابیں منگوائیں اور ان کی جلدیں اپنے پاس سے بندھوا کر واپس کر دیں تو شاہ صاحب نے جلدیں

اکھاڑ دیں۔ حالانکہ مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ میری پاک آمدنی سے بندھوائی گئی ہیں لیکن شاہ صاحب حد سے زیادہ متقی تھے۔ یہ بات گوارا نہ کی۔ لیکن یہ ہے بڑی دل شکنی کی بات جس کی میں شاہ صاحب سے معافی چاہتا ہوں مگر تقویٰ کا مقام ہی کچھ ایسا ہے جس کا دوسرا نام احتیاط ہے۔ رہے سدا نام اللہ کا۔ آپ ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء میں اکیاسی سال کی عمر میں دو سال فالج میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

مفتی صدر الدین صاحبؒ کے حالات تفصیل کے ساتھ یہاں بیان کر دئے گئے ہیں۔ لہٰذا آئندہ اوراق میں آپ کے اساتذہ کے حالات میں جو علیحدہ تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ وہاں مفتی صاحب کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مختصر حالات اساتذہ

حجۃ الاسلامؒ کے اساتذہ کا اس مقام پر تعارف کرانا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص کے حالات زندگی میں اساتذہ کے تعارف کے بغیر صاحب سوانح کی شخصیت پر پوری روشنی نہیں پڑتی۔ اس لئے ہم ان کے اساتذہ کا آپ سے تعارف کرانے کی طرف عنان قلم موڑتے ہیں۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی کا آغاز کتاب میں خاندانی علما کے ضمن میں مفصل حال آچکا ہے۔ اسی طرح گذشتہ صفحات میں مفتی صدر الدین صاحبؒ کا حال بھی تفصیل سے آچکا ہے۔ البتہ نانوتے کے مکتب کے استاذ صاحب اور سہارنپور کے مولانا محمد نواز صاحب کے حالات ہمیں باوجود کوشش کے نہ مل سکے۔

علمائے نانوتہ کے باوا آدم

مولانا مملوک علی صاحبؒ کے مختصر سوانح:

جیسا کہ مفتی محمود احمد صاحب (ابن مولانا محمد اسماعیل صاحب نانوتوی رفیق خاص حجۃ الاسلام) نے میرے لئے حضرت نانوتوی کے بعض قلمی حالات میں تاریخ پیدائش کے متعلق لکھا ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب ۱۲۰۴ھ (مطابق ۱۷۸۹ء) میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے اور وہی آپ کا آبائی وطن ہے۔ آپ کے والد کا نام نامی مولانا احمد علی تھا۔ حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم

دیوبند متوفی ۱۳۰۲ھ کے والد محترم تھے۔ آپ بچپن میں دہلی تشریف لے گئے اور وہیں تمام ترتعلیم حاصل کی۔ علوم وفنون عربیہ مولانا رشید الدین صاحب دہلوی سے پڑھے۔ تحصیل علوم کے بعد عربک دہلی کالج میں ۱۲۶۷ھ تک ملازم رہے۔ ۱۲۵۸ھ میں حج کیا۔ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور شرح موطا امام مالک اوجز المسالک میں تحریر فرماتے ہیں:

> واما مولانا مملوک علی شیخ المشائخ العظام واستاذ الکل فهو ابویعقوب و بن الشیخ علامه احمد علیؒ... اخذ اکثر الکتب الدرسیة بل جمیعها عن العلامة الشیخ الاجل مولانا رشید الدین خان الدهلوی وهو من ارشد تلامذه الشیخ الاجل الاکبر مولانا الشاه عبدالعزیز الدهلوی الشہیر فی عالم الحدیث وکان (مولانا مملوک علی) رحمه الله ماهراً فی المعقول والمنقول بارعاً فی الاصول والفروع تقدم فی العربیة والفقه نصار امام زمانه واستاذ اوانه وانتهت الیه ریاسة الکلیة العربیة الانکلیزیة بدار السلطنة دهلی ویکفیک من جملة مفاخره الجزیلة ان البدرین النیرین القطب الگنگوهی والبحر النانوتوی کانا من تلامذة و ولده العلامة الشیخ محمد یعقوب کان رئیس المحدثین بالکلیة الدیوبندیة العلیة الشهیرة فی الافاق. توفیؒ (مولانا المملوک علی) فی الحادی عشر من ذی الحجة سنتا سبع و ستین ومائتین و الف من الهجرة و قد مرض احدی عشرة یوما فی مرض یرقان رضی الله تعالیٰ عنه وارضاه.

ترجمہ: لیکن مولانا مملوک علی ایک بہت بڑے استاد بلکہ استاذ کل وہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد اور شیخ علامہ احمد علی صاحب کے فرزند ہیں۔ انہوں نے اکثر درسی کتابیں بلکہ تمام شیخ اجل علامہ مولانا رشید الدین خان دہلوی سے پڑھیں جو کہ شیخ اجل

> الاکبر مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور جو مشہور عالم محدث تھے مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ علوم عقلی و نقلی میں ماہر تھے اور اصول و فروع علم میں بڑے فائق تھے۔ عربی لٹریچر اور فقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس لئے اپنے زمانے کے امام اور استاذ بن گئے۔ تا آنکہ دہلی کے سرکاری مدرسہ (دہلی کالج) کے صدر مدرس (شعبہ علوم شرقیہ) کے درجے پر فائض ہوئے۔ اور ان کے قابل فخر امور میں سے یہ ہے کہ قطب گنگوہی (مولانا رشید احمد صاحب) اور بحر علم (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) دونوں روشن بدر مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے اور ان کے فرزند علامہ شیخ محمد یعقوب مشہور عالم دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے مولانا مملوک علی ذوالحجہ کی ۱۱، ۱۲۶۷ھ کو دنیا سے رحلت فرما گئے اور کل گیارہ روز مرض یرقان میں بیمار رہے۔ اللہ ان سے راضی رہے اور ان کو خوش رکھے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا مملوک علی صاحب دہلی کالج میں صدر علوم شرقیہ رہے۔ لیکن آپ کس سن میں ملازم ہوئے یہ مسئلہ قابل تحقیق ہے۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق مرحوم اپنی تصنیف مرحوم دہلی کالج میں ۱۸۲۵ء کے حالات میں بعض اساتذہ کے تقرر اور مدرسہ غازی الدین کو عربی کالج بنانے کی تجویز پر عمل درآمد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس مجوزہ کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اور شاہانہ عطیہ میں اس کالج کے لئے پانچسو روپیہ ماہانہ مقرر کئے گئے۔ مسٹر جے ٹیلر مقامی مجلس کے سیکرٹری ایک سو پچھتر روپیہ ماہانہ پر اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ چند مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپے قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے باقی پچیس اور تیس تیس کے تھے۔ طلباء کیلئے بھی وظیفے مقرر ہوئے۔''

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۵ء میں جب عربی کالج میں مولویوں کو رکھا گیا ہے۔ تو مولانا مملوک علی صاحب بھی غالباً ۱۸۲۵ء میں پہلے اغلباً پچاس روپیہ کے مولویوں میں رکھے گئے ہوں گے اور بعد ازاں آپ کی ترقی ہوتی رہی ہوگی یا شروع ہی میں ہیڈ مولوی رکھے

گئے ہوں گے مگر یہ بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ آئندہ تحقیقات سے معلوم ہوگا۔ ۱۸۲۵ء میں مولانا مملوک علی صاحب کی عمر چھتیس سال کو پہنچتی ہے کیونکہ آپ کی پیدائش ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء ہے مولانا عبدالحق بابائے اردو نے ''مرحوم دہلی کالج'' میں ایک جگہ آپ کا ذکر ۱۸۴۲ء کی رپورٹ کے سلسلے میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''کالج میں بیس پروفیسر ملازم تھے............ اساتذہ مولوی مملوک علی، مولوی سید محمد، مولوی سید الدین، مولوی جعفر علی تھے۔''

۱۸۴۳ء میں مشرقی شعبے میں عربی مضمون کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالحق صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

> ''عربی میں مولانا مملوک علی کی جماعت کے کل طلبہ گیارہ تھے (جس کا نصاب یہ تھا) مقامات حریری ۲۵ مقامے سے آخر تک ہدایہ کتاب الاقرار سے آخر تک، ریاضی اقلیدس کے چار مقالے، تاریخ تیموری (اردو) تمام رقعات ابوالفضل، کتاب حساب کی پہلی اوراور دوسری فصل، براؤن کی کتاب حساب عملی جغرافیہ مرآۃ الاقالیم اردو فریق اول۔'' (مرحوم دہلی کالج صفحہ ۸۳)

''تذکرہ علمائے ہند'' کے مترجم محمد ایوب صاحب قادری حاشیے میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا مملوک علیؒ بن حکیم احمد علی شیخ زادگان نانوتہ سے تھے۔ دہلی میں تحصیل علم کی۔ مولانا رشید الدین خانؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ دہلی کالج میں ایک مدت تک مدرس علوم شرقی اور پھر مدرس اعلیٰ رہے۔ مولانا مملوک علیؒ نے تحریر اقلیدس (چار مقالوں) کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی ایک تصنیف تاریخ یمنی کا مخلوط بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ مولانا مملوک علیؒ بقول مولانا عبیداللہ سندھی صرف ایک مدرس اور عالم ہی نہ تھے بلکہ ولی اللّٰہی تحریک کے ایک سرگرم کارکن تھے اور جب مولانا شاہ محمد اسحاق صاحبؒ ہجرت کر کے چلے گئے تو ہندوستان میں تحریک چلانے کیلئے انہوں نے جو بورڈ بنایا تھا اس کے ممبر مولانا مملوک علیؒ بھی تھے۔ مولانا کے خاص شاگردوں میں مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ، مولانا محمد قاسم

نانوتویؒ، مولوی احمد علی سہارنپوریؒ محدث جیسے اکابر علماء ہیں۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ تفصیل کیلئے دیکھئے:

۱۔ تذکرہ اہل دہلی مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی صفحہ ۹۸

۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۸۱۔ ۱۸۲

۳۔ تاریخ شعرائے اردو صفحہ ۴۶۳۔ ۴۶۴

۴۔ مرحوم دہلی کالج صفحہ ۱۵۱۔" (ترجمہ تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۳۶۱)

ہم نے قادری صاحب کی ساری ہی عبارت درج کردی ورنہ مقصد یہ تھا کہ مولانا مملوک علی صاحب ایک مدت تک مدرس علوم شرقی اور پھر مدرس اعلیٰ رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ولی اللہ تحریک کے ایک رکن تھے۔ اسی لئے شاہ محمد اسحاقؒ اور شاہ محمد یعقوبؒ صاحب کے ہجرت کرنے کے وقت وہ بھی خاموشی سے حج کی تیاری میں مصروف تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی تصنیف سے تاریخ یمنی بھی ایک کتاب تھی۔ اور یہ عربی کی دوسری کلاس کے کورس میں موجود تھی۔

مختصر یہ کہ مولانا مملوک علی صاحب ۱۸۲۵ء میں جبکہ ان کی عمر چھتیس سال کی پوری ہوچکی تھی دہلی کالج میں مولوی کی پوسٹ پر ملازم ہوئے اور بعدازاں میر مولوی یا صدر شعبہ علوم مشرقی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مگر حیرانی یہ ہے کہ "طبقات شعرائے ہند" کے مصنف مولانا عبدالکریم نے جیسا کہ آپ آئندہ سطور میں پڑھیں گے ۱۸۴۸ء میں مولانا مملوک علی کی تنخواہ سو روپیہ لکھی ہے اور ساتھ ہی آپ کو میر مولوی بھی لکھا ہے۔ حالانکہ میر مولوی کی ابتدا کی تنخواہ ایک سو بیس روپیہ تھی۔ لہٰذا ہمارے خیال میں سو روپیہ کی تنخواہ مشکوک ہے۔

مولانا مملوک علی صاحب دارالبقا میں:

گذشتہ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب دہلی کالج میں ۱۸۲۵ء میں ملازم ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر چھتیس سال تھی۔ علوم کی تحصیل سے وہ زیادہ سے زیادہ بیس سال میں فارغ ہوگئے ہوں گے تو اتنے عرصے کہاں رہے۔ بعض صاحبان نے ان کو مدرسہ دارالبقا میں بھی ملازم ثابت کیا ہے۔ جس کو مفتی صدرالدین نے

جاری کیا تھا۔ چنانچہ نزہۃ الخواطر کے مصنف لکھتے ہیں:

> الشیخ العالم الکبیر مملوک العلی بن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ الصدیقی النانوتوی احد الاساتذہ المشھورین ولد ونشا بنانوتہ قریۃ من اعمال "سھارنپور" وقرأ ایاما فی بلادہ ثم دخل دھلی واخذ عن العلامۃ رشید الدین الدھلوی و عن غیرہ من العلماء و تفنن فی الفقہ والاصول العربیۃ مع مھارۃ تامۃ فی المنطق والحکمۃ ولی التدریس بمدرسۃ "دارالبقاء" فدرس وافاد مدۃ عمرہ وافنی قراہ فی ذالک حتی ظھر تقدمہ فی العلماء اخذ عنہ نخلق کثیر لایحصون بحد وعد الخ

(نزہۃ الخواطر جلد ۷ صفحہ ۴۸۷)

> ترجمہ: شیخ عالم کبیر مملوک علی بن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ صدیقی نانوتوی مشہور اساتذہ میں سے ایک، نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے اور تربیت پائی۔ کچھ عرصے اپنے دیار میں تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی میں داخل ہو گئے اور علامہ رشید الدین دہلوی اور دیگر علماء سے علم حاصل کیا اور فقہ، اصول اور عربیت میں کمال حاصل کیا۔ اور منطق و فلسفہ میں بھی مہارت پیدا کی۔ ''مدرسہ دارالبقا'' میں درس دیا بعد ازاں بھی درس دیتے رہے اور اپنی تمام عمر فیض تعلیم پہنچاتے رہے تا آنکہ اس میں اپنے آپ کو گھلا ڈالا اور علما میں ان کو امتیاز حاصل ہو گیا۔ بے شمار طلبہ نے ان سے تعلیم حاصل کی۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف نے ''دارالبقا'' میں پڑھانے کا ذکر کیا ہے اور عربی دہلی کالج کو قطعاً فراموش کر دیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نزہۃ الخواطر کو دھوکا لگا ہے کہ انہوں نے دہلی عربک کالج کو ہی مدرسہ دارالبقا سمجھ لیا ہے جو زبردست لغزش ہے۔ ہاں اگر وہ یہ لکھتے کہ مولانا دارالبقا میں ملازم رہے اور پھر دہلی کالج میں تو بات اور تھی۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے بھی قصص الاکابر میں فرمایا ہے کہ:

''مولانا مملوک علی صاحبؒ جو کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے والد اور مولانا رشید احمد

صاحبؒ اور مولانا محمد قاسمؒ صاحب کے استاد ہیں دہلی میں دارالبقا سرکاری مدرسہ تھا اس میں ملازم تھے۔" (صفحہ ۱۳۲ الہادی ماہ شعبان ۱۳۵۶ھ قصص الاکابر)

اب دیکھئے حضرت تھانوی نے بھی دارالبقا کو سرِکاری مدرسہ فرمایا ہے اور سرکاری مدرسہ دہلی عربی کالج تھا۔ اگر دہلی عربی کالج کا بھی دارالبقا کے ساتھ ذکر کیا جاتا تو پھر بات صاف ہوتی۔

فیصلہ:

ہمارے خیال میں مولانا مملوک علی صاحب تحصیل علم کے بعد کسی وقت مفتی صدر الدین صاحب کے مدرسہ "دارالبقا" میں بھی عربی کالج کی ملازمت ۱۸۲۵ء سے پہلے پڑھاتے ہوں گے اور بعد ازاں عربی کالج میں ملازمت اختیار کی ہوگی۔

مولانا مملوک علی صاحب سرسید کی نظروں میں:

سرسید بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ وہ اپنی کتاب آثار الصنادید حصہ دوم میں مولانا مملوک علی صاحبؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

> "کتب درسیہ کا استحضار (حافظہ) ایسا ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینہ عالم خالی ہو جائے تو ان کے لوحِ حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے۔" (صفحہ ۷۰)

مختصر یہ ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب ہندوستان کے بڑے بڑے اہل علم و فضل مثلاً مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا احمد علی صاحبؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ دیوبندی، مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی، مولانا محمد احسن صاحبؒ نانوتوی، مولانا محمد منیر صاحبؒ نانوتوی، مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دیوبندی، سرسیدؒ، شمس العلماء ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین ایل، ایل، ڈی، مولوی نذیر احمد کے استاد تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور گمنام ہستی جو مولوی سمیع اللہ منصف کی تھی وہ بھی مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ علی گڑھ کالج جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے موسوم ہے اول اس کے بانی جبکہ یہ سکول کی صورت میں تھا یہی مولوی سمیع اللہ خان تھے۔ سرسید نے بھی اس کام میں ان کا ساتھ دیا تھا

مولوی سمیع اللہ صاحب علی گڑھ میں سب جج (منصف) تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے علی گڑھ میں سکول کی بنیاد ڈالی۔ ان باتوں کی نشان دہی مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۲۶۸ پر مولوی بشیر الدین صاحب کی کتاب ''دار الحکومت دہلی'' کے حوالے سے کی ہے۔ یہی مولوی بشیر الدین صاحب اپنی اسی کتاب میں مولانا مملوک علی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے۔''

(دار الحکومت دہلی جلد ۲ صفحہ ۵۸۴)

اور پھر جلد دوم کے اسی صفحہ پر مولوی بشیر الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''آپ کے (یعنی مولانا مملوک علی صاحب) کے ہزاروں شاگرد صاحب ثروت و اقتدار تھے۔''

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

> ''ایک شمس العلماء ڈاکٹر یا مولوی سمیع اللہ صاحب ہی کیا سچی بات تو یہ ہے کہ دلی عربک کالج کے استاذ ہونے کی وجہ سے مولانا مملوک علی صاحب سے پڑھنے اور مستفید ہونے کے مواقع جن جن لوگوں کو میسر آئے اور فارغ ہونے کے بعد نئی قائم شدہ حکومت کی مشینری میں شریک ہو کر عروج و ارتقا کی بلندیوں تک جو پہنچے ان کو آج گن کر کون بتا سکتا ہے۔'' (سوانح قاسمی گیلانی جلد ۱ صفحہ ۲۶۹)

ہمیں مولانا گیلانی کے اس خیال سے اختلاف ہے کہ عربک کالج دہلی سے نکلے ہوئے مولانا مملوک کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے بلکہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ جن طلبہ کو وہ گھر پر تعلیم دیتے تھے وہ شمار میں بہت زیادہ تھے جیسا کہ نزہۃ الخواطر نے ظاہر کیا ہے۔

مولانا مملوک صاحب بحیثیت محدث و معلم فنون:

حضرت عارف باللہؒ نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ صدرا اور شمس بازغہ اس طرح پڑھتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے اس عبارت سے صرف یہی نہ سمجھا جائے کہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ان سے صرف منطق و فلسفہ کی ہی کتابیں پڑھی تھیں بلکہ کافیے کے علاوہ نصاب میں علوم و فنون کی جو بھی کتابیں تھیں وہ سب انہوں نے مولانا

مملوک علی صاحبؒ سے پڑھی تھیں۔ چنانچہ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ تذکرۃ الرشید میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> ''صحاح ستہ کے علاوہ معقول میں منطق و فلسفہ ادب، و ہیئت و ریاضی اور منقول میں تفسیر و اصول و فقہ و معانی وغیرہا اکثر کتابیں آپ (مولانا رشید احمدؒ) نے مولانا الشیخ مملوک علی صاحب سے پڑھیں۔''

لہٰذا چونکہ حجۃ الاسلام ان کے ساتھی اور ہمدرس تھے اس لئے تفسیر، فقہ، معانی، ادب کی کتابیں مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے بھی مولانا مملوک علی صاحبؒ سے پڑھی تھیں۔

علاوہ ازیں مولانا مملوک علی صاحب حدیث بھی پڑھاتے تھے۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اپنی اور مولانا خلیل احمد صاحب کی سند حدیث کے متعلق اوجز المسالک شرح موطا امام مالک کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> **واما سندی الثانی فهو بطریق مولانا الشیخ الحافظ الحجة ابی ابراهیم خلیل احمدؒ وله مرح خمسة اسانید الاول انه اخذ کتب الحدیث کلها عن الشیخ الامام الهام الحافظ الحجة مولانا محمد مظهر النانوتویؒ الحنفی الچشتی القادری النقشبندی السهروردی قدس سره العزیز عن شمس العلماء مولانا مملوک علیؒ عن فرید دهره مولانا رشید الدینؒ خان الدهلوی عن بخاری عصره وابی حنیفة وقته السید السند مولانا شاه عبدالعزیزؒ الدهلوی العمری الحنفی قدس الله سره العزیز.**

(مقدمہ اوجز المسالک صفحہ ۳۸۔۳۹)

ترجمہ: لیکن میری حدیث کی دوسری سند (سلسلہ) تو وہ شیخ حافظ ابی ابراہیم مولانا خلیل احمد صاحب کے طریق سے ہے۔ اور ان کی سند کے پانچ طریقے ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے حدیث کی کل کتابیں شیخ امام ہمام حافظ مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی حنفی چشتی قادری نقشبندی سہروردی قدس سرہ العزیز سے پڑھیں اور مولانا محمد مظہر صاحبؒ

نے مولانا مملوک علیؒ صاحب سے پڑھیں اور انہوں نے یکتائے روزگار مولانا رشید الدین خان صاحبؒ دہلوی سے اور انہوں نے اپنے زمانے کے بخاری اور ابوحنیفہؒ سید مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ عمری الحنفی قدس سرہ العزیز سے پڑھیں۔

اس سند حدیث سے معلوم ہوا کہ مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ نے شاہ محمد اسحاق صاحب کے علاوہ حدیث مولانا مملوک علی صاحب سے بھی پڑھی تھی۔ یہ مولانا کے حدیث پڑھانے کا بین ثبوت ہے۔

بیٹے کی زبانی باپ کی فضیلت:

اب حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب عارف باللہ کی زبانی اپنے باپ مولانا مملوک علی صاحبؒ کی حقیقت سنئے۔ مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی فرماتے ہیں:

> "مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کسی نے میرے سامنے پوچھا کہ مولانا (محمد قاسمؒ) صاحب کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے (جو انہیں حاصل تھے) فرمایا کئی سبب جمع ہوگئے:
>
> ۱۔ مولانا میں یہ کمالات یک جا ہونے کے ایک خلقۃ (پیدائشی) مزاج کا معتدل ہونا کیونکہ حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے نفس کامل فائض ہوتا ہے۔
>
> ۲۔ دوسرے استادان کو کامل ملے جیسے مولانا مملوک علی صاحبؒ کہ ہر فن کے محقق اور طرز تعلیم میں بے مثل تھے۔
>
> ۳۔ پیر کامل (حاجی امداد اللہ صاحبؒ) تھے۔
>
> ۴۔ چوتھے قدرتی طور پر مولانا میں ادب بہت تھا اور جتنا ادب زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی فیضان زیادہ ہوتا ہے۔
>
> ۵۔ پانچویں تقویٰ کامل تھا۔"

(القصص الاکابر صفحہ ۱۲۵ الہادی جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ)

ان مختصر پانچ جملوں میں حضرت حجۃ الاسلام کی تمام زندگی سمودی گئی ہے لیکن ہمارا مقصد حضرت عارف باللہ کا دوسرا جملہ ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے والد محترم مولانا مملوک

علی صاحبؒ کے علم و فضل کی ہو بہو تصویر اتاری ہے اور کہا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کو کامل استاد مولانا مملوک علی صاحبؒ ملے جو ہر فن کے محقق اور طرز تعلیم میں بے مثل تھے۔ طرز کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا نہیں بلکہ کوئی غیر بے لاگ اور بلا مبالغہ تبصرہ کر رہا ہے۔

مولانا مملوک علی صاحب مولانا رشید احمد صاحب کی نظر میں:

اب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی زبانی مولانا مملوک علی صاحب کے مفاخر سنئے۔ جب حضرت گنگوہی دہلی پڑھنے گئے اس وقت کی بات فرماتے ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب مولانا گنگوہی کی زبانی لکھتے ہیں:

> ''ابتداً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ جب مولانا مملوک علی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کر لیں گویا استاد نے گھول کر پلا دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک علی صاحبؒ اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین صاحب تھے۔'' رحمہم اللہ علیہم

(تذکرۃ الرشید مولفہ مولانا عاشق الٰہی حصہ اول صفحہ ۳۰-۳۱ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی)

مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کی زبانی آپ نے سن لیا کہ مولانا مملوک علی صاحب کس پائے کے استاد اور فاضل تھے کہ ان کے درس میں طلبہ کو تسکین ملتی تھی اور مضمون پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی اور وہ گھول کر کتاب شاگرد کو پلا دیتے تھے بقول حضرت عارف باللہ کہ ہر فن کے محقق اور طرز تعلیم میں بے مثل تھے۔

مولانا مملوک علی صاحب مولانا کریم الدین کی نظر میں:

مولانا کریم الدین صاحب پانی پتی مصنف کریم اللغات نے اردو اور عربی کے شعراء کا تذکرہ لکھا ہے۔ اردو شعراء کے تذکرے کا نام ''طبقات شعرائے ہند'' ہے۔ جو ۱۸۴۸ء

مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا۔ اور عربی شعراء کے تذکرے کا نام ”فرائد الدہر“ ہے۔ جو مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا ہے مولانا مملوک علی اردو عربی دونوں زبانوں کے شاعر تھے بلکہ فارسی کے بھی: مولانا کریم الدین صاحب نے مولانا مملوک علی صاحب کا دونوں تذکروں میں ذکر کیا ہے۔ جو ہم ان کے تذکروں سے درج کرتے ہیں۔ ہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ مولانا عبدالکریم صاحب پانی پتی مولانا مملوک علی صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں:

> ”مولانا و اولانا و استاذنا و ہادینا و شیخنا جناب مولوی مملوک العلی عالم الخفی والجلی مدرس اول مدرسہ دہلی رہنے والے نانوتہ کے قدوۃ المتاخرین امام متبحرین متقدمین اس ذات حمیدہ صفات کا شمہ سایہ حال ہے کہ ایسا فاضل کامل و زاہد و عابد پابند شرع شریف مصطفوی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ نظیر اس کا خطہ ہند میں مفقود، ہر فن و علم کا سامان اس کے پاس ہر وقت موجود، اس کے فیض عام یہی عقل فیاض زار ہا۔ جس نے اس کے مشعل تعلیم سے روشنی نہیں پائی وہ عقل و بصیرت سے نابینا گھر اس کا محط الرجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے۔ درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان کے اپنا نام پیدا کر گئے۔
>
> بالفعل عہدہ اول مدرس اول عربی پر مدرسہ دہلی میں مامور ہیں، سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں۔ تمام علوم درسیہ متاخرین و متقدمین پر وہ عبور ہے کہ عقل اول بھی ان کی فیض رسانی کے مقابلے میں مجبور ہے۔ تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہے۔

حُلیہ:

ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی، خندہ رو، سفید ریش، صورت نورانی مثل عالموں ربانی کے۔ ہمارے زمانے میں ان کی ذات سے ہندوستان میں علم نے ترقی اور رفعت پائی۔ سچ ہے اس قول کاشفی کا مصداق وہی ہے۔

آں فاضل زمانہ کہ از یمن درس اوست
ہم عقل در ترفع ہم علم در کمال

اخلاق:

متواضع اور حلیم اور بردبار اور صاف منکسر اور مدبر اور دانشمند ہیں۔ غرضکہ جتنی تعریف اور جتنے اوصاف اخلاق کے بتلاش تمام پیدا کئے ہیں۔ اس میں سب موجود ہیں۔

معارض کو چاہئے کہ وہ چار گھڑی ان کی خدمت میں بیٹھ کر ان اوصاف کو ملاحظہ کرے اس وقت میرے قول کی تصدیق بحلف کرے گا۔ اور کہے گا کہ سچ ہے یا مبالغہ اور قطع نظر تعریف کے امر واقعی اس شخص نے بیان کی ہے۔

تصنیف نہ کرنا اور وعظ نہ کہنا:

تمام عمر میں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے وعظ عام نہیں کیا اور تصانیف کتب پر مائل نہیں ہوئے باعث اس کا یہ ہے کہ چونکہ ان کی فہرست میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں پھر اس صورت میں فرست واسطے تصانیف کے معلوم۔ لہٰذا اپنا ہرج گوارا کیا، دل شکنی کسی کی منظور نہیں کی۔

تصنیف:

مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس جو عربی زبان تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۴ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح بھی ہر ایک شکل کو حل کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۴۴ء میں دو مرتبہ چھپ چکا ہے۔ یہی باعث مذکورہ بالا نہ منظوم کرنے افکارات شعر یہ ہے کا تے مگر ایک مسودہ عربی خط کا جو مسمی فیروز پادشازادے کو انہوں نے ایام طالب علمی میں بے نقط لکھا تھا ڈھونڈ لایا ہوں۔ تیمنا تبرکا اپنی کتاب میں لکھتا ہوں۔“ (تذکرہ فرائد الدہر صفحہ ۴۰۲)

ان سطور سے مولانا مملوک علی کی زندگی کے بہت سے گوشے اجاگر ہو گئے ہیں اور بعض حقیقتوں کا انکشاف انہوں نے طبقات الشعراء ہند میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مدرس اول مدرسہ دہلی مولوی مملوک العلی مدظلہٗ عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہوار مدرسہ میں مقرر ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر ہونی چاہئے ویسی نہیں۔ کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم و فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارت نامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کے ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔ بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے کیونکہ وہ فاضل ایسا ہی ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے۔ گویا حفظ کر رکھی ہے۔ اس لئے رات دن سواء مدرسہ کے ان کے گھر پر طلباء پڑے رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں۔ اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ یہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے سب کو پڑھاتے ہیں۔ تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا۔ والا رات دن درس دہی طلباء میں گذرتا اور باوجود اس کثرت درس فیض رسانی کے پابند شرع شریف کے ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ غرضکہ جتنا ان کی تعریف میں لکھوں بجا ہے اگر کوئی امر بطور مبالغہ بھی لکھوں وہ بھی امر واقعی ان کی ذات میں پاتا ہوں۔ بہت بے نظیر فاضل ہے ان کے ثانی کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جس سے اس طرح کا فیض عام اور تشفی خاص و عام حاصل ہو۔

عمر:

ان کی ۱۸۴۷ء میں قریب ساٹھ برس کے ہوگئی۔ بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین تر اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ زبان اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں بارہویں کا کیا ہے حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہادیا ہے۔ اصل وطن ان کا نانوتہ ہے۔ مدت سے شاہجہان آباد میں رہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا۔"

(طبقات شعراء ہند صفحہ ۴۶۳۔۴۶۴)

مولانا مملوک علی صاحب اپنے ایک شاگرد مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی والد شیخ الہند کی نظر میں:

مولانا مملوک علی صاحب کے متعلق ہندوستان کے مایہ ناز عربی، فارسی اور اردو کے ادیب، حماسہ، متنبی، قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد اور سبعہ معلقات کے شارح نے اپنے ایک مختصر سے رسالے میں جو "ھدیة السنیه فی ذکر مدرسة الاسلامیة الدیوبندیة" کے نام سے موسوم ہے اور جو نہایت ادیبانہ عربی زبان میں ہے۔ حسب ذیل الفاظ میں جو کچھ لکھا ہے وہ تبرک کے طور پر ہم درج کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> الامام الهمام، استاذ الانام، شيخ الاسلام، ثمال الارامل عصمة الايتام مالک ازمة الفضل الخفي والجلي مولانا و سيدنا المولوی مملوک علی الصديقي رضي الله تعالىٰ عنه وارضاه عنا نسبا كان الشمس القت عليه رداء ها واعطاه البدر المنير نورها وضياء ها، رحيب الصدر، رفيع الذكر، قطب دائرة المحققين وارث علوم الانبياء و المرسلين و كنز الهداية واليقين و كان قدس سره متواضعاالله واللطلبة ابا رحيما صاحب الاخلاق

المحمدية و السيرة الكريمة النبوبة صلى الله عليه وآله و اصحابه و سلم و عظم و كرم، لايوجد نظيره فى ارباب العمائم الذين هم لقصر العلوم اساتين و دعائم ولله در القائل كانه قال فيه (شعر)

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

واستفاض فيضه فكثرت تلامذته عدد نجوم السماء اولقطرات الداماء فقرء و اعليه وبهرو اوفرغوامن التحصيل ومهرا واوجد وافى الافادة بعد تكميل الاستفادة فمن لثم سدته السنيه يوما فازومن لاذلعتبته الكريمة ولوساعة حازحتى صارت رياض العلوم بامطارفيوضه مخضرة الربى مبتلة الصبا قد اينعث ثمارها وسجعت اطيارها و تدفقت انهارها و خطبت على منابوا يكها الحمائم و تبسمت عن وجوه ازهارها الكمائم بعد مانضبت ماء ها و ذهب رواء ها وحمدت نارها و جمدت بحارها و كسد سوقها و فسد منطوقها و محت رسمها و عفت ديارها فلم يبق فيها انيس ولم يسمبها سمير ولاينبئك مثل خبيره فابى العلم الا ان يوجد فى منشبيه و مستفيديه و منتحليه فلاحامل كتاب الاوهو متقلد بقلادة حسانه و منته ولا رافع قلم الاوهر واضع جبهة على سدته فلِلّٰه دره من شمس ملات العالم نور اوضياء اوسنائاً وبهاءاً وانارت للعلم اقباملاً ثوابت و سيار او من نجم يهتدى به السارى فى ظلمات الجهل و الضلال والساورنى علوم الخبال و النكال ومن بحرلم يركمثله عطاءاً و حياءاً و سخاءاً وجباءاً ومن سحاب اصاب وابلنه كل محل و خصيب وصفصف وجلبيب ومن حديقة عطرت الكون بريا حاوا راحت الارواح من

نسیمها اوضباها من عذب فرا ات سائغ سلقے عطشے افعادم واردهم وداویٰ مرضی الجهل فشافهم فجزاه الله تعالیٰ عن تلامذته خیر الجزاء و او فی الانصباء ماذر شارق ولاح بارق و وجی غاسق وانهمر وادق.

(ہدیہ سنیہ صفحہ ۶-۷)

ترجمہ: بلند ہمت امام، لوگوں کے استاذ شیخ الاسلام مسکینوں کی پناہ، یتیموں کی حفاظت، ظاہری و باطنی فضیلت کی باگوں کے مالک مولانا وسیدنا مولوی مملوک علی (صاحب) صدیقی النسب خدا ان سے راضی ہو اور ہم سب کی طرف سے خدا ان کو راضی رکھے، (ایسے روشن نسب کہ) گویا سورج نے اپنی چادر ان کو اڑھادی ہے اور گویا کہ روشن چاند نے اپنا نور اور روشنی ان کو بخش دی ہے۔ وسیع سینے (دل) والے، بلند شہرت والے، محققین کے دائرے کے مرکز، انبیاء اور رسولوں کے علوم کے وارث، معرفت اور ہدایت کا خزانہ اور تھے قدس سرہ اللہ کے عاجز بندے اور طلبہ کے نہایت مہربان باپ، اخلاق محمدیہ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم معظم ومکرم کی سی اچھی عادت والے۔ ان کی مثال دستار والے (علما) میں جو علوم کے محل کے ستون اور کھمبے ہیں، پائی نہیں جاتی اور اللہ کیلئے ہی بھلائی شعر کہنے والے کی گویا کہ اس نے یہ شعر انہی (مولانا مملوک علی) کے بارے میں کہا ہے۔

تیری صورت سے نہیں ملتی کسی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

اور ان کے (دریائے) فیض سے لوگوں نے فیض حاصل کیا اور آسمان کے ستاروں کی مانند ان کے شاگردوں کی کثرت ہوئی یا سمندر کے قطروں کی مانند طلبہ نے ان سے پڑھا اور لائق فائق ہوئے اور تحصیل علم سے فارغ ہوئے اور ماہر ہو گئے اور پورا فائدہ حاصل کرنے کے بعد دوسروں کو فائدہ علمی پہنچانے میں انہوں نے پوری کوشش کی۔ جس نے بھی ایک دن کیلئے ان کی دہلیز کو چوم لیا تو وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے ان کی

مقدس چوکھٹ سے اگر چہ ایک گھڑی کیلئے ہی پناہ پکڑی ہو وہ بھی فلاح پا گیا تا آنکہ علوم کے باغات ان کے فیوض کی بارشوں سے سبز ٹیلوں والے اور پوروتر ہواؤں والے بن گئے۔ اور ان کے پھل پروان چڑھ گئے اور ان باغوں کے پرندے چہچہانے لگے اور ان کی نہریں ابلنے لگیں اور ان علم کے باغوں کے پیلو کے درختوں کے منبروں پر قمریوں نے خطبے دینے شروع کر دیئے اور شگوفے اپنے پھولوں کے چہروں سے ہنسنے لگے جبکہ ان (ریاضی علوم) کے پانی خشک ہو گئے تھے اور ان کی تازگی ختم ہو گئی تھی۔ اور ان کی آگ بجھ گئی تھی اور ان کے دریا جم گئے تھے، ان کا بازار کھوٹا پڑ گیا تھا اور ان کا تذکرہ ماند پڑ گیا تھا۔ ان کی رسم محو ہو گئی تھی اور ان کے دیار مٹ چکے تھے ان میں کوئی غم خوار باقی نہیں رہا اور نہ کوئی راتوں کو باتوں میں گزارنے والے نے باتیں کیں۔ اور نہ خبر دے گا۔ تجھ کو خبیر کی طرح۔ پس علم نے ان (مولانا مملوک) سے تعلق رکھنے والوں ان سے استفادہ کرنے والوں اور ان کے متعلقین کے سوا اور کہیں پائے جانے سے انکار کر دیا، پس جو بھی کوئی کتاب اٹھائے ہوئے ہے وہ ان کے احسان اور منت کا پٹکا گلے میں ڈالے ہوئے ہے اور نہ کوئی قلم ہاتھ میں لینے والا ہے مگر وہ ان کی دہلیز پر اپنی پیشانی رگڑتا ہے۔ پس اللہ کیلئے ہے بھلائی ایک ایسے سورج کی جس نے نور، روشنی، چمک اور رونق سے دنیا کو بھر دیا اور علم کے چاند اور ثوابت اور سیارے روشن کر دئے۔ اور ایک ایسا ستارہ کہ اس سے جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں میں مسافر اور ہلاکت اور عبرتناک سزا کی زیادتی میں حیران انسان ہدایت دیا جاتا ہے اور ایک ایسا دریا کہ بخشش اور حیا اور سخا اور عطا میں اس جیسا نہیں دیکھا گیا اور وہ ایک ایسے بادل تھے کہ ان کی بارش ہر قحط زدہ اور سرسبز جگہ اور چٹیل میدان اور قحط زدہ زمین پر برسی اور ایک ایسا باغ تھے کہ اس کی خوشبو سے دنیا معطر ہو گئی، اور جس نے روحوں کو اپنی نسیم اور صبا ہواؤں سے راحت پہنچائی اور وہ (مولانا مملوک علی) ایک ایسے میٹھے خوشگوار دریا تھے کہ جس نے اپنے پاس آنے والے علم کے پیاسوں کو سیراب کیا اور جہالت کے مریضوں کی دوا کی اور ان کو شفا بخشی۔ پس ان کو اللہ تعالیٰ ان کے شاگردوں کی طرف سے جب تک سورج دمکتا رہے

اور بجلی چمکتی رہے اور چاند نکلتا رہے (یا رات سیاہی ڈالتی رہے) اور بارش برستی رہے، جزائے خیر عطا فرمائے۔

ادیب الملک مولانا ذوالفقار علی صاحب کی یہ متبرک عبارت حضرت مولانا مملوک علی کی شان میں نثری مدحیہ قصیدہ ہے کہ اس سے بہتر نظم میں اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اللہ اللہ غضب کا ادبی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس عبارت کے ترجمے نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ الختصر یہ کہ مولانا مملوک علی کی علمی شخصیت، طلبہ پر شفقت، تلامیذ کی کثرت کا یہ عبارت پتہ دیتی ہے۔

مولانا مملوک علی کے اخلاق و عادات:

مولانا میں شان امارت اور شان فقر دونوں تھیں۔ جب آپ دہلی سے نانوتے تشریف لے جاتے تو یا نانوتے سے دہلی کو تو راستے میں کاندھلہ پڑتا تھا اور آپ مولانا مظفر حسین صاحب سے مل کر جایا کرتے تھے کہ انہوں نے کہہ رکھا تھا اور مولانا نے مان لیا تھا لیکن شرط یہ کی تھی کہ میرا راستہ کھوٹا نہ ہو۔ انہوں نے کہا نہیں جیسے آپ فرماتے ہیں ویسے ہی ہوگا۔ مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

> ''ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ مولانا دہلی سے نانوتے جا رہے تھے راستے میں مولوی مظفر حسین صاحب سے ملنے کیلئے ٹھہرے مولوی مظفر حسین نے حسب معمول پوچھا کہ کھانا کھا لیا ہے یا کھاؤ گے انہوں نے کہا کہ کھائیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا تازہ تیار کراؤں یا جو رکھا ہوا ہے وہی لے آؤں۔ انہوں نے کہا جو رکھا ہوا ہو وہی لے آیئے۔ مولوی صاحب ایک مٹی کے برتن میں کھچڑی کی کھرچن لے آئے اور کہا کہ رکھا ہوا تو یہ ہے بس وہ اسی کو کھا کر رخصت ہو گئے۔''

(قصص الاکابر الہادی ماہ رمضان ۱۳۵۶ھ صفحہ ۲۵)

ایک اور واقعہ حضرت تھانویؒ نے اس طرح لکھا ہے کہ:

> ''مولانا مملوک علی صاحب خوش لباس تھے۔ انہیں حکام سے ملنا ہوتا تھا۔ ایک شخص نے انہیں ایک دھوتر کا کرتا دیا کہ اس کو آپ جمعہ کے دن پہن کر نماز پڑھیں۔ چنانچہ انہوں

تے جمعہ کے دن اس کو پہنا، سارے کپڑے تو قیمتی تھے پاجامہ سر کا دوپٹہ تو بڑھیا اور کرتا دھوتر کا۔ اسی طرح جامع مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔“

(قصص الاکابر الہادی ماہ شعبان ۱۳۵۶ھ صفحہ ۳۲)

جب آپ سے قیمتی عمامے اور پاجامے کے ساتھ دھوتر کے بے میل کرتے کے پہننے کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ وہ خوش ہوگا۔

ذاتی مکان:

چونکہ مولانا مدت سے دہلی میں رہتے تھے اس لئے کوچہ چیلاں میں اپنے ذاتی مکان کا انتظام کرلیا تھا۔ مگر چھٹیوں میں نانوتے آمدورفت رہتی تھی۔

وفات:

بالآخر جیسا کہ حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ۱۱/ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء بمرض یرقان دہلی میں ہوا۔ کل گیارہ روز بیمار رہے اور خاندان شاہ ولی اللہی کے قبرستان مہندیوں میں دفن ہوئے۔

انالله وانا اليه راجعون

مولانا مہتاب علی صاحب عثمانی دیوبندی

آپ دیوبند کے عثمانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مولانا ذوالفقار صاحب شارح حماسہ، متنبی، قصیدہ بردہ، سبعہ معلقات اور قصیدہ بانت کے بڑے بھائی اور استاد ہیں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا کے تائے ہوتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے افتتاح مورخہ ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں مولانا مہتاب علی زندہ تھے۔ اور وہ دارالعلوم کے افتتاح اور مشورے میں شریک تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے جو ارکان منتخب کیے گئے ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ قدس اللہ سرہ العزیز۔
۲۔ حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ۔
۳۔ مولانا مہتاب علی صاحبؒ دیوبندی۔ (استاد محترم مولانا محمد قاسم صاحبؒ)
۴۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی۔
۵۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب والد ماجد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔
۶۔ شیخ نہال احمد صاحب دیوبندی۔
۷۔ منشی فضل حق صاحب دیوبندی۔ (رپورٹ دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۳ھ)

اس فہرست میں مولانا مہتاب علی صاحب مجلس شوریٰ کے ممبروں میں تیسرے درجے پر نظر آتے ہیں۔ ۱۲۸۳ھ کے سالانہ امتحانات جن اصحاب نے لئے ان کے متعلق مذکورہ سال کی رپورٹ میں درج ہے:

”ابتدائی سال (۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء) کی تعلیم کا امتحان حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ و مولوی مہتاب علی صاحبؒ نے نہایت سرگرمی اور مستعدی سے لیا۔“

غرضکہ مولانا مہتاب علی ممتحنین کی فہرست میں بھی ہیں۔ ۱۲۸۴ھ میں بھی مذکورہ بالا حضرات میں حضرت مولانا مہتاب علی صاحب ممتحنین میں موجود ہیں۔ اسی طرح ۱۲۸۵ھ میں بھی ممتحن ہیں۔ ۱۲۸۵ھ کے بعد مولانا مہتاب علی ۱۶/ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۳ء کے سالانہ تقسیم انعام دارالعلوم دیوبند میں بھی جیسا کہ دارالعلوم کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے جامع مسجد دیوبند کے جلسے میں شریک ہیں۔ بعدازاں مولانا مہتاب علی کسی مجلس اور جلسے میں نظر نہیں آتے۔ دارالعلوم دیوبند کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ:

> ”۱۲۹۰ھ کی مجلس شوریٰ میں ایک نام کی تبدیلی کے علاوہ وہی نام رہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ شامل کئے گئے۔ مولوی مہتاب علی اس مجلس شوریٰ میں نہیں لئے گئے۔“

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۲۷۳ھ تک مولانا مہتاب علی زندہ ہیں اور مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں۔ البتہ ۱۸۶۷ء یعنی ۱۲۷۳ھ میں مجلس شوریٰ میں وہ نہیں لئے گئے۔ چنانچہ ۱۲۹۰ھ کی دارالعلوم کی رپورٹ میں ہے:

> ”مجلس شوریٰ کے ارکان امسال حسب ذیل ہیں۔
>
> ۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ۲۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ
>
> ۳۔ حاجی عابد حسین صاحبؒ دیوبندی ۴۔ مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ دیوبندی
>
> ۵۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دیوبندی۔“

اولاد:

مولانا مہتاب علی کے ایک صاحبزادے خلیفہ احمد حسن صاحب تھے۔ دوسرے بیٹے مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم جو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے بڑے داماد تھے۔ مولانا محمد شفیع صاحب کے لڑکے مولانا محمد رفیع صاحب مدرسہ حسین بخش دہلی میں آج کل مدرس ہیں۔

(ماخوذ از مکتوب استاذ محترم مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی مورخہ ۱۵ محرم ۱۳۸۵ھ)

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری

آپ سہارنپور کے مشہور عظیم القدر عالم اور محدث ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ کے مختصر سے حالات ہم نزہۃ الخواطر جلد ۷ از علامہ شریف عبدالحیٔ بن فخر الدین حسنی سابق مدیر ندوۃ العلماء لکھنو سے پیش کرتے ہیں:

الشيخ احمد السهارنپوری

الشيخ العالم الفقيه المحدث احمد على ابن لطف الله الحنفى الماتريدى السهارنپورى احد كبار الفقهاء الحنفية ولد ونشأ بمدينة "سهارنپور" وقرأ شيئا نزراً على اساتذة بلدته ثم سافر الى دهلى واخذ عن الشيخ مملوك العلى النانوتوى واسند الحديث عن الشيخ وجيه الدين السهارنپورى عن الشيخ عبد الحئى بن حبة الله البرهانوى عن الشيخ عبدالقادر بن ولى الله الدهلوى ثم سافر الى مكة المباركة فتشرف بالحج و قل الامهات السّتِ على الشيخ اسحاق بن محمد افضل الدهلوى المهاجر المكى سبط الشيخ عبد العزيز بن ولى الله واخذ عنه الاجازة ورجل الى المدينة المنورة واكتحل متراب عتبة النبى ﷺ ثم رجع الى الهند وتصدربها للتدريس مع استرزاته بالتجارة وكان عالما صدوقاً امعينا ذاعناية تامة بالحديث صرف عمره فى تدريس الصحاح الست وتصحيحها لاسيما صحيح الامام البخارى خدمه عشر ستين فصححه وكتب عليه حاشية مبسوطة توفى

بـالفالج لست ليال خلون من جمادى الاولىٰ سنة سبع و تسعين و مائتين و الف بمدينة "سهار نپور" فدفن بها."

(نزہۃ الخواطر جلد ۷ صفحہ ۴۳)

ترجمہ: شیخ عالم فقیہ محدث احمد علی بن لطف اللہ حنفی ماتریدی سہار نپوری حنفیہ کے بڑے فقہاء میں سے ایک، سہار نپور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے اور پلے اور اپنے شہر کے اساتذہ سے کچھ پڑھے۔ پھر دہلی کا سفر کیا اور شیخ مملوک علی نانوتوی سے تعلیم حاصل کی اور شیخ وجیہ الدین سہار نپوری سے سند حدیث حاصل کی اور شیخ وجیہہ الدین نے شیخ عبد الحیٔ بن ہبۃ اللہ البرہانوی سے اور انہوں نے شیخ عبد القادر بن ولی اللہ دہلوی سے۔ پھر مولانا احمد علی نے مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور حج سے شرف حاصل کیا۔ اور صحاح ستہ شاہ محمد اسحاق بن محمد افضل دہلوی مہاجر مکی شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ کے نواسے سے پڑھا۔ اور ان سے حدیث کی اجازت لی اور پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اور نبی ﷺ کے روضے کی دہلیز کی خاک کا سرمہ آنکھوں میں لگایا۔ پھر ہندوستان کو واپس ہوئے اور پڑھانے میں نیز تجارت کے ذریعہ حصول معاش میں مشغول ہوئے۔ عالم صادق و امین اور حدیث میں پوری بصیرت رکھتے تھے اپنی عمر صحاح ستہ بالخصوص بخاری شریف کے پڑھانے اور صحیح کرنے میں صرف کردی۔ دس سال صحیح بخاری کی تصحیح میں لگا کر اس پر مفصل حاشیہ لکھا۔

فالج میں مبتلا ہو کر ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو سہار نپور میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن کئے گئے۔ (نزہۃ الخواطر صفحہ ۴۳ مطبع مجلس دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۹۵۹ء)

مرض اور وفات کا تعین:

حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کے شاگرد عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

"جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو فالج ہوگیا تھا اس میں (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) سہار نپور تشریف لے گئے تھے۔" (سوانح قاسمی صفحہ ۲۷)

پھر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

"شنبہ کے روز جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کا انتقال ہوگیا۔" (سوانح صفحہ ۲۹)

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی تحریر سے وفات کا دن بھی متعین ہوگیا۔ اب تاریخ وفات کا تعین اس طرح ہوجاتا ہے کہ مولانا احمد علی صاحب کا انتقال مولانا محمد قاسم صاحب کے انتقال سے دو دن بعد ہوا ہے۔ جیسا کہ سوانح قاسمی میں عارف باللہ نے تحریر فرمایا ہے۔ اور مولانا کی وفات ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو جمعرات کے دن ہوئی ہے۔ لہٰذا مولانا احمد علی صاحبؒ کی تاریخ وفات یقینی طور پر ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۷/ اپریل ۱۸۸۰ء بروز ہفتہ متعین ہوجاتی ہے۔

خدمت حدیث بالخصوص بخاری کا حاشیہ:

جیسا کہ نزہۃ الخواطر کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ مولانا احمد علی صاحب نے اپنی عمر حدیث پڑھانے اور کتابیں چھاپنے میں صرف کردی بالخصوص بخاری شریف پر انہوں نے بڑا کام کیا اور اس کا بہترین حاشیہ لکھا جو علمائے دیوبند اور بریلی میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ چنانچہ مولانا احمد علی صاحب بخاری کی صحت اور اس کے حاشیے پر محنت کے بارے میں خاتمہ حواشی میں تحریر فرماتے ہیں:

> **اما بعد فیقول العبد الراجی رحمة ربه القوی الخادم للحدیث النبوی احمد علی سهارنپوری انه قد استتب بعون الملک الباری طبع الصحیح الجامع للحافظ الامام شیخ الاسلام سید المحدثین محمد بن اسماعیل البخاری رحمه الله بعد ما صرفت بیرهة من دهری رظمئت نهاری و سهرت لیلی فی تصحیح مبانیه و توضیح معالیه و تنقیح مطالبه و تصحیح ماربه و تبیین اسماء الرجال بالحرکات والانساب والکنیٰ والالقاب علی حسب مایقتضیه المقام ویستدعیه المرام.** (خاتمہ طبع بخاری)

ترجمہ: حمد وصلوٰۃ کے بعد اپنے قادر وتوانا خدا کی رحمت کا امیدوار حدیث نبوی کا خادم

> احمد علی سہارنپوری کہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مدد سے سید المحدثین حافظ امام شیخ الاسلام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کی کتاب کی طباعت کا کام انجام کو پہنچا جس کیلئے میں نے اپنی عمر کا عرصہ خرچ کیا کہ دنوں کو بے آرام رہا اور راتوں کو جاگ کر کاٹا کہ بخاری کے معانی کی تصحیح اور معانی کی توضیح اور مطالب کی تنقیح اور مقاصد کی تصحیح، اسماء رجال کے حرکات اور ان کے نسب اور کنیتوں اور القاب کو مقام کے تقاضوں اور مقصد کے حالات کے پیش نظر محنت میں دن رات ایک کر دئے۔

بخاری کا یہ حاشیہ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے مفتی صدر الدین صاحبؒ کو بھی سنایا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے اس پر ایک تقریظ فرمائی ہے۔ جو بخاری کے آخر میں موجود ہے۔ اس تقریظ میں جہاں حاشیۂ بخاری کے متعلق تحسین کے کلمات ہیں وہاں مفتی صاحب کا عربی ادب میں کمال بھی چمکتا نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں:

تقریظ از مفتی صدر الدین صاحب بر حاشیہ بخاری:

الحمد لله ذى الطول والا لاء صلى الله على محمد خاتم الرسل والانبياء و على اله واصحابه الاتقياء و بعد فيقول العبد فيقول العبد المعتصم بحبل الله المتين محمد صدر الدين شرح الله صدره بنور اليقين انى رأيت هذا الكتاب غب ماطبع و عاد مطبوعا و بعد ما صنع وأمن مصنوعا فامعنت فيه و كان امعانى غاية وخضت فيه و كان فوضى نهاية نوجلته صريحا دكاسمه صحيحا والفيته جامعا بلاارتياب لما هو مذكور فى خاتمة الكتاب و قد قرأه على كثيراً حيثما كان يطبع وعضر ما يصنع فلم اجده الاكزهرة و ذوق ربوة ندية ولله در من جد فى تصحيحه واجد فى تنقيحه وسعى غير مبالى و تجشم غير ال عيسىٰ ان نيتفع به الصغير والكبير والقاصى والدانى و ذالک مرجر ومامول، والله يعطى كل مسئول. اللهم اجعل سعى مرصفه

مشکور او عمله مبرورا وضیعه ماجوراً.

(بخاری جلد دوم خاتمہ صفحہ۱۱۳)

تدریس طلبہ:

مولانا احمد علی صاحبؒ جہاں حدیث کی کتابوں کی تصحیح طباعت اور بخاری کے حواشی میں مصروف رہتے وہاں طلبہ کو دین کی تعلیم دینے میں بھی مشغول رہتے کہ اس دور کا تقاضہ ہی یہ تھا۔ چنانچہ بخاری کے خاتمہ مطبع میں آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں؛

> **ولما لم يتيسر لى فرصة بسط الكلام حسب ما يتضح به المرام لهجرم الاشغال آلمتعلمقه بالمطبع وتعجيل الطلاب الذين غاصوا فى بحار درس الكتاب و تاكيدها الى الطبع وغيره من الاسباب...... ثم لما كان شغفى بخدمة الحديث النبوى بما اوصانى بها مرشدى ومولائى ذوالنفس القدسيه والصفات الملكية والمحتد الطاهر والمفخر الظاهر المشهور بالفضل فى الافاق قدوة اهل الوقاق مولانا الحاج محمد اسحاق تغمده الله برحمته واسكنه دار كرامه فشرعت فى طبع صحيح مسلم مع شرحه للنووى و فقنى الله لاتمامه.**

ترجمہ: اور جبکہ مجھے بسط کلام کیلئے فرصت میسر نہ ہوئی اتنی کہ مقصد کی وضاحت ہو سکے اور یہ مطبع کے مشاغل کثرت اور کتاب کے درس کے سمندروں میں جن طلبہ نے غوطہ لگا رکھا تھا ان کی جلد بازی اور کتاب کی طباعت میں تقاضے اور دیگر اسباب کی وجہ سے.......... پھر جبکہ حدیث نبوی کی خدمت جیسا کہ مجھ کو میرے مرشد و مولا مقدس ذات والے اور فرشتوں جیسی صفات والے پاکیزہ طبیعت اور قابل فخر دنیا میں فضیلت کے ساتھ مشہور اور اہل وفاق کے پیشوا مولانا الحاج شاہ محمد اسحاق صاحب نے وصیت فرمائی تھی اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور اپنے کرامت کے گھر میں جگہ دے۔ پس میں نے صحیح مسلم مع شرح نووی کے چھاپنے کا آغاز کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی

تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

اس عبارت سے ان کی خدمت حدیث اور کتب حدیث کی طباعت میں مشغولیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے وطن، تلمذ اور حنفیت کا اظہار مقدمہ بخاری میں خود اس طرح فرماتے ہیں:

> **وبعد فیقول العبد الضعیف الخادم للحدیث النبوی الضبور احمد علی السهارنفوری توطنا والاسحاقتی تلمذاً والحنفی مذهباً.**

ترجمہ: حمد وصلوٰۃ کے بعد عبد ضعیف خادم حدیث نبوی احمد علی سہارنپوری بحیثیت و طینت اور اسحاقی بحیثیت شاگردی اور تقلید میں حنفی ہے کہتا ہے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب اور حضرت مولانا وجیہ الدین صاحب دونوں کے شاگرد ہونے کا ذکر مقدمہ بخاری کی ستائیسویں فصل میں سند بخاری کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> **قرأت اکثر هذ الجامع الصحیح البخاری رحمه الله تعالیٰ علی الفاضل الفقیه الألمعی الشیخ وجیه الدین المحسنی الصدیقی السهارنفوری فی البلدة السهارنفور صانها الله تعالیٰ عن الافات والشرور وحصل له الاجازة والقرأة عن الشیخ الربانی مولانا عبد الحئی عن الشیخ الماهر فی العلم الباطن والظاهر مولانا عبد القادر عن اخیه الشیخ عبد العزیز عن ابیه الشیخ ولی الله الدهلوی ثم قرأت ثانیا بعض الصحیح وسمعت بعضه بقرأة الغیر علی الشیخ المکرم المشتهر بین الافاق بالفضل والوفاق مولانا محمد اسحاق فی البلدة المکرمة مکة المعطما عزادها الله تکریما و تعظیما.** (مقدمہ بخاری صفحہ ۱۲)

ترجمہ: میں نے اکثر حصہ جامع صحیح بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کا فاضل فقیہ، المعی شیخ وجیہ الدینؒ المحسنی صدیقی سہارنپوری سے شہر سہارنپور میں خدا تعالیٰ آفات اور شرارتوں سے اس شہر کو بچائے، پڑھا اور ان کو اجازت وقرأت (بخاری کی) شیخ ربانی مولانا عبد الحئی

صاحبؒ سے اور انہیں باطنی اور ظاہری علوم کے ماہر مولانا عبدالقادرؒ سے اور انہیں اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز سے اور انہیں اپنے باپ شاہ ولی اللہ دہلوی سے۔ پھر میں نے صحیح بخاری کا بعض حصہ دوبارہ پڑھا اور بعض حصہ بخاری قرأت غیر کے ساتھ شیخ مکرم دنیا میں فضل و وفاق کے ساتھ مشہور مولانا محمد اسحاق صاحب سے بلدہ مکرمہ مکہ معظمہ میں اللہ تعالیٰ اس کی عزت و تعظیم زیادہ کرے، سنا۔ (مقدمہ بخاری)

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کی اپنی تحریری دستاویزات اور بعض دیگر تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے بہت کچھ تاریخی باتیں اس ناچیز کی تحقیق میں آچکی ہیں لیکن کئی حقیقتیں حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور کی حسب ذیل تحریر سے تحقیق کی روشنی میں آئیں گی۔ آپ اوجز المسالک شرح موطا امام مالک کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

واما مولانا احمد علی بن الشیخ لطف الله المعروف به بیر نتهو بن الشیخ محمد جمیل المعروف بالشیخ جوهراین بن الشیخ محمد خلیل بن الشیخ احمد بن الشیخ محمد ابن الشیخ بدر الدین بن الشیخ صدر الدین ابن شیخ الاسلام ابی سعید الانصاری حافظ القرآن والحدیث لم یشتغل بالعلوم من صباه بل کان رحمه الله فی صباه مشغولا باللعب مع الحمام وامثالها فارسل الیه فقیه السهارنپور مولانا سعادت علی رجلا بسأله عن معانی بعض الالفاظ فلم یقدر علی جوابها فغلب علیه العار دهرب من سهارنپور الی بلدة میرٹھ فحفظ هناک القرآن وکان عمره اذ ذاک قریباً من ثمانی عشرة سنة ثم رجع الی السهارنپور ویدء الکتب العربیة الابیدائیة علی فقیه البلدة مولانا سعادت علی المرحوم ثم قرأ الکتب الدرسیة کلها فی بلدة دهلی عن مشائخ الوقت سیما الشیخ الغلامه مملوک علی ومولانا وصی الدین

السهارنفوری واخذ کتب الحدیث الشهیر فی الافاق مولانا الشاه محمد اسحاق الدهلوی فی البلدة الطاهرة المکرمة ثم بعد الفراغ عن العلوم اشتغل باتلدریس برهة من الزمان ثم اجریٰ المطبعة الاحمدیة بدهلی و طبع فیها کتب الحدیث وحلاها بالحواشی المفیدة سیما الصحیح البخاری فحشاها باحسن البتحشیة المفیدة الاخمسة اجزاء منالاخیر فالمکها بامره رئیس المتکلمین رأس الافاضل حضرة العلامه ذوالفاخر مولانا محمد قاسم النانوتوی رئیس الجامعة القاسمیة بدیوبند دالف رسائل مفردة منها الدلیل القوی علی ترک القرأة المقتدی وبعد فتنه الغدر رجع الی وطنه بسهارنپور و اشتغل بتدریس الحدیث فی المدرسة العلیة مظاهر العلوم وتوفی فی سنة خلت من اولی الجمادین سنة سبع و تسعین بعد مائتین والف وکان قریباً مناثنتین و سعین سنة.

(اوجز المسالک صفحہ ۴۵)

ترجمہ: ولیکن مولانا احمد بن شیخ لطف اللہ مشہور بنام پیر تھو بن شیخ محمد جمیل معروف بنام شیخ جوہراین بن شیخ محمد خلیل بن شیخ احمد بن شیخ بدرالدین بن شیخ صدرالدین ابن شیخ الاسلام ابی سعید انصاری حافظ قرآن وحدیث بچپن میں علم حاصل کرنے سے غافل رہے بلکہ رحمۃ اللہ علیہ لڑکپن میں کبوتر بازی وغیرہ کا شوق رکھتے تھے ایک دفعہ مولانا سعادت علی سہارنپوری مشہور فقیہ وعالم نے ان کے پاس ایک شخص بھیجا کہ ان سے بعض الفاظ کے معنی دریافت کئے تو مولانا احمد علی جواب نہ دے سکے۔ ان کو بہت شرمندگی ہوئی اور سہارنپور سے میرٹھ بھاگ گئے۔ اور وہاں قرآن کریم حفظ کیا اور اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھارہ سال کی تھی۔ پھر قرآن کریم حفظ کر کے سہارنپور واپس ہوئے اور مولانا سعادت علی صاحب فقیہ شہر مرحوم سے ابتدائی عربی کتابیں شروع کیں۔ بعد ازاں تمام درسی کتابیں شہر دہلی میں اساتذہ وقت بالخصوص شیخ علامہ مولانا مملوک علی اور مولانا وصی

> الدین سہارنپوری سے پڑھیں۔ اور حدیث کی کتابیں دنیا میں مشہور مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی سے پاک شہر مکہ مکرمہ میں پڑھیں۔ پھر علوم سے فراغت کے بعد ایک عرصے تک پڑھانے میں مشغول رہے بعدازاں دہلی میں اپنا مطبع احمدیہ جاری کیا اور اس میں حدیث کی کتابیں چھاپیں اور مفید حاشیے لکھے خاص طور پر بخاری کا نہایت عمدہ حاشیہ لکھا مگر بخاری کے آخری پانچ پاروں کے حواشی ان کے حکم سے رئیس المتکلمین راس الافاضل صاحب مفاخر حضرت علامہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند نے مکمل کیے۔ علاوہ ازیں مولانا احمد علی صاحب نے کئی بے نظیر رسالے لکھے کہ ان میں ایک ”الدلیل القوی علی ترک قرأۃ المقتدی“ ہے۔
>
> فتنہ غدر (ہنگامہ آزادی مئی ۱۸۵۷ء) کے بعد اپنے وطن سہارنپور واپس ہوئے اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں درس حدیث دینے میں مشغول ہوئے اور جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (بروز ہفتہ مطابق ۱۷/اپریل ۱۸۸۰ء) کو اس دار فانی سے دار آخرت کو سدھارے۔ تقریباً بہتر سال کی عمر ہوئی۔

خلاصہ:

مولانا محمد زکریا صاحب کی مذکورہ بالا عبارت سے کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں یعنی اٹھارہ سال تک مولانا کا بے پروائی کی زندگی اور کبوتر بازی وغیرہ میں گذارنا بعدازاں میرٹھ جانا، قرآن کریم حفظ کرنا، پھر سہارنپور آنا اور مولانا سعادت علی صاحب سے ابتدائی عربی کتب کا پڑھنا، پھر دہلی پہنچنا۔ وہاں مولانا مملوک علی صاجب سے پڑھنا اور مولانا وصی الدین کاتب کی غلطی سے لکھا گیا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مولانا وجیہ الدین صاحب ہیں جیسا کہ خود مولانا احمد علی صاحب نے مقدمہ بخاری میں تحریر فرمایا ہے۔ پڑھنے کے بعد دہلی میں مطبع قائم کرنا اور بعد ہنگامہ آزادی سہارنپور میں قیام کرنا اور دس سال کے بعد مظاہر علوم کا جاری ہونا اور اس میں پڑھانا۔ بہتر سال کی عمر ہونا۔ بایں حساب مولانا کی پیدائش تقریباً ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۰۸ء معلوم ہوئی۔ زندگی کے آخر میں فالج میں مبتلا ہوئے۔ مولانا رشید احمد صاحب مزاج پرسی کیلئے گئے تو مہمانی میں ان کا جھوٹا کھانا جو بچا تو مولانا احمد علی صاحب نے فرمایا:

"مولوی رشید احمد کا جھوٹا کھلانا مجھے دو کہ ان کا جھوٹا کھانے سے مجھے شفا ہوگی۔"

(روایت بالمعنی قصص الاکابر)

آخر کار وقت آپہنچا اور یہ آفتاب علم ۶ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۷/اپریل ۱۸۸۰ء کو ہفتہ کے روز بہتر سال تک روشن رہ کر غروب ہوگیا اور سرزمین سہارنپور میں سپرد خاک کردیا گیا۔ خدائے کریم ان کی قبر پر رحمتوں کی بارشیں نازل فرماتا رہے کہ انہوں نے اس کے رسول ﷺ کی حدیث کی بے حد خدمت کی ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی ابن شیخ ابوسعید صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ مجددی

حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی ابن شیخ ابوسعید دہلوی مجددی استاذ حدیث مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے اوجز المسالک شرح موطا امام مالک کے مقدمے میں حسب ذیل درج فرمائے ہیں۔ واضح رہے کہ ایک شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاہ ولی اللہ صاحب کے صاحبزادے تھے مگر یہ وہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ بعض اہل علم کو دھوکا ہوا ہے۔ بلکہ وہ مولانا ابوسعید کے فرزند تھے۔

اما الشیخ عبد الغنی الحنفی فھو الامام الحافظ الحجۃ مسند وقتہ و ابوحنیفۃ عصرہ و بخاری دھرہ ابن ابی السعید ابن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن الشیخ محمد معصوم بن سند العارفین امام الطریقۃ المحددیۃ العارف باللہ احمد العمری السرھندی الشھیر (بمجدد الف ثانی) نور اللہ مرقدہ ابن عبدالاحد بن زین العابدین من ذریۃ ناصر بن عبد اللہ بن امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ. واصل السرھند سھرند بکسر السین المھملۃ وفتح الراء المھملۃ معناہ غابۃ الاسد ولما استولیٰ طاغیۃ السک علی سرھند وما والا ھاجلا عنھا عام یھا فکان من جملۃ من ھاجر وطنہ الشیخ المصفی ارتحل الی کورۃ مصطفیٰ آباد من مضافات الریاسۃ الشھیرۃ

رامپور وبها ولد ابنه ابوسعيد لليلتين خلتا من ذى القعده سنة ست و تسعين ومائة والف فاكتسب الشيخ ابوسعيد الاخلاق والعلوم الباطنية اولا عن والده المرحوم كما سياتى بسطه فى ترجمته ثم ارتحل الى دارالسلطنة دهلى و ولدبها شيخنا العلامه عبدالغنى فى شهر شعبان سنة خمس و ثلثين وما تين بعد الف ووهم من حكى ولادته فى مضافات رام پور۔ واشتغل من صباه فى تحصيل العلوم والاقتنأ من فقه النعمان وحفظ كتاب الله المبين واخذ اكثر الكتب من الحديث وغيره عن والده المرحوم سيما الامهات الستة والموطا برواية محمد بن الحسن وقرء البخارى على حضرة الشاه محمد اسحاق ايضاً واخذ مشكوٰة المصابيح عن الشيخ مخصوص الله بن الشاه رفيع الدين الدهلوى وقرأ البخارى على الشيخ محمد عابد السندهى الانصارى المدنى ايضاً واجيز لسائر الكتب باجازة عامة عنه واجيز ايضا عن الشيخ ابى الزاهد اسماعيل بن ادريس الروهى ثم المدنى واكتسب المعارف الباطنية عن والده المرحوم فى الطريقة النقشبندية وصار من قبله مجازاً بها اجازة الارشاد وقام مقامه فى الافادة والتسليک و قام مقامه فى الافادة والتسليک و الف ذيلا نفيسا عن سنن ابن ماجة سماه انجاح الحاجة وهو متداول بين الناس دكان يشتغل بسائر اوقاته فى التدريس والتسليک حتى وقعت الفتنة الهائلة فى الهند و تسلط العلوج على دهلى فهاجر فى رهط من حزبه الى ارض الحجار فقدم مكة المكرمة اولا ثم شدرحله الى البلدة الطاهرة المدينة المنورة فصار حلسها مواطبا على مااعتاده من الارر ادوالوظائف مشتغلا بالرواية والدراية

لایفتر عما کان علیه لیلا ولانهاراً وانتفع به جماعات من العلماء فمقل و مکثر الی ان لبی داعی الله سبحانه وتقدس فی غرة المحرم سنة ست و تسعین ومائتین والف رضی الله عنه وارضاه وجعل اعلیٰ الجنة مثواه. (اوجز المسالک صفحہ ۴۲۔۴۳)

ترجمہ: لیکن شیخ عبدالغنی حنفی وہ امام حافظ حجۃ اپنے وقت کے معتمد اور اپنے عہد کے ابوحنیفہ اور اپنے زمانے کے بخاری تھے۔ آپ بیٹے تھے ابوسعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ بن سیف الدین بن شیخ محمد معصوم کے اور شیخ محمد بیٹے تھے سند العارفین مجددیہ طریقے کے امام عارف باللہ شیخ احمد سرہندی عمری مجدد الف ثانی نور اللہ مرقدہ کے اور وہ تھے بیٹے عبدالاحد بن زین العابدین کے ناصر بن عبداللہ ابن امیر المومنین عمر بن الخطابؓ کی اولاد سے۔ اور سرہند کی اصل سہرند ہے سین کے زیر اور رے کے زبر کے ساتھ اس کے معنی شیر کی کچھار کے ہیں۔ اور جب سرکش سکھوں نے سرہند اور اس کے اطراف پر غلبہ پایا تو سرہند کے باشندوں کو نکال باہر کردیا۔ منجملہ ان لوگوں کے جنہوں نے اپنے وطن سرہند سے ہجرت کی شیخ صفی تھے جنہوں نے مصطفیٰ آباد علاقہ ریاست رام پور مشہور ریاست کی طرف کوچ کیا۔ وہیں ان کے یہاں ۲ ذوالحجہ ۱۱۹۶ھ کو ان کے صاحبزادے ابوسعیدؒ پیدا ہوئے۔ پس پہلے حضرت ابوسعیدؒ نے اخلاق اور باطنی علوم اپنے والد مرحوم سے حاصل کئے جیسا کہ اس کی تفصیل ان کے حالات میں آئندہ آرہی ہے۔ پھر انہوں نے دارالسلطنت دہلی کو کوچ کیا اور وہاں دہلی میں ہمارے شیخ علامہ عبدالغنی ماہ شعبان ۱۲۳۵ھ (مطابق ۱۸۱۹ء) میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے ان کی پیدائش رام پور کے علاقے کی بتائی ہے انہیں وہم ہوا ہے۔ آپ بچپن سے تحصیل علوم، فقہ حنفی، قرآن کریم کے حفظ کرنے اور حدیث وغیرہ کی اکثر کتابیں اپنے والد محترم سے خاص طور پر حدیث کی چھ اصل کتابیں اور موطا امام محمد کے پڑھنے میں مشغول رہے اور بخاری شریف حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے بھی پڑھی۔ اور مشکوٰۃ شریف شیخ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی سے اخذ کی اور بخاری شیخ محمد عابد سندھی

انصاری مدنی کے سامنے بھی پڑھی۔ اور تمام کتب کی عام اجازت ان سے حاصل کی۔ اور شیخ ابوزاہد اسماعیل بن ادریس رومی ثم مدنی سے بھی اجازت لی اور معارف باطنیہ اپنے والد مرحوم سے نقشبندی سلسلے میں حاصل کئے۔ اور ان کی طرف سے خلیفہ مجاز بھی بنے اور فیض وسلوک پہچانے میں اپنے والد کے قائم مقام بنے اور سنن ابن ماجہ پر بنام ''انجاح الحاجۃ'' نفیس ذیل لکھا۔ جو لوگوں میں متداول (مروج) ہے۔ اور اپنے تمام اوقات پڑھانے اور سلوک کی منازل طے کرانے میں گذارتے تھے۔ تا آنکہ ۱۸۵۷ء کی ہولناک جنگ آزادی کا ہندوستان میں جھنڈا بلند ہوا اور دہلی پر انگریز کافروں کا تسلط ہوگیا۔ تو شاہ عبدالغنی صاحب اپنی ایک جماعت کے ساتھ (۱۲۵۷ھ میں) زمین حجاز کو ہجرت فرما گئے پہلے مکہ مکرمہ پہنچے اور بعد ازاں مدینہ منورہ کی طرف کوچ فرمایا۔ پس اوراد و وظائف جن کے عادی ہو چکے تھے ان پر بالاستقلال جم کر کاربند رہے اور روایت (حدیث) دو روایت پر رات دن مشغول رہے۔ علماء کی جماعتوں نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب نے اللہ سبحانہ ومقدس کے فرشتہ موت کو غرہ محرم ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸-۷۹ء میں لبیک کہا اللہ ان سے راضی ہوا اور ان کو بھی راضی رکھے اور اعلیٰ جنت میں ان کا ٹھکانا بنائے۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف نے بھی شاہ عبدالغنی صاحب کے یہی کچھ حالات لکھے ہیں۔ لیکن ان کا آخری پیرا شاہ صاحب کے تقوے اور عبادت، پاکیزگی نفس اور طہارت پر نہایت لطیف اور روح افزا ہے۔ شاہ عبدالغنی صاحب کے حالات لکھتے لکھتے، لکھتے ہیں:

قد انتهت اليه الامامة فی العلم والعمل والزهد والحلم والأناة مع الصدق والامانة والعفة والصيانة وحسن القصه والاخلاص والابتهال الی الله سبحانه وشدة الخوف منه و دوام المراقبة له والتمسک بالاثر والدعاء الی الله تعالیٰ و حسن الاخلاق و نفع الخلق والاحسان اليهم والتقلل فی الدنيا والتبحره و عن اسبابها، انتفع بمجلسه و برکة دعائه و طهارة انفاسه و صدق نيته خلق

كثيـر مـن الـعـلـماء والمشائخ والفق الناس من اهل الهند والعرب عـلـى ولايتـه وجـلالتـه.. توفى يوم الثلاثاء لست خلون من محرم سنة ست و تسعين ومائتين والف بالمدينة المنورة.

(نزہۃ الخواطر جلد ۷ صفحہ ۲۸۹_۲۹۰)

ترجمہ: علم، عمل، زُہد، حلم، صداقت، امانت، عفت صیانت، حسن نیت، اخلاص، اللہ تعالیٰ سبحانہ کی طرف رجوع اور اللہ تعالیٰ کا خوف اور ہمیشہ مراقبہ کرنے اور سنت کی پابندی اور اللہ تعالیٰ سے دعا اور حسن اخلاق اور مخلوق کو نفع پہنچانے اور ان کے ساتھ احسان کرنے دنیا سے بے رغبتی اور اس کے اسباب سے بے پروائی ان کی ذات پر ختم تھی ان کی مجلس میں اور ان کی دعا کی برکت اور ان کے انفاس کی برکت اور صدق نیت سے علما اور مشائخ کی بہت سی مخلوق نے فائدہ اٹھایا۔ اور ان کی بزرگی اور ولایت پر اہل ہند و عرب سب کا اتفاق ہے۔ آپ کی وفات بروز بدھ ۶ محرم ۱۲۹۶ھ (مطابق ۱۸۷۹ء) مدینہ منورہ میں ہوئی (اور وہیں دفن ہوئے)

جس ہستی کے اساتذہ مولانا محمد مظہر صاحبؒ، مولانا احمد علی صاحبؒ سہارنپوری، مفتی صدر الدین صاحبؒ، مولانا مملوک علی صاحبؒ اور شاہ عبد الغنی صاحبؒ ہوں اس کی لیاقت، فضیلت، ذہانت، فطانت، تقویٰ اور زُہد کا کیا ٹھکانا چنانچہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب دنیا میں چمکے اور قیامت تک ان کے انوار و برکات دنیا میں قائم رہیں گے۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی سند حدیث

(از شاہ عبدالغنی صاحبؒ مجددی دہلوی)

یہ سب اساتذہ کرام اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب تھے لیکن علم حدیث کے اساتذہ کا مقام کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ علم حدیث رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور حیات طیبہ کا علم ہے۔ لہٰذا اس علم کے اساتذہ کا مقام بھی بہت ارفع اور بلند ہوتا ہے اور ایک بہت بڑی بلند نصیبی علم حدیث کے پڑھنے والے کو یہ نصیب ہوتی ہے کہ اس کا سلسلہ سند حدیث کے اساتذہ کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے۔ اس لئے بے سندی سب سے بڑی بدبختی ہے غیر مستند لوگوں کی بات بھی غیر مستند ہوتی ہے۔ اور یہی سلسلہ سند ہے جس کی خاطر محدثین نے دور دراز کے مقامات طے کر کے شیوخ سے سندیں حاصل کی ہیں۔

حجۃ الاسلام کو جو سند حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی نے لکھ کر دی۔ وہ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی بیاض میں درج ہے۔ جو مکتوبات یعقوبی کے ساتھ بیاض یعقوبی کے ۱۶۳ صفحے پر چھپی ہوئی موجود ہے اور اصل سند کا فوٹو بھی پیش خدمت ہے جو شاہ عبدالغنی صاحب کی مہر کے ساتھ مستند ہے۔ مولانا محمد یعقوب لکھتے ہیں:

صورة الاجازة التی کتبها مولانا عبدالغنی لمولانا محمد قاسمؒ

تحریر اجازت جو مولانا عبدالغنی صاحب نے مولانا محمد قاسمؒ کو لکھ کر دی۔

الحمدللہ اولا واخراً والصلوٰة والسلام علی نبیه و صفیه دائما و سرمداً وعلی اله و اصحابه ابداً ابداً اما بعد فاقول و بعون اللہ اصول واحول وانا اضعف عباد اللہ القوی عبد الغنی بن ابی سعید المجددی الدهلوی ان الاخ الصالح الکاظم محمد قاسم اصلح

الله شانه واكمل ايمانه قد قرأ على الصحيح لابى الحسين مسلم بن حجاج القشيرى النيسا پورى وجامع ابى عيسى الترمذى الا القليل من الكتابين فانه سماع غيره والثلث الاخر من صحيح البخارى بالقراة والسماع و موطا مالك بن انس سمع بعضه بقرأة ابن اخى المولوى مظهر و تفسير الجلالين قرأ على فلما رأيت تاهله لدراسته الحديث لكمال فطانته وتمام ذهانته مع صلاحية الحال فى الاعمال والاقوال والافعال اجزت له ماتيسرلى من حصول الاجازة من والدى مرشدى عن الشيخ عبد العزيز المحدث رحمة الله عليهما و كذالك حصل لى الاجازة من محدث الهجرة الشيخ عابد السندى فانى قرأت عليه البخارى و سمعت منه الى كتاب الغسل واجازنى ببقيه الكتب و سمعت على الناسك المهاجر الشيخ محمد اسحاق رحمة الله تعالىٰ البخارى والترمذى وغيرهما

صورة الخاتم

والله الغنى وانتم الفقراء

هذه (اى التى كتبت قبل ۱۲) صورة ماخط شيخنا شيخنا.

ترجمہ: اول و آخر حمد اللہ کیلئے ہے اور درود و سلام اس کے نبی صفی پر ہمیشہ ہمیشہ اور ان کے آل اور اصحاب پر ابدالاباد تک ہو۔ حمد و درود کے بعد میں کہتا ہوں اور اللہ کی مدد سے نصرت وقوت چاہتا ہوں۔ میں اللہ کے بندوں میں سب سے زیادہ عاجز عبدالغنی بن ابوسعید المجد دی دہلوی کہتا ہوں کہ اخی صالح و بردبار محمد قاسم اللہ اس کی اصلاح کرے اور ان کے ایمان کو مکمل کرے، نے مجھ پر ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری کی صحیح (مسلم شریف) اور ابوعیسیٰ کی جامع (ترمذی شریف) اقرأت کی بجز دونوں (مذکورہ) کتابوں کے تھوڑے سے حصے کے کہ وہ کسی اور نے میرے سامنے پڑھا ہے اور انہوں نے خود پڑھنے کے بجائے دوسرے سے سماع کیا ہے اور تین دوسری کتابیں

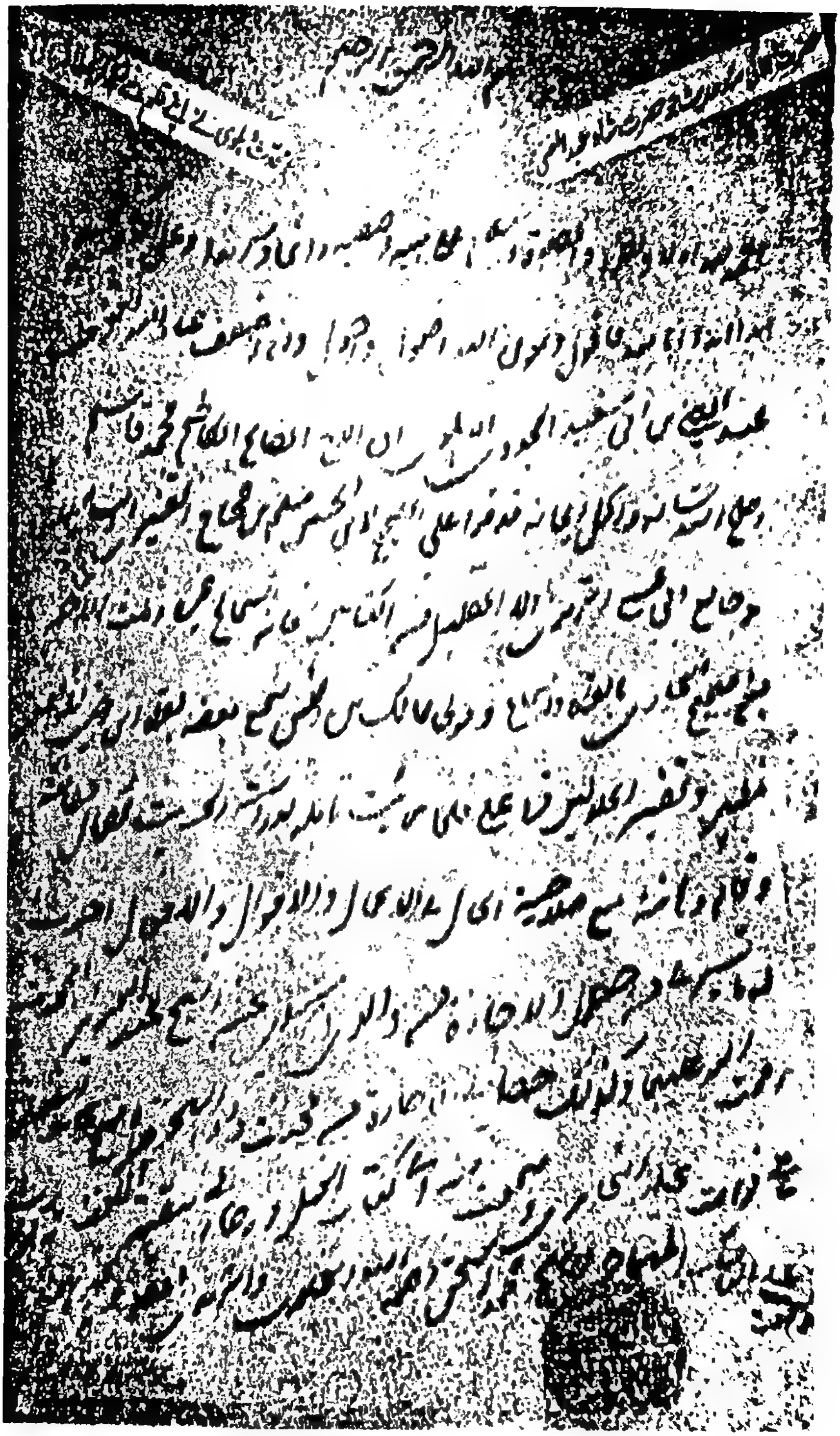

بسم الله الرحمن الرحيم

صحیح بخاری قرأت اور سماعت کے ساتھ اور موطا امام مالک بن انس میرے بھتیجے مولوی مظہر کی قرأت کے ساتھ اس کا بعض سنا۔ اور تفسیر جلالین بھی مجھ پر پڑھی۔ جب میں نے حدیث پڑھانے کی اہلیت ان کی پوری فطانت اور ذکاوت نیز اعمال واقوال وافعال میں ان کی صلاحیت پائی تو ان کیلئے حدیث کی اجازت جو کچھ مجھے اپنے والد اور اپنے مرشد سے اور ان کو شیخ عبدالعزیز محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہے، دی۔ اسی طرح مجھے محدث دارالہجرت شیخ عابد سندی سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے۔ کیونکہ میں نے ان پر بخاری پڑھی ہے اور کتاب الغسل تک سنی بھی ہے۔ انہوں نے مجھے بقیہ کتب حدیث کی بھی اجازت دی اور میں نے حدیث ناسک مہاجر شیخ محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ پر بھی بخاری وترمذی وغیرہما کتب حدیث پڑھیں۔

مہر کی شکل

واللہ الغنی وانتم الفقراء

یہ ہے تحریر کی صورت جو کہ ہمارے شیخ نے ہمارے شیخ کو لکھ کر دی۔ جس کو میں نے اوپر لکھا۔

مذکورہ سند سے معلوم ہوا کہ حجۃ الاسلامؒ نے بخاری شریف، ترمذی شریف، صحیح مسلم، موطا امام مالک اور تفسیر میں جلالین یہ پانچ کتابیں حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی ہیں۔ رہا ابوداؤد وہ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوریؒ محدث سے پڑھا جیسا کہ گذشتہ اوراق میں آپ کو معلوم ہو چکا ہے۔ اب صحاح ستہ میں سے دو کتابیں نسائی شریف اور ابن ماجہ کا کوئی پتہ نہیں کہ کس سے پڑھیں۔ غالباً یہ کتابیں بھی مولانا احمد علی صاحب یا مولانا مملوک علی صاحب سے پڑھیں ہوں گی جن کا تحقیقی طور پر علم نہیں یا ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کیونکہ مدارس عربیہ میں ان ماجہ، نسائی، موطا امام مالکؒ، موطا امام محمد کے ایک ایک دو دو سبق پڑھا دئے جاتے ہیں۔ خوب یاد ہے کہ ۱۳۴۵ھ کے تعلیمی سال میں بخاری شریف اور ترمذی دونوں کتابیں راقم الحروف نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت استاذ امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ سے پڑھیں اور ابوداؤد شریف حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ سے، مسلم شریف مولانا رسول خان صاحبؒ سے مکمل پڑھیں اور نسائی کے دو سبق یا ایک مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ چاند پوری سے اور موطا امام مالکؒ اور موطا امام محمدؒ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ سے ایک ایک دو دو سبق ابن ماجہ کا بھی ایک آدھ سبق غالباً مولانا سراج احمد صاحبؒ سے پڑھا باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

حجۃ الاسلامؒ کے علمی آباء واجداد اولاد کا شجرہ طیبہ

ہندوستان میں علم حدیث کا امام

شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی

از ١١١٤ھ/١٧٠٣ء تا ١١٧٦ھ/١٧٦٢ء

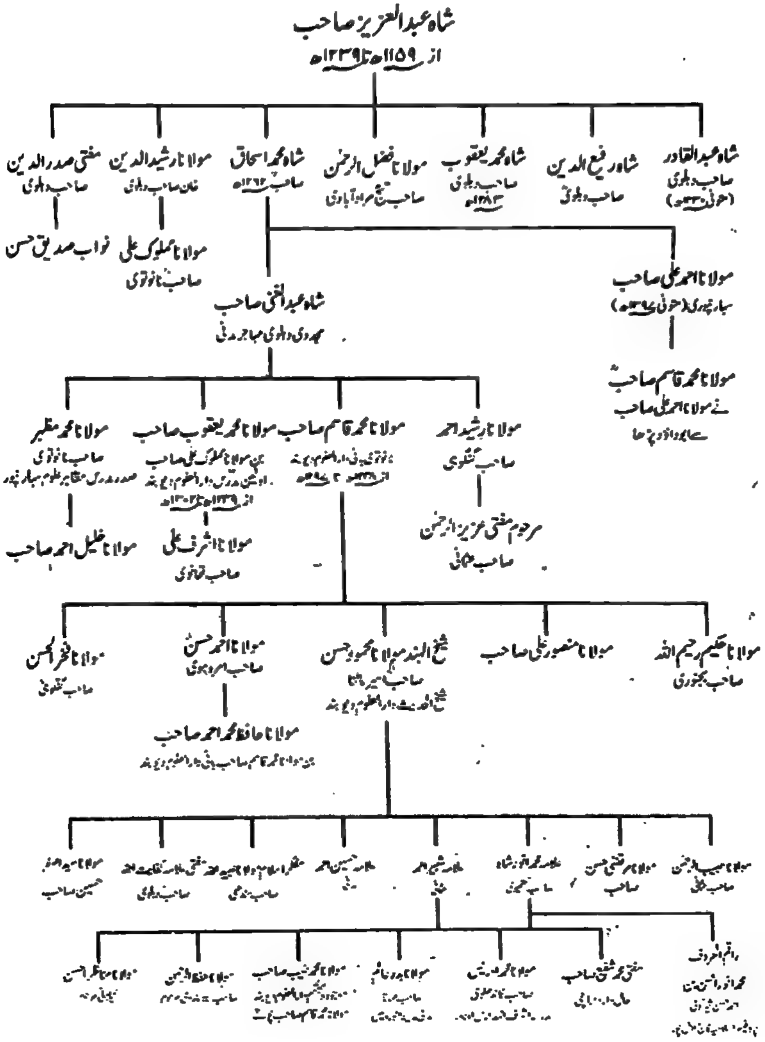
شاہ عبدالعزیز صاحب
از ١١٥٩ھ تا ١٢٣٩ھ
شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی (حوفی ١٢٣٠ھ)
شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی
شاہ محمد یعقوب صاحب دہلوی ١٢٨٣ھ
مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی
شاہ محمد اسحاق صاحب ١٢٦٢ھ
مولانا رشید الدین خان صاحب دہلوی
مفتی صدر الدین صاحب دہلوی
نواب صدیق حسن
مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی
مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری (حوفی ١٢٩٧ھ)
مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے مولانا احمد علی صاحب سے ابوداؤد پڑھا
شاہ عبدالغنی صاحب مجددی دہلوی مہاجر مدنی
مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی
مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند
مولانا محمد یعقوب صاحب بن مولانا مملوک علی صاحب اولین مدرس دارالعلوم دیوبند از ١٢٤٩ھ تا ١٣٠٢ھ
مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور
مرحوم مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی
مولانا اشرف علی صاحب تھانوی
مولانا خلیل احمد صاحب
مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری
مولانا منصور علی صاحب
شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند
مولانا احمد حسنؒ صاحب امروہوی
مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی
مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند
مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی
مولانا مرتضیٰ حسن صاحب
علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری
علامہ شبیر احمد عثمانی
علامہ حسین احمد مدنی
صاحب ندوی
مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی
مولانا سید اصغر حسین صاحب
راقم الحروف
مفتی محمد شفیع صاحب حال کراچی
مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
مولانا بدر عالم صاحب
مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند
مولانا حفظ الرحمٰن صاحب
مولانا مناظر احسن گیلانی

نوٹ: اس شجرے میں ہم نے تذکرہ علمائے ہند، نزہۃ الخواطر، سیرت سید احمد شہید مصنفہ علی میاں، اوجز المسالک اور اپنی ذاتی صحیح معلومات سے مدد لی ہے۔

ہم نے مذکورہ بالا شجرہ علمی میں مشہور مشہور علما کے نام درج کر دیئے ہیں۔ تمام کا احاطہ مقصود نہیں۔ اب ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نسبی، خاندانی اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کا شجرہ پیش کرتے ہیں جو یہ ہے:

شجرہ نسب خاندان شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ

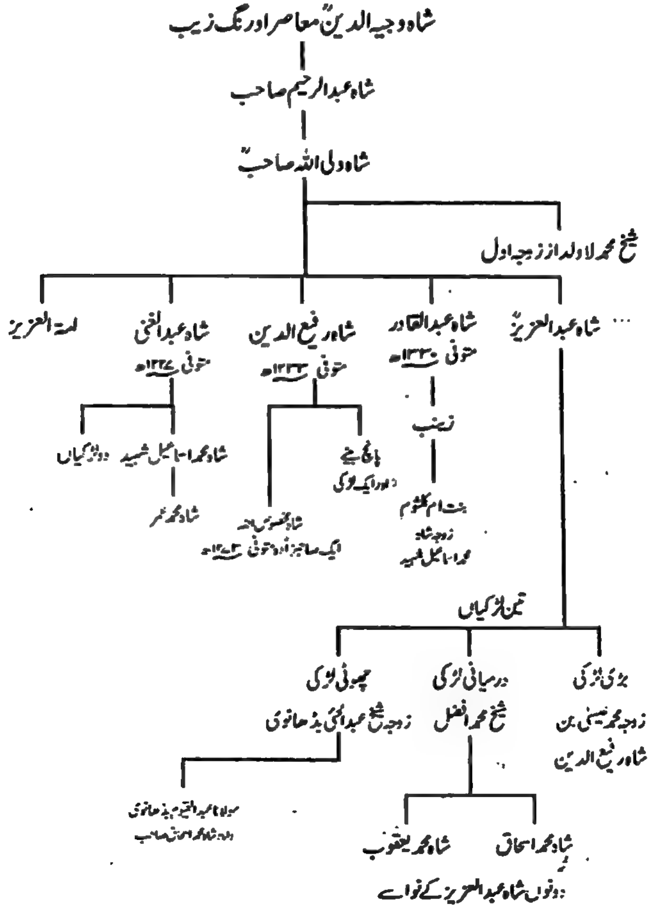
شاہ وجیہ الدینؒ معاصر اورنگ زیب
شاہ عبدالرحیم صاحب
شاہ ولی اللہ صاحبؒ
شیخ محمد لاولد از زوجہ اول
شاہ عبدالعزیزؒ
شاہ عبدالقادر متوفی ۱۲۳۰ھ
شاہ رفیع الدین متوفی ۱۲۳۳ھ
شاہ عبدالغنی متوفی ۱۲۲۷ھ
امۃ العزیز
زینب
بنت ام کلثوم زوجہ شاہ محمد اسماعیل شہید
پانچ بیٹے اور ایک لڑکی
شاہ مخصوص اللہ ایک صاحبزادہ متوفی ۱۲۷۳ھ
شاہ محمد اسماعیل شہید
دو لڑکیاں
شاہ محمد عمر
تین لڑکیاں
بڑی لڑکی زوجہ محمد عیسیٰ بن شاہ رفیع الدین
درمیانی لڑکی شیخ محمد افضل
چھوٹی لڑکی زوجہ شیخ عبدالحی بڈھانوی
مولانا عبدالقیوم بڈھانوی داماد شاہ محمد اسحاق صاحب
شاہ محمد اسحاق
شاہ محمد یعقوب
دونوں شاہ عبدالعزیز کے نواسے

نوٹ: شاہ ولی اللہ صاحب کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی سے شیخ محمد لاولد اور دوسری سے چار صاحبزادے پیدا ہوئے اور ایک صاحبزادی۔

نوٹ: یہ شجرہ ہم نے اوجز المسالک شرح موطا امام مالک از مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ صفحہ ۴۷ اور سیرت سید احمد شہید علی میاں سے اخذ کیا ہے۔

فیض ولی اللّٰہی:

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندوپاک میں حدیث کے استاذ ہیں ان کے بعد ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز صاحب کا فیض جاری رہا۔ بعد ازاں آپ کے دونوں نواسوں شاہ محمد یعقوب اور شاہ محمد اسحاق مسند حدیث پر بیٹھ کر طلبہ کو حدیث پڑھاتے رہے۔ جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی تو شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب صاحبؒ دونوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔ ان دونوں حضرات کے بعد دہلی کا دربار حدیث شاہ عبدالغنی بن مولانا ابوسعید مجددی کے دم سے رونق پذیر رہا۔ لیکن پھر شاہ عبدالغنی صاحب بھی حجاز کو ہجرت فرما گئے۔ انہی شاہ عبدالغنی صاحبؒ کا فیض مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو پہنچا۔

حجۃ الاسلام کی سند حدیث کے مختلف اساتذہ:

شاہ عبدالغنی صاحبؒ نے جو سند حدیث حجۃ الاسلام قاسم العلوم کو عطا فرمائی ہے اس میں انہوں نے اپنے مختلف اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:

۱۔ اجزت لہ ماتیسر من حصول الاجازۃ من والدی و مرشدی عن الشیخ عبد العزیزؒ

۱۔ میں نے (مولانا) محمد قاسم کو اجازت دی جیسا کہ مجھے اپنے والد و مرشد سے اجازت حدیث حاصل ہوئی اور ان کو شاہ عبدالعزیزؒ سے۔

۲۔ کذالک حصل لی الاجازۃ من محدث دار الھجرۃ الشیخ عابد السندی فانی قرأت علیہ البخاری.

۲۔ اسی طرح مجھے محدث شیخ عابد سندی سے اجازت حاصل ہوئی کہ میں نے ان پر بخاری پڑھ کر سنائی۔

٣. وسمعت علی الناسک المهاجر الشیخ محمد اسحاق رحمه الله تعالیٰ البخاری والترمذی وغیرهما.

٣۔ اور میں نے شیخ محمد اسحاق صاحب مہاجر رحمۃ اللہ علیہ پر بھی بخاری اور ترمذی وغیرہ سنی۔

تجزیۂ سند:

ان تینوں سندوں میں پہلا اور تیسرا سلسلہ سند شاہ عبدالعزیز صاحب پر ختم ہوجاتا ہے۔ البتہ شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے دوسرے استاد شیخ عابد سندی کی سند حدیث کا طریقہ دوسرا ہے۔ پھر ان شیخ عابد سندی کی سند میں شیخ علاء الدین کی تمام سند ہائے صحاح ستہ وغیرہا چار حضرات میں منحصر ہیں یعنی:

١۔ عبداللہ سالم بصری
٢۔ شیخ احمد نخلی
٣۔ شیخ حسن العجمی
٤۔ شیخ ابراہیم کردی

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنی بیاض میں حجۃ الاسلام کی بیان کردہ سند مذکورہ بالا چار حضرات کی اسناد کے متعلق بیان کرتے ہیں جو ان کے استاد شاہ عبدالغنیؒ سے آگے چلتی ہے۔ سند یہ ہے:

بسم الله الرحمن الرحیم

قال الشیخ الاجل مولانا المولوی محمد قاسم النانوتوی انه قال شیخی واستاذی قدوة العلماء مقتدی الفضلاء صاحب البرکات مولانا عبدالغنی بن قطب الوقت الحافظ ابی سعید النقشبندی انه قال الشیخ العلامه وحید العصر فرید الزمان الشیخ محمد عابد السندی اروی عن مولانا الامام الربانی الشیخ یوسف بن محمد بن علاء الدین المزجاجی عن والده الشیخ محمد عن والده الشیخ علاء الدین عن الشیخ عبد الله بن سالم البصری والشیخ احمد النخلی والشیخ حسن العجمی والشیخ ابراهیم الکردی.

وقال مولانا المولوی محمد قاسم فکل اسناد اذکره سردا فیها بعد فهو من احد هذہ الشیوخ الاربعة هکذا۔

(بیاض یعقوبی صفحہ ۱۵۷)

ترجمہ: شیخ اجل مولانا مولوی محمد قاسم نانوتوی نے کہا کہ میرے شیخ اور علما کے استاذ، فضلا کے پیشوا با برکات مولانا عبدالغنی ابن قطب وقت حافظ ابوسعید نقشبندی نے کہا کہ شیخ علامہ یکتائے روزگار و یکتائے زمانہ شیخ محمد عابد سندی نے کہا۔ انہوں نے مولانا امام ربانی شیخ یوسف بن محمد بن علاء الدین مزجاجی سے روایت کی اور انہوں نے اپنے والد شیخ علاء الدین سے اور انہوں نے شیخ عبداللہ بن سالم بصری اور شیخ احمد نخلی اور شیخ حسن عجمی اور شیخ ابراہیم کردی سے۔

اور مولانا مولوی محمد قاسم نے کہا کہ ہر اسناد جو میں بعد میں مسلسل ذکر کرتا ہوں وہ انہی چار شیوخ میں سے ایک کی ہے۔ اس طرح۔ (بیاض)

اس کے بعد مذکورہ بالا چاروں شیوخ سے جو مسلسل سندیں امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابوداؤد، امام نسائی، ابن ماجہ، سنن دارمی، مسند امام ابوحنیفہ، موطا امام مالک تک پہنچتی ہیں۔ مولانا محمد قاسمؒ صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے۔ جو بیاض یعقوبی میں صفحہ ۱۵۸ سے صفحہ ۱۶۲ تک پانچ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ وہیں ملاحظہ کی جائیں یہاں گنجائش نہیں کہ ان کو درج کیا جائے۔ البتہ یہاں ہم ایک دو سندیں بخاری کی پیش کرتے ہیں جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے امام بخاری تک شاہ محمد اسحاقؒ، شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے ذریعے پہنچتی ہیں۔

سند حدیث مولانا محمد قاسم صاحب تا امام بخاری:

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے حدیث کی سند مولانا شاہ عبدالغنیؒ سے لی انہوں نے شاہ محمد اسحاق صاحب سے اور شاہ محمد اسحاق صاحب نے اپنی سند اس طرح فرمائی ہے۔ جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب اور دیگر محدثین نے لکھی ہے:

قال مخدوم علماء الافاق شاہ محمد اسحاق الدهلوی المهاجر

حصل لی اجازة الکتاب المستطاب صحیح البخاری و قراء ته و سماعه من الشیخ الاجل و الحبر الاکمل الذی فاق بین الاقران باالتمیرا عنی الشیخ عبد العزیز و حصل له الاجازة والقرأة والسماع من والده الشیخ ولی الله بن عبد الرحیم الدهلوی و قال الشیخ ولی الله اخبرنا الشیخ ابوطاهر محمد بن ابراهیم الکردی المدنی قال اخبرنا والدی الشیخ ابراهیم الکردی المدنی قال قرأت علی الشیخ احمد القشاشی قال اخبرنا احمد بن عبد القدوس ابو المواهب الشناوی قال اخبرنا الشیخ شمس الدین محمد بن احمد بن محمد الرملی عن الشیخ احمد زکریا بن محمد ابی یحییٰ الانصاری قال قرأت علی الشیخ الحافظ ابی الفضل شهاب الدین احمد بن علی بن حجر العسقلانی عن ابراهیم بن احمد التنوخی عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الحجار عن السراج الحسین بن المبارک الزبیدی عن الشیخ ابی الوقت عبد الاول بن عیسیٰ بن شعیب السنجری الهروی عن الشیخ ابی الحسن عبد الرحمن بن مظفر الداودی عن ابی محمد عبدالله بن احمد السرخی عن ابی عبدالله محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر الفربری عن مولفه امیر المومنین فی الحدیث الشیخ ابی عبدالله محمد عن اسماعیل بن ابراهیم البخاری رحمه الله تعالیٰ.

ترجمہ: دنیا کے علما کے مخدوم شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر نے کہا ہے کہ مجھے کتاب مستطاب صحیح بخاری کی اجازت اور اس کی قرأت اور اس کی سماعت شیخ اجل اور عالم اکمل جو کہ ہم عصروں میں امتیازی شان کے باعث برتر ہوئے۔ میری مراد شیخ عبدالعزیز سے حاصل ہوئی۔ اور ان کو اجازت وقرأت وسماع اپنے والد شیخ ولی اللہ بن

عبدالرحیم دہلوی سے اور شیخ ولی اللہ نے کہا کہ ہمیں شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی نے خبر دی انہوں نے کہا کہ ہمیں میرے والد شیخ ابراہیم کردی مدنی نے انہوں نے کہا کہ میں نے (بخاری کو) شیخ احمد قشاشی پر پڑھا انہوں نے کہا کہ ہمیں خبر دی احمد بن عبدالقدوس ابوالمواہب الشناوی نے انہوں نے کہا کہ ہمیں خبر دی شیخ شمس الدین محمد بن احمد بن محمد رملی نے شیخ احمد زکریا بن محمد ابی یحییٰ انصاری سے انہوں نے کہا کہ میں نے شیخ حافظ ابی الفضل شہاب الدین احمد بن علی حجر عسقلانی پر پڑھی اور انہوں نے ابراہیم بن احمد تنوخی سے انہوں نے ابی العباس احمد بن ابی طالب جمار سے، انہوں نے سراج الحسین بن مبارک زبیدی سے، انہوں نے شیخ ابی الوقت عبدالاول بن عیسیٰ بن شعیب سنجری ہروی سے، انہوں نے شیخ ابوالحسن عبدالرحمٰن بن مظفر داؤدی سے، انہوں نے ابی محمد عبداللہ بن احمد سرخسی سے انہوں نے ابی عبداللہ محمد بن یوسف بن مطر ابن صالح بن بشر الفرلیری سے انہوں نے اس کے مولف حدیث میں امیر المومنین ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ سے۔

یہاں تک حجۃ الاسلامؒ کی سند امام بخاری تک بیسویں واسطے پر ختم ہوئی ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم، ترمذی، ابوداؤد کی سندوں کا حال ہے کہ وہ اپنے اپنے طرق میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے امام مسلم قشیری، امام ابی عیسیٰ ترمذی، امام ابوداؤد تک پہنچ جاتی ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ سے حضور پُرنور ﷺ تک سند حدیث:

اب ہم امام بخاریؒ سے حضور پرنور ﷺ تک راویوں کا سلسلہ پیش کرتے ہیں۔ اور کسی ایک حدیث کے ذریعہ امام بخاری سے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک کی سند عرض کرتے ہیں۔ یہاں آپ کے علم میں یہ حقیقت بھی ہونی چاہئے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے (جیسا کہ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کے مقدمے سے امام بخاریؒ کے حالات معلوم ہوتے ہیں) ایک ہزار شیوخ بلکہ اس سے بھی زائد سے حدیثیں حاصل کر کے لکھی ہیں۔ محدثین میں سے حاکم عبداللہ کا یہ قول پیش نظر رکھئے:

ورويـنـا مـن جـهـات عـن جـعـفـر بـن مـحـمـد القطان قال سمعت

البخاری یقول کتبت عن الف شیخ من العلماء زیادة ولیس عندی حدیث لا اذکر سنده۔

(مقدمہ بخاری از مولانا احمد علی صاحب صفحہ۴)

اور ہم نے کئی طریقوں سے جعفر القطان سے روایت کیا ہے کہ میں نے بخاری سے سنا کہ کہتے تھے کہ میں نے ایک ہزار علمائے شیوخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔ بلکہ زیادہ سے اور میرے پاس کوئی حدیث نہیں ہے کہ میں نے اس کی سند نہ لکھی ہو۔

بہرحال اب امام بخاریؒ سے رسول اللہ ﷺ تک سند معلوم کرنے کیلئے حسب ذیل حدیث لیجئے:

حدثنا ابو الیمان قال ثنا شعیب قال ثنا ابو الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرہ ان رسول اللہ ﷺ قال والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی کون احب الیہ والدہ وولدہ۔

دیکھئے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے ابو الیمان سے اور انہوں نے شعیب سے اور انہوں نے ابو الزناد سے، انہوں نے اعرج سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی رسول اللہ سے روایت کیا گویا امام بخاری تک رسول اللہ صلعم سے پانچ واسطوں کے ذریعے یہ حدیث پہنچی۔ اب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سرکار مدینہ رسول اللہ ﷺ تک پچیس واسطے معلوم ہوئے اور اس طرح بخاری کی یہ حدیث پچیس راویوں کی سند کے ذریعے حضرتؒ قاسم العلوم کو پہنچی۔ جبکہ امام بخاری تک قاسم العلوم سے بیس واسطے ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ اور ان کے حالات پر ایک نظر:

اتنی بات آپ کے ذہن میں یقیناً رہنی چاہئے کہ امام محمد بن اسماعیل البخاری جامع بخاری ۱۹۴ھ میں ترکستان کے مشہور شہر بخارا میں پیدا ہونے کی نسبت سے بخاری کہلائے اور اسی وجہ سے ان کی یہ کتاب صحیح بخاری کہلائی۔ اس کتاب میں ہر مضمون کی حدیثیں موجود ہیں۔ اس لئے اسے جامع بھی کہتے ہیں۔ بخاری میں حدیثوں کی کل تعداد چھ ہزار کے قریب ہے۔ چونکہ امام موصوف نے ان کے انتخاب میں بڑی تحقیق وتنقید سے کام لیا ہے اس لئے اپنی

جمع کردہ حدیثوں کی صحت کی بنا پر اس کتاب کا نام الصحیح رکھا۔ اسے عام طور پر صحیح بخاری کہتے ہیں۔ آپ کو ابتدا سے ہی علم حدیث کے ساتھ گہری دلچسپی تھی جہاں کوئی حدیث سنتے فوراً یاد کر لیتے۔ سولہ سال کی عمر میں اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ حج کیلئے گئے اور حج ادا کرنے کے بعد علم حدیث کی تحصیل کے لئے حجاز ہی میں رہ گئے۔ بعد ازاں مصر اور مختلف ممالک اسلامیہ کا حدیث حاصل کرنے کیلئے دورہ کیا۔ سولہ سال کے بعد آپ وطن آئے۔ کئی سال کی محنت کے بعد صحیح بخاری کو مرتب کیا۔ آپ نے انہی احادیث کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے جن کی صحت کے متعلق انہیں یقین تھا۔ اکثر علما کی رائے ہے کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری ہے۔ اس کتاب کے ترجمے چند مشرقی اور مغربی زبانوں میں ہو چکے ہیں اور متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ امام بخاری کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی۔ اس لئے ان سے سرکار مدینہ ﷺ تک احادیث کے راویوں کے واسطے پانچ کی تعداد میں ہونا قیاس کے مطابق ہیں۔ آپ کی عمر ۶۲ سال کی ہوئی۔

یمن کی بندرگاہ کے قریب ایک محدث سے سند حدیث کا لینا:

ہم اس کتاب میں اس بات کا پورا احساس رکھتے ہیں کہ اس کتاب کو جذبات اور غیر مصدقہ روایات سے پاک رکھیں لیکن جو واقعات اور روایات یقین کے درجے پر پہنچتی ہیں ان کو درج کرنے میں دل راہ شناس صحیح سمجھ کر لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ امیر شاہ خان صاحب نے حضرت حجۃ الاسلامؒ سے حسب ذیل روایت خود سنی ہے۔ اور وہ حسب ذیل سند کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ قصہ میں نے خود مولانا نانوتویؒ سے سنا ہے مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ انہی امیر خان صاحب نے فرمایا کہ:

> ''مولانا نانوتویؒ سفر حج میں تھے (کونسا حج تھا اس کا ذکر نہیں کیا) اس سفر میں ان کا جہاز یمن کی ایک بندرگاہ پر ٹھہر گیا اور مولانا کو معلوم ہوا کہ یہاں جہاز چند روز قیام کرے گا چونکہ آپ کو معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب کسی بستی میں ایک بہت معمر عالم اور محدث رہتے ہیں اس لئے آپ جہاز سے اتر کر ان کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ جب ان کی خدمت میں پہنچے اور گفتگو ہوئی تو مولانا کو ان کی شہرت علم کی تصدیق ہو گئی اور آپ نے

> ان سے حدیث کی سند کی درخواست کی ان عالم نے دریافت کیا کہ تم نے کس سے حدیث پڑھی ہے۔ مولانا نے فرمایا شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے۔ وہ عالم شاہ عبدالغنی صاحبؒ کو نہ جانتے تھے اس لئے دریافت کیا کہ شاہ عبدالغنی نے کس سے پڑھی ہے۔ مولانا نے فرمایا شاہ (محمد) اسحاق صاحب سے۔ وہ شاہ (محمد) اسحاق صاحب سے بھی واقف نہ تھے اس لئے پوچھا کہ شاہ اسحاق صاحب نے کس سے پڑھی ہے۔ مولانا نے فرمایا شاہ عبدالعزیز صاحب سے۔ وہ شاہ عبدالعزیز صاحب سے واقف تھے۔ جب ان کا نام سنا تو فرمایا کہ اب میں تم کو سند دے دوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ شاہ ولی اللہ طوبیٰ کا درخت ہے۔ پس جس طرح جہاں جہاں طوبیٰ کی شاخیں ہیں وہاں جنت ہے اور جہاں اس کا سلسلہ نہیں وہاں جنت نہیں اس کے بعد انہوں نے مولانا کو حدیث کی سند دے دی۔"
>
> (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۲۶۔۲۲۷)

قاسم العلوم کو بخاری شریف سے خاص نسبت تھی:

یوں تو ہر علم سے حضرت قاسم العلومؒ کو نسبت تھی۔ لیکن علم حدیث میں بخاری شریف کے علوم سے آپ کو خاص مناسبت تھی۔ جب حضرت مولانا بخاری شریف پڑھتے تھے۔ تو دہلی میں ایک مجذوب صاحب راستے میں ملتے تھے اور ان کی مولانا پر خاص عنایت تھی۔ یہ واقعہ مختلف راویوں سے مروی ہو کر نہایت صحت کے مقام پر پہنچا ہے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ حضرت گنگوہیؒ کی زبانی روایت کرتے ہیں:

> "ایک مرتبہ (مولانا گنگوہیؒ) خود ہی ارشاد فرماتے تھے کہ مدرسے کے راستے میں ایک مجذوب بیٹھا رہتا تھا اور آتے جاتے ہمیں ملا کرتا تھا۔ ہم دور سے سلام تو کر لیتے تھے مگر پاس نہ جاتے تھے۔ بیچارے بہت محبت کی نظر سے ہمیں دیکھتے اور پاس بلایا کرتے تھے۔ مگر ہمیں اپنے کام سے کہاں فرصت تھی اور بھی ڈر لگتا تھا کہ کہیں مجذوب نہ ہو جائیں نہ پڑھنے کے رہیں اور نہ لکھنے کے ایک مرتبہ انہوں نے دو امرود دئے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے لئے مگر کھائے نہیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ کہا بھی کہ کھالے بچہ۔ مگر ہم نے اپنے ہاتھ میں دبا لئے اور وہاں سے چل دئے۔ گھر آ کر طاق میں ڈال دئے۔ ان

میں سے ایک امرود ایک شخص نے کھا لیا تھا وہ تو مجذوب ہو گیا۔ دوسرا یونہی سوکھ کر گیا۔ اس کے بعد ہم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا۔ گو پھیر پڑتا مگر دوسری گلی سے نکل جاتے۔“

(تذکرۃ الرشید اول صفحہ ۳۵۔ ۳۶)

روایات الطیب میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی زبانی یہ روایت موجود ہے جو حضرت گنگوہیؒ کی روایت کی تائید کرتی ہے۔ جس سے ان مجذوب کا مزید حال بیان کیا گیا ہے۔ ان تمام روایات کا خلاصہ مولانا گیلانی نے اس طرح بیان کیا ہے:

”ایامِ طالب علمی میں ایک دن مولانا محمد قاسمؒ (صاحب) دلی کے کسی کوچے سے گذر رہے تھے کہ ان ہی حافظ عبدالقادر صاحب مجذوب سے راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ مولانا کے ہاتھ میں اس وقت بخاری شریف کا نسخہ تھا۔ حافظ صاحب نے بخاری کا یہ نسخہ آپ سے چھین لیا اور لے کر آگے بڑھ گئے۔ مولانا اس خیال سے کہ خدا جانے کتاب کو کہاں ڈال دیں گے آپ بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ راستے میں بھڑ بھونجے کی ایک دکان ملی حافظ (مجذوب) صاحب اسی دکان پر چڑھ گئے اور بھڑ بھونجے کی بھٹی پر بیٹھ کر بخاری شریف کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اوراق کو الٹتے جاتے تھے اور زبان سے من من من من کہتے جاتے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی روایت میں ہے کہ جب حضرت نانوتوی دہلی میں تعلیم پاتے تھے جس راستے کو جاتے تھے اس میں ایک مجذوب پڑا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے بلایا۔ مولانا کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ کہا تیرے ہاتھ میں کیا ہے۔ مولانا نے کتاب سامنے کر دی۔ اس نے اوراق الٹ پلٹ کر کے کچھ من من کی۔ پھر کتاب بند کر کے کہا ”جا تو بڑا عالم ہے۔“ (سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۲۵۶ و ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۰)

قاسم العلومؒ نے بخاری شریف براہ راست رسول اللہ ﷺ سے پڑھی:

حضرت قاسم العلومؒ نے پہلی مرتبہ جب ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں حج ادا فرمایا تو

پنجاب کے راستے سے ہوتے ہوئے جلاسہ پہنچے، اور راؤ عبداللہ صاحب سے ملے۔ راؤ عبداللہ صاحب بہت بڑے بزرگ تھے۔ ارذاح ثلاثہ میں ہے:

> "راؤ صاحب نے فرمایا کہ آؤ حاجی قاسم! مولانا نے فرمایا کہ حضرت میں حج کو جارہا ہوں فرمایا کہ پھر میں نے تمہیں حاجی ہی کہا تھا۔ رخصت کے وقت مولانا (محمد قاسم صاحب) نے فرمایا کہ حضرت میرے لئے دعا فرمائیے۔ اس پر فرمایا کہ بھائی میں تمہارے لئے کیا دعا کروں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں دونوں جہان کے بادشاہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بخاری پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

(ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۱۔۲۷۲)

آپ نے دیکھا کہ ایک اتنا بڑا ولی جیسا کہ راؤ عبداللہ صاحب تھے۔ وہ حضرت قاسم العلومؒ کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ راؤ صاحب اپنے زمانے کے بڑے صاحب کشف ولی تھے۔ انہوں نے کشف کی حالت میں رسول اللہ ﷺ سے مولانا محمد قاسم کو بخاری پڑھتے دیکھا ہے۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ قاسم العلوم نے یہ سن کر کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی اختیار فرمائی اور

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

نائب رسول ﷺ کا رسول ﷺ سے براہ راست پڑھنا:

مسلمانوں میں سے بعض وہ اہل علم جو اس کوچے سے ناواقف اور تصوف وروحانیت کی بلندیوں اور سلوک کی منزلوں سے ان کا گذر نہیں وہ اس حقیقت سے چونک جائیں گے کہ قاسم العلوم کا رسول اللہ ﷺ سے براہ راست بخاری پڑھنا کیسے ممکن ہے۔

اس شبہ کے جواب میں وہ بے شمار واقعات جو اولیا سے اسی قسم کے ظہور میں آئے ہیں اور جن کا جھٹلانا ناممکن ہے بیان کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ کا واقعہ جو مختلف کتابوں میں ہے اور اس کو مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی نے اپنے ملفوظات میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ حضور اقدس ﷺ کے مزار

مبارک پر حاضر ہوئے اور شدت شوق میں یہ اشعار پڑھے:

فی حالة البعد روحی کنت ارسلها
تقبل الارض عنی وهی نائبتی
فهذه ولة الاشباح قد حضرت
فامد یمینک کی تحظی اوبها شفتی

ترجمہ: دوری کی صورت میں اپنی روح بھیجا کرتا تھا جو میری طرف سے میری قائم مقام ہوتی تھی اور آپ کے روضے کی زمین چوما کرتی تھی۔ اب میں خود بذاتہ حاضر خدمت ہوا ہوں، لہٰذا اپنا مبارک ہاتھ بڑھایئے کہ میرا ہونٹ بوسہ لے کر لطف اندوز ہو۔

(انوار))

فوراً ہی حضور کا دست مبارک مزار مبارک سے باہر ظاہر ہو گیا۔ انہوں نے دوڑ کر بوسہ دیا اور بیہوش ہو گئے اس وقت حضور ﷺ کے دست مبارک کے نور سے سورج بھی ماند ہو گیا تھا۔ لکھا ہے کہ اس نوے ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔“

(ملفوظات جلد چہارم صفحہ ۵۷۲ تا ۵۷۳))

یہ ہم نے ایک مثال تائید کیلئے پیش کی ہے اور اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں ہم تو صرف یہ لکھتے آ رہے ہیں کہ حضرت قاسم العلومؒ نے بخاری شاہ عبدالغنی صاحبؒ سے پڑھی اور یمن کی بندرگاہ کے قریب ایک اور عالم دین سے حدیث کی سند لی اور دہلی کے مجذوب صاحب حافظ عبدالقادر نے قاسم العلوم سے بخاری لے کر اور واپس کرتے ہوئے کہا ”جا تو بڑا عالم ہے“۔ اور پھر جن کی باتیں حدیث کہلاتی ہیں ان کہنے والی ہستی رسول اللہ ﷺ سے بخاری پڑھی اور اس عالم میں پڑھی کہ راؤ عبداللہ صاحب کی معرفت و ولایت اور کشف کی آنکھوں نے خود رسول اللہ کے سامنے بیٹھے ہوئے پڑھتے دیکھا اس لئے قاسم العلومؒ کا بخاری سے بہت ہی والہانہ تعلق تھا۔ یہاں پر حضرت تھانوی کا وہ ملفوظ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت قاسم العلومؒ فرمایا کرتے تھے:

”تین کتابیں البیلی ہیں۔ ایک کلام اللہ ایک بخاری شریف ایک مثنوی شریف کہ ان کا

کسی سے احاطہ نہ ہو سکا۔ بخاری شریف کے تراجم کی دلالت کہیں خفی کہیں جلی۔ سچ یہ ہے کہ اس کا کسی سے احاطہ نہ ہوا ایسے ہی قرآن شریف اور مثنوی شریف کا۔

قاسم العلوم کا دور طالب علمی ختم ہو گیا:

ہم یہاں تک حضرت حجۃ الاسلام قاسم العلومؒ کے عہد طالب علمی کا اپنی بساط اور تحقیقات کے مطابق تمام حال بیان کر چکے یعنی حضرت مولانا مملوک علی صاحب کی وفات ۱۱/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء تک مولانا کسی نہ کسی شکل میں مولانا مملوک علی صاحبؒ، مفتی صدر الدین صاحبؒ، مولانا احمد علی صاحبؒ سے اور عربی کالج دہلی میں پڑھ کر عہد طالب علمی ختم کر چکے اور طالب علمی کا وہ پیارا اور سنہرا زمانہ جو عمر میں سب سے بہترین بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے اسے طے کر چکے اور انیس سال کی عمر میں فاضل بن گئے۔

اب ہم حضرت قاسم العلوم کے ان ظاہری علوم سے فارغ ہو کر ان کی روحانی منزلوں کی آپ کو سیر کرانا ضروری سمجھتے ہیں۔ آیئے اب ہم آپ کو دربار امدادیہ کی طرف لئے چلتے ہیں۔ جہاں کے میخانۂ معرفت کے ایک بڑے میخوار حضرت قاسم العلوم بھی تھے۔

تیسرا حصہ: روحانیات

جبینِ عقیدت آستانہ امدادیہ پر
علم ظاہر سے علم باطن کی طرف

مولوی ہرگز نشد مولائے روم
تا غلامِ شمسِ تبریزی نشد

بیعت قاسمی تقریباً ۱۲۶۶ھ:

شریعت اور طریقت کی دونوں راہیں متوازی لائن کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ شریعت کے بغیر طریقت کے علوم بے نور ہیں۔ اور طریقت کے بغیر شریعت کے علوم بے روح۔ یہ مانا کہ شریعت کے ظاہری علوم اپنی جگہ خصوصی اہمیت کے مالک ہیں۔ یہ قرآن وسنت کے قوانین اور تمدن ومعیشت کے لوازمات کا مجموعہ ہیں جن کے بغیر انسانیت کی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں لیکن ذہنی اور قلبی صلاحیتوں کو اجاگر اور بیدار کرنا علم تصوف اور روحانی علم کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ روحانیت کا حصول شریعت پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جس کے بغیر ایک عالم صحیح معنوں میں عالم نہیں ہوسکتا۔ اسی حقیقت کی طرف عنوان کے شعر میں اشارہ ہی نہیں بلکہ وضاحت کی گئی ہے۔ میرا مقصد علم تصوف اور اسرار معرفت سے ہے جس کے بغیر شریعت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اور تصوف سے بھی مرا مقصد صرف

وہ روحانی تعلیم ہے جو قرآن وسنت کے اتباع میں مضمر ہے۔

حضرت قاسم العلوم جب ظاہری علوم کی تحصیل کی آخری منزلوں میں تھے تو آپ نے پھر باطنی علوم اور اسرار معرفت ربانی کے حصول کی طرف توجہ فرمائی۔ کیونکہ وہ علم جس سے روحانیت متاثر نہ ہو۔ حقیقت میں علم کا حصول نہیں۔ علم خود ایک نور ہے وہ روحانیت کے ساتھ ہی جمع ہوسکتا ہے۔ سر کی آنکھیں ظاہری علم سے روشن ہو جائیں تو ہو جائیں لیکن دل کی آنکھیں روحانیت کے بغیر منور نہیں ہوتیں۔ بقول مولانا روم۔

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

اولیا اور اتقیائے کاملین کی صحبتیں جن میں وہ لی مع اللہ وقت (میرا اللہ کے ساتھ ایک خاص وقت ہوتا ہے) کی حالت میں ہوتے ہیں۔ صد سالہ تقوے کی عبادت سے بہتر ہوتی ہے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سال بودن و رتقا

حضرت قاسم العلومؒ میں روحانیت کی چمک ابتدا سے تھی۔ آئینہ دل پر آفتاب روحانیت کی ضیا پاشی کی دیر تھی۔ چنانچہ آفتاب امداد اللّٰہی سے ضوفشانی کی اور ماہتاب قاسمی نور سے جگمگا اٹھا۔ اس باطنی تعلیم کے حصول کے ڈانڈے کہاں سے ملتے ہیں اس کی بنیادیں طفلی سے اٹھائی جارہی تھیں اور اس کے سامان پیدا ہو رہے تھے۔

حضرت حاجی صاحب سے قدرتی روابط:

ہم ایک مرتبہ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی وہ عبارت جو آغاز کتاب میں ہم نے درج کی تھی۔ دوبارہ لکھنا مناسب اور ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے آپ کی وہ یاد تازہ ہو جائے گی کہ قاسم العلومؒ کے تعلقات و روابط حاجی صاحب سے قدرتی روابط تھے عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

"جناب مخدوم العالم حاجی امداد اللہ صاحب سے جو رابطہ نسب کا تھا حضرت مخدوم کی

> نانہال ہمارے خاندان (نانوتہ) میں تھی۔ اور بہن ان کی یہاں بیاہی تھی اکثر نانوتے تشریف لاتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نہایت محبت و اخلاص فرماتے۔" (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۵)

گیارہ سال کی عمر تک دہلی تحصیل علم کے لئے جانے سے پہلے یوں حاجی صاحب کی خدمت میں آمد و رفت رہی۔ گیارہ سال کی عمر میں جب حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا مملوک علی صاحبؒ کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے تو حاجی صاحب دہلی بھی کبھی کبھار جایا کرتے تھے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب حضرت گنگوہی کی زبانی سنی ہوئی لکھتے ہیں:

> "اعلیٰ حضرت حاجی صاحبؒ کی سب سے پہلی زیارت جو حضرت مولانا (گنگوہی) کو حاصل ہوئی اس کا تذکرہ خود حضرت امام ربانی نے بارہا فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاد رحمہ اللہ (مولانا مملوک علی صاحب) سے پڑھتے تھے ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی اس لئے انکار فرماتے تھے بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتے میں دو بار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے۔ خیر یہ منظور ہو گیا اور ہفتے میں دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب مع تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ لو بھائی حاجی صاحب آگئے حاجی صاحب آگئے اور حضرت مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "لو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا" مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے کہا کہ "بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا" مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے کہا "ہاہا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں اور ایسے ہیں" ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے۔ اول زیارت مجھے اس وقت ہوئی تھی اس کے بعد سے حضرت حاجی صاحب کو ہم دونوں کا خیال دریافت فرمایا کرتے تھے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وہ دو طالب علم (مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی رحمہما اللہ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور بس۔" (تذکرۃ الرشید صفحہ ۴۱ جلد اول)

علاوہ ازیں جب قاسم العلومؒ طالب علمی کے زمانے میں دہلی سے نانوتہ اور نانوتہ سے دہلی جاتے تو مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس تعلق یگانگت اور ازلی ارتباط قلبی کے باعث حضرت مولانا قاسم العلوم نے وطن سے دہلی اور دہلی سے وطن جاتے تھانہ بھون کی حاضری اور اعلیٰ حضرت کی زیارت کو (تھانہ بھون میں) اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ اعلیٰ حضرت (حاجی صاحبؒ) بھی جب دہلی تشریف لاتے تو حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے پاس قیام فرماتے اور استاذ الکل کے رشید شاگرد بھی زیارت سے بہرہ یاب ہوتے تھے۔ حضرت مولانا قاسم العلوم اپنے ہم جماعت طلبہ میں اعلیٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمالات علمیہ و عملیہ کا تذکرہ فرماتے اور خوارق و کرامات کے اظہار و بیان سے آستانہ علیہ کی طرف ترغیب دلایا کرتے تھے۔ خصوصاً امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ سے (مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی) چونکہ جلوت و خلوت کی شرکت تھی بہت ہی خصوصیت کا ذکر ہوتا بلکہ اس کی کوشش تھی کہ حضرت مولانا بھی اس مقدس ہاتھ پر بیعت ہوں۔''

(تذکرۃ الرشید جلد ۱ صفحہ ۴۰۔۴۱)

الغرض تھانہ بھون سے نانوتے کا قدرتی ٹیلیفون ایک روحانی رسل و رسائل کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ آخر جب ظاہری علوم اختتام پذیر تھے کہ حضرت قاسم العلوم نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی۔

بیعت رشیدی ۱۲۶۶ھ میں:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ۱۲۶۱ھ میں دہلی تشریف لے گئے تھے اور چار سال کے بعد گنگوہ تشریف لے آئے اور اس کے کچھ عرصے بعد آپ مولانا شیخ محمد محدث دہلوی سے ایک خاص مسئلے میں کہ انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان جو جگہ خالی ہے احادیث سے ثابت ہے کہ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دفن ہوں گے اور جو نہ مانے وہ ایسا یعنی کافر ہے۔ حضرت گنگوہیؒ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا وہاں دفن ہونا احادیث احاد سے ثابت ہے اور احادیث

احاد کا حکم قطعی اور یقینی نہیں ہے۔ اور اس کا منکر کافر نہیں ہوتا۔ اس پر مولانا شیخ محمد محدث نے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں بکثرت احادیث سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخر زمانے میں وفات کے بعد وہاں دفن ہونا ثابت کیا گیا تھا۔ حضرت گنگوہی نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نہ ان احادیث کا منکر ہوں اور نہ اس عقیدے کا مخالف بلکہ میں جو بات کہہ رہا ہوں اس رسالے میں اس کا جواب موجود نہیں اور وہ یہ ہے کہ احادیث احاد سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ قطعی نہیں بلکہ ظنی ہوتی ہے اور ظنی کا منکر کافر نہیں ہوتا۔ بہر حال شیخ محمد محدث کو یہ بات ناگوار گذری۔ حضرت گنگوہیؒ اس مسئلے میں بحث کیلئے تھانہ بھون پہنچے۔ حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی آپ نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ عرض کیا کہ اس مسئلے میں ان سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب نے فرمایا نہ بھائی ایسا نہ کرنا وہ ہمارے بڑے ہیں۔ بہر حال بحث وحث تو ختم ہوئی اور حضرت گنگوہیؒ نے بیعت کی درخواست کردی۔ رد وکد کے بعد حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی سفارش پر تین دن کے بعد حاجی صاحب نے مولانا گنگوہیؒ کو بیعت کرلیا۔

(ماخوذ از تذکرۃ الرشید جلد اول)

یہاں تو حضرت گنگوہی بیعت ہوگئے۔ ادھر اسی زمانے میں جبکہ حضرت قاسم العلومؒ دہلی میں تھے اور ی ۱۲۶۱ھ کے بعد وہیں رہے۔ بیعت ہوئے کیونکہ دہلی سے نانوتے آتے جاتے حجۃ الاسلام کی ملاقات حضرت حاجی صاحب ہوتی رہتی تھی گویا حضرت گنگوہی نے دہلی سے واپسی کے بعد گنگوہ کے دوران قیام میں بیعت کی اور حضرت حجۃ الاسلام نے دوران قیام دہلی میں تقریباً تعلیم سے فارغ ہوتے ہوتے بیعت کی۔ گویا اگرچہ ایک پہلے اور ایک بعد میں بیعت ہوئے لیکن زمانہ ایک ہی تھا۔ چنانچہ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ”یہی حال (جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا تعلیمی ترقی میں تھا) جناب مولوی رشید احمد صاحبؒ گنگوہی سلمہ کا تھا۔ مولوی (محمد قاسمؒ) صاحب سے اسی زمانے (یعنی دوران تحصیل تعلیم دہلی) سے دوستی اور ہم سبقی رہی۔ آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحب مرحوم کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔“

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۷)

حضرت عارف باللہ کی عبارت کے بعد مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تحقیق بھی سن لیجئے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب ”تذکرۃ الرشید کے حاشیے پر لکھتے ہیں:

> ”حضرت مولانا قاسم العلوم کو عقیدت میں حضرت گنگوہی سے مقدم ہیں۔ مگر ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے۔ حضرت مولانا کو اعلیٰ حضرت سے بیعت ہونے کی جو کچھ بھی ترغیب دیتے اور حاجی صاحب کے مناقب بیان فرمایا کرتے تھے وہ اسی عقیدت کی بنا پر تھے جو نانوتہ کے ابتدائی تعلق قرابت زیارت کے وقت سے آپ کو حاصل تھی۔ مولانا النانوتوی کے اعلیٰ حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرانے میں اصرار کوشش کا ثواب بھی حضرت مولانا گنگوہی کو حاصل ہوا۔ چنانچہ حضرت (گنگوہی) قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم صاحب نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم کو ہم نے مرید بنوایا۔ ۱۲ مولف“

(تذکرۃ الرشید حاشیہ صفحہ ۴۶ جلد اول)

ان دونوں عبارتوں میں ہمارے نزدیک کوئی تضاد نہیں جس کی دشواری مولانا گیلانی کو پیش آئی ہے مطلب صرف یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں دونوں بیعت ہوئے کوئی پہلے کوئی کچھ دیر بعد۔ بہرحال ہماری تحقیق یہ ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ ۱۲۶۶ھ میں بیعت ہوئے ہیں۔

بیعت کے بعد روحانی کیفیت:

مرید منشی فضل حق دیوبندی قاسم العلوم سوانح قاسمی مخطوطہ میں بیعت کے بعد کی روحانی حالت کا ان الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں:

> ”طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آن واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے۔ جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئی۔“ (سوانح مخطوطہ صفحہ ۱۵)

منشی فضل حق صاحب نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی مقامات سلوک طے ہو گئے تو دراصل یہ محاورے کے طور پر کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ عرصے کے بعد

جلدی ہی بکثرت ذکرواذکار کے باعث آپ کو فن سلوک کی منزلیں طے کرنے کا موقع مل گیا اور یہ بھی ناممکن نہیں۔ بعض لوگوں کو مرشد کامل کی ایک نظر میں ہی سلوک کی راہ صد سالہ طے ہوجاتی ہے۔ بقول شاعر ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

اس امر میں موسیٰ علیہ السلام کی نقل کرنے والا چور پیش نظر رہے کہ وہ فوراً ولی کامل بن گیا تھا۔

پیرومرشد کی خانقاہ مسجد پیروالی اور وہاں ذکر اللہ کی کیفیت:

بیعت کے بعد دہلی سے نانوتے کی راہ میں پیرومرشد کے یہاں تھانہ بھون قیام لازمی بات ہے۔ وہاں ذکر الٰہی اور یادالٰہی میں پیروالی مسجد کا جوسما تھا وہ حضرت عارف باللہ کے الفاظ میں سنئے لکھتے ہیں:

> ''سبحان اللہ کیا جلسہ تھا۔ پیر محمد والی مسجد میں وہ گلزار تھا کہ شب وروز سوائے ذکر اور قال اللہ قال الرسول کچھ اور دھیان نہ تھا۔ آخر شب میں ذکر جہر کا یہ رنگ ہوتا کہ غافل بھی جاگ اٹھتے اور توفیق ذکر اللہ کی پاتے۔'' (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۱۱-۱۲)

یہ وہی پیر محمد والی مسجد تھی جس کے ایک حجرے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، دوسرے میں حافظ محمد ضامن شہیدؒ اور ایک میں مولانا شیخ محمد محدثؒ تھانوی قیام رکھتے تھے۔

پیر محمد والی مسجد واقع تھانہ بھون کا منظر حکیم محمد عمر چرتھاولی ضلع مظفرنگری کے الفاظ میں:

— حکیم محمد عمر صاحب چرتھاول مظفرنگر کے رہنے والے شیخ محمد محدثؒ تھانوی کے مرید مسجد پیر محمد کا نقشہ اپنے حسب ذیل الفاظ میں اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''سبحان اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہ قدسی نفساں تھی۔ ہم پایہ نجوم یہاں کے نمازی تھے۔ ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی۔ ایک طرف شمال کے حجرے میں

مثال قطب شمالی عاشق ذوالجلال شہید لم یزلی ولی ازلی حافظ ضامن علی رحمۃ اللہ علیہ یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت قبلہ رہتے۔ سلطان زمین ولایت و کرامت، ماہ آسمان رفعت و عظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ سرگرم قال اللہ و قال الرسول رہتے۔ اور مسجد کے سامنے گرتوں پڑتوں کے تھامنے کو مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد محقق قدس اللہ سرہ الخالق (مولانا شیخ محمد محدث) .... کبھی درس و تدریس طلبہ میں .... کبھی مشاہدات ذات و سلطان الاذکار میں مستغرق ....

تینوں صاحب علاوہ اتحاد نسب، ایک پیر (میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی) کے مرید۔ وہ ماہ تو وہ بدر، وہ بدر تو وہ خورشید۔ جب کوئی شخص مرید ہونے کیلئے اس قلعے میں آتا ہفتوں بلکہ مہینوں بار بیعت نہ پاتا۔ جس کے پاس جاتا تو وہ اپنے سے بہتر دوسرے کو بتلاتا۔ دن رات پانچ سات طالب علم بحث مابعد و ماسبق میں مصروف، کوئی ذکر کلمہ طیب سے مطیب، کوئی تلاوت کلام زیبا سے مزیب، کسی کا دل پر اضطراب، صورت سیماب گرمی شغل ہو سے جواب، برق مضطر کسی کا سینہ فگار، کتاں دار، ضربات اسم ذات حق سے نمونہ شق القمر، کوئی آٹھوں پہر بارہ تسبیح کے ذکر میں، کوئی نفی و اثبات .... پر نظر جمائے ہوئے، کوئی ذکر خفی کے ذریعے .... دھیان لگائے ہوئے۔ کوئی مجرد ''الا اللہ'' کی ضربیں لگاتا، اسم ذات پڑھتا .... کوئی درود نامحدود پڑھنے میں دل و جان سے متوجہ، کوئی ادائے نوافل و وظائف میں اطمینان سے متوجہ، کوئی قرآن خوانی کرتا کوئی .... مراقبات میں جاں فشانی کرتا، کوئی تفسیر پڑھتا، حدیث سند کرتا، کوئی فقہ و اصول میں جہد و جہد کرتا، کوئی منازل درویشی کی تحقیق میں، کوئی مراحل و مراتب تصوف کی تصدیق میں طرہ براں کسی طرف تسبیح خواں کبوتراں یا ھو کسی طرف کچھ قمریاں (۱) مشغول حق سرہ۔

---

(۱) حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے کچھ قمریاں پال رکھی تھیں اور ان کی حق سرہ کی آواز پر بعض وقت بیہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ یہ خوش عقیدگی یا مبالغہ آرائی نہیں ہے بلکہ حکیم ضیاء الدین مرحوم رام پوری نے جو حافظ صاحب کے مرید تھے ''مونس مہجوراں'' میں حق سرہ پر حافظ صاحب کے بیہوش ہو جانے کا واقعہ لکھا ہے۔ (انوار)

اس قسم کی محفلوں میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کا شرکت کرنا اور مسلسل تھانہ بھون کی آمد ورفت میں اور اد وظائف، ذکر وفکر میں مشغول رہنا بھی معلوم ہے۔ چنانچہ حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی اپنی مذکورہ بالا عبارت اور مسجد پیر محمد والی میں ذکر و شغل کے بعد لکھتے ہیں:

> ”اور جب کبھی دو چار دل فگار مریدان رشید حضرات ممدوح الاذکار میں سے مثل مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی یا میانجی کمال الدین چرتھاولی غفر ہما اللہ الولی، خواہ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری یا مولوی رشید احمد گنگوہی سلمہا اللہ الحی آتے جاتے کچھ اور ہی رنگ جماتے۔“

(بحوالہ مضمون مولانا نسیم احمد فریدی رسالہ تذکرہ دیو بند اپریل ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۳۔۳۴)

یہ عبارت ہمارے لئے کتنی بڑی سند ہے کہ مسجد پیر والی میں یوں تو شب و روز اہل دل لوگوں کا مجمع رہتا حدیث و تفسیر وفقہ کا درس ہوتا۔ اللہ اللہ کے ذکر سے مسجد گونجتی لیکن ان آنے جانے والوں میں خصوصیت سے بہت بڑے عاشقین ذکر و شغل میں حکیم محمد عمر صاحب نے حضرت قاسم العلوم جیسے صاحب کی آمد کے مواقع پر مسجد میں ذکر اللہ کی اور بھی زیادہ رونق ہو جاتی تھی۔ محفل کا اور ہی رنگ ہو جاتا تھا۔ خود حضرت قاسم العلومؒ نے حافظ محمد ضامن صاحبؒ شہید کی شہادت پر جو طویل مرثیہ لکھا ہے۔ جس کو مونس مہجوراں میں حکیم ضیاء الدین صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں مسجد پیر والی کا وجد آور کیف اس طرح بیان کیا ہے ۔

شہید راہِ حق حافظ محمد ضامن چشتی
بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفان سے
نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو
سنیں گے پھر بھی وہ آوازاں لبہائے خنداں سے
تمہاری بزم پُرانوار جب یاد آئے ہم کو
تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب سوزاں سے

دیکھئے آخری شعر میں بزم پُرانوار نے ان کی مجلسوں کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے

کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ جو حضرت قاسم العلومؒ نے مسجد پیر والی میں شریک مجالس ہو ہو کر دیکھا تھا۔

ریاضت و مجاہدہ:

حضرت عارف باللہؒ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ قاسم العلومؒ کے مجاہدات نفس، اذکار و اوراد اور عبادات کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مولوی صاحب نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا۔ اشغال دشوار جیسے حبس اور سہ پایہ مدت تک کئے ہیں۔ اور بارہ تسبیح اور ذکر ارہ کا دوام تھا ہی۔ سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے۔ حرارت (ذکر اللہ کے باعث) مزاج میں ایسی آ گئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی کیونکہ یہ حرارت قلب کی تھی اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا۔'' (سوانح صفحہ ۱۶)

عارف باللہ نے یہ جو تحریر فرمایا ہے کہ ایسی ریاضتیں کی ہیں کہ کوئی کیا کرے گا اور یہ کہ ذکر اللہ کی حرارت دل میں ایسی بیٹھی تھی کہ اسی میں انتقال ہو گیا، ان دونوں جملوں میں انہوں نے قاسم العلومؒ کے مجاہدات نفس اور ریاضت کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ مرض الموت میں حجۃ الاسلامؒ کے عالم بیہوشی کے متعلق عارف باللہ نے اپنے مرید منشی محمد قاسم نیانگری کو تحریر فرمایا۔

عالم نزع میں پاس انفاس:

> ''بیہوشی ایسی ہوئی کہ نماز ظہر ادا نہ ہو سکی یہ منگل (۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) کا دن تھا۔ شام کو حالت نزع کی سی ہو گئی۔ مگر پھر سانس درست ہو گیا۔ یہ دورہ مرض کا تھا۔ رات بھر وہی کیفیت رہی اور بدھ کا تمام دن یہی حالت رہی۔ زبان بند، ہوش مطلقاً مفقود، البتہ سانس کے ساتھ پاس انفاس جاری۔''

(خط مولانا محمد یعقوبؒ صاحب بنام منشی محمد قاسم نیانگری۔ مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۶)

اللہ اللہ ذکر اللہ کی گرمی اور عالم نزع سے پہلے بیہوشی کے عالم میں سانس کے ساتھ ذکر خداوندی کا اجرا ولایت کا کتنا بڑا ظہور ہے کہ مرتے وقت بھی محبوب کا نام سانس کے ساتھ

نکل رہا ہے۔ غرض بقول ایں راقم الحروف ؎

عشق نے پھونک دیا خرمن ہستی انور
آگ جو دل میں لگی تھی وہ جلاتی ہی رہی

بیعت کے بعد اذکار و اشغال کی کثرت کے نتائج:

مولانا گیلانی نے سوانح مخطوطہ غیر مطبوعہ کے حوالے سے جن کو قاسم العلوم کے مرید منشی فضل حق دیوبندی نے لکھا تھا۔ تحریر کیا ہے:

> ''آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم، ذکر ارہ وغیرہ میں مشغول رہے۔ چھ چھ سات سات گھنٹے برابر ذکر ارہ اور حبس دم کرتے تھے۔ جس وقت آپ اس شغل کو کرتے صرف ایک تہ بند بدن پر رکھتے تھے۔ وہ تہ بند ع تی بدن (پسینے) سے ایسا تر ہو جاتا تھا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علیحدہ کر کے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے۔''

(سوانح مخطوطہ صفحہ ۱۵)

اخفائے حال اور یادِ ذوالجلال:

اپنے میخانہ معرفت یعنی حاجی امداد اللہ صاحب ؒ کی خانقاہ تھانہ بھون اور خانقاہ بھی کہاں مسجد پیر محمد والی میں جب آمد و رفت اور ذکر و شغل کی محفلوں میں حضرت قاسم العلوم شامل ہوتے۔ مریدان عقیدت کیش اپنے اپنے حال کہتے تو آپ کیا عرض کرتے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب ؒ فرماتے ہیں:

> ''حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) جب یہاں وطن (تھانہ بھون) میں تھے تو مولانا گنگوہی اور بھی بعض ذاکرین اپنے اپنے حالات حضرت (حاجی صاحب) سے بیان کرتے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب ؒ کچھ نہ بیان فرماتے۔ حضرت (حاجی صاحب) نے ایک دن پوچھا کہ آپ کچھ نہیں کہتے۔ مولانا محمد قاسم صاحب یہ سن کر رونے لگے اور عرض کیا کہ حضرت حالات و ثمرات تو بڑے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ مجھ سے تو جتنا کام حضرت نے فرمایا ہے وہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ جہاں تسبیح لے کر بیٹھا بس ایک مصیبت

ہوتی ہے۔ اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں۔ زبان قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں۔ حضرت کے کامل یا شفیق ہونے میں شبہ نہیں لیکن ؎

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

میں ہی بدقسمت ہوں۔ ایسا ہوتا ہے جیسے کسی نے زبان کو جکڑ دیا ہو۔ تو یہ حال سن کر بے ساختہ حضرت (حاجی صاحب) فرماتے ہیں کہ مبارک ہو یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور سرور عالم ﷺ کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا۔"

(قصص الاکابر صفحہ ۲۲)

یہ بات نقل کر کے حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ فرماتے ہیں:

"اس زمانے میں (جب حضرت قاسم العلوم اور حاجی صاحبؒ کے درمیان یہ تبادلہ خیال وحال ہوا تو) مولانا محض نو آموز طالب علم تھے۔ اس وقت یہ گمان بھی نہیں تھا کہ یہ اس قدر بڑے عالم ہونے والے ہیں۔ اب تو اس پیشین گوئی کا انطباق آسان ہے لیکن اس وقت یہ فرما دینا عجیب وغریب بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔ حضرت (حاجی صاحب) نے (مولانا محمد قاسم صاحب سے) فرمایا کہ تم سے حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جاؤ دین کی خدمت کرو ذکر وشغل کا اہتمام چھوڑو۔"

(قصص الاکابر صفحہ ۲۲)

حضرت حجۃ الاسلامؒ قاسم العلوم کی انکساری کہ حالات تو بڑے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ اور آپ کے اخفائے حال اور مرشد کامل کے ریمارکس سے کہ آپ کے قلب پر نبوت کا فیضان یعنی علم نبوت کی روشنی پڑ رہی ہے۔ اہل بصیرت کے لئے قاسم العلوم کا مقام واضح ہو جاتا ہے حالانکہ آپ کا یہ ابتدائی دور تھا۔ مگر پھر کس مقام پر پہنچے اور اس ابتدا کی انتہا کہاں پہنچی اس کا اندازہ آئندہ حالات سے معلوم ہوگا۔

شراب معرفت کے خم کے خم خموشی سے لنڈھائے جاتے ہیں:

مگر حضرت قاسم العلوم خموشی سے آفتاب روحانیت کے فیض سے شراب معرفت کے

خُم کے خُم لنڈھاتے جاتے ہیں۔ مگر ظرف اتنا بڑا ہے کہ چھلکتا نہیں اور جس قدر پیتے ہیں۔ وہ ظرف میں سما جاتا ہے۔ کوئی پتہ چلائے تو کیوں کر کہتے ہیں کہ ولی را ولی می شناسد لیکن قاسم ولی اللہ کو ولی بھی مشکل سے پہچانتے ہیں۔ نواب مصطفیٰ خان جو کہ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی مجددی کے مرید اور روحانیت کے خاص مقام پر پہنچ چکے تھے۔ وہ حضرت قاسم العلوم کی نسبت اور مقام ولایت کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کشف حقیقت سے قاصر رہتے ہیں۔ جناب امیر شاہ خان صاحب حضرت قاسم العلوم کی ولایت و نسبت کے اخفا کے متعلق نواب صاحب کا حسب ذیل قول بیان کرتے ہیں:

> ”نواب مصطفیٰ خان کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر (خانوادہ ولی اللّٰہی) میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے۔ سر اٹھایا تو ایک صاحب ہو جان (نامی) سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے لیکن مولانا (محمد قاسم) کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے۔“ (بحوالہ سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۳۲۷ جلد اول)

ثواب مصطفیٰ صاحب کے یہ الفاظ کہ ”میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے لیکن مولانا محمد قاسم کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے“ حضرت قاسم العلوم کے مقام ولایت، بلندی روحانیت اور نسبت کی گہرائی اور اخفا کا خاص پتہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ ولایت کا شہباز کس قدر سلوک کے آسمانوں پر اونچا اڑ رہا تھا۔

ولایت کا فطری ملکہ:

اگر آپ حضرت قاسم العلوم کے اخلاق، ملکات اور خصائل کے مزاج داں ہوں تو آپ کو ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو بچپن سے ہی ولایت سے فطری نسبت اور روحانیت میں قدرتی لگاؤ تھا حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ صاحب کشف اور ولی کامل عالم تھے آپ کی پیدائش ۱۲۱۳ھ کی ہے اور حضرت قاسم العلوم کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں ہوئی۔ ان دونوں کی عمروں کا فرق آپ کے سامنے ہے۔ غرض حضرت گنج مرادآبادیؒ کی

خدمت میں حضرت قاسم العلوم کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا:

”اس کم سنی میں ان (مولانا محمد قاسمؒ) کو ولایت مل گئی۔“

یہ الفاظ حافظ تجمل حسین صاحب دسنوی نے اپنی مولفہ کتاب ”کمالات رحمانی“ میں صفحہ ۱۲۴ پر مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے خود سن کر تحریر فرمائے ہیں۔ اتنی کم عمر میں یعنی بیعت کے بعد جوانی کی ابتدائی منزلوں میں آپ کو ولایت کامل جانا آپ کی منزل فقر و سلوک کا کتنا واضح ثبوت ہے۔

ولایت کا مقصد انسانیت قاسم العلوم اعلیٰ انسان تھے:

غور سے دیکھا جائے تو سلوک کی منزلوں کے طے کرنے میں انسان کے اخلاق کی پاکیزگی اصل مدعا ہے۔ اسی لئے حضور پُر نور ﷺ کو

انک لعلی خلق عظیم

فرما کر آپ کی انسانیت کاملہ سے پردہ اٹھایا جارہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت قاسم العلوم اپنی منزل سلوک میں روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ کر ایک بہت بڑے انسان بن چکے تھے اور سچ پوچھئے تو یہی ولایت ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے اپنے ملفوظات میں بار بار فرمایا ہے کہ مجھ سے اگر کوئی بیعت کرنا چاہتا ہے تو وہ انسان بننے کیلئے مجھ سے بیعت کرے۔ میں تو آدمی کو انسان بنانا چاہتا ہوں اور اگر ہوا میں اڑنے اور دریا پر چلنے کیلئے کوئی منزل سلوک میں قدم رکھنا چاہتا ہے تو وہ کہیں اور جائے۔ حضرت تھانوی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ سلوک کا دوسرا کام انسانیت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت قاسم العلوم کو ولایت میں انسانیت کا وہ مقام حاصل ہو گیا تھا۔ جہاں آپ کا نفس انسانیت کے تابع ہو چکا تھا۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند جو صاحب کشف اولیا میں سے تھے۔ مولانا نظام الدین صاحب حیدر آبادی نے جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں درج ہے یہ روایت مولانا رفیع الدین صاحب کی زبانی حضرت قاسم العلوم کے متعلق فرمائی ہے کہ وہ فرماتے تھے:

> ''میں نے انسانیت سے بالا درجہ (قاسم العلومؒ) کا دیکھا وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا تھا۔'' (ارواح صفحہ ۱۸۳)

اور یہی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ''میں پچیس برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور کبھی بلا وضو نہیں گیا۔'' (ارواح صفحہ ۱۸۳)

قاسم العلوم میں اسوہ نبوت کا نمونہ اور انسانیت کا اعلیٰ مقام:

اگر آپ حضرت قاسم العلومؒ کی انسانیت اعلیٰ نمونہ اور مقام معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کے اس بے نفسانہ عمل میں ملاحظہ فرمائیے۔ جو رام پور منہاران کے چند دشمنوں کے ساتھ آپ کا سلوک رہا ہے۔ یہ بعینہٖ وہی نمونہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ فرما کر پیش کیا ہے حضرت قاسم العلوم کی بعض مفسدوں نے جس میں رام پور منہاران کا ایک خاندان بھی شامل تھا حکومت برطانیہ میں رپورٹ کردی کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں جو مدرسہ کھولا ہے اس کا مقصد قبائلی علاقوں کے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنا اور ان کو گورنمنٹ کے مقابلے میں اکسانا ہے۔ اس دشمنی کے باوجود آپ ان سے نہایت مخلصانہ ملتے تھے۔ استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ''حضرت والد ماجد (مولانا حافظ محمد احمد بن مولانا محمد قاسم صاحب) نے فرمایا کہ رامپور کے اسی مخالف و معاند خاندان کے دو رکن دو بھائی تھے جن سے حضرت نانوتویؒ کا بچپن سے میل جول تھا اور حضرت کا معمول تھا کہ جب رامپور تشریف لے جاتے تو ان دونوں بھائیوں سے ملنے ضرور جاتے اور وہ حضرت سے ملنے حکیم ضیاء الدین صاحب کے مکان پر آتے۔ اس خاندان کی اس مفسدہ پردازیوں کے زمانے میں بھی حضرت کی یہ عادت نہ بدلی۔ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب کو ناگوار گذرتا تھا کہ اب حضرت ان مفسدوں میں کیوں تشریف لے جاتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود حضرت ہی پر کیا کیا زبردست الزام نہیں لگائے۔ مگر زبان سے کبھی نہیں فرمایا۔
>
> ایک دفعہ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی دونوں کا رامپور میں اجتماع ہوا۔ اور

> حضرت (قاسم العلومؒ) حسب عادت اسی مقام پر تشریف لے گئے تو حضرت حکیم صاحب نے حضرت گنگوہی کے سامنے ناک چڑھا کر فرمایا کہ دیکھئے مولانا نانوتوی اب بھی وہاں جانا نہیں چھوڑتے حضرت مسکراتے رہے۔ جب حکیم صاحب کی تیزی بڑھتی گئی اور صفائی سے فرمانا شروع کیا تو حضرت نے ذرا مستعد ہو کر فرمایا کہ حکیم صاحب آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ ان کے قلب کی حالت ملاحظہ نہیں فرماتے۔ جس شخص کے قلب میں ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل و خوار کوئی ہستی نہیں ہے تو ایسے شخص کو آپ کس طرح کہیں جانے سے روک سکتے ہیں؟ اور کہیں چلے جانے سے ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟'' (روایات لطیب از ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۳)

یہ ہے رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ جس کے سانچے میں قاسم العلوم ڈھل چکے تھے اور ہمارے نزدیک یہی تصوف، یہی سلوک، یہی انسانیت اور یہی درویشی ہے۔

اخفائے حال اور کشف تمام کی ایک مثال:

ہم نے مذکورہ صفحات میں نواب مصطفیٰ صاحب کی زبانی قاسم العلومؒ کے اخفائے نسبت ولایت کے متعلق عرض کیا تھا۔ اس مقام پر ایک خاص واقعہ پیش کرتے ہیں جو عارف باللہ قاسم العلومؒ کے کشف تمام اور اخفائے حال ولایت کے متعلق تحریر فرمایا ہے جو میرٹھ میں ایک صاحب کے ساتھ پیش آیا لکھتے ہیں:

> ''باوجودیکہ کشف تمام تھا مگر کبھی زبان سے کچھ نہ فرماتے ادنیٰ ادنیٰ اہل نسبت کے پاس بیٹھنے سے اثر ہوتا ہے۔ مولانا کو یہ ضبط تھا کہ کبھی کچھ اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ ایک بار مولوی (محمد قاسم) صاحب نے میرٹھ میں مثنوی روم پڑھانا شروع کی۔ دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضمون بیان ہوتے۔ ایک صاحب کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے سن کر یہ سمجھے کہ یہ اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ کچھ مولانا کو فیض باطنی دیا جائے۔ درخواست کی کہ کبھی تنہا ملئے۔ آپ نے فرمایا مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے۔ تنہائی کہاں۔ آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔ وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ آپ ذرا میری طرف متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے۔

مولانا سبق پڑھا رہے تھے۔ سبق البتہ موقوف کردیا۔ مگر کبھی آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بندان کی طرف متوجہ ہوئے ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہوجاتے تھے۔ اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے۔ کچھ دیر یہ معاملہ رہا۔ پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے۔ پھر بہت معذرت کی۔” (سوانح صفحہ ۱۶۔۱۷)

اللہ اللہ کیا خوب روحانی جنگ تھی۔ اس کیفیت سے دل چٹخارے لینے لگا۔ بات جو کچھ ہے سامنے ہے مگر اس سے حضرت قاسم العلوم کی روحانی طاقت کا اندازہ ہوگیا۔ نہ صرف اندازہ بلکہ ولایت و روحانیت کا اخفا مزید روحانیت کی دلیل بن گیا۔ ہمیں اس مقام پر قاسم العلوم کے مثنوی کے درس کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے جو قاسم العلومؒ میرٹھ میں دیا کرتے تھے اور جس کا نشان مذکورہ بالا عبارت میں عارف باللہؒ نے دیا ہے۔ اس درس مثنوی کے سلسلے میں قارئین پر بعض اہم امور کا بھی انکشاف ہوگا۔

مثنوی مولانا روم:

حضرت مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کو ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ کہا گیا ہے۔ صوفیا علماء میں اس کتاب کو بے حد ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ یہ کتاب معرفت کی دکان ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر اقبال جو اپنے آپ کو مرید ہندی اور مولانا کو پیر رومی کہتے ہیں اپنے فرزند ڈاکٹر جاوید کو جاوید نامے میں مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
پیر رومی کو اپنے راستے کا رفیق بنالے　　تاکہ تجھے خدا سوز و گداز عطا فرمائے
زانکہ رومی مغز را ماند ز پوست　　پای او محکم فتدور کوی و دست
کیونکہ رومی مغز اور پوست میں تمیز رکھتے ہیں　　اور ان کا پاؤں دوست کے کوچے میں مضبوط پڑتا ہے
شرح او کردند اور را کس ندید　　معنی او چوں غزالی از ما رمید
لوگوں نے مولانا روم کی شرح کی لیکن انہیں کسی نے نہیں پایا　　ان کی حقیقت ہرنی کی مانند ہم سے نکل کر بھاگ گئی
رقص تن از حرف او آموختند　　چشم را از رقص جاں بردوختند
لوگوں نے جسم کا ناچ ان کی باتوں سے سیکھا　　لیکن روح کے رقص سے آنکھوں کو سی لیا

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر اقبال" مولانا روم کی مثنوی کو رہنمائے راہ زندگی بتا رہے ہیں کیونکہ اس سے دل میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے اور دل عشق حقیقی میں پگھلتا ہے۔

درس مثنوی اور حاجی امداد اللہ صاحب:

حاجی امداد اللہ صاحب" نے تھانہ بھون میں اور ہجرت کے بعد مکہ معظمہ میں مدتوں مثنوی کا درس دیا ہے اور اس سے ان کے حلقہ مریدین میں جو سوز و ساز کی کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ حسب ذیل ایک واقعے سے واضح ہو جائے گی۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب" اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب" سے مثنوی کا سبق پڑھنا چاہا۔ مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے۔ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے سن لیا۔ مجھ کو بلا کر پوچھا۔ سنا ہے کہ حضرت مولانا سے تم مثنوی پڑھنا چاہتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ فرمایا کہ مولانا کو مدرسے میں بیٹھا رہنے دو۔ ورنہ جنگلوں میں چڑھ جائیں گے۔'' (ملفوظات حصہ چہارم ملفوظ ۹۴۷ صفحہ ۵۸۸)

اس ملفوظ سے اندازہ لگالیجئے۔ کہ مثنوی اہل معرفت کی روح کو رقص اور وجد میں لے آتی ہے اور وہ عارف ہی کیا جس کا جسم وجد میں رقص کرنے لگے۔ لیکن روح میں اہتزاز اور رقص پیدا نہ ہو۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم جاوید نامے میں لکھتے ہیں:

رقص تن در گردش آرد خاک را ۔۔۔ رقص جاں برہم زند افلاک را
جسم کا رقص خاک کو گردش میں لاتا ہے ۔۔۔ روح کا رقص آسمانوں کو زیروزبر کر ڈالتا ہے
علم و حکم از رقص جاں آید بدست ۔۔۔ ہم زمین ہم آسماں آید بدست
علم اور حکم روح کے رقص سے حاصل ہوتا ہے ۔۔۔ زمین اور آسمان بھی قبضے میں آجاتے ہیں
رقص جاں آموختن کاری بود ۔۔۔ غیر حق را سوختن کاری بود
روح کا رقص سیکھنا تو ایک کارنامہ ہے ۔۔۔ اور اللہ کے سوا سب کو جلا دینا کام کی بات ہے

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی"، حضرت محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ان تینوں حضرات نے مثنوی کے معانی اور مضامین معرفت سے جسم کے رقص

کے بجائے روح کا رقص سیکھا۔ اسی لئے مولانا رفیع الدین صاحب نے مولانا اشرف علی صاحب سے درست فرمایا تھا۔ کہ تم مولانا محمد یعقوب صاحب سے مثنوی پڑھنا چاہتے ہو وہ جنگلوں کو نکل جائیں گے اور رقص جاں کے باعث مدرسہ چھوڑ دیں گے۔

درس مثنوی میرٹھ میں اور قاسم العلوم کا رقص روح:

مثنوی پڑھاتے وقت قاسم العلوم کا بھی یہی حال ہوتا تھا وہ جب میرٹھ میں قیام پذیر تھے اور مثنوی کا درس دیتے تھے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں حضرت عارف باللہ نے پتہ دیا ہے کہ:

> ''ایک بار مولوی (محمد قاسم) صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب و غریب مضمون بیان ہوتے۔ تو حلقہ درس میں شریک ہونے والوں کی عجب کیفیت ہوتی تھی اور یہ مثنوی سے رقص روح کے حصول کا نتیجہ تھا۔''

قاسم العلومؒ نے حضرت حاجی صاحب سے مثنوی کا درس لیا ہے:

اس مقام پر پہنچ کر ایک بار پھر عرض کرتا چلوں اور یہ جو میں عرض کرنے لگا ہوں وہ الہامی بھی ہے اور تحقیقی بھی کہ حاجی صاحب تھانہ بھون میں جب مثنوی پڑھاتے تھے تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ وغیرہما۔ ان سب حضرات نے حاجی صاحب کے حلقہ درس مثنوی میں شرکت کی ہے۔ چنانچہ مولانا تھانوی جب حج کو تشریف لے گئے ہیں اور وہاں حاجی صاحب ہجرت کے بعد مقیم ہیں تو اپنے ہمراہ مثنوی کا ایک نسخہ بھی ہمراہ لیا تھا کہ وہاں پہنچ کر حاجی صاحب کے درس میں شرکت کر سکیں جیسا کہ ملفوظات تھانوی میں ہے۔ اس لئے اگر ہم نے قاسم العلوم کے اساتذہ کی فہرست میں حاجی امداداللہ صاحبؒ کو بھی شمار کیا ہے۔ تو وہ غلط نہیں ہے بلکہ ہم نے یہ کہا ہے کہ دوران آمد و رفت نانوتہ میں حاجی صاحب سے جلد بندی ہی نہیں سیکھی بلکہ کبھی کریما کا کوئی سبق اور کبھی پندنامے کا، کبھی قرآن شریف کا اور کبھی گلستان کا پڑھا ہے اور مثنوی مولانا روم کے اسباق تو یقیناً پڑھے ہیں اس لئے حاجی صاحب قاسم العلومؒ کے جہاں روحانی استاد تھے وہاں علمی استاذ بھی تھے اور اسی لئے مصباح التراویح میں حاجی صاحب کے متعلق قاسم العلومؒ نے تحریر فرمایا ہے۔

زخاک کف پائے استاذ و پیر وزاں سایہ رشک مہر منیر
کہ مانند زمانے بدست و سرم بہ چشم رسد نور و گل در برم

آمدم بر سر مطلب:

ہم حضرت حجۃ الاسلامؒ کے مقامات سلوک، روحانیت اور ولایت سے بحث کرتے آ رہے تھے کہ درمیان میں مثنوی کا ذکر آ گیا جو قاسم العلومؒ کے مقام معرفت ربانی کا ایک جز تھی۔ ہاں تو قاسم العلوم اپنے زمانے کے بہت بڑے اولیا میں سے تھے۔

درویشی و زُہد:

یوں تو طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ میں درویشی، زُہد اور قناعت کے آثار نمودار تھے لیکن بیعت کے بعد تو نفس امارہ کو کچلنے اور خواہشات نفس کو پامال کرنے میں آپ نے بڑی ریاضت اور مجاہدہ کیا ہے۔ اب ہم آپ کو طالب علمی کے متصل بعد کی زندگی کا نقشہ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے الفاظ میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جب آپ فقر اور مجاہدے کا غلبہ تھا۔ یہ دور ۱۲۶۷ھ ذی الحجہ کے بعد کا دور ہے۔ جب حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔

طالب علمی کے بعد فقر و درویشی کا دور اور بخاری کے چھ سیپاروں کی حاشیہ آرائی:

عارف باللہ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

”بعد انتقال مولانا والد مرحوم (مملوک علی صاحبؒ) کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو پیلوں کے کوچے میں تھا جا رہا۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب بھی میرے پاس آ رہے۔ کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے۔ روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے۔ میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا۔ اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو مگر بدقت کبھی اس کے اصرار

پر لے لیتے تھے ورنہ وہی رکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑ رہتے تھے۔ ایک سال کے قریب (بعد انتقال والد مرحوم) احقر دہلی رہا۔ پھر اجمیر کی نوکری (۱۲۶۹ھ) کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب سے جدائی پیش آئی۔ مولوی صاحب چند روز اسی (چیلوں کے) مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ میں جا رہے پھر دار البقا میں چند روز رہے اس زمانے میں جناب مولوی صاحب مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے، مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ کے سپرد کیا۔ مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا۔ اس پر مولوی احمد علی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاجب کا تحشیہ ان کو دکھایا جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے۔ علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں۔ اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کیسا حاشیہ لکھا ہے۔ اور اس حاشئے میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔

اس وقت کی اکثر حکایات سنی سنائی عرض کرتا ہوں کیونکہ پانچ برس تک پھر ملاقات مولوی صاحب سے نہیں ہوئی۔ جب احقر اجمیر گیا۔ مولوی صاحب اسی مکان (چیلوں کے کوچے) میں رہتے تھے اور بعض ایک دو آدمی اور تھے۔ پھر اتفاق سے سب متفرق ہو گئے۔ اور مولوی صاحب تنہا رہ گئے۔ مکان مقفل رہتا تھا۔ رات کو مولوی صاحب کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر ہو جاتے تھے اور پھر کواڑ درست کر دیتے تھے۔ چند ماہ اسی ہو کے مکان میں گذر گئے جس زمانے میں مولوی صاحب میرے پاس رہتے تھے۔ مولوی صاحب کی صورت پر

جذب کی حالت برستی تھی۔ بال سر کے بڑھ گئے تھے نہ دھونا نہ کنگھی نہ تیل نہ کترے نہ درست کئے۔ عجب صورت تھی۔ مولوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہیبت عنایت کی تھی ان کے سامنے بولنے کا ہر کسی کو حوصلہ نہ تھا۔ باوجودیکہ نہایت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے اس لئے میں تو کچھ کہہ نہ سکا ایک اور دوست سے کہلایا تب بمشکل بال کتروا کر درست کئے اور دھلوائے۔ جوئیں بہت ہوگئی تھیں ان سے نجات ہوئی۔ مزاج تنہائی پسند تھا اس لئے کچھ عرض نہ ہوسکتا تھا۔ مولوی صاحب کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی (کہ) اکثر ساکت رہتے اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا اور باوجود خوش مزاج اور ظرفت کے ترش رو اور مغموم جیسی صورت رہتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا نہ کسی کو اطلاع ہوتی تھی نہ آپ کہتے یہاں تک کہ بیمار بھی اگر ہوتے تب بھی شدت کے وقت کبھی کسی نے جان لیا تو جان لیا ورنہ خبر بھی نہ ہوئی اور دوا کرنا تو کہاں۔" (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۷۔۹۔۱۰)

حضرت عارف باللہ نے ترتیب واقعات کے تکلف کو برطرف رکھ کر ۱۲۶۷ھ سے ۱۲۶۸ھ تک کے چشم دید واقعات اور بعد ازاں پانچ سال کے حالات سن کر یکجا جمع کر دئے ہیں۔ ہمیں صرف خط کشیدہ عبارتوں سے بحث ہے۔ جس میں تنہا مکان میں رہنا جس میں ہو کا سا عالم تھا۔ جذب کی سی کیفیت طاری رہنا، بالوں کی قطع و برید اور صورت آرائی سے کوئی واسطہ نہ ہونا، صورت آرائی کیا حالت جذب کے سبب جسمانی بے پروائی کا ہونا اور جوئیں تک پڑ جانا، چارپائی کے ٹوٹے جھلنگے میں درویش صفت پڑے رہنا، سوکھے ٹکڑوں پر گذارہ کرنا، یہ سب نفس امارہ کو توڑ پھوڑ دینے کی باتیں تھیں۔ اسی عرصے میں سلوک کی منزلوں، تنہائی میں ذکرو ادوار، ذکراره اور کن کن مجاہدات سے گذرنے کا موقع ملا ہے۔ اسی کو فقر و زہد کہتے ہیں۔ وہ تنہائیوں سے نہ ڈرتے تھے۔ ہو کے عالم میں تنہا رہتے اور تاریک راستوں سے راتوں کو گذر جاتے۔ نانوتے کے جدی مکان میں دور تک لمبا دروازہ تھا اور اس میں سے رات کو بغیر خوف گذرتے کہ اور کوئی گذرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ درآنحالیکہ بقول عارف باللہ وہاں کچھ آسیب کا اثر تھا۔

قاسم فقیر ہو گیا فقیر ہو گیا، مفتی صدر الدین پکار اٹھے:

آپ کی درویشی کے چرچے نانوتے سے دہلی پہنچے۔ گذر چکا ہے کہ جب ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء فرو ہوا اور حضرت گنگوہیؒ دہلی تشریف لے گئے تو مفتی صدر الدینؒ صاحب آزردہ سے ملے۔ انہوں نے حضرت قاسم العلومؒ کے متعلق دریافت کیا کہ کیا کرتے ہیں جواب دیا کہ مطبع میں تصحیح کتب پر دس روپیہ کی نوکری کر لی ہے تو مفتی صاحب نے جو قاسم العلوم کے استاد بھی تھے فرمایا کہ "قاسم فقیر ہو گیا، قاسم فقیر ہو گیا۔" "اتنا سستا اتنا سستا۔" چنانچہ باوجود اس کے کہ آپ سینکڑوں روپیہ کی ملازمت کر سکتے تھے اور لوگوں نے بلایا بھی لیکن فقر اختیاری کو اختیار فرمایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ تھا۔

قناعت:

فقر و سلوک کی منزل میں قناعت بھی ایک خاص سنگ میل ہے۔ قناعت کے بغیر درویشی نامکمل ہے۔ حضرت قاسم العلومؒ کی قناعت درجہ کمال پر تھی امیر شاہ خان مرحوم کی روایت ہے کہ مولوی امیر الدین صاحب نے جو حضرت قاسم العلومؒ سے غایت درجہ بے تکلف تھے اور جو ان کے دور کے امام جامع مسجد دہلی کے چچا تھا وہ کہتے ہیں کہ:

> "ایک مرتبہ بھوپال سے مولانا کی طلبی آئی اور پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ میں نے کہا اے قاسم تو چلا کیوں نہیں جاتا تو فرمایا کہ مجھے صاحب کمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ پانچ سو روپیہ دیتے ہیں مگر میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا۔ پھر کس بنا پر جاؤں میں نے بہت اصرار کیا مگر نہیں مانا۔"

(امیر الروایات از ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۶۔۲۳۷)

اس صورت حال پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ حاشیہ میں لکھتے ہیں:

> "میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا پھر کس بنا پر جاؤں۔ اوّل پہلا جملہ کمال معرفت کی اور دوسرا جملہ کمال تقویٰ کی کہ جب بنائے خدمت متحقق نہ ہو تو خدمت کو قبول نہ کیا جائے۔ صریح دلیل ہے۔ سبحان اللہ یہ ہے علم و عمل۔" (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۷)

حضرت تھانویؒ کا خیال اپنی جگہ بجا مگر مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ قناعت کے جس مقام پر تھے وہاں پانچ سو روپیہ ان کی نظروں میں ایک حقیر سرمایہ تھا۔ اگر آپ میں طمع کا ذرہ بھی ہوتا تو پانچ سو روپیہ کا نام ہی سن کر بھوپال کو روانہ ہو جاتے مگر

ذالک متاع الحیوۃ الدنیا

کے پیش نظر آپ نے اس تنخواہ کو بنظرِ حقارت ٹھکرا دیا۔

بے سرو سامانی میں سنت نبوی:

عالم ہو یا درویش ان کے گھروں میں کچھ نہ کچھ سامان ہوتا ہے۔ بالخصوص اس دور میں تو بقول علامہ اقبالؒ مرحوم یہ حال ہے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

لیکن حضرت قاسم العلومؒ ہر قسم کے سامان سے بے نیاز تھے۔ آپ کی وہی حالت تھی جیسی رسول اللہ ﷺ کی کہ آپ کے مشکوئے معلیٰ میں کچھ نہ ہوتا تھا اور اگر ہوتا تو عصر کی نماز سے پہلے پہلے غربا کو تقسیم فرما دیتے۔ بہر حال مولانا محمد طیب صاحب اپنے والد بزرگوار حضرت قاسم العلوم کے صاحبزادے مولانا محمد احمد صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ:

> ''مولانا محمود حسن صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے یہ سارے بزرگ آفتاب و ماہتاب تھے۔ ایک سے ایک اعلیٰ و افضل تھا۔ لیکن بہر حال جس کی قیام گاہ پر جا کر دیکھا ضروریات زندگی میں سے کچھ نہ کچھ سامان پایا۔ حضرت گنگوہی کے حجرے میں بہر حال سامان مباح میں سے ضروریات تھیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس اللہ سرہ کے حجرے میں بہر حال کچھ نہ کچھ اشیا نظر پڑتی تھیں لیکن اس منقطع عن الخلق اور زاہد فی الدنیا حضرت (قاسم العلوم) کے حجرے میں کچھ بھی تو نظر نہ آتا تھا۔ چٹائی بھی اگر ایک تھی تو وہ ٹوٹی ہوئی گویا عمر بھر کیلئے ایک اسی چٹائی کو منتخب فرما لیا تھا نہ کوئی صندوق تھا نہ کبھی کپڑوں کی گٹھڑی بندھتی تھی۔ سفر میں جب یہ حضرات جاتے تھے تو مثلاً حضرت گنگوہیؒ کے خادم خاص عبداللہ شاہ صندوق لئے کپڑے لگاتے۔ سامان سفر مہیا ہوتا،

اہتمام ہوتا لیکن یہاں کوئی اہتمام نہ تھا اگر کبھی ایک آدھ کپڑا ہوا تو کسی کے پاس رکھوا دیا ورنہ عموماً اسی ایک ، جوڑے میں سفر پورا ہوتا جو حضر میں پہنے ہو گئے تھے۔ البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے تو لنگی باندھ کر کپڑے اتار لئے اور خود ہی دھو لئے اور وہ لباس بھی کیا تھا جو اتنی قلت کے ساتھ رہتا تھا۔

لباس:

بغیر کرتے کے بندوں دارا چکن (یا انگرکھا) اور پاجامہ۔ سردی ہوتی تو مختصر سا معمولی عمامہ ورنہ عموماً ایک کنٹوپ تمام سردی سر پر رہتا تھا۔ مدۃ العمر کسی کپڑے میں جیٹ کبھی نہیں لگائے اور فرماتے تھے کہ یہ نصرانی کی علامت ہے۔ بلکہ ہر جگہ بند استعمال فرماتے تھے۔" (ارواح ثلاثہ روایات الطیب صفحہ ۲۶۲۔۲۶۳)

بے سروسامانی کی کہانی خود اپنی زبانی:

اپنی بے سروسامانی کا حال حضرت قاسم العلوم اپنی مصنفہ کتاب آبِ حیات میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

"نہ گھر میں کوئی کتاب جو یہ بات ہو کہ جب جی چاہا اٹھایا دیکھ لیا نہ روپے پیسے کا ایسا حساب کہ حسب دلخواہ ضروریات تحصیل میں صرف کیا۔" (آب حیات صفحہ ۵)

ایک صاحب نے قاسم العلومؒ سے آپ کی کتابوں کے متعلق دریافت کیا ہے۔ جواب میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا اور بے سروسامانی کی وجہ سے آب حیات کے نہ چھپنے کا جو ذکر فرمایا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے:

تحذیر الناس آمد بدست آمد۔ انتباہ المومنین از دیوبند طلبیدہ ام۔ باقی ماند حیات النبی ﷺ ہنوز در حد تسوید است وآن ہم نزد منشی محمد حیات صاحب نوبت طبعش نرسید و نہ بہ ظاہر طبعش قریب الوقوع است۔ (فیوض قاسمی صفحہ ۳۷)

تحذیر الناس (مشہور کتاب) حاصل ہو گئی ہے انتباہ المومنین کو (رسالہ ہے) میں نے دیوبند سے طلب کیا ہے۔ رہی حیات النبی (مشہور کتاب آب حیات) تو وہ ابھی

مسودے کی حالت میں ہے اور وہ بھی منشی محمد حیات کے پاس ہے اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی اور نہ بظاہر اس کا چھپنا قریب الوقوع ہے۔"

فقر اختیاری نہ کہ اضطراری:

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ کا یہ فقر اختیاری تھا یا اضطراری۔ مگر ادنیٰ تامل سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کے فقر کی طرح جیسا کہ ارشاد فرمایا

الفقر فخری

ترجمہ: فقر میرے لئے فخر ہے۔

قاسم العلومؒ کا فقر بھی اختیاری تھا۔ کیونکہ اضطراری فقر مجبوری کا فقر ہوتا ہے۔ جس میں بے بسی سر پیٹ لیتی ہے اور جس کے متعلق فرمایا گیا ہے

یکاد الفقر ان یکون کفرا

ترجمہ: قریب ہے کہ فقر انسان کو کفر تک پہنچا دے۔

فقر اختیاری کی وضاحت کے لئے سنئے کہ قاسم العلوم نے بڑی بڑی تنخواہوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ ریاست ٹونک کا ایک عہدے دار آپ کو بڑی تنخواہ پر بلاتا ہے اور یہ وہ وقت تھا جب ریاست میں اہل علم کی بیحد قدر تھی۔ چنانچہ حکیم عبد الصمد صاحب کو جن کا عہدے دار صاحب سے تعلق تھا لکھتے ہیں:

"غرض ٹونک تک اپنی رسائی کی توقع نہیں آپ بھی اس خیال کو جانے دیجئے۔"

(فیوض قاسمیہ صفحہ ۴۸)

اور یہ تو ابھی گذشتہ صفحے میں گذرا ہے کہ آپ کو علیگڑھ سے پانچ سو روپیہ کی ملازمت آئی لیکن آپ نے اس کو بھی ٹھکرا دیا۔

دولت سے استغنا اور بے پروائی:

درحقیقت ان تمام سوانح زندگی میں قاسم الخیرات کی زندگی کے یہی تو وہ اوصاف ہیں جن کو ہم صحیح معنی میں سیرت کہہ سکتے ہیں۔ تمام علوم کو حاصل کر کے اور تمام سلوک کی منزلوں

کو طے کر کے جب انسان میں انسانیت، بے نفسی، عاجزی، اخلاق توکل، قناعت پیدا ہو جائے۔ تو وہی مقصود ہے۔ ہم حضرت قاسم العلومؒ کے اختیاری فقر سے بحث کر رہے تھے۔ تو اس سلسلے میں اور سنئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سابق مہتمم دار العلوم دیو بند حافظ انوار الحق سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ:

> ''حضرت نانوتویؒ چھتے کی مسجد میں حجرے کے سامنے چھپر میں حجامت بنوا رہے تھے کہ شیخ عبدالکریم رئیس لال کرتی میرٹھ حضرت مولانا سے ملنے کیلئے دیو بند آئے مولانا نے ان کو دور سے آتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ قریب آئے تو ایک تغافل کے ساتھ رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ گویا کہ دیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ آکر ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے ان کے ہاتھ میں رومال میں بندھے ہوئے بہت سے روپے تھے۔ جب انہیں کھڑے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تو حضرت مولانا نے ان کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ آہا شیخ صاحب ہیں، مزاج اچھا ہے انہوں نے سلام عرض کیا اور قدم چوم لئے اور وہ روپے بندھے ہوئے قدموں پر ڈال دیئے۔ حضرت نے انہیں قدموں سے الگ کر دیا۔ تب انہوں نے ہاتھ باندھ کر نسبت قبول فرمالینے کی درخواست کی۔ بالآخر بہت سے انکار کے بعد انہوں نے تمام روپیہ حضرت کی جوتیوں میں ڈال دیا۔ حضرت جب اٹھے تو نہایت استغنا کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا۔ حضرت نے جوتے پہن لئے اور حافظ انوار الحق سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ جی! ہم دنیا کماتے ہیں اور اہل دنیا بھی دنیا کماتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے اور دنیادار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انہیں ٹھکراتی ہے اور یہ فرما کر وہیں تقسیم کر دیا۔'' (ارواح ثلاثہ حصہ روایات الطیب صفحہ ۲۸۱۔۲۸۲)

نواب رامپور کلب علی خان سے ملنے سے احتراز:

شاید آپ کو حیرانی ہوگی کہ قاسم العلومؒ کا یہ رویہ آپ کے شایان شان نہ تھا۔ مگر آپ کو یہ شبہ ہونا نہ چاہئے۔ دراصل وہ رئیسوں، شہزادوں اور نوابوں کی انانیت دور کرنے کیلئے ایسا کرتے تھے۔ اسی طرح کا واقعہ اور بھی پیش نظر رکھئے کہ قاسم العلوم کو ریاست رام پور نزد مراد

آباد کسی بزرگ سے ملنے کے لئے جانے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب نے اپنے وزیرِ اعظم کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا۔ منشی حمید الدین صاحب نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سے یہ روایت بیان کرتے ہوئے جو طویل ہے اور ہم اس کا ابتدائی حصہ چھوڑتے ہیں۔ بیان کیا کہ مولانا نے (وزیر صاحب سے) ارشاد فرمایا کہ:

> ’’نواب صاحب ہی تو میری ملاقات کے مشتاق ہیں۔ میں تو ان کی زیارت کا مشتاق نہیں ہوں اگر ان کو اشتیاق ہے تو مجھ سے ملنے آئیں.......... بہرحال نہ جانا تھا نہ گئے۔ اور امراء کے مقابلے میں حضرت کا یہی طرزِ عمل رہا ہے۔ نواب محمود علی خان صاحب رئیس چھتاری ساری عمر اسی تمنا میں رہے کہ کسی طرح مل لوں۔ مگر حضرت نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔‘‘ (ارواح صفحہ ۲۸۱)

غریبوں سے محبت اور انکساری کا کمال:

دوسری جانب آپ کی انکساری کا یہ عالم کہ غربا، عوام، شاگردوں اور برابر کے دوستوں سے اس طرح ملتے تھے جس طرح ایک معمولی شخص ہوتا ہے۔ یا تو رئیس لال کرتی میرٹھ کے روپیہ کی نظروں میں اس قدر بے قدری اور یا ذرا یہ بھی سنئے کہ قاسم العلومؒ کے شاگرد مولانا احمد حسنؒ صاحب امروہی نے فرمایا کہ:

> ’’مولانا محمد قاسم صاحب کی ایک جولاہے نے دعوت کی۔ اتفاق سے اس روز بارش ہوگئی اور وہ جولاہہ وقت پر بلانے نہ آیا تو مولانا محمد قاسم صاحب خود اس جولاہے کے یہاں تشریف لے گئے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت چونکہ آج بارش ہوگئی تھی اس لئے میں دعوت کا انتظام نہ کرسکا۔ مولانا نے فرمایا کہ انتظام کیا ہوتا ہے تمہارے یہاں کچھ پکا بھی ہے اس نے کہا جی ہاں وہ تو موجود ہے۔ فرمایا کہ بس وہ ہی کھالیں گے۔ چنانچہ جو کچھ معمولی کھانا ساگ وغیرہ اس کے یہاں تیار تھا وہ بخوشی مولانا تناول فرما کر تشریف لے آئے اور فرمایا کہ بس جی تمہاری دعوت ہوگئی۔‘‘

(ارواح ثلاثہ حصہ اشرف التنبیہ صفحہ ۲۹۰۔۲۹۱)

الحاصل:

غرض یہ ہے کہ حضرت قاسم العلوم میں درویشی کی شان جو منزل سلوک کی خاص منزل ہے۔ درجہ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور ان کا فقر وہی اختیاری فقر تھا جو رسول اللہ ﷺ کا فقر اختیاری تھا۔ جو عین سنت تھا اور یہی عین تصوف ہے۔

تقویٰ:

منزل سلوک یعنی طریقت بلکہ شریعت دونوں کا نقطہ عروج تقویٰ ہے۔ صحابہ صدیقین، ابرار، صالحین سب اسی راہ سے گذرتے ہیں یہی منشائے قدرت اور یہی انسانیت کی اعلیٰ معراج ہے۔ قرآن کریم کی اعلیٰ معراج ہے۔ قرآن کریم ہر نیکی کی بنیاد تقویٰ کو قرار دیتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام کی روح ہی تقویٰ ہے۔ اللہ جل شانہ نے قرآن کریم میں تمام انسانی معاملات اور عبادات میں تقویٰ اختیار کرنے کی سخت تاکید کی ہے۔ تقویٰ کا دوسرا نام خوف خدا ہے اور خوف خدا سے احکام کی تعمیل کی توفیق پیدا ہوتی ہے۔ اور بندوں پر ظلم و ستم کرنے سے انسان بچ جاتا ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی میزان کو درست رکھنے کی اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے غرضیکہ تقویٰ کے مرکز پر ہی تمام شریعت و طریقت گردش کر رہی ہے۔ اگر منزل سلوک میں یہ مقام کسی عابد و سالک کو حاصل نہ ہو تو پھر تمام عبادات اور سلوک بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو صحابہ نے گذرے ہوئے زمانہ میں پی ہوئی شرابوں کے متعلق سوال کیا کہ ان کا کیا انجام ہوگا تو یہ آیت نازل ہوئی:

لیس علی الذین امنوا وعملوا الصلحت جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا وامنوا وعملوا الصلحت ثم اتقو و آمنوا ثم اتقو واحسنوا واللہ یحب المحسنین.

(سورہ مائدہ رکوع ۱۲ پارہ ۷)

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ان پر کوئی مضائقہ نہیں اس میں

> کہ جو کچھ وہ پہلے کھا چکے جبکہ آئندہ کو تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے اور اچھے عمل کیے۔ پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے پھر تقویٰ اختیار کیا اور نیکی کی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شراب کے حکم نازل ہونے کے بعد عام حالات میں جو صحابہ تقویٰ اور ایمان کے خصائل سے متصف ہو کر ان خصائل میں برابر ترقی کرتے رہے ہوں حتی کہ مدارج تقویٰ و ایمان میں ترقی کرتے کرتے مرتبہ احسان تک جا پہنچے ہوں تو ایک مومن کے لئے روحانی ترقیات کا انتہائی مقام ہو سکتا ہے۔ تو پھر پہلی کوتاہیوں پر قلم عفو کھینچ دیا جاتا ہے۔

یہی کچھ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تقوے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> ”تقویٰ یعنی مضار دینی سے بچنے کیلئے کئی درجے ہیں اور ایمان و یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت و ضعف متفاوت ہیں۔ تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی فکر و فکر، عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت و جلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان و یقین مضبوط و مستحکم ہوتا رہتا ہے مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی و عروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام احسان اور اس کے ثمرے پر بھی تنبیہ فرمادی۔“

دیکھئے مذکورہ آیت میں کس طرح بار بار تقوے کو دہرایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ماہ رمضان کے روزوں کو فرض کرتے ہوئے اس کی غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے۔ گویا رب العزت بندوں پر روزہ جیسی مشقت کی عبادت فرض کر کے ان کو صفت تقویٰ سے متصف دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

تقوے کی لغوی تحقیق:

قرآن کریم میں تقویٰ مختلف مقامات پر مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ چند آیات میں اس کے معانی پر غور کیجئے:

۱۔ لن ینال اللہ لحومها ولا دماء ها ولکن یناله التقوىٰ منکم

ترجمہ: اللہ کو قربانیوں کے گوشت اور ان کا خون نہیں پہنچتا لیکن اس کو تو تمہارا اخلوص پہنچتا ہے۔

دیکھئے یہاں تقوے کے صاف طور پر معنی خلوص اور اخلاص کے واضح ہوتے ہیں یعنی وہ حسن نیت جس کے ماتحت مال طیب اور محبت سے کی گئی قربانی اور پیش کش مراد ہے۔

۲. وایای فاتقون

ترجمہ: اور مجھ ہی سے ڈرو۔

یہاں تقوے سے مراد ماسوی اللہ سے بے خوفی ہے۔ یعنی جب اللہ اور بندوں کی مرضیاں آپس میں ٹکرا جائیں تو بندوں کا خوف دل سے نکال کر صرف اللہ سے ڈرنا چاہئے اور اسی کی مرضی پر چلنا چاہئے۔

۳. وان تصبرو وتتقوا لایضرکم کیدھم شیئا

ترجمہ: اور اگر (اے مسلمانو!) تم صبر کرو اور محتاط رہو تو ان کی کوئی تدبیر تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔

یہاں تقوے کے معنی چوکنے، خبردار اور محتاط رہنے کے ہیں۔ یعنی اگر مسلمان کفار کے مقابلے پر جہاد کرنے میں صابر رہیں اور ان کی چالوں سے محتاط رہیں تو کفار کی تدابیر مسلمانوں کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں گی:

۴. یا ایھا الناس اتقوا ربکم

ترجمہ: اے لوگو اپنے رب سے ڈرو۔

اس آیت میں تقویٰ مومن اور کافر سب کیلئے خدا سے ڈرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۵. واتقوا یوما ترجعون فیه الی اللہ

ترجمہ: اس دن سے ڈرو جس میں اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

یہاں اتقا کی نسبت قیامت کے ہولناک دن کی طرف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کسی خطرناک چیز یا ہولناک دن سے ڈرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

٦. ذلک الکتب لاریب فیه ھدی للمتقین

ترجمہ: یہ کتاب (قرآن) اس میں کچھ شک نہیں پرہیز گاروں کیلئے ہدایت ہے۔

اس آیت میں متقین کے ضمن میں تقوے کی تفصیل حسب ذیل چیزوں میں مشہور نظر آتی ہے یعنی متقین کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ

ا. یؤمنون بالغیب

ترجمہ: غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

۲. و یقیمون الصلوٰۃ

ترجمہ: اور نماز قائم کرتے ہیں۔

۳. ومما رزقنهم ینفقون

ترجمہ: اور اس میں سے جو ہم نے ان کو رزق دیا خرچ کرتے ہیں۔

۴. والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک

ترجمہ: اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر (قرآن) نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا (یعنی توریت وانجیل وزبور)

۵. و بالاخرۃ هم یوقنون

ترجمہ: اور جو آخرت کا یقین کرتے ہیں۔

کے ساتھ متصف ہوں اور مذکورہ بالا تمام چیزوں کا اعتقاد اور ان پر عمل تقوے کی شان پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ غرضکہ تقویٰ مختلف معانی اور نظریات کا حامل ہے۔

شریعت میں تقوے کی حقیقت:

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

اعدوا هو اقرب للتقوىٰ

کی تفسیر میں تقوے کے متعلق اپنی مشہور شہرہ آفاق تفسیر میں لکھتے ہیں:

”جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجے میں مضر ہوں ان سے بچاؤ کرتے رہنے سے جو ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کا نام تقویٰ ہے۔“

ہمارے نزدیک تقوے کی حقیقت:

جس طرح سے خلق ایک ایسا ملکہ ہے کہ اس کی وجہ سے بلا ارادہ صاحب اخلاق انسان سے اچھی عادتوں کا ظہور خود بخود ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک ایک ایسا ملکہ راسخہ کہ اس کے باعث متقی آدمی سے ہر عمل میں بلا تکلف اچھائی کا ظہور ہونے اور ہر بری بات سے بچنے کی بلا تکلف قوت پیدا ہو جائے اسی کا نام تقویٰ ہے۔ گویا تقویٰ ایک پختہ کردار لطیف سیرت اور اعلیٰ درجے کا معیاری کیرکٹر ہے۔ جو روح کو صحت مند اور پاکیزہ بنا دیتا ہے اور جسمانیت پر جو ہوا اور ہوس کی طرف کھینچ کر لے آتی ہے۔ غالب آ کر روحانیت کو اعلیٰ طاقت بخشتا ہے۔

کسی صحابی سے تقوے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا گذر کبھی ایسے راستے سے ہوا ہے۔ جہاں خاردار جھاڑیاں ہوں۔ تم وہاں سے کیسے گذرتے ہو۔ سائل نے کہا کہ دامن بچا کر گذرتے ہیں مبادا الجھ جائیں۔ فرمایا تقوے بھی یہی ہے کہ گناہوں کے راستے سے انسان اپنے آپ کو بچا کر چلے۔

قاسمی تقویٰ:

حضرت قاسم العلوم کا مقام تقویٰ بھی اتنا بلند تھا کہ بلا تکلف برائیوں سے بچنے اور اچھائیوں کے ظہور میں آنے کا ملکہ آپ کو حاصل ہو گیا تھا۔ ہم اس سلسلے میں آپ کے سامنے ان کے تقوے کی چند مثالیں پیش کریں گے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ کے حقوق میں تقویٰ کر لینا بھی ہمارے نزدیک اتنا مشکل نہیں جتنا بندوں کے حقوق میں تقویٰ اختیار کرنا، شراب، جھوٹ، چوری سے انسان آسانی سے بچ سکتا ہے لیکن کسی کا ناجائز حاصل کیا ہوا مال واپس کرنا بہت دشوار ہے۔ قاسم العلوم جب تعلیم سے فارغ ہو کر گھر واپس آئے تو آپ نے اپنی جدی جائیداد میں بہت کچھ حقداروں کے حقوق میں گڑبڑ پائی۔

مولانا گیلانی نے اس مقام پر استاذ محترم حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب کی بعض یادداشتیں پیش کی ہیں جو اپنے دادا قاسم العلوم کے متعلق انہوں نے اپنے والد محترم محمد احمد صاحبؒ سے سنی تھیں۔ جو حسب ذیل ہیں:

"حضرت (نانوتوی) جب تحصیل علم سے فارغ ہو کر گھر پر آئے تو املاک کا جائزہ لیا اور تمام املاک کو مشتبہ اور بعض کو مغصوبہ پایا۔ والد کو بہت سمجھایا کہ یہ کمائی ناجائز اور مشتبہ ہے۔" (سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۴۹۶)

دوسری عبارت یہ ہے:

"ان زمینوں کے غلے کے استعمال میں احتیاط شروع فرمائی اور والد کو بار بار ادب کے ساتھ سمجھاتے رہے۔" (سوانح گیلانی صفحہ ۴۹۶)

"فصلوں پر غلہ اہل حق کو تقسیم کیا جاتا رہا۔ بہت کم مقدار تھی جو حقوق سے بچ کر گھر میں پہنچتی تھی۔ چنانچہ گھر پر عسرت و تنگی رہتی تھی۔" (سوانح گیلانی صفحہ ۴۹۶)

علم پر عمل:

بہرحال جو علم دین دہلی سے پڑھ کر آئے تھے اس کو عمل کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ اور اپنے دست مبارک سے پرانے حصے جو رشتہ داروں کے گڑبڑ ہو گئے تھے۔ ان کے فرائض اور حصے نکالے۔ مولانا گیلانی نے مولانا محمد طیب صاحب کا ایک اور قول بھی یہاں نقل کیا ہے جو یہ ہے:

"دنیا فرائض نکلواتی تھی حصہ لینے کیلئے لیکن یہاں دوسروں کو حصہ دینے کے لئے فرائض نکلوائی جاتی ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا جو لوگوں کے سامنے آیا تھا۔"

(سوانح از گیلانی صفحہ ۴۹۶)

بہرحال آپ کی اس منصفانہ طرز اور متقیانہ عمل سے رشتہ دار، محلے اور شہر والے دنگ رہ گئے۔ اصلاح کے اس شاہ کار نے اشارہ کئے کہ یہ ہستی اپنے زمانے کی بہت بڑی مصلح اور متقی ہستی ہو گی۔

قاسمی تقوے کی دوسری مثال:

امیر شاہ خان صاحب مرحوم سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ:

> ’’حضرت مولانا نانوتوی کو حرام کے طعام سے جیسے نفرت تھی ویسے ہی اس کا احساس بھی بہت جلد کرتے تھے۔ مگر دعوت بوجہ دلداری ہر ایک کی منظور فرما لیتے تھے اور پھر آ کرتے کرتے تھے۔‘‘ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۰)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حرام کھانے کا جب احساس ہو جاتا تھا تو پھر آپ کیوں تناول فرماتے تھے۔ دراصل یہ وہ کھانا ہوتا تھا جس میں اشتباہ ہوتا تھا کہ اس میں شائد ناجائز کسب بھی موجود ہے۔ اور فتوے کے مطابق ایسا کھانا کھا لینے کی اجازت ہے۔ جس میں حلال مال ہو اور ناجائز کا شبہ ہو۔ اس لئے آپ نے شرع پر عمل کر کے دعوت کرنے والے اور کھلانے والے کی دل شکنی مناسب نہ سمجھی۔ گویا دل شکنی کرنا بھی تقوے کے خلاف ہے۔ لیکن چونکہ اس کھانے میں مال حرام کا شبہ محسوس فرماتے تھے اس لئے آ کرتے فرما دیتے تھے۔ جس سے فتوے اور تقوے دونوں پر عمل ہو جاتا تھا۔

قاسمی تقوے کی تیسری مثال:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے حضرت قاسم العلومؒ کے تقوے سے متعلق ایک دفعہ فرمایا:

> ’’مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کی جائداد خریدنا جائز نہیں، کیونکہ وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا تھا۔ البتہ جہاں ایسا نہ ہو کچھ حرج نہیں۔‘‘

(حسن العزیز جلد اول صفحہ ۱۴۴ بحوالہ قصص الاکابر)

اللہ اکبر تقوے کی یہ بلندی قابل غور ہے کہ ایسی جائداد کے متعلق بھی عدم جواز کا صاف فتویٰ دے دیا جو تقویٰ تو درکنار فتوے کے بھی خلاف ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی کا ہے جو بہت بڑے متقی تھے۔ وہ دہلی کی کسی دکان سے آم کی چٹنی نہیں کھاتے تھے کہ اس نواح میں آموں کے باغ اس وقت بیچ دیئے جاتے تھے۔ جب ان پر آم نہیں آتے تھے اور ایسی بیع کو فقہا نے ناجائز قرار دیا ہے۔

قاسمی تقوے کی چوتھی مثال:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ”مولانا محمد یعقوب صاحب کو سبزی کا شوق تھا۔ کچھ پودینہ دھنیہ وغیرہ کے درخت لگے ہوئے تھے ان میں مینگنی ڈالنے کی ضرورت ہوئی۔ کسی زمیندار کا وہاں کو گذر ہوا۔ مولانا نے ان سے فرمائش کردی۔ انہوں نے رعایا میں سے ایک گڈرئے کے سر پر ٹوکری میں مینگنیاں بھیج دیں۔ مولانا اپنے ہاتھ سے اسے سبزی میں ڈال رہے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سامنے سے آگئے۔ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اس شخص کا حال معلوم نہیں کہ ظالم ہے اس نے ضرور زبردستی ظلماً اس بے چارے غریب شخص سے بیگار لی ہے اس کو ابھی واپس کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے اسی وقت وہ مینگنیاں اپنے ہاتھ سے جمع کر کر سب واپس کردیں۔“

(قصص الاکابر الہادی ماہ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ صفحہ ۲۹ حسن العزیز جلد دوم صفحہ ۱۰۳، ۳۲۳)

اس واقعے کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ قاسمی تقوے اور ولایت نے یعقوبی ولایت اور تقوے کو سہارا دے کر تھام لیا۔

اس لئے عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے کسی شخص کے سوال کے جواب میں کہ اس نے دریافت کیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کو علم میں یہ کمال کیسے حاصل ہوا فرمایا کہ:

> ”اس کے اسباب متعدد ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ مولانا فطری طور پر معتدل القوی اور معتدل المزاج تھے۔ پھر ان کے استاد بے مثل تھے۔ پھر پیر کامل تھے۔ جن کا نظیر نہیں ان کی وجہ سے فن کی حقیقت منکشف ہوگئی۔ اساتذہ کا ادب بہت کرتے تھے اور متقی بہت تھے۔“

عارف باللہ کا یہ جملہ کہ متقی بہت تھے اس سے زیادہ عینی شہادت تقوے کے متعلق اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک متقی دوسرے متقی کے تقوے کی اس شان سے تصدیق کر رہا ہے۔

تقوے کی پانچویں مثال:

جب دار العلوم دیوبند میں درس تجوید و قرأت کی کلاس کے ساتھ نیچے تہہ خانہ بنا تو مولانا رفیع الدین صاحب نے آپ سے گرمیوں کے دنوں میں دوپہر وہاں گذارنے کیلئے کہا آپ نے فرمایا کہ اس میں آرام کرنے کا حق طلبہ کو ہے ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔

ثمرہ تقویٰ:

قاسم العلومؒ کی کامیاب زندگی کا تجزیہ ہے کہ پہلے:

۱۔ آپ نے علمائے جلیل القدر سے علوم معقولہ و منقولہ حاصل فرمائے۔

۲۔ ظاہری علوم کی تحصیل سے فراغت کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی اور تقوے کا اونچا مقام حاصل کیا۔ گویا ظاہر اور باطن دونوں کو پاک اور صاف کر کے تقوے سے سینے اور دل کو روشن کیا اور متقین میں جا ملے۔ دنیا اور دنیا کے ہیچ متاع اور حصول دولت سے کنارہ کیا۔ انہوں نے اپنا صحیح مقام متعین کر لیا اور یہ وہی مقام اور راستہ تھا جو ان کو بحیثیت نائب رسول، رسول اللہ ﷺ سے وراثت میں ملا کہ

العلماء ورثة الانبياء

بہرحال آپ متقین کے زمرے میں شامل ہوئے اور ان کیلئے قرآن کریم نے تقوے کا پھل عطا فرما دیا اور وہ یہ ہے:

۱. اولٓئک علی ھدی من ربھم و اولٓئک ھم المفلحون

ترجمہ: (متقین) وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

۲. ان اکرمکم عند اللہ اتقکم

ترجمہ: تم میں سے سب سے زیادہ معزز محترم اللہ کے نزدیک وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

۳. ان اللہ یحب المتقین

ترجمہ: اللہ تعالیٰ متقین سے پیار کرتا ہے۔

۴. من یتق اللہ یکفرّ عنه سیاته و یعظم له اجرا

ترجمہ: جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے گناہوں کو مٹاتا ہے۔ اور اس کے اجر کو زیادہ کرتا ہے۔

۵. الذین اتقوا ربهم لهم جنت تجری من تحتها الانهار خالدین فیها.

ترجمہ: وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرے ان کیلئے باغات ہیں کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔

۶. فمن اتقی و اصلح فلا خوف علیهم و لاهم یحزنون

ترجمہ: جو لوگ متقی اور نیک بنے ان کیلئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۷. الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیهم و لاهم یحزنون. الذین امنوا و کانوا یتقون. لهم البشریٰ فی الحیوة الدنیا و فی الاخرة لاتبدیل لکلمت اللہ ذلک هو الفوز العظیم.

ترجمہ: سن لو کے اولیا نہ ان کو کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ جو کہ ایمان لائے اور متقی تھے ان کیلئے دنیا کی زندگی اور آخرت میں خوشخبری ہے اور اللہ کے قول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی وہ بڑی ہی کامیابی ہے۔

ان آیات کی روشنی میں حضرت قاسم العلوم فلاح پانے والے، اللہ کے نزدیک زیادہ مکرم، خدا کے محبوب، جن کے گناہ تقوے کے باعث مٹا دیئے گئے۔ جن کو ایسی جنتوں میں داخلہ مل گیا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ایسی مامون فضا نصیب ہوئی کہ ان سے دنیا اور آخرت کا خوف اور غم دور کر دیا گیا اور ان کو بڑی کامیابی حاصل ہوگئی۔ بس قاسم العلوم کیلئے یہی کامیاب زندگی ہے اور ان معاصرین سے بہتر جنہوں نے سینکڑوں روپیہ ماہوار کی تنخواہیں لیں، ڈپٹی کلکٹر، صدر الصدور اور کیا کیا بنے۔ قاسم العلوم کے مقامات بلند کے سامنے اس دنیاوی شان و شوکت کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور قرآن کریم میں تو صاف کہہ دیا گیا:

زین للناس حب الشهوات من النساء و البنین و القناطیرا لمقنطرة من الذهب و الفضة و الخیل المسومة و الانعام و الحرث ذلک متاع الحیوة الدنیا قل أانبئک بخیر من ذلکم للذین اتقوا عند

ربھم جنت تجری من تحتھا الانھر وازواج مطھرة و رضوان من اللہ واللہ بصیر بالعباد۔

ترجمہ: لوگوں کیلئے عورتوں، بیٹوں، سونے چاندی کے انباروں اور نشان لگائے گئے عمدہ گھوڑوں اور چوپاؤں اور کھیتوں کی محبت مزین کردی گئی ہے لیکن یہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے۔ آپ کہہ دیجئے کیا میں ان چیزوں سے زیادہ بہتر چیزیں بتلاؤں، متقی لوگوں کیلئے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں کہ ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور پاکیزہ بیویاں ہیں اور اللہ کی رضا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

رضائے الٰہی:

دیکھئے قاسم العلوم نے تقویٰ اختیار کر کے اور متاع دنیا کو ٹھکرا کر جنتوں وغیرہ کے علاوہ خداوند تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کر لی جو دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے۔ کسی عربی شاعر نے خوب کہا ہے:

رضینا قسمة الجبار فینا لنا علم وللجھال مال
ہم اپنے درمیان مولیٰ کی اس تقسیم سے خوش ہیں کہ ہمیں علم ملا اور جاہلوں کو مال

صفاتِ ولی:

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ صوفیا کے مقامات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کیلئے حسب ذیل صفات کو ضرور قرار دیتے ہیں:

۱۔ کثرت سے استغفار کرتے ہیں۔
۲۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔
۳۔ عبادت وریاضت ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔
۴۔ انتہائی پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں۔
۵۔ قناعت ان کی دولت ہوتی ہے۔ ۶۔ صبر ان کا شیوہ ہوتا ہے۔
۷۔ تسلیم ان کی فطرت ہوتی ہے۔ ۸۔ توکل ان کا سہارا ہوتا ہے۔

۹۔ زُہد ان کی پہچان ہوتی ہے۔ ۱۰۔ رضا ان کا مقصدِ زندگی ہوتی ہے۔

اب آپ ہی غور کیجئے کہ ان دس صفات میں سے کونسی صفت ہے جو قاسم العلومؒ میں موجود نہ تھی۔ اگر آپ ان کے حالات کا محتاط اور وسیع مطالعہ کریں گے تو ان کی ذات میں یہ سب صفات ولایت وتصوف پائیں گے۔

روحانی برکات:

اب ان صفات کا مالک انسان جس نے ریاضت وعبادت سے نفس کو پاکیزہ، روح کو روشن اور دل کو تجلیات ربانی سے منور کرلیا ہو اس کو روحانی قوتوں کے باعث ایسے امور پر قدرت اور تصرف ہوجائے جو اولیا کو حاصل ہوتا ہے۔ اور جس کو تصوف کی اصطلاح میں کرامت کہا جاتا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دراصل معجزہ جو انبیا کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتا ہے اور کرامت جو اولیا کے وجود سے ظہور میں آتی ہے۔ اس کی پشت پر خدائی طاقت کام کرتی ہے اور معجزات اور کرامات کا اصل محرک درست قدرت ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح تیر کو پھینکنے والی بظاہر کمان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی پشت پر کمان دار کا ہاتھ ہوتا ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

تیر قضا ہر آئینہ و ترکش حق است
اما کشاد او ز کمانِ محمد است

جنگ احد میں جو مٹھی بھر کنکریاں پیغمبر خدا ﷺ نے کفار کے ماریں جن سے ان کی کمریں ٹوٹ گئیں ان کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

وما رميت اذ رميت ولكن الله رمى

ترجمہ: اور نہیں پھینکا آپ نے (کنکریوں کو) جبکہ آپ نے پھینکا مگر اللہ نے پھینکا۔

اور عیسیٰ علیہ السلام نے قوم سے فرمایا:

انی قد جئتكم باية منّ ربكم انی اخلق لكم من الطين كهيئة الطير فانفخ فيه فيكون طيراً باذن الله وابرئ الاكمه والابرص واحی الموتی باذن الله. (آل عمران رکوع ۵ پارہ ۳)

ترجمہ: میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں میں بناتا ہوں مٹی سے پرندوں کی شکل پس میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے پرندہ ہو جاتا ہے اور اندھے اور برص والے کو اچھا اور مردوں کو زندہ کردیتا ہوں اللہ کے حکم سے۔

دیکھئے عیسیٰ علیہ السلام نے مٹی کی شکل کے پرندوں کی روح پھونک کر واقعی پرندے بنا دیئے، اندھے اور مبروص انسانوں کو اچھا کر دینے اور مردوں کو زندہ کر دینے کے ساتھ باذن اللہ کا اضافہ کیا ہے۔ مبادا کسی کو غلط فہمی ہو جائے اس لئے ابرص والوں کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے میں بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ تھا۔ لیکن اس کے پس پردہ ان امور میں حکم ربانی کی کرنٹ تھی جو سرسرا رہی تھی۔

روحانیت میں قدرت ربانی کی کارفرمائی کا محرک:

اس مقام پر ایک حدیث قدسی کا درج کرنا نہایت موزوں ہوگا۔ جو یہ ہے:

لایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبه فاذا احببته کنت له سمعا و بصراً ویداً ورجلاً.

ترجمہ: میرا بندہ مسلسل نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے تا آنکہ میں اسے اپنا پیارا بنالیتا ہوں اور جب میں اس کو اپنا پیارا بنالیتا ہوں تو اس کا کان آنکھ اور پاؤں بن جاتا ہوں۔

ایک اور روایت میں ہے:

فبی یسمع و بی یبصر

ترجمہ: پس وہ میرے ذریعہ سے سنتا اور میرے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔

غالباً شیخ عبدالقادر جیلانی یا حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ علیہما نے تحریر فرمایا ہے کہ:

قرب فرائض آنست که حق تعالیٰ فاضل بود و بنده آله فعل او باشد چنانچه وارد شده است الحق ینطق علی لسان عمر ناطق حق است و زبان عمرؓ بیش از آله نیست و نیز دارد شده است که اتقوا غضب عمر فان الله یغضب.

ترجمہ: فرائض کی ادائی کے ذریعے قرب وہ ہوتا ہے کہ اللہ فاعل اور بندہ اس کے فعل کا آلہ ہوتا ہے چنانچہ وارد ہوا ہے حق عمرؓ کی زبان پر بولتا ہے (گویا کہ) بولنے والا اللہ ہے اور عمر کی زبان آلے سے زیادہ نہیں ہے اور یہ بھی حدیث میں آیا ہے کہ عمرؓ کے غصے سے محتاط رہو کیونکہ اللہ غصے ہو جاتا ہے۔

الغرض بندے کو عبادات و مجاہدات کی وجہ سے جب قرب خداوندی حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی باطنی اور روحانی طاقتیں اتنی قوی ہو جاتی ہیں کہ وہ زمین پر رہ کر آسمانوں پر کمندیں ڈالتا ہے اور وہاں پہنچتا ہے جہاں دنیا کا کوئی سائنس دان کسی میزائل اور راکٹ کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا۔ امام رازی مطالب عالیہ میں ایسے روحانی شخص کے متعلق لکھتے ہیں:

ويكون لقوته النفسانية ان يوثرني عالم الطبيعة حتى ينتهي الى درجة النفوس السمادية.

ترجمہ: اور اپنی نفسانی طاقت کی وجہ سے عالم طبیعت میں اثر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تا آنکہ آسمانی نفوس کے درجے پر پہنچ جاتا ہے۔

اور قرآن کریم میں بھی ایسی شخصیتوں کیلئے خصوصی مقامات اور قوتوں کے اعطاء کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا وان الله لمع المحسنين

(عنکبوت رکوع ۷ پارہ ۲۱)

ترجمہ: اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے بارے میں محنت کی ہم ان کو اپنی راہیں سمجھا دیں گے اور اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"جو لوگ اللہ کے واسطے محنت اٹھاتے اور سختیاں جھیلتے ہیں اور طرح طرح کے مجاہدات میں سرگرم رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ایک خاص نور بصیرت عطا فرماتا اور اپنے قرب و رضا یا جنت کی راہیں بجھاتا ہے۔ جوں جوں وہ ریاضات و مجاہدات میں ترقی کرتے ہیں اسی قدر ان کی معرفت وانکشاف کا درجہ بلند ہوتا جاتا ہے اور وہ باتیں سوجھنے لگتی ہیں کہ دوسروں کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔"

قاسم العلوم کی روحانی کمندیں اور کرامتیں:

ہماری مذکورہ بالا تحقیقی تمہید کے بعد یہ بات بالکل آسان ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب اپنی ریاضت، عبادت، مجاہدہ اور تزکیہ روح و نفس سے اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ حق ان کی زبان پر بولتا نظر آئے اور قدرتی خاص کرامات ان کے ہاتھوں پر ظہور میں آئیں۔ اس ضمن میں ہم قاسم العلوم کی کچھ کرامتیں پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن اس سے پیشتر ہم ایک دفعہ حقیقت اور واضح کر دیں کہ جس طرح انبیا کی نبوت کے ثبوت کیلئے معجزہ ضروری نہیں اسی طرح اولیا کی کرامت کا ظہور ان کے ولی ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے۔ نیز کرامت کے کچھ اصول اور اس کی تعریف بھی پیش کرتے ہیں۔

کرامت کی تعریف:

وہ شخص جو کسی نبی کا امتی متبع سنت کامل التقویٰ ہو بدعتی یا فاسق و فاجر نہ ہو اس سے کمال تقویٰ کی بنا پر کوئی خلاف عادت کام سرزد ہونا کرامت کہلاتا ہے۔

استدراج:

اگر کسی صاحب بدعت یا فاسق سے خلاف عادت کوئی کام سرزد ہو اس کو استدراج کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ہوا پر اڑنے لگے یا پانی پر چلنے لگے لیکن وہ پابند شریعت نہ ہو تو اس کو صاحب کرامت نہیں کہا جاسکتا۔

کرامت کی تین قسمیں:

۱۔ کرامت کے ظہور کے وقت کبھی صاحب کرامت کا نہ ارادہ ہوتا ہے اور نہ اس کو علم ہوتا ہے۔

۲۔ کبھی علم ہوتا ہے لیکن ارادہ نہیں ہوتا۔

۳۔ کبھی صاحب کرامت کو علم بھی ہوتا ہے اور ارادہ بھی ہوتا ہے۔

مثال اول کہ نہ ارادہ ہو نہ علم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ

کھانا کھانا اور کھانے کا دوگنا اور تین گنا ہو جانا۔

مثال دوم یعنی کرامت کا علم ہونا اور ارادہ نہ ہونا جیسے حضرت مریم کے پاس بے فصلی پھلوں کا پہنچنا۔ یہاں علم تو ہے کہ بے فصل کے پھل آتے ہیں لیکن ارادہ نہیں ہے۔

مثال سوم کہ علم بھی ہو اور قصد بھی جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دریائے نیل میں پرچہ ڈالنا جس میں لکھا تھا کہ اے نیل جاری ہو جا وہ جاری ہو گیا تھا۔

تصرف:

اس کو کہتے ہیں جس میں نہ علم ہو اور نہ ارادہ اور خلاف عادت کام ہو جائے یہ پہلی قسم میں داخل ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق کی برکت سے کھانا دوگنا یا تین گنا ہو گیا۔ البتہ دوسری دو قسموں کو جن میں صرف علم ہو ارادہ نہ ہو یا علم و ارادہ دونوں ہوں کرامت یا برکت کہا جاتا ہے۔

کرامت حسی:

پھر کرامت کی دو اور قسمیں ہیں۔ ایک قسم حسی کہلاتی ہے جیسے ہوا پر اڑنا، پانی پر چلنا۔ یہ قسم عوام کے لئے دلچسپی اور تعجب کا باعث بنتی ہے اور عوام اسی کو پسند کرتے ہیں۔

کرامت معنوی:

دوسری قسم کرامت معنوی ہوتی ہے اور وہ شریعت پر قائم رہنا، اخلاق حسنہ کا عادی ہونا۔ نیک کاموں کا پابندی اور بے تکلفی سے ظاہر ہونا، برائی سے دل پاک رہنا، کوئی سانس غفلت میں نہ گذرنا۔ یہ کرامت حسی کرامت سے بہتر ہے۔ کیونکہ حسی کرامت میں استدراج کا اندیشہ ہوتا ہے اور استدراج کا ظہور جوگیوں سے بھی ہو سکتا ہے۔

کاملین کا کرامت سے اجتناب:

کاملین اولیا کرامتیں ظاہر کرنے سے گھبراتے ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ استدراج ہو۔ علاوہ ازیں کرامت دکھانے سے دل میں فخر اور عوام میں شہرت کا جذبہ دل میں پیدا نہ ہو جائے۔

کرامت کا اخفا:

بزرگوں کا قول ہے کہ جہاں تک ہو سکے کرامت کو پوشیدہ رکھنا چاہئے البتہ جہاں ظاہر کرنے کی ضرورت ہو یا غیبی اجازت ہو یا اظہار کرامت پر کنٹرول نہ رہے یا کسی طالب حق اور مرید کے یقین کو پختہ کرنا ہو تو وہاں کوئی مضائقہ نہیں وہاں اظہار جائز ہے۔

غلبہ عبودیت:

جب بندہ تسلیم ورضا کا پیکر بن جائے اور ہر وہ حکم جو اللہ کی طرف سے آئے اس کے اجرا ہی کو اپنے لئے بندگی سمجھے تو پھر وہ کسی چیز میں تصرف نہیں کرتے اس لئے ان کی کرامتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ اس لئے کرامتوں کا ظاہر نہ ہونا کسی ولی کیلئے ضروری نہیں۔

وفات کے بعد کرامت کا اظہار درست ہے:

کسی ولی کے مرنے کے بعد بھی کرامت کا اظہار درجہ تواتر تک پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے اس میں شک نہ کرنا چاہئے۔ جیسا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا مولانا رفیع الدین صاحب کے پاس وفات کے بعد آنا اور مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہوی اور مولانا فخر الحسن صاحبؒ گنگوہی کی باہمی چشمک میں مولانا محمود حسن اسیر مالٹا کو دخل نہ دینے کے متعلق مولانا رفیع الدین صاحب کی رزائی جاڑوں کے دنوں میں جو انہوں نے اس وقت اوڑھی ہوتی تھی پسینے میں تر ہو جانا عقلاً اور مشاہدۃً درست ہے۔

کرامت کے لئے ایک اہم شرط:

کرامت کیلئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ ان اسباب کی وجہ سے ظاہر نہ ہوئی ہو جس کیلئے طبعی اور فطری اسباب موجود ہوں۔ خواہ وہ اسباب جلی یعنی واضح اور خواہ خفی جو غیر واضح ہوں، ایسے مقام پر جبکہ کرامت کا سبب کوئی واضح یا خفی طبعی سبب ہو دو قسم کی غلطیاں واقع ہوتی ہیں یعنی بعض لوگ مطلقاً عجیب بات کو کرامت سمجھنے لگتے ہیں اور عامل کے بہت معتقد بن جاتے ہیں چنانچہ مسمریزم، فریمشن، حاضرات، ہمزاد کا عمل، عملیات و نقوش، طلسمات، شعبدے،

ادویات کے عجیب اثرات، جادو، نظر بندی ان سب امور کے طبعی اسباب ہوتے ہیں خواہ خفی اور پوشیدہ ہوں لہٰذا یہ امور کرامت نہیں کہلاتے۔ مبصرین ان امور اور کرامت میں اپنی قدسیہ سے فرق کر لیتے ہیں۔

جس فعل کا اعضائے ظاہری سے کرنا ناجائز ہے باطنی قویٰ سے بھی ناجائز ہے:

جو امور ظاہری اعضا سے کرنے ناجائز ہیں مثلاً قتل کرنا تو باطنی قوت سے کسی بے گناہ کو قتل کرنا بھی ناجائز ہے اسی طرح کسی کے دل پر زور ڈال کر اس سے روپیہ بٹورنا یا پوشیدہ راز معلوم کر لینا یا نامحرم کی طرف توجہ کرنا یہ سب ناجائز ہیں اور کرامت میں شامل نہیں۔

ولی سے کسی ناجائز امر کا صدور:

اگر کسی ولی سے کوئی ناجائز امر صادر ہو جائے بشرطیکہ اس پر اصرار نہ ہو اور توبہ کر لی جائے یا کسی اختلافی مسئلے میں غلط پہلو کو اختیار کر لینے سے جبکہ اس سے توبہ کر لی جائے کرامت پر اثر نہیں پڑتا۔

یہ ہیں وہ چند امور جو کرامت میں پیش نظر رکھنا چاہئیں۔ ان شرائط کے بعد ہم چند کرامات قاسمیہ کو آپ کی بصیرت کیلئے پیش کرتے ہیں۔

کرامت قاسمی کی پہلی مثال:

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے سفر حج کا ایک واقعہ بطور کرامت اشرف التنبیہ میں اس طرح لکھا ہے کہ:

> ”حضرت مولانا محمد قاسم صاحب جہاز میں روز ایک پارہ حفظ کر کے شام کو تراویح میں سنا دیا کرتے تھے۔ اور آہستہ آہستہ یاد فرمایا کرتے تھے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا یہ حضرت مولانا کی کرامت ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رمضان شریف میں آدھا قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ تبسم سے فرمایا کہ چونکہ وہ

مولانا سے آدھے تھے اس لئے کرامت بھی آدھی ہو گئی۔"

(اشرف التنبیہ حصہ ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۸۵)

یہ حضرت قاسم العلومؒ کے پہلے سفر حج ۱۲۷۷ھ کا واقعہ ہے جس میں آپ نے تمام قرآن کریم حفظ فرمالیا تھا اور یہ ان کی کرامت ہی تھی ورنہ اتنی جلدی قرآن کریم کا حفظ کر لینا عام صورت حال کے بالکل خلاف ہے۔

دوسری مثال:

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے والد محترم مولانا حافظ محمد احمدؒ صاحب بن مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا کہ:

> "ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے چھتے کی مسجد میں فرمایا جب کہ لوگوں کا مجمع تھا کہ بھائی آج ہم تو صبح کی نماز میں مر جاتے۔ بس کچھ ہی کسر رہ گئی۔ عرض کیا گیا کیا حادثہ پیش آیا۔ فرمایا کہ آج صبح کی نماز میں سورہ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے مگر وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا ویسا ہی نکلا چلا گیا۔ اس لئے میں بچ گیا۔ نماز کے بعد جب میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے یہ ان کی توجہ کا اثر تھا۔ پھر فرمایا کہ اللہ اکبر جس شخص کی توجہ کا یہ اثر ہے کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے تو خود اس شخص کے قلب کی وسعت وقوت کا کیا حال ہوگا جس میں وہ خود علوم ہی سمائے ہوئے ہیں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کئے ہوئے ہوگا۔"
>
> (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۸۳ حصہ روایات الطیب)

تیسری مثال:

مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا کہ مجھ سے والد مرحوم نے فرمایا کہ (مجھ سے) دیوان محمد یٰسین صاحب مرحوم دیوبندی نے فرمایا کہ:

> ''قاضی پور میں جب حضرت (مولانا محمد قاسم صاحب) نانوتوی تشریف لے گئے ہیں اور عشرہ محرم تھا اور روافض نے حضرت مولانا کو اپنی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ حضرت نے فرمایا کہ منظور ہے مگر اس شرط سے کہ جب آپ لوگ مجلس میں کہہ سن چکیں گے تو ہم بھی کچھ کہیں گے وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اور وہیں کچھ مذہبی گفتگو کرتے ہوئے ان سب روافض نے کہا کہ اگر آپ بیداری میں ہم کو حضرت ﷺ کی زیارت کرادیں اور حضور ﷺ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادیں کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں تو ہم اہل سنت والجماعت میں داخل ہو جاویں گے۔ فرمایا کہ تم سب اس پر پختہ رہو تو میں بیداری میں زیارت کرانے کیلئے تیار ہوں۔ مگر یہ روافض کچھ کچے ہو گئے۔''

(ارواح ثلاثہ حصہ روایات الطیب صفحہ ۲۸۲)

جہاں تک روایت کا تعلق ہے اس کے سب راوی نہایت صادق اور ثقہ ہیں اگرچہ قاسم العلوم کی شرط پر روافض راضی نہیں ہوئے لیکن اگر راضی ہو جاتے تو کس طرح دکھاتے یہ ان کی کرامت پر موقوف تھا۔ لیکن حضرت کا آمادہ ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ گویا آپ وہ کرامت کر دکھاتے۔ اس کی تصدیق کیلئے دیکھئے سید احمد کبیرؒ رفاعی کا وہ واقعہ جو گزشتہ اوراق میں گزرا ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے روضے پر حاضر ہوئے اور دست بوسی کی خواہش کی اور حضور پر نور ﷺ کا دست مبارک روضہ اقدس سے باہر نکلا اور رفاعیؒ نے چوم لیا۔ اسی طرح کی کوئی صورت قاسم العلوم سے بھی ظہور میں آتی۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ حضرت قاسم العلومؒ کے اسی وعدے پر کہ میں تمہیں بیداری میں رسول اللہ ﷺ کو دکھادوں گا لکھتے ہیں:

> ''یا تو اس تصرف (یعنی رسول اللہ ﷺ کو بیداری میں دکھانے) پر قدرت معلوم ہوگئی یا
>
> **لو اقسم علی اللہ لابرہ**
>
> پر اعتماد ہوگا۔''

(ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۸۳)

کرامت کی چوتھی مثال اور نماز اوابین:

مولانا منصور علی خان صاحبؒ حضرت قاسم العلومؒ کے خاص شاگرد کسی لڑکے کے عشق میں اتفاق سے ایسے مبتلا ہوئے کہ ہر وقت اس کا ہی تصور دل پر چھایا رہتا اس کے عشق

نے انہیں بیکار کر کے رکھ دیا تھا۔ حضرت قاسم العلومؒ پر حقیقت حال منکشف ہوگئی تھی۔ مولانا منصور علی خان کہتے ہیں کہ ایک دن میں تنگ آگیا۔ آخر عاجز ہو کر حضرت کی خدمت میں پہنچا اور مودب عرض کیا کہ حضرت للّٰہ میری اعانت فرمایئے میں تنگ آگیا ہوں اور عاجز ہو چکا ہوں ایسی دعا فرمادیجئے کہ خیال تک میرے قلوب سے محو ہو جائے۔ فرمایا بہت اچھا بعد مغرب جب میں نماز سے فارغ ہوں تو آپ موجود رہیں۔ مولانا محمد طیب صاحب کے والد محترم سے یہ سارا قصہ مروی ہے۔ چنانچہ مولانا منصورؒ نے ان سے فرمایا کہ:

> ”میں نماز مغرب پڑھ کر چھتے کی مسجد میں بیٹھا رہا۔ جب حضرت صلوٰۃ الاوابین سے فارغ ہوئے تو آواز دی۔ مولوی صاحب! میں نے عرض کیا حضرت حاضر ہوں۔ میں سامنے حاضر ہوا اور بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ ہاتھ لاؤ۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے اس طرح رگڑا جیسے بان بٹے جاتے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے بالکل اعیاناً دیکھا کہ میں عرش کے نیچے ہوں اور ہر چہار طرف سے نور اور روشنی نے میرا احاطہ کرلیا ہے۔ گویا میں دربار الٰہی میں حاضر ہوں میں اس وقت لرزاں اور ترساں تھا کہ ساری عمر مجھ پر یہ کپکپی اور یہ خوف طاری نہ ہوا تھا۔ میں پسینہ پسینہ ہوگیا اور بالکل خودی سے گذر گیا اور حضرت برابر میری ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی پھیر رہے ہیں۔ جب ہتھیلی پھیرنا بند فرمایا تو یہ حالت بھی فرو ہوگئی۔ فرمایا جاؤ۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔ دو ایک دن کے بعد حضرت نے پوچھا کہ مولوی صاحب کیا حال ہے میں نے عرض کیا کہ حضرت اس لڑکے کا تصور یا عشق تو کجا دل میں اس لڑکے کی گنجائش تک باقی نہیں۔ فرمایا اللہ کا شکر کرو۔ والحمد للہ علی ذالک۔“ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۶۳ تا ۲۶۵)

پانچویں مثال:

ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء میں گولی لگنے اور کچھ اثر نہ ہونے کے متعلق عارف باللہ مولانا محمد یعقوبؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ”ایک بار گولی چل رہی تھی یکا یک (مولانا محمد قاسم صاحب) سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا فرمایا کہ سر میں گولی لگی۔ عمامہ

اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا۔ اور تعجب یہ کہ خون سے تمام کپڑے تر۔"

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۱۸)

یہ واقعہ اپنی صحت اور عینی مشاہدے کے باعث یقین کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے کرامت نہ کہئے تو اور کیا کہئے کہ گولی لگے۔ خون سے کپڑے تر ہو جائیں۔ مگر گولی کا نام ونشان نہیں۔ اور جان کا خطرہ تو درکنار پتہ بھی نہ چلا۔ نہ مرہم پٹی ہوئی۔

چھٹی مثال:

مباحثہ شاہجہانپور میں قاسم العلومؒ نے اسلام کی صداقت پر جو تقریر فرمائی اس کا تمام مذاہب کے لوگوں میں غلغلہ بلند ہوا حتی کہ ایک پادری نے جو مسلمانوں کے مقابلے میں آیا تھا کہا کہ اگر ایمان تقریر پر لانا ہوتا تو میں مولانا محمد قاسم صاحب کی تقریر پر ایمان لے آتا۔ جب آپ واپس آنے لگے تو شہر کے بہت سے لوگ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم لوگ دفتروں میں حاضری کی وجہ سے تقریر نہ سن سکے اس لئے ہم درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو بھی اس تقریر سے مشرف فرمایا جائے۔ تو پھر کیا ہوا مولانا احمد حسن امروہوی کی زبانی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ:

> "مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ مولوی احمد حسنؒ تم سنا دو۔ اب میں بہت حیران تھا اس لئے کہ میں نے ٹھیک طور پر مولانا کی تقریر سنی بھی نہ تھی مگر مولانا کا حکم۔ اس لئے میں نے بیان کرنے کا ارادہ کیا اور میں نے کہا کہ صاحبو! مولانا کی مثال دریا کی سی ہے اور میری مثال کوزے کی سی ہے جو بات سلجھی ہوئی کہوں اس کو مولانا کا مضمون سمجھا جائے اور جو الجھی ہوئی ہو اس کو میری طرف سے سمجھا جائے۔ اس کے بعد میں نے تقریر بیان کی مگر پھر مجھ کو تقریر کے دوران میں کچھ خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مگر تقریر کے بعد لوگوں نے بیان کیا کہ من وعن وہی تقریر تھی جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمائی تھی۔" (ارواح ثلاثہ از روایات الطیب صفحہ ۲۹۴)

ساتویں مثال:

مولانا محمد طیب صاحب روایت کرتے ہیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن (عثمانی) نے فرمایا کہ:

> ”مولوی احمد حسنؒ صاحب امروہوی اور مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ (ہر دو شاگردان قاسمی) میں باہم معاصرانہ چشمک تھی اور اس نے بعض حالات کی بنا پر ایک مخاصمت اور منازعت کی صورت اختیار کرلی اور مولانا محمود حسن صاحب گو اصل جھگڑے میں نہ شریک تھے نہ انہیں اس قسم کے امور سے دلچسپی تھی مگر صورت حالات ایسی پیش آئی کہ مولانا بھی بجائے غیر جانبدار رہنے کے کسی ایک جانب جھک گئے اور یہ واقعہ کچھ طول پکڑ گیا۔
>
> اس دوران میں ایک دن علی الصباح بعد نماز فجر مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے (جو کہ حضرت قاسم العلومؒ کے معاصر اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اور اولیائے کرام میں سے تھے۔ انوار) مولانا محمود حسن صاحب کو اپنے حجرے میں بلایا (جو دارالعلوم دیوبند میں ہے) مولانا حاضر ہوئے اور بند حجرے کے کواڑ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ موسم سخت سردی کا تھا مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے فرمایا کہ پہلے میرا یہ روئی کا لبادہ دیکھ لو۔ مولانا نے لبادہ دیکھا تو تر تھا اور خوب بھیگ رہا تھا فرمایا کہ واقعہ یہ ہے کہ ابھی ابھی مولانا نانوتویؒ جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے جس سے میں ایک دم پسینہ پسینہ ہوگیا اور میرا لبادہ تربتر ہوگیا اور یہ فرمایا کہ محمود حسن کو کہہ دو کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑے۔ بس میں نے یہ کہنے کیلئے بلایا ہے۔ مولانا محمود حسنؒ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میں آپ کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہوں کہ اس کے بعد میں اس قصے میں کچھ نہ بولوں گا۔“ (ارواح ثلاثہ حصہ روایات الطیب صفحہ ۲۶۰۔۲۶۱)

اس بعد الموت کرامت پر حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ حاشیہ میں تحریر فرماتے اور اس صورت کی کہ قاسم العلوم خود بجسد عنصری تشریف لائے تھے توجیہ لکھتے ہیں:

> ”یہ واقعہ روح کا تمثل تھا اور اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جسد مثالی تھا مگر مشابہ جسد عنصری تیار کرلیا ہو مگر وقت گذر جانے پر پھر اس مرکب کو تحلیل کردیا جاتا ہے۔“ (حاشیہ ارواح صفحہ ۲۶۱)

ہم نے یہ چند کرامتیں سلوک و تصوف کے اس باب کی تکمیل کیلئے بیان کردی ہیں ورنہ اس قسم کی کرامتیں بہت آپ سے ظہور میں آئی ہیں جیسا کہ عارف باللہ کی نوشتہ سوانح قاسمی

کے آخر میں کتاب کی تصحیح کرنے والے کی طرف سے دو سطریں تحریر ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ”واضح ہو کہ یہ جو کچھ حالات مولوی محمد یعقوب صاحب نے تحریر فرمائے ہیں وہ اپنی معیت اور ہمراہی کے زمانے کے لکھے ہیں باقی اور حالات اور آپ کی کرامات بہت ہیں جن کو کسی وقت میں بطور ضمیمہ اس کتاب کے آخر میں شائع کیا جائے گا۔“

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۳۲)

آٹھویں مثال:

امیر شاہ خان صاحب کی روایت ہے کہ خورجے میں ایک شخص رن مست خان بہترین گانے والا تھا۔ ایک دفعہ مولانا بھی خورجے تشریف لائے۔ رن مست مولانا کی مجلس میں آگیا۔ مولوی عبداللہ صاحب ساکن گلاوٹھی نے جو مولانا کی پشت پر تھے رن مست کو اشارہ کیا جو مولانا نانوتوی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے حافظ کی یہ غزل گانی شروع کی۔

غلام نرگس مست تو تاجدار انند
خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند

رن مست ایک آدھ شعر پڑھ کر خود بخود رک گیا اور بولا مولانا آپ تو مجھے پڑھنے نہیں دیتے اور بعد میں کہا جب ارادہ کرتا تھا جب ہی کوئی انگلی زبان پر آ کر رکھی جاتی تھی اور اسے دبا دیتی تھی۔ (امیر الروایات از ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۴۹)

حصول خلافت ۱۲۶۶ء:

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے فقر و سلوک سے متعلق جو حالات ہم اب نہایت بسط سے لکھ چکے ہیں ان کے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات خود بخود سامنے آتی ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ پیر و مرشد سے آپ کو خلافت کب ملی اور دوسروں کو مرید کرنے اور بیعت لینے کی اجازت کی سند کا کیا ثبوت ہے۔ اس سلسلے میں ہم ولی کامل حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ گنج مرادآبادی کا یہ قول جو پہلے پیش کر چکے ہیں دوبارہ پیش کرتے ہیں انہوں نے فرمایا:

> ”اس کم سنی میں ان (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کو ولایت مل گئی۔“

دوسرا قول قاسم العلوم کے خصوصی شاگرد مولانا فخر الحسن صاحبؒ گنگوہی کا پیش نظر

رکھئے جو ہم لکھ چکے ہیں وہ اپنی غیر مطبوعہ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

> ''طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آن واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوتے۔'' (سوانح مخطوطہ صفحہ ۱۵)

ان دونوں باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بیعت کے بعد جلد ہی خلافت مل گئی ہوگی۔ جیسا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو بیعت سے چالیس روز بعد حاجی صاحب کی طرف سے خلافت دے دی گئی تھی۔ اور یہی دونوں ہستیاں تمام مریدین میں حاجی صاحب کو زیادہ عزیز ان کی زیادہ مقرب اور محبوب تھیں۔ اس لئے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ بیعت کے بعد جلد ہی اسی سال بیعت ۱۲۶۶ھ میں آپ کو پیر و مرشد سے خلافت مل گئی تھی چونکہ مولانا گنگوہی پر طویل سوانح لکھی گئی اس میں سب کچھ درج ہے اور مولانا نانوتوی کے مفصل حالات پر اس وقت کسی نے کچھ نہیں لکھا اس لئے حصول خلافت کا صحیح مہینہ اور دن متعین نہ ہو سکے۔

عطیۂ خلافت پر پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب کی تحریری سندات:

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حسب ذیل تحریروں سے حضرت قاسم العلوم کو عطیہ خلافت کی سندوں کا ملنا صاف واضح ہے لیکن خلافت کی تاریخیں متعین نہیں۔ کیونکہ عطیہ خلافت کے بعد یہ تحریریں بار بار کے تقاضے ہیں کہ قاسم العلومؒ لوگوں کو بیعت کر لیا کریں۔ کیونکہ حضرت قاسم العلومؒ لوگوں کو یا تو بیعت ہی نہ کرتے تھے یا کرتے تو بمشکل کرتے تھے۔

سند اول:

ضیاء القلوب کے متن اور حواشی میں مختلف مریدین کو خلافت اور لوگوں کو بیعت کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> **مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ مجاز اند** (ضیاء القلوب)

ترجمہ: مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ (بیعت لینے کے) مجاز ہیں۔

سند دوم:

حضرت قاسم العلومؒ نے حاجی صاحبؒ کو مکہ معظمہ خط لکھا ہے کہ میں کسی کو مرید کرنے کے لائق نہیں ہوں۔ حاجی صاحب نے اپنے خط میں جو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نام ہے لکھا ہے اور بظاہر یہ خط ۱۲۸۳ھ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے:

> بفضلہٖ آں عزیزم عالم و عاقل اند نظر بفضل کریم کارساز نمودہ و سنت پیراں و پیشوایان خود دانستہ ہر کدام کہ طالب صادق آید ہر چہ از بزرگاں رسیدہ است و نیز از کتاب ارشاد الطالبین و جواہر خمسہ و رسالہ مکیہ کہ دراں اشغال خاندان بایانست گرفتہ مناسب حال و استعداد او تعلیم نمایند و دریغ ندارند آئندہ ہدایت کنندہ و فائدہ بخشندہ کہ طالب را فرستادہ است خود فائدہ و ہدایت و توفیق خواہد بخشید۔

(مرقات امدادیہ در آخر امداد المشتاق صفحہ ۲۰۹)

> ”خدا کے فضل سے آں عزیز عالم اور عاقل ہیں، کریم کارساز کے فضل پر نظر کر کے اپنے پیشواؤں اور پیروں کی سنت کو جان کر جو شخص بھی کہ (بیعت کرنے کیلئے) طالب صادق آئے تو جو کچھ بزرگوں سے ملا ہے اور ارشاد الطالبین اور جواہر خمسہ اور رسالہ مکیہ سے کہ اس میں ہمارے پیروں کے خاندان کے اشغال ہیں لے کر اس طالب کی استعداد اور حالت کے مطابق تعلیم کریں اور دریغ نہ کریں آئندہ ہدایت کرنے والا اور فائدہ بخشنے والا جس نے طالب کو بھیجا ہے خود فائدہ اور ہدایت اور توفیق بخشے گا۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی روحانی تکمیل کی ذمہ داری قاسم العلومؒ کے کاندھوں پر:

حاجی صاحبؒ کو عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے مکہ معظمہ تحریر فرمایا ہے کہ

آپ سے دوری کی وجہ سے آپ تک پہنچنا دشوار ہے لہٰذا مولانا قاسم صاحبؒ کو لکھ دیجئے کہ وہ ہمیں اپنے فیض سے نوازیں۔ چنانچہ حاجی صاحبؒ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو خط میں تحریر فرماتے ہوئے قاسم العلومؒ کو ان کے تاریخی نام خورشید حسین سے یاد کر کے لکھتے ہیں:

> عزیز مولوی خورشید حسین را کہ خورشید حقیقی است از بندہ بطوریکہ مرا از بزرگان خود اجازت بیعت است ہم اجازت اخذ بیعت و تعلیم است ہر کہ خواہد از وشاں بیعت نمودہ استفادہ نمایند و نیز خط اکی شاں بموجب آن صاحب در مقدمہ اجازت اخذ نوشتہ شد خواہد رسید انشاء اللہ تعالیٰ صاحب موصوف (مولانا محمد قاسم) انکار نخواہد نمود۔ امید از اکرم الامین قوی است کہ فیضان بسیار خواہد شد عاقبت بخیر باد۔

(مرقومات امدادیہ صفحہ ۲۱۶ در آخر امداد المشتاق)

> ”عزیز مولوی خورشید حسین کو کہ حقیقی سورج (ہدایت کے) ہیں بندے سے اسی طریقے پر کہ مجھے اپنے بزرگوں سے بیعت لینے کی اجازت ہے، تعلیم اور بیعت لینے کی اجازت ہے، جو شخص چاہے ان سے بیعت کر کے فائدہ حاصل کرے۔ اور ایک خط ان کے نام سے ان صاحب (یعنی مولانا محمد یعقوب صاحب) کی درخواست کے موافق بیعت لینے کے بارے میں لکھ دیا گیا ہے پہنچے گا انشاء اللہ تعالیٰ صاحب موصوف (مولانا محمد قاسم) انکار نہ کریں گے۔ کرم کرنے والوں میں سب سے زیادہ کریم سے قوی امید ہے کہ بہت فیض ہوگا۔ عاقبت بخیر ہو۔“

ذرا اندازہ لگایئے کہ حضرت عارف باللہ خود مقام ولایت پر پہنچے ہوئے ہیں لیکن ان کی درخواست پر حاجی صاحب نے ان کی روحانی تکمیل حضرت قاسم العلوم کے سپرد کی ہے جس سے ان کے روحانی کمال کا پتہ چلتا ہے۔ عارف باللہ نے ایک مرتبہ جوش میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی نسبت فرمایا:

> ”یہ بہت بخل کرتے ہیں اگر میں ایسا ہوتا جیسے یہ ہیں تو جنگل کے بلدیوں کو جو مویشی چراتے پھرتے ہیں ایسا بنا دیتا جیسے یہ ہیں۔“

(ملفوظات تھانوی جلد چہارم ملفوظ نمبر ۱۰۷۶)

مولانا ذوالفقار علی صاحب کی روحانی تربیت حضرت قاسم العلوم کے حوالے:

حاجی صاحب پیرومرشد سے مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ والد ماجد شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے جبکہ وہ ۱۲۸۲ھ کے حج سے مشرف ہوئے ہیں مکہ معظمہ میں بیعت کی ہے۔ چونکہ وہ حاجی صاحب کے پاس زیادہ نہیں ٹھہر سکے اس لئے مزید روحانیت کی تکمیل کا کام حاجی صاحب نے حضرت قاسم العلومؒ کے سپرد کیا ہے۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی اپنے عہد کے عربی، فارسی اور اردو کے عظیم المرتبہ ادیب اور عالم اور مصنف تھے۔ ان کی روحانیت کی تکمیل قاسم العلوم کے سپرد کیا جانا بھی اپنی جگہ کیا کچھ کم اہمیت کی بات ہے لکھتے ہیں:

> مولوی ذوالفقار علی صاحب داخل سلسلہ بزرگاں شدند مگر بسبب عدم فرصت و کم قیام و سفر مدینہ منورہ وغیرہ ہیچ کردن نتوانستند لہذا ایاں عزیز (مولوی محمد قاسم) حوالہ کردہ می آیند بر حال شاں توجہ مرعی دارند و از تعلیم و تلقین دریغ ندارند و ہر کس کہ طالب حق است کاذب باشد یا صادق از و انکار نہ کنند۔

(خط حاجی صاحب بنام قاسم العلوم امداد المشتاق صفحہ ۲۵۳)

> ”مولوی ذوالفقار علی صاحب بزرگوں کے سلسلے میں داخل ہو گئے ہیں لیکن عدیم الفرصتی اور قیام کی قلت اور سفر مدینہ منورہ کی وجہ سے کچھ نہ کر سکے لہذا آں عزیز کے حوالے کئے جاتے ہیں۔ ان کی حالت پر توجہ کریں اور تعلیم و تلقین سے دریغ نہ کریں اور جو کوئی بھی سچا جھوٹا طالب آئے اس سے انکار نہ کریں۔“

حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ کی تربیت قاسم العلوم کے ذمے:

حاجی محمد عابدؒ یا دوسرا نام حاجی عابد حسین صاحبؒ مشہور دیوبند کے بزرگ حج پر تشریف لے گئے تھے اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت ہو کر واپس ہوئے ہیں۔ ان کی روحانی تعلیم و تربیت بھی پیرومرشد نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے حوالے کی ہے اپنے مکتوب میں مکہ معظمہ سے حاجی عابد حسین صاحب کو لکھتے ہیں:

> ”بخدمت بابرکت عزیزم حاجی محمد عابد صاحب دام ذوقہ وشوقہ وعرفانہ بعد تحفہ سلام مسنون۔ اپنے احوال لکھتے رہیں اگر بہ سبب بعد دشوار ہو تو مولوی محمد قاسم صاحب سے دریافت کر کے عمل میں لائیں۔“ (امداد المشتاق حصہ مرقومات امدادیہ صفحہ ۳۱۹)

میاں عبدالواحد خان صاحب کی تربیت:

کوئی میاں عبدالواحد خان صاحب ہیں ان کو حاجی صاحب مکہ معظمہ سے اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> ”اور جو کچھ کہ اس عرصے میں واردات واقع ہوں مولوی رشید احمد صاحب یا مولوی محمد قاسم صاحب سے بیان کرنا چاہئے جو کچھ وہ فرماویں اس پر عملدرآمد چاہئے۔ ان کو اپنے مرشد کی جگہ سمجھیں۔“ (امداد المشتاق مرقومات امدادیہ صفحہ ۲۸۵)

اخذ بیعت پر حاجی صاحب کا سخت تقاضا:

ایک خط میں قاسم العلومؒ کے نام حاجی صاحب نے مکہ معظمہ سے تحریر کیا ہے اور بیعت لینے پر ذرا ہلکے سے افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> ”اور میں نے چند بار لکھا ہے کہ جو کوئی طالب حق آئے اپنی اور اس کی لیاقت وغیر لیاقت پر نظر نہ کر کے بیعت کر کے توبہ کرائیں اور جو کچھ کہ بزرگوں سے پہنچا ہے توکلاً علی اللہ تعلیم کرتے رہیں انشاء اللہ تعالیٰ اگر طالب صادق ہے محروم نہ رہے گا ورنہ بزرگان خاندان کی برکت سے انجام بہتر ہوگا۔“ (امداد المشتاق صفحہ ۲۷۹)

قاسم العلوم پر اپنی نسبت منکشف نہیں ہوئی:

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کو ایک خط میں مکہ معظمہ سے لکھتے ہیں:

> مولوی محمد قاسم را فہمائش نمایند کہ از بیعت گرفتن وتعلیم نمودن طریقہ سلسلہ مشائخ ہرگز انکار نہ کنند۔ احقر را امید است کہ از وشاں بسیار فیض خواہد شد۔ نسبت شاں بر اوشاں مکشوف نشدہ بر طالبان اوشاں ظاہر خواہد شد مثل آنکہ ہر شخص چہرہ خود را دیدن نتواند

ہر گاہ کہ آئینہ پیش آید ہماں وقت چہرہ خود رامی بیند۔

(مرقومات امدادیہ درآخر امداد المشتاق صفحہ ۲۶۱)

> ''مولوی محمد قاسم کو سمجھائیں کہ وہ بیعت لینے اور مشائخ کے سلسلے کے طریقے کی تعلیم دینے سے ہرگز انکار نہ کریں احقر کو امید ہے کہ ان سے بہت فیض ہوگا۔ ان کی نسبت ان پر ظاہر نہیں ہوئی۔ ان کے مریدوں پر ظاہر ہوگی۔ جس طرح کہ ہر شخص اپنے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جس وقت آئینہ سامنے آتا ہے اس وقت اپنے چہرے کو دیکھتا ہے۔''

دیکھئے قبلہ پیرو مرشد مرید کی بلند نسبتی کے متعلق کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ یہی بات تو نواب مصطفیٰ حسن خان نے کہی تھی کہ میں نے بڑے بڑے ولی دیکھے مگر مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی نسبت کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ بھلا نواب مصطفیٰ کو کیا پتہ چلتا جبکہ خود صاحب نسبت ہی بے خودی کے عالم میں ہیں ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

قاسم العلوم کے مریدین اور اخذ بیعت:

پیرو مرشد نے کبھی کی خلافت عطا کر دی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ روحانیت اور سلوک میں فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ جس طرح ظاہری علوم پڑھ کر پڑھانے کی سند دے دی جاتی ہے یہی سند آپ کو پیرو مرشد کی طرف سے مل گئی تھی کہ اب دوسروں کو منزل سلوک کا راستہ دکھائیں اور بیعت لیں مگر قاسم العلوم کے یہاں تو خاکساری، عاجزی، انکساری کے سوا کچھ نہ تھا بھلا وہ کسی کو مرید کر کے یہ باور کرانے کے لئے کب تیار تھے کہ ہم بھی پیری کے قابل ہیں، ہم بھی مرشد ہیں، ہم بھی ولایت کی دستار سر پر رکھتے ہیں۔ تاہم اہل ذوق کا شوق، معاصرین کے تقاضے اور پیرو مرشد حاجی صاحبؒ کی تاکید پر تاکید نے مجبور کر دیا کہ اس وادی میں قدم رکھیں۔ اب ذرا اس سلسلہ رشد و ہدایت میں بھی قاسمی ادائیں دیکھئے اور چند مثالیں سنئے:

دیوان محمد یٰسین دیوبندی مرحوم ملقب بہ اللہ دیا کا بیعت کرنا:

مولانا محمد طیب صاحب اپنے والد محترم مولانا محمد احمد صاحبؒ سے روایت کرتے ہیں جو بیٹے تھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے اور استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ حقیقی پوتے ہیں حضرت قاسم العلومؒ کے۔ انہوں نے فرمایا کہ والد صاحب مرحوم مولانا محمد احمد صاحبؒ نے فرمایا:

> ''حضرت نانوتوی عموماً بیعت اپنے مرشد کی طرف سے کرتے تھے چند ایک ہی لوگ تھے جن کو براہ راست اپنے آپ سے بیعت فرمایا ایک دفعہ دیوان محمد یٰسین مرحوم دیوبندی سے کہ جب انہوں نے بیعت کی درخواست کی فرمایا کہ جاؤ گنگوہ جا کر (مولانا رشید احمد صاحب سے) بیعت ہو جاؤ وہ فوراً گنگوہ پہنچے۔ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ گنگوہ سے واپس ہو کر پھر درخواست کی۔ حضرت نے فرمایا کہ تم نے گنگوہ جا کر بیعت نہیں کی۔ عرض کیا کر لی۔ فرمایا کہ اب دوبارہ بیعت کیسی؟ عرض کیا حضرت وہ تو تعمیل ارشاد تھی۔ مگر بیعت تو حضرت ہی کریں گے آخر کار خود حضرت نے بیعت فرمایا۔'' (روایات الطیب حصہ ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۶۲)

یہ دیوان محمد یٰسین جن کو دیوان اللہ دیا کہا جاتا تھا حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے جان نثار خادم اور مرید تھے اور گھر کا سب کاروبار یہی انجام دیتے تھے۔ بلکہ بوقت وفات حضرت نے فرمایا تھا کہ میرے اہل وعیال کی داسی (یعنی دیکھ بھال) دیوان جی کریں گے۔ اور انہی کے متعلق حضرت نانوتوی فرمایا کرتے تھے کہ دیوان جی ہمارے ہاتھ پاؤں ہیں۔

(سوانح مخطوطہ مولانا فخر الحسن گنگوہی بحوالہ سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۵۹۶۔ ۵۹۷ جلد اول)

مولانا احمد حسن صاحب امروہوی حلقہ بیعت میں بلکہ مسند خلافت پر:

امیر شاہ خان صاحب مینڈھو کے رہنے والے اپنے اکابر کے فیض یافتہ اور عاشق تھے۔ ان کو ہمارے حضرات کے حالات اور شبانہ روز کے واقعات کا پورا عینی علم تھا۔ راقم الحروف نے بھی ان کو دارالعلوم دیوبند میں دیکھا ہے ان سے روایت کردہ واقعات امیر

الروایات کے ساتھ مشہور ہیں انہوں نے فرمایا کہ:

> "مولانا احمد حسن صاحبؒ (امروہوی شاگرِ عزیز مولانا محمد قاسم صاحبؒ)...... بڑے معقولی تھے اور کسی کو اس میدان میں اپنا ہم عصر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دن حضرت نانوتویؒ (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) کا وعظ ہوا اور اتفاق سے سامنے وہی تھے اور مخاطب بن گئے اور معقولات ہی کے مسائل کا دور شروع ہوا۔ وعظ کے بعد انہوں نے کہا اللہ اکبر! یہ باتیں کسی انسانی دماغ کی نہیں ہوسکتیں۔ یہ تو خدا ہی کی باتیں ہیں۔ مجھ پر تو یہ اثر ہوا کہ خودی مٹ رہی ہے۔ اسی مجلس میں حضرت سے بیعت کی درخواست کی فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب کی طرف سے بیعت کرتا ہوں۔ جب آپ جائیں تو پھر وہاں تجدید بیعت کر لیں۔ چنانچہ جب مولانا (مکہ معظمہ) گئے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تجدید بیعت کر لی۔" (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۶۰)

چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکہ معظمہ سے اپنے ایک مکتوب میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری کے نام ہے لکھتے ہیں:

> "اس سال میں چند دوسرے آدمیوں کو اجازت دی گئی مثل مولوی خلیل احمدؒ خلیفہ مولوی رشید احمد صاحبؒ و مولوی احمد حسن امروہیؒ خلیفہ مولوی محمد قاسم صاحبؒ۔"

(امداد المشتاق صفحہ ۳۱۰)

مولوی محمد نظر خان کا اشتیاق بیعت اور قاسمی و رشیدی لطیفہ سنجی:

مولوی محمد نظر خان نے بیعت کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس سلسلے میں یہ تاریخی واقعہ بھی سن لیجئے اور دیکھئے کہ ایک واقعہ نہیں بلکہ قدم قدم پر ایسے واقعات ملیں گے کہ اخذ بیعت میں حضرت قاسم العلوم بہت ہی کتراتے تھے۔

> "مولوی محمد نظر خان نے (جو نانوتے کے پاس آبھ کے رہنے والے تھے) ایک پرچہ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو بغرض بیعت لکھ کر دیا۔ مولانا نے اس کو پڑھ کر جیب میں رکھ لیا۔ اتفاق سے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نانوتہ تشریف لائے۔ مولوی محمد نظر خان خبر پا کر نانوتہ آئے اور وہی مضمون لکھ کر مولانا گنگوہی کو پیش کیا اور اس میں یہ بھی لکھا

کہ اس مضمون کو میں نے مولانا نانوتوی کو بھی لکھا مگر کچھ جواب نہ دیا۔ جس وقت یہ تحریر دی ہے تو مولانا اس وقت ظہر کا وضو کر رہے تھے۔ پاس ہی مولانا نانوتوی بھی وضو بنانے آ بیٹھے۔ اتفاق سے مولوی محمد نظر خان سامنے ہی کھڑے تھے۔ مولانا گنگوہی نے مولانا نانوتوی کی طرف تبسم فرما کر مولوی محمد نظر خان سے فرمایا کہ "ایسے گونگے پیر کو خط کیوں دیا تھا جنہوں نے جواب بھی نہ دیا۔" مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہنسے اور فرمایا "لو اب بولتے پیر کے پاس آ گیا۔ اب جواب مل جائے گا۔"

(از تحریر بعض ثقات منقول از اشرف التنبیہ ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۸۹)

بیعت کیجئے ورنہ میری اپنی شکر واپس کر دیجئے:

حسب ذیل واقعہ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی روایت فرماتے ہیں کہ:

> "مولانا نانوتوی کی خدمت میں ایک شخص شکر لے کر حاضر ہوئے۔ حاضرین میں وہ تقسیم ہوگئی پھر انہوں نے بیعت کیلئے عرض کیا۔ حضرت نے انکار فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر بیعت نہیں کرتے تو میری شکر واپس کر دو۔ مولانا نے فرمایا کہ بھائی ان کی شکر لا کر دے دو۔ انہوں نے کہا کہ میں تو وہی شکر لوں گا۔ مولانا نے فرمایا بھائی وہ تو صرف آ گئی۔ عرض کیا تو مجھے بیعت کر لیجئے یا شکر میری وہی واپس کیجئے۔ آخر حضرت مولانا نے مجبور ہو کر بیعت فرما لیا۔"

(قصص الاکابر صفحہ ۲۹ منقول از حسن العزیز جلد دوم صفحہ ۸۶ ملفوظ ۲۶۲)

مریدی اور پیری کی ایجنسی:

ان واقعات سے آپ کو باور کرنے کیلئے کتنی ہی نظیریں مل گئی ہیں کہ حضرت قاسم العلومؒ لوگوں کو اول تو مرید ہی نہیں بنانا پسند فرماتے تھے اور اگر کسی کو مرید کرتے تو بمشکل۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ مرید اپنے پیر کی دکانداری چمکانے کے لئے ایجنٹی کا کام کرتے ہیں اور لوگوں کو گھیر گھیر کر اپنے پیر کے پاس لا کر تعداد بڑھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

الغرض پیر و مرشد کے مسلسل تقاضوں، احباب کے لگاتار اصرار اور مشتاقین کے متواتر اشتیاق نے اخذ بیعت پر مجبور کر دیا تھا۔

ہمیں حضرت نانوتوی کے مریدوں میں جن جن کا پتہ ان سے متعلق حالات میں ملا ہے درج کرتے ہیں۔

حاجی محمد اسحاق خان خورجوی:

''(امیر شاہ) خان صاحب نے فرمایا کہ خورجہ (ضلع بلند شہر) میں ایک شخص تھے۔ حاجی محمد اسحاق خان نہایت پابند صوم و صلوٰۃ اور ذاکر شاغل تھے۔ یہ صاحب مولانا نانوتوی سے بیعت تھے۔'' (ارواح ثلاثہ حصہ امیر الروایات صفحہ ۲۳۹)

منشی رحیم الدین صاحب:

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی ایک عبارت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''سیدنا الامام الکبیر (مولانا محمد قاسم صاحب) کے براہ راست مرید منشی سید رحیم الدین نے اس واقعہ کا ان سے تذکرہ کیا تھا۔'' (سوانح قاسمی گیلانی جلد اول صفحہ ۴۶۱)

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ حلقہ ارادت میں:

استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب حضرت شیخ الہند کے شاگرد ہونے اور روحانی تربیت حاصل کرنے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''جہاں شیخ الہندؒ کے علوم ظاہری کی تکمیل حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے فرمائی وہیں کمالات باطنی کی تکمیل بھی حضرت ہی نے فرمائی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے متعدد اکابر سے سنا ہے کہ شیخ الہندؒ کا رنگ باطن اور انداز اخلاق و کمالات بعینہٖ اپنے استاد جیسا تھا لیکن حضرت نانوتویؒ تواضعاً متوسلین کی تکمیل فرما کر انہیں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل فرما دیا کرتے تھے کہ اجازت ان سے لے لو شاید اسی انداز پر حضرت شیخ الہند کو بھی گنگوہ کی طرف منتقل فرمایا ہے۔''

(حاشیہ طیبہ سوانح قاسمی مصنفہ گیلانی صفحہ ۴۳۵ جلد اول)

شیخ الہند قاسم العلومؒ کے خلیفہ مجاز بھی تھے:

مگر میرے پاس ایسی سند اور دستاویز موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ مولانا محمود حسنؒ صاحب حضرت قاسم العلومؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "حیات شیخ الہند" کے آخر میں ایک پیری مریدی کا شجرہ دیا ہے۔ یہ شجرہ چشتیہ صابریہ، قدوسیہ امدادیہ ہے۔ جس میں شیخ الہند کا سلسلہ خلافت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے قائم کیا گیا ہے۔ چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

یا دائما الانعام والاحسان   ارحم علی العبد الفقیر الجانی
فبسیدی مولوی محمود حسن   ممدوح اہل الحمد و الاحسان
فبحق مولانا محمد قاسم   ہو قاسم للعلم والعرفان
فمرشدی غوث الوریٰ شمس الہدی   مقدام اہل العشق و الہیمان
الشیخ امداد اللہ القطب العلی   الجاہ ذی التمکین و العرفان

یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ استاذی میاں سید اصغر حسین صاحبؒ نے حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی طرف رجوع کر کے روحانی فیض حاصل کیا ہے اور ان اشعار میں مسلم ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے بعد شیخ الہندؒ نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بھی رجوع کیا ہے۔

مولانا الحاج مولوی محمد روشن خان صاحب مراد آبادی مرید قاسم العلوم:

تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی حصہ دوم کے صفحہ ۱۵۷ پر لکھتے ہیں کہ:

> "حضرت مولانا الحاج المولوی محمد روشن خان صاحب مراد آبادی مدت فیوضہ آپ حضرت مولانا قاسم العلومؒ صاحب سے بیعت تھے اور مولانا ہی کے بھیجے ہوئے امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی) کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔"

مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی قاسمی خلیفہ بھی تھے اور مرید بھی:

جہاں حضرت قاسم العلومؒ کے مریدین اور خلفا میں مولانا احمد حسن صاحب امروہوی تھے۔ انہی مریدین میں مولانا محمد صدیق صاحبؒ مراد آبادی بھی تھے جو خلیفہ مجاز بھی تھے اور بڑے فاضل وعالم تھے انہوں نے بار بار حضرت قاسم العلومؒ سے بیعت کرنے کی درخواست کی لیکن حضرت نے بہت ٹالا۔ بالآخر بھی یہ بھی ثابت قدم رہے اور پھر ۱۴/ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ مطابق ۲۳/ مئی ۱۸۷۳ء کو بیعت فرمالیا (ماخوذ از رسالہ دارالعلوم فروری ۱۹۵۶ء) مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت مولانا حکیم صدیق احمد صاحبؒ مراد آبادی (نابینا) کلہ بفیاء حضرت (مولانا محمد قاسم صاحب) کے مشہور مجازین (خلیفہ مجاز برائے سلسلہ اخذ بیعت) میں سے جو مسلمہ طور پر اہل کمال سمجھے جاتے تھے۔ نیز ابھی حال میں سفر حیدر آباد کے موقع پر مولانا حکیم مقصود علی خان صاحب اور مولانا حکیم منصور علی خان صاحب مراد آبادی (ثم حیدر آبادی) نے ایک بزرگ کا مجھ سے تعارف کرایا کہ ان کے والد ماجد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازین میں سے تھے۔''

(حاشیہ سوانح قاسمی گیلانی جلد اول صفحہ ۴۵۱)

حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی کے متعلق یہ بیان کہ وہ نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز تھے جن کو حضرت کی طرف سے لوگوں کو مرید بنانے کی اجازت تھی ایک مصدقہ سند ہے۔ بلکہ مولانا محمد صدیق صاحب نے حضرت قاسم العلومؒ سے ظاہری تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور یہ بھی درست کہ حضرت قاسم العلومؒ اپنے مریدوں کی روحانی تکمیل کرنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی طرف بھیج دیتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبای نے مولانا نانوتوی کے بعد مولانا گنگوہی سے فیض حاصل کیا اور حضرت گنگوہی کی طرف سے بھی خلافت ملی۔ جیسا کہ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری حافظ محمد ضامن صاحبؒ شہید کے خلیفہ تھے اور بعد ازاں حاجی صاحب سے بھی فیض حاصل کر کے خلافت کا مقام حاصل کیا۔ بہر حال مولانا صدیق احمد صاحب نے اپنے اشعار میں ان

دونوں کا عقیدت مندانہ ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

چمن آرا تھا وہ کیسا کہ چمن سے اس کے   ہیں رشید احمد و قاسم گل خنداں دونوں
حجۃ اللہ انہیں کہیے تو لاریب ہے راست   کیونکہ ہیں دعوئے توحید کے برہاں دونوں
ہیں یہ وہ گوہر کنوں کہ خریدار ان کے   دے کے کونین جو لیں تب بھی ہیں ارزاں دونوں
علم و حکمت کے یہ میزاب ہیں بہر طلاب   رشد اور فیض کے ہیں قلزم و عماں دونوں
نور سے ان کے منور نہ ہوں کیوں دونوں جہاں   چرخ ارشاد کے ہیں نیر تاباں دونوں
خرمی کو مدد ان سے نہ ہو کیوں عالم میں   باغ امداد کے ہیں سرو خراماں دونوں
فخر مرشد ہوئے فارغ جو سبق سے یہ ہوئے   فخر استاد تھے جب تھے یہ سبق خواں دونوں
ان بزرگوں کی ثنا مجھ سے بیاں ہو کیوں کر   جن کے استاد ہوں اور پیر ثنا خواں دونوں

جن کی تحریر سے قاصر ہے زبان خامہ
رکھتے ہیں ایسے یہ اوصاف فراواں دونوں

(رسالہ دارالعلوم دیوبند اپریل ۱۹۵۶ء)

قابلِ حیرت:

حیرت کے قابل یہ بات ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے مرشدوں اور علما کو دیکھا کہ اگر ان کا کوئی شاگرد یا مرید کسی اور کا جا کر شاگرد یا مرید ہو جاتا تو کباب سیخ کی طرح آتش حسد پر کروٹیں بدلنے اور انگاروں پر لوٹنے لگتے ہیں لیکن یہاں قاسم العلومؒ کے دل کا یہ انداز ہے کہ اپنے پکائے ہوئے اور مکمل کئے ہوئے مریدوں اور شاگردوں کو مولانا گنگوہی کے پاس بصد خلوص و بصد عجز و انکساری و نا اہلیت ذاتی تصور کر کے بھیج دیتے ہیں۔ اللہ رے بے نفسی پس یہی تو کمال درویشی ہے۔ وہاں تو بقول خود حضرت قاسمؒ یہ حال تھا۔

درونم را بعشق خویشتن سوز   بہ تیر درد خود جان و دلم دوز
دلم را محو یاد خویش گرداں   مراحسب مراد خویش گرداں

امیر شاہ خان صاحب ساکن مینڈھو بھی مرید تھے:

ان حضرات کے علاوہ جناب امیر شاہ خان صاحب جن کا ذکر خیر اوپر گذرا اور جو

اکابر دیوبند کے حالات کے ثقہ اور معتمد راوی تھے مولوی عبد الرحمٰن خورجوی، نانا احمد خان خورجوی وغیرہما کا ذکر کرتے ہوئے حضرت نانوتوی کے خورجہ تشریف لے جانے کے سلسلے میں بیان کرتے کرتے کہتے ہیں:

> ''اثنائے قصہ میں اتنی بات اور سن لو کہ میں (امیر شاہ خان) مولانا نانوتویؒ سے بیعت بھی ہوا تھا اور ان کا نہایت معتقد بھی تھا۔'' (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۷)

منشی فضل حق صاحب گنگوہی کی دیوبند کے مریدین کے متعلق شہادت:

حضرت قاسم العلوم کے مرید رشید منشی فضل حق اپنی غیر مطبوعہ سوانح میں لکھتے ہیں:

> ''دیوبند کے بہت شخص مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم کے مرید ہیں مگر سب میں درجہ اول یہی (دیوان جی اللہ دیا یعنی دیوان محمد یٰسین) ہیں۔''

(بحوالہ سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۵۹۶)

حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی:

ان مریدوں میں ایک خاص شخصیت حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی کی تھی جو مولانا کے جان نثار اور عاشق مرید تھے انہوں نے ہی اپنی جیب سے ایک مکان دیوبند میں آپ کی اہلیہ محترمہ کے نام بیع نامہ کرا کر حضرت کے قدموں میں ڈال دیا تھا جس میں آج کل مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ قیام رکھتے ہیں اور انہی حکیم صاحب نے حضرت کی وفات پر قبرستان کے لئے جگہ وقف کی تھی۔

ہمیں جہاں تک تحقیقات سے آپ کے خلفا اور مریدین کا حال معلوم ہو سکا کہ کون کون تھے آپ کی خدمت میں ان کا ذکر پیش کر دیا۔ چونکہ آپ کے سلسلہ بیعت اور مریدین و خلفا کے حالات پردہ خفا میں ہیں اس لئے اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں لکھ سکتے کہ اخذ بیعت سے انکار کے باوجود آپ کے مریدین کی تعداد کافی تھی اور مولانا محمد صدیق صاحبؒ مرادآبادی اور مولانا احمد حسنؒ صاحب امروہوی تو یقیناً خلفا میں سے تھے مگر وہی شکل ہوئی ہے کہ خود ان کی روحانی تربیت مکمل کر کے حضرت گنگوہی کے سپرد کر دیتے تھے یا چونکہ حضرت حاجی صاحب کی

طرف سے بیعت لیتے تھے اس لئے جو صاحب مکہ مکرمہ جاتے تو حاجی صاحبؒ سے تجدید بیعت کر کے خلافت کی اجازت لے لیتے۔ یہی مطلب ہے عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی اس عبارت کا جو انہوں نے اپنی نوشتہ سوانح قاسمی میں تحریر کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) باوجود اجازت حضرت حاجی صاحب مخدوم مکرم قبلہ ایک زمانے تک کسی کو بیعت نہ کرتے تھے۔ پھر آخر بہت تاکید کے بعد چند لوگ بیعت ہوئے اور بہت سے ان میں مختنی صاحب حال ہیں۔ مگر مولوی صاحب نے کسی کو اجازت نہیں فرمائی اور اب آخر میں بیعت سے انکار فرما دیتے تھے۔ اگر کوئی طالب ہوا کچھ وظیفہ بتلا دیتے۔'' (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۳۱۔۳۲)

حضرت عارف باللہ نے اپنے علم کے مطابق یہ بات لکھی ہے کہ کسی کو خلافت اور بیعت لینے کی اجازت نہیں دی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے جیسا کہ ان کے ہی الفاظ ہیں۔ اور بہت سے ان میں مختنی صاحب حال ہیں۔ بہت سے کا لفظ بتاتا ہے کہ بہت سی تعداد خلافت کا مقام رکھتی تھی اور وہ صاحب حال تک تھے۔ اس لئے قاسم العلومؒ کے بعض خلفائے مجازین تھے جو عارف باللہ کے علم میں نہ تھے۔

قاسمی مریدین کی تعداد سرسیدؒ کے نزدیک:

سرسید مرحوم علیگڑھ گزٹ اشاعت ۲۴/ اپریل ۱۸۸۰ء میں قاسم العلومؒ کی وفات پر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''وہ کچھ خواہش پیر اور مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔''

طریقہ تربیت و اصلاح و تزکیہ اخلاق

حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ تربیت و تزکیہ اخلاق نہایت حکیمانہ تھا۔ آپ اپنے مریدین اور شاگردوں نیز ملنے والوں کی اصلاح اس طرح فرماتے کہ ان کو قطعاً ناگوار نہ گذرتا بلکہ کوشش فرماتے کہ نصیحت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور کوئی ایسا نمونہ پیش کرتے کہ جس سے وہ شخص خود اپنے حال کی اصلاح اور اپنا تزکیہ کر لیتا تھا یا بعض اوقات اپنے روحانی تصرف سے کام لیتے۔ بعینہٖ وہی طریقہ جو رحمۃ للعالمین ﷺ اختیار فرمایا کرتے تھے آپ کی دلچسپی کیلئے پیش خدمت ہیں۔ ارواح ثلاثہ میں امیر شاہ خان مرحوم کی زبانی یہ روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ:

حکیمانہ اصلاح:

> ”جب منشی ممتاز علی کا مطبع میرٹھ میں تھا اس زمانے میں ان کے مطبع میں مولانا نانوتوی بھی ملازم تھے اور ایک حافظ جی بھی نوکر تھے یہ حافظ جی بالکل آزاد تھے۔ رندانہ وضع تھی چوڑیدار پاجامہ پہنتے تھے۔ ڈاڑھی چڑھاتے تھے نماز کبھی نہ پڑھتے تھے مگر مولانا نانوتوی سے اور ان سے نہایت گہری دوستی تھی۔ وہ مولانا کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے اور مولانا ان کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے۔ مولانا ان کے کنگھا کرتے تھے وہ مولانا کو کنگھا کرتے تھے۔ اگر کبھی مٹھائی وغیرہ مولانا کے پاس آتی تو ان کا حصہ ضرور رکھتے تھے۔ غرض بہت گہرے تعلقات تھے۔ مولانا کے مقدس دوست مولانا کی ایک آزاد شخص کے ساتھ اس قسم کی دوستی سے ناخوش تھے۔ مگر وہ اس کی کچھ پروانہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جمعہ کا دن تھا حسب معمول مولانا نے حافظ جی کو نہلایا اور حافظ جی نے مولانا کو جب نہا چکے تو مولانا نے فرمایا کہ حافظ جی مجھ میں اور تم میں دوستی ہے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ

> تمہارا رنگ اور ہو اور میرا رنگ اور۔ اس لئے میں بھی تمہاری ہی وضع اختیار کئے لیتا ہوں تم اپنے کپڑے لاؤ میں بھی وہی کپڑے پہنوں گا۔ اور میری ڈاڑھی موجود ہے تم اس کو بھی چڑھا دو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نہ کپڑے اتاروں گا نہ ڈاڑھی۔ وہ یہ سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے آپ مجھے اپنے کپڑے دیجئے میں آپ کے کپڑے پہنوں گا۔ اور یہ ڈاڑھی موجود ہے اس کو آپ اتار دیجئے۔ اور مولانا نے ان کو اپنے کپڑے پہنائے اور ڈاڑھی اتار دی اور وہ اس روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے۔" (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۴۶)

آپ نے دیکھا کیا حکیمانہ انداز تھا یہ حضرت نانوتوی کا کوئی اور ہوتا تو کہتا کہ حافظ جی یا تو ڈاڑھی نیچی کر لو ورنہ میں ایسا کروں گا اور ایسا کروں گا مگر واہ رے نرمی، تحمل اور حکمت قاسمی کا کمال۔

حکیمانہ مگر مشفقانہ اصلاح:

مولوی فاروق صاحب نے فرمایا کہ مولانا احمد حسن صاحبؒ نے ارشاد فرمایا (یہ وہی مولانا احمد حسن صاحب امروہوی ہیں جو حضرت قاسم العلومؒ کے شاگرد رشید اور خلیفہ مجاز ہیں) کہ:

> "جب میں اول اول مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا (مولانا احمد حسن صاحبؒ نہایت خوش لباس، خوش پوشاک تھے، عالی خاندان تھے، سید تھے) تو مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی خدمت میں ایک جولاہا آیا اور دعوت کے لئے عرض کیا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے منظور فرمالیا۔ یہ امر مجھ کو بہت ناگوار ہوا اتنا کہ جیسے کسی نے گولی ماردی کہ بھلا جولاہے کی دعوت بھی منظور کر لی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے یہ بات محسوس کر لی پھر جو کوئی دعوت کے لئے آتا تو پہلے یہ شرط کرتے کہ اس کی (یعنی مولانا احمد حسنؒ صاحب کی) بھی دعوت کرو تو منظور ہے۔ یہاں تک کہ جب بالکل میرے قلب کے اندر سے ناگواری نکل گئی تو مولانا نے میری دعوت کی شرط کو ترک کر دیا۔"

(از روایات الطیب حصہ ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۹۱)

مرشدانہ سالکانہ اصلاح:

(امیر شاہ) خان صاحب نے فرمایا کہ:

''خورجہ میں ایک شخص تھے حاجی محمد اسحاق خان نہایت پابند صوم وصلوٰۃ اور ذاکر و شاغل تھے۔ یہ صاحب مولانا نانوتوی سے بیعت تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ دو تین روز مسجد میں نہیں آئے۔ میں سمجھا کہ شاید کچھ بیمار ہو گئے ہیں اس لئے میں ان کی عیادت کیلئے گیا۔ جا کر دیکھا تو ایک کوٹھڑی میں چھپے بیٹھے تھے۔ اور کانوں میں رووڑ ٹھونس رکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا حالت ہے تم کئی روز سے نماز کیلئے نہیں آئے انہوں نے کہا کہ اچھا ہوں مگر کوئی چار روز سے ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں وہ یہ کہ جب کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے اور جب بیلوں کے سانٹا مارا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر لگتا ہے اور جب کتوں میں آپس میں لڑائی ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑتے ہیں اسی لئے سخت تکلیف میں ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا اور نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں اسی لئے میں چھپا بیٹھا ہوں اور میں نے کانوں میں رووڑ ٹھونس رکھا ہے۔

میں نے کہا کہ اپنی اس حالت کو مولانا نانوتوی کو اطلاع دو۔ انہوں نے کہا کہ تم ہی لکھ دو۔ میں نے کہا کہ تم مجھ کو لکھ کر دے دو۔ میں اپنے خط میں بھیج دوں گا انہوں نے اپنی حالت مجھے لکھ کر دے دی اور میں نے اپنے عریضے کے ساتھ اس کو مولانا کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ مولانا اس زمانے میں دہلی میں تھے۔ مولانا نے جواب دیا اس کا جواب تحریر سے نہیں ہو سکتا تم ان سے کہہ دو کہ وہ میرے پاس چلے آئیں۔ چنانچہ یہ گئے مولانا نے کچھ نہیں کیا۔ صرف اوراد و اشغال کے اوقات بدل دئے۔ یہ شخص دوسرے ہی دن اچھے ہو گئے۔'' (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۹۔۲۴۰)

اس حکایت اور قصے پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی جو اس معاملے کو کرامت سمجھتے ہیں۔ حاشئے میں تحریر فرماتے ہیں:

''کچھ نہیں کیا صرف اوراد و اشغال کے اوقات بدل دیئے۔ اقول (میں کہتا ہوں) احقر

کا وجدان یہ ہے کہ مولانا نے تصرف فرمایا ہے اور اخفائے تصرف کیلئے اوراد و اشغال کے اوقات بدلے ہیں۔ واللہ اعلم باسرار عبادہ۔"

(حاشیہ مولانا تھانوی ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۴۰)

حضرت تھانویؒ کے حاشئے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم العلومؒ نے ان کی بیماری کے علاج میں تصرف کیا تھا یعنی اپنی روحانی طاقت سے ان کی اس بیماری کا استیصال کر دیا تھا اور اس تصرف یعنی روحانی طاقت کو چھپانے کیلئے اس کے اوقات وظائف بدل کر اس کے ذہن کو دوسری طرف منتقل کر دیا تھا۔

روحانی اصلاح یعنی تصرف کے ذریعہ علاج کی ایک اور مثال:

آپ گذشتہ اوراق میں حضرت قاسم العلومؒ کی کرامتوں کے ضمن میں مطالعہ کر چکے ہیں کہ آپ کے شاگرد رشید مولانا عبدالعدل صاحبؒ کو ایک لڑکے سے اتنا گہرا عشق ہو گیا تھا کہ رات دن خیال دوست میں محو رہتے تھے۔ معلوم ہے کہ آپ نے ان کو ایک روز بعد مغرب اپنے پاس بلایا اور ان کی ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی اس زور سے رگڑی جس طرح رسی بانٹی جاتی ہے۔ اس طرح ہاتھ ملتے ملتے عشق کا سب گہرا رنگ ان کے دل سے اڑ گیا بقول داغ۔

کس قدر ان کو فراق غیر کا افسوس ہے
ہاتھ ملتے ملتے سب رنگ حنا جاتا رہا

غرض جس طرح جدائی میں کفِ افسوس ملتے ملتے رنگ حنا اڑ جانا شاعرانہ تخیل میں ممکن ہے ٹھیک اسی طرح کفِ تصرف و دست روحانیت ملتے ملتے قاسم العلومؒ نے ان کے گہرے اور پختہ رنگ حنائے عشق کو دل سے صاف کر دیا۔ یہ ہیں حضرت قاسم العلومؒ کے مریدین کی حکیمانہ اور متصرفانہ اصلاح سے متعلق چند مثالیں جن کو کافی سمجھ کر اس مضمون کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔

قاسم العلومؒ فرشتہ سیرت
ملکوتی خصلت انسان تھے

قاسم العلومؒ سر سیدؒ کی نظر میں:

ہم اب تک قاسم العلومؒ کے سلوک اور ولایت کی منزلوں سے بحمد اللہ بتدریج گذر چکے ہیں اور اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ قارئین کرام ہماری بلا مبالغہ، بلا تعصب اور عقیدتمندانہ غلو سے پاک تحریر کو انصاف کی عینک سے پڑھ کر خود بخود طریقت و شریعت میں قاسم العلومؒ کا مقام متعین کرنے میں بلا توقف پکار اٹھیں گے کہ وہ اپنے زمانے کے زبردست عالم اور عظیم المرتبہ ولی تھے۔

آیئے اپنے ان خیالات کی تائید میں ایک غیر جانبدار ملک کی مفکر ہستی یعنی سر سید مرحومؒ کے چند اقوال پیش کرتے ہیں جو انہوں نے "علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" اشاعت مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء کے ایک مضمون میں جو قاسم العلومؒ کی وفات کے سلسلے میں ہے۔ تحریر فرمائے ہیں لکھتے ہیں:

> "۱۔ لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب (نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی) کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے مگر مولوی محمد قاسم صاحبؒ مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے بھی زیادہ۔" (سر سیدؒ)
>
> ۲۔ "ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھی۔" (سر سیدؒ)

۳۔ ''مولوی محمد قاسمؒ صاحب بے مثل تھے۔'' (سرسیدؒ)

۴۔ ''درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔'' (سرسیدؒ)

۵۔ ''ابتدا ہی سے آثارِ تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارہ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔'' (سرسیدؒ)

۶۔ ''خود بھی پابند شریعت و سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔'' (سرسیدؒ)

۷۔ ''حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔'' (سرسیدؒ)

ولایت قاسمی پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں:

''مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ.......... یہ سب حضرات علمائے ربانیین اور اولیائے امت محمدیہ میں سے تھے۔''

(سید مہر علی شاہ صاحب بروایت مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی مرید خاص مہر علی شاہ صاحبؒ)

''مولانا محمد قاسم صاحب حضرت کی حق صفت علم کے مظہر اتم تھے۔''

(سید مہر علی شاہ صاحب

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نظر میں:

حضرت عارف باللہ اپنے مکتوب بتاریخ ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ بنام منشی محمد قاسم نیانگری میں مولانا محمد قاسم صاحب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”جناب مولوی محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی میرے ہم زلف اور پیر بھائی اور استاد اور استاد بھائی اور ہم وطن اور قریب رشتہ دار ہیں بڑے صاحب کمال، جامع معقول و منقول، عالم ظاہر و باطن کے ہیں اور شیخ کامل مکمل مگر خلق سے نہایت متنفر اور یکسو۔“

(مکتوبات یعقوبی صفحہ ۵۷)

مولانا ذوالفقار علی کے خیال میں:

شیخ الہند کے والد محترم مولانا ذوالفقار علی صاحب قاسم العلومؒ کے رفیق خاص اور اپنے زمانے کے زبردست اور بلند پایہ ادیب اپنی مختصر تالیف ہدیہ سنیہ کے ایک مدحیہ قصیدے میں قاسم البرکات کی روحانی عظمت کا تذکرہ ان اشعار میں کرتے ہیں۔ دو تین شعر پیش کرتا ہوں ۔

کھفِ الوری قاسم الخیرات جامعھا   من فاقِ انفاسہ روض الریاحین
لوگوں کی جائے پناہ بھلائیوں کے تقسیم کرنے والے کے خزانہ   جن کے سانس خوشبو میں پھولوں کے باغوں سے زیادہ معطر ہیں
جامی الشریعة معوان الطریقة مقدام   الحقیقة ذاغیر و تمکین
شریعت کے مددگار طریقت کے حامی حقیقت   کے پیشوا عزت و وقار کے مالک
ھادی الخلائق کشاف الحقائق   مفتاح الدقائق حتمالا بتخمین
مخلوق کے رہنما حقیقتوں سے نقاب اٹھانے والے   دقیق مسائل کے حل، کرنے والے واقعی طور پر نہ کہ اندازاً

امام العصر استاذی شیخ الحدیث مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ قاسم البرکات کے متعلق اپنے ایک قصیدے میں ان کی روحانی عظمت کے متعلق جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں لکھتے ہیں:

وما أتاہ خالقہ مقاما   واثرہ ولیا باختیار
اور خالق نے ان مولانا محمد قاسم صاحب کو مقام عطا کیا   اور اپنی قدرت سے ان کو ولی بنایا
فمعروف بہ و سری عصر   فرید فیہ من غیر المدار
وہ اپنے زمانے کے حضرت معروف کرخی اور سری سقطیؒ تھے   اور اپنے مقام ولایت میں بلاانکساری یکتا تھے
جنید ھمة دواد حالاً   وغوث الملتجی قطب المدار
ہمت میں جنیدؒ بغدادی اور حال میں داؤدؒ طائی تھے   اور ایک التجا کیے گئے غوث اور مرکز دائرہ ولایت تھے

تذکرہ حاجی امداد اللہ صاحب پیر و مرشد

سرسیدؒ نے بالکل پتے کی بات کہی ہے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبے کا دل بنا دیا تھا۔ گویا جسم میں دل ہی تو ہے۔ جس کے متعلق حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا صلح القلب صلح الجسد فاذا فسد القلب فسدا الجسد

ترجمہ: جب دل ٹھیک ہو گیا تو جسم ٹھیک ہو گیا اور جب دل خراب ہو گیا تو جسم بگڑ گیا۔

تو بقول سرسیدؒ حاجی صاحبؒ قاسم العلومؒ کے دل کو اعلیٰ درجے کا دل بنا دیا تھا اور کسی کا اعلیٰ درجہ کا دل وہی بنا سکتا ہے جس کا دل خود اعلیٰ اور اکمل درجے کا ہو۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ہم ایک مستقل کتاب ''حیات امداد'' کے نام سے لکھ چکے ہیں اور جو چھپ کر ہند و پاکستان میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کو مطالعہ کیجئے لیکن اساتذہ قاسمی کی طرح مرشد قاسمی کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو۔ پی) کے رہنے والے ہیں۔ بقول مولانا اشرف علی صاحب تھانوی آپ کی پیدائش ۲۲ صفر المظفر ۱۲۳۳ھ روز دوشنبہ (پیر) مطابق ۱۸۱۴ء بمقام قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور ہوئی۔ وہی نانوتہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا وطن تھا۔ حاجی صاحب کی والدہ نانوتے کی حضرت قاسم العلوم کے خاندان سے تھیں، یہی وجہ ہے کہ والدہ ایام ولادت میں وہیں مقیم تھیں۔ حاجی صاحب کی ہمشیرہ بھی نانوتے میں بیاہی تھیں۔ اس لئے اکثر وہاں آنا جانا رہتا۔ آپ کا نام اصل میں امداد حسین تھا لیکن اس میں شرک کی بو آتی تھی اس لئے شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی نے امداد اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا اور یہی نام مشہور ہو گیا۔ آپ کے والد کا نام نامی محمد امین تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب

حضرت عمرؓ سے ملتا ہے اس لئے فاروقی النسب ہیں۔

تھانہ بھون:

ضلع مظفر نگر کا یہ قصبہ ہندوستان میں مشہور ہے۔ یہاں بڑے بڑے علماء، فضلا اور اولیا پیدا ہوئے۔ کسی وقت اس کی آبادی اڑتالیس ہزار تھی پھر چھتیس ہزار ہوئی اور اب تو سات ہزار رہ گئی ہے۔ (ماخوذ از اشرف السوانح) یہاں اسٹیشن ہے اور سہارنپور سے چھوٹی لائن جو دہلی کو جاتی ہے اس پر یہ قصبہ واقع ہے۔

والدہ اور بھائی بہن:

آپ کے دو بڑے بھائی ذوالفقار علی اور فدا حسین تھے اور ایک بھائی اور ہمشیرہ بہادر علی اور بی بی وزیر النساء تھے۔ آپ کے والدہ کا نام بی بی حسینی (بنت شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی) تھا۔

تعلیم:

آپ نے ابتدا میں قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا اور ہجرت کے بعد مکہ معظمہ میں حفظ پورا کیا۔ سولہ سال کی عمر میں تقریباً ۱۲۴۹ھ میں مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کے ہمراہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانے میں فارسی کی مختصر کتابیں پڑھیں اور کچھ علم صرف ونحو حاصل کیا۔ مولانا رحمت علی تھانوی سے تکمیل الایمان اور شیخ عبدالحق دہلوی کی قرأت پر اخذ فرمائی۔
(شمائم امدادیہ صفحہ ۹)

بعد ازاں بالہام غیبی و بجذبہ کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قرأۃ کے طور پر حضرت مولانا محمد قلندر جلال آبادی پر گذارا۔ حصن حصین اور فقہ اکبر امام ابوحنیفہؒ قرأۃ مولانا عبدالرحیم نانوتوی سے اخذ کیا۔ (امداد المشتاق)

غرض حاجی صاحب کی تعلیم مکمل نہ تھی۔ مگر علوم باطنیہ اور علم لدنی کی وجہ سے شریعت کے نازک نازک مسائل حل فرما دیتے تھے۔ بلکہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے دریافت کیا

گیا کہ کیا حضرت حاجی صاحب عالم نہ تھے تو آپ نے فرمایا کہ عالم کیا وہ تو عالم گر تھے۔ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ لوگ تو حاجی صاحب کے بزرگی کی وجہ سے معتقد ہیں مگر میں تو حضرت کے علم کی وجہ سے آپ کا معتقد ہوں۔

بیعت:

اٹھارہ سال کی عمر میں آپ نے مولانا نصیر الدین صاحب نقشبندی مجددی دہلوی سے بیعت کی جو شاہ محمد آفاق صاحب کے خلیفہ اور مرید اور شاہ محمد اسحاق کے داماد اور شاگرد تھے۔ (امداد المشتاق صفحہ ۷)

مولانا نصیر الدین صاحبؒ کے انتقال کے بعد حاجی صاحب نے میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے جو اپنے زمانے کے بلند پایہ صاحب طریقت تھے بیعت کی۔ حاجی صاحب آپ کی خدمت میں عرصے تک رہے اور چاروں سلسلوں یعنی نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کی تکمیل کی اور خلافت حاصل کی۔ ۱۲۵۹ھ میں میانجی نور محمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

حاجی صاحب کا مقام ولایت:

حاجی امداد اللہ صاحبؒ اپنے زمانے کے اولیائے کرام میں سے تھے۔ تقریباً پانچ سو علمائے ہند آپ سے بیعت تھے۔ آپ سے بہت سی کرامتوں کا ظہور ہوا ہے۔ اعلیٰ درجے کا کشف حاصل تھا۔ مستجاب الدعوات تھے۔ میانجی نور محمد صاحب نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ ہم نے ایک ایسی ہانڈی پکائی ہے جو سو سال پہلے نہ پکی تھی اور نہ سو سال بعد یعنی اتنا بڑا مرید ولی بنایا ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں:

> ”حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں طریقت کے امام تھے، مجتہد تھے، محقق تھے، مجدد تھے۔“ (ملفوظات حصہ چہارم صفحہ ۲۹۴ ملفوظ نمبر ۱۱۳۰)

شریعت اور سنت کا بے حد اتباع تھا۔ شرعی مسائل میں اختلاف سے بہت گھبراتے تھے رواداری اور اتفاق کے دلدادہ تھے۔ مثنوی کا درس بہت شوق و جذب سے پڑھاتے تھے۔

آپ نے تصوف میں کئی رسالے لکھے۔ لیکن ضیاء القلوب علم تصوف میں بہترین رسالہ ہے۔ نظم کے بھی کئی رسالے ہیں جو تصوف میں ہیں۔

ہجرت مکہ اور جہاد آزادی:

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی میں بمقام شاملی آپ امیر جہاد تھے۔ کرامت سے انگریزوں کے ہاتھ نہ آئے۔ بعد ازاں آپ مکہ مکرمہ کو بالہام ربانی ہجرت فرما گئے۔ آپ کے حلقہ ارادت میں وہاں بھی بہت سے اشخاص داخل ہوئے۔ آپ کے اولاد نہ تھی تین شادیاں ہوئیں لیکن کسی سے اولاد نہیں ہوئی۔ بالآخر ۱۲/ جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ کو مکہ معظمہ میں وفات پائی اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کے برابر جنت المعلیٰ میں دفن کر دیئے گئے۔

حضرت حاجی صاحب سے لوگوں کے دلوں میں نور پیدا ہوا۔ ہزاروں کی اصلاح ہوئی یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

رشید و قاسم سرفہرست:

یوں تو آپ کے مریدوں میں سینکڑوں علما اور صلحا تھے جن کو آپ سے خلافت بھی ملی لیکن مریدوں میں سب سے زیادہ عزیز دو ہستیاں تھیں۔ ان میں سے ایک مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور دوسرے مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی تھے۔ ہندوستان میں رشد و ہدایت اور شریعت و طریقت سے متعلق کوئی بات ہوتی تو انہی دونوں حضرات کے سر وکالت کا سہرا بندھتا۔

تمام علمائے ہند بریلی اور دیوبند کو حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد کے مطابق رشیدؒ و قاسمؒ کا اتباع ضروری ہے:

کوئی صاحب میاں عبدالواحد صاحب بنگالی حضرت حاجی صاحبؒ سے مکہ معظمہ میں مرید ہوتے ہیں۔ ان کو خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''جو کچھ کہ اس عرصے میں واردات واقع ہوں مولوی رشید احمد صاحبؒ یا مولوی محمد قاسم صاحبؒ سے بیان کرنا چاہیے۔'' (امداد المشتاق صفحہ ۲۸۵)

حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں گذرا وہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت ہو کر مکہ معظمہ سے دیوبند آ گئے ہیں۔ بہت ہی ذاکر و شاغل اور اسم با مسمی عابد تھے مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے عمر میں بڑے تھے بریلوی خیالات رکھتے تھے مگر اختلاف سے بچتے تھے۔ نہایت مستقیم الاحوال تھے لیکن روحانی تربیت کی تکمیل کیلئے ان کو اپنے خط میں مولانا محمد قاسم صاحب کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ تمام ہندوستان و پاکستان کے متوسلین خواہ دیوبندی عقائد کے ہوں خواہ بریلی کے سب کو ضیاء القلوب میں مخاطب ہو کر حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں:

> **ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت دارد مولوی رشید احمد صاحبؒ سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحبؒ سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند۔** (ضیاء القلوب صفحہ ۶۰)
>
> ”جو شخص کہ اس فقیر سے محبت و عقیدت رکھتا ہے مولوی رشید احمد صاحبؒ سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحبؒ سلمہ کو کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی ہیں مجھ فقیر راقم اوراق کے قائم مقام بلکہ مدارج میں مجھ سے بھی زیادہ خیال کریں۔ (ضیاء القلوب صفحہ ۶۰)

اب ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ مذکورہ بالا عبارت کے مطابق تمام علمائے ہند اور متوسلین کی ہدایت کا معاملہ خواہ شریعت سے متعلق ہو یا طریقت سے انہی دونوں حضرات کے سپرد کر دیا گیا ہے جس سے کسی بریلوی اور دیوبندی کو انحراف کرنا شیخ طریقت کی خوشنودی کے خلاف کرنا ہے اور ان دونوں کے بلند مقامات کا بھی اس عبارت سے اندازہ لگایئے کہ ”بلکہ بمدارج فوق از من شمارند“ بہر حال یہ دونوں ہستیاں شریعت و طریقت میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھیں۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”حضرت (حاجی صاحب) نے آخر میں ضیاء القلوب کی چند سطران دونوں صاحبوں کی تعریف میں لکھی ہیں نہایت درست ہیں۔ یوں حضرت نے اپنی کسر نفسی کو کام فرمایا ہے مگر اظہار مرتبہ ان دونوں صاحبوں کا اس سے منظور ہے۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۱۴)

حاجی صاحب کے معتمد اور امانت دار:

دیگر دنیاوی معاملات میں بھی حاجی صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہی پر زیادہ وثوق اور بھروسہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حاجی صاحب کو ہندوستان میں کوئی چیز امانت رکھنے کی ضرورت ہوتی تو انہی حضرات کے پاس رکھتے تھے ایک خط میں حکیم ضیاء الدین صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

> ''اگر ممکن ہو برخوردار مقصود احمد اس کے (حافظ احمد حسین کے) فرزند کو ہمراہ کسی آنے والے کے اس طرف روانہ کردیں کہ مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کے مدرسے میں پڑھے گا اور خرچ راہ احمد حسین کے مبلغ میں سے کہ نزد مولوی رشید احمد امانت ہے پچاس روپیہ لے کر لانے والے کے حوالے کریں توقف نہ ہو۔'' (ترجمہ مرقومات امدادیہ صفحہ ۳۱۲)

اپنے ایک خط میں حاجی صاحبؒ ضیاء القلوب کی طباعت کی ذمہ داری ان دونوں حضرات کے سپرد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اگر مناسب دانند و در رائے آن عزیزاں آید نسخه ضیاء القلوب را نزد مولوی عبدالحکیم صاحب برادر شیخ الٰهی بخش ٹھیکیدار میرٹھ بفریسند که اوشاں طبع خواهند کنانید چرا که خط اوشاں نزد احقر آمده بود بایں مضمون که نسخه مزکور نزدم بفریسند حسب مرضی تو یعنی احقر طبع کنانیده نزد مولوی محمد قاسمؒ و مولوی رشید احمدؒ صاحب وغیره خواهم فرستاد اوشاں را اختیار راست هر کرا اهل خواهند دانست خواهند داد اگر ایں صورت ظهور کرد مولوی محمد قاسم صاحب بشرطیکه هیچ حرج تکلیف نه شود خود میرٹھ رفته در پیش نظر خویش بصحت تمام مع تحشیه و غیره در مطبع منشی ممتاز علی صاحب طبع کنانند و در رساله مذکور هرجا که الفاظ غیر مربوط باشند و عبارت خراب باشد صلاح دهند و ادب را

یکسو نهند۔ (مکتوبات امدایہ صفحہ ۲۴۹)

> اگر مناسب جانیں اور آپ عزیزوں کی رائے ہو تو نسخہ ضیاء القلوب کو مولوی عبد الحکیم صاحب برادر شیخ الٰہی بخش ٹھیکیدار میرٹھ کے پاس بھیج دیں کہ وہ چھپوائیں گے کیونکہ ان کا خط احقر کے پاس آیا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ مذکورہ نسخہ میرے پاس بھیج دیجئے آپ کی مرضی کے مطابق یعنی احقر کی طبع کرا کر مولوی محمد قاسم و مولوی رشید احمد صاحبؒ وغیرہ کے بھیج دوں گا۔ انہیں اختیار ہے جس کسی کو اہل سمجھیں دیدیں گے۔ اگر یہ صورت ظہور میں آئی تو مولوی محمد قاسم صاحبؒ بشرطیکہ کوئی حرج اور تکلیف نہ ہو خود میرٹھ جا کر اپنی نظروں کے سامنے بصحت تمام مع حاشیہ وغیرہ منشی ممتاز علی کے مطبع میں طبع کرائیں اور مذکورہ رسالے میں جہاں کہیں الفاظ بے ربط ہوں اور عبارت خراب ہو اصلاح کر دیں اور ادب کو برطرف رکھیں۔"

دیکھئے حاجی صاحب نے ضیاء القلوب کی طباعت کا اختیار ان دونوں حضرات کو دیا ہے اور مولانا محمد قاسم صاحب کو خصوصیت سے لکھا ہے کہ وہ میرٹھ جا کر اپنے سامنے چھپوائیں اور ایک بڑی عجیب بات یہ لکھی ہے کہ ضیاء القلوب کی عبارت میں جہاں ربط نہ ہو اور عبارت اچھی نہ ہو ادب کو بالائے طاق رکھ کر اس کی اصلاح کر دیں۔

قاسم العلوم کی نظروں میں پیر و مرشد حاجی صاحب کا احترام:

حاجی صاحب کو معلوم ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ ان کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور اگر کہیں پیر و مرشد کے قلم سے کوئی لفظ سہواً غلط لکھا جائے تو قاسم العلومؒ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرنا سخت بے ادبی سمجھتے ہیں۔ اس لئے حاجی صاحب کو یہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی کہ "ادب را یکسو نہند۔" چنانچہ حضرت مولانا تھانوی تحریر فرماتے ہیں:

> "حضرت حاجی صاحب مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ مولانا نے ایک مسودہ حضرت حاجی صاحب کا دیا ہوا نقل کیا۔ اس میں ایک لفظ سہواً غلط لکھا گیا تھا اس کو مولانا نے صحیح نہیں کیا ادب کی وجہ سے بلکہ وہاں جگہ چھوڑ دی حضرت حاجی صاحب نے درست فرما دیا۔" (قصص الاکابر صفحہ ۳۰)

یہ ہے ادب جس کے باعث اگلے بزرگ روحانیت واخلاق کے مقام پر پہنچتے تھے اور مرشد واستاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی روحانی بلندی اور علمی رفعت کا راز یہی تو بتایا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کا بیحد ادب کرتے تھے۔

ادب بہتر از گنج قاروں بود ۔ فزوں ترز ملک فریدوں بود
بزرگاں نکردند پروائے مال ۔ کہ اموال را ہست رو در زوال

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ حضرت حاجی صاحب جس قدر شریعت وطریقت وامور دنیا میں ان دونوں حضرات پر اعتماد کرتے تھے اتنا زیادہ اور کسی کو وہ مقام مرشد کامل کی نظروں میں نہ تھا یہ دونوں حضرات محفل امداد کی دو روشن شمعیں تھیں یا آسمان طریقت وشریعت کے دو نیر اعظم تھے جن کی روشنی سے لاکھوں شمعیں دنیا میں روشن ہوئیں اور قیامت تک ان کے عقیدتمندوں اور متوسلین سے روشن رہیں گی۔ مگر دونوں کی شاخیں کہیں مشترک اور کہیں جدا تھیں۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کا جو رنگ تقابل پیش کیا ہے وہ آپ کی بصیرت چشم کیلئے پیش خدمت ہے:

شان قاسمیؒ	شان رشیدیؒ
۱۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ میں شان ولایت کا رنگ غالب تھا۔ (قصص الاکابر صفحہ ۲۷)	۱۔ مولانا رشید احمد صاحبؒ میں شان نبوت کا (رنگ غالب تھا)
۲۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر چشتیت کی شان غالب تھی اور یہی چشتیت حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر غالب تھی۔ (قصص الاکابر صفحہ ۲۶	۲۔ مولانا گنگوہی پر نقشبندیت کی شان غالب تھی۔
۳۔ مولانا نانوتوی (محمد قاسم صاحبؒ) کی شان عالمانہ تھی نہ درویشانہ تھی بلکہ عاشقانہ تھی۔ (قصص الاکابر صفحہ ۲۸	۳۔ مولانا گنگوہی کی شان سلف کے بہت مشابہ ہے زمانے میں متاخر ہی مگر حالات وہی ہیں جو سلف کے تھے۔ (صفحہ ۲۶)

۴۔ مولانا نانوتوی کا یہ کمال تھا کہ خجلت پر فنا کو مجاہدے سے غالب کردیا۔ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۰۶ حاشیہ حکایت ۳۰۲)	۴۔ مولانا گنگوہی کا یہ کمال تھا کہ رنگ فنا خجلت پر غالب تھا۔

مولانا گنگوہیؒ	مولانا نانوتویؒ

مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے۔

۵۔ مولانا گنگوہی کا تو قدم قدم پر انتظام (تھا) (بے پروائی نہ تھی) (تھانویؒ)	۵۔ مولانا نانوتویؒ لاابالی (بے پروا) کہیں کی چیز کہیں پڑی ہے کچھ پرواہی نہیں۔ (تھانویؒ)
۶۔ ایک گروہ مولانا گنگوہیؒ کے پاس گیا کہ ہم بھی آپ کے ہمراہ حج کو چلیں گے آپ نے فرمایا کہ زادِ راہ بھی ہے انہوں نے کہا کہ ایسے ہی توکل پر چلیں گے مولانا (گنگوہی) نے فرمایا کہ جب ہم جہاز کا ٹکٹ لیں گے تو تم منیجر کے سامنے توکل کی پوٹلی رکھ دینا۔ بڑے آئے توکل کرنے والے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ (تھانویؒ ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۱۳)	۶۔ پھر ان لوگوں نے حضرت مولانا نانوتویؒ سے کہا تو آپ (ان حج کو جانے والوں کو) اجازت دیدی۔ راستے میں جو کچھ بھی ملتا وہ سب ان لوگوں کو دیدیتے اور ساتھیوں نے کہا کہ حضرت آپ تو سب ہی دے دیتے ہیں۔ کچھ تو اپنے پاس رکھئے تو فرمایا انما انا قاسم واللہ یعطی (تھانویؒ) (ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۱۳)
۷۔ اسی سفر میں مولانا گنگوہیؒ نے مولانا نانوتویؒ سے فرمایا کہ صبح سے شام تک پھرتے ہی ہو کچھ فکر بھی ہے۔ (مولانا تھانویؒ) ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۱۳	۷۔ (مولانا نانوتوی نے) فرمایا کہ حضرت آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا فکر ہے۔ (مولانا تھانویؒ) (ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۱۳)
۸۔ حضرت امام ربانی قدس سرہ پر (اس سفر حج میں) وہی انداز غالب تھا جو نیابت نبوت کے آثار جلیہ میں عالمانہ طرز ہوا کرتا ہے۔ آپ بھاری بھرکم، سادہ مزاج، منتظم و مدبر اور	۸۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں (اس حج میں) کشوف کونیہ کے اکثر ذکر تذکرے ہوتے۔ مکاشفات بیان کئے جاتے۔ خوابیں

کم گو تھے سوائے کسی مسئلے کا جواب دینے یا معمولی گفتگو میں عامی بات چیت کرنے کے اور کوئی بات نہ فرماتے تھے امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب) اس قسم کی گفتگو کے وقت بالکل خاموش ہو بیٹھتے اور ایسے بن جاتے تھے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ (مولانا عاشق الٰہی مصنف تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۳۳ حصہ اول)	ظاہر کی جاتیں۔ غلبہ ظن پر رائے ظنی ہوتی۔ اور درویشانہ صوفیانہ چھیڑ چھاڑ برابر قائم رہتی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ میاں حضرت مولانا رشید احمد کی عالی ظرفی کا کیا ٹھکانا ہے سب کچھ ہے بیٹھے ہیں۔ مگر کیا ممکن کہ ذرہ برابر ظاہر ہو جائے۔ (مولانا عاشق الٰہی مصنف تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۳۳)
۹۔ مولانا گنگوہی نہ تو بہت زیادہ بولتے تھے اور نہ بہت کم بولتے تھے۔ (تھانویؒ ملفوظات چہارم)	۹۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا سکوت بھی طویل ہوتا تھا اور تقریر بھی بہت مبسوط ہوتی تھی۔ (ملفوظ نمبر ۱۰۷۶ حصہ چہارم)
۱۰۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ (سے کوئی کسی کی شکایت کرتا تو) سنتے تھے اور کچھ نہ فرماتے تھے۔ (ملفوظات تھانویؒ حصہ چہارم ملفوظ ۹۴۵)	۱۰۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ (کسی کی شکایت) شروع ہی سے نہ سنتے تھے۔ (ملفوظ تھانویؒ ۹۴۵)
۱۱۔ حضرت گنگوہیؒ میں انتظامی مادہ زیادہ تھا جس سے حضرت کے متعلق لوگوں کا خیال سختی کا تھا۔ (ملفوظات حصہ چہارم صفحہ ۴۷۷ ملفوظ ۷۸۱)	۱۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ میں نرمی تھی۔ (ملفوظ نمبر ۷۸۱)
۱۲۔ مولانا گنگوہی کے یہاں (ہنسی مذاق کی) اتنی تو کثرت نہ تھی مگر ہاں کبھی ذرا سی بات کہہ دیتے تھے کہ سب ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے اور خود نہیں ہنستے تھے۔ (قصص الاکابر صفحہ ۳۱ الہادی ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ)	۱۲۔ مولانا محمد قاسم صاحب کی مجلس میں ہنسی مذاق خوب ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مولانا یار باش ہیں۔ (قصص الاکابر صفحہ ۳۱)

۱۴۔ حضرت گنگوہی کے پاس اگر کوئی شخص نوافل و وظائف کے اوقات میں آجاتا تو آپ اپنے وظائف کو نہ چھوڑتے تھے۔ (ملفوظات تھانویؒ)	۱۴۔ حضرت نانوتوی کے پاس اگر کوئی نوافل کے وقت آجاتا تو آپ نوافل چھوڑ کر آنے والے سے بات چیت کرنے میں مشغول ہو جاتے۔ (ملفوظات تھانویؒ)

ہم نے جو امتیازی حالات ہر دو حضرات کے لکھے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان دونوں حضرات کے خیالات میں تضاد تھا بلکہ دونوں کی شانیں اور دونوں کا رنگ جدا جدا تھا ورنہ ان دونوں حضرات کے آپس میں انتہا درجے کی محبت اور بے حد موافقت تھی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم شکر گذار ہیں کہ انہوں نے دونوں کے امتیازی رنگ پر کہیں کہیں اپنے ملفوظات میں روشنی ڈالی ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا دونوں کے شاگرد اور مرید ہیں وہ دونوں کو ایک روح اور دو قالب ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں چنانچہ اپنے ایک لمبے قصیدے کے ایک سو پینتیس اشعار میں دونوں کا اتحاد و اتفاق اس طرح پیش کرتے ہیں۔ آپ بھی پڑھ کر لطف لیجئے۔

راشد قاسم خیرات و رشید مرشد　　قبلہ دین ہیں اور کعبہ ایماں دونوں
بحرِ امواج طریقت کے ہیں دو چشمہ فیض　　گلبن شرع کے ہیں سنبل و ریحان دونوں
باغ امداد الٰہی کے ہیں دو سرو رواں　　شمع ہیں نور محمد کی درخشاں دونوں
میں نہ تفضیل کا قائل نہ مساوات کا ہاں　　مجھ سے گمرہ کی ہدایت کو ہیں یکساں دونوں
میرے ہادی مرے مرشد مرے ماویٰ ملجا　　مرے آقا، مرے مولیٰ، مرے سلطان دونوں
ان میں جو ربط ہے ہم نے تو نہ دیکھا نہ سنا　　دونوں دلدادہ ہیں اور دلبر و جاناں دونوں
ایک صورت ہے نظر آتے ہیں جس کے دو عکس　　اک حقیقت ہے کہ جس کے ہیں یہ عنواں دونوں
دونوں کو دیکھوں تو آتے ہیں نظر ایک مجھے　　ایک کو دیکھوں تو ہیں اس میں نمایاں دونوں
کبھی کہتا ہوں کہ یک جان ہیں اور دو قالب　　دیکھتا ہوں کبھی یک قالب و یک جاں دونوں
سلسلہ ان کے کمالات کا جب طے نہ ہوا　　تھک کے کہنا پڑا مجھ کو کہ ہیں یکساں دونوں

بحرِ ذخار ہیں لیکن نہیں ساحل کا پتہ ابرِ رحمت ہیں مگر ہیں گہرافشاں دونوں
بخیۂ سازِ دل مجروح ہیں، للّٰہ الحمد ان کے تارِ نظر و سوزنِ مژگاں دونوں
ان کی محفل میں ہیں یوں بیٹھے ہوئے دل اور ہم جیسے ہم بزم ہوں دو اور پریشاں دونوں
میرے محسن، مرے مخلص، مرے مخدوم ومطاع رنج افزائے دل و خاطر ویراں دونوں
قاسم خیر و رشید احمدِ ذیشاں دونوں ہیں مسیحائے زماں یوسفِ کنعاں دونوں
باغِ تسلیم و رضا کے گل خنداں دونوں گلشن قدس کے ہیں مرغ خوش الحان دونوں
ان سے راضی ہے خدا، وہ ہیں خدا سے راضی کیوں نہ قربان کروں ان پہ دل وجاں دونوں
بن گئے ان کے تصدق سے مقامِ محمود کیوں نہ نانوتہ وگنگوہ ہوں نازاں دونوں
بخدا دیکھ کے دیدار رشید و قاسم دل سے سب محو ہوئے حسرت وارماں دونوں
ان کی الفت میں مروں، ان کی غلامی میں اٹھوں سینہ صد چاک ہو اور آنکھیں ہوں گریاں دونوں
دل کے سو ٹکڑے ہوں، ہر ٹکڑے میں سودا ان کا جان صد پارہ ہو ہر پارے میں پنہاں دونوں
جاؤں عرصات میں جن خائف و نادم تہی دست دونوں ہاتھوں میں ہوں ان دونوں کے داماں دونوں

قبر سے اٹھ کر پکاروں جو رشید و قاسم
بوسہ دیں لب کو مرے مالک و رضواں دونوں

عاقبت ان کے محبوں کی ہو یارب محمود اور مخالف کو سدا ذلت و خسراں دونوں

ہائے ان اشعار میں یہ شعر کتنا حسین اور خوبصورت ہے۔

قبر سے اٹھ کے پکاروں جو رشید و قاسم
بوسہ دیں لب کو مرے مالک و رضواں دونوں

دیکھئے یہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب، اللہ اللہ کس عقیدت مندی اور سعادت مندی کا دریا ان کے سینے میں موجزن ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ نے یہ اشعار مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی کے اشعار دیکھ کر جو ابھی گذشتہ صفحات میں گذرے ہیں اسی بحر، اسی ردیف اور قافئے میں لکھے ہیں۔ کیونکہ شیخ الہندؒ نے اسی قصیدے میں دو شعر یہ بھی کہے ہیں۔

اس زمیں میں لکھوں کیا خاک کہ صدیق و ذہیں بیٹھے ہیں ہاتھ دھرے زیرِ زنخداں دونوں
مور سے، ہائے غضب احمد و عبدالرحمٰن ہوتے ہیں طالب توصیف سلیماں دونوں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد احمد صاحب بن مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسر امروہوی شاگرد قاسم العلوم والخیرات نے مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی کے اشعار کی طرز میں شیخ الہندؒ سے اشعار لکھنے کی فرمائش کی ہوگی۔ مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی نے اپنی مثنوی زیر و بم میں مولانا قاسم العلوم والخیرات کی ثنا بیان فرمائی ہے اس کے تین شعر سنئے لکھتے ہیں۔

اے کجا رفت آں مدار ابتدا آں محمد قاسم مولائے ما
آیتے بودہ ز آیات خدا منبع جود و سخا کان عطا
مرشد موصل برائی طالباں ہادی کامل برائے گمرہاں

وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ:

ہم قاسم العلوم والخیرات اور حضرت گنگوہی کے ذکر میں کہاں سے کہاں پہنچے۔ ذکر تو یہ ہو رہا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ارادتمندوں میں جس قدر پیارے یہ دونوں مرید رشید و قاسم تھے اتنا اور کوئی عزیز نہ تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب ضیاء القلوب میں فرماتے ہیں:

> مولوی رشید احمد صاحب سلمه و مولوی محمد قاسم صاحب سلمه را .... بمدارج فوق از من شمار ندا گرچه بظاهر معامله برعکس شد که اوشاں بجائے من و من مقام اوشاں شدم. وصحبت اوشاں را غنیمت دانند که ایں چنیں کساں دریں زمانه نایاب اند و از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بوده باشند و طریق سلوک که دریں رساله (ضیاء القلوب) نوشته شد در نظر شاں تحصیل نمایند انشاء الله تعالیٰ بے بهره نخواهند ماند الله تعالیٰ در عمر شاں برکت دباد. (ضیاء القلوب صفحہ ۶۰)

مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو............... درجات

میں مجھ سے زیادہ خیال کریں۔ اگرچہ بظاہر معاملہ الٹا ہوگیا کہ وہ (روحانیت میں) مرشد کی جگہ اور میں ان کی جگہ ہوگیا اور ان کی صحبت کو غنیمت جانیں کہ اس قسم کے لوگ اس زمانے میں نایاب ہیں اور ان کی بابرکت خدمت میں فیض حاصل کریں اور سلوک کا طریقہ کہ اس رسالے (ضیاء القلوب) میں لکھا گیا ہے ان کی زیر نظر حاصل کریں انشاء اللہ تعالیٰ بے بہرہ نہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔

پیر و مرشد کی مذکورہ عبارت پڑھیے اور اس میں حضرت قاسم العلومؒ اور امام ربانی کا مقام ملاحظہ فرمایئے۔ یہ صحیح کہ مرشد و استاد، مرشد و استاد ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات شاگرد استاد سے اور مرید مرشد سے آگے نکل جاتا ہے۔ مگر حاجی صاحب بالآخر آسمان ولایت پر بہت اونچے اڑتے تھے لیکن ان دونوں مریدوں کی گفتگو بھی سنئے۔ مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں:

> ''ایک بار حضرت مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ جتنی محبت پیروں کے ساتھ مریدوں کو ہوتی ہے حضرت حاجی صاحب سے مجھ کو اتنی نہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے سن کر ادھر ادھر کی باتیں کر کے فرمایا: ''اب تو ماشاء اللہ آپ کی حالت باطنی حضرت حاجی صاحب سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔'' مولانا نے فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ، استغفر اللہ بھلا کہاں حضرت اور کہاں میں ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ بہت صدمہ ہوا۔'' مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا کہ خیر آپ ان سے بڑھے نہ سہی لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ تکلیف آپ کو کیوں ہوئی۔ بس یہی ہے محبت۔ آپ تو کہتے تھے کہ مجھے حضرت سے محبت ہی نہیں اگر محبت نہ تھی تو یہ صدمہ کیوں ہوا ویسے ہی اپنی افضلیت کی نفی کر دیتے بس یہی محبت ہے۔'' حضرت مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ بھائی تم بڑے استاد ہو۔''
>
> (قصص الاکابر صفحہ ۱۸)

اب ذرا قاسم العلومؒ والخیرات کی عقیدت مندی بھی ملاحظہ ہو۔ وہ حاجی صاحبؒ کے جان نثار اور عاشق زار تھے۔ آپ نے آب حیات لکھی ہے لیکن اس سے اس وقت تک تسلی نظر نہیں آتی جب تک کہ حاجی صاحبؒ کو سنا کر اطمینان نہیں کر لیتے کہ اس کے مضامین صحیح ہیں۔

چنانچہ قاسم العلومؒ حج کو روانہ ہوئے ہیں۔ آب حیات کا مسودہ ہمراہ ہے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ پھر لکھتے ہیں:

> "حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہ کی قدم بوسی سے رتبہ عالی پایا یعنی بزیارت مطلع انوار سبحانی، منبع اسرار صمدانی، مورد افضال ذی الجلال والاکرام، مخدوم مطاع خاص و عام، سر حلقہ مخلصان سراپا اخلاص، سر لشکر صدیقاں باختصاص، رونق شریعت، زیب طریقت، ذریعہ نجات، وسیلہ سعادات، دستاویز مغفرت نیاز منداں، بہانہ واگذاشت مستمنداں، ہادی گمراہاں، مقتدائے دیں پناہاں، زبدہ زماں، عمدہ دوراں سیدنا و مرشدنا و مولانا الحاج امداد اللہ لازال کاسمہ امداد من ال اللہ للمسلمین واہل اللہ۔"

دیکھئے پیر و مرشد حاجی صاحب کیلئے جو الفاظ منتخب کئے ہیں ان سے کتنی عقیدت و محبت ٹپک رہی ہے۔ یہی حال پیر و مرشد کا تھا کہ وہ مولانا قاسم العلوم والخیرات سے محبت زیادہ کرتے تھے اور مولانا رشید احمد صاحب کی عزت زیادہ کرتے تھے۔

ہاں تو حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ:

> "مولانا رشید احمد صاحبؒ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ دونوں کو مدراج میں مجھ سے زیادہ سمجھیں اور معاملہ برعکس ہو گیا۔ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہو گیا۔"

اس خیال کے اظہار کے بعد مولانا اشرف علی صاحبؒ کی زبانی مولانا رشید احمد صاحب سے کہلا کر بھیجا:

> "ہماری آپ کی محبت اللہ کے واسطے ہے اور جب اللہ باقی ہے اسی طرح جو محبت اللہ کیلئے ہوتی ہے وہ بھی باقی رہتی ہے اور میں نے جو کچھ ضیاء القلوب میں آپ کی نسبت لکھا ہے وہ الہام سے لکھا ہے کیا میرا وہ علم اب بدل جائے گا۔"

(یادیاراں ۱۳۲۴ھ صفحہ ۸ و تذکرۃ الرشید جلد دوم)

مولانا محمد قاسم صاحبؒ حاجی امداد اللہ صاحب کی زبان تھے:

جناب قاسم العلوم والخیرات کو جو ایک خاص مقام حاجی صاحب کی طرف سے ملا وہ یہ تھا جس کا اظہار انہوں نے حسب ذیل الفاظ میں فرمایا ہے، مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں:

"مؤلف (یعنی مولانا اشرف علی صاحبؒ مؤلف رسالہ امداد المشتاق) نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ صاحبؒ) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ:

"مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا جیسے مولانا روم کو حضرت شمس تبریز قدس سرہ کی زبان بنایا تھا۔" (امداد المشتاق صفحہ ۱۱)

اس عبارت سے اندازہ لگائیے کہ حاجی صاحب کے وہ علوم جو ان کے آئینہ دل پر لدنی علم کی صورت میں مکشوف ہوتے تھے وہ قاسم العلومؒ والخیرات کی زبان پر ظاہر اور کتابوں کی شکل میں جلوہ گر ہوئے۔ یہ مقام صرف حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہی کو پیر و مرشد کی طرف سے ملا۔ اسی لئے مولانا جہاں مرید تھے وہاں حاجی صاحب کے شاگرد بھی تھے کہ علوم کا اکتساب انہوں نے حاجی صاحب سے علم لدنی کے طور پر کیا اور جب وہ اپنی کسی کتاب کو حاجی صاحب پر پڑھ کر سناتے ہیں اور اس کی تصدیق کرا لیتے ہیں تو بھی علمی شاگرد بن جاتے ہیں اور مثنوی کے شاگرد تو تھے ہی۔

ولی کامل مولانا محمد قاسم صاحبؒ بقول حاجی صاحب:

ہم آپ کے اس روحانیت کے حصے کو اب حاجی صاحب کے اس قول پر ختم کرتے ہیں جس میں انہوں نے قاسم العلومؒ والخیرات کو ولی کامل کہا ہے۔ حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے یہ خط حضرت قاسم العلومؒ والخیرات اور حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے نام لکھا ہے جو بڑا طویل خط ہے۔ یہ خط اس وقت کا لکھا ہوا ہے جبکہ حضرت قاسم العلومؒ نکاح بیوگان کے بارے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اور اسی سلسلے میں آپ نے اپنی بیوہ بوڑھی ہمشیرہ مسماۃ امینہ کا دوسرا نکاح کیا تھا۔ ان کی پہلی شادی شیخ احمد دیوبندی سے ہوئی تھی جو شیخ نہال احمد صاحب رئیس دیوبند کے بھائی تھے۔ مسماۃ امینہ کے دوسرے نکاح کے وقت شیخ اسد علی مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے والد زندہ تھے۔ الحاصل حاجی صاحب لکھتے ہیں:

از کمترین خلائق مسمی بامداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت بابرکت عالم عامل عزیزم مولوی محمد قاسم و مولوی محمد یعقوب صاحب دام شغلکم اللہ۔ بعد سلام مسنون اشتیاق مشحون مشہود رائے عزیز باد۔ مکتوب مع پارچہ کھیس یکے مورخہ ۲۶ جمادی الثانی و دیگر مورخہ ۲۲ شوال

رسیدند از مندرجہ آنہا آگاہی یافتم۔ از انتقال عزیز شیخ احمد دیوبندی مرحوم رنج گردید خدائے تعالیٰ مغفرتش کند۔ برائے او طواف و دعائے مغفرت کردہ شد۔ قبول باد۔ و نیز از دریافت نکاح ثانی عزیزہ ام ہمشیرہ مولوی محمد قاسم بحسن تدبیر و سعی مولوی صاحب موصوف خیلے فرحہا اندوختم.............. بخدمت بھائی صاحب مکرم و معظم شیخ اسد علی صاحب سلمہ بعد سلام نیاز مبارک باد اللہ تعالیٰ آں جناب را توفیق اتباع سنت نبوی ﷺ داد۔ امید قوی است کہ ہمیں عمل وسیلہ نجات جناب شود۔ عجب نیست و شکر کنند کہ خدا تعالیٰ شمارا ایک ولی کامل (پسر) عطا فرمودہ۔

کمترین خلائق امداد اللہ عفی اللہ عنہ کی طرف سے بخدمت بابرکت عالم باعمل عزیزم مولوی محمد قاسم و مولوی محمد یعقوب صاحب، دام شغلکم اللہ۔ بعد سلام مسنون، اور اشتیاق مشحون مشہود رائے عزیز ہو کہ ایک خط ع پارچہ کھیس مورخہ ۲۶ جمادی الثانیہ دوسرا مورخہ ۲۲ شوال پہنچا۔ مندرجہ احوال سے آگاہی ہوئی۔ عزیزم شیخ احمد دیوبندی مرحوم کے انتقال سے رنج ہوا خدا تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے اس کیلئے طواف اور دعائے مغفرت کی گئی۔ قبول ہو۔ نیز مولوی محمد قاسم کی ہمشیرہ عزیزہ کے دوسرے نکاح سے مولوی صاحب کے حسن تدبیر و سعی سے مجھے بیحد مسرتیں حاصل ہوئیں.............. بھائی صاحب مکرم و معظم جناب شیخ اسد علی صاحب کی خدمت میں بعد سلام نیاز "مبارک باد" اللہ تعالیٰ نے آنجناب کو سنت نبوی پر چلنے کی توفیق دی۔ پختہ امید ہے کہ اگر یہی عمل آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے تو تعجب کی بات نہیں۔ اور شکر کریں کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ایک ولی کامل بیٹا عطا فرمایا ہے۔

لیجئے یہ آخری ڈپلومہ ہے جو مرشد کامل کی طرف سے قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو ولی کامل کا مل گیا ہے۔ ہم نے اپنی بساط کے مطابق حضرت کے مقام فقر و تصوف کو قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب ہم آپ کی زندگی کے آئندہ حالات کی طرف عنان قلم موڑتے ہیں۔ یہاں تک آپ کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ عالم باعمل اور ولی کامل بن چکے ہیں۔ پھر اور کیا چاہیے سب کچھ تو مل گیا۔ آخر میں اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی شجرہ طیبہ روحانی پیش خدمت ہے۔

شجرہ روحانی چشتیہ صابریہ منظومہ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ

شجرہ طیبہ روحانی حضرت قاسم العلومؒ:

جس طرح ہم نے خاندانی حالات کے سلسلے میں حضرت قاسم العلومؒ کا نسلی شجرہ آباؤ اجداد پیش کیا ہے اور بعد ازاں تعلیمی سلسلے میں آپ کے اساتذہ کا شجرہ دیا ہے اسی طرح آپ کا روحانی شجرہ بھی پیش کرتے ہیں جو خود حضرت قاسم العلومؒ نے نظم میں تحریر فرمایا ہے۔ البتہ اسکے تین اشعار یعنی ساتواں، آٹھواں اور نواں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اپنی طرف سے زیادہ بڑھائے ہیں۔ یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ شجرہ کے یہ اسماء حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ تھانوی مہاجر مکی کی کتاب ضیاء القلوب میں درج ہیں۔ یہ حضرت نانوتوی نے اپنے منظوم شجرے میں پیرانِ عظام کا کہیں کنیت اور کہیں نصف نام سے کام لیا ہے۔ کیونکہ نظم میں پورا نام مشکل ہے۔ ہم نے اس سلسلے کے تمام بزرگوں کے نام مع سن وفات تذکرۃ الرشید حصہ دوم سے لے کر حاشئے پر درج کردئے ہیں:

الٰہی غرق دریائے گناہم تو میدانی و خود ہستی گواہم
گناہ بے عدد را بار بستم ہزاراں بار توبہ ہا شکستم
حجاب مقصدم عصیان من شد گناہم موجب حرمان من شد
بآں رحمت کہ وقف عام کردی جہاں را دعوت اسلام کردی
نمی دانم چرا محروم ماندم رہین ایں چنیں مقسوم ماندم
گدا خود را ترا سلطاں چو دیدم بدرگاہ تو اے رحمٰن دویدم

بحق رہنمائے اہل تحقیق   امام اہل حق اولاد صدیق
ملاذ خاص و عام از نقص ایماں   پناہ ہرا میر نفس و شیطاں
بآں کو شد محمد قاسمش(۱) نام   فیوض غیب را بر جملہ قسام
بحق مقتدائے عشق بازاں   رئیس و پیشوائے جاں گدازاں
امام راست بازاں شیخ عالم   ولی خاص صدیق معظم
شہ والا گہر امداد اللہ(۲)   کہ بہر عالم است امداد اللہ
بحق بادشاہ عالم نور   رئیس راستاں ثانی طیفور
شہ نور محمد(۳) نور مطلق   امام اولیا صدیق برحق
بآں شاہِ شہیداں حاج حرمین   شہ عبد الرحیم(۴) غوث دارین
بعبد الباری(۵) شیخ طریقت   چراغِ دینِ احمد شمع ملت
بعبد الہادی(۶) ہادی پیراں   امیر دستگیر دستگیراں
بحق شہ العزیز الدین(۷) اعنی   نہنگ بحر عشق و بحر معنی
بآں غواص دریائے حقیقت   محمد مکی(۸) قطب طریقت

۱؎ بیاض یعقوبی میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا شجرہ منظوم درج ہے اور اس میں ساتواں و آٹھواں اور نواں شعر انہوں نے اپنی طرف سے بڑھادئے ہیں۔ (مصنف)

(۱) مولانا محمد قاسم صاح نانوتوی پیدائش رمضان ۱۲۴۸ھ وفات ۴/ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۷ھ مدفون دیوبند

(۲) حاجی امداداللہ صاحب تھانوی فاروقی مہاجر کی پیدائش ۱۲۱۳ھ وفات ۱۳۱۷ھ مکہ معظمہ مدفن جنت المعلیٰ مکہ معظمہ

(۳) میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی ضلع مظفر نگر وفات ۴/ رمضان ۱۲۵۹ھ مزار جھنجھانہ

(۴) حاجی سید عبدالرحیم فاطمی شہید ولایتی وفات ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ

(۵) شاہ عبدالباری صدیقی امروہی ۱۱/ شعبان ۱۲۲۶ھ

(۶) شاہ عبدالہادی صدیقی امروہوی جمعہ ۴/ رمضان ۱۱۹۰ھ (امروہہ

(۷) سید عزالدین پہلے آپ کا نام عزالدین مشہور تھا بعد ازاں عضدالدین ہوگیا۔ وفات ۷/ رجب ۱۱۷۲ھ عزیز الدین بھی آپ ہی کو کہا جاتا ہے۔

(۸) شاہ محمد مکی جعفری وفات ۱۱/ رجب امروہہ ضلع مرادآباد (یو۔ پی)

بشمس چرغ دین شاہ محمدی(۹)　　کہ ہم ہادی بدوہم بود مہدی
بحقِ بحرِ مواج معانی　　محبّ اللّٰہ(۱۰) محی الدین ثانی
بحق بوسعید(۱۱) فخر اقراں　　جنید وقتِ خود شبلی دوراں
بسلطانِ المشائخ صدر اعلیٰ　　نظام الدین(۱۲) شاہ دین و دنیا
بحق صدر ایوان جلالت　　جلال الدین(۱۳) شمسِ چرخ رفعت
بحق عبدِ قدوس(۱۴) مقدس　　کہ کمتر دید چوں اور چرخِ اطلس
بحقِ سرو بُستانِ سعادت　　محمد جوہر(۱۵) کان سعادت
بحقِ سرورِ اہل معارف　　ملاذِ اہل عرفان شیخ عارف
بحق احمد(۱۶) عبد الحق(۱۷) کہ افلاک　　بہ پیش رفتش پس است از خاک
بحق مرکز اہل کمالات　　جلال الدین(۱۸) شہ عالی مقامات
بہ شمس الدین(۱۹) خورشید جہاں تاب　　امام و قدوہ ابدال و اقطاب

---

(۹) شاہ سید محمدی وفات ۳/ رجب ۱۱۰۷ھ اکبر آباد (آگرہ)

(۱۰) شیخ محب اللہ صدیقی الہ آبادی وفات بروز جمعرات ۹/ رجب ۱۰۵۸ھ احمد آباد

(۱۱) شاہ ابوسعید نعمانی نوشیروانی گنگوہی وفات ۲/ ربیع الاول ۱۰۴۱ھ گنگوہ محلہ سرائے

(۱۲) شاہ نظام الدین ملیجی فاروقی وفات ۸/ رجب ۱۰۵۱ھ

(۱۳) شاہ جلال الدین تھانیسری فاروقی جمعہ ۱۴/ ذی الحجہ ۹۸۹ھ تھانیسر

(۱۴) قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی نعمانی منگل ۲۳ جمادی الثانی ۹۴۳ھ گنگوہ محلہ سرائے ضلع سہارنپور (یو۔پی)

(۱۵) شیخ محمد فاروقی رودلوی ۸۹۸ھ رودلی

(۱۶) شیخ احمد فاروقی رودلوی

(۱۷) شیخ عبدالحق فارقوی رودلوی ۱۵/ جمادی الاخریٰ ۸۳۷ھ ارودلی

(۱۸) شیخ جلال الدین محمد عثمانی پانی پتی ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ پانی پت

(۱۹) شیخ شمس الدین ترک علوی پانی پتی ۱۹/ شعبان ۷۱۶ھ پانی پت

بحق بحرِ ذخارِ محبت بحق مشعلِ نار محبت
بحق نور چشمان اکابر علی احمد(۲۰) علاؤ الدین صابر
بحق شاہ عالی آستانہ فرید الدین(۲۱) یکتائے زمانہ
بہ شمس الاولیاء بدر المشائخ امام الاولیاء فخر المشائخ
جنابِ خواجہ(۲۲) قطب الدین چشتی کہ شستہ از جہانے نقش ز شتی
بحق آنکہ شاہ اولیا شد درِ او بوسہ گاہ اولیا شد
معین الدین(۲۳) حسن بحر کہ برخاک عدیدہ چرخ چوں او مرد چالاک
فدا برنام او جان ودلم باد نثار در گہش آب و محکم باد
بآں رشک ملائک فخر انسان سپہ سالار پیکاں خواجہ عثمان(۲۴)
بحق مست حق شاہ یگانہ شریف(۲۵) زندنی فخر زمانہ
بحق خواجہ مودود(۲۶) چشتی کہ سگ را فیض او سازد بہشتی
بحق در یکتا جوہر پاک ابو یوسف(۲۷) چراغ ہفت افلاک
بحق بو محمد(۲۸) محترم شاہ کہ بدور روز خورشید بشب ماہ

---

(۲۰) امام الملت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر حسینی ۳/ربیع الاول ۶۹۰ھ پیران مخیر رڑکی ضلع سہارنپور (یو۔پی)

(۲۱) شیخ فرید الدین شکر گنج فاروقی ۵ محرم ۶۶۸ھ یا ۶۶۹ھ پاکپتن ضلع قصور پاکستان

(۲۲) شیخ قطب الدین بختار کاکی اوشی حسینی ۱۴/ربیع الاول ۶۳۳ھ دہلی پرانی

(۲۳) امام طریقت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری بروز پیر ۶/رجب ۶۲۳ھ اجمیر راجپوتانہ ہندوستان

(۲۴) شاہ ابو النور ہارونی ۵/شوال ۶۳۳ھ مکہ مکرمہ

(۲۵) منیر الدین حاجی شریف زندانی ۳/رجب ۵۸۰ھ زنا (بخارا)

(۲۶) قطب الدین معدود چشتی حسینی غرب رجب ۵۲۷ھ چشت خراسان

(۲۷) سید ناصر الدین ابو یوسف چشتی حسینی یکم جمادی الاولیٰ ۴۵۹ھ چشت

(۲۸) سید ابو محمد محترم چشتی حسینی ۴/ربیع الاول ۴۱۱ھ چشت

بحق حاکم شہر ولایت   ابو احمد(۲۹) در بحر ولایت
بسالار طبیبان رواں ہا   ابو اسحاق(۳۰) صیقل ساز جاں ہا
بحق شاہ والا جاہ ممشاد(۳۱)   علو در عشق مولا کامل استاد
بحق بو ہمیرہ(۳۲) زیب عالم   گل باغ سعادت فخر آدم
بحق آنکہ دل در عشق حق بست   حذیفہ(۳۳) مرعشی شیر نر مست
بحق پورا دہم محویزداں   امیر عالم ابراہیم(۳۴) سلطاں
بحق زبدہ نیکو نصیباں   فضیل(۳۵) ابن عیاض استاد عرفاں
بعبد(۳۶) الواحد ابن زید شہباز   کہ بالا شد زکروبی بہ پرواز
بحق مقتدائے مقتدایاں   حسن بصری(۳۷) امام پیشوایاں
بحق شیر یزداں شاہ مرداں   در علم لدن و فیض رحمان
خلیج بحر رحمت منبع فیض   تجلی گاہ یزداں مطلع فیض
بحق آنکہ مداحش خدا شد   رسول پاک او را رہنما شد
علی(۳۸) ابن ابی طالب کہ خورشید   بنور خاکپائے او درخشید
بحق آں کہ او جہاں جہانست   خدائے روضہ اش ہفت آسمانست

---

(۲۹) سید ابو احمد ابدالی حسنی یکم یا ۳ جمادی الثانی ۳۵۰ھ چشت
(۳۰) خواجہ شرف الدین ابو اسحاق شامی ۱۴ ربیع الثانی ۳۲۹ھ (شام)
(۳۱) خواجہ کریم الدین ممشاد علو دینوری ۱۴ محرم ۲۹۹ھ
(۳۲) خواجہ امین الدین ابو ہمیرہ بصری ۷ شوال ۲۷۹ھ بصرہ
(۳۳) خواجہ سدید الدین حذیفہ مرعشی ۱۴ یا ۲۴ شوال ۲۵۲ھ
(۳۴) سلطان العارفین ابو اسحاق ابراہیم بن ادہم فاروقی یکم شوال ۱۵۷ یا ۱۶۶ھ ملک شام
(۳۵) ابو الفیض فضیل بن عیاض محرم ۱۸۷ھ (مکہ معظمہ)
(۳۶) خواجہ ابو الفضل عبد الواحد بن زید ۲۷ صفر ۱۷۶ھ یا ۱۷۸ھ بصرہ
(۳۷) سیدنا امام حسن بصریؒ یکم رجب یا ۴ محرم ۱۱۰ھ بصرہ
(۳۸) مولانا ابو الحسن و ابوتراب عمزادہ و داماد رسالتمآب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ پیر کی رات ۲۱ رمضان ۴۰ھ

بحق آں کہ محبوبش گرفتی   برائے خویش مطلوبش گرفتی
پسندیدی ز جملہ عالم آں را   بہا بگذاشتی باقی جہاں را
گزیدی از ہمہ گلہا تو اورا   نمودی صرف او ہر رنگ و بورا
ہمہ نعمت بنام او نمودی   دو عالم را بکام او نمودی
باں کو رحمۃ للعالمین است   بدرگاہت شفیع المذنبین است
بحق سرور عالم محمد ﷺ(۳۹)   بحق بر تر عالم محمد ﷺ
بذات پاک خود کاں اصلی ہستی ست   ازو قائم بلندی ہا وپستی است
ثناء او نہ مقدور جہانست   کہ کنہش برتر از کون و مکانست
دلم از نقش باطل پاک فرما   براہ خود مرا چالاک فرما
بکش از اندرونم الفت غیر   بشو از من ہوائے کعبہ و دیر
درونم را بعشق خویشتن سوز   بہ تیرِ دردِ خود جان و دلم دوز
دلم را محو یاد خویش گرداں   مرا حسب مراد خویش گرداں
اگر نالائقم قدرت تو داری   کہ خارِ عیب از جانم برآری
بخوبی زشت را مبدل نمائی   سیاہی را بہ بخشی روشنائی
گناہم را اگر دیدی نگرہم   بعفو و فضل خود اے شاہِ عالم
بجرماں ایں گدائے خستہ تاکے   دعا نشیدنِ سرگشتہ تاکے
بسے بگذشت شاہا نامرادم   بدرگاہت رسیدم، ساز، شادم
بچشمِ لطف، اے حکم تو برسر
بحالِ قاسم بے چارہ بنگر

(قصائد قاسمی مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی صفحہ ۲۰ تا ۲۳)

---

(۳۹) رسالت مآب سرکار مدینہ خاتم المرسلین، امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔ وفات دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفاً وتعظیماً (تذکرۃ الرشید حصہ دوم صفحہ ۱۰۵۔۱۰۶)

شجرہ قاسمی مجددی نقشبندی تا سرکار دو عالم ﷺ:

یہ سلسلہ جس کو خود حضرت قاسم العلومؒ نے اپنی نظم میں درج فرمایا ہے سلسلہ چشتیہ صابریہ ہے۔ اس میں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پیر میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی کے ذریعہ سے سلسلہ ہے۔ لیکن حاجی صاحب کے دوسرے پیر حضرت مولانا نصیر الدین صاحب دہلوی بھی تھے اس لئے ان کے ذریعہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا سلسلہ بزرگاں اس طرح ہوگا:

> ”مولانا محمد قاسم صاحب از حاجی امداد اللہ صاحبؒ از مولانا نصیر الدین دہلوی از شاہ محمد آفاق دہلوی از خواجہ ضیاء الدین از خواجہ محمد زبیر از خواجہ حجۃ اللہ محمد نقشبند ثانی از خواجہ محمد معصومؒ از حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندی تا سرور عالم ﷺ۔“

اس لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلہ بیعت نقشبندی مجددی اور چشتی صابری دونوں سے ملتا ہے۔ اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو چاروں سلسلوں میں بیعت رکھتے تھے چنانچہ حضرت قاسم العلومؒ بھی نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ چاروں سلسلوں میں بیعت تھے لیکن یہ حضرات سلسلہ چشتیہ میں بیعت کیا کرتے تھے۔ اس لئے عام طور پر شجرہ بھی چشتیہ ہی لکھا کرتے تھے جیسا کہ مولانا قاسم العلومؒ نے اپنا منظومہ شجرہ تحریر فرمایا ہے۔ ہم آخر میں رسول اکرم ﷺ سے قاسم العلومؒ تک چشتیہ صابریہ کا شجرہ دوسرے طور پر صرف خاص اور مشہور حضرات کی صورت میں پیش کرتے ہیں جو یہ ہے:

(شجرہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

حضرت حسن بصریؒ

(حضرت حسن بصریؒ سے پیرانِ عظام کے بعد) حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری (کا تیرھواں درجہ اور نمبر ہے)

(حضرت خواجہ معین الدین کے بعد) حضرت شیخ بابا فرید الدین شکر گنج پاکپتن (کا تیسرا نمبر ہے)

(حضرت اجمیریؒ سے دو نمبر کے بعد) حضرت شیخ علاء الدین صابر کلیری (کا چوتھا مقام اور نمبر ہے)

(شیخ علاء الدین صابری کلیری کے بعد) حضرت شیخ عبد القدوسؒ گنگوہی (کا چھٹا مقام اور نمبر ہے)

(شیخ عبد القدوسؒ گنگوہی کے بعد) حضرت شاہ عبد الرحیم ولایتی فاطمی (کا نواں مقام اور نمبر ہے)

(شاہ عبد الرحیم ولایتی کے بعد) (حضرت میانجی نور محمد صاحبؒ جھنجھانوی (کا اگلا مقام اور نمبر ہے)

حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ — حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ تھانوی — حضرت ملا نا شیخ محمد صاحب محدث تھانوی

حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی — حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتویؒ
بانی دار العلوم دیوبند — حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بن
مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی

حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحبؒ رائے پوری (سہارنپوری)

مرشدی حضرت مولانا عبد القادر صاحبؒ خلیفہ رائے پوریؒ

راقم الحروف محمد انوار الحسن شیرکوٹی

معنف کتاب ہذا پروفیسر اسلامیہ کالج لائل پور

بتاریخ ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۶۰ء

بعد نماز جمعۃ الوداع حضرت مولانا عبد القادر صاحبؒ سے مسجد میونسپل کالج لائل پور میں بیعت ہوا۔

چوتھا حصہ:

فکرِ معاش، ملازمت اور عائلی زندگی

(۱۲۶۸ھ/۵۱-۱۸۵۰ سے تا وفات ۱۲۹۷ھ/۲۰ اپریل ۱۸۸۰ء)

ہم نے گذشتہ اوراق میں قاسم العلوم والخیرات ؒ کے خاندانی و وطنی، تحصیل تعلیم، منزل سلوک کے تین دور پیش کیے ہیں۔ اب ہم آپ کے سلسلہ معاش پر مختصر بحث کریں گے کہ آپ کی کسب معاش کی داستان بھی مختصر ہے۔ اور ایک درویش صفت اور ولایت شعار قناعت پسند کی دنیا ہی خود بیحد مختصر اور محدود ہوتی ہے۔ انہیں دنیا کے مال و دولت اور کسب زر سے نفرت تھی۔

والدین تو خدا جانے کیا کیا امیدیں لگائے بیٹھے تھے مگر اس گدائے بے نوا کے پاس کچھ بھی نہ تھا ہاں دوسری دولت کے بے شمار خزانے تھے یعنی ملک عقبیٰ اور آخرت کے خزانے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس کے دل میں فقر سے محبت ہو جس کا اوڑھنا بچھانا عشقِ مولیٰ ہو اس کے دل میں دنیا کی محبت نہیں آسکتی۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

اس دور میں جو شخص دہلی پڑھ آئے۔ تعلیم مکمل کرلے اور عربک کالج سے بھی اک گونہ نسبت رہی ہو اس سے تو کسی صدر الصدوری، سکول کی انسپکٹری، ڈپٹی کلکٹری کی امید رکھنا بے جا نہیں۔ چنانچہ والد محترم شیخ اسد علی صاحب نے کہا بھی۔ حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

> ”جس زمانے میں نکاح ہوا اور والد کو یہ خیال تھا کہ ابنائے زمانہ کی طرح جب فکر ہوگا آپ نوکری کر ہی لیں گے اور بعد گذرنے کتنی مدت کے کچھ نہ کیا تب مایوس ہوگئے اور ان کو اس بات کا بہت رنج تھا کہ اور بھائی پڑھ کو نوکر ہو گئے کوئی پچاس کا کوئی سو کا، کوئی کم کوئی زیادہ سب خوش وخرم ہیں اور ان کا حال ویسا ہی ہے اور آمدنی اراضی کی مکتفی خرچ کو نہ ہوتی تھی جناب حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ سے شکایت کی کہ بھائی میرے تو یہی ایک بیٹا تھا اور مجھے کیا کچھ امیدیں تھیں کچھ کماتا تو ہمارا یہ افلاس دور ہو جاتا تم نے اسے خدا جانے کیا کر دیا کہ یہ نہ کچھ کماتا ہے نہ نوکری کرتا ہے۔ حضرت اس وقت تو ہنس کر چپ ہو رہے پھر کہلا بھیجا کہ یہ شخص ایسا ہونے والا ہے کہ وہ سو پچاس والے سب اسکی خادمی کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اسی کا نام سب طرف پکارا جائے گا۔ اور تم تنگی کی شکایت کرتے ہو خدا تعالیٰ بے نوکری ہی اتنا کچھ دے گا کہ ان نوکروں سے یہ اچھا رہے گا۔ جناب بھائی اسد علی صاحب کی زندگی ہی میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور مولوی صاحب سے بہت خوش انہوں نے انتقال کیا۔ اور تصدیق اس پیش گوئی کی اپنی آنکھ سے دیکھ گئے۔ قدر مریدوں کی پیر ہی پہچانے اور جو ایسی نظر رکھے وہی جانے۔“ (سوانح قاسمی از عارف باللہ مجتبائی صفحہ ۱۳-۱۴)

قاسم العلوم مطبع احمدی دہلی میں:

(۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء سے ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء تک)

ہمارے اس عنوان کا ربط عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی نوشتہ سوانح قاسمی کی اس عبارت سے قائم کیجئے۔ جبکہ ۱۱/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/ ۵۱-۱۸۵۰ء میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ جس مکان میں وہ رہتے تھے اسی میں قاسم العلومؒ کا قیام ان کے ساتھ تھا ان کے انتقال پر مولانا محمد یعقوبؒ صاحب اپنے مکان واقع کوچہ چیلاں دہلی میں منتقل ہو گئے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ بھی ان کے پاس جا رہے۔ ایک سال تک دونوں کا قیام اسی مکان میں رہا گویا پورا ۱۲۶۸ھ/ ۵۲-۱۸۵۱ء کا سال بھی دونوں کا کوچہ چیلاں کے مکان میں ساتھ گذرا بعد ازاں مولانا محمد یعقوب صاحب ملازمت پر اجمیر چلے گئے

اور دہلی کو خیر باد کہا۔ قاسم العلومؒ کچھ عرصے تک تنہا یہیں رہے۔ اس کے بعد حضرت عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ’’پھر چھاپہ خانے میں جا رہے۔ پھر دار البقا میں چند روز رہے۔‘‘

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۸ مطبع مجتبائی)

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۹ھ مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء میں ایک سال کے بعد وہ مولانا احمد علی صاحبؒ کے مطبع میں کام کرنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ محدث سہارنپوری کی شاگردی اختیار کر چکے ہیں۔ اسی وجہ سے مطبع احمدی مملوک مولانا احمد علیؒ صاحب سے تعلق ہوا۔

مطبع احمدی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے حالات:

مطبع احمدی میں آپ تصحیح کتب کا کام فرماتے تھے ’’تذکرہ علمائے ہند‘‘ کے مصنف اپنے تذکرہ کے صفحہ نمبر ۴۹۵ پر لکھتے ہیں:

> ’’(مولانا محمد قاسم صاحب نے) مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا مشغلہ اختیار کر لیا۔‘‘

آپ کو نام و نمود سے قطعاً نفرت تھی۔ مولویانہ وضع و قطع، جبہ و دستار جس سے عالمانہ سج دھج مقصود ہو آپ اس سے کوسوں دور تھے۔ مولوی بھی کہلانا اپنے لئے پسند نہ فرماتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ لکھتے ہیں:

> ’’بعضے احباب کی زبانی سنا ہے کہ چھاپہ خانے میں جناب مولوی احمد علی صاحب کے جب مولوی صاحب کام کیا کرتے تھے مدتوں یہ لطیفہ رہا کہ لوگ مولوی کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں۔ کوئی نام لے کر پکارتا خوش ہوتے تعظیم سے نہایت گھبراتے۔ بے تکلف ہر کسی سے رہتے اب تک جو شاگرد یا مرید تھے ان سے یارانہ کے طور پر رہتے اور کچھ اپنے لئے صورت تعظیم کی نہ رکھتے۔ علماء کی وضع عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔‘‘
>
> (سوانح قاسمی صفحہ ۸)

قاسم العلومؒ کا علمی شاہکار زندگی:

یوں تو حضرت قاسم العلومؒ والخیرات کی ساری زندگی ہی بجائے خود شاہکار ہے لیکن آپ کے علمی تصنیفی کارناموں میں مطبع احمدی کے دوران قیام میں بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کے حواشی آپ کا مایہ ناز شاہکار ہیں۔ آپ کے استاد محترم مولانا احمد علی صاحبؒ نے بخاری شریف کا حاشیہ لکھا جیسا کہ ہم ان کے حالات میں گزشتہ صفحات میں لکھ چکے ہیں۔ پانچ چھ پارے جو آخر کے باقی رہ گئے تھے ان کے حواشی محدث سہارنپوریؒ نے حضرت قاسم العلومؒ سے لکھوائے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں (جبکہ مولانا محمد قاسم صاحب تعلیم سے فارغ ہو کر مطبع احمدی میں تصحیح کتب کا کام کرتے تھے) جناب مولانا احمد علی صاحبؒ سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے مولوی (محمد قاسم صاحبؒ) کے سپرد کئے۔ مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے جناب مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا کہ آ کر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا۔ اس پر مولوی احمد علی صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دیکھایا جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے۔ علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں۔ اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کیسا حاشیہ لکھا ہے۔ اور اس حاشئے میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔'' (سوانح قاسمی مطبع مجتبائی صفحہ ۹)

بیس پچیس سال کے درمیان کی نوجوانی کی عمر میں اتنا بڑا کارنامہ علم کی رفعتوں کا کتنا بڑا نشان ہے گویا قاسم العلومؒ والخیرات کی ابتدا ہی انتہا بن گئی۔ اور لوگوں کی یہ حیرانی کہ ''آخر

کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔" بجائے خود علمی کرامت ہے۔ لیکن ہمیں تو اس پر حیرانی ہے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ نے مقدمہ بخاری اور خاتمہ طباعت پر سب کچھ لکھا مگر قاسم العلومؒ کے اس شاہکار کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اگر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنی مصنفہ سوانح قاسمی میں اس حقیقت کا اظہار نہ کر جاتے تو مولانا کا شاہکار اپنی گمنامی پر سر پیٹ لیتا۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ قاسم العلوم والخیراتؒ نے اپنے اس کام کے نام کو قطعاً گوارا نہ کیا ہوگا۔ لیکن اگر مولانا احمد علی صاحبؒ خبر کئے بغیر ٹائٹل پر ان کا بھی نام لکھ دیتے تو استاد کے ساتھ شاگرد کا نام بھی رہتا لیکن ہماری یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بخاری کا حاشیہ اور راقم الحروف کا خواب:

ابھی مولانا مناظر احسن صاحبؒ گیلانی نے سوانح قاسمی نہ لکھی تھی کہ راقم الحروف حضرت قاسم العلومؒ پر آپ کے علمی اور زندگی کے حالات لکھ چکا تھا۔ لیکن اب تک طبع نہ ہو سکے تھے۔ جب میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے بخاری کے ان حواشی کی تحقیقات ان دنوں میں کر رہا تھا تو مجھے مولانا احمد علی کے لکھے ہوئے بخاری کے مقدمے اور خاتمے میں اس قسم کا کوئی نشان نہ ملا اور ایک مرتبہ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک مطالعہ کرتا رہا اور یہ ۲۵ اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب تھی کہ اسی شب میں، میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے آکر مجھے خبر دی کہ فلاں بستی میں حضرت نانوتویؒ تشریف لائے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ سر پر پگڑی ہے اور موٹے سے کپڑے کا انگرکھا پہنے ہوئے ہیں۔ آپ کے پاس ہی برابر میں حضرت گنگوہیؒ بھی تشریف فرما ہیں میں نے حضرت نانوتویؒ اور گنگوہیؒ سے مصافحہ کیا اور قاسم البرکات سے عرض کیا کہ بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے حواشی کیا آنجناب نے لکھے ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا ہے ہوں گے بھائی۔ یعنی ٹالنے کی کوشش کی میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو بتائے ہی بنے گی اس پر حضرت نے فرمایا ہاں بھائی وہ میرے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ بہرحال مطبع احمدی کے دوران قیام میں حضرت والا کا یہ بہت ہی بڑا ابتدائی مگر انتہائی شاہکار ہے۔

کوچہ چیلاں سے پانچ سال بعد ۱۲۷۳ھ/ ۵۷-۱۸۵۶ء میں:

قاسم العلوم والبرکات مطبع احمدی اور کچھ عرصہ دارالبقا کے بعد اپنے وطن نانوتہ تشریف لے آئے۔ گویا ۲/ محرم ۱۲۶۰ھ مطابق ۴۴-۱۸۴۳ء سے لے کر ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء تک کل تیرہ سال دہلی رہے جس میں سے مولانا مملوک علی صاحبؒ کی وفات ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء تک کسی نہ کسی شکل میں تعلیم میں مصروف رہے اور ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء سے ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۶ء تک کوچہ چیلاں کے مکان اور مطبع احمدی نیز دارالبقا میں وقت گذارا۔ یہ حساب عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحریر سے بنتا ہے۔ وہ تحریر میں فرماتے ہیں کہ والد صاحب کی وفات ۹/ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کے بعد میں اپنے مملوک مکان واقع کوچہ چیلاں میں چلا آیا۔ مولانا بھی میرے ساتھ آ رہے۔ ایک سال یعنی ۱۲۶۸ھ کے ختم ہونے کے بعد پانچ سال تک جدائی رہی کیونکہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اجمیر کی ملازمت پر چلے گئے آپ تحریر فرماتے ہیں:

> ”ایک سال کے قریب (بعد انتقال والد مرحوم) احقر دہلی رہا پھر اجمیر کی نوکری کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب سے جدائی پیش آئی۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۹۰)

آگے چل کر عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ”پانچ برس تک پھر ملاقات مولوی صاحب سے نہیں ہوئی۔“

(سوانح قاسمی صفحہ ۹)

پانچ سال یعنی ۱۲۶۹ھ سے لے کر ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۶ء کے بعد ۱۲۷۴ھ مطابق ۵۷-۱۸۵۶ء میں ۱۱/ مئی سے پہلے جب مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اجمیر سے بنارس اور بنارس سے رڑکی کی ملازمت پر تشریف لائے ہیں تب دونوں کی ملاقات ہوئی۔ چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ”جب احقر بنارس سے وطن کی طرف پہنچا اتفاق نانوتہ جانے کا نہ ہوا۔ دیوبند میں اہل و عیال کو چھوڑ کر رڑکی چلا گیا وہاں کام نوکری کا کرنے لگا۔ اتفاق گھر جانے کا نہ ہوا۔ مولوی صاحب گھر (نانوتے) تھے۔ میں نے عرض کر بھیجا کہ ملنے کو جی چاہتا ہے اور

> مجھے فرصت نہیں خود پیادہ پا دو منزلہ کر کے احقر کے ملنے کو تشریف لائے۔ اور ہمیشہ جب تک قوت تھی کبھی سواری کی طرف رخ نہ تھا۔ اسی عرصے میں غدر ہو گیا بعد رمضان احقر کو سہارنپور ملنے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن وار ساتھ تھے۔ اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا۔ جب احقر وطن پہنچا چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۱۷)

معلوم ہوا کہ ہنگامہ آزادی سے پہلے ہی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ رڑکی پہنچ چکے ہیں اور قاسم العلومؒ بھی نانوتے میں موجود تھے۔ رمضان المبارک میں ہنگامہ شروع ہوا اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سہارنپور آ گئے ہیں۔ یہاں سے نانوتہ پہنچنا دشوار تھا۔ رڑکی کی ملاقات کے بعد دوبارہ ان کو قاسم العلومؒ پس از رمضان سہارنپور لینے کیلئے آئے ہیں۔

مطبع احمدی کے بعد نانوتے میں قیام:

دہلی سے قاسم العلومؒ نانوتہ تشریف لا کر ۱۲۷۴ھ ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۵۷۔۱۸۵۶ء تا ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء چار سال وطن میں اور کبھی دیوبند، اقامت پذیر رہے اسی اثناء میں ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء وقوع میں آیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس وقت میں (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) دیوبند املیا وغیرہ مختلف جائے پر متفرق اوقات میں رہے۔ بوڑیہ، گنہلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ جمنا پار کئی دفعہ گئے آئے ہیں۔''

(سوانح قاسمی صفحہ ۱۹)

یہی سال ان دونوں حضرات کے پانچ سال جدا رہنے کے بعد باہم کر دوبارہ ملاقات کرنے اور یکجا رہنے کا حال ہے۔

حج کو روانگی اور واپسی:

اس کے بعد مولانا قاسم العلومؒ ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو نانوتے سے روانہ ہو کر مکہ معظمہ پہنچے۔ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنی بیاض میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۶ نومبر ۱۸۶۰ء کو ڈیڑھ پہر دن چڑھے جمعرات کے دن نانوتے سے روانہ ہو کر (میں اور مولانا محمد قاسمؒ) حج کے لئے روانہ ہوئے۔“

(ماخوذ از بیاض یعقوبی ضمیمہ مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۲۸)

یہ تو روانگی کی تاریخ تھی لیکن واپسی کے متعلق سوانح قاسمی میں عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ میں روانہ ہوئے اور آخر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے۔ اول سفر مراجعت کی اسی مہینے کے آخر میں جہاز میں بیٹھے۔ ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے۔ جمادی الثانی تک وطن پہنچے۔“

(سوانح قاسمی صفحہ ۱۹۔۲۰)

حج سے واپسی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء پر پھر نانوتے اور مطبع مجتبائی میرٹھ میں:

ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی پر حج کے اثنا میں جب مجاہدین جنگ آزادی کی عام معافی کا اعلان ہوا تو سب نے آزادی کا سانس لیا اور اب آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملا۔ قاسم العلومؒ والخیرات کو مطبع احمدی میں کام کرنے کا موقع نہ رہا تھا کہ وہ ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نذر فتنہ ہوا۔ اس لئے منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع مجتبائی میرٹھ میں کہ وہ مولانا کے دوست تھے تصحیح کا کام شروع کیا۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”(ہمارے حج کو جانے کے) پیچھے بعد تحقیقات سرکار نے مطالبہ عام اٹھا دیا تھا۔ چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار کا شبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔ پھر (مولانا محمد قاسم صاحب) گھر پر اپنے رہے۔ غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم و برہم ہو گیا تھا مولوی احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا تھا۔ اس زمانے میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی کبھی وطن اور کبھی دیو بند رہتے۔ اسی وقت میں احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی۔
>
> پھر منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا۔ مولوی صاحب کو پرانی دوستی کے سبب بلا لیا وہی تصحیح کی خدمت تھی۔ یہ کام برائے نام تھا۔ مقصود ان کا مولوی صاحب کو اپنے پاس رکھنا تھا۔ احقر اس زمانے میں بریلی اور لکھنو ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپے خانے میں نوکر ہو گیا۔ منشی جی (ممتاز علی) حج کو گئے تھے۔“

درس مسلم شریف:

"اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی۔ احقر بھی اس میں شریک رہا۔"

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۲۱)

گویا حضرت قاسم الخیراتؒ اور حضرت عارف باللہ دونوں ایک جگہ مطبع مجتبائی میرٹھ میں ہی ساتھ کام کرنے لگے۔ بلکہ منشی ممتاز علی کے حج کے جانے کے بعد بھی مجتبائی سے متعلق رہے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اپنے ایک خط بنام مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں مکہ معظمہ سے لکھتے ہیں:

> از دریافت جمع بودن یکجا آں عزیز و مولوی محمد قاسم صاحب (در مطبع مجتبائی میرٹھ) بسیار خوشنود گردیدم کہ در اجتماع خیر و برکت می شود فی الجماعۃ برکۃ خصوصاً آنکہ ہم مشرب و ہم مذہب باشند فائدہ از یک دیگر رامی باشد۔"

(مکتوبات امدادیہ ضمیمہ امداد المشتاق صفحہ ۲۳۶)

> آن عزیز اور مولوی محمد قاسم کے (میرٹھ کی ملازمت) میں یکجا ہو جانے کی خبر پا کر بہت خوش ہوا کیونکہ اکٹھے رہنے میں خیر اور برکت ہوتی ہے جماعت میں برکت ہے خاص طور پر جبکہ ایک ہی خیال اور ایک ہی طور کے ہوں تو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔

ان دونوں حضرات کا مطبع مجتبائی میرٹھ میں اجتماع یقیناً ۱۲۸۳ھ میں اور اس سے پہلے رہا ہے۔ چنانچہ عارف باللہ اس اجتماع کے ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔"

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۱)

اور ظاہر و محقق ہے کہ دار العلوم دیوبند کی بنیاد ۱۵/ محرم ۱۲۸۳ھ بمطابق ۱۸۶۷ء کو ہوئی لہٰذا مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس زمانے میں مطبع مجتبائی میرٹھ میں تھے جبکہ دار العلوم کی ابتدا ہوئی۔

منشی ممتاز علی صاحب سے قدرے تعارف:

منشی ممتاز علی نزہت رقم اپنے عہد کے مشہور خوشنویس تھے۔ ان کے دو بیٹے منشی مشتاق علی اور منشی عبد الغنی نے بھی باپ کا فن حاصل کیا تھا۔ منشی مشتاق علی بالخصوص عربی خط میں

بڑے ماہر تھے۔ میرے کتابت کے استاذ محترم مولانا اشتیاق احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے منشی محبوب علی صاحب میرٹھی سے خوشنویسی سیکھی۔ منشی محبوب علی کو میں نے مطبع قاسمی دیوبند میں دیکھا ہے وہ منشی ممتاز علی کے شاگرد تھے اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے دوست تھے اسی لئے مطبع قاسمی میں جو دیوبند میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا تھا اور جس میں بندہ بھی دو سال رہا ہے ملازم تھے۔ انہوں نے مولانا اشتیاق احمد صاحب سے بیان کیا کہ منشی ممتاز علی نے بہادر شاہ ظفر سے خط کی اصلاح کی ہے۔ مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے بھی خط نسخ اور نستعلیق مولانا اشتیاق احمد صاحب سے تین سال دیوبند میں سیکھا اور الحمد اللہ خوب لکھ لیتا ہوں۔ اس فن میں کسی کا محتاج نہیں۔ اپنے اشعار بناتا ہوں اور خود لکھ کر آئینے میں جڑوالیتا ہوں۔ الحاصل انوار الحسن نے کتابت مولانا اشتیاق احمد صاحب سے، انہوں نے منشی محبوب علی صاحب میرٹھی سے، انہوں نے منشی ممتاز علی صاحب میرٹھی سے اور انہوں نے بہادر شاہ ظفر، شاہ دہلی سے حاصل کی۔ منشی ممتاز علی صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک قرآن کریم لکھا تھا۔ جس پر دو ترجمے ایک فارسی کا حضرت شاہ ولی اللہؒ کا اور اردو کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کا تھا۔ حاشئے پر تفسیر عباسی تھی بندے کے پاس دادا صاحب شیخ محمد حسنؒ کا خریدا ہوا یہ قرآن کریم والد صاحب مرحوم شیخ احمد حسنؒ صاحب کے ذریعے مجھ تک پہنچا۔ بڑا پیارا خط اور حنائی قرآن شریف تھا اس کی تصحیح حضرت قاسم العلومؒ نے کی تھی جس کا ذکر آخر میں درج تھا۔ افسوس صد افسوس کہ میرا یہ قرآن کریم ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں کپور تھلے رہ گیا جہاں میں رندھیر کالج کپور تھلہ میں پروفیسر تھا۔

قاسم العلومؒ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء سے ۱۲۸۵ھ/ ۶۹-۱۸۶۸ء تک مطبع مجتبائی میرٹھ میں:

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ قاسم البرکاتؒ کو ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء سے ۱۲۸۵ھ مطابق ۶۹-۱۸۶۸ء یعنی سات سال تک منشی ممتاز علی کے مطبع میں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ کیونکہ قاسم العلومؒ ۱۲۸۵ھ مطابق ۶۹-۱۸۶۸ء میں دوبارہ حج کو تشریف لے گئے ہیں۔

حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

"۱۲۸۵ھ میں مولانا کو حج کی سوجھی چند رفقا کو ساتھ لے کر حج کر آئے اور منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی بقصد قیام عرب کو گئے مگر ایک سال بعد واپس آ گئے۔"

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۱)

ایسا نہیں ہے کہ قاسم العلوم مطبع مجتبائی میں مسلسل رہے ہوں۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے ۱۲۸۳ھ میں جو ایک خط مولانا محمد قاسم صاحب کو لکھا ہے کہ ضیاء القلوب کو مطبع مجتبائی میرٹھ میں چھپوانے کیلئے خود تکلیف کریں اس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے۔

مولوی محمد قاسم صاحب بشرطیکہ ہیچ حرج و تکلیف نشو خود میرٹھ رفتہ در پیش نظر خویش بصحت تمام مع تحشیہ وغیرہ در مطبع منشی ممتاز علی صاحب طبع کنانند۔

(مرقومات امدادیہ آخر امداد المشتاق صفحہ ۲۴۹)

مولوی محمد قاسم صاحب بشرطیکہ کوئی حرج اور تکلیف نہ ہو خود میرٹھ جا کر اپنے سامنے پوری صحت کے ساتھ مع حاشیہ وغیرہ منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں طبع کرائیں۔

اس خط کی عبارت سے معلوم ہوا کہ مطبع مجتبائی میرٹھ سے بھی تعلق میں تسلسل نہیں ہے۔

قاسم البرکات ۱۲۸۶ھ/ ۷۰-۱۸۶۹ء میں مطبع ہاشمی میں:

۱۲۸۵ھ کے حج کے بعد جب حضرت قاسم العلوم والبرکات واپس تشریف لائے ہیں تو ۱۲۸۶ھ کے غالباً آخر میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں آپ نے کچھ دنوں کام کیا ہے۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

"منشی جی (ممتاز علی) کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا۔"

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۱)

نہ صرف ۱۲۸۶ھ میں قاسم الخیرات مطبع ہاشمی میں کام کرتے تھے بلکہ ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ مطابق ۷۲-۱۸۷۱ء میں وہ مطبع ہاشمی سے متعلق ہیں۔ عارف باللہ اپنے ایک خط میں جو اپنے مرید منشی محمد قاسم صاحب نیانگری کو ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۸ھ کو لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں:

”جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی میرے ہم زلف..........ان دنوں میرٹھ میں مطبع ہاشمی میں کچھ علاقہ کرلیا ہے وہاں کام کرتے ہیں۔“ (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۵۷)

قاسم العلومؒ ۱۲۸۶ھ/ ۷۰۔۱۸۶۹ء میں مطبع مجتبائی دہلی میں بھی:

ہمارے پاس باور کرنے کیلئے یہ یقینی ثبوت ہے کہ ۱۲۸۶ھ میں حضرت عارف باللہ کے قول کے مطابق کہ منشی ممتاز علی کے پیچھے مولانا نے مطبع ہاشمی میرٹھ میں کام کیا۔ آپ نے مطبع مجتبائی میں بھی ۱۲۸۶ھ میں کام کیا ہے۔ کیونکہ راقم الحروف کی نظر سے خانقاہ سراجیہ کندیاں ضلع میانوالی پاکستان کے کتب خانے میں ۱۱/ جولائی ۱۹۶۵ء مطابق ۱۱/ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ بروز پیر ایک چھوٹی حمائل شریف گذری جس کے آخر میں حسب ذیل تحریر موجود ہے:

حمائل شریف مطبع مجتبائی دہلی ۱۲۸۶ھ

بتصحیح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نظم وادہ قلم پرتو پذیر اشراقات ملہم مولوی محمد قاسم مدظلہ

حمائل کز شرف وارد شرف بر حاصل کانہا   کہ ایں جان است و بر جان است صد گونہ بلا زانہا
نوشت و طبع زو نزہت رقم ممتاز علی قاسم   صحیحش کروزاں گروید تعویذ دل و جانہاں

مادہ تاریخ طبع از مصحح مطبع مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ

اما لامثل لہ ولا مثال لہ

۱۲۸۳ھ
محــــمد
ممتاز علی

ازمولانا محمد قاسم صاحب قطعہ تاریخ دیگر

چھپائی وہ حمائل کہ اگر جان کے لب ہوں   بے ساختہ بول اٹھے کہ مرغیب چھپی ہے
۱۲   ۸۳

میں نے بھی کہا مدح میں اور کیونکہ نہ کہئے   کہتے ہیں بہ تکرار عدد خوب چھپی ہے
۱۲۸۶=۶۴۳+۶۴۳

اک راحت دل، راحت دل ہے مضاعف کیا لکھئے کہ کیا عمدہ خوش اسلوب چھپی ہے
۱۲۸۶=۶۴۳+۶۴۳ ۸۶ ھ ۱۲
کیا کہئے حمائل کی بہت خوب ہے چھاپی کیا کہتے ہیں پاکیزہ بہت خوب چھپی ہے
۸۶ ھ ۱۲ ۱۲۸۶

قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی ممتاز علی نے دہلی میں بھی ۱۲۸۶ھ میں حمائل شریف لکھ کر مطبع مجتبائی سے چھپوائی ہے اور اس کی تصحیح مولانا محمد قاسم صاحب نے کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی ممتاز علی نے میرٹھ سے مطبع مجتبائی دہلی میں منتقل کیا ہے وہیں یہ حمائل چھپی ہے اور بعد ازاں مطبع مجتبائی بیچ کر مطبع مصطفائی کھولا ہوگا۔ کیونکہ مطبع مجتبائی کا میرٹھ میں فروخت کرنا ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ مولانا گیلانی نے تحریر فرمایا ہے۔ کیونکہ اس حمائل شریف پر بھی مہر منشی ممتاز علی کی لگی ہوئی ہے جو انہوں نے ۱۲۸۳ھ میں بنوائی ہے۔

مطبع مصطفائی دہلی میں:

مولانا مناظر احسن گیلانی سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں کہ جب منشی ممتاز علی صاحب ہجرت کے ارادے سے عرب کو چلے گئے تھے تو مطبع مجتبائی بیچ گئے تھے۔ اس لئے:

> ”مطبع مصطفائی کے نام سے دلی ہی کے محلے کھڑکی تفضل حسین وکٹوریہ زنانہ ہسپتال میں منشی جی مرحوم نے دوسرا نیا مطبع جاری کیا۔“

(سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۵۳۵ جلد اول)

حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے:

> ”پھر مولوی صاحب دہلی گئے منشی جی (ممتاز علی) کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا۔“

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

> ”اس کا مطلب یہی ہے کہ میرٹھ کے مطبع ہاشمی سے قطع تعلق کر کے منشی جی کی وجہ سے آپ پھر ان ہی کے نئے مطبع مصطفائی میں کام کرنے کیلئے دلی تشریف لے گئے مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب خلف الرشید مولانا کفایت اللہ صاحب نے بھی اپنے مکتوب سامی میں لکھا ہے کہ منشی ممتاز علی صاحب عرب سے ہندوستان واپس آئے اور اپنا مطبع دہلی

میں جاری کیا تو مولانا (محمد قاسم صاحب) کو بھی میرٹھ سے دہلی لے آئے۔“

(سوانح از گیلانی جلد اول صفحہ ۵۳۵)

اس عبارت سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ قاسم الخیرات نے مطبع مصطفائی دہلی میں بھی کام کیا ہے۔

۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں قاسم العلومؒ علیگڑھ میں:

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ نے علیگڑھ میں بھی مولوی اسماعیل صاحب کو جو علیگڑھ کے ایک رئیس تھے ان کی درخواست پر ان کو پڑھایا ہے۔ مولانا گیلانی سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

> ”مولوی محمد اسماعیل صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ کسی عالم کو حضرت کے نزدیک قابل اعتماد ہوں علیگڑھ بھیج دیا جائے تا کہ میں ان سے حدیث پڑھوں۔ جواب میں مولانا نے ارقام فرمایا کہ اور کسی عالم کو اپنے کاموں سے فرصت کہاں ہے جو آپ کے پاس جانے کو راضی ہو سکتے ہوں البتہ ایک بیکار آدمی خود یہ فقیر ہے حکم ہو تو بندہ ہی حاضر ہو کر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔“ (سوانح از گیلانی جلد اول صفحہ ۴۲۸)

مولانا گیلانی نے یہ روایت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی سے کی ہے جو حیدر آباد دکن میں حکومت آصفیہ کے صدر الصدور تھے۔ راقم الحروف نے بھی ان صدر الصدور کو کئی دفعہ دیوبند میں دیکھا اور تقریریں بھی سنی ہیں۔ لیکن مجھے ان کی روایت کے اس حصے سے تو اتفاق ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ نے ان کو علیگڑھ تشریف لے جا کر پڑھانے کا وعدہ تو ضرور کیا مگر بار بار کے اصرار پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک گرامی نامے میں جو مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ شاگرد عزیز کو لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> در اوائل عشرہ ماہ گذشتہ پس از ردو کد بسیار انجام کار رفتن کول تا اختتام بخاری و صحیح مسلم قرار یافتہ بود۔ (سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۴۳۰ جلد اول)

آخر کار بخاری اور صحیح مسلم کے ختم ہونے تک کول (علیگڑھ کا پرانا نام) کا جانا بہت

ردو کد کے بعد طے پایا۔

یہ ردو کد کا لفظ بتاتا ہے کہ آپ نے بڑے اصرار کے بعد وہاں کا جانا منظور کیا ہے مولانا گیلانی اسی مولانا فخر الحسن صاحب کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اس عشرہ موعودہ میں قاسم العلومؒ علیگڑھ تشریف نہ لے جاسکے۔ کچھ عرصے کے بعد عید کی پندرھویں یا سولہویں کو جلسہ تقسیم انعام دارالعلوم دیوبند میں شرکت فرمائی۔ پھر قاسم العلوم لکھتے ہیں کہ میں میرٹھ پہنچا اور ایک رات وہاں گذار کر خورجے میں دو راتیں گذاریں اور خط کے آخر میں ہے:

امروز روز یازدہم است غالباً کہ دریں جا رسیدہ ام۔

آج گیارہواں دن ہے غالباً کہ میں یہاں (علیگڑھ) پہنچا ہوں۔

اسی خط میں مولانا فخر الحسن صاحب کو کہ وہ کسی مقام پر ہیں اور وہاں سے علیگڑھ سے بچ کر راستہ دیوبند کو جاتا ہے اور وہ شیخ الہند محمود حسن صاحب کی شادی میں شرکت کے لئے پہنچ رہے ہیں۔ قاسم العلومؒ لکھتے ہیں:

غالباً بہ تقریب نکاح مولوی محمود حسن تا بدیوبند قدم رنجہ فرمایند۔ (قاسم العلوم)

غالباً مولوی محمود حسن کے نکاح کی تقریب میں دیوبند قدم رنجہ فرمائیں۔

اور پھر بقول گیلانی خاتمہ خط میں قاسم العلوم تحریر فرماتے ہیں:

افسوس کہ کول از راہ بیکسو افتادہ است۔

افسوس کہ علیگڑھ راستے سے علیحدہ واقع ہے۔

بہر حال حضرت قاسم العلومؒ علیگڑھ بھی قیام پذیر رہے اور اس اثنا میں مولوی محمد اسماعیل صاحب کو بخاری اور مسلم شریف پڑھاتے رہے۔ یہ کونسا زمانہ تھا جب آپ علیگڑھ تشریف لے گئے اس کا پتہ شیخ الہندؒ کی شادی کی تاریخوں سے ہوسکے گا حضرت استاذی مولانا اصغر حسین صاحبؒ تلمیذ شیخ الہند حیات شیخ الہندؒ میں لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند ۱۲۶۸ھ میں عالم ظہور میں تشریف لائے۔ .... بائیس سال کی عمر میں محترم والد ماجد نے .... رئیس منشی فہیم الدین صاحب کی صاحبزادی سے .... حضرت مولانا کی شادی کردی۔"

(حیات شیخ الہند صفحہ ۱۵۸)

اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں شیخ الہند کی شادی ہوئی اور اسی ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں آپ نے علیگڑھ میں قیام فرمایا ہے۔

تنخواہ:

آپ نے دس پندرہ روپیہ یا کم وبیش تنخواہ پر مطابع میں اپنی زندگی بسر کردی۔

حضرت عارف باللہ قاسم العلوم کی شادی کے بعد کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”اب نوکری آپ نے اگر کی تو کیا کی کسی چھاپے خانے میں چار پانچ روپیہ کی تصحیح کی خدمت قبول کی۔“ (سوانح قاسمی مطبوعہ مجتبائی صفحہ ۱۲)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں:

> ”مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تنخواہ تو مطبع مجتبائی میں دس ہی روپیہ تھی۔“

(جمیل الکلام صفحہ ۳۹)

ایک اور جگہ حضرت تھانوی فرماتے ہیں:

> ”مولانا (محمد قاسم صاحب) مطبع مجتبائی میں دس روپیہ کے ملازم تھے اور اصل میں یہ بات تھی کہ مالک مطبع (منشی ممتاز علی) مولانا کی کچھ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مولانا نے ویسے تو منظور نہیں فرمایا اور یہ فرمایا کہ کچھ کام لو اور یہ بھی فرمایا کہ کاموں میں تو لیاقت کی ضرورت ہے میں اس قابل نہیں ہوں۔ ہاں قرآن شریف کو منقول عنہ سے مقابلہ کر سکتا ہوں اس میں لیاقت کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے زیادہ پیش کرنا چاہا مگر مولانا نے انکار فرمادیا۔ اس زمانے میں مولانا نے حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) سے اجازت چاہی کہ ترک ملازمت کرکے توکل کرلوں۔ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) نے (مکہ مکرمہ سے) فرمایا مولانا ابھی تو آپ پوچھ ہی رہے ہیں اور پوچھنا دلیل ہے تردد کی اور تردد دلیل ہے خامی کی اور خامی کی حالت میں توکل بمعنی ترک اسباب جائز نہیں اور جب پختگی ہوجائے گی پوچھنا چہ معنی لوگ پکڑیں گے اور آپ رسے تڑائیں گے۔“ (جمیل الکلام صفحہ ۲۱)

توکل:

اس دور میں جبکہ آپ نے حاجی صاحب سے ترک ملازمت کے لئے عرض کیا ہے توکل کا ارادہ تو پختہ تھا مگر مرشد سے اجازت چاہنا از راہ سعادت مندی تھا ورنہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۸ء تک تین سال تک تو کچھ بھی نہیں کیا گھر کی معمولی سی زمین کی آمدنی اور توکل پر ہی کام چلایا۔

ہدایا و تحائف:

حضرت قاسم الخیرات کی ذات آسمان یا شہرت پر پہنچ چکی تھی بالخصوص دار العلوم دیوبند کی سرپرستی کے زمانے میں کہ اطراف و جوانب سے نواب اور روسا آتے اور ہدایا پیش کرتے مگر بڑے لوگوں کی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ آپ نے میرٹھ کے رئیس صاحب لال کرتی والوں کا ذکر گذشتہ اوراق میں پڑھا ہی ہے لیکن غریبوں کے مخلصانہ تحفے بڑی خوشی سے لیتے اور وہ بھی اس لئے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو۔

تقسیم تحائف:

ان تحائف اور نذرانوں میں نقد روپیہ، کپڑے اور زیور بھی ہوتے تھے لیکن آپ دوسروں کو تقسیم کر دیتے تھے اور اپنے لئے بھی قبول فرماتے۔ اب ہم اس سلسلے میں سوانح قاسمی حضرت گیلانی کے حوالے سے چند عبارتیں پیش کرتے ہیں۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی لکھتے ہیں:

۱۔ ''آپ کا مخلص کوئی ادنیٰ شے بھی پیش کرتا تو نہایت خوش ہو کر اس کو قبول فرماتے اور اس کے حق میں دعا دیتے۔'' (سوانح مخطوطہ صفحہ ۲۵ سوانح گیلانی صفحہ ۵۸۱)

۲۔ ''اکثر کھانے پینے پہننے برتنے کی چیزیں عمدہ عمدہ آپ کے پاس ہدیہ میں آتیں۔'' (صفحہ ۲۶)

۳۔ ''جو کچھ بلا طلب آپ کے پاس آتا تھا وہ وقت تھا جس کا جی چاہے کھاؤ پیو۔ فوراً

اپنے شاگردوں اور مریدوں کو تقسیم کر دیتے۔ کبھی اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے کبھی یہ فرماتے کہ جو کسی کو پسند آئے لے لو۔"

(سوانح مخطوطہ صفحہ ۲۴ سوانح قاسمی گیلانی جلد اول صفحہ ۵۸۶)

مولانا منصور علی خان شاگرد رشید لکھتے ہیں:

"کوئی شخص ادنیٰ شے بھی پیش کرتا اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے اور دوسرے حاضرین کو بھی کھلاتے۔" (مذہب منصور صفحہ ۱۹۱)

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عطا فرمایا جو کچھ فتوح (غیبی امداد) ہوتی ان کے حوالے کر دیتے۔" (سوانح قاسمی مطبوعہ مجتبائی صفحہ ۱۶)

حضرت عارف باللہ اور مولانا فخر الحسنؒ صاحب نیز مولانا منصور علی خان صاحب کے ان چشم دید بیانات اور حالات سے معلوم ہوا کہ قاسم الخیرات والبرکات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اتنا رزق کریم عطا فرمایا تھا کہ نہ صرف اپنے لئے وسعت و کشائش کا سبب بنا بلکہ آپ اپنے احباب، اعزا اور حق داروں کو بھی تقسیم فرما دیتے تھے اور اس طرح تمام عمر تک یہ سلسلہ کشائش رزق چلتا رہا کہ آپ کے والد محترم جو آپ سے ابتدا میں مایوس نظر آتے تھے دنیا سے خوش ہو کر گئے جیسا کہ ہم حضرت عارف باللہ کی نوشتہ سوانح قاسمی کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔

قاسم العلومؒ کی ازدواجی زندگی

دیوبند میں شادی:

حضرت قاسم العلومؒ کے والد نے آپ کی نسبت دیوبند کے رئیس گھرانے میں شیخ کرامت حسین کی لڑکی سے کردی تھی مگر آپ نکاح سے بچنے کی کوشش میں رہتے۔ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ”مولوی (محمد قاسم) صاحب نکاح نہ کرتے تھے اور جناب بھائی اسد علی صاحب حضرت کے والد کو ادھر تو ترک نوکری اور اختیار درویشی کا رنج تھا ادھر یہ فکر ہوئی کہ دیوبند رشتہ کیا تھا۔ آخر جناب حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت کے فرمانے سے نکاح پر راضی ہوئے مگر یہ شرط کی کہ تمام عمر زوجہ کے نفقہ اولاد کی پرورش کیلئے کچھ کما لانے کے مجھ سے متقاضی نہ ہوں۔ بیچاروں نے ناچار یہ شرط قبول کی نکاح ہوگیا۔“

نکاح کرنا سنت ہے اور سنت سے اعراض کرنا درست نہیں درآنحالیکہ والد محترم نے رشتہ بھی طے کردیا ہو تاہم اس خیال سے آپ نے اپنے پیر و مرشد کے فرمانے سے رجوع کرلیا اور ترک سنت کی مصیبت سے نکلنا ہوگیا۔ مگر بات تو یہ ہے کہ درویشی اور مخلوق سے پرہیز کی عادت نے آپ کو ایسا کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ اور ایک طرح تو قاسم العلومؒ سچے بھی تھے کہ جو شخص دنیا کو کما کر بیوی کو نان و نفقہ کی ذمہ داری سے گھبراتا ہو وہ نکاح کرے تو کیا کرے۔ دوسری طرف یہ سنت بھی ایسی ہے کہ اس کے ترک پر گناہ نہیں ہوتا بشرطیکہ گناہ سے بچ سکے ورنہ اگر گناہ کے ارتکاب کا خطرہ ہو تو پھر تو فقہا نے صاف کہا ہے کہ

عند التوقان واجب

ترجمہ: یعنی غلبہ شہوت کے باعث گناہ کے ارتکاب کے خطرے کی صورت میں نکاح واجب ہے۔

سال نکاح ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۹ھ:

مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی میں قاسم العلوم والبرکات کی شادی کا سال ۱۸۵۳ء مطابق ۱۲۶۹ھ متعین کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ قاسم العلومؒ نے اپنی شب اول میں اپنی اہلیہ محترمہ کا زیور اور برتن وغیرہ خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی کی روس کے ساتھ کریمیا والی جنگ کے چندے میں دے دینے کی بخوشی اجازت لے لی تھی اس لئے شادی کا تعین ۱۸۵۳ء میں ہوتا ہے کہ یہ جنگ مذکورہ سال میں ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت قاسم العلوم کی عمر جبکہ آپ کی پیدائش ۱۸۳۲ء کی ہے اکیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ کی شادی حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی شادی سے تین سال بعد ہوئی ہے کیونکہ بیاض یعقوبی میں مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں۔ درانحالیکہ قاسم العلوم اور عارف باللہ دونوں ہم زلف تھے۔

> واقعہ ۱۲۹۲ھ شب چہار دہم رمضان المبارک روز جمعہ بوقت نواخت دہ گھنٹہ شب انتقال زوجہ محمد یعقوب عمدۃ النسا اسم با مسمی بنت شیخ کرامت حسین مرحوم والدہ معین الدین وقطب الدین وعلاء الدین وجلال الدین وفاطمہ وخدیجہ گردید برائے یادنوشتہ شد و بروز جمعہ دفن شد و نکاح او در شعبان ۱۲۶۶ھ شدہ بود بمہر سماء بست وشش سال بعد نکاح زندہ ماند وقت نکاح ہفدہ سالہ بود در عمر چہل وسہ انتقال شد۔

(بیاض یعقوبی صفحہ ۱۵۱)

> واقعہ ۱۲۹۶ھ رمضان المبارک کی چودھویں رات کو رات کے دس بجے (مولانا) محمد یعقوب کی بیوی عمدۃ النساء اسم با مسمی شیخ کرامت حسین مرحوم کی بیٹی، معین الدین، قطب الدین، علاء الدین، جلال الدین، فاطمہ اور خدیجہ کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ یادداشت کیلئے لکھا گیا جمعہ کے دن دفن ہوئی۔ اور ان کا نکاح شعبان ۱۲۶۶ھ میں بعوض مہر پانچ سو روپیہ ہوا۔ نکاح کے بعد چھبیس سال زندہ رہیں۔ نکاح کے وقت

سترہ سال کی عمر تھی۔ تینتالیس کی عمر میں انتقال ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ عمدۃ النسا شیخ کرامت حسین کی چھوٹی بیٹی تھیں اور قاسم العلومؒ کے گھر میں ان کی بڑی لڑکی تھیں لیکن بڑی لڑکی کا نکاح بظاہر چھوٹی سے بعد میں ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی شادی آپ کے والد محترم مولانا مملوک علیؒ صاحب متوفی ۱۲۶۷ھ کے سامنے ہی ہو چکی تھی۔

سامان جہیز:

مولانا محمد طیب صاحب کی جدہ محترمہ حضرت قاسم العلومؒ کی اہلیہ مولانا محمد طیب صاحب کے جوان ہونے تک زندہ رہی ہیں۔ اسی لئے جدہ محترمہ سے مولانا محمد طیب صاحب کو بہت سے حقیقتیں معلوم ہوئی ہیں جو قطعی اور یقینی ہیں۔ لہٰذا اب ہم وہ تاریخی چیزیں پیش کرتے ہیں جو دادی صاحبہ نے پوتے سے فرمائی ہیں۔ اور یہ سب روایات سوانح قاسمی گیلانی میں درج ہیں مولانا محمد طیب صاحب فرماتے ہیں:

> ''احقر کی دادی صاحبہ فرمایا کرتی تھیں کہ میرے والد شیخ کرامت حسین (رئیس دیوبند) نے جب (مولانا محمد قاسم صاحب) سے نکاح کر کے مجھے رخصت کیا تو اس زمانے کے لحاظ سے جہیز بہت بڑا اور عظیم الشان دیا جس میں قیمتی زیورات، کپڑے اور تانبے کے برتنوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔'' (صفحہ ۵۰۸ جلد اول)

شب اول میں نوافل اور جہیز کا سامان سلطان ترکی کے چندے میں:

امنگوں اور تمناؤں کی پہلی رات اس قدر انتظار اور بیتابی کی رات ہوتی ہے لیکن حضرت قاسم العلومؒ نے اس رات کے آغاز میں نوافل کا سلسلہ جاری رکھ کر کس قدر ولایت عظمیٰ صبر اور سیلف کنٹرول (Self Control) کا ثبوت دیا ہے۔ مولانا محمد طیب صاحب اپنی دادی کی زبانی بیان فرماتے ہیں:

> ''حضرت جب شب اول میں آئے تو آتے ہی نوافل شروع فرمائیں۔ نوافل سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس تشریف لائے اور انتہائی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ

فرمایا کہ جب تم کو اللہ نے میرے ساتھ وابستہ کر دیا ہے تو نبھاؤ کی ضرورت ہے۔ مگر بصورت موجودہ نبھاؤ میں دشواری ہے کہ تم امیر ہو اور میں غریب و نادار ہوں۔ صورتیں اب دو ہی ہیں یا میں بھی تونگر بنوں یا تم میری طرح نادار بن جاؤ۔ میرا امیر بننا تو دشوار ہے اس لئے آسان صورت دوسری ہو سکتی ہے کہ تم میری طرح ہو جاؤ۔

حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ میرا جو تعلق قائم فرمایا ہے اس میں مجھے تربیت کا منصب اور تمہیں اطاعت کا منصب دیا ہے۔ اگر تم کو کسی بات کا حکم دوں جس میں تمہارا ہی نفع ہو تو کیا تم کو مجھ پر اعتماد ہوگا۔ کئی بار فرمانے پر بالآخر میں نے عرض کیا کہ مجھے پورا اعتماد ہے۔ (اس کے بعد فرمایا) اچھا سب زیور اتار کر مجھے دیدو۔ (میں نے کہا) آپ کو کلی اختیار ہے۔ علی الصباح تمام زیورات، تمام جوڑے کپڑوں کے ساتھ اور سارے برتن جو ہزاروں روپیہ کا سامان تھا سب کا سب چندہ سلطانی میں دے دیا۔ میں جب دیوبند واپس گئی تو رئیس باپ نے میرے ہاتھ پاؤں، ناک کان کو خالی دیکھ کر پوچھا کہ زیور کیا ہوا۔ جو واقعہ پیش آیا تھا والد صاحب کے سامنے سب دہرا دیا گیا۔ پھر از سر نو پورا جہیز تیار کیا میں پھر لد پھند کر دوبارہ سسرال پہنچی۔ رات کو حضرت تشریف لائے اور پھر آخرت کی ترغیب اور کل کی تیاری کیلئے آج کا اختیار کہہ دیا گیا کہ آپ مختار ہیں۔ صبح ہی یہ ہزاروں روپیہ کا سامان پھر سلطانی چندے میں دے ڈالا۔ اس کے بعد میرے قلب سے روپیہ پیسہ اور زیور وغیرہ کی محبت ہی قطعاً نکل گئی بلکہ ان اشیاء (زیورات وغیرہ) سے ایک قسم کا تنفر پیدا ہو گیا۔ پھر عمر بھر نہ میں نے زیور بنوایا اور نہ فاخرہ لباس کی مجھ میں کبھی ہوس یا آرزو پیدا ہوئی۔“

(سوانح قاسمی گیلانی جلد اول ماخوذ از صفحہ ۵۰۷ تا صفحہ ۵۱۳)

قاسم العلومؒ کی زوجہ محترمہ ام رحم کی سیرت پر ایک نظر

شوہر کی اطاعت اور مہمان نوازی:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں:

”جب (مولانا محمد قاسم صاحب) وطن آتے اور یہاں مہمان آتے، والدین کو دشواری ہوتی تب یہ کیا کہ بی بی کا زیور اس کی اجازت سے بیچ کر صرف کر دیا۔ وہ ایسی تابعدار تھیں کہ والدین کی خدمت میں جو مشقت اٹھائی مولوی صاحب کی مزاج داری، ان کو علاوہ برآں ہوئی اور والدین کی رضا کیلئے جب ناخوش ہوتے تو ان کو ہی کچھ کہہ لیتے۔ آخر میں ان کے بڑے شکر گذار رہے اور اللہ جل شانہ نے بہت کچھ عنایت فرمایا جو کچھ فتوح ہوتی ان کے حوالے فرما دیتے وہ اللہ کی بندی خدا سلامت رکھے ایسی سخی اور دست کشادہ ہے کہ جناب مولوی صاحب کی مہمانداری کو اسی کے باعث رونق تھی کبھی یاد نہیں کہ کسی وقت کوئی آ گیا ہو اور گھر میں کھانا نہ ملا ہو بلکہ خود فرماتے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے۔ جو میں قصد کرتا ہوں وہ مہمان نوازی میں اس سے بڑھ کر کرتی ہے۔“ (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۱۲)

استغنا اور دنیا سے بے رغبتی:

مولانا محمد طیب صاحب نے اپنی جدہ محترمہ سے سنا وہ فرماتی تھیں کہ:

”ایک دفعہ کا ایک ذکر ہے کہ کسی معتقد نے ایک چادر بیش قیمت اور ایک عدد زیور طلائی

بی بی صاحبہ (اہلیہ محترمہ قاسم العلومؒ) کی ملک کر کے (مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس) بھیجا۔ (حضرت قاسم العلومؒ نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا) فی الحقیقت چادر اور زیور سے دل خوش ضرور ہوتا ہے لیکن چند روز کے استعمال سے یہ دونوں ہی چیزیں خراب ہو جائیں گی۔ جو کام اس ریشمی چادر سے ملے گا وہی لٹھے کی سفید چادر سے بھی نکل سکتا ہے۔ خداوند تعالیٰ ان کے عوض عاقبت میں پائدار لباس اور زیور عطا فرمائیں گے۔ بی بی صاحبہ نے فوراً (چادر ریشمی اور طلائی زیور دونوں کو) دے دیا اور دل پر میل نہ آیا۔ مولانا کے معتقد آپ کی بی بی کے واسطے قیمتی لباس اور زیور بنا کر بھیجتے مگر مولانا (بجائے بی بی صاحبہ کے) مساکین کو دے دیا کرتے اور بی بی صاحبہ کو خبر بھی نہ کرتے۔"

(سوانح قاسمی از گیلانی حصہ اول صفحہ ۵۱۵۔۵۱۶)

اہلیہ صاحبہ کا صبر اور شوہر کی دلجوئی:

مولانا محمد طیب صاحب اپنی جدہ محترمہ کی زبانی سنی ہوئی یہ بات بھی تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت (نانوتوی) کی عادت شب کو سوتے وقت دودھ کے استعمال کی تھی۔ گائے کا دودھ استعمال کرتے تھے۔ شب کی غذا عامۃً یہی ہوتی تھی۔ جب حضرت نماز عشا سے فارغ ہو کر آتے اور بالاخانے پر تشریف لے جاتے تو دودھ کا پیالہ لے کر میں پہنچ جاتی۔ میرا انتظار اگر کرتے تو یہ علامت خوشدلی کی ہوتی اور اگر انتظار کئے بغیر نوافل میں مشغول ہو گئے تو یہ علامت ناگواری کی ہوتی تھی۔ (کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ) حضرت نے نوافل میں پوری شب گذار دی اور میں بھی پوری شب پیالہ لئے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔" (سوانح قاسمی از گیلانی جلد اول صفحہ ۵۱۸)

ساس کی خدمت میں شوہر کی خوشنودی:

حافظ محمد احمدؒ صاحب فرزند مولانا محمد قاسم صاحبؒ اپنی والدہ ماجدہ کی زبانی سنی ہوئی حسب ذیل روایت بیان فرماتے ہیں کہ:

> ''مجھ سے شادی کے اگلے ہی دن (حضرت نانوتوی) فرمادیا تھا کہ میں نے نکاح صرف اپنی بوا (والدہ) کی راحت کے لئے کیا ہے۔ بار بار یہی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تو ان ہی خدمت کے لئے یہ بار اپنے ذمے رکھا ورنہ میں فقیر آدمی تھا مجھے کیا ان چیزوں میں پھنسنے کی ضرورت تھی۔''

حافظ صاحب ہی اپنی والدہ کی زبانی بیان کرتے تھے کہ آخری عمر میں حضرت والد مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی والدہ محترمہ یعنی میری دادی صاحبہ مرض اسہال میں مبتلا ہوئیں۔ بیماری اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ دن میں تین تین چار چار مرتبہ کپڑے خراب ہوجاتے تو باوجودیکہ حضرت قاسم العلومؒ کی اہلیہ یعنی حافظ صاحب کی والدہ خود بخوشی کپڑے دھویا کرتی تھیں لیکن مولانا خود والدہ کے کپڑے دھونے کی سعادت حاصل کرنا پسند کرتے۔ لیکن اہلیہ محترمہ پسند نہ کرتی تھیں کہ مولانا کپڑے دھوئیں بالآخر یہ طے ہوا کہ ایک دن وہ کپڑے دھویا کریں گے اور ایک دن اہلیہ محترمہ لیکن حضرت قاسم العلومؒ کی اہلیہ کی زبانی حافظ صاحب روایت کرتے ہیں کہ:

> ''میں یہ کیا کرتی کہ دھونے کیلئے دن بھر میں چار پانچ کپڑے جمع ہوجاتے تو تین چار کپڑوں کو میں خود دھو کر سکھالیتی اور حضرت کے سامنے ایک کپڑا دھونے کی باری کے دن پیش کردیا کرتی تھی۔'' (سوانح قاسمی از گیلانی جلد اول صفحہ ۵۰۲۔۵۰۳)

قاسم العلوم کی اہلیہ کی دینداری اور ذکر الٰہی:

مولانا محمد طیب صاحب اپنی جدہ محترمہ اہلیہ قاسم العلومؒ کی دینداری کے متعلق اپنے چشم دید واقعات بیان کرتے ہیں کہ:

> ''اذان کی حی علی الصلوٰۃ پر کام کو چھوڑ کر اس طرح اٹھ جاتی تھیں کہ گویا اس کام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ بالکل ہر چیز سے بیگانہ بن جاتیں۔ بعد نماز صبح سر پر اور منہ پر اپنا دوپٹہ ڈال کر ہلکی ضرب سے ذکر کیا کرتی تھیں۔ آندھی ہو، مینہ ہو، سردی ہو، گرمی ہو اس میں بال برابر فرق نہ آتا تھا۔
>
> میں نے جب حدیث شروع کی اور مشکوٰۃ میرے والد صاحب (حافظ محمد احمد) مرحوم

> کے یہاں شروع ہوئی پھر دوسرے سال مسلم شریف بھی ان ہی کے یہاں ہوئی تو میں سبق پڑھ کر گھر آ کر سبق کی تقریر دادی صاحبہ کو سنایا کرتا تھا جب تک میں تقریر کرتا رہتا تھا ان کی آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری رہتے۔"

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد اول صفحہ ۵۱۹)

اہلیہ محترمہ کا برادری میں احترام:

مولانا محمد طیب صاحب اپنی محترمہ دادی صاحبہ کے برادری میں احترام سے متعلق اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

> "حضرت (مولانا محمد قاسم صاحب) سے نسبت کی وجہ سے ان کا ایک خاص مقام تھا جو برادری میں ممتاز تھا۔ بڑی سے بڑی خاتون ان کے لئے سرہانہ چھوڑ دیتی تھیں۔ برادری میں دلہن پالکی سے اس وقت تک نہیں اتاری جاتی تھی جب تک وہ (یعنی دادی صاحبہ) سر پر ہاتھ نہ رکھ دیں۔ اسی طرح کھانا تقسیم نہ ہوتا تھا جب تک کہ ان سے اس کی ابتدا نہ کرائی جائے غرض امیر و غریب سب ان کی عزت کرتے تھے اور ان سے دبتے تھے۔" (سوانح قاسمی از گیلانی جلد اول صفحہ ۵۲۱)

قاسم العلومؒ کو والدین کی خدمت کا زبردست احساس:

گذشتہ عبارت میں آپ نے پڑھا ہے کہ قاسم العلومؒ کو اپنی اہلیہ کی طرف سے یہ شدید احساس رہا ہے کہ وہ اپنے خسر اور خوشدامن کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ حضرت قاسم الخیرات کے والدین آپ کی شادی کے کافی بعد تک زندہ رہے ہیں۔ والدہ کی وفات سے پہلے بیماری میں کئی کئی بار اسہال ہونا اور اہلیہ کا کپڑے دھونا آپ نے پڑھ لیا ہے۔ والد محترم شیخ اسد علی صاحب کی وفات کا حال ہم ابتدا میں لکھ چکے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا نے اپنے والد کی خدمت کا بیماری میں جو حق ادا کیا وہ حسب ذیل واقعات سے واضح ہوتا ہے۔

آپ کے والد محترم آپ کی وجہ سے کہ دار العلوم کی خدمات کے سلسلے میں یہاں مولانا کا قیام رہتا دیوبند آتے جاتے اور یوں بھی شیخ کرامت حسین سے سمدھیانے کا تعلق تھا۔

حافظ محمد احمد صاحبؒ جنہوں نے اپنے دادا کو بڑے ہو کر خوب دیکھا تھا بیان کرتے ہیں کہ میرے دادا جان شیخ اسد علی دیوبند آئے اور بیمار ہو گئے۔ ان کا قیام قاسم العلومؒ کی سسرال میں شیخ کرامت حسین کی بیٹھک میں تھا اور میرے والد صاحبؒ قاسم العلوم چھتے کے مسجد میں رہتے تھے دادا صاحب کی بیماری کی وجہ سے وہ بھی اکثر وقت بیٹھک میں والد صاحب کے پاس گذارتے صرف نماز کیلئے چھتے کی مسجد میں جاتے اور بعض اوقات فرماتے:

> ”شریعت کی طرف سے مجھے رخصت ہے کہ میں خدمت والد کروں اور یہیں نماز ادا کروں تم لوگ نماز مسجد میں پڑھ آؤ۔“

(روایات طاہرہ بحوالہ حافظ محمد احمد صاحبؒ۔ سوانح گیلانی جلد اول صفحہ ۴۹۰)

اس وجہ سے حضرت قاسم العلومؒ کے نیاز مند شاگردوں اور مریدوں کی رائے ہوئی کہ شیخ اسد علی صاحب کو چھتے کی مسجد ہی میں لے چلیں جس کے حجرے میں آپ کو رکھا گیا۔ یہاں خود بھی قاسم العلومؒ خدمت کرتے اور شاگرد نیز عقیدت مند بھی۔ بیماری میں اسہال کی نوبت پہنچ گئی۔ حضرت قاسم العلومؒ جگہ صاف کرنے کی طرف دوڑتے لیکن عقیدت مند آگے بڑھتے اور بخوشی یہ کام انجام دیتے حتی کہ ایک دفعہ جب اسہال کے باعث صفائی کا ارادہ ہو رہا تھا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے سبقت کر کے ہاتھوں سے بغیر کسی آلہ صفائی کے اسہال صاف کر ڈالا۔ یہ دیکھ کر شیخ اسد علی حیران ہوتے تھے اور اپنے بیٹے کے ان وسائل اور ذرائع سے حیران رہ جاتے تھے۔

قاسم العلومؒ کے والد شیخ اسد علی کی وفات:

اسی بیماری میں قاسم العلومؒ کے والد محترم کا انتقال ہو گیا تھا لیکن ان کی وفات کی کوئی تاریخ متعین کرنا معلومات سے خارج ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں آپ کے والد کا انتقال خود آپ کی وفات سے چھ سال پہلے ہوا معلوم ہوتا ہے۔

قاسم العلومؒ کی اولاد:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں کی تفصیل مولانا

محمد یعقوب صاحبؒ نے سوانح قاسمی میں حسب ذیل الفاظ میں پیش کی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> ”جناب مولوی (محمد قاسمؒ) صاحب نے دو صاحبزادے چھوڑے ایک میاں احمد جن کی عمر اٹھارہ برس کی ہے۔ شادی ہوگئی۔ طالب علمی میں مصروف ہیں۔ بحمداللہ ذہین عمدہ طبیعت تیز مزاج سنجیدہ ہے۔ مولانا کے قدم بقدم خداتعالیٰ کرے اور ویسی ہی شہرت اور عزت خدا نصیب کرے اور صلاح وتقویٰ اور نشر علم و خیران کی ذات سے فرماوے۔ چھوٹے صاحبزادے میاں محمد ہاشم آٹھ برس کی عمر بہت ذی ہوش مستقیم مزاج ہیں قرآن شریف حفظ کر رہے ہیں.......... اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ ایک بی بی اکرامن یہ سب سے میاں احمد سے بھی بڑی ہیں۔ مولوی صاحب کی اول اولاد یہی ہیں۔ نکاح ان کا جناب مولوی صاحب نے میاں پیر جی مولوی عبداللہ صاحب سے کیا ہے یہ احقر کے ہمشیرہ زادے ہیں اور اولاد میں شاہ ابوالمعالی انبیٹھوی اور مولوی انصار علی صاحب مرحوم کے بیٹے ہیں.......... ان کے تین لڑکیاں ہیں.......... (بی بی اکرامن) سے۔ چھوٹی بی بی رقیہ ہیں۔ ان کا نکاح مولوی پیر جی محمد صدیق سے کیا ہے۔ یہ مولوی صاحب کے ماموں مولوی امین ازامین صاحب مرحوم کے نواسے ہیں اور اولاد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ہیں.......... ان کے ایک لڑکا ہے۔ چھوٹی صاحبزادی بی بی عائشہ ان کی عمر چار برس کی ہے۔ مولوی صاحب کو ان سے بہت محبت تھی بخلاف اور اولاد کے مولوی صاحب ان کو پاس بٹھلاتے اور ان سے باتیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ بعمر و صلاح نصیب فرمادے۔ یہ اس عمر پر بہت ہوشیار خوش مزاج ہیں۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱)

عارف باللہ کی تحریر کی ہوئی حقیقت کی روشنی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی اولاد کی ترتیب حسب ذیل ہوتی ہے:

۱۔ بی بی اکرامن زوجہ پیر جی مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھوی۔
سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۲۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

والد بزرگوار مولانا محمد طیب صاحب۔

۳۔ بی بی رقیہ زوجہ پیر جی مولوی محمد صدیق صاحب۔

۴۔ میاں محمد ہاشم ۵۔ بی بی عائشہ

دراصل قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے یہ پانچ بچے جن کا ذکر عارف باللہ نے فرمایا ہے۔ آپ کی وفات کے وقت میں تھے لیکن بعض بچے آپ کی وفات سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ مولانا محمد طیب صاحب سوانح قاسمی از گیلانی کے حاشیئے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”حضرت والا (مولانا محمد قاسم صاحب) کی بلاواسطہ دس اولاد ہوئیں۔ مولانا محمد احمد، محمد ہاشم، محمد میاں، محمد میاں خردسالی میں بعمر گیارہ ماہ فوت ہو گئے اور محمد ہاشم کا جوانی کی عمر میں مکہ معظمہ میں انتقال ہوا۔ پسری نسل صرف مولانا محمد احمد صاحب سے چلی۔ لڑکیاں سات ہوئیں۔ اکرام النساء، رقیہ، خدیجہ، مریم، عائشہ دو کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ ان میں عائشہ زندہ ہیں مگر لاولد ہیں۔ خدیجہ، مریم اور دو نا معلوم الاسم لڑکپن ہی میں فوت ہو گئیں۔ دختری اولاد صرف دو سے چلی اکرام النساء اور رقیہ سے۔“

(حاشیہ صفحہ ۴۔۵ جلد اول)

حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی عبارت سے صحیح اولاد کی تعداد کا علم ہوا جو ان کو اپنی دادی صاحبہ سے معلوم ہوا ہے جو صحت معلومات کا واحد ذریعہ ہیں۔ شروع میں حضرت قاسم العلومؒ کے کئی لڑکیاں پیدا ہوئیں جن کے باعث آپ کے والد شیخ اسد علی کو پوتے کی پیدائش کی تمنا نے بے تاب کر دیا۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”بعد نکاح والد اکثر مکدر رہتے تھے اور آرزو کرتے تھے کہ کوئی پوتا ہوتا تو اس سے امید نسل جاری ہونے کی بندھتی۔ اول کئی لڑکیاں ہوئیں جن میں سے دو زندہ اب ہیں ایک بزرگ نے کہا کہ تم یہ آرزو کرتے ہو اور مولوی صاحب کو ناخوش رکھتے ہو ان کو مکدر نہ کرو اللہ تعالیٰ تم کو بھی خوش کرے گا۔ تب سے مولوی صاحب کی اکثر مزاج داری کرتے اور مہمانوں کی خدمت اور تواضع سے کسی طرح نہ گھبراتے۔ تب اللہ تعالیٰ نے میاں احمد کو عنایت کیا۔ آج بحمد تعالیٰ میاں احمد جوان ہیں۔ اٹھارہ برس کی عمر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے

> والد کی مثل کرے۔ آمین۔ اور میاں ہاشم پیدا ہوئے آج ان کی عمر آٹھ برس کی ہے یہ نام مولوی صاحب کے والد کا رکھا ہوا ہے اس عرصے میں کئی لڑکے لڑکیاں پیدا ہوئیں اور چھوٹی ہی عمر میں چل بسیں۔ اب ایک لڑکی تین چار برس کی آخری اولاد ہے۔ اللہ ان سب کو عمر و سعادت و خوبی نصیب کرے اور مولوی صاحب کا نام ان کی نسل سے قائم رکھے۔" (سوانح قاسمی صفحہ ۱۵)

مولانا محمد طیب صاحب اور حضرت عارف باللہ کی تحریروں میں اولاد کے متعلق صاف مطابقت ہوگئی۔ البتہ یہ بات کہ شیخ اسد علی صاحب اپنے فرزند مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو مکدر اور ناخوش رکھتے تھے اس کی تشریح بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے کردی اور وہ یہ کہ حضرت قاسم العلومؒ کے پاس آپ کے مہمانوں کی کثرت رہتی تھی اس پر قاسم العلومؒ نے کبھی ملازمت کی اور کبھی نہ کی اور ملازمت بھی معمولی اس لئے مہمانوں کا خرچ چلتا تو کس طرح پر بس یہی تکدر کی بات تھی۔ لیکن بقول عارف باللہ شیخ اسد علی صاحب کی ہی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی اور مولوی (محمد قاسم) صاحب سے بہت خوش انہوں نے انتقال کیا۔

بی بی اکرامن (اکرام النسا) اور بی بی رقیہ کی شادیاں:

حضرت قاسم العلومؒ نے اپنی ان دونوں صاحبزادیوں کا رسوم دنیا اور جہیز کے تکلف سے بالا ہو کر جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ وعظ فرمایا اور خود ہی نکاح پڑھ دیا آپ کے والد شیخ اسد علی کو بہت افسوس ہوا بلکہ مولانا محمد قاسم صاحب سے خفا ہو کر نانوتے چلے گئے مگر مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو منانے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ وہ آئے اور پھر برادری کو کھانا کھلایا۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> "جناب مولوی صاحب نے دونوں لڑکیوں کا نکاح بالکل سنت کے موافق کیا۔ بدوں اطلاع کسی کے جمعہ کے روز بعد جمعہ نکاح کردیا۔ البتہ جناب مولوی رشید احمد صاحب کو بلوالیا تھا اور ان کو غالباً اطلاع فرمادی تھی اور کسی کو خبر نہ تھی اور نہ کچھ جہیز وغیرہ کی فکر کی گئی مگر بعنایت خداوندی دونوں کے پاس زیور کپڑا جیسے ہماری برادری میں ہوا کرتا ہے موجود ہے نہایت خوش و خرم گذران ہے۔ اللہ کا شکر اور احسان ہے۔"

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۳۰۔۳۱)

ماشاء اللہ زر زیور کیوں نہ ہوتا کہ بی بی اکرامن کے خاوند مولانا عبداللہ صاحب انبیٹھوی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینیات کے ناظم بن گئے تھے۔ حالانکہ بقول مولانا محمد طاہر صاحب برادر خرد مولانا محمد طیب صاحب جب نکاح کے بعد بی بی اکرامن کو رخصت کیا گیا۔ تو جو کپڑے پہن رکھے تھے انہی کپڑوں میں سسرال کو رخصت کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں قاسم العلوم کی اہلیہ محترمہ نے جب لڑکی شادی کے بعد سسرال سے والدین کے یہاں پہلی مرتبہ آئیں تو تو جو کچھ ہو سکا دے دیا اور یہ بھی سن لیجئے کہ حضرت قاسم العلوم کی اجازت سے لڑکی کو آٹھ روز کے بعد والدہ نے بلایا۔ گویا اگلے روز بلانے کی رسم کو بھی توڑ دیا گیا۔

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مولانا عبداللہ صاحب کی والدہ مولانا محمد قاسم صاحب کی خالہ ہوتی تھیں اور چونکہ یہ بیوہ ہو گئی تھیں اس لئے تحریک نکاح بیوگان کے باعث ان کا دوسرا نکاح ہوا تھا اس وجہ سے دوسرے نکاح کی اولاد کے لئے لوگ لڑکیاں بھی دینا پسند نہ کرتے تھے۔ لہٰذا قاسم العلوم نے اپنی لڑکی سے شادی کر دی۔

نور نگاہ مولانا محمد قاسم صاحب

مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت قاسم العلومؒ کی نرینہ اولاد میں مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جس کے بغیر سوانح قاسمی مکمل نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا مختصراً ان کا حال لکھتا ہوں جو میں نے سید محبوب صاحب رضوی کی تصنیف تاریخ دیوبند سے اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”حافظ محمد احمد صاحب ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں نانوتے میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد گلاوٹھی کے مدرسے میں جہاں مولانا عبداللہ انبیٹھوی صدر مدرس تھے اور جو قاسم العلوم کا قائم کردہ تھا بھیج دئے گئے۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لئے حضرت قاسم العلومؒ نے ان کو اپنے تلمیذ خاص مولانا احمد حسن صاحب امروہوی کے پاس مدرسہ شاہی مراد آباد بھیج دیا ان سے مختلف علوم وفنون کی اکثر کتابیں پڑھیں بعد ازاں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے معقول اور ادب کی تعلیم حاصل کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے ترمذی شریف کے کچھ سبق پڑھے۔ دورہ حدیث گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے پڑھا۔ جلالین اور بیضاوی بھی وہیں پڑھیں۔

مدرس:

۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے۔ اور ہر فن کی کتابیں مثلاً مشکوٰۃ، جلالین، مسلم شریف، ابن ماجہ، مختصر المعانی اور میر زاہد وغیرہ پڑھائیں۔ ۱۳۱۳ء مطابق ۱۸۹۶ء میں حضرت گنگوہی نے آپ کو دارالعلوم کا مہتمم بنا دیا۔ آپ کے

زمانے میں دارالعلوم دیوبند نے بہت ترقی کی جس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم نائب مہتمم کی کوشش کو بھی بہت دخل تھا۔ جب آپ مہتمم ہوئے تو دارالعلوم کی آمدنی اوسطاً پانچ چھ ہزار سالانہ تھی لیکن آپ کے زمانے میں نوے ہزار تک پہنچی طلبہ دو ڈھائی سو سے ترقی کر کے نوسو تک پہنچ گئے۔ کتب خانے کی کتابیں پانچ ہزار سے چالیس ہزار تک پہنچ گئیں ۱۳۱۳ھ تک دارالعلوم کی عمارت کی لاگت چھتیس ہزار روپیہ تھی مگر آپ کے زمانے میں چار لاکھ تک پہنچی۔ دارالحدیث کی تکمیل بھی آپ ہی کے زمانے میں ہوئی دارالطلبہ جدید کے چند کمرے آپ کے زمانے میں بن گئے تھے۔ حیدر آباد ریاست کا وظیفہ دوسو سے ایک ہزار تک آپ کے عہد میں پہنچا۔ نظام حیدر آباد نے آپ کو مفتی اعظم کے عہدے پر حکومت آصفیہ میں مقرر کیا جہاں آپ ایک ہزار روپیہ ماہوار پر ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء سے ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء تک فائز رہے۔ بعد ازاں اہتمام دارالعلوم پر آگئے۔ آپ کو حکومت برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا لیکن آپ نے واپس کر دیا۔

وفات:

۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں نظام دکن کے دہلی آنے کی توقع تھی اس لئے آپ ان کو دارالعلوم دیوبند تشریف لانے کی دعوت دینے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ بیماری اور کمزوری ہی کے عالم میں گئے تھے وہاں جا کر طبیعت اور خراب ہوگئی اسی حالت میں دیوبند کو واپسی کا ارادہ ہوگیا۔ روانہ ہوئے ہی تھے کہ حدود ریاست میں نظام آباد اسٹیشن پر گاڑی میں ۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء کو انتقال ہوگیا۔ نظام دکن کے فرمانے پر آپ کا جنازہ حیدر آباد لایا گیا اور ۴ جمادی الاولیٰ کو عصر سے ذرا پہلے خطہ صالحین کے قبرستان میں آپ کو دفن کر دیا گیا۔" (ماخوذ از تاریخ دیوبند صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۸)

سراپا حافظ صاحبؒ:

راقم الحروف نے حافظ صاحبؒ کو جبکہ وہ دارالعلومؒ کے مہتمم تھے خوب دیکھا ہے۔ وہ

دراصل دارالعلوم کے بادشاہ اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نائب مہتمم وزیر دارالعلوم تھے۔ حافظ صاحب کا رعب ودبدبہ زبان زدعام تھا گٹھیلا دوہرا جسم، چوڑا سینہ، سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سفید، آنکھیں بڑی بڑی پر رعب اوپر کو ابھری ہوئی جو پھٹی پھٹی سی، سر بڑا، بازو موٹے موٹے، نہ لمبے اور نہ ٹھگنے بلکہ متوسط القامت تھے۔ سر پر گول ٹوپی، پاؤں میں دلی کا ایک پھول کا جوتا، جدھر سے گذر جاتے طلبہ سہم جاتے میری آنکھوں کے سامنے حافظ صاحب کا پورا نقشہ پھر گیا ہے۔ اکثر دفتر اہتمام سے اتر کر اپنے گھر تشریف لے جاتے تو مسجد کی راہ سے گذرتے سلام علیک ہو جاتی تھی۔

حافظ صاحب کی بہترین یادگار

آپ کے فرزند اکبر مولانا محمد طیب صاحبؒ

حافظ صاحب کی بہترین یادگار آپ کے فرزند اکبر حافظ قاری الحاج مولانا محمد طیب صاحب ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم ہیں۔ سلیم الطبع، خندہ پیشانی، کریم النفس، خوبصورت وخوب سیرت، بلند ہمت، مدبر، منتظم، متحمل مزاج، نیک طینت، فصیح البیان۔

سراپا:

چہرہ روشن، سر متوسط، پیشانی کشادہ، ابرو پیوستہ، آنکھیں بڑی بڑی جذاب، ناک موزوں کھڑی، سینہ کشادہ، ہاتھ اور انگلیاں نرم، مصافحہ کیجئے تو دل میں ٹھنڈک اور تسکین محسوس ہوتی ہے۔ خندہ پیشانی، باتیں کرتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ رفتار ثقہ، سر پر کپڑے کی اٹھی ہوئی عالمانہ ٹوپی، پاؤں میں اکثر دلی کا جوتا، جوانی سے لے کر اب تک قریب سے میں نے خوب دیکھا ہے تعلیم سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ دارالعلوم میں ابتدائی کتابیں پڑھاتے تھے۔ میں نے ان سے ہدایۃ النحو اور قدوری پڑھی تھی۔ کبھی سڑک کے بڑے گیٹ کے برابر بغلی کے اوپر کے کمرے میں پڑھاتے اور اس وقت وہ کمرہ ان کا مخصوص تھا۔ قدوری نودرت کے درمیانی کمرے میں پڑھاتے۔ اس وقت نوجوان تھے۔ اب ستر سے اوپر ہیں ڈاڑھی سفید ہو چکی ہے۔ جسم بھی ڈھیلا ہو گیا ہے۔ مگر چہرے پر اللہ کا نور روشن ہے۔

بہترین مدرس، بہترین مقرر، شرافت کا مجسمہ اور ثقافت اسلامی کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ حضرت قاسم العلومؒ کے پوتے بن کر انہیں دنیا میں آنا تھا جس طرح دادا امام وقت تھا پوتا بھی باپ دادا کا نام روشن کرنے والا نکلا۔

سوانح:

حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن نانوتہ ضلع سہارنپور ہے۔ سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ دو سال میں قرآن شریف حفظ کیا۔ پانچ سال فارسی اور ریاضی میں صرف کئے۔ بعد ازاں عربی کی تعلیم میں مصروف رہے۔ ۱۳۳۷ھ میں سند فضیلت حاصل کی۔ امام عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی آپ کے خاص اساتذہ میں سے تھے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیم دینا شروع کی۔ ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں آپ کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مہتمم بنائے گئے۔ اور آج ۲۲ رجب ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۶ نومبر ۱۹۶۵ء تک مہتمم ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے اور خدائے کریم جاری رکھے۔

الغرض مولانا محمد طیب صاحب کے زمانے میں دارالعلوم کو ان کی ذات سے اور ان کی ذات کو دارالعلوم سے بہت فائدہ پہنچا۔ جب آپ نے دارالعلوم کا اہتمام سنبھالا تو دارالعلوم کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار دو سو چھبیس تھی لیکن آپ کے زمانے میں دارالعلوم کی سالانہ آمدنی تین لاکھ سے بھی اوپر پہنچ گئی۔ عمارتوں میں دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، جدید مطبخ، بالائی دارالحدیث، بالائی مسجد، باب الظاہر اور جدید دارالطلبہ آپ ہی کے عہد کی یادگاریں ہیں۔

ملک میں تقریروں کا سلسلہ اور تصانیف:

ہند و پاک میں کوئی بڑا شہر اور قصبہ ہوگا جہاں آپ کی تقریروں نے ملک سے خراج نہ لیا ہو۔ دارالعلوم کے سلسلے میں ۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰ء میں افغانستان تشریف لے گئے۔ افریقہ میں بھی آپ کی تقریریں ہوئیں اور اب گذشتہ سال ہندوستان کی طرف سے قاہرہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے زبردست مقالہ پڑھا۔ آپ متعدد تصنیفات کے مالک ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے اہتمام پر آپ کا انتخاب اپنی خاص حکمت سے فرمایا تھا۔ جس کے ثمرات ہم مدت سے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ خدائے کریم ان کو مدت دراز

تک دارالعلوم کی خدمت کا موقع عنایت فرمائے۔ حق تو یہ ہے کہ دادا کے لگائے ہوئے باغ کی انہوں نے جس شان سے آبیاری کی وہ انہی کا حصہ ہے۔ آخر میں ہم حضرت قاسم العلوم کی اولاد کا شجرہ پیش کرتے ہیں جو یہ ہے:

شجرہ اولاد مولانا محمد قاسم صاحبؒ:

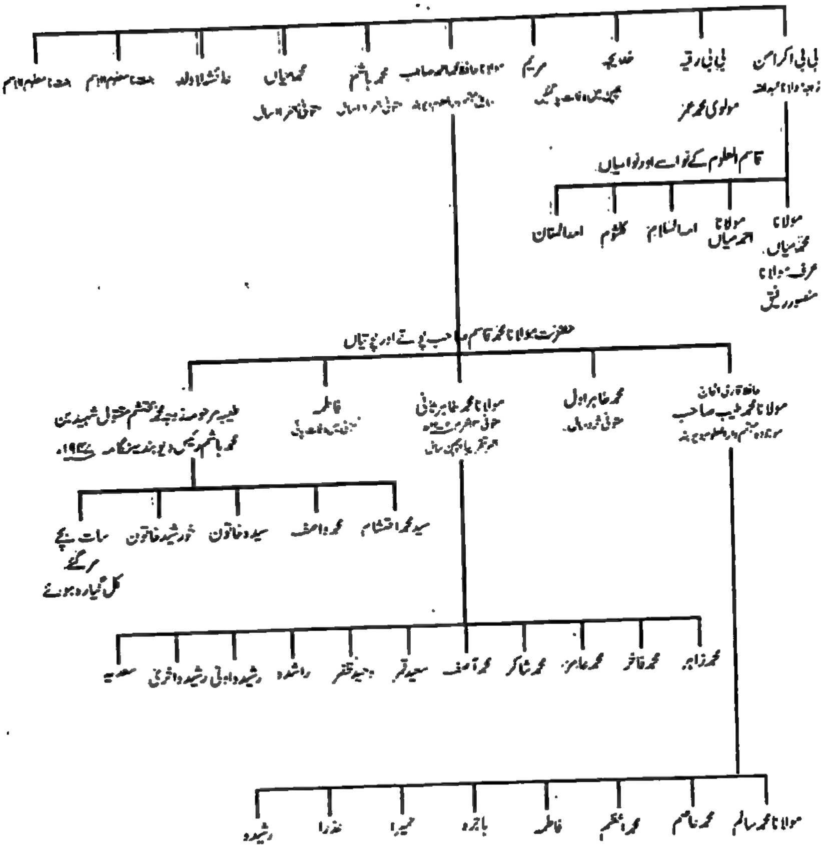
بی بی اکرامن
زوجہ مولانا عبداللہ
بی بی رقیہ
مولوی محمد عمر
خدیجہ
بچپن میں وفات پا گئیں
مریم
۱۳۰۰ھ حافظ محمد احمد صاحب
محمد ہاشم
محمد میاں
عائشہ لاولد
قاسم العلوم کے نواسے اور نواسیاں
مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور رفیق
مولانا احمد میاں
ام السلام
کلثوم
امۃ المنان
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے پوتے اور پوتیاں
حافظ قاری الحاج مولانا محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند
محمد طاہر اول
مولانا محمد طاہر ثانی
فاطمہ
طیبہ مرحومہ بیوہ محمد محتشم مقتول شہید
محمد ہاشم ... دیوبند ہنگامہ ۱۹۴۷ء
سید محمد احتشام
محمد واصف
سیدہ خاتون
خورشید خاتون
سات بچے مرگئے
کل گیارہ ہوئے
محمد زاہد
محمد فاخر
محمد عامر
محمد شاکر
محمد آصف
سید قمر
جنید قیصر
راشدہ
رشیدہ اولیٰ
رشیدہ اخریٰ
سعدیہ
مولانا محمد سالم
محمد ناصم
محمد اعظم
فاطمہ
ہاجرہ
حمیرا
عذرا
رشیدہ

ہم نے اس شجرے میں حضرت قاسم العلومؒ کے پوتوں اور ان کی اولاد کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ معاملہ ایک نسل اور آگے تک بڑھ گیا ہے جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔ مزید نسل کا حال سوانح قاسمی از گیلانی کی جلد اول صفحہ ۵۰۴ تا ۵۰۶ پر ملاحظہ فرمایئے جن کے حواشی میں

مولانا محمد طیب صاحب نے تفصیل سے تمام ذریت کا ذکر کیا ہے جو تقریباً دو سو سے متجاوز ہو چکی ہے۔ ہم نے یہ شجرہ بھی وہیں سے معلومات بہم پہنچا کر خود ترتیب دیا ہے۔

الحاصل:

حاصل یہ ہے کہ اس حصے میں ہم نے بقدر ضرورت حضرت نانوتوی قاسم العلوم کی ملازمت، شادی اور اولاد کا ذکر تفصیل سے یک جا کر دیا ہے۔ اس سے فارغ ہو کر ہم اب ان کی زندگی کے شمشیر و سناں کے دور کی طرف چلتے ہیں۔ جب انہوں نے ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف جہاد بالسیف میں حصہ لے کر اپنی زندگی کا نیا روشن باب لکھا تھا اور اپنے آپ کو مجاہدین کی فہرست میں شامل کیا تھا۔

پانچواں حصہ:

۱۸۵۷ء کا جہاد حریت

شمشیر بکف مولانا محمد قاسمؒ

علم میں کمال اور فقر و تصوف میں خداوندی جمال حاصل کر لینا ایک عالم کے لئے باعمل ہو جانے کا مقام ہے۔ اور یہی مقصود مومن عالم ہے جو حضرت قاسم العلومؒ والخیرات کو حاصل ہو چکا ہے لیکن کتنے ہی علماء ہیں جو علم باطنی میں ید طولیٰ رکھنے کے باوجود اس میدان کے مرد نہ نکلے جو شمشیر بکف ہو کر جہاد فی سبیل اللہ اور جذبہ شہادت سے سرشار ہو کر اور سر سے کفن باندھ کر نکلتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب جہاں علوم ظاہری و باطنی کے شہسوار تھے وہاں قدرت نے ان کو ایسا نڈر دل بھی دیا تھا جو ان کو ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں انگریزوں کے مقابلے میں لے آیا تھا۔ انہوں نے یہ جہاد حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اپنے پیر و مرشد کی کمان میں شاملی ضلع مظفر نگر (یو۔ پی) میں برپا کیا اور اپنی تلوار کے وہ جوہر دکھائے جو صفحات تاریخ میں آج تک چمک رہے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ ہم ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت پر سیر حاصل تبصرہ کریں جو سلطنت مغلیہ کے بجھے ہوئے چراغ کو روشن کرنے کے لئے لڑا گیا یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان کب سے ہندوستان میں آنے شروع ہوئے اور کون کون سی مسلمان سلطنتوں کو ہندوستان پر تسلط و اقتدار حاصل رہا۔

مسلمانوں کی مالا بار اور سیلون میں آمد:

اگر آپ تاریخ کی مفصل کتابیں پڑھیں گے تو آپ کو ان سے مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا حال معلوم ہوگا۔ دراصل مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد ابتداء میں مالا بار وغیرہ کے علاقے میں تجارت کی صورت میں ہوئی۔ چنانچہ یہاں اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ مذہب اسلام کے ساتھ ساتھ عربوں کی زبان بھی یہاں رواج پانے لگی۔ جس کے اثرات مالا بار اور سیلون وغیرہ میں اب تک موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت ۱۵ھ میں عمان کے گورنر عثمان بن ابی عاص ثقفی نے تھانے پر جو بمبئی کے علاقے میں واقع ہے حملہ کر کے اسے حاصل کرلیا۔

ملتان پر حملہ:

اس کے بعد امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ۴۴ھ میں مہلب بن ابی صفرہ نے ملتان پر (جو آج کل مغربی پاکستان کے سابق صوبہ پنجاب میں واقع ہے) حملہ کیا۔

دیبل پرانے کراچی پر محمد بن قاسم کی چڑھائی:

سلطنت امویہ کے ایک خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں جبکہ حجاج بن یوسف گورنر تھا محمد بن قاسم نے جو حجاج کا بھتیجا ہوتا تھا ۹۲ھ میں پرانے کراچی پر جو دیبل کے نام سے مشہور تھا اور ہے حملہ کیا جو سابق صوبہ سندھ پاکستان میں واقع ہے۔ شہر دیبل موجودہ کراچی سے کچھ فاصلے پر تھا۔

راقم الحروف نے دیبل کے آثار ۲۶ دسمبر ۱۹۶۱ء کو سوا گیارہ بجے دن کے مشاہدہ کیا یہاں پر مختلف قسم کے مٹی کے برتن دیکھے اور بعض پتھروں کے ٹکڑوں پر

بسم اللہ الرحمن الرحیم لا الہ الا اللہ وان محمد اعبدہ و رسولہ

اور

انما یعمر مسجد اللہ من أمن باللہ

لکھا تھا۔

محمد بن قاسم کے حملے کی وجہ:

جس زمانے میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا تھا اس زمانے میں سندھ بہت بڑا ملک کہلاتا تھا۔ جنوب میں مالودہ اور گجرات، شمال میں میانوالی بلکہ اس سے بھی اوپر تک، مشرق میں ملتان اور دیپال پور کے علاقے تھے اور مغرب میں سیستان اور مکران کی حد تھی جو عربوں کی سلطنت میں تھے۔ دیبل یا دیول (قدیم کراچی) نیرون، راوڑ، برہمن آباد اور ملتان سندھ کی ریاست کے مشہور شہر تھے اور الور (روہڑی) اس کا پایہ تخت تھا۔ یہاں کے لوگ عموماً بدھ مذہب کے جاٹ تھے۔ سندھ پر راجہ داہر حکومت کرتا تھا جو برہمن تھا۔

داہر نہایت مغرور تھا اور عربوں کے معاملات میں دخل دیتا رہتا تھا اور باغیوں کو اپنے یہاں پناہ دیتا تھا اور عربوں کے علاقے پر حملے کے لئے ان کو اکساتا رہتا تھا۔

یہ کشیدگی جاری تھی کہ لنکا میں چند مسلمان تاجروں کا انتقال ہو گیا۔ لنکا کے راجہ نے ان کے بیوی بچوں کو جہازوں میں سوار کر کے خراسان سے حاکم حجاج کے پاس روانہ کر دیا خلیفہ ولید بن عبدالملک خلیفہ امویہ کے زمانے میں گورنر تھا۔ ان جہازوں پر مسلمان تاجر بھی تھے جو حج کی غرض سے مکہ مکرمہ جانا چاہتے تھے لیکن راستے میں بحری قزاقوں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا اور عورتوں بچوں اور مردوں کو گرفتار کر کے دیول (کراچی قدیم) اور الور کے قید خانوں میں بند کر دیا۔ حجاج بن یوسف کو علم ہوا تو اس نے داہر کو لکھا کہ ہمارے آدمیوں کو رہا کیا جائے نقصان کی تلافی کی جائے۔ اس نے جواب دیا کہ بحری ڈاکو میرے قبضے سے باہر ہیں۔ جب یہ جواب حجاج کو پہنچا تو غیرتِ قومی سے چہرہ تمتما اٹھا اور اپنے سترہ سالہ مدبر اور منتظم بھتیجے کو بارہ ہزار سوار دے کر سندھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ فتح کا پھریرا لہراتا ہوا محمد بن قاسم آگے بڑھا اور راجہ داہر کو اس نے راوڑ کے مقام پر جالیا۔ تین روز تک ہنگامہ گرم رہا اور آخرکار راجہ داہر مارا گیا محمد بن قاسم کوئی ساڑھے تین سال سندھ میں رہا۔ سوا سو سال تک سندھ عربوں کے قبضے میں رہا۔ لیکن جب عربوں کی حکومت کو زوال آیا تو یہاں سندھ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ہندوؤں کی ریاستیں بن گئیں اور تمام سندھ پر ہندوؤں کی حکومت ہو گئی۔

(تاریخ ہندوستان از پروفیسر عبدالقادر مرحوم اسلامیہ کالج لاہور)

سبکتگین اور جے پال کی جنگ اور محمود غزنوی کے حملے:

گیارھویں صدی عیسوی میں طویل خاموشی کے بعد مسلمان افغانستان کے راستے پنجاب میں داخل ہوئے اس وقت یعنی سبکتگین اور محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان کی مغربی حدود غزنی تک پہنچی ہوئی تھیں۔ شمالی ہندوستان میں بہت سی ریاستیں قائم تھیں۔ پنجاب کی ریاست دریائے ستلج سے لے کر غزنی تک پھیلی ہوئی تھی۔ غزنی، کابل، پشاور، ہنڈ بھیرہ، لاہور، کانگڑہ اور جالندھر اس کے مشہور شہر تھے۔ دریائے ستلج سے لے کر جمنا تک کا علاقہ بھی پنجاب میں شامل تھا لیکن الپتگین نے غزنی پر قبضہ کر لیا تھا۔ سبکتگین جو الپتگین کا غلام اور داماد تھا۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس نے کابل بھی لے لیا۔ اس وقت یہاں ہندو لوگ رہتے تھے لیکن سبکتگین کے اقبال سے مشرف باسلام ہو گئے۔

جے پال نے سبکتگین کا زور بڑھتا دیکھ کر ایک زبردست لشکر بھیجا۔ سبکتگین بھی بھاری فوج لے کر نکلا اور آخر جے پال کو شکست ہوئی اور اس نے صلح کر لی۔ ۹۹۷ء میں سبکتگین کا انتقال ہو گیا تو اس کا بیٹا محمود غزنوی تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا بہادر تھا اس نے ۱۰۰۰ء سے ۱۰۳۰ء تک ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور اپنا کھویا ہوا علاقہ لینے کے لئے محمود غزنوی سے جنگ کی لیکن گرفتار ہوا۔ تاوان جنگ دے کر چھوٹا اور غم میں جل کر مر گیا۔ کچھ عرصے تک ہندوستان کے بعض حصوں پر غزنویوں کا اقتدار رہا۔

(تاریخ عبدالقادر)

شہاب الدین محمد غوری ۱۱۷۵ء سے ۱۲۰۳ء تک:

محمود غزنوی کی وفات کے بعد تقریباً کوئی ڈیڑھ سو سال غوری حکومت رہی۔ لیکن بعد ازاں علاء الدین نے غزنی کو تباہ کر دیا اس کا بھتیجا شہاب الدین محمد غوری تھا۔ محمد غوری نے ہندوستان پر حملے کئے اور مختلف علاقے فتح کر لئے۔ لاہور فتح کر کے سرہند کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ قلعہ دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کے قبضے میں تھا وہ گھبرا کر بھاگ گیا اور سرہند فتح ہو گیا۔ محمد غوری کا قبضہ غزنی سے سرہند تک ہو گیا۔ غرض مختلف لڑائیوں میں اس نے

بہار اور بنگال تک کا علاقہ حاصل کرلیا۔ محمد غوری نے ۱۲۰۳ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اور مسلمان ہندوستان آتے رہے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ خاندانِ غلاماں: ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک خاندانِ غلاماں کا دور رہا۔

۲۔ خاندانِ خلجی: یہ خاندان ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک حاکم رہا۔

۳۔ خاندانِ تغلق: یہ خاندان ۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۴ء تک رہا۔

۴۔ خاندانِ سادات: یہ خاندان ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۰ء تک

۵۔ خاندانِ لودھی: ۱۴۵۰ء سے ۱۵۲۶ء تک

۶۔ خاندان مغلیہ ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک:

خاندانِ لودھی کے بعد ہندوستان کی حکومت خاندانِ مغلیہ کے حصے میں آئی اور بابر ہندوستان میں آیا خاندانِ مغلیہ کے بادشاہوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ظہیر الدین بابر: ۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۰ء تک

۲۔ نصیر الدین ہمایوں: ۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۰ء تک

۷۔ سوری خاندان:

۱۔ شیر شاہ سوری جو ایک بہادر سردار تھا۔ اٹھا اور اس نے ہمایوں کو نکال بھگایا۔ ۱۵۳۹ء سے ۱۵۴۵ء تک قابض رہا۔

۲۔ سلیم شاہ سوری: ۱۵۴۵ء سے ۱۵۵۳ء تک بادشاہ رہا۔ جو شیر شاہ کا بیٹا تھا۔

۳۔ عادل شاہ سوری: ۱۵۵۳ء سے ۱۵۵۵ء تک

پھر مغلیہ خاندان اور ہمایوں:

ہمایوں جو شیر شاہ سے بھاگ کر ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی کے پاس چلا گیا وہاں ایک سال رہا آخر ۱۵۵۵ء میں چودہ ہزار ایرانی سپاہی لے کر لوٹا اور پندرہ سال کی جلاوطنی کے بعد پنجاب دہلی اور آگرے پر قابض ہوا۔

۴۔ اکبر بادشاہ: یہ بادشاہ ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک حکومت کرتا رہا۔ اکبر نصیر الدین ہمایوں کا لڑکا تھا۔

۵۔ نور الدین جہانگیر: ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء تک بادشاہت کی۔ یہ اکبر بادشاہ کا فرزند تھا۔

۶۔ شہاب الدین شاہجہاں: ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک حکومت کی۔ شاہ جہاں جہانگیر کا بیٹا تھا۔

۷۔ اورنگزیب عالمگیر: ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک بادشاہت کی جو کہ شاہجہان کا فرزند تھا۔

۸۔ معظم بہادر شاہ یا شاہِ عالم: ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۱ء تک سلطنت کی۔ یہ عالمگیر کا بیٹا تھا۔

۹۔ جہاندار شاہ: بہادر شاہ کے بعد ۱۷۱۱ء میں تخت پر بیٹھا اور اسی سال لاہور میں وفات پا گیا۔

۱۰۔ فرخ سیر: ۱۷۱۲ء سے ۱۷۱۹ء تک بادشاہت کرتا رہا۔

۱۱۔ رفیع الدرجات: ۱۷۲۰ء چند ماہ بعد دِق اور سل میں بیمار رہ کر مر گیا۔

۱۲۔ رفیع الشان: ۱۷۲۰ء رفیع الدرجات کا بھائی تھا۔ یہ بھی دق اور سل میں چند ماہ کے بعد مر گیا۔

۱۳۔ محمد شاہ: ۱۷۲۰ء سے ۱۷۴۸ء تک حکومت کی (شاہ ولی اللہ کے دور میں)

۱۴۔ احمد شاہ: ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک حکومت کی جو محمد شاہ کا بیٹا تھا۔

۱۵۔ عالمگیر ثانی: ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۹ء تک حکومت کی (اس کو غازی الدین نے قتل کر دیا تھا۔)

۱۶۔ علی گوہر شاہِ عالم ثانی: باپ کا بیدردانہ قتل دیکھ کر بھاگ گیا تھا اور پندرہ سال جلاوطنی میں گذارے۔ ۱۷۷۲ء میں وہ مرہٹوں کی حفاظت میں دہلی واپس آیا۔ شاہ عالم ثانی برائے نام بادشاہ تھا۔ مرہٹے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ ۱۷۸۵ء میں نواب

نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر روہیلے نے عارضی طور پر دہلی پر قبضہ کرلیا جس نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال ڈالیں ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا اور شاہ عالم ثانی کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہوگیا۔

۱۷۔ اکبر شاہ ثانی: ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک یہ برائے نام بادشاہ رہا۔ ۱۸۳۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

۱۸۔ سراج الدین بہادر شاہ ظفر: ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا بیٹا بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۷ سال کے قریب تھی۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں حصہ لینے کے باعث انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے رنگون میں نظر بند کردیا جہاں ۹۲ سال کی عمر میں ۱۸۶۲ء میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوگیا۔ (ماخوذ از تاریخ ہندوستان عبدالقادر)

سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ۱۸۰۳ء:

یوں تو سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ۱۸۰۳ء میں ہوگیا تھا لیکن پھر بھی بہادر شاہ ظفر دلی کے لال قلعے میں بیٹھے تھے اور برائے نام بادشاہ کہلاتے تھے مگر ۱۸۵۷ء میں قلعہ سے بھی نکلنا پڑا۔

مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ:

سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کی ہزار سالہ سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور نہایت بے کسی کے عالم میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوگیا۔

مختلف مسلمان حکومتوں کی مدت حکومت کا خلاصہ:

محمد بن قاسمؒ سے سلطنت مغلیہ تک مختلف خاندانوں کے مسلمان فرمانرواؤں کی حکومت کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ عربوں کی حکومت محمد بن قاسم کے عہد سے سندھ پر	۱۲۵ سال
۲۔ خاندان غزنوی کی حکومت تقریباً	۱۵۰ سال
۳۔ غوریوں کی حکومت تقریباً	۵۸ سال
۴۔ خاندان غلاماں	۸۴ سال
۵۔ خاندان خلجی	۳۰ سال
۶۔ خاندان تغلق	۹۴ سال
۷۔ خاندان سادات	۳۶ سال
۸۔ لودھی خاندان	۷۶ سال
۹۔ خاندان سوری	۱۷ سال
۱۰۔ خاندان مغلیہ	۲۶۰ سال
میزان کل	**۹۳۰ سال**

مسلمانوں کی حکومت رہی۔

نوٹ: ۱۷ سال ہمایوں کی جلاوطنی کو نکال کر اور ۱۸۰۳ء میں دہلی کو انگریزوں کے فتح کرنے تک۔

انگریزوں کی سلطنت اور ان کی فتوحات

۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک

اب ہم آپ کو سلطنتِ مغلیہ کے عہد جہانگیر میں انگریزوں کی آمد اور ان کے بتدریج تسلط کے متعلق بتانا چاہتے ہیں ہندوستان انگریز ایک تاجر کی حیثیت سے داخل ہوا اور تقریباً دو سو سال حکومت کرنے کے بعد ایک حاکم کی حیثیت سے گیا۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں کمپنی کی حکومت قائم رہی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ حکومت براہ راست برطانیہ کے تاج کے ماتحت ہوگئی۔ انگریز نے ۱۸۵۷ء تک بنگال و برما اور جنوبی ہند سے لے کر دہلی پنجاب اور سندھ تک کا تمام علاقہ جائز و ناجائز حربے استعمال کر کے انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ جس کی ابتدا کلایو جیسے بددیانت شخص سے ہوئی اور انتہا ایک دشمنِ اسلام شخص ماؤنٹ بیٹن پر ہوئی۔ انگریز کی فتوحات مندرجہ ذیل ہیں:

سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں:

۱۔ ملکہ الزبتھ کے عہد میں لندن کے چند تاجروں نے مل کر ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ ۱۶۱۵ء میں سر طامس رو انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کا سفیر بن کر جہانگیر کے دربار میں آیا۔ اور تین سال میں اس نے بہت سے تجارتی حقوق حاصل کئے اور رفتہ رفتہ اپنی حفاظت کے بہانے سے اسلحہ اور سپاہی رکھنے شروع کر دیئے اور سیاسی چالیں چلنی شروع کر دیں۔ ۱۷۶۳ء تک انگریزوں نے فرانسیسیوں اور دیگر یورپین اقوام کا زور جنوبی ہند میں بالکل ختم کر دیا۔

میر جعفر کی غداری رابرٹ کلایو کی سازش اور نواب سراج الدولہ کی شہادت:

۲۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال میں نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان پلاسی کی لڑائی ہوئی جس میں کلایو نے میر جعفر سے ساز باز کر کے نواب کو شکست دی اور وہ قتل ہوا۔ انگریزوں نے بنگال سے دل کھول کر دولت حاصل کی اور بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں پلاسی کی رہی سہی کسر بھی نکل گئی۔ کیونکہ اس میں شہنشاہِ ہندوستان کو بھی شکست ہوئی۔ جس سے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے علاقے ہاتھ آئے۔

۳۔ ۱۷۷۴ء سے ۱۷۸۵ء تک وارن ہیسٹنگز نے غازی پور سے بنارس تک کا علاقہ ظلم وستم کر کے حاصل کیا۔

۴۔ ۵۔ ۶۔ ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک لارڈ ولزلی نے میسور کی چوتھی جنگ مرہٹوں کی دوسری اور تیسری جنگ میں فتح حاصل کر کے مندرجہ ذیل علاقوں کو انگریزی عملداری میں شامل کرلیا:

تنجور، سورت، کرناٹک، روہیل کھنڈ، گورکھپور، گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ (دو آب)، بلاری، کڈاپہ، کنارا، کوئمبٹور، کٹک، بالاسور، بھڑوچ، احمد نگر، علی گڑھ، دہلی، آگرہ

۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۸۱۳ء تا ۱۸۲۳ء لارڈ ہیسٹنگز نے گورکھوں سے گڑھوال، کماؤں اور ترائی کے علاقے حاصل کئے۔ مرہٹوں کی چوتھی جنگ میں مرہٹوں سے ناگپور، اندور اور احاطہ بمبئی کے علاقے حاصل کئے۔ جس میں احمد نگر، خاندیش اور کاٹھیاوار شامل تھے۔

۱۱۔ لارڈ ایمہرسٹ نے ۱۸۲۳ء تا ۱۸۲۸ء آسام، اراکان، تناسرم، بھرت پور اور ولیم بنٹنک نے میسور، کچھار اور کورگ کو انگریزی عملداری میں شامل کیا۔

۱۲۔ ۱۳۔ لارڈ ٹرک لینڈ اور ایلن برائے ۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۴ء تک دہلی سے ستلج تک کا علاقہ اور سندھ انگریزی حکومت میں شامل کیا۔

۱۴۔ تا ۱۸۔ ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی دوسری جنگ میں پنجاب انگریزوں کے ہاتھ

آیا۔ ۱۸۵۲ء میں برما کی جنگ میں پروم اور پینگو کو ملا کر لوئر برما کا تمام علاقہ انگریزوں کو مل گیا۔

۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۰ء لارڈ ڈلہوزی نے مندرجہ ذیل علاقوں کو بذریعہ الحاق انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا۔

پنجاب، پیگو، پردم، ستارہ، جھانسی، ناگ پور، جیت پور، سنبھل پور، اودھے پور، بگھاٹ، اودھ، برار، احاطہ مدراس۔

الغرض جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۵۸ء کے آخر میں تمام ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں آگیا اور ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء تک وہ ہندوستان پر حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ ہندوستان کو دو حصوں یعنی پاکستان اور بھارت میں تقسیم کرکے خاموشی سے انگریز چلا گیا۔

انگریزوں کی بتدریج فتوحات کا نقشہ ملاحظہ کیجئے جو آپ کی بصیرت کیلئے پیش کیا جاتا ہے۔ ہم نے ہر علاقے پر نمبر بھی لگا دیئے ہیں تاکہ سمجھنے میں سہولت ہو۔

برعظیم پاک وہند سلطنت برطانیہ کی توسیع ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

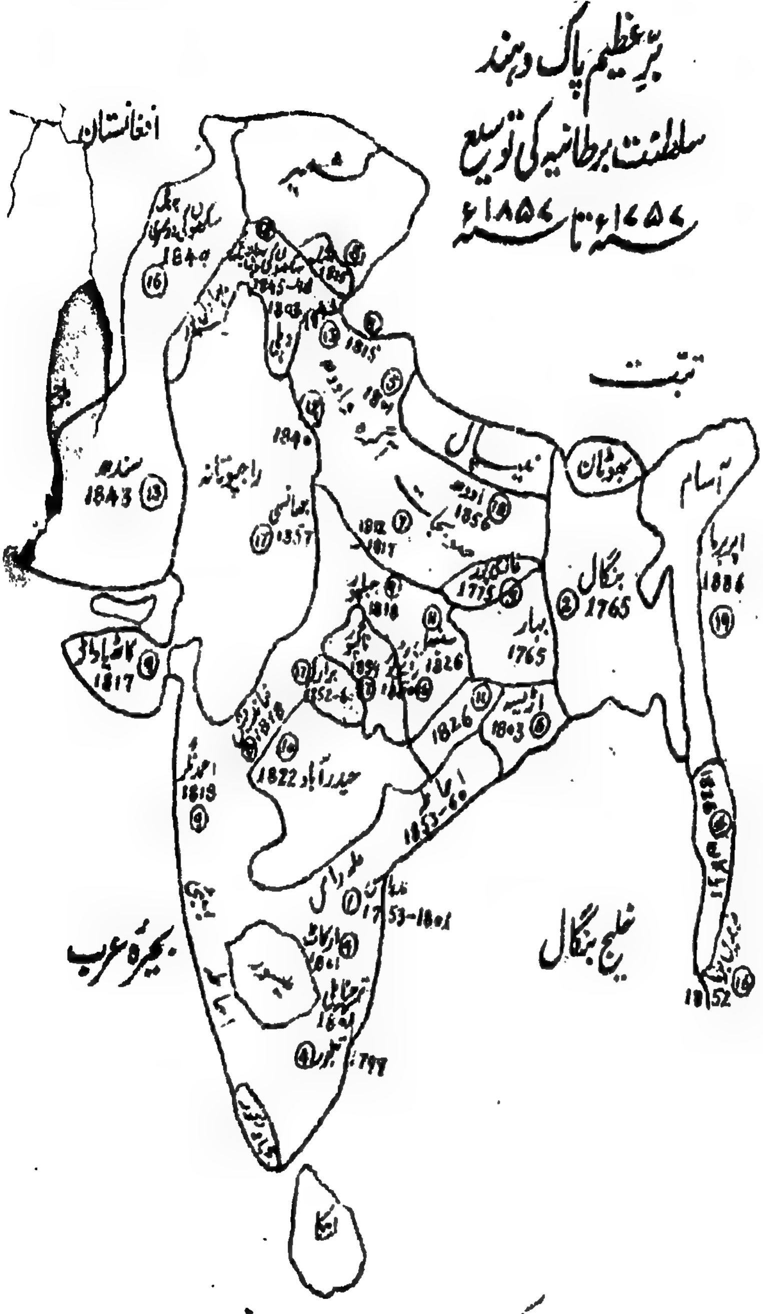
برعظیم پاک وہند
سلطنت برطانیہ کی توسیع
۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء
افغانستان
کشمیر
تبت
نیپال
بھوٹان
آسام
سندھ 1843
راجپوتانہ
جھانسی 1857
اودھ 1856
بنگال 1765
بہار 1765
کاٹھیاواڑ 1817
حیدرآباد 1822
احمد نگر 1818
اڑیسہ 1803
1826
1815
1840
1849
1853-60
1801
1852
1886
مدراس 1753-1801
بحیرۂ عرب
خلیج بنگال
لنکا
بحر ہند

انگریزوں کی کمینہ حرکتیں

سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب پر اگر غور کیا جائے تو ادنیٰ تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کے بعد ان کا کوئی قابل جانشین پیدا نہیں ہوا۔ علاوہ ازیں اگر حیدر علی، سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو اپنے علاقوں میں ابھرے بھی تو ان کے غدار اور نمک حرام وزیروں میر جعفر اور صادق نے انگریزوں سے سازش کر کے انہیں ہلاک کرا دیا۔ حیدر علی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں سلطنت مغلیہ کے امراء اور شہزادے اپنے اقتدار اور ذاتی خود غرضیوں کے باعث سلطنت مغلیہ کو کمزور بنا چکے تھے۔ نمک حرام غدار انگریز جو تجارتی مقاصد لے کر ہندوستان میں آیا اور سارے ہندوستان کو جوڑ توڑ اور کہیں فوجی طاقت سے ہڑپ کر گیا اب اس کا تمام ہندوستان پر اقتدار تھا لیکن اقتدار کے نشے میں چور ہو کر نہایت ہی اوچھے حربوں اور کمینہ حرکتوں پر اتر آیا۔ آہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا۔

۱۸۵۷ء کا جہاد حریت اور اس کے اسباب:

لارڈ ڈلہوزی کے بعد ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ ہندوستان میں گورنر جنرل ہو کر آیا۔ جب وہ کلکتے پہنچا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر جگہ امن و امان ہے لیکن جلد ہی سنگین صورتحال سے دوچار ہوا جس نے انگریزی اقتدار کو خطرے میں ڈال دیا۔ انگریز اسے ہندوستانی سپاہیوں کا غدر کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا آغاز فوج کے غیر ملکی افسروں کے خلاف ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کی شکل میں رونما ہوا تھا۔ یہ سپاہی غیر مطمئن تھے کیونکہ غیر ملکی افسروں کا سلوک ان کیساتھ ناروا تھا اور وہ ان کے مذہبی عقائد میں بھی مداخلت کر رہے تھے۔ سپاہیوں کی یہ بغاوت عوام میں بھی پھیل گئی۔ دراصل یہ بغاوت نہ تھی بلکہ غیر ملکی اقتدار کا جوا اپنی گردن سے اتارنے کیلئے برعظیم کے عوام کی ایک کوشش تھی اسی لئے اس کو جنگ آزادی کہا جاتا ہے۔

دیسی ریاستوں پر قبضے سے بیروزگاری:

لارڈ ڈلہوزی نے دیسی ریاستوں پر قبضہ کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی اس سے بہت بیروزگاری پھیل گئی۔ اس برعظیم کے لوگوں کو ان ریاستوں میں جو اعلیٰ عہدے اور منصب حاصل تھے اب وہ اعلیٰ عہدے اور منصب انہیں نہ ملے۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے انتقال کے بعد کوئی مغل شہنشاہ نہیں کہلائے گا اور بہادر شاہ کے وارث لال قلعہ کو خالی کر دیں گے۔ اس طرح اس برعظیم سے مسلمانوں کی حکومت کا آخری نشان بھی مٹا دیا جائے گا۔

مسلم اور ہندو مذہبی احساسات کی پامالی:

مزید برآں اس برعظیم کے مسلمان اور ہندو لوگوں کے مذہبی احساسات، رسم و رواج کے امتیازات کو انگریزوں نے جو اندھا دھند کچلنا شروع کر دیا تھا وہ اس جنگ آزادی کا بہت بڑا سبب بنا۔ کمپنی کی حکومت عیسائی پادریوں اور مشنریوں کی کھلم کھلا سرپرستی کر رہی تھی لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ کمپنی کی حکومت ہمیں عیسائی بنانے پر تلی ہوئی ہے اور ہماری مذہبی اور مجلسی روایات اور ادارے خطرے میں ہیں۔ کمپنی کی حکومت نے عوام کی ان جائز شکایتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ خود سرسید نے ”اسباب بغاوت ہند“ میں لکھا ہے کہ کمپنی کی حکومت کے افسر اپنے ماتحت ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ

> ”ہماری کوٹھی میں آن کر پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا کوئی شخص حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا۔“

لیکن جہاں کہیں روک ٹوک کا اندیشہ ہوتا ان علاقوں میں بقول سرسید

> ”یہ رواج نکلا کہ پادری صاحبوں کے ساتھ تھانے کا ایک چپراسی جانے لگا۔“

سرسید یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> ”پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد

کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور تکلیف پہنچتی تھی۔"

(اسباب بغاوت ہند صفحہ ۲۷)

اس کے علاوہ سکولوں اور کالجوں میں بھی یہی عیسائی بنانے کا جال بچھایا جا رہا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ:

> "بڑے بڑے عالی قدر حکام متعمداً ان سکولوں میں جاتے تھے اور لوگوں کو اس میں داخل اور شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ طالب علموں سے جو لڑکے کم عمر ہوتے تھے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون؟ تمہارا نجات دینے والا کون؟ وہ عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے تو اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔"

بلکہ پادری ایڈمنڈ نے ایک گشتی چٹھی حکومت سے تعلق رکھنے والے ہر اس شخص کو لکھی تھی جو ملک میں کسی قسم کا امتیاز رکھتا تھا جس کے ابتدائی الفاظ یہ تھے کہ:

> "وہ وقت آ گیا ہے کہ اس مضمون پر سرگرمی سے غور کیا جائے کہ سب لوگوں کو ایک ہی مذہب (یعنی عیسائی) اختیار کرنا چاہئے۔"

سرسید لکھتے ہیں کہ:

> "ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آ گیا۔ پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔ سب کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آ گیا۔ اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان (عیسائی) ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو۔ سب لوگ بیشک یہ سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ آپس میں ہندوستانی لوگ اہلکاران سرکاری سے پوچھتے تھے کہ تمہارے پاس بھی آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم بھی بہ سبب لالچ نوکری کے کرسٹان ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی اہلکاروں کو الزام لگایا کہ جن کے پاس چٹھیاں آئی تھیں وہ مارے شرمندگی اور بدنامی کے چھپاتے تھے اور انکار کرتے تھے کہ ہمارے پاس تو نہیں آئی۔ لوگ جواب دیتے تھے کہ اب آ جائے گی۔ کیا تم سرکار کے نوکر نہیں ہو۔"

(اسباب بغاوت ہند صفحہ ۳۰)

فوج میں خنزیر اور گائے کی چربی لگے ہوئے کارتوسوں کی تقسیم:

اس اثنا میں فوج میں ایسے کارتوس جاری کئے گئے جن پر گائے اور سور کی چربی ملی ہوتی تھی۔ ہندو اور مسلمان سپاہیوں نے ان کارتوسوں کی مخالفت کی جن سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا انہیں سخت سزائیں دی گئیں یہاں تک کہ بعض کو پھانسی بھی دی گئی۔

ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی پالیسی کا ثبوت اس تقریر سے بھی ملتا ہے۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے چیئرمین منگلس نے ۱۸۵۷ء میں لندن کی پارلیمنٹ میں کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ:

> ”خدا نے ہندوستان کی یہ عظیم الشان سلطنت انگلستان کو اس لئے سونپی ہے کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حضرت عیسیٰ کی فتح کا علم لہرانے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنی پوری طاقت اس کام میں لگا دینی چاہئے۔ کہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے اعلیٰ وارفع مقاصد کو پورا کرنے میں ذرا بھی ڈھیل نہ آنے پائے۔“

ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے منصوبوں کی تائید میکالے کے اس خط سے بھی ہوتی ہے۔ جو اس نے ۱۲/ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو ہندوستان سے اپنی والدہ کے نام لندن بھیجا تھا۔ لکھتا ہے:

> ”اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے پختہ یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال بعد بنگال میں ایک بھی بت پرست (غیر عیسائی) نہ رہے گا۔“

(بحوالہ اخبار کوہستان مورخہ ۵/ اگست ۱۹۶۴ء صفحہ ۸ کالم ۲)

میرٹھ چھاؤنی سے فوجوں نے علم حریت بلند کیا:

یہ وہ اسباب تھے جن کے باعث حریت کا جھنڈا مجاہدین آزادی نے بلند کیا۔ بالخصوص سور اور گائے کی چربی کے کارتوسوں نے جن کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا آگ پر تیل کا کام کیا۔ فوجوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے سینکڑوں فوجیوں

کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۰/ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی چھاؤنی کے فوجیوں نے جیل کے دروازے توڑ ڈالے، محافظوں کو قتل کیا یہ اتوار کا دن تھا۔ انگریز افسر گرجا کا رخ کر رہے تھے۔ میرٹھ کی جیل میں جو قیدی تھے ان میں سواروں کی ایک پلٹن اور پیادوں کی دو پلٹنیں تھیں۔ جنگ آزادی کا آغاز انہی سے ہوا۔ الغرض قیدی محافظوں کو قتل کر کے باہر نکل آئے۔ افسروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بنگلے خالی ہونے لگے۔ گرجاؤں کی گھنٹیاں خاموش ہوگئیں۔ جیل سے باہر کے جو حریت پسند تھے وہ بھی شامل ہوتے چلے گئے۔ بیسویں رجمنٹ نے خود ہی دیسی رجمنٹ کے کمانڈر کرنل فینٹس کو اس کی سخت گیریوں کا مزا چکھا دیا اور اس کو قتل کر دیا۔ بعد ازاں دہلی کی جانب بڑھے اور چند گھنٹے میں دہلی پہنچ گئے۔ کیونکہ میرٹھ سے دہلی کا فاصلہ بیالیس میل ہے۔ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کو لال قلعے سے باہر لا کر شہنشاہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

شاہ ظفر کی شمولیت:

بہادر شاہ ظفر بوڑھے اور کمزور تھے۔ اس پیری میں اس ذمہ داری کے اٹھانے کے قابل نہ تھے لیکن انہوں نے مجاہدین کی پیش کش کو رد کرنا بھی دشوار سمجھا۔ بادشاہ نے ان کو اپنی سرپرستی کا یقین دلایا اور کہا کہ:

> ”میں مال اور جان سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن میرے پاس نہ خزانہ ہے نہ فوج۔ ہاں جو کچھ میرے پاس ہے اسے نکال لو۔ کمر ہمت باندھ کر اپنے خون کے پیاسوں کو ملک سے نکال دو۔ ہنگامی اخراجات کیلئے میرا سکہ جاری کر دو۔“

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی پر مجاہدین حریت کا قبضہ:

مجاہدین آزادی نے بادشاہ کو اپنی جانیں قربان کر دینے کا یقین دلایا۔ چنانچہ دہلی جس پر انگریزوں کا مکمل قبضہ تھا چھ دن کی زبردست خونریزی کے بعد ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء کو اس پر حریت پسندوں نے فتح کر کے قبضہ کر لیا اور دہلی میں بادشاہ بہادر شاہ کی بادشاہت سے سلطنت مغلیہ میں پھر جان پڑ گئی۔

بہادر شاہ کی مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی پوزیشن:

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہنگامہ آزادی سے پہلے تمام ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا مکمل قبضہ ہو گیا تھا۔ دہلی بھی مکمل انہی کے قبضے میں تھی جس میں ریزیڈنٹ رہتا تھا۔ بادشاہ بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے صرف قلعہ معلّٰی میں ان کی حکومت سمٹ کر رہ گئی تھی۔ وہاں بھی شہزادوں اور امرا میں رات دن کی نوک جھونک رہتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بہادر شاہ کو صرف وظیفہ ملتا تھا۔ وہ بھی ناکافی تھا۔ وظیفے میں زیادتی کی درخواست دی گئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے کہا کہ جو کچھ وظیفہ ملتا ہے اسی میں گذارہ کیا جائے۔ یہ بات بہادر شاہ کو سخت ناگوار گذری۔ بلکہ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ بہادر شاہ ظفر کی وفات کے بعد لال قلعہ خالی کرالیا جائے گا اور ان کی اولاد کو پندرہ ہزار ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ بہادر شاہ کے ہوتے ہوئے بھی لال قلعہ میں انگریز سیاحوں کو بادشاہ کی اجازت کے بغیر انگریزوں کے لال قلعہ کے محافظ سیر کرنے کی اجازت دے دیتے تھے اور انگریزوں کے جاسوس بادشاہ کے محل کی منٹ منٹ کی خبریں کمپنی کے افسروں کو پہنچاتے تھے۔

لارڈ کیننگ گورنر جنرل:

۱۸۵۷ء میں جب ہنگامہ آزادی برپا ہوا اس زمانے میں لارڈ کیننگ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ یہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۸ء تک گورنر رہا۔

۱۸۵۷ء کی دہلی:

دہلی سلاطین مغلیہ کا پایۂ تخت تھی خصوصاً شاہجہان کے لال قلعے کی تعمیر کے بعد تو دہلی ہندوستان کی دلہن بن گئی تھی۔ یہاں بڑے بڑے علما، فضلا، اطبا، اولیا، شعرا، شرفا بستے تھے۔ مغلیہ بادشاہوں کے قیام کی وجہ سے بقول میر تقی میر یہ حالت تھی ؎

دہلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب
رہتے ہیں منتخب ہی جہاں روزگار کے

دہلی اور دیگر علاقوں پر بہادر شاہ کا جھنڈا:

دہلی کو انگریزوں سے آزاد کرالیا گیا، کچھ انگریز قتل کئے گئے لیکن بعد ازاں بہادر شاہ ظفر نے حکم جاری کیا کہ انگریزوں کو قتل نہ کیا جائے دراصل دہلی اور تمام ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ غاصبانہ اور جابرانہ تھا۔ بادشاہ قانونی اور اخلاقی طور پر بہادر شاہ ہی تھے۔ کمپنی کا قبضہ غیر آئینی تھا۔ انہوں نے اپنی بادشاہی کا اعلان بھی نہیں کیا تھا۔ ابھی تک وہ تاجرانہ حیثیت میں ہی تھے۔

غرض یہ ہے کہ دہلی کے بعد حریت پسندوں نے بہت جلد علیگڑھ، اٹاوہ، نصیر آباد، شاہجہان پور، بریلی، مراد آباد، اعظم گڈھ، گورکھپور، جون پور، الہ آباد پر بہادر شاہ کا جھنڈا لہرادیا۔

یہاں ہم وہ نقشہ پیش کرتے ہیں جو ۱۸۵۷ء میں جہاد حریت کے وقت دہلی کی آبادی سے متعلق ہے۔

۱۸۵۷ء میں دہلی شہر کا نقشہ:

(از کوہستان اخبار ۱۹۶۴ء مضمون عشرت رحمانی)

انگریزوں کے قتل سے پرہیز:

رعایا میں سے انگریز مردوں، عورتوں، بچوں پر قطعاً دست درازی نہیں کی گئی چند جو مارے گئے تھے ان کے بعد احتیاط برتی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خفیہ پولیس کے افسر ولیم سیور نے خود اس بات کی گواہی دی۔ وہ کہتا ہے:

> ''چاہے اور کتنا بھی ظلم اور خون خرابہ کیوں نہ ہوا ہو جو قصے انگریز عورتوں کی بے عزتی کے بارے میں پھیل گئے تھے وہ سب جہاںتک میں نے تحقیقات کی بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے۔'' (اخبار مشرق لاہور صفحہ ۱ کالم ۱)

لکھنو میں ہنگامہ آزادی اور بیگم محل کی سرگرمیاں اور شہزادہ برجیس قدر کی تخت نشینی:

انگریزوں نے جہاں بہادر شاہ ظفر کو قلعہ معلیٰ میں بند کر کے رکھ دیا تھا وہاں اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو بھی شہر بدر کر دیا تھا اور ان کو عیاش ثابت کر کے اور طرح طرح کے الزام لگا کر بدنام کیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ سب ان کے خلاف پروپیگنڈہ تھا وہ نہایت زیرک، فہیم اور خوددار نواب تھے۔ انہوں نے اپنے پہلوں کی خرابیوں کی اصلاح کی۔ روزانہ صبح کو فوجی پریڈ کا معائنہ کرتے۔ برسوں کی زنگ آلود تلواروں اور اسلحہ کو صاف کرایا اور خاموشی سے نوجوانوں میں انگریز سے نفرت اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اپنوں ہی نے یہ سب باتیں انگریزوں کو بتا دیں جس پر وہ جلاوطن کر دیئے گئے۔ بیگم محل نواب واجد علی کی بیگم ۵۶۔ ۱۸۵۷ء میں پردہ نشینی کے عالم ہی میں خفیہ تنظیم کرتی رہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔

۲ مئی ۱۸۵۷ء کو لکھنو میں جنگ آزادی کا آغاز:

۲ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی اور میرٹھ سے پہلے لکھنو میں محمدی جھنڈا بلند کر کے جنگ آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ سب سے پہلے آغا مرزا عرف کمبل پوش کو سردار بنا کر دو سو مجاہدین کے ساتھ

محمدی پرچم تلے جلوس کی شکل میں گشت کرنے بھیج دیا۔ (قیصر التواریخ) انگریزی ریزیڈنٹ نے سب کو گرفتار کرا کے پھانسی پر لٹکوا دیا۔ بیگم محل نے مجلس مشاورت منعقد کی اور بے شمار لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ حضرت بیگم محل مجاہدین کے لشکر کو پس پردہ خطاب کرتیں۔ ان کا نعرہ تھا "کفار کو وطن سے نکال دو۔"

آخر حضرت محل کی سرکردگی میں بیلی گارڈ پر لشکر مجاہدین نے حملہ کر دیا۔ انگریزی افواج پسپا ہونے لگیں۔ بعد ازاں ۲۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کی فوج کو مکمل شکست دینے کیلئے بیلی گارڈ پر سخت حملہ ہوا۔

مولانا احمد اللہ شاہ سپہ سالار:

مولانا احمد شاہ صاحب ان کے سپہ سالار تھے گیارہ دن کے اندر لکھنو کی سرزمین فرنگیوں سے خالی ہو گئی اور واجد علی شاہ کے بیٹے کو جو بیگم محل سے تھے یعنی برجیس قدر جن کی عمر دس سال تھی باپ کی جگہ بٹھا دیا گیا۔ بعد ازاں کانپور سے انگریزوں کی فوجیں آ گئیں لڑائی ہوتی رہی۔ مختصر یہ کہ جنرل اوٹرم سخت بھاری کمک سے مجاہدین پر حملہ آور ہوا اور مسلسل انگریزوں کی طاقت بڑھتی گئی۔ حضرت محل اور برجیس قدر کو شہر سے باہر بھیج دیا گیا تھا لیکن تا بکے مجاہدین کی بڑی تعداد شہید ہو گئی۔ جو بچے پھانسی دیئے گئے اور لکھنو پھر کئی ماہ بعد انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ برجیس قدر صرف آٹھ ماہ بارہ دن نواب رہے اور پھر گرفتار ہو گئے وکٹوریہ کی جوبلی ۱۸۹۱ء میں ان کا قصور معاف ہوا۔ پھر اپنوں ہی میں سے کسی نے ان کو زہر دے دیا اور ۱۵/ اگست ۱۸۹۳ء میں وفات پا گئے۔ حضرت محل کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا اور واجد علی شاہ بھی نظر بندی میں وفات پا گئے۔

جنگ آزادی کا تیسرا مرکز کانپور:

جنگ آزادی کا تیسرا مرکز کانپور تھا وہاں نانا صاحب جنہیں ہندو پنتھ کہتے تھے۔ حریت پسندوں کا سردار تھا وہاں انگریزی فوجوں نے بیس دن تک مقابلہ کیا اور انگریزوں کو شکست دی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ہیولاک انگریزی فوج لے کر کانپور پہنچ گیا اور نانا کو شکست ہوئی اور وہاں سے بھاگ نکلا اور کچھ پتہ نہ چلا۔

جنگ آزادی کا چوتھا مرکز جھانسی تھا:

یہاں بھی حریت پسندوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی بہت سوں کو قتل کیا۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو گدی پر بٹھا دیا گیا تھا اور وہ اپنی فوج کو لڑا رہی تھی تا آنکہ وہ جنگ میں کام آئی اور وہاں پھر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔

تمام ہندوستان میں حریت کے شعلے بھڑک اٹھے تھے:

پرانے اخبارات اور پرانی دستاویزات سے جن کو عشرت رحمانی صاحب نے ترتیب دیا ہے اور جن کی ترتیب دار کوہستان میں "۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک" کے عنوان سے مضامین چھپتے رہے ہیں اور ان چند اوراق میں ہم نے بھی ان کے مضامین سے استفادہ کیا ہے، پتہ چلتا ہے کہ جنگ آزادی کے لئے عرصے سے تیاری ہو رہی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ متولد ۱۷۰۳ء نے انگریزوں کے خلاف تحریک جاری کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند اکبر شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں سے جہاد کا فتویٰ دیا، پھر مولانا سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ صوبہ سرحد فتح کر لیا گیا اور اس میں اسلامی قانون جاری کیا گیا۔ مولانا سید احمد صاحب کے جہاد کا مرکز ریاست ٹونک تھا۔ لیکن بعض پٹھانوں کی غداری سے سکھوں نے اطلاع پا کر بالاکوٹ کے مقام پر چھاپہ مار کر سب کو شہید کر دیا ۱۸۵۶ء میں جب انگریزوں نے اودھ کا الحاق اپنی حکومت میں کر لیا تو مولانا احمد شاہ صاحب، عظیم اللہ خان مردو اثاد مجاہد جنہوں نے نانا راؤ کی لندن میں وکالت کی اور حضرت محل یہ سب انگریزوں کے خلاف تحریک میں پہلے ہی سے مصروف تھے۔

انگریزوں کے اقتدار کا صدر مقام اور مرکز فورٹ ولیم کلکتہ تھا لیکن ملکی اور غیر ملکی سیاسیات کا اکھاڑہ دہلی تھا۔ مولانا احمد اللہ دہلی بھی آئے تھے کہ انقلاب کی روح پھونکیں۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں میں جہاد کی روح پھونکی بالآخر جب پانسہ پلٹا اور لکھنؤ میں حضرت محل اور مولانا احمد اللہ لڑتے لڑتے کمزور ہو گئے تو مولانا احمد اللہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ اس طرح ان کا بھی قصہ تمام ہوا۔

۱۸۵۷ء:

۱۸۵۷ء کی تحریک مولانا سید احمد شہید اور شاہ ولی اللہ تحریک ہی کا اثر تھا۔ ان کی جماعت کے علما نے جہاد ۱۸۵۷ء میں بڑا حصہ لیا۔ مولانا احمد اللہ تو بڑے مجاہد تھے ہی مولانا فضل حق خیرآبادی جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے انہوں نے بھی جہاد میں حصہ لیا اور ان کو بھی انگریزوں نے گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیا۔ ذوالفقار الملک نواب خان بہادر نے ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو فیض آباد میں جہاد کا علم بلند کیا اور روہیل کھنڈ کے تمام علاقے پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس علاقے میں شاہجہانپور، مراد آباد، بجنور (راقم الحروف کا ضلع) بھی شامل تھا۔ نواب محمود خان جن کو سرسید نا ’’محمود‘‘ کہتے ہیں بجنور اور اس کے تمام علاقے پر قابض ہو گئے حالانکہ محمود خان نجیب الطرفین یوسف زئی روہیلے پٹھان تھے۔ وہ نواب نجیب اللہ نواب آباد ضلع بجنور کے پڑپوتے تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو وہ بھی مجاہدین کی کمان کر رہے تھے۔ ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نواب محمود خان نے محمدی جھنڈے کو بلند کر دیا۔ اس عرصے میں مولوی منیر خان چار سو مجاہدین کے گروہ کے ساتھ نجیب آباد پہنچے۔

بجنور مجاہدین کے قبضے میں:

مسلمانانِ بجنور نے ملا اخوان یوسف کو اپنا رہنما بنا لیا اور جلال آباد (ضلع بجنور تحصیل نجیب آباد) میں جہاد کا حکم دیا اور ادھر مراد آباد کی انقلابی شورش اور جیل خانے کے ٹوٹ جانے کی اطلاع نجیب آباد آئی اور وہاں جہاد کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ انگریزوں میں مقابلے کی تاب نہ تھی اس لئے خاموشی سے انہوں نے بجنور خالی کر دیا اور محمود خان کا بجنور پر تسلط ہو گیا۔ اس زمانے سرسید بجنور میں صدر امین اور انگریزوں کے خیر خواہ تھے لیکن اس کے بعد ہندو ٹھاکر نواب محمود خان کی مخالفت پر کھڑے ہوئے ان کو بھی انہوں نے مطیع کر لیا۔

شیرکوٹ ضلع بجنور اور ماڑے خان:

نواب محمود خان کو معلوم ہوا کہ شیرکوٹ میں ماڑے خان بھی طاقت پکڑ گیا ہے لہٰذا

اس کو ٹھیک کیا جائے۔ سر سید تاریخ سرکشی بجنور میں لکھتے ہیں:

> ”دسویں جولائی کو احمد اللہ خان (نواب محمود خان کا بھانجا) نجیب آباد سے نگینے آیا اور چودھویں کو دھام پور (ضلع بجنور شیر کوٹ سے چار میل ہے) پہنچا۔ وہاں جانے کا مطلب یہ تھا کہ امام بخش عرف ماڑے بدمعاش شیر کوٹ نے روپ چند مہاجن کو لوٹا تھا اور لاکھ ہا روپیہ کا مال لے لیا تھا اس کا تدارک کرے اور جو روپیہ اس نے لوٹا ہے وہ اس سے چھین کر اپنے قبضے میں لائے۔ ماڑے نے بھی اپنے پاس سامان لڑائی درست کیا تھا مستعد مقابلہ بیٹھا تھا اس لئے احمد اللہ خان نے دھام پور میں کئی دن مقام کیا۔“

(سرکشی بجنور صفحہ ۱۷۳۔۱۷۴)

سر سید ماڑے خان کے سخت خلاف ہیں اور بعد ازاں لکھتے ہیں کہ ماڑے خان کے فساد سے تنگ آکر شیر کوٹ کے سب ہندو مسلمان احمد اللہ خان سے ملے اوز ماڑے خان کا استحصال چاہا۔ یہ ملاقات ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو ہوئی۔ پھر سر سید لکھتے ہیں:

> ”اس وقت تک احمد اللہ خان سے ماڑے خان کچھ کمزور نہ تھا اس لئے احمد اللہ خان نے ماڑے سے صلح کرنی چاہی۔ اپنے معتمدوں کو بیچ میں ڈالا۔ بڑی منفعت اس صلح میں احمد اللہ خان کو یہ تھی کہ ایک پکا بدمعاش اس کے ہاتھ آتا تھا اور ضلع میں طرح طرح کے فساد برپا کرنے کو ایک بہت اچھا چلتا اوزار ملتا تھا۔“ (صفحہ ۱۷۵)

بہرحال دونوں میں صلح ہوگئی۔ ماڑے خان دھامپور گئے اور احمد اللہ خان سے ملاقات کی اور چار اشرفیاں نذرانے میں پیش کیں اور تلوار کھول کر احمد اللہ خان کے آگے رکھ دی۔ احمد اللہ خان نے تلوار ماڑے خان کے باندھ دی اور شیر کوٹ کو رخصت کیا۔ یہ ۲۲ جولائی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ بعد ازاں احمد اللہ خان شیر کوٹ گئے۔ ماڑے خان نے استقبال کیا۔ امراؤ سنگھ چودھری رئیس شیر کوٹ، کی یہ صاحبان قوت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جو توپ کہ نگینہ سے معرفت نھو خاں بجنور میں آئی تھی ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو شیر کوٹ روانہ ہوئی۔

(سرکشی بجنور صفحہ ۱۷۶)

امراؤ سنگھ سے بارہ سال کی مال گذاری ایک لاکھ روپیہ طلب کر رہے تھے اور مقصد

اس کو زک پہنچانا تھا۔

شیر کوٹ کی پہلی لڑائی ۲۸ جولائی ۱۸۵۷ء:

احمد اللہ خان نے چودھری شیوراج سنگھ اور لچھمن سنگھ زمینداران شیر کوٹ کی حویلی پر توپ لگادی اور اس کے ساتھ ماڑے خان مع ساکنان محلہ کوٹڑہ شریک ہوئے اور حویلی کو لوٹ لیا۔ شیوراج، اس کی بیوی اور بیٹا مارے گئے۔ (سرکشی بجنور صفحہ ۱۷۹)

اس لڑائی سے ضلع کے ہندو اور مسلمانوں میں کشیدگی ہوگئی۔ چودھریوں نے پچیس ہزار ہندو جمع کئے اور احمد اللہ کے پاس صرف دو ڈھائی ہزار تھے۔

شیر کوٹ کی دوسری جنگ ۵/ اگست ۱۸۵۷ء:

۵/ اگست ۱۸۵۷ء کو چودھریوں اور احمد اللہ خان میں جنگ ہوئی۔ احمد اللہ خان گڑھی میں گھر گیا۔ آخر چودھریوں کی فتح ہوئی اور محلہ کوٹڑے کے مسلمانوں کا حملہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ لیکن احمد اللہ خان مع اپنے چند آدمیوں کے گڑھی میں سے نکل بھاگا اور نجیب آباد پہنچ گیا۔

چودھریوں کا بجنور پر حملہ اور محمود خان پر چڑھائی:

پھر مہاراج سنگھ ہلدور، چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ رئیسان بجنور نے بجنور پر حملہ کیا اور محمود خان پر چڑھائی کی کوٹھیاں اور سرکاری دفتر جلادئے اور بجنور کو فتح کرلیا فتح کے بعد ہلدور والے چودھری ہلدور کو، تاج پور والے تاج پور کو اور چودھری امراؤ سنگھ اور بسنت سنگھ شیر کوٹ اپنی گڑھی میں واپس آگئے۔ یہ ۸/ اگست ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔

ماڑے خان اور ہندوؤں کا قتل:

معاملات چلتے رہے تا آنکہ چودھری امراؤ سنگھ رئیس شیر کوٹ نگینے کو روانہ ہوئے اور ماڑے خان نے یورش کی۔ قاضی برہان الدین قاضی شیر کوٹ نے پٹواریوں کو کہ قوم کے بنئے تھے اپنے گھر میں اکٹھا کرلیا گویا پناہ دی۔ کچھ لوگ قاضی صاحب کے دروازے پر جمع ہوگئے اور

شور برپا کرنے لگے۔ قاضی صاحب نے ان لوگوں کو باہر نکال دیا اور ماڑے خان اور غضنفر علی خان کے ہاتھوں انتیس آدمی مارے گئے۔ ماڑے کی بہت دہشت پھیل گئی۔ یہ ۲۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ محمود خان، احمد اللہ خان، ماڑے خان اور غضنفر علی خان کے درمیان اس طرح تقسیم عمل میں آئی کہ نگینہ دھام پور اور چاند پور ماڑے خان اور غضنفر علی خان کو اور نجیب آباد اور بجنور احمد اللہ خان کو اور یہ سب نواب خان کے ماتحت رہیں گے۔ (سرکشی بجنور از سر سید صفحہ ۲۵۴۔ ۲۵۵)

۲ نومبر کو ماڑے خان اور احمد اللہ خان تاجپور پہنچنے والے تھے۔ چودھری پرتاپ سنگھ کو ماڑے خان نے خط لکھا کہ:

> چودھری صاحب مشفق مہربان کرم فرمائے برحال نیاز مندان چودھری پرتاب سنگھ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام شوق اینکہ ارادہ لشکر ایں جانب بطرف تاجپور است کہ آں صاحب تدبیر رسد وغیرہ صازند چناں نشود کہ بہ کسے نہج تکلیف مردمان لشکر را شود باقی خیریت است فقط رقیمۃ الشوق چودھری امام بخش عرف ماڑے خان از مقام چاند پور مورخہ دوم ربیع الاول ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۸۵۷ء)
>
> چودھری صاحب مشفق مہربان کرم فرمائے برحال نیاز مندان چودھری پرتاپ سنگھ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام شوق اینکہ ہمارے لشکر کا ارادہ تاجپور جانے کا ہے۔ آپ رسد وغیرہ کی تدبیر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کی تکلیف لشکریوں کو ہو۔ باقی خیریت ہے۔ فقط خط شوق چودھری امام بخش عرف ماڑے خان از مقام چاند پور مورخہ ۲/ ربیع الاول ۱۲۷۴ھ۔" (سرکشی بجنور از سرسید صفحہ ۲۵۹)

غرضکہ تمام ضلع بجنور میں جہاد حریت کے ہنگامے برپا ہوئے اور ساتھ ہی ہندو اور مسلمانوں کے آپس میں بھی فساد کے شعلے بھڑکے ضلع بجنور کی قیادت نواب محمود خان کے ہاتھ میں تھی اور ان کے ساتھ ماڑے خان وغیرہ بھی تھے۔ شیر کوٹ اور ضلع بجنور اپنے وطن کا یہ حال ہم نے ذرا خصوصیت سے یہاں محض وطن ہونے کی وجہ سے درج کر دیا ہے۔ ورنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے شعلے جیسا کہ ہم لکھتے آ رہے ہیں میرٹھ کی چھاؤنی کے حریت پسندوں نے جو

انگریزوں کے دشمن فوجی تھے بھڑکائے انہوں نے دہلی فتح کی، مولانا احمد اللہ خان نے ملکہ محل کی سرپرستی میں لکھنو اور دیگر مقامات میں جہاد حریت بلند کیا، عظیم اللہ خان نے دھوندو پنت نانا راؤ کے ساتھ کانپور میں فضل حق خیر آبادی نے دہلی میں جھانسی کی رانی نے قلعہ گوالیار میں، محمود خان نے ضلع بجنور میں، نواب خان بہادر خان نے بریلی میں، مولانا لیاقت علی خان نے الہ آباد میں، سیالکوٹ پنجاب میں مجاہدین نے جنرل نکلسن کی فوج کے ساتھ اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں احمد خان کھرل نے، مولانا عبدالقادر صاحب لدھیانوی نے لدھیانے، جالندھر، پھلور کے علاقوں میں بالخصوص جالندھر کی چھاؤنی میں، علاوہ ازیں لاہور میں بعض مجاہدین آزادی نے جنگ حریت کے شعلے بھڑکائے۔ منشی رسول بخش کاکوروی کی قیادت میں کاکوری میں جہاد ہوا مگر انگریزوں کے غلبے کے بعد مجاہدین کاکوری کو پھانسی لگی۔

تصویر حذف کردی گئی

کوہ مری کی قیادت سردار سمت خان کے سپرد تھی جو انگریزوں کے خلاف پہاڑی قبائل کی کمان کرتے رہے۔ نواب عبدالرحمٰن خان والی جھجر نے جن کو مجاہدین نے رہتک کا حکمران بنایا تھا یہ بھی اپنے علاقے کی کمان سنبھالے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر وزیر خان مشہور مناظر لکھنو میں۔ نواب ولی داد خان والی مالاگڑھ کے لشکر مجاہدین کا پہلا حملہ ہوا اور اسماعیل خان نے انگریزی فوجوں کو بھگا کر بلند شہر پر قبضہ کرلیا۔ مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی سرکاری ملازمت چھوڑ کر جنرل بخت خان بہادر شاہ ظفر کے خیر خواہ کے ساتھ دہلی کے معرکوں میں شریک رہے۔ پھر لکھنو میں سکندر باغ کے معرکوں میں شریک رہے۔ بدایوں اور اس کے اطراف میں اہل بدایوں نے مرزا منصور بیگ کی سرگردگی میں جہاد حریت کے فرائض ادا کئے وہاں کا کلکٹر ایڈورڈس تھا۔ پھر جنرل نیاز محمد خان نے بدایون پر ٹھاکروں کے حملوں کو پسپا کر کے انگریزوں

کے منصوبے خاک میں ملادئے۔ حکیم سعید اللہ نے بھی بدایوں کے معرکے میں مجاہدین کی قیادت کی۔ امروہہ ضلع مراد آباد میں مجاہدین کی قیادت سید شبیر علی خان امروہوی اور سید گلزار علی نے کی۔ مولانا وہاج الدین صاحب مراد آبادی نے مراد آباد میں معرکہ آرائی کی۔ اور انگریزوں کی فوج کے چھکے چھڑادیئے۔ اس جنگ میں عورتوں نے بھی مجاہدین مردوں کے ساتھ مل کر جنگ کی اور جنرل بخت خان بھی مجاہدین کی رہبری کیلئے ایک لشکر لے کر پہنچے۔ مولانا کافی اور نواب مجو خان یہاں لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔ علیگڑھ میں مولانا عبد الجلیل صاحب کی قیادت میں جہاد حریت ہوا اور مولانا نے جام شہادت نوش فرمایا۔ بریلی میں جنرل بخت خان کے ساتھ ساتھ مدار علی خان اور محمد شفیع رسالدار پیش پیش تھے۔ آگرے میں لال بہادر خان میواتی، سید اکبر زمان اور دیگر مجاہدین نے انگریزوں کے چھکے چھڑادئے۔ پٹنہ (بہار) میں بھی مجاہدین نے سرگرمیاں دکھائیں لیکن پٹنے کے مجاہدین بعد میں گرفتار ہوئے اور ان کو پھانسی دی گئی۔ ان پھانسی پانے والوں میں مولانا پیر علی، زمیندار لطف علی خان کے ایک کارندے شیخ گھسیٹا اور سید وارث علی شامل تھے۔ مولانا پیر علی زخموں سے چور تھے۔ دوران مقدمہ بیڑی پہن کر آتے رہے مگر کسی مجاہد کا نام نہیں بتایا۔

مولانا جعفر شاہ تھانیسری جو مولانا سید احمد بریلوی کے معتقدین میں سے تھے انہوں نے بھی سردھڑ کی بازی لگادی۔ گرفتار ہوئے اور کالا پانی بھیجے گئے اور مدت کے بعد واپس آئے۔

حیدر آباد دکن میں بھی شعلہ حریت بلند ہوا اور سب سے پہلے اورنگ آباد میں مجاہدین اٹھے۔ مشرقی بنگال کے اضلاع میں مولوی کرامت علی اور حاجی سید بخت نے حیرت انگیز کارنامے دکھائے۔ غرضکہ کوئی جگہ ہندوستان میں ایسی نہ تھی جہاں جہاد حریت نہ ہو۔ علمانے اس جہاد میں بھرپور قیادت کی وہ انگریز سے ہندوستان کو خالی کرا کر سلطنت مغلیہ کے مسلمان بادشاہ کو بحال اور برسر اقتدار لانا چاہتے تھے اور اس جنگ کو جہاد کہتے تھے۔ چنانچہ مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ خان، مولانا محمد جعفر تھانیسری، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا تبارک علی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریا آبادی، مولانا یحییٰ علی، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی انعام اللہ گویا مفتی لطف اللہ علیگڑھی، فضل امام خیر آبادی، مولانا غلام قادر،

قاضی فیض اللہ کشمیری، مولوی ابوسعید، مولوی رضی اللہ جیسے حضرات جہاد میں شریک تھے۔

تصویریں حذف کردی گئیں

دہلی میں جنرل بخت خان کی آمد اور جہاد کا فتویٰ:

جنرل بخت خان جو کسی وقت انگریزوں کی فوج میں ملازم تھے اور اپنے پیر و مرشد کے ایما پر ملازمت ترک کر چکے تھے وہ جنگ آزادی میں بہت پیش پیش تھے اور اپنی وفاداری کے باعث بہادر شاہ ظفر کے نائب السلطنت بن گئے تھے۔ سید ہاشمی فرید آبادی کا بیان ہے کہ:

> ”دہلی میں ڈیڑھ دو ماہ (مئی اور جون ۱۸۵۷ء) کی سخت بدنظمی اور افراتفری کے بعد بریلی کی فوج انگریز کو ہندوستان سے اور مغل سلطنت کو ذلت کی قبر سے نکالنے کیلئے دہلی پہنچی۔ اس میں صرف کمپنی کے باغی سپاہی نہ تھے بلکہ بہت سے مجاہدین تازہ بھرتی کئے گئے تھے۔ خود سپہ سالار بخت خان روہیلہ خاصہ دیانتدار اور سنجیدہ قسم کا آدمی تھا جو پہلے انگریزی فوج میں رسالداری کر چکا تھا تنظیم اور قواعد جنگ سے آشنا تھا۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اپنے پیر کے حکم سے کافر فرنگی کی نوکری چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ انگریزوں کی ہمعصر شہادتوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ اس نے (۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو) دہلی آکر امن و انتظام پر توجہ کی اور ایک شہری مجلس بٹھائی کہ بدنظمی کو سر اٹھانے نہ دے۔ انہی کارگزاریوں کی بنا پر بہادر شاہ نے ملکی اور عسکری اختیار بخت خان کے سپرد کئے اور اپنا نائب السلطنت بنا دیا تھا۔ حقیقت میں یہی شخص دہلی کے دائرے میں توجہ کا محور ہو کر ذاتی لیاقت و کارروائی سے آگے بڑھا اور دلیری و حوصلہ مندی کے ساتھ انتظام کی قابلیت و فراعت سے انصاف رکھتا تھا۔“ (بحوالہ اخبار کوہستان ۱۹/ اگست ۱۹۶۴ء صفحہ ۸ کالم نمبر ۲۔۳ سلسلہ مضامین عشرت رحمانی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک)

جنرل بخت خان کی آمد کے بعد دہلی میں علما کے مشورے سے جہاد کا اعلان ہوا اور اس اعلان نے عوام کے جوش میں آگ لگا دی۔ بخت خان کی تحریک پر علمائے عصر نے جامع

مسجد دہلی میں جمع ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ جس پر مفتی صدر الدین صاحب آزردہ قاسم العلوم مولانا نانوتوی کے استاد کے بھی دستخط تھے۔ جس کی وجہ سے مفتی صاحب کی جائداد ضبط ہوئی۔ اس فتوے کی اصل عبارت دہلی کے "صادق الاخبار" مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء میں بحوالہ "اخبار الظفر دہلی اردو" شائع ہوئی تھی جواب تک موجود ہے اور بقول عشرت رحمانی ڈاکٹر اظہر عباس ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہندی کتاب "سوتنتر دہلی" میں اس کا عکس حال ہی میں طبع کیا جا چکا ہے۔

نقل استفتا از اخبار الظفر دہلی اردو:

> "کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں؟ اور جو لوگ اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہئے یا نہیں؟ بیان کرو اللہ تم کو جزائے خیر دے گا۔"

جواب:

> درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے، بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے۔ تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا۔ اور اطراف و حوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر (دہلی) کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جائے گا اور اس طرح اس ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً و غرباً فرض عین ہوگا اور جو عدوان بستیوں پر ہجوم اور قتل و غارت کا ارادہ ہو تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا بشرط ان کی طاقت کے۔

العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ

اس جواب کے نیچے ذیل کے علمائے گرامی کے دستخط ہیں:

۱۔ محمد نذیر حسین

۲۔ رحمت اللہ کیرانوی

۳۔ مفتی صدر الدین

۴۔ مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی

۵۔ محمد ضیاء الدین

۶۔ عبد القادر

۷۔ احمد سعید احمدی

۸۔ محمد میر خان (یا میر محمد خان)

۹۔ عبد الکریم

۱۰۔ سکندر علی

۱۱۔ محمد کریم اللہ

۱۲۔ مولوی عبد الغنی

۱۳۔ محمد علی

۱۴۔ فرید الدین

۱۵۔ محمد سرفراز علی

۱۶۔ سید محبوب علی جعفری

۱۷۔ محمد حامی الدین

۱۸۔ سید احمد علی

۱۹۔ الٰہی بخش

۲۰۔ محمد مصطفیٰ خان ولد حیدر شاہ نقشبندی

۲۱۔ محمد انصار علی

۲۲۔ سراج وضیاء الفقہا مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی صاحب

۲۳۔ مولوی سعید الدین

۲۴۔ اللہ الغنی (اتم الفقرا)

۲۵۔ حیدر علی

۲۶۔ سیف الرحمٰن

۲۷۔ سید عبد الحمید

۲۸۔ محمد ہاشم

۲۹۔ سید محمد

۳۰۔ محمد امداد علی

۳۱۔ خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضاۃ محمد علی حسینی

یہ خبریں محمد حسین آزاد کے والد سید محمد باقر نے بھی اپنے دہلی اردو اخبار میں دی تھیں۔ جن کو پھانسی دے دی گئی تھی اور انہوں نے اس فتوے کا بھی اخبار میں ذکر کیا تھا۔ اس فتوے کا بہت اثر ہوا۔ اول تو پہلے ہی سے جنگ آزادی کے شعلے بھڑک رہے تھے لیکن اس فتوے کے بعد اور بھی جنگ کی اہمیت جہاد کے باعث مسلمانوں میں بڑھ گئی۔

جنگ حریت میں تھانہ بھون

ضلع مظفر نگر کی حالت:

جس طرح تمام ہندوستان میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی ضلع مظفر نگر اور ضلع سہار نپور بھی اس کی زد اور لپیٹ سے کہاں بچتا۔ کمپنی کی حکومت ہر جگہ ڈانوا ڈول تھی اور اکثر شہروں سے ان کو نکال باہر کیا گیا تھا اس لئے بستیوں اور قصبوں کا امن معززین شہر کے سپرد تھا۔ تھانہ بھون میں بھی امن بحال رکھنے اور فیصلے چکانے کا کام حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے سپرد ہوا اور شہریوں نے ان کو اپنا سربراہ بنالیا اس سلسلے میں ہم ان حضرات کا بیان پیش کرتے ہیں جو یقین کا درجہ رکھتے ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے خلیفہ ہیں جنہوں نے مولانا گنگوہی کے حالات تذکرۃ الرشید کے نام سے دو حصوں میں تحریر کئے ہیں اور انہوں نے واقعات سے براہ راست واقفیت حاصل کی ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحبؒ امیر تھانہ بھون:

حاجی امداد اللہ صاحب خود تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے جیسا کہ ہم اس کتاب میں ان کی شخصیت پر روشنی ڈال چکے ہیں اور ہم نے ایک مستقل کتاب ”حیات امداد“ کے نام سے لکھی ہے جو طبع ہو چکی ہے بہر حال وہ تمام ہندوستان میں مشہور تھے دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ اور شہزادوں میں ان کا وقار و احترام تھا اور محل کی بیگمات میں بھی ان کی بزرگی کا چرچا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب حاجی صاحبؒ اور تھانہ بھون کے لوگوں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس بدامنی کی حالت میں عام باشندگان قصبہ اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گذران دشوار ہے گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھالیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دیدی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے اس لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکادیا کریں میں اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلے کے موافق چندروز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اسی قصے نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کی جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔'' (تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۷۴)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور جناب مولانا رشید احمد صاحبؒ حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے شرعی مشیر:

قطعی طور پر ثابت ہے کہ حاجی صاحب کو اہل قصبہ نے اپنا امیر شہر مقرر کرلیا تھا اور کچھ عرصے کے لئے تھانہ بھون میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ چونکہ حاجی صاحب شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے اس لئے ان کو شرعی مشیروں اور مفتیوں کی ضرورت تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی دونوں حضرت حاجی صاحب کے مرید تھے اس لئے اس نواح میں ان سے بڑھ کر اور کون شریعت کے احکام بتانے میں ماہر ہوسکتا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحبؒ) قدس سرہ دس برس ہوئے اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کو اپنے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے۔ ہمیشہ آمد ورفت رہتی ہی تھی۔ اب جبکہ ہر چہار طرف بدامنی تھی آپ کیلئے یہاں حاضر رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی ادھر اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا

میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا ہے اس لئے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔'' (تذکرۃ الرشید صفحہ ۷۴ حصہ اول)

ہر دو حضرات کے تھانہ بھون رہنے کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ وہ حاجی صاحب کو احکام شریعت میں مشورہ دیتے رہیں۔ رہا یہ کہ بدامنی کی وجہ سے یہ دونوں حضرات تھانہ بھون رہ پڑے تھے مولانا عاشق الٰہی صاحب نے یہ بات احتیاطاً لکھ دی ہے کہ انگریزوں کی حکومت سر پر تھی۔ اس لئے کئی تاریخی امور میں ہمیں نتائج خود نکالنے پڑیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحبؒ کے علاوہ ان دونوں حضرات کے خدام اور معتقدین بھی یہیں رہ پڑے تھے جن میں مولانا محمد مظہر صاحبؒ نانوتوی، مولانا محمد منیر صاحبؒ نانوتوی وغیرہما یقیناً شامل ہیں اور کتنے ہی اور صاحبان بھی۔

نانوتہ، گنگوہ، تھانہ بھون، شاملی مظفرنگر اور کیرانے میں باہمی رابطہ:

صاف ظاہر ہے کہ جہاد حریت کا مرکز حضرت حاجی صاحب کی وجہ سے تھانہ بھون بنا اور آس پاس کے قصبوں مثلاً نانوتہ، گنگوہی، شاملی ضلع مظفرنگر، کیرانہ اور کاندھلے کے لوگوں سے بھی رابطہ تھا اور یہ حضرات جہاد کیلئے اندر ہی اندر لوگوں کو تیار کر رہے تھے اور ان قصبوں میں ان حضرات کی آمد و رفت تھی۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''اتنی بات یقینی ہے کہ اس گھبراہٹ کے زمانے میں جبکہ عام لوگ بند کواڑوں گھر میں بیٹھے ہوئے کانپتے تھے حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہما) اور نیز دیگر حضرات (یعنی مولانا محمد منیرؒ اور حافظ محمد ضامن صاحبؒ شہید حریت) اپنے کاروبار نہایت ہی اطمینان کے ساتھ انجام دیتے اور جس شغل میں اس سے قبل مصروف تھے بدستور ان کاموں میں مشغول رہتے تھے کبھی ذرہ بھر اضطراب نہیں پیدا ہوا۔ اور کسی وقت حبہ برابر تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ آپ کو اور آپ کے مختصر مجمع کو جب کسی ضرورت کیلئے شاملی کیرانہ اور مظفرنگر جانے کی ضرورت ہوئی غایت درجہ سکون و وقار کے ساتھ گئے اور طمانیت قلبی کے ساتھ واپس ہوئے ان ایام میں آپ کو

ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے حفاظت جان کیلئے تلوار البتہ پاس رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر شیر کی طرح نکلے چلے آتے تھے۔"

(تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۷۴)

صاف اور یقینی طور پر معلوم ہوا کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا رشید احمد صاحبؒ، حافظ محمد ضامن صاحبؒ، مولانا محمد مظہرؒ اور مولانا محمد منیرؒ کی مختصر جماعت لوگوں کو جہاد کیلئے تیار کرنے کے باعث اطراف و جوانب کے قصبات میں پھر رہی تھی ورنہ بدامنی کے زمانے میں وہ کون سے ذاتی کاروبار تھے جن کے باعث یہ صاحبان پھر رہے تھے۔ ان درویش، زاہد اور دنیا سے بے تعلق حضرات کے ذاتی کاروبار نہ ہوئے اور نہ رہے۔ گوشوں میں بیٹھ کر سب اللہ اللہ کرنے والے لوگ تھے۔ اس لئے اب جو یہ آمد و رفت تھی محض جہاد کے لئے تھی اور یہی ذاتی کاروبار تھا یہ بھی معلوم ہوا کہ تلواریں ان صاحبان کے پاس رہتی تھیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ فطری طور پر بہادر اور دلیر مجاہد تھے:

دراصل جہاں اس دور میں انگریزوں کے حامیوں اور اس کی فوجوں سے جہاد جاری تھا وہاں ملک میں آوارہ گرد لوگوں سے بھی مقابلے کرنے پڑتے تھے جن کا کام محض لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے متعلق ان کی فطری بہادری اور بے خوفی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "اسی عرصے میں غدر ہو گیا۔ بعد رمضان احقر کو سہارنپور لینے کو تشریف لائے۔ چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے۔ اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا۔ جب احقر وطن پہنچا چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا (محمد قاسم) کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔

نشانہ بازی:

> اسی زمانے میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ محلے کی مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں لگا رہے تھے اور نشانے کی

> جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں مجھے بھی دکھلاؤ۔ کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانے کا ذکر کیا۔ تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی صاف گولی نشانے پر لگی اور سب مشاق کتنی دیر سے لگا رہے تھے۔ دائرے میں لگ جانے کو نشانے پر پہنچا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی۔ اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادھ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ تھی نہ ہوئی۔ تیراندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں۔
>
> حاصل یہ کہ اس طوفان بے تمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے ہم نے کبھی مولانا (محمد قاسمؒ) کو گھبراتے نہ دیکھا۔ خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے۔ چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلے کی آ گئی اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ۔"

(سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب صاحب صفحہ ۱۷۔۱۸)

ایک مجاہد کیلئے ایسا ہی نڈر اور بے خوف ہونا ضروری ہے۔ جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب اور حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی عبارتوں سے واضح ہوا۔ آپ کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایام ہنگامہ آزادی میں مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس تلوار رہتی تھی اور نانوتے میں بھی بعض مفسدوں سے آپ کا مقابلہ ہوا ہے اور آپ نے مردانگی کے جوہر دکھائے ہیں۔

جہاد شاملی ضلع مظفر نگر کا پس منظر اور سبب:

جہاد شاملی ضلع مظفر نگر کا پس منظر اس کے سوا کیا ہے کہ تمام ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلی ہوئی تھی اور ان کو ہندوستان سے نکال دینے کے متعلق علما نے فتویٰ دے دیا تھا۔ اس فتوے پر مولانا رحمت اللہ صاحب کے بھی دستخط تھے۔ جیسا کہ ابھی گذرا ضلع مظفر نگر

دہلی کے قریب واقع ہے اس لئے ایک ایسے خطے میں جو علما اور اولیاء کا خطہ تھا۔ جہاد کی کھچڑی کیوں نہ پکتی۔ اس لئے عام وجہ تو یہی جہاد کا ہندوستان گیر تخیل تھا لیکن فوری طور پر جہاد کے خیال کو حسب ذیل واقعے نے بھڑکا دیا۔

جہاد کا فوری سبب:

ادھر تو جہاد کی پخت و پز ہو رہی تھی ادھر ایک واقعہ پیش آ گیا جس نے ایک دم جہاد کا شعلہ بھڑکا دیا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”تھانہ (بھون) کے رئیس قاضی عنایت علی خان کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم خان چند ہاتھی خریدنے سہارنپور گیا۔ وہاں ابن آفت رسیدہ کا کوئی بنیا قدیمی دشمن کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا جس کو زمیندرارانہ تحمصات میں عبدالرحیم کے ساتھ خاص عداوت تھی۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاکم ضلع سے جا رپورٹ کی کہ فلاں رئیس بھی باغی و مفسد ہے چنانچہ دہلی میں کمک بھیجنے کیلئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔ زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا اسی وقت دوڑ گئی اور رئیس گرفتار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی ہوئی۔“

(تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۷۴۔۷۵)

اسی صفحے کے حاشئے پر مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”اصل قصہ یوں سنا تھا (سنا کس سے حضرت گنگوہی سے سنا ہوگا) کہ قاضی سعادت علی خان پسر نجابت علی خان رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے دو بیٹے تھے جن میں بڑے لڑکے عنایت علی خان نے باپ کے مرنے پر ریاست کا کام سنبھال رکھا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم خان جو بڑے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے باطمینان حسب خواہش یہاں جی چاہتا چلے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے جان نثار اور شیدا لو عاشق زار تھے۔ اسی گھٹا ٹوپ اندھیاؤ میں جبکہ کئی جگہ غدر پڑ چکا اور دہلی اس کا آشیانہ بنا ہوا تھا عبدالرحیم خان مع چند احباب کے سہارنپور گئے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے۔ زمیندارانہ

قصوں میں آدمی کے دشمن بہتیرے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک بنیا جس کو قدیم سے اس ریاست کے ساتھ عداوت تھی اتفاق سے وہاں مقیم تھا اس نے زمانہ غدر کو غنیمت سمجھا اور پنکھی صاحب انگریز سے جو باغیوں کی سرکوبی کیلئے حکم موت کا مجاز بن کر انتظاماً ضلع سہارنپور میں معین کیا گیا تھا جا مخبری کی کہ تھانہ بھون کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہو گیا۔ چنانچہ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کیلئے ہاتھی خریدنے آیا اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ادھر یہ جھوٹی مخبری ہوئی اور ادھر گلی کوچوں میں دشمنوں نے اس افواہ کو پھیلا دیا یہاں تک کہ ایک گارڈ بسمت سرائے روانہ کیا گیا اور عبدالرحیم خان مع ہمراہیان بالزام بغاوت جیل خانہ بھیج دئے گئے۔ زمانہ تھا احتیاط کا فوراً نا کردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا اور اگلے دن قاضی عنایت علی خان کو (اپنے بھائی کے دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی۔ اس صدمے سے عنایت علی خان پر رنج و غم کے پل ٹوٹ پڑے اور جوش حزن میں بھائی کے انتقال کا خیال پختہ ہو گیا۔ اتفاق سے چند سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اطلاع ہوئی اور یہ اپنے جنون میں مست چند رفقائے کار کو ساتھ لئے شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گذرے ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر بسمت مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے سے فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس فساد کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج لشکر کو حکم ہو گیا جس پر عنایت علی خان نے فساد کھلم کھلا بلند کیا۔ چنانچہ شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پر نقارہ بجایا گیا اور جتھے کا جتھا تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا اور کیا جو کچھ کیا جس وقت گورنمنٹ کو اہلکاران تحصیل کے مارے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم شاملی پہنچا۔ اور چار طرف نعشوں اور قصبے کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصے سے تھرا اٹھا آخر یہ کہہ کر ”تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا۔“ مظفر نگر واپس ہو گیا اس لئے کہ تنہا تھا اور اس بدامنی کے وقت میں جان کا خطرہ قوی۔ چند ماہ بعد جبکہ امن ہوا اور دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی تو قاضی صاحب کو اپنی

> جان کا فکر ہوا یہانتک کہ تھانہ بھون میں یہ خبر گرم ہوئی کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچی چاہتی ہے اس وحشت اثر اطلاع سے لوگوں کے تلوے نیچے سے زمین نکل گئی اور بھاگنے کی سوجھی کہ جدھر منہ سمائے نکل جائیں۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے مع چند ہمراہیوں کے تھانہ بھون کو خیر باد کہی اور بسمت نجیب آباد روانہ ہوئے اور وہیں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہیں چلا۔ کمپنی کی طرف سے بھی پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آؤ اپنے بھائی کو صبر کرو غلطی سے یہ حرکت ہو گئی اگر تم انتقام سے باز آ گئے تو تم کو تھانے کا نواب بنا دیا جائے گا مگر تقدیر کے مضبوط پنجوں سے بھاگ جانا طاقت سے باہر ہے۔ حق تعالیٰ کے علم میں جب اس گھرانے کی تباہی و جلاوطنی اور گمشدگی و خانہ ویرانی اسی طرح مقدر تھی تو قاضی عنایت علی کیا سمجھتے۔ صبح صادق نمودار ہوئی تو بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی۔ تھانہ بھون سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔ دن نکلے پر فوج شہر میں داخل ہوئی اور قتل وقتال، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے شہر پناہ کے چاروں دروازے گرا دئے گئے اور مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ دے دی گئی۔ اس عالم کسمپرسی میں نواع وحوالی کے دیہاتیوں نے لوٹ مار اور بیجا حرکتوں کا ارتکاب کرنے میں زیادہ حصہ لیا خلاصہ یہ کہ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے حاکم ضلع کا قول پورا ہو گیا یعنی شاملی کی طرح تھانہ بھون کو بھی مسمار کر دوں گا۔" واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔
>
> (تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۷۳۔۷۴ کا حاشیہ)

مولانا عاشق الٰہی صاحب کا بیان سامنے رکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قاضی عنایت علی صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم صاحب کی وجہ سے تھانہ بھون اور شاملی میں جہاد حریت لڑا گیا۔ صاف ظاہر ہوا کہ انہوں نے انگریزی راج میں یہ کتاب لکھی ہے اس لئے وہ صاف صاف لکھنے سے مجبور ہیں۔ مگر اس میں کیا مضائقہ تھا کہ ایک کتاب خفیہ طور پر ان تمام تفصیلات کے متعلق لکھ دی جاتی اور وہ کسی وقت بھی تاریخی دستاویز بن جاتی جس میں حاجی امداد اللہ صاحبؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ وغیرہ کے حالات درج ہوتے۔ مگر ایسا نہ ہوا، تاہم حالات

یقین کے درجے پر ہمارے سامنے ہیں جن کی کڑیاں ہم ملاتے جائیں گے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ دہلی میں بخت خان کی کوشش پر علما نے جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا جو ہم نے اوپر درج کیا ہے اور اس پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے دستخط بھی ہیں جو ایک پختہ سند ہے کہ وہ علمائے تھانہ بھون کے ساتھ جہاد میں پیش پیش تھے۔ ان کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ جہاد شاملی اور تھانہ بھون کی کھچڑی قاضی عبدالرحیم کے مار دینے سے پہلے پک رہی تھی۔

مولانا رحمت اللہ صاحب کی زندگی

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانہ ضلع مظفر نگر میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا اصلی وطن پانی پت تھا مگر ان کے والد نجیب اللہ صاحب کیرانہ میں آ کر مقیم ہوئے۔ وہاں سے میر منشی کے عہدے پر میرٹھ چلے گئے اور آخر عمر میں کیرانہ آ گئے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب ابتدائی تعلیم حاصل کر کے دہلی چلے گئے اور مولوی محمد حیات کے مدرسے سے فارغ ہو کر تبلیغ اسلام اور عیسائیت کی تردید میں مصروف ہوئے۔ ماہ رجب ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۴ء میں آگرے کے مقام پر کئی روز تک فنڈر پادری سے مناظرہ کیا اور فنڈر کو سخت شکست دی۔ عیسائیوں سے فاتحانہ مناظروں کے باعث کمپنی کی حکومت کی نظروں میں مولانا رحمت اللہ کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے مولانا عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے سخت برہم تھے اور ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار انہیں ایک نظر نہ بھاتا تھا اسی جذبہ اسلام سے سرشار ہو کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی فکر میں تھے۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب انگریزوں کے وفادار جنہوں نے جہاد ۱۸۵۷ء کے پندرہ سال بعد اپنی کتاب ''تاریخ عروج انگلیشیہ'' مکمل کی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

مولانا رحمت اللہ کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دہلی میں آمد:

> ''مولوی رحمت اللہ اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن واپس چلا گیا۔''

عشرت رحمانی صاحب اپنے مضامین ''۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء'' تک میں لکھتے ہیں:

''حقیقت حال اس (مولوی ذکاء اللہ کے بیان) کے خلاف تھی۔ مستند تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکا ہے کہ مولانا رحمت اللہ صاحب تھانہ بھون کی جمعیۃ العلماء کی نمائندگی کیلئے دہلی تشریف لائے تھے گو اس وقت وہاں ہنگامہ فساد کی صورت تھی لیکن جہاد کی تحریک و تنظیم کے محرک جنرل بخت خان نے بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کرنے کے بعد نظم ونسق کی درستی کا بیڑا اٹھایا تھا اور دہلی اور تھانہ بھون کے علمائے کرام کی رہنمائی میں نیز رہنمائے جہاد حضرت مولانا میر سرفراز علی صاحب کے مشورے سے بادشاہ نے شہر کے انتظامی امور جنرل بخت خان کے سپرد کر دیئے تھے اور اب یہ طے پا چکا تھا کہ دہلی کو پایہ تخت بنا کر ملک میں ایک صالح نظام قائم کیا جائے چنانچہ علمائے عصر کے اجتماع میں جامع مسجد (دہلی) میں جہاد کا فتویٰ مکمل ہوا۔ منجملہ دوسرے علمائے کرام کے اس فتوے پر ایک دستخط رحمت اللہ کیرانوی کے نام سے بھی ثبت ہیں۔ اور اس دستاویزی ثبوت کی موجودگی میں اس سے انکار ممکن نہیں کہ مولانا رحمت اللہ نے فتویٰ جہاد پر دستخط نہیں کئے اور وہ انقلاب کی تحریک وجدوجہد کو فساد کی صورت سمجھ کر واپس چلے گئے۔''

(کوہستان اخبار لاہور مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۸ کالم ۱)

مولانا عارف السلام جو کہ مولانا رحمت اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی کے پڑپوتے تھے اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سنا تھا ان کی زبانی مولانا محمد عارف عثمانی نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''ضلع مظفر نگر کے پرگنہ شاملی میں زمیندارہ شیوخ اور گوجروں کے ہاتھ میں تھا جن میں دینداری کے ساتھ جوش بھی تھا چنانچہ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا اور مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔ شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا گیا اور پرگنہ کے چاروں طرف اس مجاہدانہ تحریک کا اثر عام ہو گیا (تھانہ بھون کے رہنما مجاہدین کے علاوہ) نواح کیرانہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ گورہ فوج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مجاہدین کیرانہ میں چونکہ مسلمان گوجر زیادہ تھے اس لئے ان کی قیادت چودھری عظیم الدین حضرت مولانا کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس زمانے میں نماز عصر کے بعد مجاہدین

کی تنظیم اور تربیت کیلئے کیرانہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا تھا جس کی آواز سن کر وہاں کے لوگ جمع ہو جاتے اور اعلان کیا جاتا تھا:

ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا

اس جملے کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا عوام کو سنایا جاتا تھا (یعنی تحریک انقلاب پر تقاریر اور تنظیمی ہدایات سنائی جاتی تھیں) اس پرانی آواز کو سننے والوں میں سے کوئی نہیں رہا مگر جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس کی صدائے بازگشت سنی ہے وہ اب بھی موجود ہیں۔ کیرانے کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا مگر بعض ابنائے وطن کی زمانہ سازی اور مخبروں کی سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کیرانے میں گورہ فوج اور توپ خانہ داخل ہوا۔ محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپ نصب کیا گیا اور گورہ فوج نے دربار کا محاصرہ کر لیا۔ ہر گھر کی تلاشی لی گئی عورتوں، بچوں اور ہر شخص کو فرداً فرداً دربار سے باہر نکالا گیا اس لئے کہ مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب *پنجیٹھ مسلمان گوجروں کا ایک گاؤں ہے وہاں حضرت مولانا اپنی باقی جماعت کے ساتھ پہنچے۔ خود اس گاؤں کے لوگ بھی مجاہدین میں شریک تھے اس دوران میں گورا فوج کے ایک گھوڑا سوار دستے نے *پنجیٹھ کا رخ کیا۔ کیرانہ اور تمام قرب و جوار کے حالات کی اطلاع مولانا کو ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ *پنجیٹھ کے مکھیا کو جب فوج کی آمد کا حال معلوم ہوا تو اس نے فوراً جماعت کو منتشر کر دیا اور مولانا سے خواہش کی کہ کھرپا لے کر کھیت میں گھاس کاٹنے چلے جائیں۔"

(اخبار کوہستان لاہور سلسلہ مضامین عشرت رحمانی اشاعتہائے ۱۹۶۴ء

آگے چل کر مولانا عارف السلام کے اس بیان کے بعد عشرت رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مولانا رحمت اللہ صاحب مجاہدانہ عزائم کو کامگار بنانے کی غرض سے حب الوطنی میں سرشار گھسیارے کے لباس میں کھیت میں کام کرتے رہے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ گورہ فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گذری جہاں مین گھاس کاٹ رہا تھا۔ اور ان کی ٹاپوں

سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وہ میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں فوج کو اپنے پاس گذرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مگر ۔

دشمن اگر قویست نگہبان قوی تر است

فوج وہاں سے ان کی طرف دھیان کئے بغیر چلی گئی اور گاؤں کا جا کر محاصرہ کر لیا مکھیا کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے گاؤں کی تلاشی لی گئی مولانا کا کہیں پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ مجبوراً فوجی دستہ کیرانہ واپس ہو گیا۔ حالات پر قابو پا لیا گیا اور انگریزوں نے قابض و متصرف ہو کر حضرت مولانا (رحمت اللہ) کے خلاف فوجداری مقدمہ چلانے کا حکم دیا۔ گرفتاری کیلئے وارنٹ جاری ہوا اور وہ مفرور باغی قرار دئے گئے۔ آپ کی گرفتاری کیلئے ایک ہزار روپیہ انعام بھی مقرر کیا گیا۔"

(اخبار کوہستان لاہور مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۴ء از مضمون ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۵ء تک از عشرت رحمانی)

الغرض کیرانہ پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ مولانا کی خواہش تھی کہ کسی طرح دہلی پہنچیں اور پھر وہاں انقلابی تنظیم از سر نو کریں۔ وہ شہر شہر اس لئے پھرے مگر حالات نے ساتھ نہ دیا بالآخر مولانا جے پور سے جودھ پور تشریف لیگئے اور خطرناک جنگلوں اور ریگستانی علاقوں کو پیدل طے کر کے بندرگاہ سورت پہنچے اور وہاں سے مکہ محترمہ پہنچے۔ وہاں بھی انہوں نے بہت سی علمی خدمات انجام دیں اور مدرسہ صولتیہ وہاں قائم کیا جو کلکتے کی صولت بیگم کے نام پر ان کے روپیہ سے مولانا نے جاری کیا۔ بالآخر ۲۴ رمضان ۱۳۰۸ھ مطابق ۲ مئی ۱۸۹۱ء کو وفات پا گئے۔ اور مکہ محترمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

عارف السلام کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ علمائے تھانہ بھون اور کیرانہ کے مولانا رحمت اللہ نے باہم مل کر ایک ہی محاذ بنایا تھا۔ اب مولانا عاشق الٰہی کی یہ عبارت پھر پڑھئے جس میں انہوں نے لکھا ہے:

> "اتنی بات یقینی ہے کہ اس گھبراہٹ کے زمانے میں جبکہ عام لوگ بند کواڑوں گھر میں بیٹھے ہوئے کانپتے تھے حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد اور نیز دیگر حضرات (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہ) کو کسی ضرورت کیلئے شاملی، کیرانہ، مظفر نگر جانے کی

ضرورت ہوئی غایت درجہ سکون و وقار کے ساتھ گئے۔"

(تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۷۴)

آپ نے کچھ دیکھا کہ یہ کیرانہ اور شاملی کے نام مولانا عاشق الٰہی کی زبان قلم پر کیوں آئے۔ یہ دراصل حاجی امداد اللہ صاحبؒ، مولانا رشید احمد صاحبؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا رحمت اللہ صاحبؒ، مولانا محمد مظہر صاحبؒ، مولانا محمد منیر صاحبؒ، حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی ان قصبوں میں باہم مشوروں اور دیگر انقلابی کارروائیوں کیلئے تیاری اور معرکہ آرائی کی جدوجہد کیلئے آمد و رفت تھی۔ ان کے ہمراہ شاملی کیرانے اور تھانہ بھون کے عوام وغیرہ بھی ہوتے تھے۔

ہمارا مقصد اس بیان سے یہ ہے کہ تھانہ بھون اور شاملی بلکہ ضلع مظفر نگر اور سہارنپور کے یہ علما جہاد حریت کی تیاریوں میں دہلی کے فتوے کے بعد سے ہی مصروف تھے جہاد کا فتویٰ جنرل بخت خان کے ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کے بعد جولائی کے مہینے ہی میں مرتب ہوا جس پر مولانا رحمت اللہ کے دستخط ہیں اور شاملی کا جہاد ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوا ہے۔ جو ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ بروز پیر کے ساتھ مطابق ہے۔

جہاد شاملی ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء مطابق ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ بروز پیر بوقت ظہر

جہاں تک شاملی جہاد کا معاملہ ہے تو اس کی تاریخ، وقت، دن اور سنہ ہجری و سنہ عیسوی پورے یقین کے ساتھ ہمارے سامنے تاریخی دستاویز کی صورت میں موجود ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں:

> ”یہ قتل وخونریزی شاملی میں ۱۴/ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہوئی جو دن فتح دلی کا تھا۔“

(بحوالہ اخبار کوہستان ۱۹ ستمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۸ کالم ۵)

مولانا مناظر احسن گیلانی کو جہاد شاملی کی تاریخ کا پتہ چلنے میں بے چارگی رہی لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ تحقیقات بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ تو سنئے کہ حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری منہاران ضلع سہارنپور نے جو کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے جان نثار اور عاشق مرید ہیں انہوں نے اپنے ایک رسالے ”مونس مہجوراں“ میں جو قلمی ہے اور مدرسہ صولتیہ مکہ محترمہ کے کتب خانے میں موجود ہے جس کو انہوں نے اپنے حج کے موقع پر حاجی امداد اللہ صاحب کو خود پیش کیا ہوگا۔ اپنے پیر حافظ محمد ضامن صاحب کی تاریخ شہادت بمقام شاملی ضلع مظفر نگر ۲۴/محرم الحرام ۱۲۷۴ھ بروز پیر بوقت ظہر درج کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ”آپ (حافظ محمد ضامن صاحب) نے ۲۴/محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت شربت شہادت نوش فرمایا۔“ (محسن مہجوراں)

حافظ محمد ضامن صاحب حاجی امداد اللہ صاحب کے خاندانی عزیز، ہم وطن، پیر بھائی اور صاحب کشف ولی تھے۔ جنہوں نے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ لہٰذا دونوں انگریزی اور ہجری تاریخوں سے جہاد شاملی کا تعین ہو جاتا ہے جس سے پہلے تمام ملک جہاد سے سرشار تھا۔

الحاصل ہم یہ ثابت کر رہے تھے کہ قاضی عنایت علی کے چھوٹے بھائی جن کا عرفی نام

قاضی عبدالرحیم تھا لیکن بقول عشرت رحمانی ان کا اصلی نام قاضی رعایت علی تھا ان کے پھانسی دیئے جانے سے پہلے ہی دہلی میں جولائی ۱۸۵۷ء میں جہاد فتویٰ جاری ہو چکا تھا اور علمائے تھانہ بھون کے نمائندے مولانا رحمت اللہ جامع مسجد دہلی میں موجود تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے قاضی عنایت علی کے چھوٹے بھائی کے مارے جانے کو شاملی کے جہاد کا جو سبب بتایا ہے وہ غلط ہے اور مجبوری ہے۔ ہاں یہ ایک فوری سبب اٹھ کھڑے ہونے کا ہو گیا تھا۔ ورنہ تیاری پہلے سے ہو رہی تھی۔

جہادِ حریت کی پہلے سے تیاری کا ایک اور ثبوت:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ شاملی ضلع مظفر نگر کے جہاد سے پہلے نواب شبر علی خان صاحب رئیس مراد آباد کے ذریعہ سے شاہ دہلی بہادر شاہ ظفر سے جہاد کیلئے بات چیت کر رہے تھے۔ یہاں واقفیت کیلئے یہ بتانا ضروری ہے کہ نواب شبر علی صاحب مراد آبادی، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے بڑے معتقد تھے اور نواب شاہ دہلی کے مصاحب خاص اور معتمد علیہ تھے۔

اس سلسلے میں ہم آپ کو مولانا محمد طیب صاحب کے ''جہادی مقالہ'' کی طرف لئے چلتے ہیں جس میں انہوں نے اپنے جد امجد مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی جہادی سرگرمیوں پر مولانا محمد میاں صاحب منصور سے کابل میں تفصیلی طور پر واقعات سن کر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا محمد میاں صاحب مولانا محمد قاسم صاحب کے حقیقی نواسے اور مولانا محمد طیب صاحب کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ انہوں نے مولانا منیر صاحب نانوتوی سے جو خود جہاد میں شریک تھے یہ واقعات خود سنے تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب اپنے استاذ محترم شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا کی تحریک ریشمی رومال میں شریک تھے اور اپنے شیخ کے حکم سے قبائلی علاقوں میں تحریک آزادی پھیلانے میں مصروف رہے لیکن اس تحریک کا حکومت برطانیہ کو علم ہو گیا۔ شیخ الہند مکہ محترمہ پہنچے تھے کہ ترکی وزراء سے تحریک کے متعلق بات چیت کریں ادھر انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا تھا کہ شاہ کابل سے تحریک آزادی ہند پر گفتگو کریں۔ شیخ الہندؒ کا مقصد یہ تھا کہ ترکی، ایران اور کابل کے مسلمان بادشاہوں اور آزاد قبائلیوں کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کیا جائے۔ اسی اثنا میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی جنگ میں ترک انگریزوں کے خلاف لڑ رہے

تھے۔ حجاز مقدس ترکوں کی عملداری میں تھا۔ شریف مکہ انگریزوں سے مل گیا اور ترکوں کو حجاز سے نکلنا پڑا۔ شیخ الہند کو انگریزوں نے شریف مکہ کے ذریعہ گرفتار کرایا اور مقدمہ چلا کر مالٹا میں قید کر دیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا محمد میاں کو جو پہلے سے کابل میں تھے جلا وطنی کا حکم ملا۔ اس لئے یہ دونوں کابل میں رہ پڑے۔ مدتوں تک جدائی کے بعد مولانا محمد طیب صاحب کابل تشریف لے گئے اور انہوں نے مولانا محمد میاں سے جو کچھ سنا تھا اس کو اس جہادی مقالے میں درج کر دیا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت نانوتوی (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) نے ان (یعنی نواب شبر علی) کی معرفت بادشاہ دہلی کو جہاد اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر آمادہ فرمایا۔ غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دلی کو ان (انگریزوں) سے پاک کرنے کی سعی کریں اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اصول پر دو طرف سے یہ حملہ اور دفاع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے۔''

(مقالہ جہاد صفحہ ۴ بحوالہ سوانح قاسمی از گیلانی جلد دوم صفحہ ۱۳۶۔۱۳۷)

یہ اس وقت کی بات ہے جب دہلی پر میرٹھ کی باغی فوج نے جا کر حملہ کیا ہے بہادر شاہ کو اپنے قدموں پر کھڑا کر کے انہوں نے دہلی کو انگریزوں سے خالی کرا لیا ہے۔ اب مولانا محمد قاسم صاحب کی کوشش یہ تھی کہ تھانہ بھون سے جہاد کرتے ہوئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی دہلی آمد و رفت سے ڈانڈے ملاتے ہوئے اور کیرانہ وغیرہ سے بڑھتے ہوئے شاہدرہ کی راہ سے بادشاہ سے جا ملیں۔ سلسلہ جنبانی جب ہو رہی تھی تھانہ بھون پر حاجی امداد اللہ صاحب کی حکومت تھی۔ اطراف و جوانب کے دیہات قاضی عنایت علی زمینداری میں تھے لہٰذا یہ سب ان کی رعایا تھی مولانا مناظر احسن گیلانی قاضی عنایت علی صاحب کو جدی قاضی کہہ کر ان کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں لہٰذا ان سے مختصر سا تعارف ہم پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الحق جنہوں نے سرسید کی کتاب ''سرکشی بجنور'' کے اول میں مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور بہادر شاہ ظفر کے مددگاروں پر آخر میں نوٹ لکھے ہیں قاضی عنایت علی کے متعلق علمائے ہند کا شاندار ماضی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قاضی عنایت علی کے حالات

"قاضی عنایت علی خان تھانہ بھون کے بااختیار قاضی تھے۔ ان کا خاندان عہد شاہجہانی سے اس عہدے پر ممتاز چلا آرہا تھا۔ بائیس گاؤں جاگیر تھے۔ باوجود جاگیردار ہونے کے نہایت متبع شریعت اور بڑے صادق القول تھے۔ فنون حرب اور شہسواری میں بہت مہارت تھی۔ تحریک آزادی میں آپ حاجی امداد اللہ صاحب، حافظ ضامن علی، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی اور مولانا محمد منیر کے ہمراہ تھے۔ شاملی پہنچ کر انگریزی فوج سے نبرد آزما ہوئے اس لڑائی میں ضامن علی شہید ہوئے۔ جب انگریزوں کا اقتدار (اس علاقے میں) دوبارہ قائم ہوا تو انہوں نے ایک سو سے زائد نفوس کو مہاجنوں والی باغچی میں پھانسی دے دی۔ یہ (قاضی عنایت علی) یہاں سے بجنور گئے اور نواب محمود خان کے ہمراہ رہ کر داد شجاعت دی۔ پھر میرٹھ ہوتے ہوئے بندیل کھنڈ پہنچے۔ ۱۸۵۹ء میں بھوپال میں قیام کیا۔ نواب قدسیہ بیگم نے ان کو معقول مشاہرے پر سواروں اور گھوڑوں کی تربیت واصلاح کے لئے ملازم رکھ لیا۔ ایک عرصہ بعد الور میں قصبہ تجارہ کے قریب ایک موضع میں شمشیر ساز دوست کے یہاں مقیم رہے۔ وہیں ۱۹۱۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔"

(علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد ۴ صفحہ ۲۵۲)

مسٹر ثناء الحق صاحب ایم۔ اے علیگ مرتب رسالہ "وحدۃ الوجود" مصنفہ مولانا شیخ محمد محدث کے مقدمے میں قاضی عنایت علی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"علمائے ہند کا شاندار ماضی" میں حکمراں بیگم کا نام قدسیہ بیگم تحریر ہے جو یقیناً غلط ہے اس لئے کہ اس زمانے میں بھوپال کی مسند پر سکندر جہاں بیگم رونق افروز تھیں۔ ان کا

عہد ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء تا ۲۰ اکتوبر ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء ہے۔"

(مقدمہ وحدۃ الوجود حاشیہ صفحہ ۶۳)

سر سید شاملی کے جہاد اور تھانہ بھون کے انگریزوں کی فوج کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے کے بعد قاضی عنایت علی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "عنایت علی خان قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع (بجنور) میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا............ (ضلع بجنور میں آ کر نواب محمود خان، احمد اللہ خان، ماڑے خان کے ہمراہ گنگا پار ضلع سہارنپور میں آ کر) قاضی عنایت اللہ خان کھیڑہ مجاہد پور کی چوکی پر اترا اور دو ہندو برقنداز پکڑ لایا۔ ایک مار ڈالا اور ایک کو مسلمان کر لیا۔ اس طرح قاضی عز یت علی اور دلیل سنگھ گوجر اور رضا حسن عرف چھٹن دو ضرب توپ اور دو ہزار آدمی کی جمعیت سے میراں پور پر اتر آئے اور میراں پور کے ساتھ تھانے کو اور کچھ دکانوں کو لوٹ لیا اور کئی آدمی کو قتل کیا اور نا محمود خان کے نام کی منادی پٹوائی اور پھر (ضلع سہارنپور کے علاقے سے بجنور میں) بھاگ آیا۔"

(سرکشی ضلع بجنور از سر سید صفحہ ۲۰۶)

عشرت رحمانی اپنے مضمون "۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء" تک میں قاضی عنایت علی خان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "قاضی عنایت علی خان جو دستے کی سرکردگی کر رہے تھے اور بڑی بے جگری سے دشمن کی بے پناہ قوت کے مقابلے پر (تھانہ بھون کے انگریزوں کے حملے میں) ڈٹے ہوئے تھے اس بربادی کے بعد اپنے مختصر دستے کو لے کر ایک طرف چلے گئے اور علاقے دار خفیہ جنگ جاری رکھی گئی جگہ انگریزوں کے دستوں اور افسروں کو شکست دی پھر تحصیل جانسٹھ سے ہوتے ہوئے بجنور پہنچ گئے۔ راستے میں کئی مقامات پر مجاہدین ان کے ساتھ شامل ہوتے رہے اور مالی امداد بھی ملی۔ انگریز حکام نے کئی جگہ کا پتہ معلوم کر کر کے فوج بھیجی مگر وہ اور ان کے ہمراہی مجاہد اس ہمت اور دلیری سے لڑے کہ مخالف فوج کو مار کر آگے بڑھ گئے اب ان کی طاقت بھی بڑھتی جا رہی تھی اور انگریز حکام پر ان

کی ایسی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ مقابلہ کرنا دشوار سمجھنے لگے تھے۔ آخر ضلع بجنور کے (انگریزی) حاکموں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک بھاری لشکر توپ خانے کے ساتھ ان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ نجیب آباد کے ایک گاؤں میں اس لشکر نے قاضی صاحب اور ان کے آزاد لشکر کو گھیرا ڈال کر نرغے میں لے لیا اور گولہ باری شروع کر دی۔ مجاہدین کی تعداد دشمن کے مقابلے میں ایک تہائی تھی اور توپیں صرف دو تین ہی ہوں گی جو قدیم انداز کی اور انگریزوں کی بھاری توپوں سے بہت کم درجے کی تھیں۔ لیکن مجاہدین بیخوف وخطر لڑتے رہے۔ گولوں اور گولیوں کی بارش میں سینکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے مگر ان کی استقامت وجرأت میں فرق نہ آیا۔ دس روز تک اسی طرح مقابلہ جاری رہا۔

قاضی (عنایت علی) صاحب اپنے زمانے کے بے نظیر ماہر حرب سمجھے جاتے تھے اور شہسواری میں بھی ان کا مقابلہ مشکل تھا۔ انہوں نے اپنی مختصر جمعیت کو اس ترتیب و تدبیر سے انگریزوں کی بھاری فوجوں کے مقابلے میں آراستہ کیا تھا جو ہزاروں کے مقابلے میں سینکڑوں کی طاقت اور معمولی آلات حرب کے ساتھ ترکی بترکی اتنے عرصے تک لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ انگریزی لشکر جرار کے قدم اکھڑنے لگے۔ قاضی صاحب نے دست بدست جنگ میں اس دلیری سے تلوار چلائی کہ دشمن کو پست کر دیا۔ ان کے دائیں بازو پر ان کا ایک وفادار دوست چنچل سنگھ راجپوت اور بائیں بازو پر جان نثار فدائی کلر مصروف پیکار تھے اس درمیان میں چنچل سنگھ کو ایک دم نو گولیاں لگیں اور وہ بری طرح زخمی ہو کر گھوڑے سے نیچے گرا اور گرتے گرتے آواز دی ''قاضی صاحب خدا حافظ'' قاضی صاحب نے جو اپنے مخلص جوانمرد کو اس حالت میں دیکھا فوراً اپنے گھوڑے سے کود پڑے اور چنچل سنگھ کو گود میں لے کر گولیوں کی زد سے بچتے حیرت انگریز طریقے سے اپنے خیمے میں لے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں لشکر مجاہدین کی صفوں میں کچھ انتشار پیدا ہونے لگا چند سرداروں نے دوڑ کر قاضی صاحب کو اطلاع کی لیکن چنچل سنگھ فوت ہو چکا تھا اور قاضی صاحب ایک جانثار کے غم

میں کچھ حواس باختہ تھے آخر طبیعت کو سنبھالا اور جھپٹ کر میدان جنگ میں پہنچے مگر اتنی دیر میں فتح کا نقشہ شکست میں بدل چکا تھا کیونکہ غنیم کے افسروں نے قاضی صاحب کی غیر حاضری سے پورا فائدہ اٹھا کر بھاگتی ہوئی فوجوں کو للکارا اور ایسا حملہ بولا کہ مجاہدین کو پسپا ہونا پڑا۔ قاضی صاحب نے اس بگڑے ہوئے نقشے کو بھانپ کر نہایت چابکدستی سے لڑتے بھڑتے اپنی بقیہ جمعیت کو بچا کر ایک طرف کا رخ کیا۔ اس موچے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

اب قاضی صاحب بجنور کے علاقے سے ہوتے ہوئے بندیل گھنڈ کے علاقے میں پہنچے اور اپنی بچی کھچی جمعیت کے ساتھ راستے میں سینکڑوں فدائیانِ وطن کو شریک کر کے انگریزی فوجوں سے جابجا لڑتے رہے۔ ان میں سے کچھ مجاہدین لڑائیوں میں شہید ہوئے کچھ زخمی ہو کر گرفتار کر لئے گئے۔

۱۸۵۹ء مین قاضی صاحب کے ساتھ معدودے چند رفقا تھے جن میں انہوں نے اپنے وطن واپس کر کے تنہا بھوپال کا قصد کیا اور وہاں اپنے اعزا کے ساتھ قیام پذیر ہوئے، بھوپال کے قیام کے دوران قاضی صاحب علیہ حضرت قدسیہ بیگم (اور بقول ثناء اللہ صاحب علیگ سکندر جہاں بیگم) والی بھوپال کے خاص مصاحبین اور سرداروں میں شامل کئے گئے اور اپنی اصلیت اور مرتبے کو پوشیدہ رکھ کر ایک سپاہی کی حیثیت میں شہسواری کے کرتب دکھا کر درجہ امتیاز حاصل کیا۔ لیکن ان کی شہسواری کے محیر العقول کرشمے دیکھ کر بعض امرائے ریاست کو ان پر شبہ ہوا۔ ان کی مشکوک نظریں تاڑ کر قاضی صاحب بھوپال سے بھی چلے گئے اور ریاست الور کے ایک قصبہ تجارہ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں جہاں ان کا ایک شمشیر ساز آہنگر رہتا تھا اس کے پاس رہنے لگے اور بقیہ عمر وہیں گوشہ گمنامی میں گذاری کیونکہ ملک کے ہر چپے پر سامراج کا قبضہ و تصرف ہو چکا تھا اور ان کی مجاہدانہ مساعی کے لئے کوئی تدبیر اور میدان نہ رہا تھا۔

جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے قاضی صاحبؒ نے ۱۹۱۰ء میں تراسی یا پچاسی سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کے وضاحت کے بعد اس شمشیر ساز کو علم

> ہوا کہ وہ اِن کے قدیم محسن دوست تھانہ بھون کے مشہور رئیس قاضی عنایت علی خان تھے۔ قاضی صاحب علیہ الرحمۃ کے دو صاحبزادے تھے جو ان کی جاگیریں اور تمام املاک و سامان ضبط ہو جانے کے بعد ایک مدت تک میرٹھ میں مقیم گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔“
>
> (اخبار کوہستان لاہور مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۸ مضمون عشرت رحمانی صاحب ”۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک“ مجاہد ملت قاضی عنایت علی خان کی عدیم النظیر استقامت)

قاضی عنایت علی بحیثیت وکیل:

ثناء الحق صاحب انگریزوں کی فوجوں کا نجیب آباد کو فتح کرنے اور قاضی عنایت علی کا شہزادہ فیروز کے پاس مراد آباد چلے جانے اور شہزادہ فیروز کا مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے اور قاضی صاحب کے بھوپال پہنچنے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”جب شہزادہ (فیروز) ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلا گیا تو قاضی صاحب مایوس ہو کر بھوپال کی طرف جہاں ان کے بعض اعزہ تھے روانہ ہو گئے۔ بھوپال پہنچ کر نواب سکندر جہاں بیگم کی ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ تقریباً چھ ماہ رہنے پائے تھے کہ پولیٹیکل افسر کو ان کی موجودگی کا علم ہو گیا اس لئے وہ بھوپال چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ بھوپال سے چل کر آگرہ آئے اس زمانے میں ہائیکورٹ آگرے میں تھی وہ نام بدل کر ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے میں عوام اور حکام پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا لیکن بدقسمتی نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ایک سال بعد جج کو معلوم ہو گیا کہ یہ تھانہ بھون کے قاضی عنایت علی خان ہیں۔ وہ بھلا آدمی تھا اور قاضی صاحب کی قابلیت سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی خطرے سے آگاہ کر دیا اور رائے دی کہ ”آگرے سے کسی اور جگہ چلے جاؤ“ انہوں نے الور کا رخ کیا۔ راستے میں مرض ضیق النفس لاحق ہو گیا تاہم وہ الور پہنچ کر مہاراجہ کی ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ الور کے دوران قیام میں ایک مرتبہ پوشیدہ طور تھانہ بھون آئے اور تین روز قیام کر کے واپس چلے گئے الور میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ انتقال کے موقع پر مولانا شیخ محمدؒ کے

بہنوئی حکیم شیخ احمد ریاست میں حاکم ضلع تھے انہوں نے خفیہ طور پر تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ رات ہی میں چند آدمیوں نے نماز جنازہ ادا کی اور تاریکی شب میں دفنانے کیلئے لے چلے۔ اتفاق سے قبر مکمل ہونے میں دیر ہوگئی۔ اسی میں دن نکل آیا۔ مسلمان سپاہیوں پر مشتمل کئی فوجی دستے ادھر سے گذرے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے نماز جنازہ ادا کی۔ پھر کچھ میواتی آئے انہوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور قبر تیار ہونے پر جسد خاکی کو آسودہ خاک کردیا گیا۔ ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں ان کا سنہ وفات ۱۹۱۰ء تحریر ہے جو صحیح نہیں۔'' (مقدمہ وحدہ الوجود الشہود صفحہ ۶۳ و حاشیہ صفحہ ۶۴)

مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی عنایت علی خان صاحب رئیس تھانہ بھون کے حالات سے ہم فارغ ہو چکے ہیں۔ ان حالات کے بغیر کتاب نامکمل رہ جاتی اس لئے شاملی جہاد حریت کی تفصیلات سے پہلے ہی قاضی صاحب کا ذکر ہمارے سامنے آگیا اور ہم نے لکھ دیا۔

تھانہ بھون میں جہاد حریت تحقیق کی روشنی میں

گذشتہ اوراق میں آپ کو تذکرۃ الرشید مصنفہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی کے حوالے سے معلوم ہو چکا ہے کہ شاملی کے جہاد کا فوری سبب قاضی عنایت علی صاحب رئیس تھانہ بھون کے چھوٹے بھائی قاضی رعایت علی عرف قاضی عبدالرحیم مرحوم کا وہ حادثہ ہے جو انہیں سہارنپور میں پیش آیا۔ وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ آزادی میں سہارنپور گئے تھے۔ وہاں کوئی بنیا جو زمینداری کے معاملات کے باعث ان کا پرانا دشمن تھا ٹھہرا ہوا تھا اس نے ضلع کلکٹر سے شکایت کی تھی کہ تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہو گیا ہے اور وہ دہلی کو کمک بھیجنے کیلئے ہاتھی خریدنے کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ حکومت کی دوڑ گئی اور انہیں گرفتار کر لیا اور بالآخر پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ مولانا عاشق الٰہی نے صاف طور پر یہی سبب لکھا ہے لیکن مسٹر ثناء اللہ صاحب وحدہ الوجود کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''قاضی عنایت علی کے برادر قاضی عبدالرحیم جو بڑے بھائی کو باپ کے مثل سمجھتے تھے اور ریاست کے کاموں سے علیحدہ رہ کر امیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے کسی غرض سے مع چند احباب و رفقا سہارنپور تشریف لے گئے اور وہاں سرائے میں مقیم ہوئے تھانہ بھون کے ایک کایستھ نے جو کلکٹری میں سررشتہ دار تھا کسی خاندانی چشمک و عداوت کی بنا پر حاکم ضلع رابرٹ اسپنکی سے شکایت کر دی کہ تھانہ بھون کا رئیس کمپنی سے باغی ہو گیا ہے اور دہلی کے باغیوں کو امداد پہنچانے کی غرض سے سامان حرب خریدنے کیلئے سہارنپور آیا ہے۔ یہ دور ایسا تھا جب معمولی سے شبہ پر دار و رسن کی تیاری ہو جاتی تھی۔ انگریز باغی اور بغاوت کے نام سے بھڑکتا تھا۔ قدرتی طور پر اسپنکی کو کچھ شک اور کچھ یقین ہوا۔ پھر بھی اس نے حقیقت حال معلوم کرنی چاہی مگر جب مقدر ہی برگشتہ تھا تو اس کی

کوشش کس طرح اچھے نتائج پیدا کر سکتی تھی خود قاضی عبدالرحیم کے بعض عزیزوں نے بے رخی اختیار کی اور کلکٹر سے مرعوب ہو کر کچھ ایسے جوابات دیئے جن سے اس کے یقین میں جو تھوڑی بہت کمی تھی وہ بھی جاتی رہی اور قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقا کو وقت کے قانون کے مطابق موت کی سزا دے دی گئی۔"

(مقدمہ حدۃ الوجود الشھود صفحہ ۴۷۔۴۸)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرحیم سامان حرب کیلئے سہارنپور گئے تھے عشرت رحمانی شاملی کی جہاد حریت کے اسباب کے متعلق لکھتے ہیں:

"قاضی عنایت علی خان کے بھائی قاضی رعایت علی خان عرف قاضی عبدالرحیم ہاتھیوں کی خریداری کیلئے سہارنپور گئے۔ ایک روایت کے مطابق یہ ہاتھی مجاہدین کی لشکر کشی کے لئے خریدے جا رہے تھے۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ قاضی صاحب کا مقصد ہاتھیوں کی خریداری سے محض شوق امارت تھا۔ انگریزی مخبروں نے کلکٹر ضلع ایس پنکھی (اسپنکی) کو اطلاع دی کہ قاضی عبدالرحیم باغیوں کی فوج اپنے ہمراہ لے کر آئے ہیں اور حکومت کے خلاف جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اسی کام کیلئے ہاتھی خرید رہے ہیں۔

سہارنپور کو حکومت ایک اہم مرکز بنا رہی تھی کیونکہ شمالی ہند کی بغاوت کو کچلنے کی غرض سے سابق صوبہ پنجاب سے فوجیں لائی جا رہی تھیں جن کا ہیڈ کوارٹر سہارنپور بنایا جا رہا تھا۔ اگر سہارنپور پر مجاہدین کا قبضہ ہو جائے تو انگریزوں کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سوچ کر کلکٹر ایسا گھبرایا کہ اس نے فوج کا سراغ لگایا اور نہ اس معاملے کی مزید تحقیقات کی۔ ادھر اس کو مخبروں سے تھانہ بھون میں علما اور دوسرے مجاہدین کی سرگرمیوں کی اطلاعیں بھی مل رہی تھیں۔ ایس پنکھی نے بلا پس و پیش بدحواسی میں ایک پولیس دستہ بھیج کر قاضی عبدالرحیم اور ان کے چند نہتے ساتھیوں کو گرفتار کرا لیا، بلکہ قاضی صاحب اور ہمراہیوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

تھانہ بھون میں بے انتہا اشتعال:

قاضی صاحب کی شہادت کی خبر رات ہی کو تھانہ بھون پہنچ گئی اور قاضی عنایت علی خان

بھائی کی اس ناگہانی وفات کے صدمے سے حواس باختہ ہو گئے اور تمام عزا و احباب کے دلوں پر رنج و غم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ قصبہ بھر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ تمام مجاہدین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فوراً حملے کی اجازت طلب کی۔"

جہاد کیلئے مجلس مشاورت:

اس صورت حال کے پیش نظر مجلس مشاورت طلب کی گئی۔ نانوتہ اور گنگوہ تھانہ بھون کے قریب تھے چنانچہ وہاں سے حضرت قاسم العلومؒ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد منیر صاحب اور مولانا محمد مظہر صاحب کو بلایا گیا۔ حاجی صاحب تھانہ بھون کے ناظم اعلیٰ تھے انگریز کی حکومت اٹھ چکی تھی حافظ محمد ضامن صاحب مولانا شیخ محمد محدث اور قاضی عنایت علی خود تھانہ بھون میں موجود تھے۔

اسپنکی کی پیشکش:

ادھر ان حضرات میں صلاح مشورے ہوئے ادھر اسپنکی کو تھانہ بھون میں جوش و خروش کا علم ہوا تو اس نے کہلا کر بھیجا:

> "یہ سب کچھ نادانستگی میں ہو گیا ہے۔ آپ صبر و شکیب کو کام میں لائیں اور کوئی کاروائی نہ کریں ہم آپ کو مزید جائداد عطا کریں گے اور تھانہ بھون کا مستقل نواب تسلیم کر لیں گے۔" (مقدمہ وحدۃ الوجود از مسٹر ثناء الحق علیگ صفحہ ۴۸)

عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

> "قصبہ (تھانہ بھون) کے پولیس سٹیشن کو مجاہدین کے منصوبوں کی خبر ہوئی۔ پولیس افسر نے کلکٹر ضلع کو فوراً سہارنپور اطلاع کی۔ پنکھی کو اس پر اپنی بدحواسی اور غلطی کا احساس ہوا اور بغاوت کے اندیشے سے فوراً پولیس افسر کو حکم دیا کہ وہ قاضی عنایت علی خان سے مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کرے اور معذرت کرے کہ غلط فہمی کی بنا پر ہم سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے ہم تمہارے بھائی کا خوں بہا دینے کو تیار ہیں۔ حکومت تمہیں سارا پرگنہ

> (جو ۸۴ مواضعات پر مشتمل تھا) دے کر اس پر گنے کا نواب بنانے کو تیار ہے۔ تم کسی قسم کی بغاوت اور شورش میں شرکت نہ کرو اور حکومت کے وفادار رہو اور اعزاز و اکرام حاصل کرو۔" (مضامین عشرت رحمانی کوہستانی ۷ ستمبر ۱۹۶۴ء قسط ۳۶ کالم ۲)

اس پیشکش کو قاضی عنایت علی صاحب نے ٹھکرا دیا۔ بالآخر تھانہ بھون میں مجلس مشاورت میں جہاد کے لئے مذکورہ بالا حضرات کا مشورہ ہوا۔ مولانا محمد طیب صاحب کے مقالہ جہادی میں جو انہوں نے مولانا منصور انصاری سے سنا اور انہوں نے مولانا محمد منیر صاحب سے جو جہاد میں شریک تھے سنا کہ مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی نے کہا:

> "اگر آپ کی حجتیں مان لی جائیں تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے۔"

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد دوم صفحہ ۱۲۳)

یہ سن کر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا۔ مولانا محمد طیب کے جہادی مقالے میں ہے کہ:

> "نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے۔ حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں۔ انہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔ سب ساکت ہو گئے اور متفقہ طور پر سب نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔"

(مقالہ جہاد از مولانا محمد طیب صاحب بحوالہ سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۱۲۵۔۱۲۶)

مولانا عاشق الٰہی صاحب تحریر فرماتے ہیں جیسا کہ گذشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ لوگ جمع ہو کر حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا:

> "آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں۔ اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکا دیا کریں۔"

میرا خیال ہے کہ حاجی صاحب کو تھانہ بھون کا امیر پہلے ہی بنا لیا گیا تھا جبکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے باعث امن اٹھ چکا تھا اور انگریزوں نے خود امن قائم کرنے کا اعلان کر دیا تھا اب حاجی صاحب کو امیر جہاد بنایا گیا تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا والدین سے جہاد کیلئے اجازت حاصل کرنا:

جب جہاد کا فیصلہ ہوگیا تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اپنے والدین سے اجازت لینے کے لئے جوانہوں نے شرعاً مناسب سمجھا قریب ہی اپنے گھر نانوتے تشریف لے گئے اور والدین سے اجازت مانگی۔ مولانا محمد طیب صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا محمد طاہر صاحب مرحوم کی یادداشت میں جوانہوں نے اپنے والد صاحب سے سنا یہ ہے:

> ''اپنی والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے (ماں کو مخاطب کر کے) فرمانے لگے کہ خدا کی راہ میں جان اور مال کو فدا کر دینا ایسا ہے اور جو خوشی سے اپنی جان خدا کے حوالے کر دیتا ہے اس کا ایسا درجہ ہے۔ جہاد فرض ہو چکا ہے۔ یہ مسئلہ ہے کہ اطاعت خالق میں والدین کی اطاعت اگر معارض ہو تو وہ ساقط ہو جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دیں تا کہ آپ کو بھی اجر ملے۔ مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں فرمانے لگیں کہ بھائی تم اللہ ہی کی چیز ہو میں خوشی سے تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں اگر تم زندہ آگئے تو میں تم سے مل لوں گی نہیں تو آخرت میں انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی ملنا ہوگا۔''

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد دوم صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۱)

والدہ محترمہ سے اجازت لینے کے بعد والد صاحب شیخ اسد علی صاحب سے جو اس وقت اپنے مکان کے چبوترے پر کھڑے تھے اجازت لینے کے لئے حاضر ہوئے اور نہایت عاجزی اور نرمی سے اپنے والد سے اس عزم کو ظاہر کیا تو انہوں نے اکھڑتا ہوا جواب اس طرح دیا کہ حضرت کی والدہ سے کہا کہ ذرا میری پگڑی لے آؤ۔ وہ لے آئیں اسے باندھا۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے عرض کیا:

> ''باوا جی یہ کیوں باندھ رہے ہیں۔ تیرے ساتھ سر کٹانے آخر جاؤں گا بھی۔ (جس پر حضرت قاسم العلوم نے عرض کیا کہ) آپ میری وجہ سے کیوں سر کٹاتے ہیں اگر آپ کو

سر کٹانا ہے تو اللہ کے لئے کٹایئے اور میرے ساتھ چلئے۔ (بعد ازاں عرض کیا) بندہ رخصت ہوتا ہے مگر پھر والد بھی راضی ہو گئے۔"

(بحوالہ سوانح قاسمی از گیلانی جلد دوم صفحہ ۱۳۲-۱۳۳)

جہاد کی ابتدا اور شیر علی کے باغ کی سڑک پر تھانہ بھون سے حملہ:

قاضی عنایت علی خان کے چھوٹے بھائی قاضی رعایت علی عرف عبدالرحیم کو پھانسی دیئے جانے یا گولی سے مار دیئے جانے کے بعد جو جہاد کا فوری جوش پیدا ہوا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب کی وہ عبارت جو گذشتہ اوراق میں گذری اس کو ایک مرتبہ پھر دیکھ لیجئے وہ صحیح تاریخی دستاویز ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> "(انگریزی فوج کے) چند فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ (قاضی عنایت علی صاحب) اپنے چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی کے باغ کی سمت کی سڑک پر جا پڑے۔ اور جس وقت سوار سامنے سے گذرے ان کا اسباب لوٹ لیا ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہو کر سمت مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔"

قاضی صاحب کے یہ چند رفقا صاف ظاہر ہے کہ حافظ محمد ضامن صاحبؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، مولانا محمد مظہر صاحب اور مولانا محمد منیر صاحب تھے اور ان کے علاوہ قاضی صاحب کی رعایا کے لوگ تھے۔ یہاں اتنا اشارہ کر دینا چاہئے کہ سہارنپور سے چھوٹی لائن جو دہلی کو جاتی ہے اسی لائن پر نانوتہ، تھانہ بھون، شاملی، کیرانہ اور کاندھلہ قریب قریب واقع ہیں اور اس زمانے میں تھانہ بھون ضلع سہارنپور میں شامل تھا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ حضرت حاجی امداد صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ سے براہ راست باطنی فیوض حاصل کئے ہوئے ہیں دونوں کی صحبت میں بیٹھے ہیں اور حالات سے واقف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "خبر آئی کہ توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن لا رہی ہے۔ رات کو یہاں سے گذرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی۔ کیونکہ جو ہتھیاران مجاہدین

کے پاس تھے وہ تلوار، بندوق توڑے والی اور برچھے وغیرہ تھے مگر توپ کسی کے پاس نہ تھی توپ خانے کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا فکر مت کرو۔ سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ جب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی صاحب نے افسر مقرر کردیا تھا آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو۔ جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانے کے سامنے گذری تو سب نے یک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحبؒ کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ اس سے لوگوں میں ان حضرات کی فراست، ذکاوت، فنون حربیہ کی مہارت، معاملہ فہمی اور ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔" (نقش حیات جلد دوم صفحہ ۴۴)

تصویر

شاملی کے مجاہدین انگریزی لشکر کے توپ خانے پر فتحیاب ہوئے غازیان دین کی مختصر جمعیت نے الحاج مولانا رشید احمد گنگوہی کے حسن تدبر سے دشمنوں کی توپیں چھین لیں۔

(از کوہستان اخبار ۱۹۶۴ء بسلسلہ مضمون عشرت رحمانی)

قاضی عنایت علی کا اسلحہ اور کارتوس کی بہنگیوں پر قبضہ:

باغ شیر علی کی اس سڑک پر سے جو اسلحہ و کارتوسوں کی بہنگیاں لدی جارہی تھیں ان پر حملے کا حال مولانا حسین احمد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک توپ خانہ وغیرہ پر

قبضہ کرنے کا کارنامہ مولانا گنگوہیؒ سے متعلق ہے لیکن ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں:

> ”جہاد کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قاضی عنایت علی نے اپنے چار آدمیوں کی ہمراہی میں انگریزوں کے وہ اسلحہ اور کارتوس جو بہنگیوں میں سہارنپور سے کیرانہ لے جا رہے تھے چھین لئے انگریز افسر جو ساتھ تھے مقابلے میں آکر مارے گئے۔ سہارنپور اور مظفرنگر کے حکام کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ بدلہ لینے کیلئے موقع کے منتظر رہے۔“

(مقدمہ وحدۃ الوجود صفحہ ۵۱)

(تجزیہ) دراصل سب نے ہی حملہ کیا لیکن اس مسئلے کے امیر ممکن ہے کہ مولانا گنگوہی ہوں لیکن صحیح یہ ہے کہ قاضی عنایت علی صاحب بھائی کے جوش انتقام میں حملے میں پیش پیش تھے۔ توپ خانہ جب حاصل ہوگیا تو حضرت گنگوہی نے اس کو امیر لشکر کی حیثیت سے امیر تھانہ بھون و امیر جہاد حاجی صاحب کے سامنے لاکر رکھ دیا۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب کا بیان صحیح دستاویز ہے۔ جیسا کہ گزشتہ اوراق میں آپ نے لکھا ہے کہ:

> ”فوجی سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی کئی بہنگیاں لدوائے سہارنپور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے (قاضی عنایت علی صاحب) اپنے چند رفقا اور رعایا کو ساتھ لے کر شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور جس وقت سوار سامنے سے گذرے ان کا اسباب (یعنی اسلحہ) لوٹ لیا۔ ایک سوار اسی جنگ میں زخمی ہوکر سمت مشرق جنگل کو بھاگا مگر تھوڑے فاصلے پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔“

(تذکرہ جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۷۳ و حاشیہ نمبر ۷۳)

تحقیق نے راہ ہموار کردی کہ تمام اسلحہ لوٹ لیا گیا اور انگریزوں کے جن فوجیوں کی نگرانی میں اسلحہ جا رہا تھا وہ سب مارے گئے ایک جو بھاگا وہ بھی گھوڑے سے گر کر مر گیا۔

شاملی کا جہاد ۱۲ ستمبر تا ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء:

اس جھڑپ اور اسلحہ پر چھاپہ مارنے اور انگریزی فوجیوں کے مارے جانے کی خبر جب سہارنپور اور مظفرنگر پہنچی تو مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ (بھون) پر فوج کشی کا حکم ہو گیا۔ شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پا کر (تھانہ بھون میں) نقارہ بجا دیا گیا اور جتھے کا جتھا شاملی پر چڑھ دوڑا اور کیا جو کچھ کیا۔'' (تذکرہ جلد ۶ صفحہ ۳۷)

شاملی کی فوجی اہمیت:

ثناء اللہ صاحب شاملی کی فوجی اہمیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اس وقت شاملی تجارتی منڈی ہونے کے اعتبار سے نیز بعض اور وجوہ سے ایک اہم جگہ سمجھی جاتی تھی۔ وہاں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی۔ مہر سنگھ اس قصبے کا بڑا زمیندار اور ذی اثر رئیس تھا۔ ابراہیم خان سب کلکٹر (تحصیلدار) سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے چنانچہ اس نے شاہ دہلی سے نامہ و پیام شروع کیا۔ انگریز حکام کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کیں۔ گرانٹ (ضلع مظفرنگر کا جائنٹ مجسٹریٹ) پہلے سے کچھ سواروں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اوائل ستمبر میں حاکم ضلع آر۔ ایم ایڈورڈس نے کچھ پیدل فوج اور دو توپیں اس کی مدد کیلئے بھیج دیں اس کے بعد ایڈورڈس خود بھی پہنچ گیا لیکن چودہ ۱۴ ستمبر کو وہ فرسٹ پنجاب کیولری کے تقریباً سو (۱۰۰) ہتھیار بند آدمی سب کلکٹر ابراہیم خان کی مدد کیلئے چھوڑ کر بڑھانہ (ضلع مظفرنگر) کے قلعے کی طرف چلا گیا۔ اور اس پر آسانی سے قابض ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں مجاہدین تھانہ بھون یلغار کر کے شاملی پہنچ گئے اور تحصیل پر جو ایک مستحکم قلعے کی حیثیت رکھتی تھی حملہ آور ہوئے۔ یہ معرکہ نہایت سخت تھا لیکن مجاہدین نے دلیری و جرأت سے کام لے کر تحصیل کا پھاٹک توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انگریز وقائع نگار ہنری جارج کین (Renry Gerge Keen) کا بیان ہے کہ لڑائی تمام دن جاری رہی لیکن چونکہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی اور کچھ خانہ بدوش بھی ان کی طرف آ ملے تھے اس لئے ان کا پلہ بھاری رہا۔ انہوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطے کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگا دی محصورین میں سے ۱۱۳ (ایک سو تیرہ) آدمی مارے گئے جن میں ابراہیم خان کلکٹر بھی تھا۔'' (وحدة

الوجود صفحہ ۵۳)

یہاں ابراہیم خان تحصیلدار کے متعلق وحدۃ الوجود کے مقدمہ نویس ثناء الحق صاحب کا یہ نوٹ بھی مناسب ہوگا۔ لکھتے ہیں:

> ”سی گرانٹ ضلع مظفر نگر کا جائنٹ مجسٹریٹ تھا۔ اس نے جنگ آزادی کے بعد ابراہیم خان کے بیٹے کی درخواست پر اس کو ایک سٹرفکیٹ دیا تھا جس میں ابراہیم خان کی خدمات کو سراہا تھا اور اس کی وفاداری کی تعریف کی تھی اسی سٹرفکیٹ میں لکھتا ہے:
>
> ”خصوصاً شروع اس غدر میرٹھ سے ہم شاملی کو تشریف لے گئے تھے اور دو روز باوجود اور بارہ روز ماہ جولائی اور چودہ روز ماہ ستمبر ہم وہاں مقیم رہے۔“

اس عبارت سے یہ معلوم نہیں ہوا کہ شاملی کی جنگ آزادی میں گرانٹ موجود تھا یا نہیں کیونکہ ستمبر کے کوئی ۱۴ روز اس نے وہاں قیام کیا ہے۔

سرسید شاملی کی جنگ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”ستمبر ۱۸۵۷ء میں دفعۃً مسلمانان ساکنان تھانہ بھون نے جس کا افسر قاضی عنایت علی تھا فساد برپا کر دیا اور ایک بڑے گروہ نے تحصیل شاملی پر حملہ کیا۔ اس وقت تحصیل شاملی میں منجملہ دس سوار پنجابی رسالے کے اور اٹھائیس سپاہی جیل خانے کے اور پچاس سے زائد سپاہی معینہ تھانہ اور تحصیل کے باقی آدمی اس افسر کے خاندان کے مع اکبر خان اس کے بھاوے جو رامپور سے گئے تھے اور وہاں موجود تھے۔ یہ افسر بکمال دلاوری و بہادری مقابلہ پیش آیا اور تحصیل شاملی کو مستحکم کرا کر اور اس میں محصور ہو کر بخوبی لڑا اور ہر دفعہ مفسدوں کے حملہ کناں کو ہٹا دیا اور بہت سے آدمی ان کے مارے گئے۔ آخر کو گولی و بارود تحصیل میں ختم ہو چکی اور نہایت مجبوری کا وقت آیا اور مفسدوں کو قابو ہو گیا اور وہ لوگ تحصیل کے قریب آ گئے یہاں تک کہ تحصیل میں گھس آئے وہاں بھی مقابلہ ہوا اور یہ افسر نہایت بہادری سے مع اکثر آدمیوں اپنے خاندان کے کام آیا اور شرط نمک حلالی کو پورا کی۔ یہ قتل و خونریزی شاملی میں تھی ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو واقع ہوئی جو دن کہ فتح دہلی کا تھا۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ اس افسر کے کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا اس ہنگامے میں ۱۱۳ (ایک سو تیرہ) آدمی جن میں سو سے زیادہ مسلمان

تھے کام آئے اور ہر ایک تمغہ خیر خواہی سرکار کا اپنے نام کے ساتھ لے گیا۔ یہ ہنگامہ جو تحصیل شاملی میں تھانہ بھون کے مفسدوں کے ساتھ ہوا وہ ہنگامہ ہے جس کا مفسدان تھانہ بھون نے جہاد نام رکھا تھا مگر ان تمام حالات کو دیکھنے سے واضح ہوگا کہ جو لوگ ان مفسدوں کے مقابلے میں آئے اور دو بدو ہو کر لڑے اور بہتوں کو جان سے مارا اور مرتے دم تک مقابلہ و مقاتلہ سے باز نہ رہے وہ بھی مسلمان تھے اور نیک بخت اور اپنے مذہب کے پکے۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور شلفلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا جہاد کے نام سے مشہور کیا تھا۔”

(بحوالہ وحدۃ الوجود صفحہ ۵۳ تا ۵۶)

ہمیں سرسید کی روح سے معذرت کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجاہدین آزادی کے بڑے بڑے بزرگوں کیلئے انہوں نے جو سوقیانہ الفاظ استعمال کئے ہیں وہ ان کو زیب نہیں دیتے۔ نواب محمود کو نا محمود عبدالکریم عرف ماڑے خان شیر کوٹی کو حرام زادہ اور مجاہدین تھانہ بھون کو جن میں حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب، حافظ ضامن حسن صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین تھے مفسدین لکھنا غیر مہذب اور ناشائستہ حرکت ہے بھلا انگریزوں کے طرفدار مسلمانوں کو پکا مسلمان کہنا کونسی حدیث میں لکھا ہے۔ کیا سرسید بتائیں گے کہ قاضی عنایت علی صاحب کے چھوٹے بھائی اور ان کے ساتھیوں کو بلا تحقیق پھانسی دے دینا اور گولیوں سے اڑا دینا ان کے نزدیک کس طرح جائز تھا۔ ابراہیم تحصیلدار کی مسلمانی کا بھرم تو سرسید کے اس جملے سے کھل جاتا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ”اس افسر کے کان تک مژدہ فتح دہلی جس کا وہ ہر دم مشتاق تھا پہنچنے نہیں پایا تھا۔“ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ والعجبی است

جہاد شاملی کا دوسرا پس منظر:

آپ نے ثناء الحق صاحب اور سرسید کی تفصیلات پڑھ لیں۔ ثناء الحق صاحب نے ہنری جارک کین کی کتاب سے تفصیلات پیش کی ہیں مگر عشرت رحمانی صاحب اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ باغ شیر علی کی سڑک پر حملہ کرنے اور توپ خانہ چھیننے کے بعد جو

کچھ ہوا یہ ہے۔ عشرت صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اسی دوران مجاہدین کو معلوم ہوا کہ کلکٹر پنکھی (اسپنکی) معائنے کی غرض سے شاملی آیا ہوا ہے۔ ان کی نظر میں یہ ظالم صرف قاضی عبدالرحیم کا قاتل ہی نہیں تھا بلکہ تحریک آزادی کا دشمن تھا اس لئے وہ اس تاک میں تھے کہ کسی طرح اس سے انتقام لینے اور مزا چکھانے کا موقع ملے۔ چنانچہ شاملی میں اس کے قیام کا پتہ چلتے ہی مجاہدین کا لشکر دیوانہ وار کوچ کرتا شاملی پہنچ گیا۔ اس لشکر کے سربراہ حضرت حافظ محمد ضامن علی صاحب تھے اور ان کے ساتھ دوسرے اکابر علما بھی موجود تھے۔ خود قاضی عنایت علی خان بھی ایک دستے کی قیادت کر رہے تھے جس وقت اس لشکر کے شاملی پہنچنے کی اطلاع حکام کو ملی فوراً مسلح دستے اور انگریزی فوج مقابلے کیلیا بلائی گئی۔ طرفین میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مجاہدین کا جوش و خروش ناقابل بیان تھا۔ بھاری جنگ کے بعد انگریزی فوج کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی اور تحصیل کی عمارت میں محصور ہوگئی یہ عمارت اس قدر مضبوط تھی کہ ایک مستحکم قلعے کا حکم رکھتی تھی۔ دروازہ بند کر کے فوج اور پولیس دیواروں پر سے مجاہدین پر گولیاں برساتے رہے جو کھلے میدان صف آرا تھے۔ اور گولیوں سے حفاظت کا کوئی سامان نہ تھا۔ انگریزی دستے عمارت کے اندر دیواروں کی پناہ میں چھپے ہوئے گولیاں چلا رہے تھے نتیجہ یہ کہ مجاہدین کا شدید جانی نقصان ہوا۔ مگر عزم و جرأت سے میدان میں ڈٹے ہوئے مقابلہ کرتے رہے۔ مجاہدین کے پاس اسلحہ بھی کم تھا اور بھوکے پیاسے گولیوں کی بارش کھلے سروں پر برداشت کر رہے تھے مگر استقامت کا یہ عالم تھا کہ دو روز برابر اسی طرح جنگ جاری رکھی۔ تیسرے روز قائد لشکر حضرت حافظ محمد ضامن علی صاحب نے بڑھ کر تن تنہا تحصیل کے مستحکم پھاٹک پر ایسا حملہ کیا کہ دروازہ ٹوٹ گیا مجاہدین و غنیم کی فوجوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کرنا شروع کی طرفین کے سینکڑوں آدمی زخمی اور ہلاک ہوئے۔ انگریزی فوج کی گولیوں کی پروانہ کر کے حضرت حافظ صاحب نے سینہ سپر ہو کر فاتحانہ پیش قدمی میں جام شہادت نوش فرمایا۔ مجاہدین میں اس سے اور بھی جوش عمل بڑھا اور درانہ غنیم ٹڈی دل کو کچلتے ہوئے تحصیل کے اندر گھس گئے اور فتح پائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ (پنکھی) کلکٹر کی شاملی میں آمد کی خبر درست نہ تھی۔''

(مضمون عشرت رحمانی "۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک" اخبار کوہستان لاہور قسط نمبر ۳۶ اشاعت ۸ ستمبر ۱۹۶۸ء کالم نمبر ۳-۴)

ذیل میں ہم عشرت صاحب رحمانی کے مضمون "۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک" میں سے وہ فوٹو پیش کرتے ہیں جو انہوں نے شاملی کی تحصیل کا اور باہر ایک قتل وقتال کا یادگاری نقش دیا ہے انہوں نے یہ نقش کہاں سے لیا اس کا انہوں نے حوالہ نہیں دیا بلکہ اس نقش کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

"شاملی تحصیل کا انگریزی حصار ایک یادگار نقش جہاں حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے لشکر مجاہدین کو فتح یاب کیا اور جام شہادت نوش فرمایا۔"

(کوہستان قسط نمبر ۴۷-۱۹ ستمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۰)

تصویر حذف کردی گئی

شاملی تحصیل کا انگریزی حصار (ایک یادگار نقش) جہاں حافظ محمد ضامن صاحبؒ نے لشکر مجاہدین کو فتحیاب کیا اور جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے نقش حیات میں علمائے تھانہ بھون کی مجلس شوریٰ کے متعلق جو جہاد کے لئے بیٹھی تھی حسب ذیل نشان دیا ہے:

"حضرت (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) نانوتوی نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا (کیونکہ وہ چچا پیر تھے) (نہیں بلکہ حاجی صاحب سے عمر میں بڑے تھے اس لئے تایا پیر تھے) کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ دشمنان دین ووطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا "اتنا بھی سامان

> نہیں جتنا کہ غزوہ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ محمد ضامن صاحب نے فرمایا کہ مولانا بس میں سمجھ گیا اور پھر جہاد کی تیاری شروع کر دی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحبؒ نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانویؒ کو میمنہ میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔" (نقش حیات جلد دوم صفحہ ۴۲۔۴۳)

اس عبارت سے ہمیں فوجی عہدوں کی تقسیم کا پتہ چلتا ہے لیکن کیا اچھا ہوتا کہ حضرت مولانا مدنیؒ اپنی فوجی تقسیم کی معلومات کا حوالہ عنایت فرماتے۔

بہر حال واقعات اور حقیقت سے لبریز حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ باغ شیر علی کے پاس سے تھانہ بھون کے قریب گذرنے والی سڑک پر اکابر دیوبند تھانہ بھون نے انگریزی حکومت کے فوجیوں اور میگزین پر بھرپور حملہ کیا اور ان کا توپ خانہ بہنگیوں میں لدا ہوا اسلحہ اور کارتوس وغیرہ چھین لئے اور انگریزی فوجی مارے گئے اور بعد ازاں شاملی پر تین روز تک زبردست جنگ رہی اور حضرت، حافظ محمد ضامن صاحب شہید ہو گئے اور انہوں نے شاملی کی تحصیل کا دروازہ توڑ کر رکھ دیا۔ شاملی کو فتح کر لیا۔ مولانا محمد طیب صاحب نے مولانا منصور انصاری سے اور انہوں نے مولانا محمد منیر سے سنا کہ:

> "انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی اور ادھر سے مجاہدین پر بندوقوں کی باڑھ مارنی شروع کی جس سے سینکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے۔ اس وقت پریشانی یہ تھی کہ انگریزی فوج قلعہ بند اور محفوظ تھی اور مجاہدین سامنے کھلے میدان میں تھے۔ ان کا (یعنی انگریزی فوج کے بندوقچیوں) کا حملہ کارگر اور کامیاب ہوتا تھا اور مجاہدین کے حملے غیر موثر ہو کر رہ جاتے تھے۔ اس طرح (ایک طرفہ مار کی وجہ سے) مجاہدین کا کافی نقصان ہوا۔" (جہادی مقالہ)

مولانا محمد قاسم صاحب کا کارنامہ:

مذکورہ بالا روایات میں تو یہ ہے کہ حافظ صاحب نے حملہ کر کے تحصیل کا دروازہ توڑ

دیا۔ سرسید کی روایت میں ہے کہ تحصیل میں جو چھپر پڑے تھے اور ان کا کچھ حصہ باہر کی طرف کو تھا ان میں آگ لگادی گئی لیکن مولانا محمد طیب صاحب اپنے جہادی مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''(تحصیل کے) دروازے کے قریب چھپر کی ایک کٹیا تھی جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایہ لینے کیلئے بنائی گئی تھی۔ حضرت نانوتوی نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپریا کو اپنی جگہ سے جلد جلد اکھاڑ کر اسے تحصیل کے دروازے سے لا ملایا اور اس میں آگ دے دی۔ آگ کا لگنا تھا کہ تحصیل کے پھاٹک کے کواڑ بھی جل اٹھے۔ بند دروازہ مجاہدین کیلئے وا ہوگیا اور یلغار کرتے ہوئے تحصیل کے اندر مجاہدین گھس گئے قلعہ بند فوج سے دست بدست جنگ ہونے لگی پانسہ مجاہدین کے حق میں پلٹ آیا۔ انگریزی فوج کو شکست ہوئی تحصیل شاملی پر مجاہدوں کا قبضہ ہوگیا (حافظ صاحب کو تحصیل کے باہر اور اندر مجاہدین کی نگرانی اور کمان کے باعث آنے جانے کی ضرورت پڑتی تھی کہ اسی اثنا میں جب وہ باہر تحصیل کی طرف منہ کئے کھڑے ہوئے جائزہ لے رہے تھے کہ بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب ''گولی ناف پر لگی'' (اور بقول مولانا محمد طیب صاحب) ''حضرت (حافظ شہیدؒ) اک دم اچھل کر زمین پر گرے (اور دیکھا گیا کہ) بہ ہیئت تشہد زمین پر بیٹھے ہیں۔'' (جہادی مقالہ صفحہ ۷)

حافظ صاحب کی شہادت اور تھانہ بھون میں تدفین:

مولانا عاشق الٰہی صاحب تذکرۃ الرشید میں شاملی کے جہاد کے موقع پر لکھتے ہیں کہ:

> ''اسی گھمسان میدان میں (حافظ صاحب نے) مولانا (رشید احمد صاحب) کو پاس بلایا اور فرمایا میاں رشید میرا دم نکلے تو تم میرے پاس ضرور ہونا۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ حافظ صاحب دھم سے زمین پر گرے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا۔ حافظ صاحب کا زخم سے چور ہو کر گرنا تھا اور حضرت امام ربانی کا لپک کر تڑپتی نعش کا کاندھے پر اٹھانا قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کا سر اپنے زانو پر رکھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے، یہاں تک کہ حافظ صاحبؒ کا آپ کے زانو پر سر رکھے وصال ہوگیا۔ جب مفسدوں (یعنی انگریزی فوجوں) کی معرکہ آرائی سے پیچھا

شاملی کا میدان جہاد اور گنج شہیداں جس میں مجاہدین شاملی مدفون ہیں

> چھٹا تو حضرت اپنے شہید وفا روحانی مربی (حافظ صاحب) کی نعش کو کاندھے پر لے کر اٹھے اور چارپائی پر لٹا کر یکے بعد دیگرے تھانہ بھون میں بسمت مغرب زمین کی گود کے حوالے کیا۔" (تذکرۃ الرشید جلد نمبر ۱ صفحہ ۷۵۔۷۶)

آگے چل کر مولانا عاشق الٰہی صاحب بھی صاف صاف مخبروں کی زبانی بستی کی دکانوں کے چھپروں سے تحصیل کا دروازہ جلانے کا واقعہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ عقلمند کیلئے اشارہ کافی ہے:

> "مفسدوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشیں حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور مخبری کی کہ تھانہ کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دکانوں کے چھپر انہوں نے تحصیل کے دروازے پر جمع کئے اور اس میں آگ لگا دی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملاؤں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کا لوٹا تھا۔" (تذکرہ جلد نمبر ۱ صفحہ ۷۶)

حقیقت روشن ہو کر سامنے آئی کہ بستی کی دکانوں کے چھپر اتار کر جس میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ بھی شریک تھے تحصیل کا دروازہ جلایا گیا۔

ثناء الحق صاحب علیگ لکھتے ہیں:

حافظ صاحب کے مزار کا محلِ وقوع:

> "شاملی کی فتح نے وقتی طور پر انگریزی حکومت کو دبنے پر مجبور کر دیا۔ مجاہدین اس نمایاں کامیابی کے بعد تھانہ بھون لوٹ آئے اور حضرت حافظ ضامن حسن شہید کے جسد مبارک کو لا کر آسودہ خاک کیا۔ آپ کا مزارِ پرانوار شہر سے ریلوے سٹیشن جاتے ہوئے بیروں کے باغات کے درمیان واقع ہے۔ چار دیواری چھوٹی اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ آج بھی خاک و خشت کے اس انبار سے طرح طرح کی کرامتوں کا ظہور ہوتا ہے۔"

(مقدمہ وحدۃ الوجود والشہود صفحہ ۵۶)

جہادِ شاملی کے بعد تھانہ بھون کی ویرانی اور تباہی ستمبر ۱۸۵۷ء:

جہادِ شاملی کے بعد جو کچھ تھانہ بھون پر گذری ہم گذشتہ اوراق میں مولانا عاشق الٰہی صاحب کے حوالے سے لکھ آئے ہیں کہ انگریزوں کی فوج نے حملہ کیا اور تھانہ بھون کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور قصبے کو جلا کر خاک کردیا۔

ثناء الحق صاحب لکھتے ہیں:

> ''شاملی کی شکست نے انگریزوں کو بے انتہا مشتعل کردیا۔ ایڈورڈس بڑھانے (ضلع مظفر نگر) کے قلعہ کو فتح کر کے لوٹا تو اس کی فوج میں دو توپوں اور ۱۰۰ (سو) سکھ سپاہیوں کا اضافہ ہوگیا تھا وہ سمجھ رہا تھا کہ میرے شاملی پہنچنے سے وہاں کی فوج کو تقویت ہوگی لیکن راستے ہی میں تھا کہ اسے تحصیل پر مجاہدین کے قبضے کی اطلاع ملی اس نے اس تاراجی (لوٹ) کا بدلہ لینے کے لئے اسی وقت تھانہ بھون پر حملہ کرنا چاہا لیکن یہ معلوم کر کے کہ مظفر نگر کی حالت زیادہ تشویشناک ہے وہ تھانہ بھون کو چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہوگیا۔
>
> ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۲ھ کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہوگیا تھا۔ ادھر ایڈورڈس نے مظفر نگر پہنچ کر وہاں کے حالات درست کئے جب ہر طرف سے اطمینان ہوگیا تو پھر تھانہ بھون کی طرف توجہ کی۔ انہی ایام میں کمشنر میرٹھ اور کلکٹر سہارنپور (رابرٹ اسپنکی) کے پاس کمک آگئی اور کمشنر مذکور کا اشارہ پا کر ایڈورس نے تھانہ بھون کی طرف کوچ کردیا۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ اس کے ساتھ کل کتنی فوج تھی اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس میں کچھ پیدل سکھ اور سوار کچھ گورکھے اور دو توپیں تھیں اس فوج کے ساتھ دو سول افسر بھی تھے ایک سوٹنن میلول اور دوسرا ملکم لو۔ موخر الذکر کو رابرٹ اسپنکی نے آخری امدادی فوج کے ساتھ بھیجا تھا۔ ایڈورڈس نے دن اور تاریخ کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن گمان غالب ہے کہ یہ حملہ ۱۶ ستمبر (۱۸۵۷ء) کے بعد ہوا تھا۔
>
> کپتان اسمتھ اور لفٹیننٹ کوبلر کی ماتحتی میں سکھوں اور گورکھوں کی ایک جمعیت نے حملہ کیا اور آبادی سے باہر کی چند عمارتوں پر قبضہ کرلیا۔ کچھ فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ لیکن مجاہدین نے یہ حملہ بری طرح پسپا کردیا۔ انگریزی فوج کے سترہ آدمی مارے گئے اور

پچیس زخمی ہوئے جن میں وہ افسر تھے۔ پسپائی کے وقت میلول اور لو نے بڑی سمجھداری سے کام لیا اور وہ اپنی فوج کو تباہی سے بچا کر نکال لے گئے۔ حالانکہ خود لو ایک معرکہ میں زخمی ہو گیا۔ اس کے زخمی ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی فوج کو لئے ایک گاؤں کی تنگ گلیوں سے گذر رہا تھا تو ایک جتھے نے اس کو گھیر لیا۔ دست بدست لڑائی ہوئی جس میں اس کی تلوار کے تین نہایت گہرے زخم آئے۔

اس شکست نے انگریزوں میں کافی کھلبلی ڈال دی۔ کمشنر، اسپنکی کو اور اسپنکی فوجی افسروں اور کلکٹر مظفر نگر ایڈورڈس کو مہتم گردانے لگے۔ لیکن کین کی رائے ہے کہ اس سانحے کی پوری ذمہ داری درحقیقت کمشنر پر عائد ہوتی ہے اس لئے کہ اس نے تھوڑی سی فوج بھیج کر ایڈورڈس کو یہ نادر شاہی حکم دیا تھا کہ ”فوراً بڑھو اور مفسدوں کا سر کچل دو“ مگر جب دوبارہ غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ یہ احکامات قبل از وقت نافذ کر دئے گئے ہیں تو اس نے حملے کو کچھ عرصے کیلئے ملتوی کر دینا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے پہلے حکم کے مطابق حملہ کیا جا چکا تھا اور پسپا بھی ہو گیا تھا۔ بہر حال اس شکست کے تھوڑے ہی عرصے بعد مزید کمک آ گئی اور ستمبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے انگریزی فوج نے بغیر کسی مزاحمت کے تھانہ بھون پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدین اپنے گھروں کو چھوڑ کر مختلف شہروں اور قصبوں کی طرف چلے گئے۔ (مقدمہ وحدۃ الوجود صفحہ ۵۶ تا ۵۸)

مذکورہ بالا واقعات ہنری جارج کین (Henry Gerge Keen) کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ کین کا بیان ہے کہ تھانہ بھون پر دو حملے ہوئے لیکن بقول ثناء الحق صاحب کے قاضی محمد مکرم صاحب مائل کے بیان کے مطابق تھانہ بھون پر چار حملے ہوئے۔

۱۔ پہلے حملے میں ایک ہزار سپاہی اور چھ توپیں تھیں۔ جلال آباد اور تھانہ بھون کے راستے پر مجاہدین نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور اسے پسپا کر دیا۔

۲۔ دوسرا حملہ دو ہزار فوج سے ہوا اس میں بھی چھ توپیں تھیں۔ مجاہدین نے بہادری سے مقابلہ کر کے اس حملے کو بھی ناکام بنا دیا۔ توپوں سے محض دو گولے چلنے کی

نوبت آئی تھی کہ مجاہدین نے ان کو بیکار کر دیا اور انگریزی فوج اس مرتبہ بھی ہزیمت خوردہ واپس گئی۔

۳۔ تیسرا حملہ زیادہ سخت تھا اس مرتبہ انگریزی فوج کی تعداد چھ ہزار تھی اور پورا توپ خانہ مع گولا بارود ساتھ تھا۔ یہ فوج بڑھتی ہوئی حوض والی مسجد تک جہاں مولانا شیخ محمد کا مکان تھا پہنچ گئی۔ لیکن قاضی عنایت علی نے نہایت بہادری سے اس کا مقابلہ کیا۔ اور اس دفعہ بھی انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب جلال آباد سے بھی آگے تک کیا پھر لوٹ آئے۔

۴۔ چوتھا حملہ جب تیسرا حملہ بھی پسپا ہو گیا تو انگریزوں نے جھلا کر بارہ ہزار اور ایک روایت کے بموجب چوبیس ہزار سپاہ اور توپ خانہ کے ساتھ چوتھی مرتبہ حملہ کیا۔ مجاہدین اس کو نہ روک سکے اور میدان کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے جس کو جہاں موقع ملا چلا گیا قصبے پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔" (حاشیہ وحدۃ الوجود صفحہ ۵۸ تا ۶۰)

ان سب اکابر نے شاملی کے علاوہ تھانہ بھون میں بھی جہاد کیا معلوم ہوتا ہے۔ ادھر شاملی فتح ہوئی ادھر حافظ محمد ضامن شہید ہوئے اور مجاہدین لاش لے کر تھانہ بھون آ رہے تھے تھانہ بھون میں ان کی شہادت کی خبر مل چکی تھی۔ ہر گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ حاجی صاحب مع اہل قصبہ جنازے کے استقبال کیلئے باہر آئے ہوئے تھے۔ جونہی جنازے پر نظر پڑی بیساختہ چیخ نکل گئی اور یہ جملہ زبان سے نکلا:

"جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا وہ بات پوری ہو گئی، دیکھنا قصہ بھی ختم ہو گیا۔"

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۵۸)

خدا شناس اکابر اور عارفین کی یہی رائے ہے کہ یہ سب کچھ شہادت کے دولہا حافظ صاحب کیلئے میدان کارزار اور جہاد کا سامان پیدا کیا گیا کہ ملاقات خداوندی کے لئے عرصے سے بے حد بے تاب تھے بلکہ بعض اوقات لقائے ربی کیلئے خودکشی کیلئے مضطرب نظر آتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس حجرے میں کوئی چاقو اور چھری رہنے نہ دو۔ مبادا میں اپنے آپ کو فنا کر لوں۔ (ملفوظات تھانوی)

حافظ محمد ضامن صاحبؒ کے حالات زندگی

اس مقام پر قدرے حافظ صاحب کے حالات زندگی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

حافظ محمد ضامنؒ صاحب ساکن تھانہ بھون حاجی امداد اللہ صاحبؒ اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ کے ہم وطن، پیر بھائی اور فاروقی النسل تھے ولی کامل اور منزل سلوک کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہو چکے تھے۔ آپ کے مرشد میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے حاجی صاحب کے مقامات سلوک کی تکمیل کے لئے ان کو حافظ صاحب کے سپرد کیا۔ بلکہ مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے بھی تعلیم سے فراغت کے بعد اول حافظ صاحب سے جو مولانا کے رشتے کے ماموں ہوتے تھے فیض حاصل کیا۔ اور پھر میاں جی نور محمد صاحب سے بیعت کی۔

پیدائش:

ہماری تحقیق ہمیں اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ حافظ صاحب ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان پیدا ہوئے۔ کیونکہ آپ حاجی صاحب اور مولانا شیخ محمد صاحب دونوں سے عمر میں چند سال بڑے تھے۔ حاجی صاحب کا سال پیدائش ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۴ء ہے اور مولانا شیخ محمد ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ شہادت کے وقت آپ کی عمر تقریباً پینتالیس سال تھی اس لئے حافظ صاحب شہید ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء کے قریب قریب پیدا ہوئے ہیں۔

ہم آپ کو اب حافظ صاحب کے ایک خلیفہ اور جان نثار مرید حکیم ضیاء الدین صاحب رامپور منہاران ضلع سہارنپور کی اس تحریری دستاویز کی طرف لئے چلتے ہیں جو "مونس مہجوراں" کے نام سے مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور جو حافظ ضامن صاحب کی جہاد شاملی میں شرکت پر ایک یقینی تاریخی تحریر ہے اور اس میں حافظ ضامن صاحب کے محقق حالات بھی درج ہیں۔

عادات واخلاق:

حکیم ضیاء الدین صاحب ”مونس مہجوراں“ میں حافظ صاحب کے عادات واخلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ”اللہ تعالیٰ نے اس ذات عالی کو کیا بے نظیر پیدا کیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاتا اور بایں صورت وشان باکمال .... ایسے بے ساختہ اور بے تکلف تھے کہ تصنع کا گمان بھی نہ آتا تھا اور ظاہر وباطن وہ صاف معاملہ تھا کہ ریا کی بو باس نہ تھی اور ہر ایک یہ جانتا تھا کہ مجھ سے نہایت محبت رکھتے ہیں۔ ہیبت حق چہرہ پر نور سے ایسی عیاں تھی کہ ہر ایک دفعہ آنکھ نہ ملا سکتا تھا اور مردم شناسی کا یہ ملکہ تھا کہ کبھی رائے خطا نہ ہوتی تھی اور جیسا جس کو دیکھتے ویسے اس سے کلام فرمایا کرتے تھے۔ غرض کسی حال میں افراط وتفریط نہ تھی اور باوصف خانہ داری اور اہل وعیال کے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے۔ گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا ہر وقت عشق الٰہی میں مست وسرشار رہتے تھے۔ دل کی کیفیت چہرہ مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی۔ آنکھیں ہر وقت بادہ معرفت کے نشے سے مخمور رہتی تھیں۔ محبت الٰہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا۔“

(مونس مہجوراں رسالہ تذکرہ دیوبند نومبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۱)

حافظ صاحب کا حلیہ:

حکیم ضیاء الدین صاحب نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے سو اشعار اپنے رسالے میں درج کئے ہیں جن میں حافظ صاحب کا حلیہ بیان کیا گیا ہے جس سے بوقت شہادت ڈاڑھی کے بالوں کا سیاہ ہونا اور چیچک کے داغوں کا چہرے پر ہونا وغیرہ ثابت ہوتا ہے۔ کچھ اشعار حسب ذیل ہیں۔

حلیہ پاک ان کا لکھے ہے قلم   ہیں ید قدرت کے وہ نادر رقم
صورت وسیرت میں سب سے نبیہ   حضرت فاروق کی بالکل شبیہ
قامتِ موزوں ہے طوبیٰ مثال   اس کی صفت ہوگئی لکھنی محال

قد متوسط ہے نہ کوتہ، دراز سامنے جس کے کرے طوبیٰ نیاز
چہرہ پرنور کا عالم ہے اور چاہئے یاں دیدہ حق ہیں کو غور
نور خدا اس میں نظر آئے ہے سامنے کیا برق ہو شرمائے ہے
چہرہ پرنور میں ہے یوں دمک نور تجلی کی ہو جیسے چمک
چاند کہاں چہرہ نیکو کہاں چشم کہاں نرگس جادو کہاں
چشم نہیں نسخ کا یہ صاد ہے صل علی کیا عجب ایجاد ہے
سرخی چشم اس کی جو یاد آئے ہے آنکھوں سے یاں خون ہی بہ جائے ہے
ابروں میں جو نہیں پیوستگی اس میں ہے اک اور ہی دلبستگی
ان کے محاسن میں وہ چمکے عذار شعلے کی جوں دو دسیہ میں بہار
موج تبسم نے یہ عالم کیا گوہر و مرجان کو بے دم کیا
بات ہے کیا بات، پُر اسرار ہے بات ہے یا مطلع انوار ہے
رمزہ کنایہ سے لطیفوں سے پُر جیسے مرصع ہو کوئی سلک دُر
چہرے پہ چیچک کے جو دیکھو نشاں قطرہ شبنم گل تر پر عیاں
کیا کہوں ایسی ہے وہ گردن بلند زُلف کی پہنچے نہ جہاں تک کمند
عشق الٰہی میں جو ہمت بڑھی سر کو عجب طرح کی گرمی چڑھی
تاب نہ تھی سر پہ ذرا رکھیں بال دیتے تھے سر پر سے بلا اپنی ٹال
نعمت باطن کا خزانہ وہ دل آتش عشق اس میں صدا مشتعل
سینے پہ کچھ بال سیہ ہیں نمود ہیں یہ اسی آتش سوزاں کا دود
ہمت عالی کا کروں کیا بیاں جس کے رہے زیر قدم آسماں

پشت کی توصیف سنی ہر کہیں
تکیہ جز اللہ کسی پر نہیں

تعلیم وتربیت:

حافظ صاحب کی تعلیم وتربیت کا جہاں تک ہم کو علم ہے تو وہ اس قدر ہے کہ آپ نے

معمولی اردو فارسی کی کتابیں پڑھی تھیں اور قرآن شریف حفظ کیا تھا اور بس۔ آپ زیادہ لکھے پڑھے اور عالم نہ تھے۔ مسائل کی ضرورت پڑتی تو مولانا شیخ محمد محدث سے پوچھا کرتے تھے اور پھر مولانا گنگوہی سے، چنانچہ یہ تینوں حضرات یعنی حافظ صاحب، مولانا شیخ محمد اور حاجی امداد اللہ صاحب مسجد پیر محمد میں رہتے وہیں ذکر اللہ کی مجلسیں لگتیں اور مولانا شیخ محمد درس و تدریس میں رہتے۔ تینوں حضرات ولایت کا مقام رکھتے تھے۔ غرض کہ مسجد پیر محمد میں عجب بہار تھی۔ حافظ صاحب کسی کو بیعت نہیں کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی بیعت ہونے کے لئے کہتا تو آپ فرمادیتے:

> "بھائی اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ وہ خانقاہ میں اندر بیٹھے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے تو مولانا محمد محدث کے پاس جا کر پوچھو اور اگر حقہ پینا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

بیعت:

آپ نے میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی (ضلع مظفر نگر) سے بیعت کی تھی اور ان کے خلیفہ اور بہت بڑے صاحب کشف بزرگ تھے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

> "(بیعت کرنے کے بعد) وقت عصر حضرت میانجی صاحب (نور محمد) قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم آیت کریمہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ ختم کرلو۔ حضرت حافظ صاحب نے بعد عصر آیت کریمہ شروع فرمائی اور اگلی عصر تک ختم فرما کر اسی جگہ سے اٹھے اور اس ایک رات دن میں بجز حاجت ضروری یا نماز وغیرہ ضروریات کے کوئی بات نہ کی۔ جب میانجی صاحب نے ذکر و اشغال تلقین فرمائے اسی ہمت اور استقامت کے ساتھ انجام کو پہنچائے سوائے اور اشغال کے چند روز میں جس دم کی یہ مشق حاصل فرمائی تھی کہ ایک دم ذکر نفی و اثبات بعد شرائط پانچ سو مرتبہ تک پہنچا کر چھوڑ دیا۔ زیادہ حاجت نہ ہوئی ورنہ خدا جانے کہاں تک کثرت فرماتے اور کئی سال تک فقط آدھ پاؤ کے بقدر کھانا نوش جاں فرمایا کرتے تھے۔ اور ربط قلب شیخؒ کے ساتھ اس قدر پیدا کیا تھا کہ بالکل محو اور فانی الشیخ ہوگئے تھے ۱۵ شعبان (شب برات) سے آخر

رمضان شریف تک ڈیڑھ مہینے تمام شب مشغول رہتے تھے۔ شب کو لیٹنا، سونا بالکل موقوف کر دیتے تھے۔ چند روز میں کمال جذب کے ساتھ سلوک طے فرمایا اور اس قدر کمال توحید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے۔ اس وقت تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے۔" (مونس مہجوراں بحوالہ مضمون رسالہ تذکرہ دیوبند نومبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۰۔۱۱)

وجد اور اخفائے حال:

ولایت کے بہت اونچے مقام پر اڑنے کے باوجود اپنے مقامات کشف ولایت کو چھپاتے تھے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

"ابتدائے حال میں حضرت حافظ صاحب کو قمریوں سے شوق تھا۔ ایک روز بعد کھانا کھانے کے ایک روٹی قمریوں کیلئے لائے۔ جس وقت قریب پنجرے کے پہنچے تو ایک قمری نے صدائے حق سترہ سنائی۔ اس صدا کو سنتے ہی بیہوش ہو کر گر پڑے ناگاہ ایک شخص آ گیا اس وقت ہوش آ گیا تھا گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور یوں فرمایا کہ "دیکھو اکثر آدمی راہ میں پانی گرا دیتے ہیں لوگ رپٹ کر گر جاتے ہیں" سبحان اللہ کتنا اخفائے حال تھا کہ حتی المقدور اپنے حال کو بالوں سے چھپا دیا۔ اسی وجہ سے آپ کے اکثر حال اور خرق عادات ظاہر نہ ہوئے۔" (مونس مہجوراں)

اتباع شریعت اور زہد وتقویٰ:

حافظ صاحب شریعت کے بہت پابند تھے اور بدعت سے سخت متنفر، حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

"اور اتباع شریعت یہ کچھ تھا کہ ادنیٰ بدعت بھی جڑ سے اکھاڑ دیا کرتے تھے اور خود مسئلہ مختلف فیہا میں احتیاط پر عمل فرمایا کرتے تھے اور امر و نواہی میں شان فاروقیت کا (کہ فاروقی تھے) عروج ہوتا تھا زہد وتقویٰ پر ایسی کمر چست باندھی تھی کہ جان تک سے دریغ نہ فرمایا اللہ اللہ کیا اور اوصاف بیان کروں مختصر یہ کہ ایک دریائے نور تھا۔ نور محمدی کا ظہور تھا۔" (مونس مہجوراں)

شہادت کا کشف:

شہادت سے پہلے آپ کو شہادت کا کشف ہو چکا تھا حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ شہادت کے سال فرمایا کرتے تھے:

> "دیکھو حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے نے لیوئے ان ایام میں حضرت پیر و مرشد (حافظ صاحب ولولہ محبت الٰہی میں ایسے مست و مخمور ہوئے ہوئے تھے کہ اکثر ذکر شہادت برزبان تھا اور بہت باتیں اسرار کی کہ اٹھتے تھے۔ سرحال (اخفائے حال) کا چنداں لحاظ نہ رہا تھا اور جو کوئی بیعت کا مستدعی ہوتا تھا برخلاف عادت فوراً بیعت کر لیتے تھے۔" (مونس مہجوراں)

> "سرِ حال کا بہت خیال تھا آزادانہ وضع رکھتے تھے بوسیلہ سفارش حضرت حاجی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ میں مشرف بہ بیعت ہوا تھا۔" (مونس)

شہادت سے آٹھ دس روز پہلے حافظ صاحب کا خط:

شہادت سے آٹھ دس روز پہلے ایک خط فارسی زبان میں حافظ صاحب نے حکیم ضیاء الدین صاحب کو تحریر فرمایا جس کا ترجمہ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> "برادر دینی حکیم محمد ضیاء الدین سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام واضح رائے ہو کہ تمہاری تحریر کے موافق دل میرا متمنی ملاقات ہے لازم کہ بغور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے عاقل کو اشارہ کافی ہے۔ باقی حال بروقت بیان کیا جائے گا۔ فقط والسلام۔"

اس خط سے واضح ہے کہ جہاد کی تیاریاں پہلے ہی سے ہو رہی تھیں۔ قاضی عبدالرحیم کا معاملہ تو فوری جہاد کا سبب بن گیا تھا۔ کھچڑی پہلے سے پک رہی تھی۔

شہادت کی تیاری:

چونکہ شہادت کا کشف ہو چکا تھا اس لئے میدان شہادت میں جانے سے پہلے عید کی نماز کی تیاری کی طرح آپ نے شہادت کی بھی تیاری کی کہ محبوب سے ملاقات کا یہی طریقہ ہونا

چاہئے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

”جس وقت ارادہ معرکے کا کیا غسل فرما کر سب نیا لباس زیب بدن شریف فرمایا اور یہ لباس بہت روز پیشتر سے رکھ چھوڑا تھا حالانکہ ان کے بعد کے کپڑے بنائے ہوئے استعمال فرمائے اور وہ لباس اس دن کام آیا۔ نعلین شریفین کچھ بوسیدہ نہ تھیں مگر وہ بھی نئی منگا کر زیب پا کیں اور یہاں تک سامان لباس وغیرہ کا اہتمام کیا تھا کہ خوشبو ملی اور سرمہ لگایا، دستار پیچدار، سپاہیانہ وضع، شمشیر لے کر شربت دیدار کی تمنا میں علم جوانمردی اٹھا کر مردانہ، مشاقانہ برسر معرکہ جاں بحق تسلیم فرمائی جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

در کوئے تو عاشقاں چناں جاں بدہند
کانجا ملک الموت نہ گنجد ہرگز

تاریخ شہادت ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء

بروز پیر بوقت ظہر بمقام شاملی:

ہم حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ رسالہ لکھ کر تاریخ کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یوم شہادت کے متعلق لکھتے ہیں:

”آپ (حافظ صاحب) نے ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت شربت شہادت نوش جاں فرمایا۔ آپ کی وفات وشہادت پر جو تاریخیں کہی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ مولف رسالہ (حکیم ضیاء الدین) کے بھائی محمد علاء الدین صاحب رامپوری نے ”شہادت مرشد ہادی“ تاریخ شہادت نکالی۔

(۱۲۷۴ھ)

۲۔ مرزا غالب کے شاگرد مولوی عبدالسمیع صاحب بیدل رام پوری (منہاران) مصنف ”حمد باری“ نے یہ قطعہ لکھا ہے جس سے معرکہ جہاد پر بھی تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب ان کے اشعار لکھتے ہیں۔

شہید ہوگئے ضامن علی پاک نہاد جواب جن کا نہ تھا کوئی نسل آدم میں

ہوئے شہید مگر اک تماشہ دکھلا کر   لہولہان کیا دشمنوں کو اک دم میں
نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی   گلو بریدہ ہے سکہ بھی ان کا درہم میں
جو مارے تیر تو لگتے ہی جالیا گوشہ   ہزاروں کافر بد کیش نے جہنم میں
خدا کو پیارے ہوئے آخرش شہید ہوئے   نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ تواں ہم میں
جو پوچھا سن شہادت کہا فلک نے کہ ہائے   ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں
۱۲۷۴ھ

ایک اور تاریخ بیدل صاحب نے فارسی میں یہ لکھی ہے ۔

بیدل آن وقت کہ حافظ ضامن   رفت و آراست بجنت مسند
شاد رضوان شد و گفت ایں تاریخ   حافظ مصحف ایزو آمد
۱۲۷۴ھ

۴۔ میانجی عبدالغفور کوئی بزرگ اس وقت تھے۔ انہوں نے یہ تاریخ نکالی ۔

حوریں سب مل مل کے بولیں واہ وا   پیر کے دن خلد میں پیر آگئے
۱۲۷۴ھ

۵۔ ایک اور تاریخ ملا زین العابدین پشاوری کوئی بزرگ تھے۔ انہوں نے کہی ۔

شہ بہشت بریں بود نیرا زپے سال   بفال طرفہ بر آمد شہ بہشت بریں
۱۲۷۴ھ

مرثیہ حافظ محمد ضامنؒ شہید از مولانا محمد قاسم صاحبؒ:

حکیم ضیاء الدین صاحب نے مونس مہجوراں میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ۱۶۵ اشعار جو انہوں نے حافظ محمد ضامن صاحبؒ کے مرثئے میں لکھے ہیں درج کئے ہیں۔ جن میں سے کچھ یہاں پیش کئے جاتے ہیں ۔

نہ پوچھو ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم اس قدر جاں سے   ہمیں پایا پڑا ہے اب کے غمہائے فراواں سے
نہیں سے مول لے دے دل مجھے کچھ اور اے ہمدم   کہ اٹھنے کا نہیں بارِ غم اس قلب پریشاں سے
چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جا کر   کہ جس کا فال پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے
شہید راہ حق حافظ محمد ضامن چشتی   بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے

فراق یار میں جینا تعجب ہے دلے ہمدم   اجل سے اٹھ سکیں شاید نہ ہم بار گناہاں سے
نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو   سنیں گے پھر بھی وہ آوازان لبہائے خنداں سے
کسی کا کیا گیا پر رنج فرقت کی مصیبت کو   کوئی جا کر کے ٹک پوچھے ضیاء الدین نالاں سے
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حب الٰہی کی   کوئی پوچھے سبب رحلت کا اس سالار خوباں سے
اگر ممنوع تھا ہم سے گنہگاروں کا لے چلنا   تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا ہے سلطاں سے
اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے   تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالار نیکاں سے
مبارک ہو تمہیں وصل خدا خلد بریں میں پر   ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے
غم فرقت میں یاں گذرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی   تمہیں فرصت نہیں واں لذت دیدار یزداں سے
بنے تھے یوں تو ہم روز ازل سے غم اٹھانے کو   نہ تھی پر یہ خبر ہوں گے الگ بھی تیرے داماں سے
تمہارے ہجر میں جاں جہاں کچھ بن نہیں آتا   دل حسرت زدہ گھبرائے ہے سیر گلستاں سے
دل مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی   مگر ہاں سر نکالو تم مگر گنج شہیداں سے

تمہاری بزم پُر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو
تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب سوزاں سے

مولانا عبدالسمیع بیدل کے تاریخی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب نے جہاد میں بے حد سرگرمی سے کام لیتے ہوئے انگریزوں اور دوسرے دشمنوں مثلاً سکھوں کو بہت قتل کیا ہے انگریز جو بھی دیکھا اسے جہاد میں نہ چھوڑا۔ ہزاروں کا لفظ بتاتا ہے کہ حافظ صاحب کی شمشیر اور ان کے تیر نے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے اشعار سے حافظ صاحب کا شہید راہ حق ہونا، عشق و عرفان کی دولت سے مالا مال ہونا، حافظ صاحب کا امیر جہاد ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ سلطان کے لفظ سے واضح ہے۔ نیز ان اشعار سے حافظ صاحب کی پیر محمد والی مسجد میں پُر انوار مجلسوں کی طرف بھی نشان دہی ہوتی ہے۔

جلال کبریائی کا ظہور:

آگے چل کر حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ”حاصل کلام اس ہنگامے میں جلال کبریائی کو جوش وخروش تھا اور مدہوشانِ شیون الٰہی کو بھی ایک ولولہ اور ذوق وشوق تھا۔ چنانچہ مرشدی (رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ مرقدہ وقدس سرہ) نے بھی ضرور دنیائے دنیہ کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ کمر ہمت چست باندھ کر امر حق پر جان ومال کو قربان کیا اور ذوق وشوق دیدار الٰہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا اور تمنائے شربت شہادت وجام کوثر میں ہماری بے کسی کا بھی خیال نہ فرمایا۔ سبحان اللہ کیا ہمت مرداں مدد خدا کا تماشہ دکھلا کر مردانہ اور مشتاقانہ چوبیسویں محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو برسر معرکہ ہو کر جام شہادت نوش فرمایا۔ واہ کیا خوب داد ہمت لے گئے اور داغ حسرت دے گئے۔ (دوہرہ)

ساجن دکھیا کر گئے اور سکھ کو لے گئے ساتھ
جنم بچھو ہادے گئے اور پھر کے نہ پوچھی بات
یہ غلام آپ کا اے شاہ محمد ضامن
کب تلک حسرت دیدار کاٹے گاون

حافظ صاحب کے گھر کی ویرانی:

یہ حقیقت یہاں پہنچ کر واضح ہوگئی کہ ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء بروز پیر بوقت ظہر میدان جہاد میں شاملی کی تحصیل کے سامنے میدان میں آپ نے گولی کھا کر شہادت کا مقام حاصل کیا اور مولانا رشید احمد صاحب کے زانو پر میدان جہاد کی ایک مسجد میں آپ نے آخری سانس لے کر خدا سے جا ملاقات کی۔ بعد ازاں انگریزی فوجوں نے تھانہ بھون کو تباہ وبرباد کر دیا اور ان حضرات کی خانقاہ بھی نذر آتش ہوگئی۔ حکیم ضیاء الدین لکھتے ہیں:

> ”مسکن حضرت اقدس (حافظ صاحب) کہ اب ویران ہے باوصف اس خستہ حال کے دیکھو وہاں کیا جلوہ حق ہے اور اس اجڑے مکان میں کیا دل کشادگی ہے۔ خس وخاشاک سے بوئے گل اور نغمہ بلبل کی کیفیت پائی جاتی ہے اکثر اہل دل وہاں جا کر مسرور ہوتے ہیں اور فیض اٹھاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

بزمیکه بتشاں کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

یہ ہیں حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید علیہ الرحمۃ جو جہاد شاملی میں شہید ہوکر جنت الفردوس کی بہاروں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

شہادت ہے مطلوب مقصود و مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

اب ہم حضرت حاجی صاحب کے متعلق بھی جہاد کے بعد ان کے حالات سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی مکہ محترمہ کو ہجرت

۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں حصہ لینے والوں کو پھانسیوں پر لٹکایا جا رہا تھا۔ خبروں پر خبریں آتیں کہ فلاں کو پھانسی ہوئی اور فلاں کو کالے پانی کی سزا ملی۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”تینوں حضرات (حاجی صاحب حضرت گنگوہیؒ اور نانوتویؒ) کے نام چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور گرفتار کنندہ کیلئے صلہ تجویز ہو چکا تھا اس لئے لوگ تلاش میں ساعی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے وطن کو خیر باد کہا اور بہ نیت حرمین گھر سے باہر نکلے، آخری ملاقات ہند کیلئے گنگوہ آئے (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۷۷) اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے چند ماہ انبالہ، تگری، پنجلاسہ وغیرہا مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا اور آخر براہ سندھ و کراچی عرب کا راستہ لیا، جس وقت پنجلاسہ ضلع انبالہ پہنچے تو (اپنے مرید) راؤ عبداللہ خان رئیس کے اصطبل اسپاں کی ویران و تاریک کوٹھڑی میں مقیم تھے۔ ایک روز اسی کوٹھڑی میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادے سے مصلیٰ بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خان اعلیٰ حضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت، خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خان اعلیٰ حضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھڑی سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازے کے قریب پہنچے ہیں تو

سامنے سے دوش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا ششدر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، دوش اصطبل کے پاس پہنچی، دوش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر کہ میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق ہوا، اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لئے اور نہایت اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرے پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پا کر کبھی مخبر کی دروغگوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھے۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرے کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰ حضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ اس کوٹھڑی میں کیا گھاس بھری جاتی ہے؟ اس کے پٹ کھول دئے۔ راؤ عبداللہ خان کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی وہ انہی کے دل سے پوچھنا چاہئے سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلے کا وقت آگیا اور اپنا پیمانہ حیات لبریز ہو کر اچھلا چاہتا ہے اس لئے راضی برضا ہو کر ”جی ہاں“ کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔

کرامت:

خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہے تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا ہوا تھا، لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا پڑا تھا مگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خان دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحان وشاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار۔ کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر۔ آخر مخبر کی دھوکہ دہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خانصاحب ”یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے؟“ راؤ صاحب بولے جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اس کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا کہ آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھڑی؟ راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ”جناب مسجد فرض نماز کیلئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی چھپی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتہ بھی نہ

چلے" یہ جواب سن کر افسر نے پٹ بند کر دئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا۔ "راؤ صاحب معاف کیجئے آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہیں آیا۔" راؤ عبداللہ خان کی نظر سے دوش کے سوار جب اوجھل ہوئے تو واپس ہوئے اور کوٹھڑی کھولی دیکھا کہ اعلیٰ حضرت نماز سے سلام پھیر چکے۔ اور مصلیٰ پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔" (تذکرۃ الرشید جلد اصفحہ ۷۷ تا ۷۹)

عشرت رحمانی صاحب حاجی صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

"تھانہ بھون کے علمائے کرام کی زیر قیادت مجاہدین اپنے مرکز کے علاوہ ضلع مظفر نگر اور سہارنپور کے سب علاقوں میں پھیل کر معرکہ آرائیوں میں مصروف تھے۔ تھانہ بھون کی شکست کے بعد بھی انہوں نے علاقوں میں جنگ جاری رکھی تھی۔ میلی سن کے بیان کے مطابق پہلی بار کپتان اسمتھ اور لیفٹیننٹ کیولروس کی سرکردگی میں گورکھوں اور سکھوں کی فوجیں تھانہ بھون پر بھیجی گئی تھیں۔ مجاہدین نے انہیں مار بھگایا تھا۔ اس کے بعد جنرل ڈنلاپ نے ایک بڑی بھاری فوج اور توپ خانے کے ساتھ سخت حملہ کیا۔ مجاہدین کے پاس توڑے دار بندوقیں اور معمولی سامان جنگ تھا۔ جرأت اور استقامت سے مقابلہ کر کے پسپا ہوئے۔ کیونکہ انگریزی توپیں چاروں طرف سے گولہ باری کر رہی تھیں۔ مناسب یہی تھا کہ شہر خالی کر کے جانی نقصان سے محفوظ رہیں اور مجاہدین دوسرے مورچے سنبھالنے کے لئے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔

امیر جماعت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ اس شکست کے بعد گنگوہ تشریف لے گئے، اس کے بعد ضلع مظفر نگر و سہارنپور کے دیہات میں تنظیم جہاد کرتے رہے بعد ازاں ضلع انبالہ تشریف لے گئے جہاں تقریباً ڈیڑھ سال انبالہ، تگری اور پنجلاسہ وغیرہ کے علاقوں میں مجاہدین کو پیغام حریت دیتے ہوئے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔"

(اخبار کوہستان ۹ ستمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۸)

یہ لکھ کر عشرت رحمانی صاحب راؤ عبداللہ صاحب کے یہاں حاجی صاحب کے قیام

اور دوڑ کے پہنچنے اور حاجی صاحب کی کرامت کا ذکر کرتے ہیں جو ہم ابھی درج کر چکے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''اسی طرح گڑھی پختہ، ضلع مظفر نگر میں حضرت حاجی صاحب موضع کے رئیس کے مہمان تھے کلکٹر ضلع نے ان کے قیام کی اطلاع ملنے پر انگریز سپریٹنڈنٹ پولیس کو بھیجا کہ خود جا کر تلاشی لے کیونکہ موضع کا تھانیدار مسلمان تھا۔ جب سپریٹنڈنٹ پولیس اور تھانیدار اپنی جمعیت کے ساتھ زمیندار موصوف کے مکان کی طرف چلے تو تھانیدار خواجہ احمد حسین نے دور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور رئیس کا نام لے کر شور مچایا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ حکومت کے وفادار ہو کر باغیوں کے سرغنے کو اپنے گھر مہمان بناتے ہیں۔ ان کا فرض تھا کہ ایسے شخص کے یہاں آنے کی خبر فوراً ہمیں بھیجتے۔ اب اچھی طرح اس حرکت کا مزا چکھنا پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف سے گاؤں والے یہ آوازیں سن کر دوڑے۔ ان رئیس کے پاس گئے اور پہلے ہی پولیس اور حکام کے آنے کی خبر پہنچا دی چنانچہ حضرت حاجی صاحب کو جلدی سے خفیہ طور پر کسی ایسے مقام پر روپوش کر دیا گیا کہ چپے چپے کی تلاشی کے باوجود ان کا کسی کو نشان نہ مل سکا اور کئی مقامات پر اسی قسم کے واقعات پیش آئے۔ حکام حضرت حاجی صاحب کا تعاقب کرتے رہے اور حضرت حاجی صاحب جگہ جگہ رشد و ہدایت کی شمع دکھاتے لوگوں میں بیداری و حریت کے جذبات جگاتے تائید غیبی کے حفظ و امان میں سندھ کے راستے کراچی پہنچے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کیلئے روانہ ہو گئے اور سرزمین حجاز میں مستقل طور پر (مکہ معظمہ) قیام پذیر ہوئے۔ یہاں آپ کے زہد و تقویٰ ریاضت اور مجاہدہ اور درس و تدریس (مثنوی مولانا روم وغیرہ) نے اہل عرب و عجم کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اور شیخ العرب و العجم کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے بلند عزائم اور مجاہدانہ سرگرمیوں نے ملک کے گوشے گوشے میں روح حریت پھونکی اور قوم کو غیر ملکی استبداد اور لادینی کے تسلط سے نجات دلانے کے لئے ہر طرح کی صعوبتیں جھیلیں۔ میلوں پا پیادہ سفر کئے، گھر بار لٹایا، اہل خانہ در بدر ہوئے۔''

(کوہستان اخبار ۹ ستمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۸ کالم نمبر ۴۔۵)

بالہام غیبی مکہ محترمہ کو ہجرت:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے مکہ محترمہ کو ہجرت خود فرمائی یا آپ کو غیبی الہام کے باعث ہجرت کا اشارہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں حکیم ضیاء الدین صاحب اپنے رسالے ”مونس مہجوراں“ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”ناگاہ جناب حاجی صاحب قبلہ سلمہ اللہ تعالیٰ کو جناب باری سے الہام ہوا کہ بیت اللہ کو آؤ۔ چنانچہ وہ بھی بالہام حق، بیت اللہ شریف تشریف لے گئے، ہائے بیدادی کیسے کیسے مربی جدا ہوئے، اس پر بھی ہم سر پھرے جیتے رہے، یہ نظم حسب ذیل ہے۔
>
> چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
> ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا غل تھا
> خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خاک گلشن میں
> بتاتا باغباں رورو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اپنی کتاب آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”سیدنا و مرشدنا و مولانا الحاج امداد اللہ (زال کاسمہ امداداً من اللہ للمسلمین و اہل اللہ کی زیارت سے جو ہنگامہ و متحیر مثال غدر ہندوستان کے بعد وطن قدیمی تھانہ بھون ضلع سہارنپور و مظفر نگر کو چھوڑ کر بحکم اشارات باطنی بلد اللہ الامین مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفا وعزۃ میں مقیم ہیں بہرہ اندوز شرف و عزت ہوا۔“ (صفحہ۴)

اس عبارت میں ”بحکم اشارات ربانی“ مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اور حکیم ضیاء الدین صاحب نے جناب باری سے الہام ہوا کہ بیت اللہ کو آؤ کے جملے میں بالکل صاف ہو گیا کہ حاجی صاحب کو باری تعالیٰ کی طرف سے ہندوستان چھوڑ کر حجاز آنے کی دعوت دی گئی۔

اسی طرح خدا کا حکم ہے:

روپوشی کے ایام میں جب حاجی صاحب پنجلاسہ میں تھے اور حضرت گنگوہی کو وہاں

قیام کا علم ہوا تو حضرت گنگوہی بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب ''راتوں چلتے، دنوں چھپتے، خاردار جنگل پیدل قطع کرتے'' پنجلاسہ پہنچے۔ حاجی صاحب سے ملے۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہی) نے ہر چند اصرار کیا کہ بندے کو ہمرکاب لے چلیں مگر اعلیٰ حضرت نے نہ مانا اور یہ فرمایا کہ اسی طرح خدا کا حکم ہے ''جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا۔'' آپ کو وہاں سے رخصت فرمادیا۔ حضرت مولانا بادل ناخواستہ الفراق کہتے روانہ ہوئے اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے اعلیٰ حضرت نے تسلی و تشفی دی اور فرمایا میاں رشید احمد تم سے تو حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت میں ہندوستان سے نکلتے وقت تم سے ضرور مل کر جاؤں گا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے اور مراتب میں ترقی دے۔'' اس کے بعد دیر تک چھاتی سے لگائے رکھا اور آخر کار پدرانہ شفقت اور مربیانہ محبت کے انداز پر خود بھی چشم نم ہوئے اور مولانا کو بھی رلایا۔''

(تذکرہ جلد نمبر ا صفحہ ۸۱)

حاجی صاحب مولانا گنگوہی سے جیل میں ملے:

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کو ہجرت کا الہام ہوا تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے مولانا گنگوہی سے ہندوستان سے نکلتے وقت ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مولانا گنگوہی پنجلاسہ سے واپسی پر حاجی صاحب سے ملنے کے بعد گنگوہ واپس پہنچے اور رام پور منہاران سے گرفتار ہو کر مظفر نگر کی جیل میں پہنچے تو ایک شخص نے مولانا گنگوہی سے پوچھا کہ حاجی صاحب تو حجاز چلے گئے مگر حسب وعدہ آپ سے مل کر نہیں گئے۔ حضرت گنگوہی نے بہت ہی ہلکی آواز سے فرمایا:

''اعلیٰ حضرت وعدہ خلاف نہ تھے۔''

مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ''دوسرے طرق سے معلوم ہوا کہ باوجود سنگین پہرے کے اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے جیل خانے کے اندر قدم رکھا اور کئی گھنٹے باتیں کر کے شب ہی میں واپس

ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔" (تذکرۃ الرشید صفحہ ۸۵ جلد اول)

حاجی صاحب کا کشف خاص:

مولانا عاشق الٰہی صاحب مولانا گنگوہی کی گرفتاری کے بعد حاجی صاحب کے ایک خصوصی کشف کے متعلق لکھتے ہیں:

> "مولوی ولایت حسین کی روایت ہے کہ حکیم صاحب جو اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کے مرید انبالہ کے رہنے والے بندے کے ساتھ سفر حج میں شریک تھے فرماتے تھے کہ جس زمانے میں مولانا گنگوہی جیل خانے میں تھے اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرمانے لگے کہ "میاں کچھ سنا کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔" خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں ابھی تک تو کوئی خبر آئی نہیں۔ فرمایا "ہاں حکم ہوگیا چلو" یہ فرما کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور میں غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی غرض تین آدمی چلے شہر سے نکل کر تھوڑی دیر جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قدرتی سبز مخملی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکوت فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا "پھر چلو مولوی رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا۔ خدائے تعالیٰ کو ان سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے۔" چنانچہ چند روز بعد اس کا ظہور ہوگیا۔" (تذکرۃ الرشید جلد نمبر ا صفحہ ۸۵)

۱۲۷۶ھ/ ۱۸۵۹ء میں مکہ محترمہ میں ورود اور وفات:

حکومت کی سر توڑ کوششوں کے باوجود حاجی صاحب حفاظت خداوندی میں گرفتار ہوئے بغیر گنگوہ، انبالہ، تنگری، پنجلاسہ میں معتقدین اور جان نثار مریدین کے یہاں قیام کرتے کرتے جمادی الاخریٰ ۱۲۷۶ھ میں پنجاب اور سندھ سے ہوتے ہوئے کراچی اور پھر بادبانی جہاز کے ذریعہ چلتے چلاتے دو سال کے عرصے میں ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں مکہ محترمہ پہنچے۔ مکہ محترمہ کے دوران قیام، ابتدا میں بے حد فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کے بعد فتوحات کے دروازے کھلے اور حجاز کے لوگوں کو چالیس سال فیض پہنچاتے رہے۔ آپ صفر

۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے اور اکتالیس سال کی عمر میں آپ نے اس جہادِ حریت کے بعد ہجرت فرمائی اور ۱۲ یا ۱۳ جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ کو بروز بدھ صبح کی اذان کے وقت چوراسی سال تین ماہ بیس دن کی عمر میں وفات پائی۔ جنت المعلیٰ میں (جہاں حضرت خدیجہ الکبریٰؓ) کا مزار ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مجاہد کی قبر کے برابر دفن کئے گئے اور اس طرح یہ دونوں مجاہدین اور عالم وولی عالم برزخ میں قیامت تک کی رفاقت کا عہد و پیماں کئے ہوئے ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوامِ ما

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی پر کیا گذری

اب اس جہادِ حریت کے ایک اور جان نثار پروانے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی پر کیا گذری، ان کا حال بھی سن لیجئے ورنہ قاری کو تشنگی رہ جائے گی مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ''آپ کی گرفتاری کا اشتہار ہو چکا تھا اور دوش آیا چاہتی تھی چنانچہ اقارب کے اصرار سے آپ اپنی دادھیال (کہ آپ کا اصلی وطن وہی تھا) یعنی قصبہ رام پور چلے گئے اور وہاں حکیم ضیاء الدین صاحب مرحوم کے مکان پر قیام کیا۔ چند ہی دن گذرے تھے کہ گارڈن کرنل فرانسیسی، غلام علی ساکن قصبہ ملی پور ضلع سہارنپور مخبر کو ستر سواروں کے ساتھ لے کر جن میں چند مسلمان اور اکثر سکھ تھے گنگوہ پہنچا۔'' (تذکرہ صفحہ ۸۱)

جب مولانا گنگوہی وہاں نہ ملے اور انہوں نے کونہ کونہ چھان مارا تو پھر مولانا عاشق الٰہی لکھتے ہیں:

> ''دوش نے رام پور (منہاران) کا رخ کیا کہتے ہیں کہ رامپور کی مخبری کرنے والا شخص حکیم امیر بخش تھا واللہ اعلم بالصواب۔ دوش رام پور پہنچی اور حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب) قدس سرہ حکیم ضیاء الدین صاحب کے مکان سے گرفتار ہوئے۔ تخمینے سے یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ کا ختم یا ۱۲۷۶ھ کا شروع سال ہے۔ چونکہ آپ نے اپنی گرفتاری اور حاکم کے حکم کی تعمیل میں دوش کے ہمراہ چلنے سے کچھ بھی تامل یا اضطراب نہیں فرمایا اس لئے آپ کو کسی قسم کی کوئی اذیت نہیں پہنچائی گئی اور نہ ذلیل سمجھا گیا۔

صرف آپ کے چاروں طرف محافظ پہرہ دار تعینات کردیے گئے اور بند بہل میں آپ کو سوار کر سہارنپور چلتا کر دیا گیا۔ بیل تھے تیز رفتار اور حکم بھی تھا عجلت کا اس لئے کچی سڑک پر وہ غبار اڑا کہ راستہ چلنے والوں کی آنکھیں اندھی ہوگئیں۔"

(تذکرہ صفحہ ۸۲)

اکبر علی نامی سہارنپور کا ایک شیخ زادہ ان لوگوں میں شامل تھا جو حضرت کو جیل خانے تک پہنچانے پر مقرر ہوئے تھے اس نے بتایا کہ

"مولوی رشید احمد کو جیل خانے پہنچا کر آیا ہوں۔"

مولانا ابوالنصر حضرت کے جان نثار ماموں حالات کے تعاقب میں تھے۔ نانوتے کے کسی کیلی بردار کے ہاتھوں جو جیل کا خادم ہوگا مولانا ابوالنصر نے مولانا گنگوہی کو اندر کھانا بھیجا۔ حضرت گنگوہی نے کنکریوں پر کوئلے سے لکھ کر بھیجا:

"کچھ مت گھبراؤ میں بحمداللہ آرام میں ہوں۔" (تذکرہ صفحہ ۸۳)

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تحریر کے مطابق کہ:

"مولانا تین یا چار یوم کال کوٹھڑی میں اور پندرہ دن جیل خانے کی حوالات میں مقید رہے۔ تحقیقات پر تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی آخر عدالت سے حکم ہوا کہ تھانہ بھون کا قصہ ہے اس لئے مظفرنگر منتقل کیا جائے۔ چنانچہ امام ربانی جنگی حراست اور ننگی تلواروں کے پہرے میں براہ دیوبند دو پڑاؤ کر کے پا پیادہ مظفرنگر لائے گئے اور اب یہاں کے جیل خانے میں حوالات کے اندر بند کر دیئے گئے۔" (تذکرہ صفحہ ۸۴)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے ملاقات:

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تحریر کے مطابق کہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"سنا ہے کہ دیوبند کے قریب گذرنے پر مولانا قاسم العلوم نظر براہ راستے سے کچھ ہٹ کر بغرض ملاقات پہلے سے آ کھڑے ہوئے تھے۔ گو خود بھی مخدوش حالت میں تھے مگر بے تابی شوق نے اس وقت چھپنے نہ دیا۔ دور ہی دور سے سلام ہوئے۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا۔ مسکرائے اور اشاروں ہی اشاروں میں خدائے تعالیٰ کے وہ وعدے

یاد دلائے جو سچے سرکاری خیر خواہوں کے لئے اور امتحانی مصیبتوں پر صبر و استقلال ظاہر کرنے والوں کیلئے انجام کار ودیعت رکھے گئے ہیں۔" (صفحہ ۸۴)

آگے مولانا عاشق الٰہی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

مظفر نگر کے جیل خانے میں حضرت کو کم وبیش چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس اثنا میں آپ کی استقامت، جوانمردی، استقلال پختگی، توکل، رضا، تدین راقنا، شجاعت، ہمت اور سب پر طرہ حق تعالیٰ کی اطاعت ومحبت جو آپ کی رگ رگ میں سرایت کیے ہوئے تھی اس درجہ حیرت انگیز ثابت ہوئیں کہ جن کی نظیر نہیں نظر آتی۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک ساری حراست کے زمانے میں آپ کی نماز ایک وقت کی قضا نہیں ہوئی۔ جیل خانے میں آپ کو صاف ستھرا پانی مسلمان کے ہاتھوں وضو کے لئے برابر ملتا رہا۔ حوالات کے دوسرے قیدی اور مظلوم وستم رسیدہ محبوسین کا گروہ آپ کا معتقد ہوگیا اور ان میں بہتیرے وہیں آپ سے بیعت ہوئے۔ آپ جس کی کوٹھڑی میں بھی نماز با جماعت ادا کرتے اور ہر وقت اطمینان کے ساتھ ترقی درجات میں مشغول رہتے تھے۔ ارشاد ظاہری وباطنی کے افاضہ سے آپ کو کسی دن غفلت نہ ہوئی۔ وعظ اور پند ونصیحت کے ساتھ قرآن شریف کا ترجمہ لوگوں کو سناتے اور ایک وحدہ لاشریک خدا کی جانب رفقا کو بلایا کرتے تھے کبھی ذکر میں مصروف ہوتے کبھی شغل میں، کسی وقت صبر کی تعلیم دیتے اور کسی وقت شکر کی، کبھی علم کا مذاق غالب ہوتا اور کبھی طریقت وسلوک کا جس وقت حاکم کے حکم سے عدالت میں بلائے جاتے تو ظاہر ہو کر بے تکلف گفتگو کرتے اور جو وہ دریافت کرتا بے تکلف اس کا جواب دیتے تھے آپ نے کبھی کوئی کلمہ دبا کر یا زبان کو موڑ کر نہیں کہا۔ کسی وقت جان بچانے کیلئے تقیہ نہیں کیا۔ جو بات کہی سچ کہی اور جس بات کا جواب دیا خدا کو حاظر ناظر سمجھ کر بالکل واقع کے مطابق اور حقیقت حال کے موافق کبھی آپ سے سوال ہوا کہ:

سوال: رشید احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا آپ جواب دیتے۔

جواب: ہمارا کام فساد کا نہیں نہ ہم مفسدوں کے ساتھی۔ (یعنی فساد کہاں جہاد کیا تھا

مفسدوں کے ساتھ نہیں مجاہدین کے ساتھ تھے) کبھی دریافت ہوتا کہ:

سوال: تم نے سرکار کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے؟

جواب: آپ اپنی تسبیح کی طرف اشارہ کر کے فرماتے کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے کبھی حاکم دھمکاتا کہ ہم تم کو پوری سزا دیں گے۔ آپ فرماتے کیا مضائقہ ہے۔ مگر تحقیق کر کے۔ ایک مرتبہ حاکم نے پوچھا:

سوال: تمہارا پیشہ کیا ہے؟

جواب: کچھ بھی نہیں مگر زمینداری۔

غرض حاکم نے ہر چند تحقیق کیا اور تجسس و تفتیش میں پوری کوشش صرف کر دی مگر کچھ ثابت نہ ہوا۔ اور ہر بات کا معقول جواب پایا۔ آخر بری کئے گئے۔ اور فیصلہ سنا دیا گیا کہ:

”رشید احمد بری کر دئے گئے۔“

اور اپنے قاضی الحاجات حلال المشکلات پروردگار کا شکریہ ادا کرتے گنگوہ پہنچے۔

صد شکر خزاں خورد و چمن ہوگیا شاداب
آنکھوں کی گئی روشنی دوبارہ پلٹ آئی
سوکھے ہوئے دریا میں تموج نظر آیا
رحمت کی گھٹا برسر گنگوہ سمٹ آئی

(تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۸۴ تا ۸۶)

اس رہائی کے بعد گنگوہ آ کر حضرت گنگوہی نے درس و تدریس علوم دینیہ اور روحانی فیوض میں ساری عمر گذار دی۔ آپ ۶ ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ (مطابق ۱۸۲۹ء) کو بروز دوشنبہ (پیر) بوقت چاشت پیدا ہوئے تھے اور باختلاف رویت ہلال ۸ یا ۹ جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ (مطابق ۱۱/ اگست ۱۹۰۸ء) کو بروز جمعہ ساڑھے بارہ بجے وفات ہوئی۔ رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے بعد ان اکابر پر کیا گذری ان کے حالات سے فارغ ہو کر ہم اپنے مرکز تصنیف حضرت قاسم العلومؒ کی طرف چلتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا جہاد حریت میں حصہ

ہم نے جہاد حریت کے اس عنوان کے ماتحت جس قدر تفصیل سے کلام کیا ہے اس کے ڈانڈے دراصل ہم حضرت مجاہد اسلام مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے ملانا چاہتے ہیں۔ آپ نے گذشتہ اوراق میں پڑھا ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں ایک نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔ وہ میرٹھ چھاؤنی کے فوجیوں کی دہلی کی طرف یلغار کے وقت سے ہی چوکنے ہو گئے تھے ان کی خواہش ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی سے یہ تھی کہ انگریز کی حکومت کا کسی طرح خاتمہ ہو اور مسلمانوں کی حکومت پھر برسر اقتدار آ جائے۔ وہ دہلی شہر میں تقریباً ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۲ء تک بسلسلہ تعلیم و مشاغل مطبع احمدی مقیم رہے جہاں بہادر شاہ ظفر سلطنت مغلیہ کے آخری برائے نام تاجدار کی شخصیت غیور مسلمانوں اور ناموس اسلام کے پاسبانوں کو غیرت دلانے کا سامان بہم پہنچا رہی تھی۔ قاسم العلومؒ نے دہلی میں انگریزوں کو بہادر شاہ ظفر اور مسلمانوں کے سینوں پر مونگ دلتے دیکھا تھا۔ انہوں نے دیدہ عبرت بیں سے وہ اشارے بھی دیکھے تھے جو انگریزوں کی آنکھیں اپنے اقتدار کی شراب میں چور اور مخمور ہو کر لال قلعہ کی طرف کرتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ یہ قلعہ کبھی شاہجہاں نے ہمارے لئے بنایا تھا۔ دہلی کی شاہی جامع مسجد کے میناروں کو مولانا نے آسمان سے سرگوشیاں کرتے سنا تھا کہ وہ سلاطین مغلیہ کہاں گئے جن کے اقتدار کے سائے میں ہم آزادانہ اذانیں بلند کرتے تھے۔ انہوں نے جمنا کی موجوں کو لال قلعہ سے سر ٹکراتے ہوئے دیکھا تھا کہ قلعہ معلّی کے معمار کہاں گئے جو اس کے جھروکوں سے جمنا کے مناظر دیکھا کرتے تھے۔ انہوں نے مجبور و مقہور بہادر شاہ کو دیکھا تھا جس کے آباء و

اجداد کے ملک میں اسے صرف اتنا وظیفہ ملتا تھا جو اس کے گذران کیلئے بھی کافی نہ تھا۔

اب جب مئی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو وہ نانوتے میں مضطربانہ کروٹیں بدل رہے تھے۔ باہم اکابر کی ملاقاتیں ہوا ہی کرتی تھیں جہاد کا فتوئ دہلی سے صادر ہو ہی چکا تھا۔ ادھر مولانا محمد طیب صاحب کے جہادی مقالے سے معلوم ہی ہو چکا ہے کہ حضرت قاسم العلوم نے نواب شبر علی صاحب رئیس مرادآباد مصاحب بہادر شاہ ظفر کی معرفت شاہ دہلی کو دہلی آزاد کرانے اور جہاد کرنے پر آمادہ کرنے کی سلسلہ جنبانی کر رکھی تھی۔ مولانا محمد طیب صاحب اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دلی کو ان (انگریزوں) سے پاک کرنے کی سعی کریں اور ہم تھانہ بھون اور شاملی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اصول پر دو طرف سے یہ حملہ اور دفاع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے۔'' (مقالہ صفحہ ۴)

لیکن اس خبر میں صحت کا عنصر غالب نظر نہیں آتا۔ دہلی تو اس وقت آزاد ہو چکی تھی کیونکہ فوجی جب میرٹھ سے یلغار کرتے ہوئے پہنچے ہیں تو انہوں نے شاہ دہلی کو قلعے سے باہر نکال کر کھڑا کیا اور ان کو از سر نو بادشاہت کا اعلان کرنے کیلئے کہا گیا اور انہوں نے اعلان کر دیا اور بعد ازاں اور بھی بہت سے مجاہدین ان کے ساتھ مل گئے اور دہلی کو آزاد کرا لیا گیا تھا ہاں بات یہ ہو گی کہ دہلی سے شاملی، مظفر نگر اور سہارنپور تک کا علاقہ خالی کرا لیا جائے۔ ابھی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ انہی سرگرمیوں میں مشغول تھے کہ جہاد کے شعلے مظفر نگر، بڈھانہ وغیرہ تک پہنچ گئے۔

قاضی عبدالرحیم کا حادثہ:

اسی اثنا میں قاضی عبدالرحیم کا حادثہ سہارنپور میں پیش آ گیا جس نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ حضرت قاسم العلومؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مجلس مشاورت میں جہاد پر آمادہ کرنے کا عملی جوش پیدا کیا۔ جبکہ ان کے برعکس مولانا شیخ محمد محدث جہاد کے خلاف تھے۔

جہاد پر آمادہ کرنا قاسم العلومؒ کا کارنامہ تھا:

حالات کی تحقیق اور گذشتہ واقعات پر نظر رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کے محرک صرف حضرت قاسم العلوم تھے۔ انہوں نے جہاد کا امیر بنانے کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا نام پیش کیا اور جب مولانا شیخ محمد محدث نے اسلحہ کے پاس نہ ہونے اور جہاد کی شرط اولیں امیر جہاد نہ ہونے کا عذر پیش کیا تو حضرت قاسم العلوم ہی تھے جنہوں نے امیر جہاد کی تجویز پیش کی اور حضرت حاجی صاحب کو امیر جہاد بنا دیا گیا۔ رہا اسلحہ کا فقدان تو آپ نے فرمایا کہ کیا ہمارے پاس اتنا بھی اسلحہ نہیں کہ جتنا جنگِ بدر میں صحابہ کے پاس تھا؟

جہاں ان مراحل کو حضرت قاسم العلوم نے طے کر دیا وہاں حضرت حافظ محمد ضامن صاحب کو آمادہ جہاد کرنے کا کارنامہ بھی حضرت قاسم العلوم کے دفترِ عمل میں لکھا گیا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حافظ صاحب نے فرمایا کہ مولانا میں اب سمجھ گیا اور پھر حافظ صاحب کو آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح بپھرے ہوئے شیر کی طرح جہاد میں شامل ہو کر شہید ہوئے۔ یہ صحیح کہ حافظ صاحب شہید ہوئے اور حضرت قاسم العلوم غازی بنے مگر حافظ صاحب کو شہادت کی ڈگری دلانے میں غازی اسلام قاسم العلوم ہی کا کام تھا۔

قاسم العلوم فطری مجاہد تھے:

دراصل قاسم العلوم جہاد و قتال کی فطری طبیعت لے کر آئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ بچپن سے بے خوف، نڈر اور جری تھے۔ نانوتے کے مکان میں جو دور تک دروازے سے گذر کر اندر پہنچتا تھا۔ مولانا بچپن میں بے باکی سے اس راستے میں سے گذرتے تھے جبکہ آپ کے اور چچازاد بھائی رات کو ادھر سے اندھیرے میں گذرتے ڈرتے تھے۔

پھر آپ نے دہلی کے مولانا مملوک علی صاحب کے مکان میں مولانا کو ہو کے عالم میں تنہا رہتے دیکھا ہے کہ رات کو کواڑ اتار کر اندر داخل ہوتے اور اسی طرح کواڑ چڑھا کر باہر جاتے، جس کا نشان مولانا محمد یعقوب صاحب نے سوانح میں دیا ہے۔

ایامِ فتنہ میں بے خوفی:

آپ نے یہ بھی سوانح قاسمی میں مولانا محمد یعقوب صاحب کی قلمی وزبانی پڑھ لیا ہے کہ جب وہ رڑکی کی میں تھے تو انہوں نے حضرت قاسم العلوم کو ملنے کیلئے بلایا تھا۔ وہ رڑکی پیدل گئے اور ملے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''اسی عرصے میں غدر ہوگیا۔ بعد رمضان احقر کو سہارنپور لینے کو تشریف لائے چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے۔ اس وقت راہ چلنا بدون ہتھیار اور سامان کے دشوار تھا۔ جب احقر وطن پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی۔

نشانہ بازی:

> اسی زمانے میں ہمارے بھائی ہم عمر اکثر بندوق اور گولی لگانے میں مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دن آپ مسجد میں سے آئے کہ ہم گولیاں لگا رہے تھے اور نشانے کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا۔ قریب سے بندوق لگاتے تھے، گولیاں مٹی کی تھیں۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں مجھے بھی دکھلاؤ۔ کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانے کا ذکر کیا تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی صاف گولی نشانہ پر لگی اور وہ سب مشاق کتنی دیر سے لگا رہے تھے۔ دائرے میں لگ جانے کو نشانے پر پہنچا جانتے تھے اور یہ بات اتفاقی نہ تھی اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادھ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ تھی نہ ہوئی۔ تیر اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ اس طوفان بدتمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے، ہم نے کبھی مولانا کو گھبراتے نہیں دیکھا، خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے۔ چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلے کی آگئی۔ اللہ رے مولوی صاحب نے ایسے ثابت قدم تلوار ہاتھ میں اور

بندوقچیوں کا مقابلہ۔" (سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب صاحب صفحہ ۱۷، ۱۸)

اس عبارت سے حضرت قاسم العلوم کی بے خوفی، جرأت، حوصلہ، ہمت اور استقلال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قدرت سے مجاہدانہ فطرت لے کر آئے تھے۔ وہ سفر کے لئے سواری پر نگاہ نہ رکھتے میلوں اور کوسوں پیدل چلتے۔ اس طرح وہ قدرت سے مشقت طلب جسم اور نڈر دل لے کر آئے تھے۔

تھانہ بھون میں مجلس مشاورت میں جہاد کا مشورہ دے کر سب کو آمادہ کر کے وہ والد اور والدہ سے جہاد کی اجازت لے کر واپس آئے اور اب ان کے سامنے شہادت کا جام نوش کرنا تھا یا غازی کہلانا۔ تھانہ بھون پہنچ کر انہوں نے شیر علی کے باغ کے مقام پر انگریزی اسلحہ پر چھاپہ مارنے میں زبردست کردار ادا کیا۔ جو شخص جہاد کا محکم فیصلہ کر کے اور کرا کے اٹھا ہو وہ شیر علی کے باغ میں چھاپہ مار دستے میں شریک کیوں نہ ہوتا۔ ضرور ہوا اور دوسروں کے ساتھ کامیاب ہوا۔

جہاد شاملی میں حضرت قاسم العلوم کی سرگرمیاں:

باغ شیر علی نزد تھانہ بھون کے چھاپے کے بعد حضرت قاسم العلوم شاملی پر جہاد کرنے والوں کی فہرست میں آگے آگے تھے۔ وہ میدان جہاد میں بے خوف گھس جانے والوں میں سے تھے۔ باغ شیر علی کے چھاپے میں رفقائے جہادیوں کو ان کی اس بے دھڑک پیشقدمیوں کا اندازہ ہو چکا تھا۔ یہ ساری رپورٹ امیر جہاد حاجی امداد اللہ صاحب کو پہنچ چکی تھی کہ مولانا محمد قاسم صاحب نہایت بے جگری کے ساتھ جان کی پروا نہ کرتے ہوئے بے خودی کے انداز میں جہاد کی صفوں میں گھس جاتے ہیں لہٰذا اس بات کا انتظام کرنا چاہیئے۔

حضرت قاسم العلوم پر مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی بحیثیت نگران اور معاون جہاد:

مجاہدین کا لشکر جب شاملی کو روانہ ہوا تو حاجی صاحب نے مولانا منیر صاحب کو جن

کے حالات ہم ابتدائے کتاب میں لکھ چکے ہیں ہدایت کی تھی کہ مولانا محمد قاسم صاحب کے ساتھ ساتھ رہیں اور خطرات میں ان کی پوری نگہداشت رکھیں مولانا محمد طیب صاحب ''جہادی مقالہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا محمد منیر سے سنی ہوئی یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان (مولانا محمد منیر صاحبؒ) کو مخاطب کر کے حاجی صاحب نے مجاہدوں کو رخصت کرتے ہوئے وصیت کی تھی کہ ''مولانا (محمد قاسم صاحب) بالکل آزاد اور جری ہیں۔ ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں اس لئے کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ (ان کو یہ ذمہ داری اس لئے سپرد کی گئی کہ) شدتِ محبت سے ان (مولانا محمد منیر صاحب) کو بھی بغیر مولانا محمد قاسم صاحب کے قرار نہ آتا تھا۔'' (جہادی مقالہ صفحہ ۶)

اسی وصیت سے پتہ چلتا ہے کہ باغ شیر علی سے انگریزوں کی فوج کا وہ دستہ جو اسلحہ لئے جا رہا تھا حضرت مولانا نے اس پر حملے میں اپنی جان کی پروا نہ کر کے حملہ کیا تھا جس کی رپورٹ امیر جہاد حاجی صاحب کو پہنچی تھی۔ مولانا محمد منیر صاحب نے مولانا محمد میاں مرحوم کو بتایا۔ اور انہوں نے مولانا محمد طیب صاحب کو کہ:

> ''میں پس پشت بطور محافظ اس طرح رہتا تھا کہ حضرت (مولانا محمد قاسم صاحب) کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ ان کی محافظت اور نگرانی کر رہے ہیں۔ (مولانا محمد منیر نے فرمایا کہ) اس ہنگامہ محشر خیز میں حضرت (نانوتوی) میدان جنگ کے ایک کنارے پر دم لینے کے لئے کھڑے تھے کہ (انگریزی فوج) کا ایک سپاہی جو صورتاً سکھ (معلوم ہوتا) تھا اور ڈیل ڈول میں اتنا طویل و عریض تھا کہ حضرت (نانوتوی کے جثے کے آدمی اس جیسے تن و توش رکھنے والے سے چار بن سکتے تھے۔ (انگریزی فوج کے اس سپاہی نے حضرت نانوتوی کو میدان کے کنارے کھڑا پا کر) دور سے تاکا اور غصے میں لپک کر اس طرف آیا۔ حضرت (نانوتوی) کو ڈانٹا اور کہا کہ تم نے بہت سر ابھارا ہے۔ اب آ میری ضرب کا جواب دے۔ یہ تیغہ (تلوار جو اس کے ہاتھ میں تھی اٹھا کر کہا یہ) تیرے لئے موت کا پیغام ہے۔ دو دھارا تیغہ پوری قوت سے اٹھا کر حضرت (نانوتوی) پر چلانا ہی چاہتا تھا

(کہ حضرت نانوتوی نے فرمایا) باتیں کیا بنا رہا ہے اپنے پیچھے کی تو خبر لے۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو (حضرت نانوتوی) نے جینو کا ہاتھ اس کے داہنے کندھے پر مارا۔ وار اتنی قوت سے کیا گیا تھا کہ تلوار دائیں مونڈھے کو کاٹ کر گذرتی ہوئی بائیں پیر پر آ کر رکی۔ سر سے پیر تک دو پارہ ہو کر آدھا ادھر اور آدھا ادھر گرا ہوا تھا۔ اسی بے جان لاشے پر پاؤں رکھتے ہوئے پھر صف قتال میں آ گئے۔" (حوالہ مذکورہ)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے گولی کا لگنا اور محفوظ رہنا:

آپ نے گذشتہ اوراق میں یہ بھی پڑھ لیا ہے کہ حضرت قاسم العلوم چھپر یا اٹھا کر تحصیل کے دروازے تک لائے اور اسی کی آڑ میں گولیوں سے محفوظ ہو کر دروازے پر اسے آگ لگا دی اور اس طرح مجاہدین کو اندر داخل ہو کر دو بدو انگریزی فوجیوں کو قتل کرنے کا موقع ملا۔ اسی شاملی کے جہاد میں جہاں حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے گولی لگی اور وہ شہید ہوئے لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی کنپٹی پر بھی گولی لگی لیکن اللہ تعالیٰ نے صاف بچا لیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

کرامتِ قاسمی:

"ایک بار گولی چل رہی تھی یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا گولی لگی ایک بھائی دوڑے پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا کہ سر میں گولی لگی۔ عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔" (صفحہ ۱۸)

دوسرا حادثہ:

"انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بندوق ماری جس کے سینکھے سے ایک موچھ اور کچھ ڈاڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سلمھ بھی بس تھا۔"

اسی جہاد شاملی کے واقعات کی جیتی جاگتی اور زندہ دو تصویریں ہیں جن کا اظہار

حضرت عارف باللہ نے اپنی ان دونوں متصل عبارتوں میں کیا ہے۔ کس قدر یقینی اور تاریخی ہیں۔ یہ دونوں تحریری دستاویزیں جن سے شاملی میں شرکت کرنے، گولی کھانے اور کرامت سے جان بچنے کا ثبوت ملتا ہے دوسرا واقعہ بھی اسی جہاد کا ہے جس کو علیحدہ کر کے عبارت میں صاف طور پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بیان کیا ہے جس میں بندوق مارنے اور اس کے سنبھے سے ایک موچھ اور کچھ ڈاڑھی جل جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں بھی سنبھ کے ذریعہ جان جانا یقینی تھا۔ مگر قدرت نے بچالیا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب آگے چل کر شاملی کے جہاد میں شرکت کی یقین دہانی کو کس طرح اشارے میں صاف بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''اس زخم کی (جو گولی اور سنبھے سے ہوا تھا) اجمالی خبر بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۱۸)

اس عبارت سے شاملی کے جہاد کے علاوہ تھانہ بھون میں بھی جہاد کی شرکت کا پتہ چلتا ہے جب کہ انگریزوں نے تھانہ بھون پر مسلسل حملے کئے ہیں۔ انہی دنوں کا جو ذکر مولانا محمد یعقوب صاحب نے کیا ہے کہ ''کسی نے منہ در منہ بندوق ماری'' شرح صدر یہ ہوا ہے کہ شاملی کے بعد یہ واقعہ تھانہ بھون کا معلوم ہوتا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب ''تذکرۃ الرشید'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ کہ حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہیؒ) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلومؒ اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار (حاجی صاحب) کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پر جما کر ڈٹ گیا اور سرکار (حاجی امداداللہ صاحب) پر جان نثار کے لئے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے۔ وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لئے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں

اور حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔"

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے گولی لگی:

> "حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کیا ہوا میاں؟ عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا۔ کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر۔"

(تذکرہ جلد اول صفحہ ۷۴، ۷۵)

کتنی صاف باتیں کہہ گئے مولانا عاشق الٰہی صاحب جن سے معلوم ہوا کہ جہاد شاملی میں حاجی صاحب بھی شامل تھے۔ گو تین دن نہ سہی۔ لیکن جب حضرت قاسم العلوم کے گولی لگی ہے تو حاجی صاحب موجود تھے اور ان کی کرامت سے مولانا پر گولی کا اثر نہ ہوا گو خون میں کپڑے تر ہو گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ گولی دماغ میں سے پار ہو کر نکل گئی اور یہ کہ جہاد میں مولانا پگڑی باندھے ہوئے تھے۔

مولانا گیلانی سے یہاں زبردست تسامح ہوا ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت سے مولانا گنگوہی مراد لئے ہیں (سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۱۶۰) جو یقیناً نہیں ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی مولانا گنگوہی کو امام ربانی اور حاجی صاحب کو اعلیٰ حضرت لکھتے ہیں جیسا کہ اوپر کی عبارت سے واضح ہے۔ پھر مولانا عاشق الٰہی صاحب کی عبارت سے ان حضرات کی بہادری، پامردی اور استقلال کا پتہ چلتا ہے کہ جم غفیر سے مقابلہ تھا اور منظر سخت ہولناک تھا۔ غرض یہ ہے کہ مولانا نے مجاہد بن کر بڑا اونچا مقام حاصل کیا۔ بقول اقبال مرحوم ؎

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

جہاد کے بعد روپوشی:

جہاد ختم ہونے کے بعد جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ حاجی صاحب، مولانا گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب تینوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ مولانا عاشق الٰہی لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند اور امام ربانی قدس سرہ نے (جہاد کے بعد) گنگوہ مراجعت فرمائی۔ انہی ایام روپوشی میں مولانا قاسم العلوم کو املیا، کمتھلہ، لاڈوہ اور پنجلاسہ (ضلع انبالہ) اور جمنا پار کئی دفعہ آنے جانے کا اتفاق ہوا۔''

(تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۷۷)

حاجی صاحب سے ملاقاتیں:

انبالہ اور سہارنپور کے علاقے آپس میں ملتے ہیں۔ حاجی صاحب حجاز کو روانہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے وہ جن جن مواضع سے گذرے اور رہے۔ ان مواضع میں مولانا محمد قاسم صاحب ان سے ملاقات کو جاتے رہے۔ اسی لئے جمنا پار جو سہارنپور اور انبالہ کے درمیان بہتی ہے کئی دفعہ پار کر کے جاتے رہے۔ اس لئے حضرت قاسم العلوم املیا، کمتھلہ، لاڈوہ اور پنجلاسہ جاتے رہے اور دیوبند اور نانوتہ بھی پہنچتے اور قیام کرتے۔ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

دیوبند میں مولانا محمد قاسم صاحب کی تلاش:

> ''(تھانہ بھون کے جہاد میں) زخم کی خبر اجمالی بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے، اس لئے حاجت روپوشی کی ہوئی۔ حضرت حاجی صاحب بھی ایسے ہی باعث روپوش ہو گئے تھے۔ ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے۔ زنانہ مکان کے کھوٹے پر۔ مردوں میں سے کوئی تھا نہیں۔ زینے پر آ کر فرمایا پردہ کر لو میں باہر جاتا ہوں۔ عورتوں سے رک نہ سکے باہر چلے گئے۔ بعض مرد بازار میں تھے ان کو اطلاع کی۔ وہ اتنے میں مکان پر پہنچے۔ دوڑ سرکاری آدمیوں کی پہنچ گئی تھی۔

انہوں نے آ کر تلاشی لی (مگر مولانا نکل چکے تھے) اس لئے خانہ تلاشی سے کچھ نہ ملا۔ اس کے بعد مسجد چھتہ میں رہتے۔" (سوانح قاسمی صفحہ ۱۸، ۱۹)

معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری پولیس ان کے تعاقب میں برابر رہی۔ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

"اسی طرح اللہ تعالیٰ نے چند بار بچایا۔ اس زمانے کی کیفیات عجیب و غریب گذری ہیں۔ لکھنا ان کا طول ہے۔ اسی وقت میں دیوبند اور املیا وغیرہ مختلف جائے پر متفرق واقعات میں رہے۔ بوڑیہ، گھتلہ، لاڈوہ، پنجلاسہ، جمنا پار کئی دفعہ آئے گئے۔" (صفحہ ۱۹)

پولیس کے سوال کا منطقی مگر صحیح جواب:

مولانا عاشق الٰہی صاحب دیوبند کی روپوشی دوڑ کی آمد اور مولانا کے منطقی جواب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں روپوش تھے۔ ایک روز زنانہ مکان کے کوٹھے پر تھے مردوں میں سے کوئی تھا نہیں۔ زینے میں آ کر فرمایا۔ پردہ کرلو۔ میں باہر جاتا ہوں۔ عورتوں سے رک نہ سکے۔ باہر چلے گئے۔ جا رہے تھے کہ دوش راستے میں ملی۔ آپ ہی کی گرفتاری میں تھی۔ خدا کی شان ہے کہ ایک شخص نے آپ ہی سے پوچھا کہ مولوی محمد قاسم کہاں ہیں؟ آپ نے ایک قدم آگے بڑھا کر پچھلے پاؤں کی جانب نظر ڈالی اور فرمایا ابھی تو یہاں تھا۔ یہ فرما کر آپ آگے چلے گئے اور دوش نے مکان پر جا کر تلاشی لی۔ آخر ناکام واپس ہوئے، حق تعالیٰ کی حفاظت بر سر تھی۔ اس لئے کوئی آنچ نہ آئی، اس ضمن میں کرامات و خوارق عادات، غیبی حفاظت کے سامان ظاہر ہوئے۔ اس قصے کے بعد مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) (چھتے کی اور دوسری) مسجد میں رہتے اور کوئی قسم کا تعرض نہ کرتا تھا۔" (تذکرہ جلد اول صفحہ ۷۹)

یہ جگہ فوٹو کیلئے تھی جو حذف کر دیا گیا ہے

روپوشی میں پابندیِ سنت:

چونکہ حضرت نانوتوی کے چہرے پر نشان جہاد یعنی زخم تھا۔ اس لئے خدام نے آپ کو روپوشی کا مشورہ دیا تھا۔ ورنہ آپ اس سلسلے میں بے پرواتھے۔ مولانا محمد طیب صاحب جہادی مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”متوسلین اور خدام نے عرض کیا کہ احتیاط خلاف توکل نہیں۔ حضرت روپوش ہوجائیں، اپنی سسرال کے عالیشان مکان (دیوان) میں روپوش ہوئے، تین دن پورے ہوتے ہی اک دم پھر باہر نکل آئے اور کھلے بندوں پھرنے چلنے لگے۔ لوگوں نے پھر نسبت روپوشی کے لئے عرض کیا (تو فرمایا) تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین دن ہی روپوش رہے۔“ (جہادی مقالہ)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ حکومت کی پولیس کئی مرتبہ آپ سے دوچار ہوئی۔ لیکن ہر دفعہ آپ بچ گئے۔ جب آپ اپنی سسرال کے گھر سے باہر نکلے تھے تو اس میں خیریت ہی ہوگئی۔ اگر مکان سے باہر نہ نکلتے تو مکان کی تلاشی کے وقت گرفتار ہوجاتے۔ اسی طرح چھتے کی مسجد میں جہاں سسرال کے مکان کی تلاشی کے بعد اکثر رہتے۔ حکومت کی دوڑ پہنچ گئی۔ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

تصویر حذف کردی گئی

"مخبر نے خبر کی کہ حضرت (نانوتویؒ) چھتے کی مسجد میں ہیں۔ دوش آئی مسجد کا محاصرہ کرلیا کپتان پولیس مسجد میں آیا۔ حضرت ٹہل رہے تھے۔ کپتان نے خود حضرت سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسمؒ کہاں ہیں؟ ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی یہیں تھے دیکھ لیجئے۔ کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا۔ حضرت (نانوتویؒ) نہایت اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے اور پولیس کے گھیرے میں سے گذرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمز الدین کی طرف روانہ ہوگئے کپتان مسجد سے باہر نکلا اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا کہ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں جو جارہے ہیں۔ پولیس ادھر چلی اور مسجد شاہ رمز الدین کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت وہاں سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں سے گذرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے۔ غرض پولیس کا چکر اور حضرت کا یہ دور عرصے تک جاری رہا۔ مگر بحفاظت الٰہی پولیس حضرت پر قابو نہ پاسکی۔" (جہادی مقالہ صفحہ ۱۰)

یہ حفاظت ربانی نہیں تو اور کیا ہے۔ سرکار عالم ﷺ ہجرت کی رات کفار کے سامنے سے ہی ان کے منہ پر غبار ڈالتے ہوئے اور پڑھتے ہوئے نکل گئے تھے۔ یہی حال کرامت کے طور پر آپ کے ایک عالم اور ولی امتی کا ہوا۔

موضع چکوالی میں قیام:

ان حالات میں جیسا کہ آپ کے ساتھ گذر رہے تھے۔ آپ کے نسبتی بھائی شیخ نہال احمد نے اپنے گاؤں چکوالی میں قیام پر مجبور کیا۔ یہ گاؤں نانوتہ اور دیوبند کی درمیانی سڑک پر واقع ہے۔ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

"مخبر نے اس قیام کی گورنمنٹ میں اطلاع کردی۔ دوش چکوال پہنچ گئی۔ پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا۔ شیخ نہال احمد کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ سخت خائف اور ہراساں

ہوئے۔ مولانا نانوتوی کی گرفتاری میرے گاؤں میں ہو جس میں میں ہی خود حضرت کو باصرار لے کر آیا ہوں۔ (شیخ صاحب کی پریشانی حالی دیکھ کر دلاتسلی میں ان سے فرمایا) اس طرح خوف زدہ صورت بنا کر تو آپ مجھے پکڑوا کر رہیں گے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں اپنا بچاؤ خود کرلوں گا۔ حضرت (نانوتوی) باہر نکل آئے۔ (اور کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے بغیر کپتان کو مخاطب ہو کر فرمایا) آیئے آیئے تشریف لایئے۔ (اس عرصے میں حضرت نانوتوی نے چائے بنوائی، پلائی گئی۔ کپتان ذرا مانوس ہوا اور پوچھنے لگا) آپ مولانا محمد قاسم صاحب سے واقف ہیں؟ ’’جی ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں‘‘ (اپنی زبان سے اپنے مناسب وقت حالات بیان فرماتے رہے کہ کپتان بولا) ہم زنانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں (فرمایا) ’’شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں‘‘ کونہ کونہ چھان مارا (مگر وہ جو پاس تھے انہیں کون پاتا) حضرت (نانوتوی) کپتان کے ساتھ ساتھ تلاشی دلانے میں مصروف تھے (مگر جب ناکامی ہوئی تو کپتان چکوالی سے رخصت ہوا) حضرت بھی اس سے رخصت ہو کر نانوتہ روانہ ہو گئے۔

کپتان نے (مخبر کو) بہت ڈانٹا کہ تو غلط خبریں دیا کرتا ہے (اس نے جواب دیا) آپ نے غور نہیں کیا کہیں مولانا وہی صاحب تو نہ تھے جنہوں نے تلاشی دلوائی۔ کپتان نے وارنٹ جیب سے نکال کر حلیہ پڑھا تو حضرت نانوتوی کے چہرے مہرے پر منطبق پایا۔ (کپتان نانوتے روانہ ہوا۔ ادھر حضرت نانوتوی کو خبر کر دی گئی۔ کپتان نانوتہ پہنچا اور مولانا) دوسرے راستے سے دیوبند پہنچ گئے۔ غرض پولیس کو چکر میں رکھا اور گرفتار نہ ہوئے۔‘‘ (جہادی مقالہ از مولانا محمد طیب صاحب)

عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

’’آپ نے اس خطرناک دور میں بھی ایک جگہ قیام کر کے بیٹھ رہنا گوارا نہ کیا اور جماعتی تنظیم کیلئے مختلف علاقوں میں پاپیادہ میلوں سفر کرتے رہے۔ اپنے مرشد طریقت و امیر جہاد سے ہدایات حاصل کرنے گنگوہ، انبیٹھہ، لبڈیہ، گمتھلہ، تگری اور پنجلاسہ وغیرہ مواضعات میں پیدل ساری رات سفر کر کے پہنچتے رہے۔ اور ان کے مکہ معظمہ ہجرت

> کرنے کے بعد ۱۸۵۹ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ہندو پاک کے مجاہدین اور انقلاب پرست جماعتوں کے حق میں معافی کا اعلان ہو چکا تھا۔ لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی گرفتاری کیلئے پولیس کی خفیہ تگ و دو جاری رہی۔ دراصل یہ اعلان بھی ایک چال تھی اور اس بہانے سے عیار و حکام محبان وطن کے کھلم کھلا سامنے آنے کے منتظر تھے۔ چنانچہ اس کے بعد اکثر رہنما حضرت علامہ فضل حق اور دیگر حضرات کو گرفتار کر کے سخت سزائیں دی گئیں۔ اسی لئے حضرت مولانا کو مخلصین و معتقدین نے کوشش کر کے روپوش ہی رکھا۔ اور بالآخر دسمبر ۱۸۶۰ء میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحب کو مجبور کر کے سفر بیت اللہ اختیار کیا۔ اور ایک سال حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں رہ کر ان سب حضرات نے مسائل تنظیم کی تکمیل کی۔ اور ۱۸۶۱ء میں وطن واپس آ گئے۔" (کوہستان ۱۲ ستمبر ۱۹۶۴ء)

ایسٹ انڈیا کی جگہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت:

جس زمانے میں ۱۸۵۷ء کا جہاد حریت برپا ہوا اس وقت ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کی حکومت تھی۔ بعد ازاں پارلیمنٹ کی طرف سے ۲/ اگست ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے ماتحت ہندوستان براہ راست آ گیا۔ تین ماہ کے بعد لارڈ کیننگ نے ملکہ کی طرف سے ہندوستان میں یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو عام معافی کا حکم دیا۔ یہ معافی نامہ حسب ذیل شرطوں کے ساتھ تھا۔

۱۔ انگریزی رعایا کے قتل میں بذاتہ جو شریک ہوئے ان کو رحم کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔

۲۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو ان کو بھی معافی نہیں ہے۔

۳۔ جو لوگ باغیوں کے سردار تھے۔

۴۔ جنہوں نے بغاوت کی ترغیب دی ہو۔

> "مذکورہ بالا شرطوں کی گرفت میں جن مجاہدین کی سزا کا خدشہ تھا ان کے متعلق اعلان میں تھا۔ ان کے متعلق صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہو گی لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ لوگ اپنی اطاعت سے پھر

گئے کا مل غور کیا جائے گا۔" (سوانح قاسمی گیلانی جلد دوم صفحہ ۱۸۹)

اس لئے حضرت قاسم العلوم کا سامنے آنا ابھی مخدوش تھا لہٰذا مناسب یہ سمجھا گیا کہ حرمین شریفین کا سفر کیا جائے۔ چنانچہ جان کی حفاظت کی خاطر حضرت قاسم العلوم حاجی صاحب کی روانگی کے بعد خود بھی مکہ مکرمہ کو روانہ ہو گئے۔

قاسم العلوم کے والدین کی حالت:

حضرت قاسم العلوم کے والدین اسی وقت سے پریشان تھے جب سے آپ جہاد کی اجازت لے کر تھانہ بھون کو روانہ ہوئے تھے جو جہاد کا مرکز تھا۔ جہاد کے بعد آپ کے والد ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کسی کو میرے بیٹے کی بھی خبر ہے۔ جب سلامتی کا علم ہوا تو جان میں جان آئی۔ مگر کئی سال تک پریشانی کے عالم میں دن گذرے تا آنکہ حج سے واپس نہ آگئے۔ حضرت قاسم العلوم جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ مطابق دسمبر ۱۸۶۰ء میں حج کے ارادے سے تشریف لے گئے اور ایک سال کے بعد ۱۸۶۱ء میں واپس آئے۔ گویا ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۱ء تک پانچ سال مسلسل جہاد اور اس کے اثرات سے متاثر رہے۔

قدرت کی مختلف شانیں:

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس جہاد میں قدرت نے اپنے بزرگ اور نیک بندوں کے ساتھ مختلف معاملے کئے۔ حافظ صاحب اگرچہ ولی کامل تھے ان کو جام شہادت سے نوازا گیا۔ حاجی صاحبؒ جو اپنے زمانے کے اہل اللہ میں سے تھے ان کو حرمین شریفین کی طرف ہجرت کا حکم ہوا۔ امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو چھ ماہ جیل کی مشقت میں کندن بنایا گیا اور سنت یوسفی سے سرفراز فرما کر جیل والوں کی اصلاح فرمائی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو گرفتار ہی نہ ہونے دیا۔ یہ گرفتاری کیوں نہیں ہوئی اس کی اصلی حقیقت وہ ہے جو آپ نے خود اپنے فرزند مولانا حافظ محمد احمد صاحب سے بیان فرمائی اور انہوں نے اپنے فرزند مولانا محمد طیب صاحب سے کہ:

"میں اکثر دیکھتا ہوں کہ حضرت ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اپنی ردائے مبارک میں

> مجھے ڈھانپ کر کبھی اندر لاتے ہیں، کبھی باہر لے جاتے ہیں۔ سوتے اور جاگتے اکثر اوقات یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے کہ حضور ﷺ ردائے مبارک میں لئے رہتے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے۔" (ارواح ثلاثہ حصہ روایات الطیب صفحہ ۲۵۳)

مولانا محمد مظہر صاحبؒ اور مولانا محمد منیر صاحبؒ:

ان دونوں حضرات کے حالات کتاب کے آغاز میں بیان کئے جا چکے ہیں۔ دونوں حضرات حضرت قاسم العلوم کے خاندانی بھائی اور ایک دادا کی اولاد تھے۔ دونوں نے شاملی اور تھانہ بھون کے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ عشرت رحمانی لکھتے ہیں:

> "مولانا محمد منیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے خاص عقیدت و مودت رکھتے تھے ہر وقت ان کے ساتھ ہی رہتے۔ چنانچہ جب تھانہ بھون میں اعلان جہاد ہوا اور علمائے ملت سر بکف ہو کر میدان میں نکل آئے تو اسی تعلق خاطر کی بنا پر امیر المجاہدین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے مولانا محمد منیر کو اسی فوجی دستے میں شامل کیا جس کی قیادت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے سپرد تھی اور مولانا محمد منیرؒ ان کے دستِ راست بن کر جوہر شجاعت دکھاتے رہے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مزاج میں اس قدر جوش تھا کہ وہ عزم و احتیاط کو قطعاً کام نہ لائے (یعنی میدان جہاد میں) اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد منیر کو خاص طور پر ہدایت فرمائی تھی کہ ان کو کبھی تنہا نہ چھوڑنا اور اچھی طرح خبر گیری کرنا کیونکہ انہیں خود اپنی جان کا خیال نہیں رہتا مولانا محمد منیرؒ ہر مورچے پر جنگ کے دوران دوگونہ خدمات انجام دیتے۔ ایک طرف مورچہ سنبھالنا، مدمقابل دشمنوں سے لڑنا اور دوسری طرف مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی نگرانی کرنا اور موقع بے موقع اقدام سے روک ٹوک کرتے رہنا اس کے باوجود بھی مولانا محمد قاسم صاحبؒ لڑتے ہوئے جوش و خروش میں بے سدھ ہو کر اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے اور مولانا محمد منیر کو سینہ سپر ہو کر ان کی حفاظت کے لئے آگے بڑھ جاتے۔ شاملی کے مورچے پر ان دوہری خدمات کے سبب ایک بار مولانا محمد منیر بال بال بچے ورنہ دشمنوں کے نرغے میں بری طرح گھر گئے تھے لیکن وہ انتہائی

> جرأت و ہمت سے دست بدست مقابلہ کرتے مولانا محمد قاسم صاحب اور خود کو صاف بچا کر لے آئے۔ کئی بار زخمی بھی ہوئے مگر تحفظ دین و وطن کو جان سے زیادہ عزیز رکھ کر جنگ میں ڈٹے رہے۔ شاملی کی شکست کے ساتھ اپنے بڑے بھائی اور مولانا محمد قاسم صاحب کے ساتھ وہ بھی روپوش ہو گئے۔ آپ قصبہ نانوتے میں ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے۔" (کوہستان اخبار لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۴ء)

یہ ہیں ہمارے مولانا امام المجاہدین مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کو قدرت نے عالم باعمل، ولی، مجاہد فی سبیل اللہ بنا کر انسانیت اور ولایت، شریعت اور طریقت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔

کوئی ہمارے اسماعیل کو تو دیکھے:

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید، اپنے زمانے کے جہاں عالم ربانی تھے۔ وہاں بہت بڑے مجاہد بھی تھے۔ امیر شاہ خان صاحب سے روایت ہے کہ:

> "ایک دفعہ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب کی مجلس میں مولانا اسماعیل شہید کا تذکرہ ہو رہا تھا اور ان کے مناقب بیان کئے جا رہے تھے حضرت نے مولانا نانوتوی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "مولانا اسماعیل تو تھے ہی کوئی ہمارے اسماعیل کو بھی دیکھے۔"

(ارواح ثلاثہ حصہ امیر الروایات صفحہ ۳۵)

حاجی صاحب کا مقصد یہ تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کی ذات میں قدرت نے علم و عمل اور جہاد کا مادہ ایسا ودیعت کیا تھا جیسا کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید میں۔

دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ:

ان سب حقیقتوں سے سیر حاصل بحث کے بعد مختصر الفاظ میں اب ہم دہلی کے زوال اور انگریزوں کے دوبارہ اس پر قبضہ ہونے کے بعد متعلق صرف اتنا لکھتے ہیں کہ مجاہدین کا بہت سے علاقے اور بالخصوص دہلی پر قبضہ ہونے کے بعد ردعمل ہوا اور انگریزوں نے سکھوں، گورکھوں اور مختلف دشمنانِ اسلام کا غیر معمولی لشکر جمع کر کے تمام ہندوستان کو دوبارہ زیر نگیں

کرلیا اور دہلی پر ہولناک جنگ کے بعد ۱۴/ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دوبارہ قبضہ کرلیا۔ دہلی کے مسلمانوں پر کیا گذری بقول بہادر شاہ ظفر ؎

جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

ہزاروں شرفا کو دہلی میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ دہلی تباہ ہوگئی کوئی مسلمان اس میں باقی نہ رہا۔ بہادر شاہ کے بیٹوں کو ہڈسن نے گولی سے اڑا دیا اور ان کے سر کٹوا کر بہادر شاہ کے سامنے پیش کئے۔ بہادر شاہ ظفر جو خود ہمایوں کے مقبرے میں جا چھپے تھے گرفتار ہوئے اور انہیں اور ان کی بیگم زینت محل کو رنگون میں نظر بند کردیا گیا۔ جہاں وہ غم میں گھل گھل کر ۱۸٦۲ء میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ رہے سدا نام اللہ کا۔

قاسم العلومؒ اور فریضہ حج

حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کی ترتیب کس قدر پاک اور صاف، حسین اور خوبصورت ہے کہ اول علوم شرعیہ کی تکمیل کی۔ پھر علوم طریقت کے سمندر کے موتی چنے، روحانیت میں غوطہ لگایا اور پھر جہاد فی سبیل اللہ کی عزت وعظمت سے سرفراز ہوئے اور بعد ازاں حج بیت اللہ اور زیارت گنبد خضرا سے شرف اندوز ہوئے۔ کیا اچھی اور کس قدر بابرکت ہے یہ زندگی جو اس طرح ترتیب پائے۔ آپ نے تین دفعہ حج فرمایا۔ حیرت ہے کہ مشائخ دیوبند کے مصنف نے مولانا کے دو حج کا ذکر کیا ہے اور تیسرے حج کی تحقیقات ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

پہلا حج ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء:

پہلا حج ۹/ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۹/ جون ۱۸۶۱ء بروز بدھ براہ پنجاب، سندھ و کراچی۔

دوسرا حج ۱۲۸۶ھ:

دوسرا حج ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں براہ بمبئی ادا فرمایا۔

تیسرا حج ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء:

تیسرا حج ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں براہ بمبئی ادا فرمایا۔

۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کے بعد جب مجاہدین حکومت فرنگ کی قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشوں سے گذر رہے تھے اور جہاد شاملی کے مجاہدوں کی بھی تلاش ہو رہی تھی تو یہ سلسلہ کئی

سال تک برابر چلتا رہا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مکہ محترمہ کی طرف ہجرت کر ہی چکے تھے اس لئے حضرت قاسم العلوم نے بھی حج کا ارادہ فرمایا۔ عرصہ دراز کی روپوشی سے یہی بہتر سمجھا گیا کہ حج کے لئے مکہ محترمہ کو روانہ ہوا جائے کہ حرمین شریفین کی پناہ گاہ سے بہتر کوئی پناہ گاہ نہیں۔

پہلے حج کی تفصیلات روانگی ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹/نومبر ۱۸۶۰ء بروز جمعرات:

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت حاجی صاحب عرب کو روانہ ہوگئے۔ احقر کو بعد ان کے یہی سوجھی کہ تو بھی چل۔ مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) کی روپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی ورنہ انکو اپنی جان کا کچھ خیال نہ تھا۔ مولاناؒ نے بھی ارادہ کیا۔ اس روپوشی کی بلا کے سبب والدین نے بخوشی اجازت دے دی۔ احقر بے سامان تھا قلیل سا زادِ راہ بہم پہنچایا تھا۔ مگر مولوی (محمد قاسم) صاحب کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی۔ ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے۔ مگر بدولت توکل سب راہ بخیر و خوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہوگئے۔ کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے کراچی سے جہاز میں بیٹھے جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ (بارہ سو ستتر) میں روانہ ہوئے اور آخری ذیقعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۱۹)

سہو کتابت:

عارف باللہ نے حج کی روانگی کا مہینہ جمادی الثانی تحریر فرمایا جس میں سہو ہوا ہے ورنہ نانوتے سے دونوں حضرات کی روانگی ۱۵/ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو جمعرات کے روز ہوئی۔

بیاض یعقوبی یا روزنامچہ حج سفر خشکی:

قاسم العلومؒ کے پہلے حج میں چونکہ عارف باللہ بھی شریک تھے۔ انہوں نے اس حج

کی تاریخ وار پوری ڈائری درج کی ہے جس میں روزنامچے کے طور پر انگریزی تاریخ اور دن بھی لکھے ہوئے ہیں۔ عارف باللہ کا یہ روزنامچہ نہایت ہی قیمتی دستاویز ہے جو مکتوبات یعقوبی کے آخر میں بیاض یعقوبی کے نام سے طبع شدہ ہے۔ نیز دیگر بہت سے معلومات بھی اس میں درج ہیں۔ ہم اس روزنامچے کا خلاصہ آپ کی خدمت میں معلومات بہم پہنچانے کے لئے پیش کرتے ہیں:

”۱۰ جمادی الاولیٰ (۱۲۷۷ھ) (مطابق) ۲۴ نومبر (۱۸۶۰ء) شنبہ دیوبند سے مولوی خورشید حسین صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب کا تاریخی نام) کے ساتھ لے کر وطن (نانوتہ) آیا۔

۱۵ جمادی الاولیٰ مطابق ۲۹ نومبر پنجشنبہ نانوتہ سے ڈیڑھ پہر دن چڑھے (سفر حج کو) چلے۔ (رامپور منہاران کو ہوتے ہوئے

۱۶ (جمادی الاولیٰ مطابق) ۳۰ نومبر بروز جمعہ چار گھڑی دن چڑھے عصر کے وقت سہارنپور پہنچے (دس کوس) عشا کے بعد حافظ عابد حسین (مشہور دیوبند کے بزرگ) مع سواری زنانہ دیوبند سے آئے۔

۱۸ جمادی الاولیٰ ۲۰ (دسمبر ۱۸۶۰ء) یکشنبہ چھکڑا کیا چار روپیہ میں نے اور چھ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے دئے بعد نماز ظہر سرسادہ پہنچے۔

۱۹ جمادی الاولیٰ ۳۰ دسمبر دوشنبہ (پیر) بعد نماز صبح چل کر ظہر کی نماز جگادھری میں پڑھی۔ آٹا ایک روپیہ کا نو سیر تھا۔

۲۰ جمادی الاولیٰ ۴ دسمبر نماز ظہر ملانہ میں پڑھی (۱۴ کوس)۔

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ ۵ دسمبر ۱۸۶۰ء ملانہ سے پھر رات چل کر دوپہر کو انبالہ چھاونی پہنچے۔ مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کل صبح تشریف لائے اور آگے کو روانہ ہوئے۔ بعد نماز ظہر چلے اور انبالہ شہر قیام کیا۔ اتفاق سے راؤ عبداللہ خان صاحب (حاجی امداداللہ صاحبؒ) کے مرید ملے۔ (۱۴ کوس)

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ء ۶ دسمبر ۱۸۶۰ء جمعرات پتاری پہنچے۔ (۱۲ کوس)

۲۳ مطابق ۷ جمعہ سرہند پہنچے۔ حضرت مجدد الف ثانی کی قبر کی زیارت کی۔ حافظ عابد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب دونوں پہلے پہنچ گئے۔

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ ۸ دسمبر ۱۸۶۰ء ہفتہ رات سے چلے لشکری جان کی سرائے میں سب مل گئے۔ (۱۴ کوس)

۲۵ جمادی الاولیٰ ۹ دسمبر اتوار کچھ رات سے چلے قبل دوپہر لدھیانہ پہنچے۔

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۰ دسمبر پیر لدھیانے میں قیام کیا۔

۲۷ جمادی الاولیٰ ۔ ۱۱ دسمبر منگل۔ لدھیانے سے چل کر قبل دوپہر جگراؤں پہنچے۔ (۱۷ کوس)

۲۸ جمادی الاولیٰ ۔ ۱۲ دسمبر بدھ۔ پڑاؤ مینان ہوا۔ (۹ کوس)

۲۹ جمادی الاولیٰ ۔ ۱۳ دسمبر جمعرات۔ بعد نماز عشا چلے دوپہر کو گھل میں پڑاؤ کیا۔ ۲۱ کوس۔

۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۰ء بروز جمعہ آدھی رات سے چلے اور کچھ دن چڑھے فیروز پور پہنچے۔ شہر کی سرائے میں ٹھہرے۔ سب بزرگوں سے ملاقات ہوئی جمعہ پڑھا۔ (۹ کوس)

یکم جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۱۸۶۰ء ہفتہ سفر دریا:

ظہر کی نماز گھاٹ پر پڑھی۔ پھر شہر فیروز پر آئے۔ عصر کی نماز راستے میں پڑھی۔

۲ جمادی الاخریٰ ۱۶ دسمبر اتوار بعد نماز ظہر کچھ دیر بعد چلے بعد مغرب گھاٹ لندھو پہنچے۔ رات گذاری۔ سردی سخت تھی۔

۴ مطابق ۱۸ منگل ایک اور کشتی کی۔

۵۔ ۱۹ بدھ تین کشتیوں میں سامان لادا اور کشتی ہی میں سو رہے۔

۶ مطابق ۲۰ جمعرات قبل ظہر چلے عصر کے وقت کنارہ مغربی دو کوس پر مقام کیا یعنی ابیکے گاؤں میں۔

۷ مطابق ۲۱ جمعہ کو چلے ظہر کے وقت دریا کے کنارے ٹھہرے۔ چاروں کشتیاں

یکجا ہو گئیں۔ ہماری اور مولوی عبدالسمیع (مشہور بدعتی عالم رام پور منہاران کی کشتی بھی آ گئی۔ دس کوس چلے۔

۹ مطابق ۲۳ اتوار ظہر کے وقت ایک گاؤں میں لشکر کیا۔ عصر کو چلے اور مغرب کے وقت کشتی رکی۔

۱۰ مطابق ۲۴ پیر صبح کی نماز کے بعد چلے۔ ایک گاؤں آ ٹھہرے ظہر و عصر پڑھیں۔ بعد مغرب آگے جا کر رکے۔ ۱۵ کوس چلے۔

۱۱ مطابق ۲۵ منگل چلے ظہر کے وقت کشتیاں رکیں۔ نماز پڑھی۔

۱۲ مطابق ۲۶ بدھ۔ صبح سے چلے۔ راہ میں ظہر پڑھی۔ عصر کے وقت رکے۔ پاکپتن یہاں سے مغرب میں ہے۔ مولوی محمد قاسم، حاجی عابد حسین روانہ ہوئے۔

۱۳ مطابق ۲۷ جمعرات۔ صبح کے بعد کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور پاکپتن مزار بابا فرید شکر گنج کی زیارت کی۔

۱۴ مطابق ۲۸ جمعہ صبح چلے۔ دوپہر ٹھہرے۔ ظہر اور عصر پڑھیں۔

۱۵ مطابق ۲۹ ہفتہ چلے۔ نماز ظہر راہ میں پڑھی۔ عصر کے وقت چل کر قیام کیا۔

۱۶ مطابق ۳۰ اتوار صبح سے چلے۔ راہ میں ظہر پڑھی عصر و مغرب کے درمیان لکھا نام گاؤں میں ٹھہرے۔ پاک پتن سے یہاں تک چالیس میل۔ بہاولپور پچاس ساٹھ کوس ہے۔

۱۷ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء پیر کو چلے مغرب کے وقت ٹھہرے۔

۱۸ جمادی الاخریٰ ۱۲۷۷ھ یکم جنوری ۱۸۶۰ء منگل:

چلے اور شام کو قیام کیا۔

۱۹ مطابق ۲ بدھ۔ صبح سے چلے۔ شام کو قیام کیا۔

۲۰ مطابق جمعرات کو ہوا کی وجہ سے کچھ دور چل کر کشتی کو روک لیا۔

۲۱ مطابق ۴ جمعہ۔ کچھ دور چلے کہ ہوا کی شدت سے ظہر تک قیام کیا۔

۲۲ مطابق ۵ ہفتہ علی الصباح چلے دوپہر کو بہاولپور کے گھاٹ قیام کیا۔ شہر میں ہم

سب گیے۔ دریا سے دو ڈھائی کوس ہے۔

۲۳ مطابق ۶ اتوار بہاولپور قیام رہا۔

۲۴ مطابق ۷ پیر صبح کو چلے بعد عصر قیام کیا۔

۲۵ مطابق ۸ منگل صبح سے چلے۔ مغرب کے وقت قیام کیا۔ ۲۰ کوس از بہاولپور

۲۶ مطابق ۹ بدھ چلے۔ چار پانچ کوس کے فاصلے پر دریائے چناب، دریائے جہلم، دریائے راوی کا سنگھم آپہنچا۔ دوپہر کو ٹھہرے۔ بعد نماز ظہر آگے چلے۔ مغرب کے وقت ٹھہرے۔

۲۷ مطابق ۱۰ جمعرات۔ چلے تھے کہ دریائے سندھ آملا۔ شام کو مٹھن کوٹ کے نزدیک قیام کیا۔

۲۸ مطابق ۱۱ جمعہ۔ صبح چلے مٹھن کوٹ کے کنارے ٹھہرے بہت اچھا شہر ہے۔ بعد نماز عصر ٹھہرے۔

۲۹ مطابق ۱۲ ہفتہ۔ صبح سے چلے۔ سب یک جا ٹھہرے۔ چاند نظر آیا۔ حاجی عابد جسین صاحبؒ ایک گاؤں سے تین روپیہ کا سوا چھ سیر گھی لائے۔

یکم رجب ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۸۶۱ء اتوار:

صبح چلے۔ بسبب ہوا ظہر کو ٹھہرے۔

۲ مطابق ۱۴ پیر چلے اور شام یک جا ٹھہرے۔

۳ مطابق ۱۵ منگل۔ ہوا، ترشح کے باعث یہیں قیام رہا۔

۴ مطابق ۱۶ بدھ صبح کی نماز پڑھ کے چلے۔ عصر کے وقت سب کشتیاں ایک جگہ ٹھہریں۔

۵ مطابق ۱۷ جمعرات صبح چلے اور کچھ دن رہے۔ سکھر کے نزدیک پہنچے۔

۶ مطابق ۱۸ جمعہ بعد نماز صبح چلے کچھ دن چڑھے سکھر پہنچے۔

۷ مطابق ۱۹ پیر۔ سکھر ہی میں ٹھہرے رہے۔

۸ مطابق ۲۰ پیر۔ سکھر ہی میں رہے۔

۹ مطابق ۲۱ پیر۔ مولوی محمد قاسم روڑی سے آئے۔

۱۰ مطابق ۲۲ منگل۔ صبح کی نماز پڑھ کے چلے۔ ظہر راستے میں پڑھی۔

۱۱ مطابق ۲۳ بدھ صبح چلے ظہر کے وقت دریا کے کنارے ٹھہرے۔

۱۲ مطابق ۲۴ جمعرات بعد اشراق چلے۔ قریب مغرب قیام۔

۱۳ مطابق ۲۵ جمعہ صبح سے چلے۔ عصر کے وقت ٹھہرے۔ غرضکہ حیدرآباد کے پاس پہنچے۔

یکم شعبان ۱۲۷۷ھ ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء منگل:

اسی طرح روزانہ چلتے رہے یہاں تک کہ

۱۳ شعبان ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۴ فروری بروز اتوار بعد ظہر کراچی کی بندرگاہ پر پہنچے۔

اگلا جمعہ کراچی میں پڑھا۔

یکم رمضان ۱۲۷۷ھ ۱۴ مارچ ۱۸۶۱ء:

جمعرات کے دن بعد نماز مغرب کراچی سے چلے۔ راستے میں تراویح پڑھی۔ اسی طرح چلتے رہے۔

تا آنکہ ۷ شوال ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۸۶۱ء بروز جمعرات بندر مکلا پہنچے۔

۲۰ شوال ۱۲۷۷ھ یکم مئی ۱۸۶۱ء بدھ:

۲۱ مطابق ۲ جمعرات عدن کا پہاڑ نظر آتا رہا۔

۲۱ ذیقعدہ ۱۲۷۷ھ مطابق یکم جون ۱۸۶۱ء بروز ہفتہ تمام رات چلے۔ کچھ دن چڑھے سعدیہ پہنچے۔ بعد نماز ظہر غسل کر کے سب نے احرام باندھا۔ بعد مغرب چلے۔

۲۳ ذیقعدہ ۱۲۷۷ھ ۳ جون ۱۸۶۱ء بروز پیر مکہ محترمہ میں آمد:

تمام رات چلتے رہے۔ صبح پہر دن چڑھے مکہ شریف پہنچے۔ طواف بیت اللہ اور سعی کر کے احرام عمرہ سے حلال ہوئے۔ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے ملے اور

حضرت کی رباط میں ٹھہرے۔

حج ۹ ذی الحجہ مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۱ء:

۸ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸ جون ۱۸۶۱ء بروز منگل مولانا محمد قاسم صاحب حاجی صاحب کے ہمراہ بعد نماز صبح اول وقت منیٰ پہنچے۔

۹ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۱ء بروز بدھ بعد نماز صبح عرفات کو روانہ ہو گئے۔ بعد زوال عرفات میں ٹھہر کر حج کیا۔ بعد مغرب وہاں سے چل کر مزدلفہ میں پہنچے۔

۱۰ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۰ جون ۱۸۶۱ء بروز جمعرات صبح مزدلفہ سے چل کر کچھ دن چڑھے منیٰ پہنچے۔ رمی کی۔ قربانی کی۔ سر منڈایا، طواف کو مکہ محترمہ گئے شام کو واپس ہوئے۔

۱۱ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۱ جون ۱۸۶۱ء بروز جمعہ رمی کی۔ اور نماز جمعہ منیٰ میں پڑھی۔

۱۲ ذوالحجہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۲ جون ۱۸۶۱ء بروز ہفتہ رمی کی۔ اور بعد عصر مکہ محترمہ کو روانہ ہوئے، قریب عشا مکان پہنچے۔ اور اس طرح مولانا محمد قاسم صاحب کا حج پورا ہوا۔“

مدینہ منورہ تشریف لے جانے اور واپسی کا حال مولانا محمد یعقوب صاحب کے حوالے سے حج کے ذکر کے آغاز میں بیان کیا جا چکا ہے۔

حفظ قرآن کریم:

یہی پہلے حج کا سفر ہے کہ اسی میں رمضان شریف کا چاند کراچی میں دیکھا گیا۔ کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے سفر حج کے روزنامچے میں ہے:

”یکم رمضان ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۴/ اپریل بروز پنجشنبہ بعد نماز مغرب کراچی سے لنگر تینوں جہازوں کا اٹھایا اور رستے میں تراویح پڑھی۔“ (بیاض یعقوبی صفحہ ۱۴۰)

اس سے واضح ہوا کہ رمضان کا چاند کراچی میں دیکھا گیا۔ اور پہلی تراویح بھی وہیں پڑھی گئی ہوں گی۔ بعد ازاں جہاز میں پڑھی گئیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”جاتی دفعہ کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے۔ رمضان کا چاند دیکھ کر مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا اول وہاں سنایا اور جہاز میں کیا میسر تھا۔ بعد عید مکلہ پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی۔ مولوی صاحب کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ پڑھتے اور یاد کر لیتے اور حافظوں کے نزدیک ٹھہرا ہوا ہے کہ بلند آواز سے یاد ہوتا ہے۔ بعد ختم مولوی صاحب فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں، میں نے یاد کیا ہے اور جب یاد کیا پاؤ سیپارے کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا اور جب سنایا ایسا صاف سنایا جیسے اچھے پرانے حافظ پھر تو اکثر بہت پڑھتے۔ ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک ہی رکعت میں پڑھے اگر کوئی اقتدار کرتا رکعت روک کر اس کر منع فرما دیتے اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے۔“
>
> (سوانح قاسمی صفحہ ۲۰)

اللہ اللہ اب حضرت قاسم العلوم حافظ قرآن بھی ہو گئے اور حرمین شریفین کی زیارت سے پہلے اس مبارک سفر میں تھوڑے سے عرصے میں قرآن کریم کا حفظ کر لینا صاف اور کھلی ہوئی کرامت ہے۔

مدینہ منورہ کو روانگی اور ہندوستان کو واپسی

براہ بمبئی جمادی الاخریٰ ۱۲۷۸ھ:

مذکورہ بالا روزنامچے سے مکہ محترمہ پہنچنے حج سے فارغ ہونے کی تفصیلات معلوم ہوئیں لیکن ڈائری میں مدینہ منورہ کی روانگی کا حال درج نہیں۔ البتہ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”بعد حج مدینہ شریف روانہ ہوئے اول سفر مراجعت کی اسی مہینے کے آخر میں جہاز میں

> بیٹھے۔ ربیع الاول کے آخر میں بمبئی آئے جمادی الثانی تک وطن پہنچے۔ بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم وزیادہ میں وطن آئے۔ مراجعت براہ بمبئی اور ناسک ہوئی۔ ریل ناسک تک تھی وہاں سے گاڑیوں میں آئے۔" (سوانح صفحہ ۱۹۔۲۰)

یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ حضرت قاسم العلوم ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو بروز جمعرات روانہ ہو کر جمادی الاخری ۱۲۷۸ھ مطابق دسمبر ۱۸۶۱ء میں ایک سال اور ایک ماہ کے بعد نانوتہ اپنے وطن میں پہنچے۔

قاسم العلوم کا دوسرا حج بتاریخ ۹ ذوالحجہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ء:

حجۃ الاسلام نے دوسرا حج ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں ادا فرمایا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> "۱۲۸۵ھ میں مولانا کو پھر حج کی سوجھی۔ چند رفقا کو ساتھ لے کر حج کو آئے مگر ایک سال بعد واپس آگئے۔" (سوانح صفحہ ۲۱)

مگر حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمۃ کی مصنفہ اپنی کتاب آب حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حج ۱۲۸۶ھ میں ہوا ہے اور روانگی بھی ۸ شوال ۱۲۸۶ھ کو ہوئی ہے۔ چنانچہ اپنی مصنفہ کتاب ہدیۃ الشیعہ پر نظر ثانی کے ضمن میں پہلے اور دوسرے صفحے پر حجۃ الاسلام تحریر فرماتے ہیں:

> "اس سال اعنی ۱۲۸۶ھ میں قبل رمضان شریف منشی محمد حیات نے ہدیۃ الشیعہ چھاپنے کا ارادہ کیا............ اسی میں رمضان شریف کا آجانا نہ لکھنے کا اور بہانہ ہوگیا.......... سامان غیبی باعث عزم سفر حج ہوا۔ آٹھویں شوال کو وطن سے رخصت ہوا۔" (ہدیۃ الشیعہ صفحہ ۲۰۱)

حاصل یہ ہے کہ دوسرا حج یقیناً ۱۲۸۶ھ میں ادا کیا گیا ہے۔ جو نفلی حج ہے اور اس حج کیلئے وطن سے روانگی ۸ شوال ۱۲۸۶ھ کو ہوئی ہے۔ اس لئے صاحب حج کی تاریخوں اور حج کے سال کو صحت کے اعتبار سے ترجیح دی جائے گی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت قاسم العلوم کے تینوں حج غیبی سامان کے مرہون منت ہیں۔

حضرت قاسم العلوم کا تیسرا حج روانگی ۹ شوال ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء واپسی ربیع الاول ۱۲۹۵ھ:

تیسرے حج کے متعلق حضرت قاسم العلوم اپنے ایک عربی مکتوب میں اپنے شاگرد عزیز حکیم مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوری کو تحریر فرماتے ہیں:

> **حررت اليوم ما حررت وانا على عجل لما انا على ظهر السير غداً او بعد غد انشاء الله تعالىٰ. فستسمع قريباً ان قاسماً راح بعيدا. اليوم ثامن شوال بروية التاسع والعشرين فقدر اى الهلال ههنا جم غفير من الناس.**

ترجمہ: آج میں نے جو کچھ لکھ دیا۔ لکھ دیا اور میں جلدی میں ہوں۔ کیونکہ میں کل کو یا پرسوں کو سفر پر روانہ ہوں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ آپ عنقریب سن لیں گے کہ قاسم دور چلا گیا۔ آج ۲۹ کے چاند سے شوال (۱۲۹۴ھ) کی آٹھ تاریخ ہے۔ کیونکہ لوگوں کے جم غفیر نے چاند دیکھا ہے۔

خط کے آخر میں حضرت قاسم العلوم نے اپنے شاگرد کو اس اچانک اطلاع سے حیرانی میں ڈال دیا۔ چنانچہ اس ناگاہ روانگی سے انہوں نے کیا خیال کیا۔ سنئے حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> **بعد ارسال هذه المرسالة الى هذا الخادم بالتعجيل لقد على هو جاء الترحيل الى بيت الرب الجليل كما اشار اليه فى ختام هذه التميقة الشريفة باشارة لطيفة لايخفى لطفها على صاحب الطبع اللطيف ولما كان ذالک الزمان المعلوم زمان محاربة الروس بسلطان الروم فمن اجل ذالک ظن الظانون ان ذهابه رحمه الله فى هذا الوقت الى ديار العرب ليس الالغرض ان يدخل فى زمرة احياء لايموتون.**
>
> **و ذالک لان الناس كانوا يعلمون من قبل انه قدس سره كان قد فرغ قبل هذا عن اداء عبادة الحج فريضة وناظة مرة بعد اولىٰ**

وکرة بعد اخریٰ فظنوا فی هذه الحالة و فطنوا انه لیس داع لذهابه العالی الی تلک الدیار فی هذه المرة الامر فخیم الشان احروی لشانه الفحیم مناسبا لعلو همته و مقتضی لعادته المستمرة ولطیف هذا الخیال بدون التفکر فی المآل عرض لبالی باقضاء الطبع من فرط الحزن والملال.

فلما رجع رحمه الله الی وطنه لمالوف مع الخیر و عافیة الحال و دفع بقدومه الشریف عن قلوب خدام حضرته کلفة الملال حررت فی خدمته الشریفة عریضة فارسل فی جوابه الی شفقة علی بالعجلة نمیقة عالیة مختصرة غیر طویلة و عریضة ذکرها فی هذاه الجریدة لا یخلو عن فائدة جلیلة ولا اقل من حصول البرکة بکلامه لخدام حضرته المتبرکة وهی هذه.

ترجمہ: اس خط کے خادم کو بھیجنے کے بعد جلد ہی بیت اللہ کی طرف سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ جیسا کہ حضرت قاسم العلوم نے اس خط کے آخر میں لطیف اشارہ کیا ہے جس کا لطف، لطیف طبیعت پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اور چونکہ یہ زمانہ روس کا سلطان روم (ترکی) سے جنگ کا زمانہ تھا۔ اس لئے گمان کرنے والوں نے گمان کیا کہ اس وقت میں دیار عرب کو آپ کا جانا خدا کی آپ پر رحمت ہو ایک خاص غرض کے سوا نہیں ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو شہید کر کے ان زندوں میں شامل ہو جائیں جو کبھی نہیں مرتے۔

اور یہ اس لئے کہ لوگ پہلے سے جانتے ہیں کہ حضرت قدس سرہ اس سے پہلے فرض حج اور نفلی حج کی عبادت سے یکے بعد دیگرے اور ایک کے بعد دوسرے حج سے فارغ ہو چکے تھے لہٰذا اس حالت میں انہوں نے قیاس کیا اور سوچا کہ عالیجناب کا دیار عرب کی طرف اس مرتبہ جانا کسی خاص مہم کیلئے ہے جو آپ کی شان کے شایان اور آپ کی بلند ہمتی کے مناسب اور آپ کی ہمیشہ کی عادت کے تقاضے کے مطابق ہے اور اس لطیف خیال کا انجام سوچے بغیر دل میں آنا طبیعت میں غیر معمول حزن اور ملال کے تقاضے کی بنا پر ہے۔

جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ خیر و عافیت کے ساتھ اپنے وطن کو واپس ہوئے اور اپنی

تشریف آوری سے خدام کے دلوں سے ملال کی کلفت کو دور فرمایا تو میں نے آپ کی خدمت شریف میں ایک خط لکھا جس کا جواب مجھ پر شفقت کی وجہ سے جلد عنایت فرمایا جو کہ مختصر طور پر تھا جس کا ذکر کرنا بڑے فائدے سے خالی نہیں۔ اور کم از کم خدام کیلئے حضرت کا یہ خط برکت کے حصول سے بھی کیا کم ہے۔ اور وہ خط آگے آرہا ہے۔

حکیم رحیم اللہ صاحبؒ بجنوری کی اس تحریر کے دوسرے پیرے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم اس حج سے پیشتر دو حج، ایک فرض اور دوسرا نفلی ادا کر چکے تھے جب قاسم العلوم تیسرے حج سے واپس ہوئے۔ تو حکیم صاحب موصوف نے حضرت کو خط لکھا۔ جس کا جواب حسب ذیل ہے:

من الفقير محمد قاسم

الى جامع الكمالات المولوى رحيم الله سلمه الله تعالىٰ

السلام عليكم

اليوم ورد كتابكم الشريف فسرني سركم الله تعالىٰ. انتم تسئلون عن سر رحلتى فى الشتاء وماسواه من احوالى فاستمع يا اخى للحج فضيلة لاتكاد تبلغها عبادة اخرىٰ ففيه تنويه شان المحبوب ورجاء مغفرة الذنوب اثارة واثار المحبة واقامة اطوار المودة واعتلاق بالجمال واشتياق الى الكمال فهل من مذنب يكون صحيحا سويا له بلاغ الى بيت الحرام يستمع تلك الفضائل ثم لا يقطع الحبائل ثم قال الله تعالىٰ فى شان بيته الحرام ومن دخله كان امنا وفى شانه نبيه عليه و على اله و اصحابه الصلوٰة والسلام ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاء وك الخ

وكانت خطيئاتى احاطت بى فرأيت الاعتلاق بهذه الوسيلة ورجوت الغفران بهذه الحيلة.

فلما رجعت وركبت البحر اخذتنى حمى نافضة واصابنى بهاقئى شديد حتى شرفت منه على الهلاك واستيأس منى

الاصحاب و ظن الناس ظن السوء ولولا ادعية الاكابر والاصاغر لكنت اليوم نسياً منسيا فشفاني الله بغير دوا وقواني بلاغذاء وردني الى بيتي صحيحا سليما الا انى لم ابلغ اليوم اشدى لما ان الطاقة ذهبت سريعاً وعادت بطيئا ولتقرا منى السلام على مسيح الزمان حكيم محمد ابراهيم خان۔"

(مکتوب مبارک موصول از مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند)

ترجمہ: فقیر محمد قاسم کی طرف سے جامع کمالات مولوی محمد رحیم اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ کی طرف

السلام علیکم۔

آج آپ کا شرافت نامہ ملا جس۔ نے خوش کیا اللہ تعالیٰ آپ کو بھی خوش رکھے، آپ نے جاڑوں کے موسم میں میرے سفرار دیگر احوال کے متعلق دریافت کیا ہے تو اے عزیز غور سے سنو کہ حج کی اتنی فضیلت ہے کہ کوئی اور عبادت اس کے قریب بھی نہیں پہنچتی کیونکہ اس میں محبوب کی شان کا ظہور اور گناہوں کی مغفرت کی امید، محبت کے آثار کا نشان، دوستی کے انداز کا قیام جمال دوست سے لطف اندوزی اور کمال کی طرف اشتیاق ہوتا ہے پس کوئی گنہگار ایسا ہے کہ صحیح اور تندرست ہو اور بیت اللہ کی طرف اسے جانے کا شوق نہ ہو اور حج کے فضائل سن کر وہاں جانے کا ارادہ نہ کرے۔ درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی شان میں کہا ہو کہ "جو شخص اس میں داخل ہوا وہ امن میں ہوگیا" اور نبی ﷺ کی شان میں ان پر، ان کی اولاد پر اور ان کے اصحاب پر صلوٰۃ وسلام ہو اور اگر وہ لوگ جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا آپ کے پاس آئیں۔ الخ

اور میرے گناہ مجھ پر چھا گئے تھے لہٰذا حج میں میں نے نجات دیکھی اور اس حیلے سے بخشش کی امید باندھی۔

جب میں حج سے واپس ہوا اور جہاز میں سوار ہوا تو مجھے سخت بخار نے آ پکڑا اور سخت قے ہوئی یہاں تک کہ مرنے کے قریب ہوگیا اور میرے رفقا بھی مایوس ہوگئے اور لوگوں کو موت کا گمان ہوگیا اور اگر بزرگوں اور خردوں کی دعائیں نہ ہوتیں تو آج میں بھولا بسرا ہوگیا ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بغیر دوا کے مجھے شفا دی اور بغیر غذا کے قوت

> بخشی اور میرے گھر مجھے صحیح وسالم لوٹا دیا لیکن میں ابھی تک اپنی اصلی قوت کو نہیں پہنچا۔ کیونکہ طاقت چلی تو جلدی جاتی ہے لیکن واپس دیر میں ہوتی ہے۔ ہاں میرا اسلام مسیح زماں حکی محمد ابراہیم خان سے کہنا۔“

اس خط میں حضرت قاسم العلوم نے مختصر طور پر سب کچھ بتا دیا ہے جو ہمارے لئے تاریخی اور یقینی دستاویز ہے۔ آپ نے اپنی واپسی میں جس بیماری کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے ہی شفا بخشی۔ ورنہ جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے۔ رفقا بھی ناامید ہو گئے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جو خود حج میں شریک تھے۔ انہوں نے بیماری سے متعلق گھر پہنچنے تک کا تمام نقشہ حسب ذیل عبارت میں کھینچ کر رکھ دیا ہے:

> ”اسی سال (۱۲۹۴ھ) ارادہ جناب مولوی رشید احمد صاحب کا حج کو جانے کا تھا۔ احقر بھی تیار ہوا اور چلتے میں مولانا (محمد قاسم صاحب) کو بھی ساتھ لے ہی لیا اور مولوی صاحب کے ساتھ اور کچھ کتنے ہی معتقد و خادم آپ کے روانہ ہوئے۔ (۹ یا ۱۰) شوال ۱۲۹۴ھ میں روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کے اول پھر اپنے وطن واپس آئے۔ اس سفر میں تمام قافلہ علما کا تھا۔ اٹھارہ بیس مولوی فاضل (یونیورسٹی کے نہیں بلکہ عربی مدارس کے) ساتھ تھے اور عجب لطف کا مجمع تھا۔ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحبؒ) کی زیارت سے اور ان متبرک مکانوں کی زیارت سے مشرف ہو کر جب واپس ہوئے ہدہ پہنچ کر مولانا (محمد قاسم) کو بخار ہو گیا۔ یہ خیال ہوا کہ جدائی ایسے بزرگ اور بزرگ مقاموں اور پیادہ پا زیادہ چلنے کے سبب سے ہے اور نہ کچھ پہلے حج سے بھی طبیعت ناساز تھی۔ جدہ پہنچتے ہی جہاز پر سوار ہو گئے۔ اس جہاز کا لنگر اٹھنے والا تھا اور دیگر جہازوں کی خبر عشرہ بلکہ دو ہفتے تک کی تھی اس لئے یہ خیال کیا کہ پندرہ روز میں بمبئی پہنچیں گے اور اتنی تکلیف اٹھا لیں گے۔ واقعی اس جہاز میں اتنی ہی تکلیف ہوئی جتنی جاتی دفعہ جہاز میں آسائش و راحت پائی تھی۔ دو روز جہاز پر چڑھے ہوئے تھے کہ مولانا کو دورہ صفرائے معمولی ہوا اور بخار بھی۔ وہاں نہ جگہ راحت کی نہ دوا نہ کچھ تدبیر عرض کی شدت ہوئی ایک دن یہ نوبت ہوئی کہ ہم سب مایوس ہو گئے اور جہاز میں وبا تھی۔ ہر روز ایک دو آدمی انتقال کرتے تھے۔ عدن پہنچے وہاں قرنطینہ ہو گیا۔ یعنی

بسبب مرض نہ جہاز کے آدمی کنارے پر اتر سکے اور نہ شہر کے آدمی جہاز پر آسکے۔ بعدہ پھر مکلے میں قدرے قیام کیا۔ وہاں سے البتہ لیموں بکنے آئے وہ لئے تربوز اور گلاب اور بعض ادویہ جہاز میں مل گئی تھیں۔ جہاز کے ڈاکٹر نے کونین دی اور مرغ کا شوربا غذا کو کہا۔ وہاں مرغ کہاں میسر تھا۔ آخر مرغ بھی اپنے پاس سے دیا۔ مولانا کو دورے میں غذا سے نفرت مطلق ہو جاتی تھی۔ اب کچھ رغبت شروع ہوئی۔ بمبئی ایسے پہنچے کہ بیٹھنے کی طاقت دشواری سے تھی۔ دو تین روز ٹھہر کر وطن کو روانہ ہوئے۔ ہر چند موسم سرما تھا مگر جبلپور کے میدانوں میں دوپہر کو لو چلنے لگی اور مولانا کی طبیعت بگڑی۔ خیر الحمد اللہ اس وقت نارنگی لیموں یہ چیزیں پاس تھیں۔ کھلائیں، پانی پلایا۔ وطن پہنچنے کے بعد مرض رفع ہوا گونہ طاقت آئی مگر کھانسی ٹھہر گئی اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا۔ زیادہ بولنا دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا۔ پھر اس میں بھی کسی قدر تخفیف ہوئی۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۲۵۔۲۶)

۱۲۹۴ھ میں کاروان حجاز:

اس کاروان حجاز کے اللہ والے حضرات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ہم آپ کو ایک اور صاحب قلم کی طرف لئے چلتے ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب تذکرۃ الرشید میں لکھتے ہیں:

”۱۲۹۴ ہجری نبوی وہ سال تھا جس میں ترکی اور روسی دو زبردست سلطنتوں میں باہم جنگ ہو رہی تھی۔ اس سال حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) نے حج کا قصد فرمایا۔ آپ کے اس مبارک سفر حجاز کی جس وقت دیگر حضرات کو اطلاع ہوئی تو سرزمین ہندوستان کے منتخب اور جید علما سب ہی معیت کے لئے تیار ہو گئے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ حضرات دینی معاونت کے لئے بحیلہ سفر حجاز حقیقت میں ملک روم کا سفر کر رہے ہیں۔ ترکی سلطنت کی طرف سے والنٹیر جماعت میں شامل ہو کر مجاہد فی سبیل اللہ بنیں گے۔ لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔

مشاہیر علما میں حضرت امام ربانی قدس سرہ کے ہمراہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب حکیم ضیاء الدین صاحب، مولانا محمد مظہر صاحب مع اہلیہ، مولانا محمد یعقوب صاحب،

مولانا رفیع الدین صاحب، مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند)، مولانا حکیم محمد حسن صاحب، مولوی حکیم محمد اسماعیل صاحب، مولوی سخاوت علی صاحب انبیٹھوی اور حضرت کے خاص خادم مولوی پیر محمد صاحب سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص شاگرد مولوی حافظ عبدالعدل صاحب و مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی، مولوی احمد حسن صاحب کانپور مع اہلیہ اور حضرت کے بھانجے مولوی الطاف الرحمٰن صاحب وغیرہم تھے۔" (صفحہ ۲۲)

اس سال سفر حج کیلئے بعض سہولتیں وجود میں آچکی تھیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

"اس سال جس میں اس مقدس مجمع کا یہ مبارک و مشہور سفر حجاز واقع ہوا خشکی کا رخانی جہاز (ریل گاڑی) بمبئی تک مسلسل جاری ہو گیا تھا۔ اور بمبئی سے جدے تک کیلئے بحری دخانی آگبوٹ (سٹیمر) ایجاد ہو کر چل نکلے تھے۔ (تذکرہ صفحہ ۲۳ حصہ اول)

یہ حضرات غازی آباد، الہٰ آباد، جبلپور کے راستے بمبئی پہنچے تھے۔ اس اثنا میں دو روز کیلئے یہ سب قافلے کو نواب ممتاز علی خان صاحب نے اٹاوہ اتار لیا تھا۔"

(تذکرۃ الرشید جلد اول)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی کرامت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی زبانی:

یہ سارا قافلہ بمبئی پہنچ گیا۔ اور بائیس دن بمبئی رکا رہا۔ سب گھبرا اٹھے کہ جہاز کیوں نہیں آتا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"ایک دن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمانے لگے کہ آج معلوم ہوا ہے کہ سارے قافلے کو مولانا محمد قاسم صاحبؒ روک رہے ہیں۔ ان کے چند رفقا اور متوسلین ضلع مظفر نگر سے آنے والے ہیں۔ جب تک وہ نہ آجائیں گے اس وقت تک نہ جہاز آکے نہ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ مظفر نگر کا قافلہ جس دن بمبئی پہنچا، اسی دن ایک

جرمنی کا جہاز حاجی قاسم نے ٹھیکے لے کر شام ہی کو ٹکٹ کھول دیا اور فروخت کرنا شروع کر دیا۔ چھتری کا محصول پینتالیس روپیہ اور تخت کا کرایہ پچیس روپیہ۔ اگلے دن کشتیاں کنارے پر آ لگیں اور جدے کے جانے والے سارے مسافر جہاز پر سوار بھی ہو گئے۔ دوسرے دن جہاز نے عرب کی جانب رخ پھیرا اور رخصتی سیٹی بجا کر روانہ ہو گیا۔ پانچوں نمازیں جماعت سے ادا ہوتیں۔ نصرانی کپتان اس پیاری عبادت کو سلیم و سلیس انداز کے ساتھ ادا ہوتے دیکھتا تو خوش ہوتا۔ غرض آٹھویں دن عدن کی بندرگاہ پر جہاز نے لنگر کیا۔ ایک دن ٹھہر کر روانہ ہوا اور پھر چوتھے دن جدہ کا بندرگاہ نظر آنے لگا۔“

(تذکرۃ جلد اول صفحہ ۲۳۵_۲۳۶)

بمبئی سے روانگی:

وطن سے روانہ ہو کر یہ حضرات بخیریت بمبئی پہنچے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بمبئی سے روانگی کا حال اپنی بیاض میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

۱۲۹۴ھ پنجشنبہ یکم ذیقعدہ بحساب یکم شوال چہار شنبہ بعد از نماز صبح از بمبئی روانہ شدہ بواخست سہ بر مرکب دخانی رسیدیم و سامان لنگر برداشتن از نواخت در شد بعد چار لنگر برداشتہ روانہ شدند باز توقف کرد باز روانہ شد آخر بعد مغرب از کھاڑی خارج شد و در دریائے اعظم رسیدیم در روز جمعہ ہم شوال بساخت دوازدہ عدن رسیدیم و لنگر انداختند بقیہ روز جمعہ و شب شنبہ توقف ماند۔ مال عدن خارج کردند و مال حدیدہ و جدہ از یکجائے در جائے دیگر افگندند برائے مساوات وزن در روز شنبہ بوقت عصر سامان لنگر برداشتن شد و قبیل مغرب حرکت کرد و بعد مغرب روانہ شدیم آخر شب روشنی مینار باب المندب بنظر آمد و بعد طلوع صبح صادق از باب کبیر جانب یسار گذشتیم و باب صغیر بہ یمین ماند از صبح ہوائے موافق در خواہش است و قدرے تلاطم و جہاز در حرکت است۔ سہ شنبہ سیزدہم ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ امید بود کہ بجدہ رسیم مگر بسبب آنکہ خرف بود کہ روز آخر شود و بشب رسیدن دشوار حرکت کم کردند تمام شب ہمیں طور ماند صباح جہاز شنبہ چہاردہم ذیقعدہ جبل جدہ بنظری آمد مگر کپتان جہاز و دربان اختلاف کردند راہ گم کردند۔ آخر

بنواخت ودہ از اتفاق ماہی گیر کہ در وقت رسیدہ خضر راہ شد بالجملہ بریازدہ لنگر انداختند دو وقت ظہر بجدہ رسیدیم۔ بر کنارہ با عبداللہ مستان ملاقات شد۔ (بیاض یعقوبی صفحہ ۱۵)

''۱۲۹۴ھ جمعرات یکم ذیقعدہ بحساب یکم شوال بدھ صبح نماز کے بعد بمبئی سے روانہ ہو کر تین بجے دخانی جہاز پر پہنچے اور دو بجے سے لنگر اٹھانے کا سامان ہوا۔ چار بجے کے بعد لنگر اٹھا کر روانہ ہوئے پھر ٹھہرے پھر روانہ ہوئے۔ آخر بعد مغرب کھاڑی سے نکل کر دریائے اعظم میں پہنچے اور جمعہ کے دن شوال کے مہینے میں بارہ بجے عدن پہنچے۔ اور لنگر ڈال دیا۔ جمعہ کے بقایا دن اور ہفتے کی رات کو قیام رہا۔ عدن کا سامان نکالا اور حدیدہ اور جدہ کا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈالا۔ اور وزن کی برابری کیلئے ہفتے کے دن عصر کے وقت لنگر کا سامان اٹھانا ہوا اور مغرب سے ذرا پہلے حرکت ہوئی۔ اور مغرب کے بعد روانہ ہو گئے۔ رات کے آخر میں باب المندب کے مینار کی روشنی نظر آئی اور صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد باب کبیر سے ہم بائیں جانب کو گذرے اور باب صغیر دائیں جانب رہا۔ صبح سے موافق ہوا چل رہی ہے اور کچھ تلاطم بھی اور جہاز حرکت میں ہے۔ بروز منگل ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ کو امید تھی کہ جدہ میں پہنچ جائیں گے مگر رات ہو جانے کے خوف سے کہ اس وقت دشواری ہوگی رفتار کو کم کر دیا۔ تمام رات اسی طرح چلتے رہے ۱۴ ذیقعدہ بروز بدھ جدے کا پہاڑ دکھائی دیا گیا مگر جہاز کے کپتان اور محافظ میں اختلاف ہو گیا اور راستہ گم ہو گیا۔ آخر دس بجے اتفاقاً ایک ماہی گیر خضر راہ بن کر پہنچ گیا۔ آخر گیارہ بجے لنگر ڈالدیا اور ظہر کے وقت جدہ پہنچ گئے کنارے پر عبداللہ مستان سے ملاقات ہوئی۔''

مولانا محمد قاسم صاحب کا سفر حج میں فقر و درویشی کا رنگ:

اس سفر حج میں ایک سے ایک بڑھ کر عالم درویش تھا اور ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کا حال تھا لیکن حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے متعلق مولانا عاشق الٰہی صاحب تذکرے میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ پر فقر و درویشی اور حسن خلق کا غلبہ تھا جس کی وجہ سے

آپ ہر وقت مجمع کا مرکز بنے رہتے تھے اور آپ کو مخلوق گھیرے رہتی تھی............

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں کشوف کو نیہ کے اکثر ذکر تذکرے ہوتے۔ مکاشفات بیان کئے جاتے۔ خوابیں ظاہر کی جاتیں۔ غلبہ ظن پر رائے زنی ہوتی۔ اور درویشانہ صوفیانہ چھیڑ چھاڑ برابر قائم رہتی تھی۔"

(تذکرہ جلد اول صفحہ ۲۳۲۔۲۳۳)

جہاز میں حجۃ الاسلام کا مشغلہ:

مولانا عاشق الٰہی لکھتے ہیں کہ:

"جہاز کے سارے سفر میں بھی حضرات کا فرق طبائع اپنا اپنا رنگ جدا دکھلاتا رہا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اکثر اوقات مجمع میں گھرے رہتے اور خلق اللہ کو کلمات طیبات سے مستفید فرماتے رہتے تھے۔" (تذکرہ ج اول صفحہ ۲۳۶)

قیام مکہ اور واپسی:

مکہ معظمہ پہنچ کر یہ سب حضرات حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رباط میں مقیم ہوئے اور صبح کا کھانا سو آدمیوں کا حاجی صاحب نے کھلایا۔ حج سے فراغت کے بعد روضہ حضور پُر نور پر مدینہ منورہ آئے اور بیس دن قیام کیا۔ بعد ازاں پھر یہ قافلہ مکہ معظمہ واپس آیا۔ اور ایک ماہ مقیم رہا۔ ایک ماہ دوبارہ مکہ مکرم قیام کرنے کے بعد یہ حضرات جدہ کو روانہ ہو گئے۔ جہاز تیار تھا۔ مگر جگہ تنگ تھی۔ تاہم سب اسی جہاز میں سوار ہو گئے۔ اسی دن شام کو جہاز روانہ ہو گیا۔ راستے میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو بخار نے آدبایا اور حالت نازک ہو گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی اور جدہ سے تیرھویں روز جہاز بمبئی پہنچا اور بمبئی سے یہ حضرات اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اور حضرت حجۃ الاسلام بھی اپنی منزل مقصود کو پہنچے۔ (تذکرۃ الرشید جلد اول)

چھٹا حصہ:

چشمہ فیض قاسمی دار العلوم دیوبند

جب عنایت ربانی کا چھینٹا کسی انسانی وجود پر پڑتا ہے۔ تو اس انسان کا شرف عرش سے بھی زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ اور جب عنایت ربانی کسی جگہ پر جلوہ فگن ہوتی ہے۔ تو اس سے مسجد اقصیٰ، بیت اللہ کوہ طور اور مسجد نبوی جیسے مقدس مقامات نمودار ہوتے ہیں۔ اور جب رحمت الٰہی کسی وقت پر چشم التفات کرتی ہے تو اس سے شب قدر جمعہ، شب برأت، رمضان جیسے نورانی اوقات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

خواہ کچھ بھی ہو یہ حقیقت تو آنکھوں کے سامنے ایسی وضاحت کے ساتھ آتی ہے کہ دار العلوم دیوبند کا وجود بھی مشیت ایزدی کا نتیجہ اور عنایت ربانی کا منشا نظر آتا ہے کسی چیز کی نشو و نما اور خصوصی مقبولیت میں خدائی قدرت ضرور کارفرما ہوتی ہے۔ دار العلوم بھی اسی منشا کا پرتو نظر آتا ہے۔ جس سے علوم شریعت اور قرآن وسنت کے چشمے ابل ابل کر دنیائے اسلام کیلئے آب حیات کا کام کر گئے۔ اور دنیائے اسلام میں دار العلوم دیوبند کی نوعیت کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس حقیقت کی تائید میں صرف ایک تاریخی واقعہ پیش کرنا کافی ہوگا۔ جو تذکرۃ الرشید حصہ دوم سے نقل کرتا ہوں:

> ”مولوی عبد السبحان صاحب انسپکٹر پولیس ضلع گوالیار فرماتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب کمشنر بندوبست ریاست گوالیار ایک بار پریشانی میں مبتلا ہوئے اور ریاست کی طرف سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی یہ خبر پا کر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گنج مراد آباد پہنچے۔ حضرت مولانا (گنج مراد

آبادی) نے وطن دریافت فرمایا انہوں نے عرض کیا "دیوبند" مولانا نے تعجب کے ساتھ فرمایا گنگوہ حضرت مولانا کی خدمت میں قریب تر کیوں نہ گئے اتنا دراز سفر کیوں اختیار کیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت لائی ہے مولانا نے ارشاد فرمایا تم گنگوہ ہی جاؤ۔ تمہاری مشکل کشائی حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ ہی کی دعا پر موقوف ہے اور تمام روئے زمین کے اولیاء بھی اگر دعا کریں گے تو نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ واپس ہوئے اور بوسیلہ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحبؒ حضرت (گنگوہیؒ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے سفارش کی۔ تو حضرت امام ربانیؒ (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ) نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی قصور نہیں کیا یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے سو قصوروار بھی اللہ پاک کے ہوئے۔ حق تعالیٰ سے توبہ کریں۔ بندہ دعا کرے گا۔ چنانچہ ادھر انہوں نے توبہ کی ادھر مطالبے سے برأت کا کمشنر صاحب کے پاس سے حکم آ گیا۔" (تذکرۃ الرشید حصہ دوم صفحہ ۲۱۵)

اس واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ دارالعلوم کے ایک سخت مخالف کی رستگاری محض دارالعلوم کی مخالفت سے توبہ کرنے میں پوشیدہ تھی۔ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی جیسی زبردست روحانی شخصیت نے اس مقدمہ کو نہ صرف اپنے قابو سے بلکہ تمام اولیاء کے قابو سے باہر بتا کر مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے زیر اثر ظاہر فرمایا اس بات سے حضرت گنج مرادآبادی کی وساطت سے حضرت گنگوہی کے مقام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور بغیر کسی تعصب اور جانبداری کے حضرت گنگوہی کے حسب ذیل جملے پر بھی صلائے عام ہے۔ یاران نکتہ دان کیلئے یہ کہنا حقیقت کے خلاف نظر نہیں آتا کہ:

> "یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو اللہ کا ہے سو قصوروار بھی اللہ پاک کے ہوئے حق تعالیٰ سے توبہ کریں بندہ دعا کرے گا۔"

دارالعلوم دیوبند کے من جانب اللہ ہونے کی ایک خاص وجہ وہ بھی ہے جس کا ذکر علمائے حق کے مصنف مولانا محمد میاں نے پہلے حصے میں کیا ہے کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ جب غالباً ۱۲۸۶ھ میں حج کو تشریف لے گئے ہیں۔ جبکہ دارالعلوم کو قائم ہوئے ابھی

تین سال ہوئے تھے۔ تو مولانا نے حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے مکہ مکرمہ میں عرض کیا کہ ہم نے دیوبند میں مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کیلئے دعا فرمائیے تو حاجی صاحبؒ نے جواب میں فرمایا:

> ’’سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحرگاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانقدر کو یہ سرزمین لے اڑی۔‘‘

(علمائے حق حصہ اول صفحہ ۷۱)

اسی قسم کی ایک اور بات علمائے حق کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ’’حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ قدس اللہ سرہ العزیز پنجاب کو جاتے ہوئے جب دیوبند سے گذرے تو جہاں دارالعلوم ہے وہاں کوڑیاں ڈالی جاتی تھیں۔ قریب ہی قیام فرمایا اور فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی بو آتی ہے۔‘‘ (صفحہ ۶۷ و ۷۲)

بہر حال دارالعلوم دیوبند کے مقام کی بلندی اس کے بانی کی رفعت شان پر دلالت کرتی ہے اور وہ ہیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

سعادت عظمیٰ:

مولانا کی یہ خوش بختی تھی کہ ان کی تحریک اور کوشش سے سرزمین دیوبند ایک بڑی سعادت کو لے اڑی۔ آپ کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ یہاں سے جس قدر عظیم الشان علما پیدا ہوئے جنہوں نے دنیائے اسلام کو اپنے کردار اور مجاہدانہ کارناموں سے روشن کر دیا۔ ان سب کی نیک بختیاں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حساب میں درج ہوتی رہیں گی کہ اس گلشن علم کے وہ باغبان ہیں۔

تحریک دارالعلوم کا پس منظر:

دوسری تحریکوں کی طرح تحریک دیوبند بھی ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک ہے جس کے بانی حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ۱۸۵۷ء میں

جبکہ سلطنت مغلیہ کا تختہ الٹا جا چکا۔ تو مسلمانوں کی ہزار سالہ سطوتیں خاک میں مل گئیں۔ علوم اسلامی کی سرپرستی کے سامان بظاہر ختم ہو گئے۔ چاروں طرف سے کفر کے سائے بڑھ رہے تھے۔ مسلمانوں کا وقار اور ان کی تہذیب مٹ رہی تھی۔ ان حالات میں حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانان دیوبند میں مدرسہ کی تحریک کی۔

ہم نے گذشتہ اوراق میں جہاد شاملی کے سلسلے میں حضرت قاسم العلوم کی جانبازانہ اور سرفروشانہ کوششوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بعد ازاں ان کی حرمین شریفین کو روانگی اور وہاں سے واپسی کا حال تحریر کر دیا ہے۔ وہاں سے حضرت نے کچھ عرصے کے بعد مطبع مجتبائی میرٹھ سے تصحیح کا تعلق قائم کر لیا اس لئے نانوتے سے میرٹھ اور میرٹھ سے نانوتے کے سر میں اکثر آپ کا قیام اپنی سسرال میں دیوبند رہتا۔ اہل دیوبند آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان میں چند ہستیاں ایسی تھیں جو دیوبند میں اپنی روحانی عظمت اور علمی و خاندانی وجاہت کے اعتبار سے بلند پایہ اور امتیازی مقام رکھتی تھیں۔ وہ تھے حاجی حافظ محمد عابدؒ یا حاجی عابد حسین صاحب اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب۔ یہ دونوں حضرات چھتے کی مسجد میں جو دیوان سے یعنی حضرت قاسم العلوم کی سسرال کے محل سے بالکل نزدیک ہے ملتے جلتے اور رفیق مسجد بنے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انہی دونوں حضرات سے محبت اور انس کا رشتہ استوار ہوا۔ بعد ازاں حلقہ قاسمی میں اور بھی آملے۔ منشی فضل حق صاحب اپنی غیر مطبوعہ سوانح مخطوطہ میں لکھتے ہیں:

> ”اس عہد قدیم (زمانہ ورود حضرت نانوتویؒ یعنی ۱۲۷۴ھ) کے مجمع کے خاص لوگ یہ ہیں۔ حاجی دیوان محمد یٰسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق صاحب عرف حافظ کلو۔ پیر جی ماجد علی صاحب، حاجی ظہور الدین صاحب، حکیم مشتاق احمد صاحب (ایک جگہ ذیل کے دو نام اور اضافہ کئے ہیں) شیخ منظور احمد صاحب، منشی نہال احمد صاحب۔“ (بحوالہ سوانح قاسمی جلد دوم صفحہ ۲۳۶)

لیکن ان حضرات کے علاوہ دو اور ممتاز ہستیوں میں ایک مولانا ذوالفقار علی صاحب شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن صاحبؒ کے والد ماجد جو کہ ہندوستان میں عربی کے مایہ ناز ادیب اور

دیوان متنبی، دیوان حماسہ، سبعہ معلقہ، قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد کے مترجم اور شارح جو انگریزی حکومت میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور پنشن لے کر دیوبند مقیم ہو چکے تھے۔ آپ شہر کے رئیس زمیندار ذی وجاہت، مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد اور دہلی عربک کالج کے فاضل تھے۔ ہم نے مستقل طور پر ان کے سوانح زندگی لکھے ہیں۔ جو ابھی تک طبع نہیں ہوئے۔

ایک اور ہستی جو اس حلقہ قاسمی میں آکر شامل ہوئی۔ وہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے والد بزرگوار مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دیوبندی تھے جو عربی کالج دلی کے فارغ التحصیل، مولانا مملوک علی صاحب کے شاگرد اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور وہ بھی پنشن لے کر دیوبند آچکے تھے۔ ہم نے ان کے حالات زندگی بھی قلم بند کیے ہیں جو انشاء اللہ تعالیٰ کسی وقت طبع ہوں گے۔

مذکورہ بالا حضرات میں سے بھی خصوصی ہستیاں حاجی محمد عابد صاحبؒ، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب تھے۔ رہے دوسرے حضرات وہ حضرت قاسم العلومؒ کے جان نثار تھے ان میں سے خاص طور پر حکیم مشتاق احمد صاحب جنہوں نے حضرت کیلئے دیوبند میں آپ کی زوجہ محترمہ کے نام مکان خرید کر رجسٹری کرادی۔ دوسرے دیوان محمد یٰسین ہیں جو آپ کے عاشق صادق اور مرید تھے اور جن کو دیوان اللہ دیا بھی کہا جاتا تھا۔ یہ حضرت قاسم العلومؒ کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے جن کی لڑکی سے قاسم العلوم نے اپنے صاحبزادے مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی شادی کی اور جو مولانا محمد طیب صاحب کی والدہ تھیں۔ ان کا ذکر مریدین کی فہرست میں پہلے آچکا ہے۔ حسب ذیل قطعہ تاریخ وفات حضرت شیخ الہندؒ نے انہی کی وفات پر لکھا ہے۔

قطعہ تاریخ وفات دیوان محمد یٰسین صاحب عرف خادم اللہ دیا خاص قاسم العلومؒ:

زاں چہ اندیشم کہ زیر خاک باشد جائے من   رفت چوں زیر زمیں قلب و سر اعضائے من
آں چناں رفتہ عزیزان و بزرگان زیر خاک   خاک افشانم کہ گردد جائے ایشاں جائے من

آں بزرگاں داغ دیگر بر دلم دارند حیف — کز ازل داغی از دشاں بود بر سیمائے من
آن عزیز انیکہ منزل در سویداو اشتند — ہست در سودائے شاں ایں شیون وسودائے من
چوں بگوش رفتگاں نتواں رسد بازم چہ سود — آسماں صحن قیامت شد گر از غوغائے من
بود باقی از گروہ اصفیا صاحب دلے — از سرم دامن کشاں بگذشت آں ملجائے من
آن نکوصورت کہ بودہ قلب(۱) قرآں نام او — واں نکو سیرت کہ بودہ ما من دماوائے من
جاں نثار و والہ و دلدادہ مخدوم(۲) من — مخلص و ممدوح و مخدوم و کرم فرمائے من

با زبان یاس اکنوں می سرایم نغمہ
ملجا ما مرد یعنی خادم مولائے من

۳۱ ھ ۱۳

ان اشعار سے دیوان محمد یٰسین صاحب کا جان نثار خادم ہونا واضح ہے۔ رہے حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے حالات یہ ہیں۔

---

(۱) یعنی یٰسین۔ کیونکہ سورہ یٰسین قرآن کریم کا قلب ہے۔ دیوان محمد یٰسین کی مناسبت مقصود ہے۔

(۲) مخدوم سے مراد حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ہیں۔ جن کے دیوان محمد یٰسین صاحب خادم تھے۔

ذکرِ خیر حاجی عابد حسین صاحب

آپ کو حاجی عابد حسین صاحب اور حاجی محمد عابد دونوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے کسی نے کوئی نام اور کسی نے کوئی نام لیا ہے۔ دیوبند کے ایک بزرگ سید جمعیت علی دیوبندی نے حاجی صاحب کے والد اور ان کا نام جامع مسجد دیوبند کی سعی تعمیر کے بارے میں اپنی مثنوی میں اس طرح تحریر کیا ہے۔

پیر جی عاشق علی کے نورِ عین
بانی مسجد ہوئے عابد حسین

بظاہر والد محترم نے عابد حسین نام رکھا تھا۔ لیکن اس نام کے معنی میں اہل علم کو کچھ شک نظر آتا ہے۔ جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا اصلی نام امداد حسین تھا۔ لیکن اس نام کو امداد اللہ میں بدل دیا گیا تھا۔ یہی صورت کچھ حاجی عابد حسین کے نام میں ہوئی ہے کہ ان کو محمد عابد کہا جانے لگا۔

پیدائش ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء:

آپ کی پیدائش ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں ہوئی۔ آپ حضرت قاسم العلوم سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے۔ آپ دیوبند میں خاندان سادات کے ایک ذی وجاہت، صاحب اثر، عابد و زاہد اور معزز و ممتاز ہستی تھے۔ آپ کی بزرگی کا سکہ دیوبند کے ہر خرد و کلاں، مرد اور عورت، بچے اور بوڑھے کے دل پر تھا۔ آپ کے روحانی فیض نے دیوبند اور اطراف و جوانب بلکہ دوسرے صوبوں کے لوگوں کے دلوں کو بھی مسخر کر رکھا تھا۔ عابد و زاہد ہونے کے باعث بہت بڑے عامل بھی تھے۔ آپ کے تعویذ اور گنڈوں کا دور دور چرچا تھا۔ نہ صرف چرچا بلکہ در حقیقت ان کا روحانی فیض اور تعویذوں کا اثر ہر قسم کے بیماروں پر تریاق کا کام کرتا۔ جب کسی

بچے کو تکلیف ہوتی، عورتوں کو ان کے تعویذ کی طرف توجہ ہوتی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کوئی عورت جو اپنی کسی عزیز کے پاس آکر مہمان ہوئی تو دیوبند میں اس کے بچے کو کچھ تکلیف ہوگئی۔ اس پر میزبان عورت نے کہا "منگاؤں حاجی صاحب کا تعویذ" غرضکہ ان کے تعویذ میں بڑی برکت تھی۔

حاجی صاحب کے پیر و مرشد:

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم تو نہ تھے لیکن فارسی وغیرہ کی تعلیم سے بہرہ مند تھے۔ البتہ اس دور میں روحانیت کا چرچا عام تھا۔ اس لئے اس طرف توجہ زیادہ تھی۔ آپ کے سلسلہ بیعت کے متعلق سوانح مخطوطہ کے حوالے سے سوانح قاسمی کے مصنف مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

> "حاجی صاحب جن کو نوعمری ہی سے باطنی معرفت اور سلوک کا شوق تھا۔ سوانح مخطوطہ (از فضل حق دیوبندی) کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتی طریقے کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میانجی کریم بخش تھا رام پور منہاران کے رہنے والے تھے ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے۔ کسب وسلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت طے کئے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میانجی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ:
>
> "(سید عابد حسین صاحب) جناب میانجی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رامپوری چشتی کے خلیفہ ہیں۔ اہل دیوبند کو آپ سے (یعنی سید عابد صاحب سے) کمال درجہ عقیدت ہے۔"

(سوانح مخطوطہ از منشی فضل حق بحوالہ سوانح قاسمی از مولانا گیلانی صفحہ ۲۳۸۔۲۳۹)

حاجی صاحب کو حاجی مہاجر مکی سے خلافت کا حصول:

یہ بات بھی تحقیق اور یقین کے درجے میں ہے کہ ۱۲۸۴ھ میں جب حاجی محمد عابد صاحب حج کو تشریف لے گئے تو انہوں نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکہ سے مکہ مکرمہ بیعت کی اور ۱۲۹۸ھ میں انہیں حاجی صاحب سے خلافت ملی۔

آگے چل کر حاجی محمد عابد صاحبؒ کے کمالات روحانی کے متعلق لکھتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''ان میں ادنیٰ (کمال) تعویذ و گنڈہ ہے جس کے سبب اہل دیوبند اور نواح دیوبند کے ہر قسم کے دکھ درد ولدر دور ہوتے ہیں۔ دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی بچہ ایسا ہوگا جس کے گلے میں آپ کا (یعنی حاجی سید محمد عابد صاحب کا) تعویذ نہ ہوگا۔ اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی جن کے بازو پر آپ کا نقش نہ ہو۔ آپ کا مطب (تعویذی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا ہے۔ خصوصاً وبائی و موسمی امراض میں غربا علاج کم کرتے ہیں۔ آپ ہی کے تعویذوں پر قناعت کرتے ہیں۔ آپ کی ذاف فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہے۔ غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد ہیں۔'' (سوانح مخطوطہ بحوالہ سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۲۳۹۔۲۴۰)

حاجی محمد عابد صاحب کا تقویٰ اور پابندی نماز با جماعت:

علمائے حق کے مصنف مولانا محمد میاں صاحب نے حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری (بجنوری) دیوبند کے یکتائے روزگار و مناظر کی زبانی لکھا ہے کہ:

> ''ایک روز آپ (حاجی محمد عابد صاحب) کو بہت رنجیدہ دیکھا گیا۔ کبیدگی اور افسردگی کی یہ حالت تھی کہ کسی نوجوان عزیز کی مرگ ناگہانی کا شبہ ہوتا تھا۔ سبب دریافت کیا گیا تو بہت زیادہ اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال کے بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی۔'' (علمائے حق حصہ اول صفحہ ۶۵)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب اپنی مثنوی زیر و بم کے حسب ذیل اشعار میں سے پہلے شعر میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کے معاملات میں حاجی صاحب کو شریک مشورہ کئے جانے اور آپ کی درویشی وغیرہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

ہم شریک مشورہ اے نور عین ہست حضرت حاجی عابد حسین
عالم کامل، ولی، مرد خدا پائے او بر پائے فخر انبیا

ہم جمالی، ہم جلالی شان او کان حلم و مخزن خلق نکو
نقش تعویذش مثال نقش قدر فیض او برخاص و عامی مثل بدر

تعمیر جامع مسجد دیوبند کا عظیم الشان کارنامہ:

آپ کے جہاں اور کارنامے ہیں۔ انہی میں سے دیوبند کی عالی شان جامع مسجد کی تعمیر میں شبانہ روز کی محنت ثروہی اور ولولہ تکمیل جامع ہے۔ یہ مسجد ہندوستان کی عظیم الشان مسجدوں میں سے ایک خاص رفیع الشان مسجد ہے۔ جس کی شان دیکھنے ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب۔ حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

حاجی صاحب کے دوسرے صفات:

”آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ پابندی وضع استقلال طبع، اولوالعزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے۔“

صائب رائے حاجی صاحب:

آپ کی اصابت رائے کے متعلق منشی فضل حق صاحب لکھتے ہیں:

”باوجودیکہ (حاجی محمد عابد صاحب نے) دنیا کو ترک کردیا۔ مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے تو اس میں بھی ایسی اچھی صائب رائے ہوتی ہے جیسے بڑے ہوشیار دنیادار کی۔“

طالب علم سے معافی:

ایک دفعہ مدرسے کے کسی طالب علم اور حاجی صاحب میں رنجش پیدا ہوگئی۔ طالب علم نے حاجی صاحب کو کچھ سخت وسست بھی کہہ دیا تھا۔ وہ طالب علم کسی مسجد میں رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ حاجی عابدؒ صاحب اسی مسجد میں گئے اور پھر کیا دیکھا گیا کہ:

”حاجی صاحب (طالب علم کے سامنے) ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا

معاف کردیجئے آپ نائب رسول ﷺ ہیں۔ آپ کا ناراض رکھنا مجھے گوارا نہیں۔"

(ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۶۹)

اہتمام دار العلوم دیوبند:

دار العلوم دیوبند کے آغاز ۱۲۸۳ھ اور پھر ۱۲۸۶ھ ۱۲۸۷ھ اور بعد ازاں ۱۳۰۶ھ سے ۱۳۰۹ھ متفرق اوقات میں سات سال دار العلوم کے مہتمم رہے۔

حج اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بیعت:

بنائے دار العلوم کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد آپ ۱۲۸۴ھ میں حج کیلئے تشریف لے گئے۔ اسی سفر میں آپ نے حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ جیسا کہ مکتوبات امدادیہ میں ہے۔ اور حاجی صاحب نے آپ کی اصلاح اور منزل سلوک کیلئے حضرت قاسم العلوم کو متوجہ کیا ہے۔

وفات:

آخر یہ درویش ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء کو ۸۱ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ایک ولی کامل دنیا سے اٹھ گیا۔

ذکرِ خیر حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ

رفقائے قاسمی میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب اولیائے کرام اور صاحب کشف بزرگوں میں سے تھے۔ آپ کا تقویٰ، دیانت، روحانیت، وقار اور دیگر اوصاف دیوبند بھر میں مشہور تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ کے رفقا میں وہ قابل فخر بزرگ تھے۔ ان کی اصابت رائے، تدبر، سلیقہ، سلامت روی، امور انتظامیہ میں مہارت ترکِ دنیا اور زُہد، ریاضت وعبادت کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔

پیدائش:

آپ ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے۔ گویا حضرت قاسم العلومؒ سے عمر میں چار سال چھوٹے تھے۔ افسوس کہ ان کی تحصیل علم کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور ان سے خلافت ملی۔ حضرت مفتی مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ انہی مولانا رفیع الدین صاحب سے بیعت تھے۔

کہتے ہیں کہ علم میں زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ لیکن انتظامی معاملات میں بہت زیادہ دسترس اور کمال حاصل تھا۔ ان کا شمار اولیائے کرام میں ہوتا تھا۔

اہتمام دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء:

آپ دو مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بنائے گئے۔ جیسا کہ دارالعلوم دیوبند کی سالانہ رپوٹوں سے واضح ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء اور ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں جب حاجی محمد عابد صاحبؒ حرمین شریفین کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ بعد ازاں تین سال کے بعد ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں مستقل مہتمم بنادئے گئے۔ کیونکہ

حاجی صاحب جامع مسجد دیوبند کی تعمیر کے اہتمام میں بہت مصروف رہتے تھے۔ بہرحال ۱۲۸۸ھ سے ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء کے اوائل تک آپ اہتمام کے عہدے پر تقریباً اٹھارہ انیس سال فائز رہے۔

ترقی دارالعلوم اور تعمیرات:

آپ کے عہد بابرکت میں دارالعلوم نے تعمیری اور تعلیمی بہت ترقی کی۔ چونکہ آپ کا حسن انتظام اعلیٰ درجے کا تھا۔ اس لئے ترقی ہونا مسلم ہے۔ دارالعلوم کی ابتدائی تعمیری ترقیات آپ ہی کے زمانے میں ہوئیں۔

نودرے کی درسگاہ کی تعمیر اور پختگی آپ کی فن تعمیر سے باخبری کی واضح دلیل ہے یہ درسگاہ اپنی شان کے اعتبار سے نرالی درسگاہ ہے۔

نودرے کی بنیاد ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں جب کھدوائی گئی تو آپ نے ایک خواب دیکھا کہ:

> ”آنحضرت ﷺ نودرے کی درسگاہ کے تجویز کردہ مقام پر تشریف فرما ہیں اور مولانا رفیع الدین صاحب سے فرما رہے ہیں کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے۔ یہ فرمایا اور عصائے مبارک سے احاطہ اور عمارت کا نقشہ کھینچ کر بتایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔“

مولانا صبح کو جو اٹھے تو خواب کے مطابق نشانات ملے۔ چنانچہ انہی نشانات کے مطابق نودرے کی درسگاہ تعمیر کی گئی۔

اس خواب سے بارگاہ نبوت میں دارالعلوم کی مقبولیت کا صاف پتہ چلتا ہے اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے مقام بلند کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ، مولانا رفیع الدین صاحب کے متعلق اپنی مثنوی زیر و بم میں تحریر فرماتے ہیں۔

آنکہ ساز و مدرسہ را اہتمام ہست مولانا رفیع الدین نام
عقل کامل دارد و رائے صواب عقل اول ہست شاگرد جناب
خُلق چوں خُلق عظیم انبیا طالب راہِ خدا را پیشوا
رہنمائے غادیان و گمرہاں ہادی را خدائے مستعاں

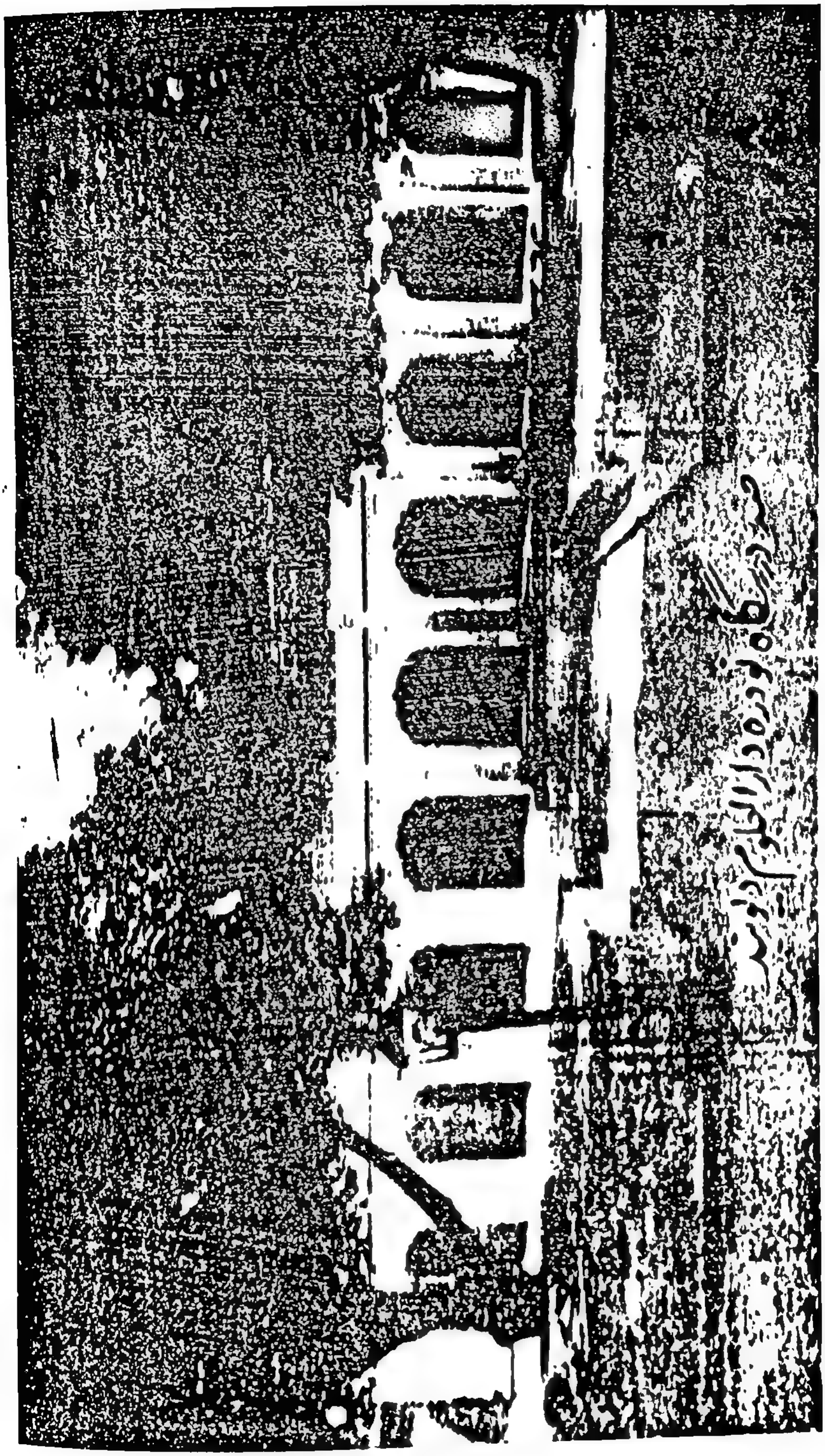

درسگاہ دورہ دارالعلوم دیوبند

حج اور وفات:

مولانا رفیع الدین صاحب پہلی مرتبہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں حرمین شریفین کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے اور پھر واپس تشریف لے آئے۔ بعد ازاں ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں دوبارہ مدینہ منورہ کی ہجرت کی نیت سے حجاز کو تشریف لے گئے اور دو سال کے بعد وہیں ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں وفات پا گئے۔ اور اپنے شیخ شاہ عبدالغنی بن شاہ سعید دہلوی مجددی کے متصل قبہ عثمانی کے باہر دفن ہوئے۔

(ماخوذ از تاریخ دیوبند مولانا سید محبوب رضوی و مثنوی زیر و بم حضرت تھانوی و تذکرۃ الخلیل مولانا عاشق الٰہی میرٹھی و روئداد مدرسہ دیوبند)

دار العلوم دیو بند کے عناصر اربعہ

الغرض دار العلوم دیو بند کے یہی چار خاص عناصر ہیں۔ یعنی محرک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ ہیں اور حاجی محمد عابد صاحبؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین ان کی تحریک پر عمل کرنے والے اور بقیہ سب حضرات رفقائے مجلس۔

محرک:

حضرت مولانا محمد طیب صاحب کو دار العلوم دیو بند کی بنیاد کے بارے میں دیو بند کے ایک اسی سالہ بزرگ منشی محمد فائق صاحب محلہ خانقاہ دیو بند سے ایک بیان ملا ہے۔ جو الفرقان بابت ماہ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا ہے۔ یہ بیان منشی محمد فائق صاحب نے جناب مولانا محمد طیب صاحب کے دریافت کرنے پر ۱۴ محرم ۱۳۵۶ھ کو دیا تھا۔ منشی صاحب موصوف ان لوگوں میں سے ہیں۔ جن کے سامنے دار العلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ بیان حسب ذیل ہے۔

بیان منشی محمد فائق صاحب:

دار العلوم کے آغاز و افتتاح کا واقعہ اس طرح ہے کہ مولوی عبد الرب صاحب واعظ دہلوی نے اہل دیو بند کو اپنے ایک وعظ میں ترغیب دی کہ وہ دیو بند میں جامع مسجد تعمیر کریں اور اپنے پُر اثر بیان سے چندے کی تحریک بھی کر دی۔ چنانچہ مجلس وعظ ہی میں سات آٹھ سو روپیہ جمع ہو گیا اور قریباً اسی قدر رقم کے مزید وعدے بھی ہو گئے۔ اس وقت یہ رقم بطور امانت رکھی گئی اور یہ طے پایا کہ حضرت (مولانا محمد قاسم صاحب) نانوتویؒ

جب نانوتے سے دیوبند تشریف لائیں تو جامع مسجد کی جگہ کا انتخاب حضرت کے مشورے سے کیا جائے۔ تین چار ماہ کے بعد حضرت کی تشریف آوری ہوئی تو شیخ کرم نبی وغیرہ دس بارہ عمائد شہر چھتے کی مسجد میں جمع ہوئے۔ میں خود بھی اس مجلس میں موجود تھا لوگوں نے واقعہ عرض کیا اور رقم سامنے رکھ دی۔ فرمایا کہ بھائی تمہارے قبضے میں سو سے اوپر مسجدیں ہیں۔ اگر اب جامع مسجد نہ بھی ہو تو کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے۔ اس پر لوگوں کو کچھ مایوسی ہوگئی کہ شاید حضرت کا منشا جامع مسجد بنوانے کا نہیں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حضرت منشائے مبارک کو ذرا اور واضح فرمایئے۔ پھر یہی فرمایا کہ اگر جامع مسجد شہر میں نہ ہو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ پھر لوگوں نے کہا کہ حضرت جو منشائے مبارک ہو صاف ارشاد فرمایئے۔ ہم سب خدام تعمیل کیلئے موجود ہیں۔ فرمایا کہ بھائی دیوبند میں مسجدیں تو بہتیری ہیں اگر ایک مسجد اور بڑھائی تو کیا ہوا۔ کوشش اس کی کرو کہ احکام الٰہی بتلانے والے بن سکیں۔ جن سے مسجد کی بھی آبادی ہے اور دین کی بقا بھی ہے۔ اور میرا مطلب یہ ہے کہ مسجد تو خیر بناؤ یا نہ بناؤ لیکن آج سب سے بڑی ضرورت مدرسہ بنانے کی ہے کہ دین کے مبلغ پیدا ہوں۔ اس پر سب نے عرض کیا کہ سبحان اللہ اس سے بہتر کیا بات ہے۔ پھر حضرت اس کو قائم فرما دیجئے۔ ہم سب ارشاد کی تعمیل کریں گے قضاء و قدر سے اسی دن ملا محمود صاحب جو غالباً میرٹھ میں ملازم تھے اور پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی رخصت یا تعطیل میں دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے بلائے گئے اور حضرت نانوتویؒ نے فرمایا:

ملا صاحب آپ کو وہاں کیا تنخواہ ملتی ہے فرمایا کہ ۱۵ روپیہ۔ فرمایا اگر ہم یہاں ہی آپ کو پندرہ دیں؟ فرمانے لگے حضرت یہاں کے تو دس بھی مجھے کافی ہیں۔ فرمایا کہ بس آج سے آپ کی پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔ آپ پڑھانا شروع کر دیں اور چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے اسی دن مدرسے کا آغاز کر دیا گیا۔ اور جب ہی مدرسے کیلئے مکان موجودہ منشی رفیق احمد صاحب چکی والے کا انتخاب کرلیا گیا (منشی محمد فائق صاحب نے فرمایا) کہ بھائی یہ بنا کا قصہ میرے سامنے کا ہے۔ پھر جب مدرسے

کیلئے زمین لی گئی اور تعمیر کی رائے ہوئی تو اکابر کا مجمع تھا۔ ہزار ہا آدمی بیرونی اور مقامی جمع تھے۔ سب نے حضرت پر اصرار کیا کہ جب آپ ہی نے یہ بات اٹھائی ہے تو آپ ہی پہلی اینٹ بھی رکھیں۔ چنانچہ حضرت نے آگے بڑھ کر اینٹ ہاتھ میں لی۔ اور اپنے ساتھ ہی حضرت میانجی منے شاہ صاحب کے ہاتھ سے (جو دیوبند کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ انوار) اینٹ رکھوائی اور پھر خود رکھی۔ پھر اور سب بزرگوں نے رکھی۔

(منشی) محمد فائق محلہ خانقاہ دیوبند — المصدق
۱۴ محرم ؁۱۳۵۶ھ — احقر محمد طیب غفرلہٗ
مہتمم دارالعلوم دیوبند

بیان پر تبصرہ:

۱۔ اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ دیوبند کی موجودہ جامع مسجد کی تعمیر کے محرک مولانا عبدالرب صاحب دہلوی تھے پھر تاریخی حالات سے معلوم ہوا کہ حاجی محمد عابد صاحب نے جامع مسجد بنوانے میں عملی قدم اٹھایا۔

۲۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند کی تحریک حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے کی اور اہل دیوبند نے اس کی طرف عملی قدم اٹھایا جس میں حاجی محمد عابد صاحب پیش پیش تھے۔ اور مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب ان کے شریک کار تھے۔ بایں معنی محرک ہی بانی مدرسہ اور موسس مدرسہ ٹھہرے۔

منشی فضل حق صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان:

منشی محمد فائق کے بیان سے یہ تو معلوم ہو چکا کہ دوران قیام دیوبند ؁۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے بعد حضرت قاسم العلومؒ کے دماغ میں اسلامی مدرسے کا تخیل اندر ہی اندر پک

رہا تھا۔ چنانچہ اس کام کے لئے دیوبند میں حضرت قاسم العلومؒ کی نظر حاجی محمد عابد صاحب پر پڑی اور ان کو قیام مدرسہ کیلئے آمادہ کیا۔ حاجی محمد عابد صاحب پر اس کا جو ردِ عمل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جو سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے لکھا ہے کہ:

> ''ایک دن بوقت اشراق سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپیہ اپنے پاس سے ڈال چھتے کی مسجد میں تن تنہا (حاجی محمد عابد صاحب) مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم کے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپیہ عنایت کئے اور دعا کی اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب (علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے والد) نے اور چھ روپیہ اس مسکین (یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب دیوبندی) نے دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں۔ فوراً بارہ روپیہ دیئے اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی دیوبندی (مولوی ممتاز علی رسالہ تہذیب النسواں کے بانی کے والد اور سید امتیاز علی تاج کے دادا) وہاں موجود تھے۔ ان کی طرف سے بھی بارہ روپیہ عنایت کئے گئے۔ وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب) محلہ ابوالبرکات میں پہنچے۔ (وہاں سے) دو سو روپیہ جمع ہو گئے اور شام تک تین سو روپے۔ پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں۔ یہ قصہ بروز جمعہ دوم ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا اور مدرسہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا۔'' (بحوالہ سوانح قاسمی گیلانی جلد دوم صفحہ ۲۵۹)

حاجی نذیر احمد مصنف تذکرۃ العابدین کا تاسیسی تاریخی بیان دار العلوم کے متعلق:

حاجی نذیر احمد مصنف تذکرۃ العابدین حاجی محمد عابد صاحب کے متعلق مدرسے کے لئے چندے کے حاصل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اگلے روز حاجی (عابد حسین) صاحب نے مولوی محمد قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا کہ

> آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آئے۔ فقیر نے یہ صورت (فراہمی چندہ) اختیار کی ہے۔" (تذکرۃ العابدین صفحہ ۶۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

اس خط میں جہاں حاجی صاحب نے حضرت قاسم العلومؒ کو دیوبند آنے اور مدرسے میں پڑھانے کی دعوت دی تھی۔ وہاں حسب ذیل مضمون بھی تھا۔ جس کو حضرت الاستاذ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند نے قلمبند کیا تھا۔ حضرت مولانا بلیاوی تحریر فرماتے ہیں:

> "حاجی عابد حسین صاحب کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد صاحب کے پاس بچشم خود دیکھا ہے اور مجھے اس کا مضمون بجنسہ قریب قریب اسی کے الفاظ میں پوری طرح محفوظ ہے۔ اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا (نانوتوی) مرحوم کو لکھا ہے کہ وہ جو آپ کے ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک ایک سوال پوچھنے کیلئے سہارنپور آدمی بھیجنا پڑتا ہے فقیر کے دل میں ایک دم خیال آ گیا اور چندے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپیہ ہو گئے۔ اب آپ تشریف لے آئے۔"

(بحوالہ سوانح از گیلانی صفحہ ۲۵۰ جلد دوم)

خط سے اس قدر معلوم ہوا کہ مدرسے کے لئے حاجی محمد عابد صاحب نے چندہ کر لیا ہے لیکن ابھی مدرسے کا افتتاح نہیں ہوا۔ حاجی صاحب کے خط کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کے الفاظ تذکرۃ العابدین کے مصنف نے حسب ذیل پیش کئے ہیں:

> "مولوی محمد قاسم صاحب نے جواب لکھا کہ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپیہ ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ وہ پڑھا دیں گے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔" (تذکرۃ العابدین صفحہ ۶۹)

معلوم ہوا کہ جہاں تک چندہ کرنے کا تعلق تھا وہ تو حاجی محمد عابد صاحب نے کیا۔ لیکن مدرس کا انتظام حاجی صاحب سے مشورہ لئے بغیر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے خود

کیا۔ اور ملا محمود صاحب دیوبند کو (جو اس زمانے میں میرٹھ میں تھے اور حضرت مولانا بھی مطبع مجتبائی منشی احمد علی کے چھاپہ خانے میں تصحیح کتب پر ملازم تھے) دیوبند بھیج دیا اور مدرسے کی ترقی میں سعی وکوشش کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر رکھی۔ اس طرح کی خود اختیاری سے پتہ چلتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس میں در پردہ دست قاسمی کام کر رہا تھا۔ ورنہ حضرت نانوتوی کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ آپ نے مدرسے میں پڑھانے کیلئے مجھے بلایا ہے۔ لیکن میں نہیں آ سکتا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ملا محمود صاحب کو بھیج دوں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

حاجی محمد عابد صاحبؒ اور حضرت نانوتویؒ کے تبادلہ خطوط کی دستاویزات سے منشی محمد فائق کا بیان مجروح ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو آپ نے گذشتہ صفحات میں پڑھا ہے حاجی صاحب نے جو یہ فرمایا کہ آپ کے اور ہمارے درمیان جو مدرسے کے اجرا کے بارے میں تذکرہ ہوا کرتا تھا تو اس کیلئے ایک دم میرے دل میں خیال آ گیا تو دراصل یہ خیال چندہ کرنے کا خیال آیا ہے۔ تاسیس مدرسے کا خیال تو حضرت قاسم العلومؒ نے پیدا کیا تھا۔ حاجی صاحب کے اسی خیال کی ترجمانی مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کے الهدیۃ السنیۃ کی حسب ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:

> **لما اراد الله تعالىٰ شانه وعز سلطانه خير هذه البلاد وارشاد العباد باحياء العلوم الدينية والفنون اليقينية اذ عانا و تصديقا و ايقانا و تحقيقا الهم السيد النسيب الجليل والشريف الحسيب النبيل، السيد الاجل محمد عابد. بتاسيس هذه المدرسة التى اسست على التقوى. فندب السيد اهل الخير الى اعانة هذه المثوبة وتائيد هذه المشورة سنة اثنين و ثمانين بعد الالف والمائتين من هجرة سيد الثقلين صلى الله عليه وعلى اله وسلم و عظم و كرم فاستمعوله وانتدبوه واجابوه واتبعوه.**

”جب اللہ تعالیٰ شانہ وعز سلطانہ نے ان شہروں کی بھلائی اور علوم دینیہ اور فنون یقینیہ کے زندہ کرنے کے ذریعے ان شہروں کی بھلائی کا ارادہ کیا۔ تو سید بزرگ نسب اور

> شریف حسب بزرگ سید (حاجی) محمد عابد صاحب کے دل میں اس مدرسے کی بنا کیلئے جس کی بنیاد تقوے پر رکھی گئی ہے۔ خیال پیدا کر دیا۔ چنانچہ سید صاحب نے اہل خیر لوگوں کو اس کار خیر میں چندہ دینے اور مشورے سے مدد دینے کی طرف ۱۲۸۲ھ میں دعوت دی۔ چنانچہ اہل خیر نے ان کی دعوت پر کان دھرا اور ان کی آواز پر لبیک کہا۔ اور ان کے پیچھے لگ گئے۔" (ہدیہ سنیہ صفحہ ۲ مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۰۷ھ)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دار العلوم دیوبند اپنی تالیف کردہ سوانح قاسمی میں بنیاد مدرسہ کے متعلق حسب ذیل الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ وہ ۱۲۸۳ھ کا زمانہ تھا۔ جبکہ مولانا محمد یعقوب صاحب بھی مطبع مجتبائی میرٹھ میں حضرت قاسم العلومؒ کے ساتھ تصحیح کتب میں منسلک تھے۔ لکھتے ہیں:

> "وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی ذوالفقار علی صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔ مدرس کے لئے تنخواہ پندرہ روپیہ تجویز ہوئی اور چندہ شروع ہوا چند ہی روز گذرے کہ چندے کو افزونی ہوئی اور مدرس بڑھائے گئے اور مکتب فارسی اور حافظ قرآن مقرر ہوئے۔ اور کتب خانہ جمع ہوا۔
>
> مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسے میں دیوبند آئے۔ اور پھر ہر طرح اس مدرسے کے سرپرست ہوئے۔ مدرسے کے احوال لکھنا یہاں طول لاطائل ہے۔ سالانہ کیفیتوں سے یہ سب امر واضح ہو جاتے ہیں۔"

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ حاجی محمد عابد صاحبؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی تجویز پر مدرسہ دیوبند کی ابتدا ہوئی۔ حالانکہ مولانا ذوالفقار علی صاحب نے ہدیہ سنیہ میں لکھا ہے کہ حاجی صاحب کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجویز مدرسہ کا الہام ہوا۔ اس لئے یہاں بھی روایت میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ پھر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے حضرت قاسم العلومؒ کو آغاز مدرسہ سے ہر طرح اس مدرسے کا سرپرست ہونا ظاہر کیا ہے۔ ہر طرح کا لفظ مدرسے پر تمامی تصرفات کا احاطہ رکھتا

ہے۔ آخر اگر مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس کے محرک اور مجوز نہ تھے تو ہر طرح مدرسے کی سرپرستی کا ظہور کیسے ہوا۔ دراصل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے قاسمی تجویز پر دھیان نہ دیتے ہوئے ان لوگوں کا نام تجویز مدرسہ میں لکھ دیا ہے جنہوں نے تحریک قاسمی کو عملی جامہ پہنانے کی طرف قدم اٹھایا تھا۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا گرامی نامہ اور بانیان مدرسہ:

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ دیوبند کے متعلق جب اطلاع دی گئی تو وہ اپنے مکتوب بنام مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ میں تحریر فرماتے ہیں:

> واز اجرائے مدرسہ علم دین بسعی آں عزیزاں و عزیزم حافظ عابد حسین صاحب چہ خوشی ہا رو نمود کہ بہ بیان نمی آید۔ خدا تعالیٰ ایں امر خیر را مدام جاری داد و ساعیان و باعثان ایں را جزاء خیر دہاد۔ (مرقومات امدادیہ صفحہ ۲۴۸ ضمیمہ امداد المشتاق)
>
> اور آپ عزیزوں اور عزیزم حافظ عابد حسین کی کوشش سے دینی مدرسے کے اجراء سے بہت ہی زیادہ خوشیاں ہوئیں۔ کہ بیان سے باہر ہیں اللہ تعالیٰ اس کارِ خیر کو ہمیشہ جاری رکھے۔ اور کوشش کرنے والوں اور جو اس مدرسے کے باعث ہیں۔ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس مکتوب گرامی میں بھی مولانا محمد قاسم صاحب اور حاجی حافظ محمد عابد صاحبؒ بلکہ مولانا محمد یعقوبؒ بھی اجرائے مدرسہ میں شامل نظر آتے ہیں۔ یہ مکتوب ۱۲۸۳ھ کا ہے۔ اسی سال مولانا ذوالفقار علی صاحب حج کو تشریف لے گئے تھے۔ غالباً انہی سے اجرائے مدرسہ کا حال معلوم ہوا ہے۔ حاجی صاحب اسی خط میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو لکھتے ہیں:

> مولوی ذوالفقار علی صاحب داخل سلسلہ بزرگان شدند مگر بہ سبب عدم فرصت و کم قیام و سفر مدینہ منورہ وغیرہ ہیچ کردن نتوانستند لہٰذا بآں عزیز حوالہ کردہ می آیند۔ بر حال شاں توجہ مرعی دارند و از تعلیم و تلقین دریغ ندارند۔
>
> مولوی ذوالفقار علی صاحبؒ بزرگوں کے سلسلے میں بیعت کر کے داخل ہوئے۔ لیکن

عدیم الفرصتی اور تھوڑے سے قیام اور سفر مدینہ منورہ (علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام) کچھ نہ کر سکے۔ لہٰذا آں عزیز کے حوالے کئے جاتے ہیں۔ ان کے حال پر توجہ رکھیں اور تعلیم و تلقین سے دریغ نہ کریں۔

مدرسہ دیوبند کیلئے سب سے پہلے چندہ دینے والا:

گذشتہ صفحات میں آپ نے منشی فضل حق صاحب کی زبانی سنا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے سوانح مخطوطہ میں لکھا ہے کہ ایک روز صبح کو اشراق کے وقت سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپیہ اپنی طرف سے ڈال کر حاجی محمد عابد صاحب مولانا مہتاب علی صاحب کے پاس گئے (وہی مولانا مہتاب علی صاحب جو شیخ نہال احمد کے مکتب میں پڑھایا کرتے تھے اور حضرت نانوتوی نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی تھی) اور انہوں نے چھ روپیہ عنایت فرمائے۔ اب مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی سنئے وہ فرماتے ہیں کہ چھتے کی مسجد میں چندہ ہونا شروع ہوا۔ حاجی محمد عابد صاحب رومال بچھا کر بیٹھ گئے اور سب سے پہلے انہوں نے چندہ دیا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی ایک نظم میں جو حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد ۱۲۹۸ھ کے جلسہ تقسیم انعام دارالعلوم میں پڑھی تھی۔ ایک شعر یہ بھی لکھا تھا ۔

مرد حق عابد صداقت کیش
اولیں گستر اند رومالش

اور اس کا ایک مصرع یہ بھی تھا ۔

چیزے از طیبات اموالش

باقی نظم کا پتہ نہیں۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ چندے کیلئے سب سے پہلے حاجی صاحب نے رومال بچھایا اور اپنے پاکیزہ مال سے کچھ دیا۔ لہٰذا منشی فضل حق صاحب کی وہ روایت کہ جھولی لے کر چلے۔ اور پہلے اپنے تین روپیہ ڈالے یہ بھی مجروح ہو گئی۔

آگے چل کر مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک شعر یہ کہا تھا ۔

لیک ایں طائر ہمایوں فال
شد ز قاسم عطا پرو مالش

یعنی حاجی محمد عابد صاحب کے بازو اور پر خواہ روحانی ہوں یا دار العلوم کی سعی کے بارے میں تو وہ حضرت قاسم العلومؒ نے لگائے ہیں۔ گویا قاسم العلوم کے بغیر حاجی صاحب بے پروبال تھے۔ اور ہم حضرت نانوتوی کے سلسلہ رشد و ہدایت میں لکھ چکے ہیں کہ ۱۲۸۴ھ میں جب حاجی محمد عابد صاحب حج کو گئے تو حاجی امداد اللہ صاحب علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر انہوں نے بیعت کی اور پھر مرشد کامل نے حاجی محمد عابد صاحب کی روحانی تکمیل مولانا محمد قاسم صاحب کے حوالے فرمائی بہر حال حاجی محمد عابد صاحب کو حضرت نانوتوی نے پروبال بخشے اور اسی لئے تجویزیں اور احکام مربی روحانیت قاسم العلومؒ کے ہوتے تھے اور تعمیل احکام حاجی محمد عابد صاحب کی طرف سے ہوتی تھی۔ انہی روحانی پروبال کا نتیجہ ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی طرف سے حاجی محمد عابد صاحب کو ۱۲۹۸ھ میں خلافت حاصل ہوئی۔

حضرت قاسم العلومؒ نے دار العلوم دیوبند کو دار العلوم بنایا:

مولانا ذوالفقار علی صاحب ہدیہ سنیہ میں حاجی محمد عابد صاحب کی ان مساعی کے بعد اور چندہ وغیرہ فراہم کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ثم قیض اللہ سبحانہ لترصیص الامر المعلوم واحیاء العلوم الشیخ الاکبر الازھر الاطھر الشیخ العارف الولی اباالھاشم مولانا المولوی محمدن القاسم، فریش ذالک الشیخ الماجد السید محمد عابد، وکم من مدارس طبعت علی مثالھا و نسبحت علی منوالھا۔ کل ذالک ببرکات انفاس مولانا قاسم الخیر و قاصم الضیر و من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر منعمل بھا وللباقیات الصالحات خیر عندربک ثوابا و خیر املاً

پھر اللہ پاک نے علوم کو زندہ کرنے اور مدرسہ کو مستحکم کرنے کے لئے شیخ اکبر و ازہر و اطہر شیخ عارف ولی ابوالہاشم مولانا مولوی محمد قاسم صاحبؒ کو مقدر فرمایا۔ انہوں نے شیخ بزرگ سید محمد عابد کر پروبال عنایت کئے۔ اور کتنے ہی اور مدارس مدرسہ دیوبند جیسے جاری کئے گئے اور اس کے طریقے پر قائم کئے گئے۔ یہ سب مولانا قاسم الخیر اور نقصان

کے دافع کے انفاس طیبہ کی برکتوں کے سبب سے ہوئے۔ اور جس نے اسلام میں سنت حسنہ جاری کی تو اس کیلئے اس کا اجر ہے اور جس نے اس پر عمل کیا اس کا بھی اجر ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں ثواب اور نیکی کی امید پر آپ کے رب کے نزدیک بہتر ہیں۔

(ہدیہ سنیہ فی تذکرۃ المدرسۃ الاسلامیہ الدیوبندیہ صفحہ ۲۔۳)

قاسم العلوم کا لقب:

مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ کی عبارت میں ریش نے وہی بات ادا کی ہے جو مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے "شدز قاسم پروبالش" میں فرمائی۔ بلکہ آگے ترقی فرما کر یہ بھی ظاہر فرمایا کہ کتنے ایک مدارس عربی جو دارالعلوم دیوبند کے نمونے پر قائم کئے گئے۔ ان سب کے بانی حضرت قاسم العلوم ہی ہیں اور اسی۔ لئے مولانا کو قاسم العلوم کہا جانے لگا۔

حضرت قاسمؒ اور تاسیس دارالعلوم:

ایک محقق کیلئے تمام اقوال کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا تحقیق کی روح اور اس کا حق ادا کرنا ہوتا ہے۔ خود حضرت مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ کی بنائے مدرسہ سے متعلق وہ تقریر پڑھئے جو آپ نے ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۴ء کو دیوبند کی جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ فرمائی۔ اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

> "مگر سب دور نزدیک کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسے کی بنا دیوبند والوں نے ڈالی۔ اس امر میں وہ سب کے امام ہیں۔ ہر چند اور باہر کے صاحب اس کار خیر میں شریک ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں ہی کا طفیل ہے اور اس وجہ سے اگر یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کار خیر کا ثواب ملے گا۔ اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو عین مطابق قول نبی کریم ﷺ
>
> من سن سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل الى يوم القيامة او كما قال۔" (رپورٹ دارالعلوم ۱۲۹۰ھ)

حضرت قاسم العلوم نے اپنی تقریر میں کسی ایک شخص کا نام نہیں لیا بلکہ دیوبند والوں کا

نام لیا ہے۔ جن میں مذکورہ بالا چند حضرات شامل ہیں اور یہ بھی ضرور یاد رکھئے کہ:

قاسم العلوم کی گمنام پسندی اور شہرت سے نفرت:

قاسم العلومؒ اپنی گمنامی کو بے حد پسند کرتے تھے اور شہرت سے اس قدر نفرت کرتے تھے اور بھاگتے تھے کہ اپنے کیے ہوئے کارناموں کو شرکاء اور رفقاء کے کارنامے بتا کر خوش ہوتے تھے۔ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ اپنے لئے گمنامی کو بے حد پسند کرتے تھے۔ ایک دن فرماتے تھے کہ:

> ”اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے کیا اس میں سے ظاہر ہوئے اور آخر سب کو خاک میں ملا دیا اپنا کہنا کر دکھلایا۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۱۰۔۱۱)

یہی گمنام پسندی دارالعلوم دیوبند کی تاسیس میں بھی کارفرما رہی۔ سب کچھ کرنے کے بعد بھی نام و نمود اور شہرت سے دور بھاگتے تھے۔ یہاں بھی دیوبند والوں کو بانی فرما رہے ہیں جو اتنے درجے میں درست ہے کہ حضرت قاسم العلوم کی قیادت میں اہل دیوبند نے بہت کچھ کیا۔ اب ذرا دارالعلوم کے اجرا اور اس کی تاسیس میں ایک سرگرم شخصیت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی نظم کے بعض اشعار جو ۱۳۱۲ھ کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ سنئے جس میں انہوں نے حضرت قاسم العلومؒ کو بانی دارالعلوم کہا ہے واضح رہے کہ حضرت نانوتوی نے دارالعلوم کی بنیاد رکھتے ہوئے اس ادارے کو قندیل معلق سے تشبیہ دی تھی اور فرمایا تھا کہ:

> ”عالم مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کی سی ہے یعنی جب تک اس کا مدار توکل اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔“

اس مضمون کو مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی کے والد نے اشعار میں اس طرح باندھا ہے ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لئے   کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ   یہ سمجھ لینا کہ بے نور وضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معیں   ایک گر جائے گا پیدا دوسرا ہو جائے گا

دیکھئے بات کہاں پہنچی اور نتیجہ صاف طور پر سامنے آگیا کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت قاسم العلومؒ ہیں۔ جیسا کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے صاف اقرار فرمایا ہے۔ حضرت شیخ الہند اپنی ایک نظم میں جو ۲۰ صفر ۱۳۲۴ھ کے ایک سالانہ جلسے میں انہوں نے سنائی لکھتے ہیں۔

رحمت حق ہوئی تو یکایک اٹھے چند مردان خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم
یوسف علم شریعت کے خریدار بنے جمع کر کے سر اخلاص سے معدود درم
سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنام ایزد کوردہ میں کہ جہاں بیٹھے ہیں ارباب ہمم
شوق کہتا تھا بڑھو ضعف تھا کہتا ٹھہرو ناتوانوں کا تھا کیا، کہئے عجب ضیق میں دم

اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں کہ اک مرد خدا
آرہا تیز روی سے ہے، لئے ساتھ علم

بے نیازی و توکل رخ روشن سے نمود قطع منزل کیلئے دونوں قدم تیغ دودم
کسی بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور پڑگئی جان میں جان آہی گیا دم میں دم
ناتوانوں کو ملا اس کی حمایت سے یہ زور زینہ بام ترقی پہ بڑھا سب کا قدم
تھی نرالی ہی کچھ اس مرد صفا کی سج دھج تھے عجائب ہی کچھ اس شیر خدا کے دم خم
گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی یک بیک چونک پڑے اہل مدر اہل خیم
اس کی آواز تھی یا بانگ خلیل اللہی کہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم
عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر ذوق علمی کا تھا جس سینے میں تھوڑا سا بھی دم
دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مودع(۱) خیر کا شمہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم
باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نحن معک(۲) جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقش قدم
اس مربی دل و جاں کی مسیحائی سے علم دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہ عدم
ابر علم و عمل و فضل کا بادل برسا جس جگہ اس یم رحمت کا پڑا نقش قدم
علم کو لا کے ثریا سے ثریٰ پر رکھا آنکھوں سے دیکھ لیا علم مالم یعلم

---

(۱) امانت رکھا گیا۔ (۲) ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

دولت علم سے سیراب کیا عالم کو قاسم علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علم
اس کی آواز تھی بیشک قُم عیسیٰ کی صدا جس کے صدقے سے لیا علم نے دوبارہ جنم
طائر علم شریعت کے لئے یہ دہین برکت حضرت قاسم سے ہے مامون حرم
سلسلے علم کے امصار وقریٰ تک جاری اس کی ہمت سے ہوئے بل بے ترا فیض اعم

جملہ اعیان واکابر تھے جلو میں اس کے
اس کی شوکت کو پہنچی تھی کہاں شوکت جم

حضرت شیخ الہند کے اشعار میں ایک سرسری جائزہ ہے کہ دیوبند والوں نے چندہ کیا لیکن انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ حضرت قاسم العلوم تشریف لائے اور پھر انہوں نے ہی مدرسہ جاری کیا اور پھر اس نے خوب ترقی کی جملہ اعیان واکابر کے جلوں میں تھے اور وہ سب قافلے کے سالار تھے لیکن یہی شیخ الہند ایک اور جگہ دارالعلوم کا بانی صاف لفظوں میں قاسم العلوم کو ٹھہرا رہے ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی سے براست گفتگو میں شیخ الہند نے فرمایا:۔

> ”حضرت الاستاذ (حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ) نے اس مدرسے کو کیا درس وتدریس تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا، مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں۔ ۱۹۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔“ (سوانح قاسمی از گیلانی ص ۲۲۶ جلد دوم)

اور خود حضرت قاسم العلوم نے اپنی تقریر میں جو ۱۲۹۰ء کے انعامی سالانہ جلسے میں ۱۹/ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹/ جنوری ۱۸۷۴ء کو جامع مسجد میں فرمائی، ارشاد فرمایا:

> ”صاحبو! بے غرضانہ ہماری التماس ہے کہ آپ صاحب اس نعمت عظمیٰ کو غنیمت جانیں ہم گنہگار آپ صاحبوں کی خاطر اس مدرسے کی خدمت گذاری کے لئے بجان ودل حاضر ہیں ...... اور اُلٹے ممنون احسان ہوں گے، کہ آپ صاحبوں نے اس ہماری خدمت گذاری کو قبول فرمایا اور ہم کو اپنا خیر خواہ سمجھا۔“ (رپوٹ دارالعلوم ۱۲۹۰ھ)

دیکھئے اس عبارت میں کس کی کوششوں اور محنتوں کے آثار اور نشانات اُبھر رہے ہیں،

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حاجی محمد عابد صاحب مرحوم نے اس کام کو اُٹھایا اور دیگر حضرات نے ان کا ساتھ دیا، مگر اس کے کرتا دھرتا حضرت قاسم العلومؒ ہی تھے، اور حضرت قاسم العلوم نے ان الفاظ پر یعنی ''اور اُلٹے ممنون ہونگے کہ آپ صاحبوں نے اس ہماری خدمت گذاری کو قبول فرمایا۔'' غور کیجئے کہ اُلٹے ممنون ہونا صاف بتاتا ہے کہ آپ لوگوں کو ہمارا ممنون ہونا چاہئے تھا کیونکہ ہم نے یہ مدرسہ جاری کیا، بہر حال واضح ہوگیا کہ دار العلوم کے اصل بانی حضرت قاسم العلوم ہی ہیں، اور انہی کے نام سے یہ اسلامی یونیورسٹی قائم ہے۔

حضرت قاسم العلومؒ بانی دار العلوم دیوبند

یہ مدرسہ جیسا کہ مدرسے کی روئدادوں اور دیگر دستاویزات سے پتہ چلتا ہے۔ ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۷ء کو جمعرات کے روز چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے جاری ہوا، اور ملاّ محمود صاحب دیوبندی سب سے پہلے مدرّس کے سامنے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود حسن، صاحب اسیر مالٹا نے تعلیم کا آغاز کیا، دار العلوم کی روئدادوں کے مطابق پہلے ہی سال کے اختتام تک ۷۸ طلبہ جمع ہوگئے، جن میں دیوبند کے اطراف وجوانب کے علاوہ بنارس، پنجاب اور افغانستان کے اٹھاون ۵۸ طلبہ تھے اور کل آمدنی چھ سو انچاس روپیہ چار آنے تھی چھتے کی مسجد کے بعد مدرسہ قاضی کی مسجد میں اور پھر کرائے کے مکان میں اور بعد ازاں چند سال جامع مسجد کے متعدد حجروں میں رہا، اب جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی، حضرت قاسم العلومؒ کی رائے ہوئی کہ اب مدرسے کے لئے مستقل عمارت ہونی چاہئے، چنانچہ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمدؒ صاحب اور محدّث بلند پایہ حضرت مولانا احمد علیؒ صاحب نے اس کی تائید فرمائی۔ (ضمیمہ روئداد مدرسہ بابت ۱۳۰۱ھ)

حاجی محمد عابد صاحب کی مخالفت

حاجی صاحب نے مدرسے کے لئے مستقل عمارت کی ضرورت کی شدت سے مخالفت کی کہ کیا ضرورت ہے اتنے مصارف کی، مسلمانوں کا پیسہ ضائع ہوگا، جامع مسجد کی سہ دریاں اور حجرے اس کے لئے کافی ہیں، لیکن بقول حضرت شیخ الہند حضرت والا (مولانا نانوتوی) کے

سامنے مدرسے کا روشن مستقبل تھا، اس لئے اُنہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب مدرسے کے لئے علیحدہ جگہ ہی مناسب ہے، مگر حاجی صاحب نے اس رائے کو تسلیم نہیں کیا، آخر کار حضرت نانوتوی نے لوگوں سے فرمایا کہ مدرسے کے مکان کے لئے اشتہار جاری کر دیا جائے ...... اشتہار جاری ہوگیا، اور اس میں عام مسلمانوں کو دعوت دی گئی جمعہ کا دن سنگِ بنیاد رکھنے کا طے ہوا۔ اس سلسلے میں مدرسے کی ۱۲۹۲ھ کی رپورٹ یہ ہے:

''۲/ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ یوم جمعہ کو ایک بڑا جلسہ دیو بند کی جامع میں منعقد ہوا ہزار ہا اہل اسلام و خیر خواہان مدرسہ جمع ہوئے، یہ مبارک و پر رونق جلسہ بھی اپنی نوعیت میں ایک ہی جلسہ تھا، دیو بند کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ قال اللہ و قال الرسول کے فدائیوں سے معمور نظر آتا تھا، ہر در و دیوار پر انوار تھی، ہر جگہ تفسیر و حدیث کے چرچے تھے، مسلمانوں کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں تھے، خیر خواہوں کی خوشی میں مضطربانہ کیفیت تھی، طلبہ کے لئے جامع مسجد کے فرش پر بانسوں کا ایک ٹھاٹر بنایا گیا تھا جس میں دو سَو طلبہ کے قریب بیٹھے تھے، اور جامع مسجد کھچا کھچ نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، وہ جمعہ، جمعہ نہ تھا بلکہ مخلصین کے لئے وہ عید کا دن تھا بعد ادائے نماز جمعہ اوّل حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے منبر پر کھڑے ہو کر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی ایک مؤثر تحریر پڑھی جس سے سامعین کے دلوں پر ایک عجیب و غریب اثر تھا، اس کے بعد مولوی محمد مراد صاحب پاک پٹنی، مولوی عبد اللہ خاں صاحب گوالیاری، مولوی عبد الحق صاحب بریلوی، مولوی عبد العزیز خاں صاحب دیو بندی، مولوی عبد اللہ صاحب انبہٹوی کے سر پر حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کے دست مبارک سے دستار فضیلت بندھوائی گئی، شرکائے چندہ اور حاضری جلسہ کی مسرت و محبت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس لئے کہ وہ اپنے صرف کا بہت عمدہ نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

دار العلوم کا سنگِ بنیاد

اس کے بعد کل راہالیان جلسہ اس موقع پر تشریف لائے، جہاں تعمیر مدرسہ کی بنیاد رکھی جانے والی

تھی، اوّل پتھر جناب مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمدؒ صاحب گنگوہی اور مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی نے ایک ایک اینٹ رکھی، اور خواجہ محمد یوسف صاحب رئیس علی گڈھ نے اس بنیاد میں کھڑے ہوکر اسی وقت مدرسے کی تعریف اور اس کے قیام و استحکام کی ضرورت میں ایک تقریر پُر تاثیر فرمائی جس کو سامعین نے بہت پسند کیا، بزرگوں سے سُنا ہے کہ دیوبند کے سادات میں سے موجودہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب مدظلہ استاد حدیث دار العلوم کے نانا میاں جی مُنّے شاہ صاحب سے بھی حضرت نانوتوی نے ایک اینٹ اسی وقت رکھوائی تھی، یہ بھی بزرگوں سے سنا ہے کہ جب تعمیر مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا جا چکا تو سب بزرگوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت گڑگڑا کر الحاح و زاری کے ساتھ دُعا کی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، نے فرمایا کہ:

> ”عالم مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کی سی ہے، یعنی جب تک اس کا مدار توکل و اعتماد علی اللہ پر رہے گا، یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے تعمیر مدرسہ کی تاریخ اشرف عبارات نکالی تھی۔“

(القاسم دار العلوم نمبر محرم الحرام ۱۳۴۷ھ ص ۷۰)

درس گاہ نو درہ

جس درسگاہ کا سنگ بنیاد ۲/ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۶ء کو رکھا گیا تھا یہ نو درے کی درس گاہ ہے۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۷ء) میں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا، اور پانچ سال کی مدت میں یہ درس گاہ تیار ہوئی دار العلوم کی یہ ابتدائی عمارت ہے اور مولانا رفیع الدین صاحب کے دور کی یاد گار ہے۔

یہ ہے مختصر روئداد جو بنیاد دار العلوم کی ہم نے پیش کی، دراصل وہ مکتب اور مدرسہ جس میں حاجی صاحب شریک تھے، ان کے دار العلوم کی بنیاد سے اختلاف کے باعث ختم ہو گیا۔

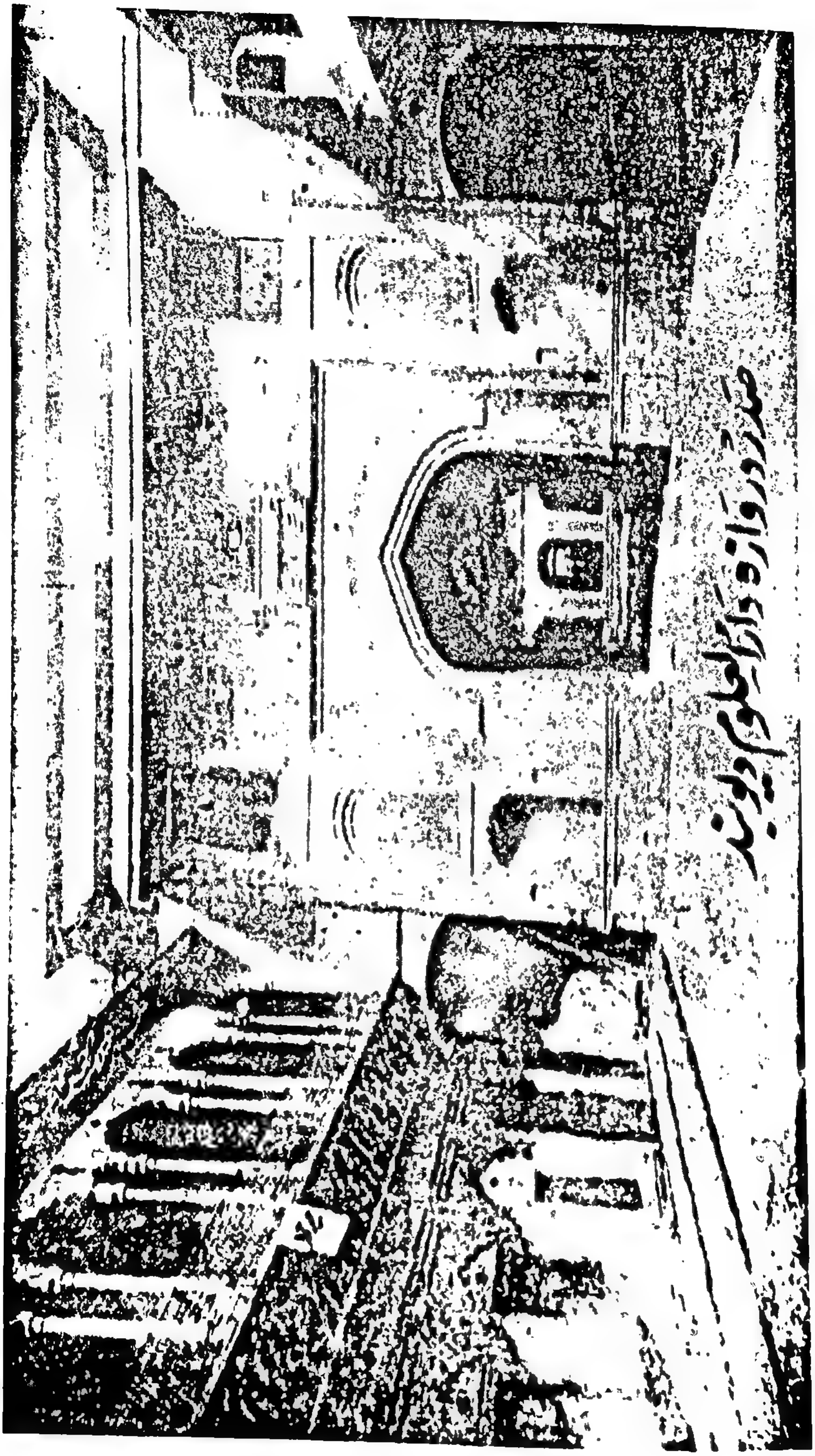
صدر دروازہ دارالعلوم دیوبند

صدر دروازہ دارالعلوم دیوبند

مولانا محمد میاں صاحب مصنف علمائے حق بنیاد دار العلوم کے متعلق لکھتے ہیں:

> "حضرت حاجی عابد حسین صاحب چونکہ جامع مسجد کی سہ دریوں کو مدرسہ کیلئے کافی سمجھتے تھے انہوں نے اس وقت بھی مخالفت کی تھی۔ چنانچہ جب مجمع مدرسے کی بنیاد گاہ پر جارہا تھا حضرت حاجی صاحب الگ ہو کر مسجد چھتہ میں تشریف لے آئے۔ لیکن حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کو اپنے ایک رفیق کی ناگواری اور کبیدگی کب گوارا ہو سکتی تھی۔ آپ بھی پیچھے پیچھے مسجد چھتہ میں پہنچ گئے۔ اور حاجی صاحب سے پکار کر فرمایا "اجی حاجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور ہم سب آپ کے چھوٹے ہیں۔ آپ نے ان چھوٹوں کے ساتھ کیا بے رخی اور بے توجہی برتنی شروع کر دی۔ کچھ ان الفاظ کا ایسا اثر حاجی صاحب پر ہوا کہ بے اختیار ہو کر گر پڑے اور اتنے روئے کہ آواز نکل پڑی اور کہا مولانا اللہ میرا قصور معاف فرمایئے حضرت نے حاجی صاحب کو اٹھا کر گلے سے لگالیا اور فرمایا کہ حاجی صاحب آپ کیا فرما رہے ہیں آپ تو ہمارے بڑے ہیں بزرگ ہیں۔ پھر حضرت حاجی صاحب کو لے کر بنیاد پر پہنچے۔ جو کھد کر تیار تھی۔"

(علمائے حق حصہ اول صفحہ ۷۹۔۸۰)

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا بنیاد دار العلوم کے لئے اشتہار، جلسے میں آپ کی نمایاں حیثیت اور تقریر دار العلوم کی عمارت کی بنیاد میں خود اختیاری یہ چیزیں بتا رہی ہیں کہ حضرت قاسم العلومؒ ہی دار العلوم کے کل بکلاں خود مختار اور ALL IN ALL تھے۔ حاجی صاحب کا انکار، ان کے بے بسی، مستقبل پر مبصرانہ نگاہ کا فقدان اور سنگ بنیاد سے اجتناب اور علیحدگی پر ان کے حقوق مدرسہ میں تخفیف بلکہ ایک گونہ بیزاری کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اتنی ہی بات ہے ورنہ حاجی صاحب برابر مدرسے کے خادم رہے۔ اور اپنی غلطی کو انہوں نے جلد محسوس کر لیا۔

تجزیہ:

دار العلوم دیوبند کا یہ تاریخی تفصیل جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کی اس کا خلاصہ ہمارے خیال میں یہ ہوا کہ حضرت قاسم العلوم نے دیوبند میں مدرسہ جاری کرنے کی تحریک کی، حاجی محمد عابد صاحب، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے باہمی موافقت سے

مدرسے کیلئے تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ حاجی صاحب نے سب سے پہلے چندہ دیا اور قاسمی تحریک کے باعث حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو لکھا کہ ہم نے آپ کے مرضی کے مطابق مدرسے کیلئے چندہ کرلیا ہے۔ اب آپ آیئے اور آکر پڑھانا شروع کردیجئے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مدرسے کا افتتاح ابھی نہیں ہوا۔ افتتاح اس وقت ہوا کہ حضرت قاسم العلوم نے ملا محمود صاحب دیوبندی کو میرٹھ سے بھیجا اور کہلا بھیجا کہ میں ان کو پندرہ روپیہ ماہوار پر بھیجتا ہوں۔ چنانچہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو اس کا افتتاح مولانا نانوتوی کے پروگرام کے مطابق عمل میں آیا۔ دس سال تک یہ مدرسہ، مدرسہ کی شکل میں مختلف جگہ ادلتا بدلتا رہا اور بالآخر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے دل میں مدرسے کی بجائے دارالعلوم کا تخیل آیا اور انہوں نے ۱۲۹۲ھ میں حاجی صاحب کے علی الرغم دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی اور وہی دارالعلوم کے بانی ٹھہرے۔ سب نے انہی کو دارالعلوم کا بانی سمجھا اور آج تک سمجھتے چلے آتے ہیں۔ عالم بالا میں بھی اور دنیا میں بھی انہی کے نام سے یہ اسلامی یونیورسٹی منسوب اور مشہور ہوئی۔

بانی کے عقائد:

واضح رہے کہ کسی بھی بنیاد میں بانی کے اثرات، معتقدات اور افکار شامل ہوئے بغیر رنگ نہیں لاتے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے فضلا کے عقائد میں قاسمی رنگ موجود ہے۔ حاجی محمد عابد صاحبؒ کا نہیں۔ ان کے عقائد سے دارالعلوم کا خمیر نہیں اٹھا۔ وہ عالم بھی نہ تھے ان پر دارالعلوم کا بانی ہونا پھبتا بھی نہیں تھا۔

الغرض یہ سعادت حضرت قاسم العلومؒ کے حصے میں آئی کہ وہی بانی دارالعلوم دیوبند کہلائے اور آج تک متفقہ طور پر سب کے ذہنوں میں یہ طے شدہ حقیقت بن کر جلوہ گر ہے حضرت قاسم العلوم اور دارالعلوم میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے کہ جب قاسم العلوم کا نام نامی آتا ہے تو دارالعلوم بھی ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھر جاتا ہے اور جب دارالعلوم زبان پر آتا ہے تو قاسم العلوم کی یاد دل کے ساز کے ہر تار تار میں زیر و بم پیدا کرتی ہے۔

گل و بلبل کی طرح ہے مجھے نسبت تجھ سے
لوگ لیتے ہیں مرا نام ترے نام کے ساتھ

حکومت برطانیہ میں بانی دارالعلوم دیوبند حضرت قاسمؒ کی شکایت:

یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاد حریت کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ آپ روپوش رہے۔ پھر حج کو چلے گئے۔ واپسی سے پہلے عام معافی کا اعلان ہو چکا تھا اس لئے دارالعلوم دیوبند کی تحریک اور اس کی ترقی اور سرپرستی میں بھرپور حصہ لینے کے باوجود حضرت مولانا اپنے آپ کو نام میں آگے نہ رکھتے تھے گو کام میں سب سے آگے تھے۔ مبادا دارالعلوم کو گزند پہنچے۔ مگر پھر بھی بعض لوگوں نے حکومت میں شکایت کر دی۔ شکایت کیا تھی حسب ذیل پختہ روایت پڑھئے۔ جو استاد محترم مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔ فرماتے ہیں:

> ”حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بعض مفسدہ پردازوں نے جس میں رام پور کا ایک خاندان بھی شامل تھا جس کو حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب کے خاندان سے پشتینی عداوت تھی حکومت میں یہ درخواست پیش کی کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلے میں کھولا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کئے جائیں تاکہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہو جائے یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو قواعد جنگ کی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کرانے کے لئے کابل کو تیار کر رہا ہے۔ ہم گورنمنٹ کو خیر خواہانہ اطلاع دیتے ہیں کہ وہ بیدار رہے اور ہم بھی ہر قسم کی سراغ رسانی اور تفتیش حالات کیلئے گورنمنٹ کو مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔

حکومت کے یہاں تفتیش حالات کے لئے احکام جاری ہوئے اور تفتیش کے مراکز گنگوہ، نانوتہ، رام پور (منہاران) جلال آباد قرار پائے اور ان کا صدر مقام دیوبند بنا دیا گیا۔ حکام نے دورے کئے اور بعض حکام نے نانوتہ پہنچ کر حضرت نانوتوی کی زیارت کرنے کیلئے مسجد میں آنے کی اجازت چاہی۔ حضرت نے اجازت دی اور کہلوا دیا کہ جوتا نکال کر آئیں۔ حاکم آیا اور بیٹھا نہیں۔ بلکہ نہایت ادب سے چپ چاپ حضرت کے سامنے کھڑا رہا۔ واپس ہو کر اس نے حکومت ہند کو رپورٹ کی کہ جو

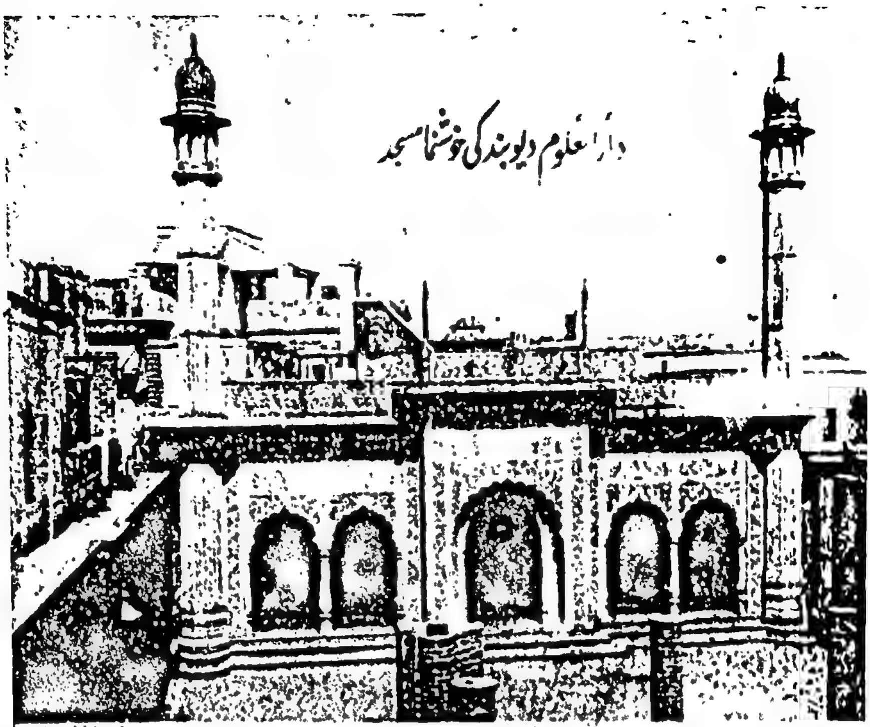

دارالعلوم دیوبند کی خوشنما مسجد

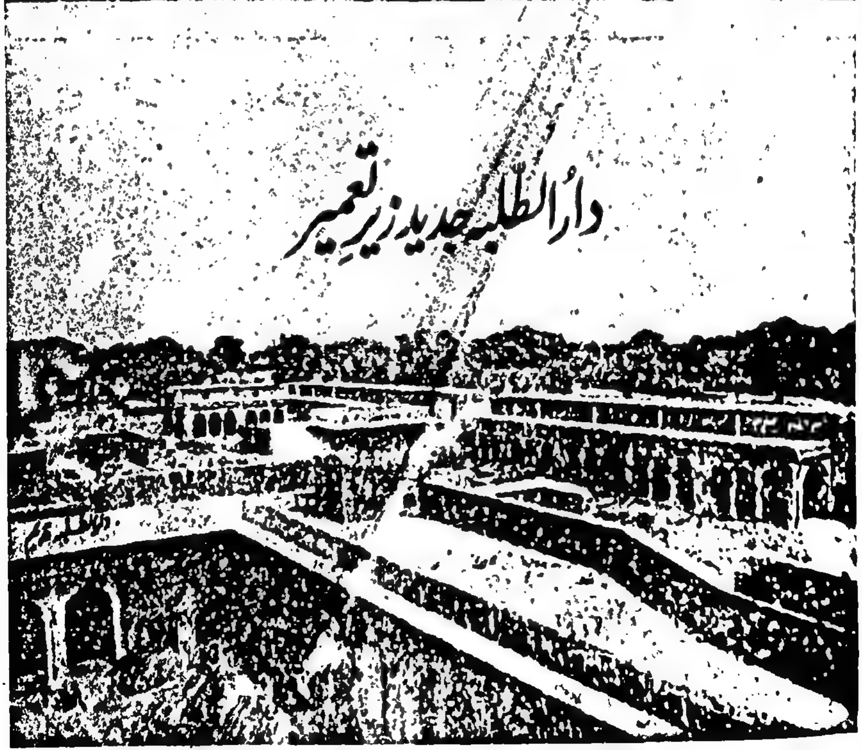

دارالطلبہ جدید زیرِ تعمیر

لوگ ایسی مقدس صورتوں پر نقضِ امن اور غدر و فساد کا الزام لگاتے ہیں وہ خود مفسد ہیں اور یہ محض چند مفسدوں کی شرارت ہے۔

اس واقعے کے بعد حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ میں اکثر دیکھتا ہوں کہ حضرت ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اپنی ردائے مبارک میں مجھے ڈھانپ کر کبھی اندر لاتے ہیں کبھی باہر لے جاتے ہیں۔ سوتے اور جاگتے اکثر اوقات یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے کہ حضور ردائے مبارک میں لئے رہتے ہیں اور الگ کرنا نہیں چاہتے۔"

(ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۲۵۱۔۲۵۲)

دیکھئے لوگوں نے جو حکومت میں رپورٹ دی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں کہ

"مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے زمانے والے دارالعلوم کا بانی حضرت ہی کو سمجھتے تھے۔ ورنہ حکومت میں مخالفین کو حاجی محمد عابد صاحب کا نام لینا چاہئے تھا اور حکومت کی تحقیقات کا مرکز حاجی محمد عابد صاحب کی ذات اور ان کا گھر ہونا چاہئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ اس دور کے مسلمانوں کے ذہنوں میں بانی دارالعلوم حضرت قاسم العلوم طے شدہ ہیں۔

مشورہ قاسم العلومؒ کا اور عمل میرا:

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب سابق مہتمم دارالعلوم کے متعلق استاذی مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن سے میں نے ابن ماجہ اور موطا امام محمد و مالک پڑھے ہیں، سے یہ روایت ہے کہ:

> "مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ ایسی مناسبت تھی کہ جو کچھ مولانا کے قلب پر وارد ہوتا تھا اسی کا خیال مجھے گذرتا تھا اور حضرت قبلہ والد مرحوم نے اس واقعہ کو یوں بیان فرمایا کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے تھے کہ "حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام کبھی خود نہیں فرمایا بلکہ اہتمام کیلئے مجھے طلب فرمایا اور میں وہی کرتا ہوں جو انہیں مکشوف ہوتا ہے۔ علم ان کا ہے عمل میرا ہے۔ ان کے منشائے علمی و کشفی کو میں سمجھ کر فوراً عمل درآمد کرتا

ہوں۔" (روایات الطیب ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۸)

معلوم ہوا کہ تمام امور مدرسہ کا انصرام حضرت قاسم العلوم ہی کے قلبی الہام کے مطابق مولانا رفیع الدین صاحب اپنے دور میں انجام دیتے رہے۔ گویا سب کام پس پردہ مولانا نانوتوی ہی انجام دے رہے تھے۔ حالانکہ اس دور میں حاجی محمد عابد صاحب بھی زندہ تھے۔

۱۲۸۶ھ میں آغاز دارالعلوم کے تین سال بعد حضرت قاسم العلوم نے مطبع مجتبائی میرٹھ میں طبع شدہ حمائل کی جو تصحیح فرمائی ہے اور اشعار میں اس کی تاریخ طبع بھی لکھی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس پر یہ عبارت درج ہے:

> "قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی مدرسہ دیوبند نے اس کی تصحیح فرمائی۔"

دیکھئے دارالعلوم کے ابتدائی تین سالہ دور میں حاجی محمد عابد صاحبؒ اور تمام رفقائے دارالعلوم کے ہوتے ہوئے ان کی موجودگی میں حضرت نانوتویؒ کا بانی مدرسہ دیوبند لکھا جانا حقیقت کے مطابق تسلیم شدہ بات ہے۔

دارالعلوم کے اصول وضوابط:

یہ کام دارالعلوم کے صدر اور بانی سے متعلق ہے کہ وہ اور مجلس شوریٰ کسی ادارے کے آئین وضوابط مرتب کرے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مجلس شوریٰ نے حضرت قاسم العلومؒ کی قلبی اور روحانی بصیرت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ان کو ہی دارالعلوم کا سرپرست بنایا ہوا ہے۔ بانی ہونے کی حیثیت سے آپ نے دارالعلوم کے لئے جو آئین وضوابط مرتب فرمائے ان سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں ڈالے گئے ہیں۔ گویا قاسم العلومؒ والخیرات کو قدرت نے دارالعلوم کی قیادت اور امامت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اصول اور آئین وضوابط حسب ذیل ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

بانی دارالعلوم دیوبند

کے آٹھ الہامی اور اساسی اصول
جن پر دارالعلوم کی انتظامی بنیاد رکھی گئی

بقلم خود بانی دارالعلوم

وہ اصول جن پر مدرسہ اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں:

۱۔ اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں اوروں سے کرائیں۔ خیراندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲۔ بقار طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیراندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اوروں کی رائے موافق ہونا ناگوار ہو۔ تو پھر اس مدرسے کی بنا میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہ دل سے ہر وقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے۔ سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضرور ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے

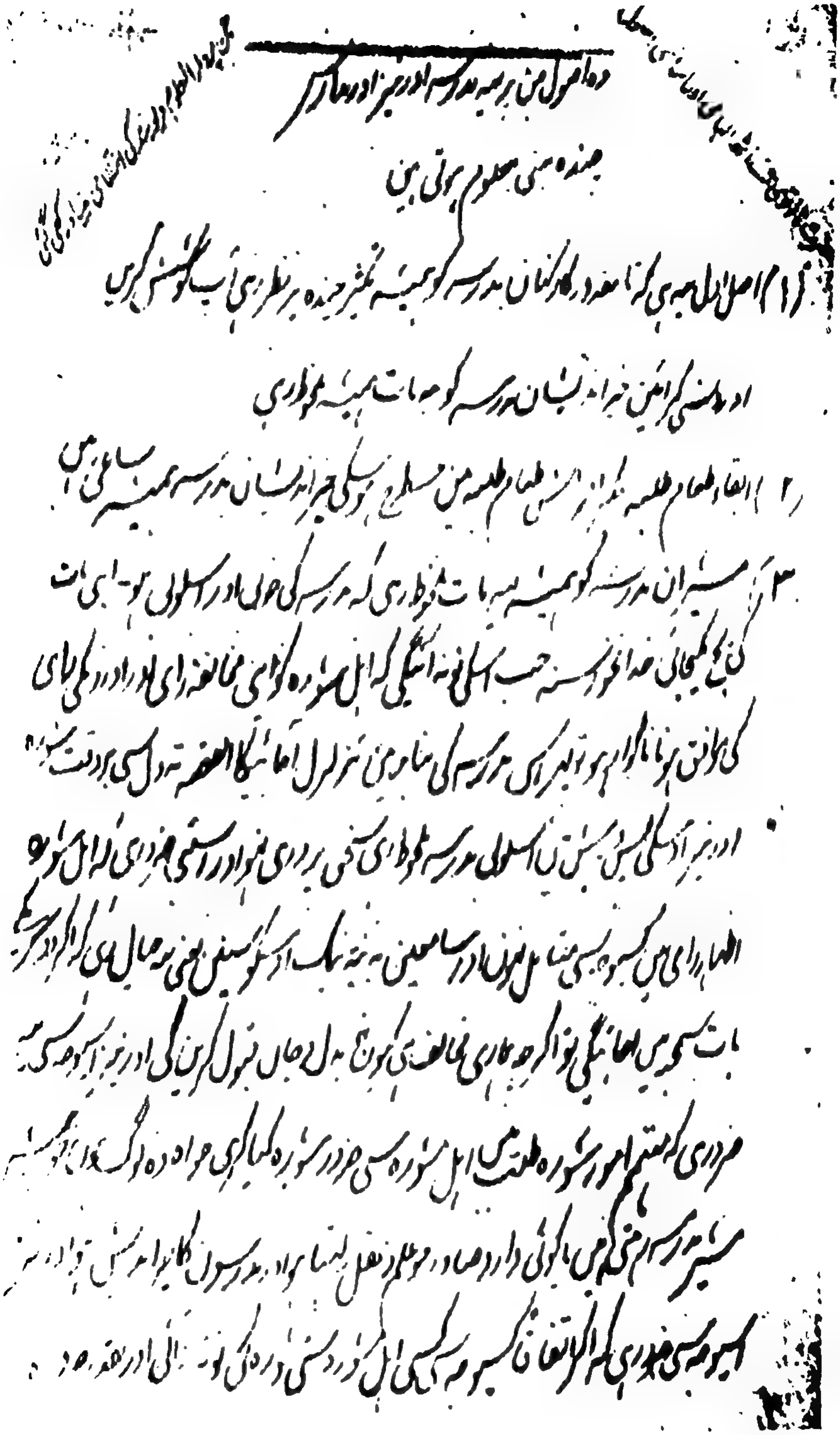

وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور مدارس

چندہ میں معلوم ہوتے ہیں

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہی آپ کوشش کریں

اوروں سے کرائیں خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہی

(۲) ابقاء طعام طلبہ بلکہ افزائش طعام طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو اپنی بات

کی پچ نہ کی جائے خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئیگی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے

کی موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائیگا القصہ تہ دل سے بروقت مشورہ

اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ

اظہار رائے میں کسی وجہ سے متأمل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی

بات سمجھ میں آجائیگی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کرینگے اور نیز اسی وجہ سے یہ

ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ

مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز

اسی وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت

دارالعلوم دیوبند کے اصول وضوابط

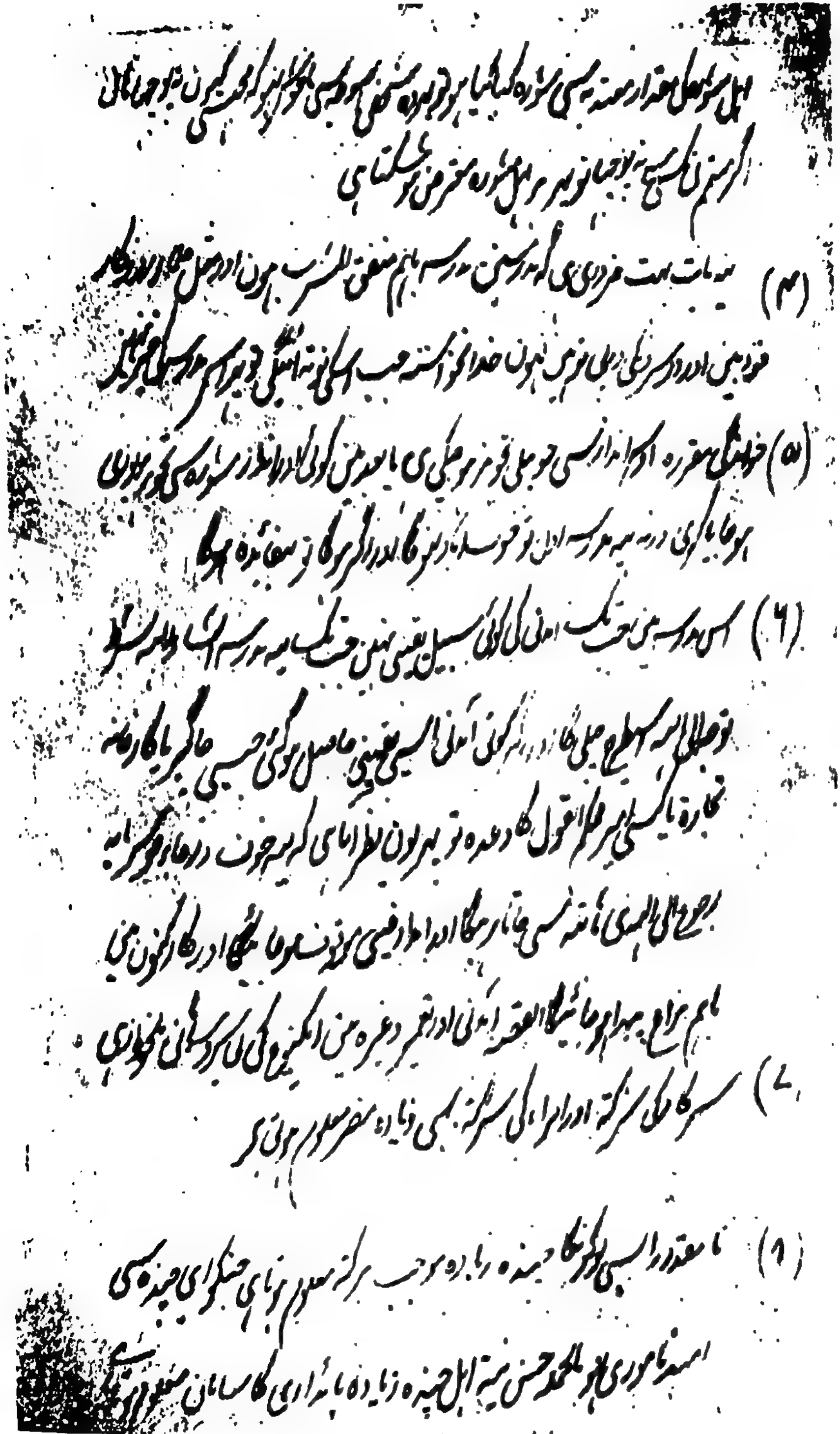

اہل مشورہ کی مقدار معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے

میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں۔ یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل و جان قبول کریں گے۔ اور نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو۔ اور اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں۔ اور مثل علماء روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی۔ تو پھر اس مدرسے کی خیر نہیں۔

۵۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو۔ پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶۔ اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں۔ جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔ اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسی جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف درجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی۔ اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷۔ سرکار کی شرکت اور امرا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے

چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات کے وضع کردہ یہ الہامی اصول جہاں ان کی کشفی اور روحانی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں ان کی سرپرستی اور قیادت باطنیہ کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ انہوں نے مدرسین کے ہم مشرب ہونے کو کتنا ضروری قرار دیا ہے اور حکومت یا کسی امیر محکم القول کے چندے کو مناسب نہیں بتایا۔ بلکہ عوام کے حسن نیت سے آراستہ چندوں، توکل اور بے سروسامانی پر زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ اور برہمنی حکومت کی خواہش کے باوجود دارالعلوم نے کسی سے آج تک گرانٹ لینا پسند نہیں کی۔

باہمہ اور بے ہمہ:

حالات بتلاتے ہیں کہ قاسم العلوم شبانہ روز دارالعلوم کی خدمات سرانجام دینے کے باوجود مدرسے سے ظاہری اور نام کا کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اور نہ ہی مدرسے سے کسی مفاد کا تصور دل میں تھا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق جو قاسم العلومؒ کے مرید بھی تھے اپنے مشاہدات کی بنا پر لکھتے ہیں:

> ”یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامی دیوبند آپ (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) ہی کا ساختہ پرداختہ اور کیا کچھ اس کا کارخانہ کہ چھوٹی سے سرکار، مگر ہرگز کبھی اس کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا۔ اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسے کی مدرسی قبول فرمائیے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر قبول نہ فرمایا اور کبھی کسی طور یا ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے مدرسے سے روادار نہ ہوئے۔ حالانکہ رات دن مدرسے کی خوش اسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول۔“

(سوانح مخطوطہ بحوالہ سوانح گیلانی جلد اول صفحہ ۵۳۶)

سوانح مخطوطہ کے مصنف بتاتے ہیں کہ مدرسہ اسلامی دیوبند حضرت قاسم العلوم ہی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اور رات دن اس کی خدمت کے باوجود مدرسے سے ایک پائی نہیں لی۔ یہ باہمہ اور بے ہمہ نہیں تو اور کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ بانی اپنی معنوی بنا سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتا

اور رات دن اس میں لگا رہتا ہے اور بظاہر بے تعلق رہتا ہے اور بباطن اس میں محو ہوتا ہے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب تذکرۃ الرشید کے پہلے حصے میں دارالعلوم دیوبند میں چار مرتبہ جلسہ دستار بندی ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۲ھ ۱۲۹۴ھ اور بعد ازاں ۱۴ ربیع الاول ۱۳۰۱ھ بروز جمعرات کے جلسہ دستار بندی میں باہر کے مہمانوں کی آمد، حکیم مشتاق احمد صاحب رئیس دیوبند کی شہر اور بیرون شہر کے تقریباً تین ہزار مہمانوں کی مہمان نوازی کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

> ''بعد نماز صبح ان نو تعمیر مکان (نودرہ) میں جہاں اس وقت مدرسہ قائم ہے اجتماع شروع ہوا اور آٹھ بجے تک جلسے کا نصاب مکمل ہوگیا۔ اس وقت مدرسے کے مدرس اول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے منبر پر کھڑے ہو کر ایک نہایت دلچسپ اور پرتاثیر تقریر فرمائی۔ جس میں مختصر مگر جامع الفاظ کے اندر حالات مدرسہ بیان فرمائے اور اس نئی تعمیر (نودرہ) کا آمد و خرچ اور ضروریات کا اظہار فرمایا جو ۱۲۹۳ھ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں رکھی ہوئی بنیاد پر قائم ہوا اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے الہامی نقشے پر آٹھ سال سے تعمیر ہو رہا تھا۔ اور اب تک ساڑھے بائیس ہزار روپیہ خرچ ہو کر بضرورت جلسہ قابل جلوس بنا لیا گیا تھا۔''

(صفحہ ۲۴۸۔۲۴۹)

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی تحریر سے بھی قاسمی ہاتھوں کی بنیاد رکھے جانے اور قاسم العلوم کے بانی دارالعلوم ہونے کا دستاویزی ثبوت ملتا ہے۔

سرسید کے نزدیک بانی دارالعلوم حضرت قاسم العلومؒ:

سرسید مرحوم حضرت قاسم العلوم کی وفات پر اپنے علیگڑھ گزٹ مورخہ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''انہی (مولانا محمد قاسم صاحب) کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کیلئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا............
>
> دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم

کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔" (گزٹ صفحہ ۴۶۷۔۴۶۸)

غرض دیوبند اور اطراف و جوانب ہند و پاک و ممالک اسلامیہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند کے لقب سے مسلّم اور مشہور ہیں ہاں اور دیگر اکابر کی کوششیں بھی بارگاہ رب العزت میں سنہرے حرفوں سے لکھی ہوئی ہیں۔

اور یہ راقم الحروف انوارالحسن شیرکوٹی تو روزانہ صبح کی نماز کے بعد سب اکابر اور اساتذہ کو ان الفاظ سے یاد کرتا:

السلام والرحمة علی حاجی امداد الله والسلام الرحمة علی مولانا محمد قاسم والسلام الرحمة علی مولانا رشید احمد گنگوهی والسلام والرحمة علی مولانا محمد یعقوب، والسلام والرحمة علی مولانا رفیع الدین والسلام و الرحمة علی حاجی محمد عابد والسلام والرحمة علی مولانا ذوالفقار علی وعلی مولانا فضل الرحمن و علی مولانا ملا محمود والسلام والرحمة علی مولانا محمود حسن و مولانا فخر الحسن و مولانا احمد حسن و علی شاه عبدالرحیم رائے پوری والسلام و الرحمة علی مولانا غلام رسول والسلام والرحمة علی مولانا اشرف علی، والسلام والرحمة علی مفتی عزیز الرحمن والسلام والرحمة علی مولانا سید محمد انور شاه والسلام والرحمة علی حکیم محمد حسن والسلام والرحمة علی مولانا محمد احمد و علی مولانا حبیب الرحمن والسلام والرحمة علی مرشدی مولانا عبد القادر والسلام والرحمة علی میاں اصغر حسین والسلام والرحمة علی مولانا محمد یٰسین شیر کوٹی و علی مولانا عبد الصمد والسلام والرحمة علی مولانا حسین احمد مدنی والسلام والرحمة علی مولانا الشبیر احمد عثمانی والسلام

والرحمة علی مولانا رسول خان و علی مولانا محمد ابراهیم بلیادی والسلام والرحمة علی مولانا مرتضی حسن و علی مولانا سراج احمد و علی مولانا اعزاز علی و علی مولانا عبد السمیع و علی مولانا گل محمد خان وعلی مولانا محمد ادریس سکروڈھوی و علی مولانا نبیه حسن و علی مولانا احمد شیر و السلام والرحمة علی مولانا محمد ادریس کاندهلوی و علی مفتی محمد شفیع والسلام والرحمة علی مولانا محمد طیب و علی مولانا بدر عالم والسلام والرحمة علی مولانا یعقوب الرحمن عثمانی و علی مولانا محمد علی حیدر آبادی و علی بهائی سعید احمد گنگوهی و السلام والرحمة علی مولانا اشتیاق احمد الخطاط و علی قاری محمد یامین و علی مولوی افتخار علی والسلام والرحمة علی جمیع فضلاء الدیوبند و متنسبیه و خدامه اجمعین.

پڑھ کر دل کو اطمینان بخشتا ہوں۔ خط کشیدہ حضرات میرے اساتذہ ہیں۔

روزانہ آنحضور ﷺ اور تمام انبیاء، تمام صحابہ تمام تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مفسرین، محدثین، فقہاء و متکلمین، اولیاء و اتقیا، ابرار، محسنین، حفاظ و قرار و مجودین، ملائکہ السماوات و الارضین۔ مناظرین و مبلغین اسلام، شہدائے کربلا، علماء، صوفیاء، اساتذہ، جدو جدہ، والدین اور سب اہل خانہ اہل خاندان تلامیذ اہل وطن اور تمام مومنین اور مومنات اور مومنات اور مسلمین و مسلمات پر سلام ورحمت اور دعائے مغفرت بھیجتا ہوں اور یہ میرا عرصے کا معمول ہے۔ بہر حال اس دعا میں حاجی محمد عابد اور مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمٰن بھی میری زبان پر وظیفے کے طور پر آتے ہیں۔ خواہ ان حضرات کے خاندان والے کبھی دعائے مغفرت بھی نہ کرتے ہوں۔ کچھ بھی ہو ان حضرات کا فضلائے دیوبند پر بڑا احسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان بانیان دارالعلوم کے سوانح زندگی لکھ ڈالے ہیں۔ اور مجھے تو جو کچھ ملا وہ

دارالعلوم دیوبند کے طفیل ہی میں ملا ۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

میں اگر چاہتا تو سکول اور کالجوں کی کتابوں سے دولت سمیٹ لیتا اور الحمدللہ کہ میں نے کالج اور اسکولوں کے لئے بھی کتابیں لکھیں لیکن پاکستان بننے کے بعد تو میرا مشغلہ تصنیف و تالیف اکابر دیوبند ہیں اور بس۔ اور ابھی مشاہیر دیوبند کا بہت بڑا پروگرام سامنے ہے۔ خدائے کریم اس کی توفیق عطا فرمائے اور ان حضرات کے طفیل میں میری مغفرت فرمادے۔

دار العلوم کی بتدریج ترقی

سب سے پہلے استاد ملا محمود دیوبندی اور سب سے پہلے شاگرد مولانا محمود حسن:

الغرض ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء بروز جمعرات چھتے کی مسجد میں انار کے درخت کے نیچے حضرت قاسم العلوم کی تحریک اور قیادت میں ملا محمود صاحب دیوبندی مدرس اولین کے سامنے جو پندرہ روپیہ کے مشاہرے پر رکھے گئے تھے مدرسہ جاری ہوا اور سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب ہوئے۔ گویا محمود نے محمود کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔

۹ محرم ۱۲۸۳ھ کو اعلان کیا گیا کہ مدرسے کیلئے اب تک چار سو ایک روپیہ آٹھ آنے کی رقم جمع ہو چکی ہے۔ بوقت اجرا طلبہ کی تعداد ۱۶ تھی۔ لیکن آخر میں اسی سال ۷۸ طلبہ کی تعداد پہنچ گئی۔ ان طلبہ میں اٹھاون طالب علم باہر کے تھے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی آمد:

طلبہ کی تعداد کے پیش نظر حضرت مولانا محمد یعقوب کو حضرت قاسم العلومؒ نے صدر مدرس کے فرائض انجام دینے کیلئے پچیس روپیہ پر مقرر فرمایا جو اس زمانے میں میرٹھ کے مطبع میں منشی ممتاز علی کے یہاں تصحیح کا کام انجام دیتے تھے۔ لیکن امیر احمد صاحب عشرتی نے غالباً پینتیس روپیہ تحریر کی ہے جو بظاہر درست نہیں۔

مسجد چھتہ جس میں دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا

مسجد چھتہ جس میں دار العلوم دیو بند کا افتتاح ہوا۔

اولین مہتمم:

سب سے پہلے مہتمم حاجی محمد عابد صاحب مقرر ہوئے۔ ۱۲۸۴ھ میں جب حاجی صاحب حرمین شریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے تو مولانا رفیع الدین صاحب کو مہتمم بنایا گیا۔ آپ نے ۱۵ شعبان ۱۲۸۴ھ کو اہتمام کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ۱۲۸۶ھ میں مولانا رفیع الدین صاحب حرمین شریفین کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے تو پھر حاجی محمد عابد صاحب کو مہتمم بنادیا گیا۔ مولانا رفیع الدین صاحب کی واپسی پر پھر مولانا رفیع الدین صاحب کو مہتمم بنایا گیا اور حاجی محمد عابد صاحب کلیتہً جامع مسجد دیوبند کی تعمیر کے اہتمام پر لگادیئے گئے۔ جامع مسجد کی بنیاد مولانا عبدالرب دہلوی کی تحریک پر ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی اور ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۷۰ء میں مکمل ہوئی۔ عبدالخالق صاحب نے چندے میں بے حد کوشش کی۔

سب سے پہلی مجلس شوریٰ:

دارالعلوم کی سب سے پہلی شوریٰ حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھی:

۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ
۲۔ حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ
۳۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ
۴۔ مولانا فضل الرحمن صاحبؒ
۵۔ مولانا مہتاب علی صاحبؒ
۶۔ شیخ نہال احمد صاحبؒ
۷۔ منشی فضل حق صاحب دیوبندیؒ

سالانہ آمد و صرف:

پہلے سال کی آمدنی ۶۴۴ روپیہ چار آنے تھی اور خرچ تین سو تر انوے روپیہ بارہ آنے تھا۔ سالانہ امتحان مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا مہتاب علی صاحب نے لیا۔

پہلا سالانہ انعامی جلسہ:

پہلا سالانہ انعامی جلسہ ہوا۔ جس میں ستائیس روپیہ کی کتابیں طلبہ کو انعام میں دی

گئیں۔

فارسی وحساب اور قرآن کی تعلیم:

۱۲۸۴ھ میں فارسی وغیرہ کی کلاسیں کھولی گئیں اور حساب، اردو، قرآن ناظرہ وحافظہ کی جماعتیں بھی کھول دی گئیں۔ اسی سال مدرسے کا حساب رکھنے کیلئے چار روپیہ ماہوار پر ایک محرر رکھا گیا۔

۱۲۸۴ھ میں طلبہ کی تعداد ایک سو بیس ہوگئی۔ اور چندہ بھی بڑھ گیا۔ اس سال کا امتحان مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا مہتاب علی صاحب نے لیا۔

غرض یہ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اپنی وفات تک برابر دارالعلوم کے سرپرست رہے اور تمام امور سرانجام دیتے رہے۔

وفات حضرت قاسم العلوم ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء:

جس سال حضرت قاسم العلوم کا انتقال ہوا تو طلبہ کی تعداد ۱۸۶ تھی اور آمدنی گیارہ ہزار نو سو پچیس روپیہ تک پہنچ گئی تھی۔ اس زمانے میں یہ رقم معمولی رقم نہ تھی۔

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے انتقال اور حاجی محمد عابد صاحب کے استعفا ۱۳۱۰ھ کے بعد اقتدار اہتمام یکے بعد دیگر منشی فضل حق صاحب دیوبندی مصنف سوانح مخطوطہ اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتویؒ کے ہاتھوں میں آیا۔ لیکن بعد ازاں ۱۳۱۲ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے جو حضرت نانوتویؒ کے بعد سرپرست مقرر ہوئے تھے اہتمام دارالعلوم حضرت قاسم العلومؒ کے صاحبزادہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے سپرد کر دیا۔ اس میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم کی سفارش کو جو حضرت گنگوہی کے تلامذہ تھے بہت دخل تھا۔

حافظ محمد احمد صاحب ۱۳۱۲ھ سے ۱۳۴۷ھ تک:

حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں آمدنی کا اوسط نوے ہزار تک پہنچ گیا اور

طلبہ کی تعداد ڈھائی سو سے نو سو تک پہنچی۔ آپ کے چارج سے پہلے کتب خانے میں پانچ ہزار کتابیں تھیں لیکن آپ کے عہد میں کتابوں کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۶ء تک دار العلوم دیوبند کی تعمیرات چھتیس ہزار روپیہ صرف ہو چکا تھا لیکن حافظ صاحب کے دور میں عمارات کی مالیت چار لاکھ پہنچ گئی تھی۔ مختلف شعبوں اور دفاتر کی تشکیل آپ ہی کے عہد کے زریں کارنامے ہیں۔ دار الحدیث کی شاندار عمارت آپ ہی کے عہد میں آغاز پذیر ہوئی۔ جدید دار الاقامہ کا آغاز آپ ہی کے عہد میں ہوا۔ مسجد اور کتب خانے کی شاندار عمارتیں آپ ہی کی یادگار ہیں۔ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ء کے عظیم الشان جلسہ دستار بندی کا سہرا بھی آپ ہی کے عہد اہتمام کے سر ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے بڑے بھائی:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کو فخر العلما کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ ایک عظیم المرتبہ عالم، عربی کے زبردست ادیب، اعلیٰ پائے کے مدبر، منتظم اور سیاست دان تھے۔ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں حافظ صاحب کی مدد کیلئے آپ کو نائب مہتمم بنایا گیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور حافظ صاحب ایک روح اور دو قالب تھے۔ دراصل حافظ صاحب کے دور اہتمام کی ترقی میں پس پردہ مولانا حبیب الرحمٰنؒ کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ اور ان کے عہد کی ترقی درحقیقت مولانا حبیب الرحمٰن کی ترقی تھی۔ موصوف اس بلا کے دانا اور دور اندیش تھے کہ ان کو اگر امیر معاویہ ثانی رضی اللہ عنہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ میرا مقصد صرف دانائی اور تدبر اور انتظام میں تشبیہ دینا ہے۔ ورنہ ایک صحابی کے گھوڑے کی ناک کا غبار حضور اکرم ﷺ کی معیت میں غیر صحابی سے افضل ہے۔

آپ کی مایہ ناز تصنیف ‘‘دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا’’ بہترین شاہکار ہے۔ اسی طرح ‘‘تعلیمات اسلام’’ کا مقام ہے۔ اور لامیۃ المعجزات عربی اشعار میں آپ کے عربی ادب کی زندہ مثال ہے۔ آپ کا انتقال ۴ رجب ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں ہوا۔

اہتمام حکیم الاسلام مولانا محمد طیب:

مولانا حکیم الاسلام اپنے والد محترم کے عہد ہی میں ۱۳۴۶ھ سے مددگار مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی وفات کے بعد سے اب تک مسلسل مہتمم ہیں آپ نے پہلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ آمدنی کے اعتبار سے اب دارالعلوم تین لاکھ سالانہ سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ خود موصوف اکثر ہندو پاک کے دوروں پر زرِ کثیر حاصل کر کے لاتے ہیں۔ آپ ہی کے عہد میں دارالتفسیر، دارالطلبہ جدید، بالائی مسجد، دارالافتاء، دارالقرآن کی عمارتیں مکمل ہوئیں۔ اور مختلف شعبہ ہائے دارالعلوم ترقی پذیر ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ:

ہندو پاک ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے آپ درخشندہ آفتاب ہیں۔ ان کو اگر ناموس شریعت کے لقب سے یاد کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مجلس شوریٰ نے علامہ عثمانی کی شخصیت کو صدر اہتمام کے عہدے پر لانا نہایت ضروری سمجھا اس لئے ڈابھیل سے آپ کو بلا کر صدارت کا کام سپرد کیا گیا۔ ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۶ء سے ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۴ء تک آپ نے آٹھ نو سال بحیثیت صدر مہتمم دارالعلوم کی خدمات انجام دیں۔ ادھر ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۱ء سے ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء تک سترہ سال دارالعلوم میں مفت تعلیم دیتے رہے۔ ان کی وجہ سے دارالعلوم کو اور دارالعلوم سے ان کو چار چاند لگ گئے۔ وہ دارالعلوم کے مایہ ناز فرزند ہیں۔ تقریر و تحریر کے امام اور جامع العلوم تھے۔ تعمیر و نظریہ پاکستان کے وہ سب سے اونچے مفکر تھے۔ ان کے دور میں دارالعلوم کو بہت ترقی ہوئی۔

دارالعلوم کے سرپرست حضرات:

حضرت قاسم العلوم سب سے پہلے سرپرست اور بانی کی وفات کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ۱۲۹۷ھ سے ۱۳۲۳ھ تک دارالعلوم کے سرپرست رہے۔ اور ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب ۱۳۳۹ھ تک اور ان کی مالٹا کی اسیری کے اثنا میں

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور ان کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رجب ۱۳۵۴ھ تک سرپرست رہے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں سرپرستی سے استعفا دے دیا تھا۔ بعد ازاں کسی کو سرپرست نہیں بنایا گیا۔ سرپرست دراصل ایک طرح کا چانسلر ہوتا تھا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد یعقوب صاحب:

دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب تھے۔ جو آواخر ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۶ء تک شیخ الحدیث رہے۔

مولانا سید احمد صاحب دہلوی:

ان کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی جو اپنے زمانے کے ماہر علوم معقول و منقول تھے اور بالخصوص ریاضی میں تو بے حد ید طولیٰ رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے زمانے میں مدرس دوم تھے۔ انہی کو مدرس اول بنا دیا گیا۔ آپ کو ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۹ء میں دارالعلوم میں مدرس رکھا گیا تھا لیکن ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء میں خود دارالعلوم کو چھوڑ کر بھوپال چلے گئے۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا:

مولانا سید احمد صاحب کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کو ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۷۵ء میں شیخ الحدیث بنایا گیا۔ آپ کو دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۲۹۱ھ میں بحیثیت مدرس چہارم رکھا گیا تھا کچھ عرصے کے بعد شیخ الحدیث کے مرتبے پر پہنچے اور تا وفات ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء شیخ الحدیث رہے۔ مالٹا میں اسیر رہے اور ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف زبردست انقلاب کے مجوز تھے۔ آپ کا بڑا کارنامہ ترجمہ قرآن ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ:

آپ اپنے دور کے امام تھے ہر علم میں ماہر تھے۔ بے نظیر حافظہ تھا ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۶ء

میں پیدا ہوئے۔ دار العلوم میں آکر تکمیل کی۔ شیخ الہند کے شاگرد تھے۔ جب حضرت شیخ الہند ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں حج کو تشریف لے گئے اور پھر وہاں گرفتار ہو کر مالٹا میں نظر بند رہے۔ تو سیدی و استاذی مولانا محمد انور شاہ صاحب ان کے قائم مقام ہوئے اور ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء تک دار العلوم دیو بند میں شیخ الحدیث رہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آخری دورہ ہماری جماعت نے دیو بند میں پڑھا ہے۔ جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ بعد ازاں ڈابھیل کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ الحدیث رہے اور بالآخر ۳ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں ۶۱ سال کی عمر میں وفات پائی اور محلہ خانقاہ دیو بند میں مدفون ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ:

حضرت انور شاہ صاحبؒ کے بعد چوتھے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی صاحب ہوئے آپ کی پیدائش ۱۹ شوال ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۹ء کو قصبہ بانگر مئو ضلع اناؤ میں ہوئی دیو بند میں تعلیم پائی۔ حضرت شیخ الہند کے عزیز شاگردوں اور جان نثاروں میں تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ہمراہ مالٹا میں اسیر ہوئے۔ پھر ہندوستان تشریف لے آئے۔ ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء سے عہدہ شیخ الحدیث پر مامور کئے گئے۔ جس روز مولانا حسین احمد صاحبؒ نے پہلی مرتبہ حضرت شاہ صاحب کے بعد دار الحدیث میں قدم رکھا۔ میں دیو بند میں تھا آپ کا وصال ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعرات دو پہر کے بعد ۸۱ سال ۶ ماہ ۲۴ دن قمری اور ۷۹ سال ۲ ماہ ایک دن شمسی میں ہوا۔ اس طرح آپ نے ۲۹ سال دار العلوم دیو بند میں حدیث پڑھائی۔

ستم ظریفی:

غالباً ۱۹۴۲ء کی بات ہے جو ملک ہند میں حکومت برطانیہ کے خلاف زبردست ہنگامہ خیزیاں ہوئیں۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور دیگر لیڈر گرفتار ہوئے۔ دار العلوم دیو بند میں مولانا مدنی کی جگہ اس وقت مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی سے بہتر بخاری شریف کے لئے کوئی موزوں نہ تھا۔ اس وقت علامہ عثمانی دار العلوم کے صدر مہتمم تھے۔ یہ وقت ان سے علمی

فیوض کے حصول کا بالکل ٹھیک وقت تھا۔ اور یہ وقت تھا شگفتن گلہائے علم کا۔ چنانچہ طلبہ نے مولانا عثمانی کے مکان پر خارج میں بخاری پڑھنی شروع کی۔

حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ۔

مولانا مدنیؒ کے بعد ۱۳۵۷ھ سے حضرت مولانا فخر الدین صاحب دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث ہیں۔ آپ علم حدیث میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں بندہ پاکستان سے دیوبند گیا تو ان کے درس میں بیٹھ کر بخاری کا سبق سنا۔ آپ کی تقریر بخاری کے متعدد حصے چھپ چلے ہیں جو نہایت محدثانہ اور عالمانہ ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں علوم وفنون کی تعلیم

دارالعلوم دیوبند میں آٹھ سال کا کورس ہے جس میں

۱۔ علم صرف
۲۔ نحو
۳۔ ادب
۴۔ علم معانی وبیان
۵۔ منطق
۶۔ فلسفہ
۷۔ فقہ
۸۔ اصول فقہ
۹۔ حدیث
۱۰۔ اصول حدیث
۱۱۔ تفسیر
۱۲۔ علم الفرائض
۱۳۔ علم العقائد
۱۴۔ علم الکلام
۱۵۔ علم الطب
۱۶۔ علم المناظرہ
۱۷۔ علم ہیئت
۱۸۔ فارسی
۱۹۔ ریاضی
۲۰۔ تجوید وقرأت

اور دین سے متعلق دیگر علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ دارالعلوم میں خصوصیت سے دورہ حدیث کی بڑی ہی اہمیت اور شان ہے۔ دور دور سے طلبہ دورے کی تعلیم کیلئے آتے ہیں۔ اور پروانہ وار شمع حدیث پر جانیں نثار کرتے ہیں۔

طلبہ کی تعداد:

طلبہ کی تعداد ہر سال چودہ پندرہ سو ہوتی ہے۔ کسی طالب علم سے خواہ وہ امیر ہو یا غریب کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ دارالعلوم سے اکثر طلبہ کو کھانا، کپڑا، صابن، تیل اور کتنے طلباء کو نقد وظیفہ دیا جاتا ہے۔ تمام طلبہ کو پڑھنے کے لئے کتب خانے سے مستعار کتابیں دی جاتی ہیں

اور جب امتحان دے کر سالانہ تعطیل پر جاتے ہیں تو کتابیں واپس لے لی جاتی ہیں۔ سالانہ امتحان شعبان میں ہوتا ہے اور رمضان المبارک کی تعطیل کردی جاتی ہے۔ تقریباً چالیس اساتذہ تعلیم دیتے ہیں اور کل عملہ سو سے زیادہ ہے۔

نظام دارالعلوم:

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ ہے جو ملک کے ہر صوبے سے ایک ایک نمائندہ لے کر منتخب کی جاتی ہے۔ جس کے حسب ضرورت جلسے ہوتے ہیں مہتمم تمام مدرسے کا ناظم اعلیٰ ہوتا ہے۔ اور ناظم تعلیم صدر مدرس کو بنایا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا مسلک

دارالعلوم کا مسلک شاہ ولی اللّٰہی مسلک ہے۔ گذشتہ اوراق میں آپ نے پڑھا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے اور وہ شاہ محمد اسحاق صاحب کے اور وہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے اور وہ اپنے والد محترم شاہ ولی اللہ صاحب کے۔ لہٰذا دہلی کا کارخانہ علم جب درہم برہم ہوگیا تو یہ خزانہ علم مولانا محمد قاسم صاحب کی کوششوں سے دیوبند کو منتقل ہوگیا۔ چنانچہ دارالعلوم اب تک اسی مسلک پر چل رہا ہے۔ وہ قرآن وسنت دونوں پر سختی سے عامل ہیں۔

تقلید امام اعظمؒ:

فقہ میں علمائے دارالعلوم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے زبردست مقلد ہیں اور حنفیت کے لئے باعث فخر حنفی ہیں۔

علمائے دیوبند کا روحانی مسلک:

آپ نے گذشتہ اوراق میں پڑھا ہے کہ حضرت قاسم العلوم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ وہ چاروں سلسلوں نقشبندی، چشتی، سہروردی، قادری سے منسلک ہیں۔ اور چاروں سلسلوں میں بیعت کرتے ہیں۔ ان کے یہاں پیری اور مریدی کی صحیح روح جلوہ فرما رہی ہے۔ انہوں نے تصوف کو دنیاداری سے قطعاً دور رکھا ہے اور لاکھوں آدمیوں کو روحانیت اور اصلاح اخلاق سے مالا مال کیا ہے۔ شریعت وطریقت سے دنیا کمانے کا کبھی تصور بھی ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا۔

علمائے دیوبند کے عقائد:

عقائد میں علمائے دیوبند امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں جو اہل سنت

والجماعت کے عقائد میں امام ہیں۔ حضرت استاذی مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

> "جملہ سلاسل (نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ) کے بزرگان دین ہمارے مقلد اور پیشوا ہیں۔ ان کی محبت ذریعہ نجات، ان کی کرامت ثابت، ان سے بغض وعداوت شقاوت ومحرومی کی علامت یہ ہمارا اعتقاد ہے۔ ہاں بزرگوں کو نبی نہیں سمجھتے۔ ان کو دربار خداوندی میں شفیع اور وسیلہ جانتے ہیں۔ کارخانہ عالم ان کے قبضہ قدرت میں نہیں سمجھتے کہ وہ جو چاہیں کریں، جس کو چاہیں دیں یا نہ دیں۔ ہاں جس سے خداوند عالم جس کام کو چاہے لے لے۔ یہ امر ثابت ہے کہ ہم ان کی قبروں کو سجدہ نہیں کرتے۔ خانہ کعبہ کی طرح ان کے مزارات کا طواف نہیں کرتے۔ تعزیوں میں اولاد کیلئے عرضیاں لکھ کر نہیں لگاتے۔ خدائے ذوالجلال کی صفات مختصہ میں کوئی مخلوق شریک نہیں۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کوئی ولی نہیں۔ ان کے بعد تابعین کا مرتبہ ہے۔ پھر اولیائے امت کا خیار امت (امت کے نیک لوگ) خلاصہ اسلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ممتاز فرمایا ہے۔ ان کی محبت ذریعہ نجات اور عداوت شقاوت وحرمان کی علامت جس سے سوء خاتمہ کا خوف۔ یہ ہمارے وہ عقائد ہیں جن پر اپنی موت وحیات چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمارا اسی پر خاتمہ ہو۔ ہم بالکل سچے پکے حنفی (امام ابوحنیفہؒ کے مقلد) اور سلاسل حضرات اولیا نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ کے حلقہ بگوش ہیں۔ ہاں انہی حضرات کی برکت سے بدعات سے متنفر تام (پوری نفرت کرنے والے) ہیں۔" (ماخوذ از فتویٰ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مندرجہ الختم صفحہ ۱۵)

رسول مدنی ﷺ کی محبت اور عظمت ایمان ہے:

کسی مسلمان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حضور پُر نور ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا آپ سے محبت نہیں کرتا عقل وانصاف کا خون کرنا اور فہم وفراست کا دیوالیہ پن ہے۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی

ولو انهم صبروا حتى تخرج اليهم

کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضور کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے۔ جس پر قوم مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اخوت کا نظام قائم ہے۔'' (سورہ حجرات)

آنحضور ﷺ پر کثرت درود عین ثواب ہے:

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب فاضل دیوبند و سابق مدرس و صدر المدرسین مظاہر العلوم اپنی کتاب مہند میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک آنحضرت ﷺ پر درود شریف کی کثرت مستحب اور نہایت موجب اجر و ثواب ہے۔ لیکن افضل ہمارے نزدیک وہ درود ہے جس کے لفظ آنحضرت ﷺ سے منقول ہیں۔ گو غیر منقول کا پڑھنا بھی فضیلت سے خالی نہیں۔'' (مہند صفحہ ۱۸)

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے:

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سابق سرپرست دیوبند اپنے ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ نقائص اور عیبوں سے پاک ہے۔ اس کے کلام میں ہرگز ہرگز کذب کا شائبہ نہیں ہے۔ یعنی جھوٹ کے کروڑویں کے کروڑویں حصے کا بھی احتمال نہیں نکل سکتا۔ آیت کریمہ

ومن اصدق من اللہ قیلا

اللہ سے زیادہ کون سچا ہو سکتا ہے

پر ہمارا ایمان ہے۔ جو شخص ایسا نہ مانے وہ قطعاً کافر اور ملعون ہے۔ اور مخالف قرآن و حدیث اور اجماع امت کا ہے۔ وہ ہرگز مومن نہیں۔''

(بحوالہ شہاب ثاقب از مولانا حسین احمد صاحب صفحہ ۱۰۰)

میلاد شریف اور علمائے دیوبند:

علمائے دیوبند پر یہ ایک بہتان ہے کہ وہ مطلقاً حضور پُر نور ﷺ کی پیدائش کے

حالات بیان کرنے کو پسند نہیں کرتے۔ بھلا یہ بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ مولانا خلیل احمد صاحب فرماتے ہیں:

> ”ذکر ولادت شریفہ صحیح روایات کے ساتھ صدق نیت اور اخلاص سے جبکہ وہ محفل میلاد خلاف شرع باتوں سے خالی ہو باعث خیر و برکت ہے۔ ہم پر یہ افترا ہے کہ ہم نفس مولود مبارک کو ناجائز یا بدعت سمجھتے ہیں۔“ (مہند صفحہ ۳۲)

علم غیب اور علمائے دیوبند:

علم غیب کے متعلق علمائے دیوبند کا مسلک قرآنی آیات کے ماتحت وہی ہے جو متقدمین علمائے عقائد نے تحریر کیا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ دیوبندی

وعنده مفاتح الغيب

کے ماتحت لکھتے ہیں:

> ”مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے، شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہئے اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر دینا مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں۔ جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔“ (پارہ ۹ سورہ اعراف رکوع ۱۳)

علمائے دیوبند کا رنگ اعتدال:

علمائے دیوبند افراط و تفریط سے بچ کر چلتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں کے بعض فرقوں میں ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے ایک جلسے میں ایک صاحب کے اس قول پر کہ دیوبندیوں کو بھی گلابی وہابی کہا جاتا ہے، فرمایا:

> ”الحمد للہ کہ آپ ہماری جماعت کو گلابی وہابی کہہ کر اس کی برائی نہیں بلکہ اس کی اچھائی بیان کر رہے ہیں۔ کیونکہ گلابی رنگ نہ شدید گہرا ہوتا ہے اور نہ بالکل پھیکا۔ بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال کی شان رکھتا ہے۔ علمائے دیوبند نہ احکام شریعت میں بعض

جماعتوں کی طرح سخت ہیں۔ کہ دین کو دشوار اور بوجھل بنا دیں اور نہ بعض جماعتوں کی طرح بالکل نرم ہی ہیں کہ دین کو قبر پرستی، اوہام پرستی اور جنوں اور بھوتوں کی کہانی بنا دیں۔ ہاں ان کا ایک معتدل رنگ ہے کہ وہ توحید و رسالت اور ولایت کو اپنے اپنے مقام پر رکھ کر تجاوز سے پرہیز کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اپنی گلابیت پر الحمدللہ فخر ہے۔"

تکفیر سے تابمقدور احتیاط اور باہمی رواداری:

علمائے دیوبند تابمقدور قادیانیوں کے سوا کسی مسلمانوں کے کسی فرقے کو کافر کہنے سے سخت احتیاط کرتے ہیں۔ علامہ شبیر احمد صاحب الشہاب میں محمد علی لاہوری پارٹی کے لیڈر کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ یقین کیجئے ہم کو مرزا صاحبؔ یا کسی ایک کلمہ گو کے کافر اور مرتد ثابت کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں نہ تمام شیعوں کو نہ سارے نیچریوں کو حتی کہ ان بریلویوں کو بھی کافر نہیں کہتے جو ہم کو کافر بتلاتے ہیں اور ہماری تمنا تھی کہ کوئی صورت ایسی نکل آتی کہ مرزائیوں کی تکفیر سے بھی ہم کو زبان آلودہ نہ کرنی پڑتی۔ لیکن ان کے ملحدانہ دعاوی نے جن سے بارگاہ رسالت میں سخت گستاخی ہوتی ہے اور کسی طرح ختم نبوت کا ستون کھڑا نہیں رہ سکتا، ہم کو مضطر کر دیا ہے کہ بادل ناخواستہ ان کی گمراہی سے لوگوں کو بچائیں کہ جو زہر دودھ یا مٹھائی میں مخلوط ہو گیا ہو وہ سخت خطرناک ہے۔" (الشہاب صفحہ ۲۰۔۲۱)

مولوی بہاء الحق صاحب قاسمی مفتی محمد حسن صاحب امرتسری سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے فرمایا کہ:

"اگر مجھے مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو میں پڑھ لیتا۔"

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ رشیدیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اور یہ بندہ تو شیعوں کو بھی مسلمان سمجھتا ہے۔" اوکما قال

جس زمانے میں بہاولپور میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب دیوبندی

عدالت میں قادیانی مرد کے مسلمان عورت سے نکاح کی تنسیخ کے بارے میں قادیانیوں کے کفر کو ثابت کر رہے تھے تو قادیانی وکیل نے کہا کہ دیوبندی بریلویوں کو اور بریلوی دیوبندیوں کو بھی تو کافر کہتے ہیں تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

> ''میں بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی طرف سے گذارش کرتا ہوں کہ حضرات دیوبند، بریلوی حضرات کی تکفیر نہیں کرتے۔ اہل سنت والجماعۃ اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے اور علمائے دیوبند اور بریلی میں واقعات کا اختلاف ہے، قانون کا نہیں۔ چنانچہ فقہا نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کلمہ کفر کسی شبہ کی بنا پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔'' (حیات انور صفحہ ۳۳۳)

ایصال ثواب:

مردوں کو ایصال ثواب کے وہ قطعی طور پر قائل ہیں۔ خواہ مردوں کے لئے غربا و مساکین کو کھانا، کپڑا دینے کی صورت میں ثواب پہنچایا جائے یا قرآن کریم پڑھ کر کسی مسلمان مردے کی روح کو ثواب پہنچایا جائے یا نوافل پڑھ کر مردہ والدین یا استاد یا پیر و مرشد یا کسی بھی مسلمان کو بخشے جائیں اور ایسا کرنا ان کے نزدیک قرآن وسنت سے ثابت ہے اور عقلاً بھی یہ درست ہے کہ اپنی نیکی کو انسان دوسرے کو ہدیۃً پیش کر دے اور اپنے منافع کا دوسرے کو مالک بنا دے تو عقل اس امر کو جائز قرار دیتی ہے ہاں جس کو ثواب پہنچایا جائے وہ مسلمان ہو۔ فاتحہ اور قل ہو اللہ پڑھ کر یا قرآن کریم کے دوسرے اجزاء پڑھ کر بشرطیکہ اس طریقے سے ہو جو سنت سے ثابت ہے۔ ان کا ثواب مردے کو پہنچا دینا ان کے نزدیک جائز ہے۔ ان کے نزدیک رحمت الٰہی اس قدر وسیع ہے کہ جس وقت ثواب پہنچایا جائے پہنچ جاتا ہے۔ زمان و مکان دور و نزدیک شب و روز کی ان کے نزدیک کوئی قید نہیں۔ البتہ ان سب امور کو وہ رسم و راہ دنیا سے بلند و بالا ہو کر پسند کرتے ہیں۔ لیکن اگر ایصال ثواب کا معاملہ رہ و رسم دنیا میں آ کر مقید ہو جائے اور سود پر قرض لے کر برادری کے کھلانے کے لئے کیا جائے یا سات سات دن تک مہمانوں کی آمد و رفت پر پلاؤ، زردہ، قورما، متنجن اور پھلوں کے ڈھیر لگا دیئے جائیں۔ تو اس سے مردے کو کیا ملتا ہے۔ ان ماتمی محفلوں پر سرسری نظر ڈال کر دیکھ لیجئے تو علمائے دیوبند کے نظریات آپ کو

درست نظر آئیں گے۔ غرضکہ ناک کو برادری سے کٹانے کیلئے یہ سب کاروبار ہو رہا ہے۔ لائل پور کی ایک ایسی ہی محفل میں ملوں کے سیٹھوں اور تاجروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد ایک سیٹھ صاحب جب رخصت ہونے لگے تو انہوں نے صاحب خانہ سے کہا کہ آپ کا شکریہ کہ ہم یتیموں کا خیال رکھتے ہیں۔ اس جملے نے محفل کو زعفران زار اور دیوار قہقہہ بنا دیا۔ اس جملے میں وہ کچھ آ گیا کہ ایک کتاب میں وہ مضمون نہ سما سکتا تھا۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

تمہیں بتاؤں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحا ہوگا

اگر فاتحہ پڑھتے وقت غربا کو دیا جانے والا کھانا اور پھل اتفاقیہ سامنے رکھے ہوں تو اس میں بھی کیا مضائقہ ہے۔ ہاں اگر فاتحہ کے وقت کھانا اور پھل اور پانی سامنے ہونا لازمی قرار دے دیا جائے تو وہ اس کو ایصال ثواب میں وسعت کی بجائے تنگی اور سنت کی بجائے بدعت سمجھتے ہیں اور یہ بس سنت وبدعت کا اختلاف ہے کفر واسلام کا نہیں۔

علمائے دیوبند کی وسیع الخیالی:

علمائے دیوبند کے سامنے اسلام کی تبلیغ کیلئے پورا نظام اسلام پیش نظر رہا ہے اور انہوں نے تعلیم اسلام کے ہر ہر گوشے کو ملت کے سامنے اجاگر کیا ہے۔ ان کے سامنے صرف چند محدود مسائل نہیں ہیں بلکہ پورے ضابطہ حیات کا احیا اور ہمہ گیر اور محیط اسلامی راہوں کی رہبری اور نمائندگی ہے وہ مسلمانوں میں تفریق اور اختلاف کو ہوا دینا یقیناً پسند نہیں کرتے۔ ہاں جب ان پر حملے ہوتے ہیں تو دفاع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اختلاف کو ہوا دینے سے سخت نفرت کرتے تھے:

حجۃ الاسلام مسلمانوں کی تکفیر تو کجا اختلافی مسائل چھیڑ کر ان میں تفریق کو بھی سخت ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا:

> ”فی زمانہ کفار کا غلبہ ہے وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو۔ بلکہ توڑنے کی بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔“ (سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۴۸۰ جلد اول)

کسی شخص نے قاسم العلومؒ سے علم غیب کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

> ”در مسلمانان کیست کہ قرآن، دین و ایمان او نباشد بناء علیہ تا بمقدور کسی را کافر نباید دانست۔“ (فیوض قاسمیہ صفحہ ۴۸)

مسلمانوں میں کون ایسا ہے کہ قرآن کریم اس کا دین و ایمان نہ ہو اس لئے جہاں تک گنجائش ہو کسی کو کافر نہ جاننا چاہیئے۔

علمائے دیو بند غیر جانبدار علما کی نظروں میں:

علمائے دیو بند کی اس رواداری امن پسندی اور احتیاط کے باعث پیر سید مہر علی شاہ نے فرمایا:

> ”مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا، مولانا خلیل احمدؒ سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیو بندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے۔ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے۔ اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانین اور اولیائے امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے مگر میرا اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور قبول عام ہے بالخصوص مولانا اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم کی خدمات طریقت پر نظر کر کے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں۔“

(چراغ سنت صفحہ ۲۷۰ مصنفہ مولانا سید فردوس علی شاہ صاحب)

حضرت مولانا شیر محمد صاحب شرقپوری:

صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری نے خزینہ معرفت میں اپنے پیر و مرشد میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کا قول درج کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

> ”دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ان میں سے ایک شاہ صاحب (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) ہیں۔“

اب آپ ہی غور فرمایئے کہ مذکورہ بالا حضرات جو نہ تو دیوبند کے تعلیم یافتہ نہ ان حضرات کے مرید ہیں انہوں نے انصاف پسندی کے ماتحت علمائے دیوبند کو ان عقائد کے ہوتے ہوئے جو شاہ ولی اللہ اور امام ابوالحسن اشعری سے انہیں وراثت میں ملے ہیں، اپنے زمانے کے علمائے ربانی بعض کو مجدد اور بعض کو علم الٰہی کا مظہر اتم کہا ہے۔ مولانا ابوالحسنات صاحب خطیب مسجد وزیر خان لاہور بریلوی مکتبہ فکر کے مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے ۱۷/اپریل ۱۹۵۵ء کو جماعت اسلامی کے اجتماع سے اچھرہ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ”میں اعلان کئے دیتا ہوں کہ اساسی عقائد کے اعتبار سے دونوں مکتبوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ بریلوی علا حضرت رسول اکرم ﷺ کی ادنیٰ توہین کرنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں اور دیوبند کے علا بھی اصولی طور پر (بلکہ ہر طور پر) اس کلیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ دونوں سلسلوں کے علا کی درمیان بعض عبارتوں کے متعلق رائے کا اختلاف ہے۔ بریلوی علماء، دیوبندی علا کی بعض تحریروں پر معترض ہیں اور یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان تحریروں کے ظاہری معانی کو (حقیقی اور اصلی معنوں کو نہیں) صحیح سمجھنے والا گمراہ ہے۔ دیوبندی اپنے اکابر کی ان تحریروں کو قابل گرفت یا مورد تنقید خیال نہیں کرتے۔ لیکن اصول و اساس میں بریلوی علما سے سو فیصد متفق ہیں۔“

(نوائے پاکستان اخبار لاہور ۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء)

غرض یہ ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو فہمیدہ علما اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ علمائے دیوبند دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور اسی طرح دار العلوم دیوبند کا اپنی اسلامی چال ڈھال کے اعتبار سے کہیں کوئی جواب نہیں۔

دارالعلوم دیوبند علامہ رشید رضا کی نظر میں:

ندوۃ العلماء لکھنو کی دعوت پر مفتی محمد عبدہ کے شاگرد رشید علامہ رشید رضا جب ہندوستان آئے اور انہوں نے ندوۃ، علیگڑھ، مظاہر العلوم کا معائنہ کیا تو بعد ازاں ۵/ اپریل ۱۹۱۲ء کو دارالعلوم دیوبند آئے تو انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

ولولم ارھا لرجعت من الھند حزینا

اگر میں دارالعلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو ہند سے غمگین لوٹتا۔

مصر پہنچ کر انہوں نے اپنے رسالے المنار میں لکھا:

ماقرت عینی فی الھند کما قرت بردیۃ مدرسۃ دیوبند ولا سرت بشیء ھنک کسرورھا بما لاح لھامن الغیرۃ والاخلاص فی علما ھذہ المدرسۃ۔ (المنار شعبان ۱۳۳۰ھ)

ہندوستان بھر میں میری آنکھ کو ایسی ٹھنڈک کہیں نصیب نہیں ہوئی جیسی دارالعلوم دیوبند میں اور نہ اتنی خوشی کہیں حاصل ہوئی جتنی وہاں ہوئی اور یہ اس غیرت اور اخلاص کی وجہ سے جو میں نے اس مدرسے کے علماء میں دیکھی۔

بعض انگریزی خواں لوگوں نے علمائے دیوبند کے متعلق علامہ رشید رضا سے کہا کہ علمائے دیوبند پرانے خیالات کے متعصب حضرات ہیں۔ اس خیال کی تردید کرتے ہوئے علامہ نے اسی مضمون میں آگے چل کر لکھا:

وکان کثیر من اخوانی المسلمین فی بلاد الھند المختلفہ یذکرون لی ھذہ المدرسۃ و یصف راجال الدنیا منھم علماء ھا بالجمود والنصب و یظھرون رغبتھم فی اصلاح تعمیم نفعھا و قد رایتھم وللہ الحمد فوق جمیع ماسمعت عنھم من ثناء وانتھاد

(منار شعبان ۱۳۳۰ھ)

میرے سامنے ہندوستان کے مختلف شہروں میں بہت سے مسلمان بھائیوں نے اس مدرسے کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا اور بہت سے دنیادار لوگوں نے علمائے مدرسہ کے

متعلق جامد و متعصب ہونے کا خیال ظاہر کر کے اپنی رغبت اس کی اصلاح اور تعمیم نفع کی طرف ظاہر کی لیکن خدا شکر کرے کہ میں نے ان علما کو مدح کرنے والوں کی مدح اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینیوں سے بہت بلند پایا۔

دارالعلوم دیوبند شیخ الاسلام فلپائن کے خیال میں اہلسنت والجماعۃ کا مدرسہ ہے:

فلپائن کے شیخ الاسلام شیخ وجیہہ الدین ہندوستان کے شہروں کی درسگاہوں اور دہلی اور علیگڑھ دیکھتے ہوئے جب ۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء کو دیوبند پہنچے تو دارالعلوم کو دیکھ کر انہوں نے فرمایا:

> انی رأیت فی هذه المدرسة انواراً فوق نور فی درر تاج الملوک و انها بنیت علی التقوی والتعلیم فیها تعلیم اهل السنة والجماعة.
>
> میں نے اس مدرسے میں ایسے انوار دیکھے ہیں جو بادشاہوں کے تاج کے موتیوں کے نور سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ اس مدرسے کی بنیاد تقویٰ پر اور اس کی تعلیم اہل سنت والجماعت کی تعلیم ہے۔

ترکستان کے شیخ الاسلام نے دو باتیں فرما کر یعنی یہ کہ اس دارالعلوم کی بنیاد تقوے پر ہے اور یہ کہ اہل سنت والجماعت کے مطابق یہاں تعلیم ہے تمام باتوں کا فیصلہ کر دیا جس کے بعد کسی کو بولنے کی گنجائش باقی نہیں۔

علمائے جامع ازہر قاہرہ (مصر) کے علما کا خیال:

عہد ماضی میں تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے جبکہ علمائے ازہر (مصر) کا ایک وفد دارالعلوم دیوبند آیا۔ اس وقت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ دارالعلوم کے وائس چانسلر تھے۔ وفد کے امیر شیخ ابراہیم جبالی نے تقریر میں فرمایا جو آئینہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے:

فقد سعدنا بزيارة جامعة دارالعلوم الديوبندية وطفنا على درسها في مختلف الطبقات و اجتمعنا بمديرها فضيلة الاستاذ الشيخ شبير احمد العثماني و حضرات اساتذة الاكرمين فشهدنا ماملا قلوبنا سروراً و لمحنا للعلم في وجوههم نورا.

ہمیں جامعہ دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہم نے مختلف درجات میں پھر کر درس و تدریس کا معائنہ کیا اور اس مدرسے کے مدیر جناب شیخ شبیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی ہم نے ایسا منظر دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے بھر دیا اور ان کے چہروں پر علم کا نور دیکھا۔

اکبر الہ آبادی مرحوم نے دارالعلوم دیوبند کے متعلق فرمایا تھا ؎

ہے دل روشن مثال دیوبند
اور ندوہ ہے زبان ہوش مند

مولانا ظفر علی خان صاحب مرحوم مالک و ایڈیٹر زمیندار اخبار لاہور نے فرمایا ؎

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند — ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند — حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دو چند
اسم تیرا بامسمّٰی ضرب تیری بے پناہ — دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند
تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے نثار — قرن اولیٰ کی خبر لائی تیری الٹی زقند
تو علم بردار حق ہے، حق نگہباں ہے ترا — خیل باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند
ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو — کرلیا ان عالمانہ دین قیم نے پسند
جان کردیں گے جو ناموس پیمبر پر فدا — حق کے رستے پر کٹا دیں گے، جو اپنا بند بند
کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ — جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند
اس میں قاسم ہوں کہ انور شہ کہ محمود الحسن — سب کے دل تھے دردمن اس کی فطرت ارجمند

گرمی ہنگامہ ہے تیری حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایات سلف کا سربلند

دارالعلوم دیوبند کا ایک اجمالی منظر

دارالعلوم دیوبند کا ایک اجمالی منظر

غرضکہ دنیائے اسلام کا سنجیدہ، منصف مزاج، وسیع القلب اور روشن دماغ طبقہ دار العلوم دیوبند کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہے۔

حاجی امداد اللہ صاحبؒ کا فرمان دار العلوم کی امداد ضروری سمجھو:

سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب نے اپنی ایک تحریر میں جو دار العلوم دیوبند کے رسالے میں شائع ہوئی تمام متوسلین اور مریدین ومعتقدین کو دار العلوم کی امداد کیلئے توجہ دلائی ہے لکھتے ہیں:

> ”بعد حمد وصلوٰۃ کے فقیر امداد اللہ ان کی خدمت میں جو صاحب اس فقیر سے علاقہ محبت اور ارادت اور قرابت رکھتے ہیں۔ خواہ قرابت حسبی ہو یا نسبی، عرض ہے کہ مدرسہ عربیہ دیوبند جو اس وقت میں اپنی خوبی سے نہایت رونق اور شہرت پر ہے فقیر کو اس سے ایک علاقہ خاص ہے بلکہ یہ مدرسہ اپنا ہی مدرسہ سمجھیں اور جو کچھ اعانت اس مدرسہ کی اپنی ذات سے ہو سکے یا سعی اور سفارش سے ممکن ہو اس میں ہمیشہ ساعی رہیں اور نگرانی اس مدرسے کی اپنی ذمہ ضروری سمجھیں کیونکہ اس آخری زمانہ میں جو مقبولیت بارگاہِ الٰہی میں کارخانہ علم کو ہے اور کسی امر کو نہیں اور سب صاحب اس مدرسے کے باب میں بلکہ ہر امر میں متفق ویک دل ویکجہت ہو کر ہمت فرمادیں۔ کیونکہ اتفاق اللہ جل شانہ کے نزدیک نہایت مقبول اور ہر کام میں موجب انجام نیک ہے۔“

ہم دار العلوم کے متعلق یہ بتا رہے تھے کہ یہ ادارہ تمام دنیائے اسلام کی آنکھ کا تارا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے دین اور وطن دونوں کی بے شمار بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ تصنیف وتالیف، تحریر وتقریر، ابلاغ وتبلیغ، وعظ وپند، سیاست وادب غرضکہ ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں کی مقدور بھر خدمات انجام دی ہیں ہم نے حیات امداد کے اول میں نہایت مبسوط ومفصل مقدمہ تحریر کیا ہے اسے پڑھ کر یقیناً آپ کے دل کو تسکین نصیب ہوگی اس میں ہم نے علمائے دیوبند کی مذکورہ بالا خدمات کی تفصیلات کا بھرپور منصفانہ جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب اور اس کے مقدمے کو پڑھ کر استاذ محترم حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب نے راقم الحروف کے نام ایک مکتوب گرامی میں جو تاثرات قلبی تحریر فرمائے ہیں اس کے کچھ اقتباسات حسب

ذیل ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند

محترمی ومکرمی زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون...... کتاب مستطاب حیات امداد و بصیرت افزائے نظر و فکر ہوئی اس کا ابتدائی تفصیلی مقدمہ پڑھا بے حد مسرت ہوئی۔ آپ نے نہایت ہی پاکیزہ انداز میں دیوبند اور بزرگان دیوبند کا تعارف کرایا ہے جو حقیقی اور واقعی ہے...... حیات امداد حیات افروز کتاب ہے نصف کے قریب اسے دیکھ چکا ہوں اور برابر دیکھ رہا ہوں...... آپ نے ان بزرگوں کو روشناس کرا کر ایک بڑی خدمت کا سہرا اپنے سر باندھا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دارین میں اس کا صلہ عطا فرمائے۔ حیات امداد کے بعد دوسری جلدوں کا ابھی سے انتظار شروع ہوگیا ہے۔

والسلام

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند ۱۵ محرم ۱۳۸۵ھ"

میدان سیاست اور آزادی ہند و پاک میں

علمائے دیوبند کی جدوجہد:

حضرت قاسم العلوم کے دارالعلوم دیوبند کا بانی ہونے کا یہ بھی ثبوت ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مجاہدین کو عبوری شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اب وہ مذہب اور دین کے احیا اور فروغ میں مسلمانوں کی بقا اور ملت کی حیات مضمر سمجھتے تھے اور ایسا خیال اکثر اسی کے دل میں آسکتا ہے جو ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں سے پورے طور پر گزرا ہو اور قوم کے مستقبل کا فکر مند ہو۔ حضرت قاسم العلوم کا مقصد دارالعلوم کی فضا سے علما اور مجاہد علما پیدا کرنا تھا۔ آپ کے شاگرد رشید اور مزاج شناس رازداں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا نے مولانا مناظر احسن گیلانی کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا:

"۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ناکام ہونے کے بعد حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم

> صاحب) نے اس مدرسے کو جو قائم کیا تو تعلیم سے زیادہ ان کی غرض کچھ اور تھی۔ (یعنی مجاہد پیدا کرنا اور انگریزوں کے خلاف مجاہدانہ روح پھونکنا)"

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد اول صفحہ ۲۷۹ حواشی)

یہی وہ حقیقت تھی جس کے متعلق جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ رامپور منہاران (سہارنپور) کے بعض فساد پسند مخالفوں نے حضرت قاسم العلوم کے خلاف حکومت کو اطلاع دی کہ:

> "مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں ایک مدرسہ گورنمنٹ کے مقابلے میں کھولا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ سرحد کے لوگوں سے تعلقات پیدا کئے جائیں تا کہ گورنمنٹ سے جہاد آسان ہوجائے۔ یہ مدرسہ خفیہ طور پر طلبہ کو قواعد جنگ کی تعلیم دیتا ہے اور ہندوستان پر چڑھائی کیلئے کابل کو تیار کررہا ہے۔ ہم گورنمنٹ کو خیر خواہانہ اطلاع دیتے ہیں۔" (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۵۱)

یہ رپورٹ بتاتی ہے کہ حضرت قاسم العلوم کا مقصد وہی تھا کہ جو شیخ الہندؒ نے مولانا مناظر احسن گیلانی سے فرمایا تھا۔

حضرت قاسم العلوم کا مقصد انگریزوں کو نکال کر خالص مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا تھا:

حکومت انگلیشیہ میں مفسدین کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت قاسم العلومؒ کا نظریہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا تھا اور متحدہ قومیت کے قطعاً قائل نہ تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا نظریہ حکومت:

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسی تحریک کو لے کر اٹھے اور ان کا مقصد بھی آزاد قبائل، امیر افغانستان اور شاہ ایران اور سلطان ترکی کو متحد کر کے ہندوستان پر حملہ کرانا اور مسلمانوں کی حکومت قائم کرنا تھا۔ ریشمی رومال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی تحریک تھی۔ وہ جب مالٹا سے ۱۹۱۹ء کے آخر میں رہا ہو کر دیوبند واپس تشریف

لائے تو تحریک خلافت شباب پر تھی۔ آپ کا سب سے پہلا خطبہ صدارت جو جمعیۃ العلمائے ہند دہلی کے اجلاس ۱۹۲۰ء میں پڑھا گیا اس میں انہوں نے تحریک خلافت میں مسلمانون کے ساتھ ہندوؤں کے تعاون کے بارے میں صاف طور پر فرمایا درانحالیکہ تحریک خلافت اور آزادی ہند کو مسلمان لے کر اٹھے تھے اور ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو گئے تھے:

> "برادران وطن نے تمہاری اس مصیبت میں جس قدر تمہارے ساتھ ہمدردی کی ہے اور کررہے ہیں وہ ان کی اخلاقی مروت اور انسانی شرافت کی دلیل ہے۔ اسلام نے احسان کا بدلہ احسان قرار دیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ احسان اس کا نام ہے کہ آپ اپنی چیز کسی کو دے دیں کسی دوسرے کی چیز اٹھا کر دے دینے کو احسان نہیں کہتے اس لئے آپ برادران وطن کے احسان کے بدلے میں وہی کام کرسکتے ہیں جو اخلاقی اور شریفانہ طور پر اپنے اختیارات سے کرسکتے ہوں۔ مذہبی احکام خدا کی امانت ہیں اس پر تمہارا اختیار نہیں ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ حدود مذہب کے اندر رہ کر تم احسان کے بدلے میں احسان کرو اور دونوں قوتیں مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلے کیلئے کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے مذہب اور تمہاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔" (خطبہ صفحہ ۳۰)

یہ ہے سیاست ملک میں شیخ الہند کا نظریہ کہ ہندوؤں کی طرف سے اسلام اور اس کی حدود میں کسی نقصان یا مداخلت کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں برہمن کی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۶ء تک کی تمام متعفن اور گندہ وسیسہ کاریوں کا جواب دے دیا گیا ہے۔ واردھا سکیم، نہرو رپورٹ، دیہات سدھار سکیم، ودھیا مندر سکیم، کانگریس کی وزارت یہ سب وہ مسلم کش سکمیں تھیں جو شیخ الہند کے نظریۓ کے قطعاً مخالف اور تا کی تہ میں مداخلت فی الدین کی گھناؤنی سازش تھی یہ بھی معلوم ہوا کہ مل کر آزادی تو حاصل کرسکتے ہیں لیکن ایسا نہیں کرسکتے کہ جس میں مسلمان مغلوب ہوں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی اور سیاست ہند:

علمائے دیوبند کفار سے معاملہ خرید و فروخت، شرکت تجارت وغیرہ اور باہمی رواداری اور اخلاق کے معاملے کو تو مباح فرماتے ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ نے کیا ہے لیکن ایسی

کسی چیز کی اجازت نہیں دیتے جس سے مسلمان مغلوب یا دین میں مداخلت ہو۔ حضرت گنگوہی نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ آیا کانگریس میں شرکت جائز ہے جو ہندو اور مسلمان وغیرہ ساکنین ہند کے واسطے رفع تکالیف و جلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ بحث انہی امور میں ہو جو کل جماعتہائے ہند پر موثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو یا خلاف سرکار ہو تو ایسی جماعت میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟

حضرت گنگوہیؒ کا جواب:

> اگر ہندو مسلمان باہم شرکت بیع و شراکت و تجارت میں کرلیویں اس طرح کہ کوئی نقصان دین میں یا خلاف شرع معاملہ کرنا اور سود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آئے جائز ہے اور مباح ہے۔ اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملے سے بھی کوئی خلاف شرع امر لازم آتا ہو یا مسلمانوں کی ذلت واہانت یا ترقی ہنود ہوتی ہو وہ کام بھی حرام ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ اسی طرح پر ہے اور بس۔ فقط بندہ رشید احمد گنگوہی۔"

(فتویٰ ۱۳۰۶ھ از رسالہ نصرۃ الابرار)

دیکھئے حضرت گنگوہیؒ بھی مسلمانوں کا غلبہ چاہتے ہیں اور ان کا مقصد ہنود کے ساتھ شرکت سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاملات دنیاوی میں شرکت مباح ہے۔ بشرطیکہ خلاف شرع کوئی کام نہ ہو سکے۔ اور صاف فیصلہ فرمادیا کہ جس شرکت میں ترقی ہنود ہوتی ہو وہ بھی حرام ہے۔ کجا یہ کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب علمائے دیوبند میں وہ واحد ہستی ہیں جو تحریک خلافت کے پُرجوش دور میں بھی ہندوؤں کے ساتھ سیاست میں اشتراک اور تعاون کو ہرگز ہرگز نظر میں نہ لاتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے سخت حامی تھے اور کانگریس کے سخت مخالف۔ انہوں نے قائداعظم کی خدمت میں کئی وفد اس لئے بھیجے کہ ان کو دین پر چلنے کی تبلیغ کریں اور قائد

اعظم ان کی دل سے بے حد قدر کرتے تھے۔ چنانچہ قائد اعظم نے فرمایا تھا:

> ''مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علما کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔''

(تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی صفحہ ۹۶)

حضرت حکیم الامت مسلم لیگ اور قائدین مسلم لیگ کی اصلاح فرماتے رہے آپ ''اعلام نافع'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''میں خود اس مسلم لیگ کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھیجے جاتے ہیں، اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علما بھی مل کر ان پر زور دیتے اور ان کو نماز، روزہ، وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔''

(افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ صفحہ ۸۶)

غرض یہ ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب جو خود دارالعلوم دیوبند کے سرپرست اور اس کے فاضل ہیں انہوں نے اور ان کے تمام خلفا اور مریدین نے جن میں دیوبند کے بہت سے فضلا تھے مسلم لیگ کی بڑی تائید کی جو آگے چل کر پاکستان کی صورت میں نمودار ہوئی۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ:

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی سے کون واقف نہیں جن کی تفسیر قرآن گھر گھر پڑھی جاتی اور جس کے بیسیوں ایڈیشن چھپ کر ہند و پاکستان میں شایع ہوئے۔

علامہ شبیر احمد صاحب دارالعلوم کے مایہ ناز فرزند ہیں ہم نے ان پر مستقل کتاب ''تجلیات عثمانی'' لکھی ہے جو کئی سال ہوئے چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور دوسری کتاب ''حیات عثمانی'' راقم الحروف نے مرتب کر لی ہے لیکن چھپی نہیں مگر ان کے مکتوبات جو اس ناچیز نے مرتب کئے ہیں عنقریب چھپ کر آنے والے ہیں۔ علامہ عثمانی کے علم و فضل کے متعلق بڑے بڑے لیڈروں، علماء، صحافی حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک دفعہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

نے لاہور میں ذبیحہ گاؤ پر تقریر فرمائی سر شفیع صدارت کر رہے تھے تقریر ختم ہوئی تو سر شفیع نے روتے ہوئے کہا:

> ''کاش میری والدہ مجھے بھی پڑھنے کے لئے وہاں بھیجتی جہاں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تعلیم پائی ہے۔'' (حالات دار العلوم ۱۳۸۳ھ صفحہ ۶)

بہر حال علامہ عثمانی کی ہستی ہند و پاک بلکہ دنیائے اسلام میں اور بالخصوص پاکستان کے شیخ الاسلام ہونے کی حیثیت سے عظیم المرتبہ ہستی تھی۔ انہوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کے نظرئے کی اس قدر بھرپور خدمت کی ہے کہ قائد اعظم کے بعد یہی ایک شخصیت تھی جس نے پاکستان کی تعمیر میں زبردست حصہ لیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا یہی وجہ ہیکہ مسلم لیگ میں ان کی شرکت سے مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک تمام ہندوستان میں غلغلہ مچ گیا اور شریعت کی روشنی میں انہوں نے مسلمانانِ ہند و پاک کو مسلم لیگ میں شرکت اور نظریہ پاکستان کی حمایت کی راہ دکھلائی جس سے مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے تسکین حاصل ہوئی آپ نے ہی صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں پاکستان کے لئے فتح کا جھنڈا بلند کیا۔ انہی خدمات کا اثر تھا کہ آپ پاکستان کی مرکزی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور آپ ہی کی کوششوں سے پاکستان کا قانون اسلامی بنایا جانا طے ہوا جو کسی وقت بھی انشاء اللہ عملی صورت اختیار کر کے رہے گا۔

غرض یہ ہے کہ علمائے دیوبند میں بہت سے حضرات مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کے حامی تھے اور یہ کہنا کہ علمائے دیوبند کانگریس کے حامی تھے سراسر الزام ہے۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی فاضل دیوبند:

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سے بھی کون واقف نہیں وہ بھی دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزند تھے جو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کا تختہ الٹنے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی تجاویز کو مولانا عملی جامہ پہنانے کے لئے قبائلی علاقوں اور کابل کی خاک چھان رہے تھے۔ اسی اسکیم میں مولانا منصور انصاری فاضل دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے داماد بھی شریک تھے۔

سب شاہ ولی اللہ کی راہ پر:

جیسا کہ ہم نے حیات امداد کے مقدمے میں لکھا ہے اب بھی یہ عرض کرتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیزؒ ہوں یا شاہ محمد اسماعیلؒ، مولانا محمد قاسم صاحب ہوں یا مولانا سید احمد صاحبؒ شہید شیخ الہند ہوں یا مولانا اشرف علیؒ، مولانا حسین احمدؒ صاحب ہوں یا مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی سب کے سب شاہ ولی اللہ کی تحریک میں منسلک تھے اور ان کی تحریک صرف ایک تھی اور وہ یہ کہ ہندوستان سے انگریزوں اور غیر مسلموں کی قوت کو پامال کر کے مسلمانوں کی حکومت کو سنبھالا دیا جائے یا دوبارہ قائم کیا جائے۔

صوبہ سرحد میں اسلامی حکومت:

حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ جب سندھ کی راہ سے کابل کی سرحد پر پہنچے اور وہاں سے صوبہ سرحد پر حملہ کر کے انہوں نے اس کو زیرنگیں کر لیا تو اس علاقے میں اسلامی قانون نافذ کیا اور اسی طرح وہ سارے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت کو بحال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے سوا اپنے لشکر میں کسی مرہٹے، کسی برہمن کسی راجپوت کو ساتھ لے کر ہندوستان میں ہندو مسلم حکومت کا مشترکہ خواب نہیں دیکھا۔

۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، مولانا رحمت اللہ صاحبؒ کیرانوی اور تمام علمائے دیوبند کا نظریہ یہ تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کو بحال کیا جائے اور سلطنت مغلیہ کو دوبارہ برسرِ اقتدار لایا جائے کسی ہندو یا سکھ کی شرکت کا حکومت میں تصور بھی نہ تھا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اکبر کے زمانے میں شعائرِ اسلامی کے زوال اور اسلامی قدروں کی پامالی اکبر کی طرف سے ہندوؤں کو غیر معمولی رعایات اور ان کا زور، مان سنگھ، بھارمل، بھگوان داس، راجہ بیربل اور ٹوڈرمل کا حکومت کے سیاہ وسفید میں اختیار دیکھا دین الٰہی کے روز بروز سر نکالنے کے انداز، دین اسلام میں اکبر کی مداخلت، ابوالفضل کی دین

الٰہی میں خلافت کے انداز اور جہانگیر کے زمانے میں طرح طرح کے اسلام کش فتنے ابھرتے دیکھے تو انہوں نے اکبری الحاد کو للکارا اور مسلمانوں کو بیدار کیا اور ہندو مسلم میں امتیاز قائم کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ اسلام اور کفر دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے آپ نے مسلمانوں کو چونکایا اور فرمایا۔

''اسلام اور اہل اسلام کی عزت کفر اور اہل کفر کی خواری ہے۔''

انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں فرمایا:

> ''اور قرون ماضی کفار برلا بہ طریق استیلا اجرائے احکام کفر در دارالاسلام برملا می کردند و مسلمانان از اظہار احکام اسلام عاجز بودند و اگر میکردند بقتل می رسیدند۔ واویلا وامصیبتا واحسرتا واحزنا نام محمد ﷺ کہ محبوب رب العالمین است معتقدان او ذلیل وخوار بودند۔ منکران اور بعزت بودند، آں بسخریہ واستہزاء بر جراحتہائے ایشاں نمک پاشیدند۔''
>
> پچھلے زمانے میں کافر کھلم کھلا طاقت و جبر سے دارالاسلام میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار میں عاجز تھے اور اگر ظاہر کرتے تو قتل کیے جاتے۔ فریاد ہے مصیبت ہے، حسرت کا خون ہے، ہائے افسوس محمد ﷺ کہ رب کے محبوب میں ان کے معتقد ذلیل اور ان کے منکر عزت سے تھے۔ کافر مذاق سے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے۔

دیکھئے ان حالات میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمان امرا کی اصلاح کی اور ان کو توجہ دلائی اور کسی ہندو مسلم متحدہ قومیت کا نعرہ نہیں لگایا اور نہ کسی کافر سے مدد مانگی۔ بلکہ دو قومی نظریئے کو بیدار کر کے اصلاح کی اور جہانگیر کو راہ راست پر لا کر چھوڑا اسی دور میں ''ہروے رام'' نے رام اور رحمٰن ایک ہیں کا نعرہ لگایا اور ''بھگتی تحریک'' کی بنیاد ڈالی اس کا مقصد ہی مسلمانوں کی قومیت کو مٹانا تھا مگر مجدد صاحبؒ نے ان سب فتنوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکی۔ جس کا ثبوت جہانگیر کا آخری زمانہ اور شاہجہان اور عالمگیر کا پورا دور تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ:

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جب مغل بادشاہوں کا زوال اور مرہٹوں کی روز افزوں

طاقت کا اندازہ لگایا جنہوں نے پورے ملک میں قتل وغارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور مسلمانوں کی انفرادیت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا تو آپ نے ہندو مسلم متحدہ قومیت کا نعرہ بلند نہیں کیا بلکہ مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی جو ان کے زمانے میں عظیم المرتبت شخصیتیں تھیں چنانچہ احمد شاہ ابدالی ہندوستان آئے اور ان کی مرہٹوں سے پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست سے تمام مہاراشٹر میں صف ماتم بچھ گیا۔ (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات خلیق احمد نظامی)

حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ:

جب حضرت مولانا سید احمد شہید نے ہندوستان میں مسلمانوں کی مقہوری اور اسلامیاں ہند کو مصیبت میں دیکھا تو انہوں نے بھی ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت کا کوئی تصور دل میں پیدا نہیں کیا بلکہ مسلمان بادشاہ شاہ بخارا کو خط لکھا۔ تحریر فرماتے ہیں:

> ”جب اسلامی بلاد پر غیر مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلے اور مقاتلے کی کوشش اس وقت تک جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس لے لئے جائیں ورنہ مسلمان گنہگار ہوں گے۔ ان کے اعمال بارگاہ خداوندی میں مقبول نہ ہوں گے اور وہ خود قرب حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔“

(مکتوب بنام شاہ بخارا سیرت سید احمد شہید از غلام رسول مہر جلد اول صفحہ ۲۵۰)

دیکھئے حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ کا نعرہ بھی اسلام اور مسلمانوں کا غیر مسلموں پر تفوق کا نعرہ ہے جس میں ہندو مسلم متحدہ حکومت کا قطعاً دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں بلکہ صرف مسلمانوں کا ہندوستان میں غلبہ مقصود ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہیدؒ:

حضرت مولانا سید احمد صاحب شہید کے رفیق جہاد نے بھی عیسائیوں اور مشرکوں کے خلاف تلوار نکالی اور دونوں کے خلاف صرف مسلمانوں کی حکومت کے قیام اور غلبے کا نعرہ

لگایا اور ہندوؤں کی طرف متحدہ حکومت کے بجائے شاہ محمود درانی سلطان ہرات کے نام خط میں لکھا:

> ”جہاد قائم کرنا اور بغاوت وفساد کو مٹانا ہر زمانے اور ہر مقام میں خدا کا نہایت اہم حکم رہا ہے خصوصاً اس زمانے میں جب کافروں اور مشرکوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے، اس بنا پر خدا کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہندو سندھ و خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنو اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔“

(مکاتیب شاہ اسماعیل شہید صفحہ ۳۷۔۳۸)

علمائے دیوبند کا نظریہ:

ان سب حالات کے پیش نظر علمائے دیوبند کا نظریہ بھی وہی مجددی، ولی اللّٰہی، سید احمدی، شاہ اسماعیلی کا دو قومی نظریہ اور مسلمانوں کا ہندوستان میں تفوق رہا ہے۔ جیسا کہ ہم نے تاریخ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

کانگریسی مسلمان:

پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پیشتر ہندوستان میں ایسے مسلمان بھی تھے جو کانگریس کے دلدادہ اور جان سے شیدا تھے۔ وہ مسلم لیگ اور نظریہ پاکستان کے قطعاً مخالف تھے اور ان میں کے بچے کھچے ابھی تک جبکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو برہمنی حکومت میں سینکڑوں جگہ بے دریغ قتل کیا گیا ہے لوٹا گیا ہے مسلمان عورتوں کی بے عصمتی کی گئی ہے، مسجدوں کی جگہ مندر بنائے گئے ہیں، کتنی جگہ اذانوں کی آوازیں سنکر ان ستم شعاروں نے موذنوں پر پتھر برسائے ہیں۔ نمازیوں پر بے دریغ ستم ڈھائے ہیں۔ مسلمانوں کی دکانوں کو آگ لگائی ہے۔ ان کے مذہبی اور قومی اذاروں کو مفلوج اور بے دست و پا کیا جا رہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی اور اس کے مہتمم کی خانہ تلاشی کی گئی ہے۔ علیگڑھ یونیورسٹی سے نہ صرف مسلم کا نام مٹانے بلکہ اس کا نام ونشان مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو جیل خانوں میں بند کر دیا گیا لیکن ہندوستان کے ان نیشنلسٹ مسلمانوں کی

ذرا بھی آنکھیں نہیں کھلتیں حالانکہ بعض کانگریس نواز رسالے اور اخبار برہمنی حکومت کی ان صاف ستم شعاریوں اور واضح مظالم کے خلاف بیسیوں دفعہ چلا چلا اٹھے ہیں۔ ان لوگوں نے کشتہ ستم مسلمانوں کے اجڑے گھروں اور مقتولین کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپتے دیکھا ہے، دورے کئے ہیں اخباروں کو رپورٹیں دی ہیں لیکن ہمارے کانگریس نواز اہل علم و قلم اس بات پر پورا زور صرف کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ دار الاسلام ہی نہیں بلکہ وہ تو دار السلام اور جنت الفردوس ہے۔

سخن شناس نہ دلبر اخطا اینجاست

ہندوستان کے باہر کے ممالک میں کانگریس کے سفر خرچ پر جا کر بین الاسلامی کانفرنسوں میں کہہ آتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مکمل امن و آزادی ہے اور وہاں جو آپس میں تھوڑے بہت جھگڑے ہو جاتے ہیں وہ بھائیوں جیسے جھگڑے ہیں ان میں کسی کو دخل نہیں دینا چاہئے۔

ان حالات سے متاثر ہو کر ہندوستان کے جذبہ اسلامی سے لبریز اکثر خواص و عوام میں ہندوستان میں ۱۹۶۷ء کے آنے والے انتخابات کیلئے ''مسلم مجلس مشاورت کا ہفتہ'' منشور یو۔ پی میں ۱۹/ اگست کو شروع ہو کر ۲۶/ اگست ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا جس کے چار سو جلسے یو۔ پی کے مختلف شہروں بلند شہر، بریلی، کانپور، الہ آباد، لکھنو، فیض آباد، پرتاب گڑھ، مراد آباد، اعظم گڑھ، فرخ آباد، بجنور، رائے بریلی، گورکھپور وغیرہ وغیرہ میں ہوئے۔

جناب محترم علی میاں اور دیگر حضرات قابل مبارک باد ہیں کہ ان کے دلوں میں حضرت مولانا سید احمد صاحب ''شہید کی روح دوڑ رہی ہے اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی رائے عامہ کو بیدار کر کے الیکشن میں حصہ لینے سے پہلے اور کسی جماعت کا ساتھ دینے سے پہلے زبان اردو، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور مسلمانوں کے دیگر حقوق منوانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ مولانا علی میاں نے کانپور کے جلسے میں فرمایا:

''اگر آج علیگڑھ ختم ہو گیا تو پھر ندوہ کی باری ہے اور پھر دیوبند کی باری ہے۔''

(اخبار ندائے ملت ہفت روزہ لکھنو صفحہ ۳)

ایک طرف تو ''مسلم مجلس مشاورت'' کی یہ مجاہدانہ کوششیں اور دوسری طرف ہفت روزہ اخبار ''بیباک'' سہارنپور لکھتا ہے:

> ''یداللہ علی الجماعۃ کے مقدس حلقوں اور جمعیۃ العلماء ہند (دہلی) کے صحیفہ گرامی روزنامہ ''الجمعیۃ'' سے کون یہ توقع کر سکتا تھا کہ یہاں بھی اتحاد بین المسلمین کے مقصد کو وطن دشمنی اور غداری کا مرادف قرار دیا جائے گا اور مجلس مشاورت کو جو جملہ مسلم جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مرکزی ادارہ ہے اور جس کے اتحاد ملی کا مقصد دراصل ملک کے قومی اور انسانی اتحاد ہی کے اعلیٰ مقصد کا رہین منت ہے اسے ملک اور مسلمانوں کیلئے ایک فتنہ اور ہلاکت بتایا جائے گا۔''

گویا الجمعیۃ اخبار دہلی ''مسلم مجلس مشاورت'' کو جیسا کہ اخبار ''بیباک'' نے لکھا ہے وطن دشمنی، غداری، فتنہ اور ہلاکت کا خطاب دے رہا ہے۔ آگے چل کر ''بیباک'' لکھتا ہے:

> ''کاش ہمارے آج کے رہنمایان جمعیت جمعیۃ علماء ہند کی شاندار روایات پر رحم فرمائیں اور انہیں یہ محسوس ہو سکے کہ ان کے ایسے ہی مجاہدانہ کارناموں کی بدولت عام مسلمانوں میں جمعیۃ علماء کا مقام کیا ہے۔ کیا ہوتا جا رہا ہے اور وہ کس طرح کچھ مریدوں اور کچھ خاص مفادات رکھنے والوں کی جماعت ہو کر رہ گئی ہے۔''

(ندائے ملت لکھنؤ صفحہ ۸۔۹ مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۶۶ء)

اخبار ''بیباک'' نے جمعیۃ علماء دہلی کو ان کے چند مفاد پرست مریدوں کی جماعت کہا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ جمعیۃ کے گذشتہ کارناموں پر آج کی جمعیۃ نے پانی پھیر دیا ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کا کوئی احترام نہیں ہے۔

رسالہ الفرقان کے مرتب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی فاضل دیوبند ''الفرقان'' ستمبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ''مسلم مجلس مشاورت'' کی مخالفت کرنے والی جمعیت العلماء کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> 'اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت الیکشن کے بارے میں مسلمانوں کی کوئی رہنمائی کرنا چاہتی ہے تو جمعیۃ علما کی طرف سے اس کی راہ میں خلل اندازی کی کیا تک ہے،

> مسلمانوں کے مختلف حلقے مل کر عام مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو جمعیت ان کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے کہ یہ فرقہ پرستی ہے، مسلم لیگیت ہے، یہ کیا مصیبت ہے کہ نہ آپ خود (رہبری) کریں نہ دوسروں کو کرنے دیں۔"

(الفرقان صفحہ ۳۔۴۔۵)

جمعیۃ العلمائے ہند کو مخلصانہ مشورہ:

ہم جمعیۃ العلمائے ہند کے اصحاب کی خدمت میں مذکورہ بالا تحریروں کی روشنی میں یہ مخلصانہ مشورہ پیش کریں گے کہ وہ اپنی سیاست میں ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے لچک پیدا کریں اور اپنا وقار قائم کرنے کیلئے ہندوستان کے مسلمانوں کی ترجمانی اس طرح کریں کہ سب مسلمانان ہند مرحبا کہہ اٹھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے جو کچھ آپ نے اختلاف کیا اس روش کو ترک کر دیں۔ جیسا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مجالس میں فرمایا کہ ہمیں اب پاکستان کے خلاف کوئی بات کہنے سے احتیاط کرنی چاہئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی نے مسلم کونشن ۱۹۶۶ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "ہم نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کی مخالفت کی ہم آخر تک تقسیم وطن کے خلاف رہے لیکن جبکہ پاکستان ایک ملک بن گیا ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں۔" (ندائے ملت لکھنو ۲ستمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۱)

لہٰذا موجودہ بزرگان جمعیت کو بھی لچکدار سیاست اختیار کرنے اور کسی بھی اسلامی ملک کی مخالفت کرنے سے محتاط رہنا چاہئے۔ ۱۹۶۵ء کی ہندو پاک جنگ میں بعض نیشلسٹ دیندار مسلمانوں نے دہلی اور جالندھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے پاکستان کے خلاف جو تقریریں کی ہیں وہ ہم نے خود سنی ہیں جن کو کسی صورت میں بھی مومنانہ فراست کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

دارالعلوم دیوبند:

یہ بھی جتا دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ دارالعلوم کسی ایک ملک کی امانت نہیں ہے یہ

تمام مسلمانوں کا سرمایہ ہے اس لئے دارالعلوم میں رہ کر کسی صاحب کو یہ حق نہیں ہونا چاہئے کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے خلاف سیاست میں حصہ لیں جس سے دارالعلوم کا وقار مٹی میں مل جائے۔

مضبوط پاکستان:

یہ بات بہت روشن ہے کہ پاکستان چھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کا دل سے بہی خواہ ہے۔ مضبوط پاکستان بھارت کے مسلمانوں کے لئے ڈھال ہے۔ اور الحمد اللہ ہمیں فخر ہے کہ ہمارا پاکستان اس قدر مضبوط اور طاقتور ہے کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء سے ۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء تک سترہ روزہ جنگ کے دوران اس نے نہ صرف بھارت بلکہ ساری دنیا سے اپنا لوہا منوالیا۔ بھارت نے پچھتر ہزار فوج سے لاہور پر اور ساڑھے پانچ سو ٹینکوں سے سیالکوٹ پر حملہ کیا لیکن دنیا نے دیکھا کہ پاکستان کے مجاہد سینوں سے بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے جا پہنچے اور اپنی جانوں پر کھیل کر ان کے پرخچے اڑا دئے۔ بعینہٖ اصحاب فیل کا نمونہ ہمارے سامنے تھا۔ آخر اتنے ٹینک سیالکوٹ میں کیوں گھس نہ سکے۔ جرمنی نے جنگ میں چار سو ٹینکوں سے جنگ لڑی تھی۔ لیکن بھارت نے دنیا کا ریکارڈ توڑ کر رکھ دیا تھا مگر مجاہدین پاکستان نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور نیا ریکارڈ قائم کیا۔

پاکستان کا جنگی جہاز اور دوارکا:

بھارت سے ۷ ستمبر کو ۴۸ ہوائی جہاز سرگودھا کی فضا پر اڑ کر پہنچے۔ سکواڈرن لیڈر ایم۔ ایم عالم نے آنِ واحد میں پانچ ہوائی جہاز گرا کر عالمی ریکارڈ قائم کیا باقی کو بھگا دیا۔ یونس حسن شہید پائلٹ نے پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے پر کھڑے ہوئے تیرہ ہوائی جہازوں کو تباہ کر کے رکھ دیا اور خود شہید ہو گیا۔ سترہ دن کی جنگ میں بھارت کے ایک سو تیرہ ہوائی جہازوں کو تباہ کیا گیا۔ پانچ سو ٹینک تباہ کئے گئے۔ ہزاروں فوجی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور ایک ہزار سات سو کے قریب قیدی بنائے گئے۔ آدم پور، ہلواڑہ، پٹھان کوٹ، دوارکا، انبالہ کے ہوائی اڈوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ بھارت جو پاکستان کو فتح کرنے آیا تھا اس کا سولہ سو

مربع میل علاقہ پاکستان کے تسلط میں آیا۔ جنگ بندی سے کچھ پہلے بھارتی بحریہ کا ایک جہاز سمندر کی تہہ میں پہنچا دیا گیا۔ بھارت کا بے شمار اسلحہ پاکستان کے ہاتھ آیا۔ چھمب اور جوڑیاں کے مضبوط محاذوں کو لمحوں میں فتح کر کے قبضہ میں لایا گیا۔ پاکستان کے بچے، لڑکے، جوان، بوڑھے اور عورتیں تن من دھن قربان کرنے کے لئے میدان میں اتر آئے۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایثار اور قربانی کے بعد مسلمانوں میں ایسی قربانی اور بہادری کی مثال نہیں ملتی۔

بھارت کی لوک سبھا میں چاون صاحب نے تالیوں کی گونج میں مژدہ سنایا کہ شام کو لاہور کے جمخانہ کلب میں چائے نوش کی جائے گی۔ بھارتی ریڈیو نے اعلان کیا کہ لاہور فتح ہو گیا۔ انارکلی میں ہماری فوجیں پھر رہی ہیں۔ امرتسر کے لوگ لوٹ مار کیلئے بسوں میں سوار اور پیدل نکل پڑے۔ لیکن ہمارے ہوائی جہازوں نے دم زدن میں ان بمباری کر کے جہنم میں پہنچا دیا۔ بے شمار لاشیں امرتسر روانہ ہوئیں۔ کہرام مچ گیا۔ امرتسر کے لوگ جالندھر، جالندھر کے دہلی بھاگ گئے اور وہاں کے علیگڑھ۔ ہسپتال زخمیوں سے بھر گئے اور جب وہاں جگہ نہ ملی تو دوسرے مکانوں میں رکھا گیا۔ دلی میں لاہور کی فتح پر مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ بھنگڑا ناچ ناچے گئے لیکن ان کی ساری خوشیوں کو اللہ تعالیٰ نے ماتم میں بدل دیا۔ آخر ہندوستان نے امریکہ کی خوشامد کی اور جنگ بند ہوئی۔

بہر حال بھارتی مسلمان بھائیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ مضبوط پاکستان بھارتی مسلمانوں کا سرپرست اور مامن ہے۔

الحاصل:

ہم علمائے دیوبند کے سیاسی کارناموں کے متعلق بات کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گئے۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ دارالعلوم دیوبند نے سیاسیات ملکی اور آزادی ہند اور تعمیر پاکستان میں بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہند، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد صاحب اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کے کارناموں سے واضح ہے اور اسی مجاہدانہ اسپرٹ کا پیدا کرنا حضرت قاسم العلوم کا منشا تھا۔

دار العلوم دیوبند کے ثمرات:

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ دار العلوم پر جو پھل لگے اس کی مثال ہندوستان تو کیا ممالکِ اسلامیہ میں بھی نہ ملے گی۔ یہاں سے بڑے بڑے نامور فاضل، مفسر، محدث، فقیہ، مجاہد، مصنف، ولی، درویش، ادیب، شاعر، منطقی، فلسفی اور معلم پیدا ہوئے جن میں سے کچھ حضرات حسب ذیل ہیں۔ جن کا ثانی دنیا نے پیدا نہیں کیا۔ مثلاً:

۱۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا
۲۔ مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی
۳۔ مولانا فخر الحسن صاحبؒ گنگوہی
۴۔ مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہوی
۵۔ مولانا اشرف علی صاحبؒ
۶۔ مولانا محمد یٰسین صاحبؒ شیرکوٹی
۷۔ مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ
۸۔ مولانا حسین احمد صاحبؒ
۹۔ مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی
۱۰۔ مولانا عبد الحق حقانی صاحبؒ
۱۱۔ مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ
۱۲۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ
۱۳۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ
۱۴۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ
۱۵۔ مولانا عبید اللہ صاحبؒ سندھی
۱۶۔ مولانا فخر الدین صاحبؒ
۱۷۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دہلوی
۱۸۔ مولانا سہول صاحبؒ
۱۹۔ مولانا رسول خان صاحبؒ
۲۰۔ مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ بلیاوی
۲۱۔ مولانا احمد علی صاحبؒ لاہوری
۲۲۔ مولانا اعزاز علی صاحبؒ
۲۳۔ مولانا عبد السمیع صاحبؒ
۲۴۔ مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ
۲۵۔ مولانا عماد الدینؒ انصاری شیرکوٹی
۲۶۔ مولانا مظہر الدینؒ شیرکوٹی
۲۷۔ مولانا محمد ادریس صاحبؒ کاندھلوی
۲۸۔ مولانا حفظ الرحمٰنؒ سیوہاروی
۲۹۔ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحبؒ
۳۰۔ مولانا محمد میاں صاحبؒ
۳۱۔ مولانا احسان اللہ خانؒ تاجور نجیب آبادی
۳۲۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحبؒ
۳۳۔ مولانا یعقوب الرحمٰن صاحبؒ عثمانی
۳۴۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ
۳۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ بجنوری
۳۶۔ مولانا احمد رضا بجنوریؒ

۳۷۔ مولانا فخر الحسن صاحبؒ دیوبندی ۳۸۔ مولانا انظر شاہ صاحب
۳۹۔ مولانا محمد علی صاحبؒ حیدر آبادی
۴۰۔ کمترین خلائق محمد انوار الحسن شیرکوٹی وغیرہ وغیرہ

یہ کس کا لگایا ہوا باغ تھا اور کس باغ میں یہ پھل لگے تو اس کا جواب آخر میں یہی ہے

یہ باغ قاسمی کے ثمرات ہیں

جس کے سدا بہار پھول جنت کے پھولوں کی طرح ہمیشہ کھلتے اور مہکتے رہیں گے اور جس کے پھل ہمیشہ دنیائے اسلام کو شیریں دہن بناتے رہیں گے۔ الٰہی اس ادارے کو قیامت تک سبز و شاداب رکھنا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے یہ باغ لگایا ان کو جنت الفردوس کی نعمتوں سے سرفراز فرمانا اور اس راقم الحروف کو بھی ان حضرات کے صدقے میں اپنی مغفرت کے دامن میں چھپا لینا کہ۔

مرے جرم سے تیری رحمت زیادہ

دیگر عربی مدارس کے بانی حضرت قاسم العلومؒ

آپ کی سب سے بڑی علمی شان کا مظہر تو دارالعلوم دیوبند ہے۔ لیکن آپ ہی کی برکت سے ہندوستان کے دوسرے حصوں اور شہروں میں بھی عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان سب کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب تھے کیونکہ آپ ہی کے نقش قدم پر دوسروں نے چلنا شروع کیا۔

مظاہر العلوم سہارنپور:

دارالعلوم کے بعد سہارنپور میں مظاہر العلوم کو مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپور رحمۃ اللہ علیہ نے یکم رجب ۱۲۸۳ھ میں محلہ قاضی میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی صاحب انبیٹھوی پہلے مدرس ہوئے جو تیرہ روپیہ تنخواہ پر رکھے گئے۔ سب سے پہلے طالب علم مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین ہوئے۔ پھر مولانا احمد علی صاحب محدث نے مدرسے کی مدد فرمائی۔ شوال ۱۲۸۳ھ میں مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی صدر مدرس ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد ۱۳۰۳ء میں مولانا عبدالعلی صدر مدرس بنائے گئے۔ ۱۳۱۰ھ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بن مولانا احمد علی صدر مدرس ہوئے۔ ۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۴ھ کو مولانا خلیل احمد صاحب صدر مدرس بنائے گئے۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ھ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب بھی مظاہر العلوم میں آ گئے۔ اور آجکل مولانا محمد یحییٰ صاحب کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مظاہر العلوم کے شیخ الحدیث ہیں مدظلہ العالی۔ (تذکرۃ الخلیل)

مدرسہ قاسم العلومؒ مرادآباد:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہی کے نام پر شاہی مسجد مرادآباد میں مدرسہ قاسم

العلوم جاری ہوا۔ پھر گلاوٹھی میں آپ ہی کی کوشش سے مدرسہ اسلامیہ کا آغاز ہوا۔ اور اس میں آپ کے مشہور شاگرد مولانا احمد حسن صاحب امروہوی صدر مدرس تھے۔ ادھر نگینہ ضلع بجنور کی جامع مسجد میں ایک دینی مدرسہ کھولا گیا۔ راقم الحروف نے بھی اس میں ایک سال تعلیم پائی اور میانجی سراج الدین صاحب سیوہاروی سے مصدر فیوض، پندنامہ، رفعات عالمگیری پڑھی۔ ابتدا میں یہاں مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی مولانا نانوتویؒ کے شاگرد تعلیم دیتے رہے۔

ایک دفعہ مولانا فخر الحسن صاحبؒ نے مولانا نانوتوی سے یہاں کے لوگوں کی بے پروائی کی شکایت کی اور اپنے قیام کو دشوار سمجھا تو مولانا نانوتویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

> ”باطلاع تزلزل بنائے مدرسہ نگینہ بدو وجہ رنج دارم یکی از طرف آں عزیز دوم از طرف اہل نگینہ کہ چہ کم حوصلگی کردند۔ آرے ہر نعمتے کہ بے سابقہ جدو جہدی رسد ناقدر شناساں ہمیں ساں ضائع می کنند۔ یارب ایں چہ زمانہ است کہ از شرفا فہم برگرفتند چوں بنظر غور منگرم ایں ہمہ نیز نگہار بے نیازی است صدق رسول الکریم ”یرفع اعلم“ بظاہر چناں می نماید کہ اگر ایں خواں نعمت را از نگینہ خواہند برداشت باز نخواہند گسترانید انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ (گیارہواں مکتوب مجموعہ قاسم العلوم صفحہ ۲)
>
> نگینے کے مدرسے کی بنیاد میں خلل پڑ جانے کی اطلاع سے دو وجہ سے غم رکھتا ہوں ایک آں عزیز کی طرف سے دوسرے اہل نگینہ کی طرف سے کہ انہوں نے کیا پست ہمتی کی ہے۔ ہاں جو نعمت بغیر کسی سابقہ کوششوں کے پہنچ جاتی ہے اس کو ناقدرے اسی طرح ضائع کرتے ہیں یارب یہ کیا زمانہ ہے کہ شرفا سے سمجھ اٹھ گئی۔ جب میں بنظر غور دیکھتا ہوں تو یہ سب بے پروائی کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں رسول کریم نے سچ فرمایا کہ علم اٹھ جائے گا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس خوان نعمت کو نگینہ سے اٹھائیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ نہ بچھائیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہرحال ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبات میں مدارس اسلامیہ کا اجرا ہوتا رہا چنانچہ مظفر نگر، مراد آباد، رڑکی، خورجہ، منگلور اور نگینے میں مدارس کھولے گئے۔

مدارس کا الحاق دار العلوم دیوبند سے:

دار العلوم دیوبند کو قدرت نے مرکزی مقام عطا فرمایا اور دیگر مدارس عربیہ اس کی شاخیں قرار دی گئیں۔ ۱۲۹۳ھ کی روئداد دار العلوم دیوبند میں ہے:

> ”اس مدرسے کی چند شاخیں بھی اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں منجملہ ایک انبیہٹہ پیرزادگان ضلع سہارنپور میں اور دو تھانہ بھون ضلع مظفر نگر اور شہر مظفر نگر میں اور ایک گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں ہے۔“ (صفحہ ۴۲)

گویا دار العلوم ایک یونیورسٹی تھی اور باقی ہندوستان کے عربی مدارس اس کے ماتحت تھے۔ چنانچہ اسی حقیقت کے ماتحت دار العلوم سے اساتذہ ان مدارس کا سالانہ امتحان لینے جاتے تھے دار العلوم کی ۱۲۹۳ھ کی روئداد میں گلاوٹھی کے مدرسے کے بارے میں یہ تحریر پڑھیے:

> ”مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول نے بہمراہی مہتمم مدرسہ دیوبند اس مدرسے کا امتحان لیا۔“ (روئداد صفحہ ۴۲)

بلکہ ۱۲۹۳ھ کی روئداد میں ایک تجویز بھی پیش کی گئی ہے جو حسب ذیل ہے:

> ”ارباب مشاورت مدرسہ دیوبند کے نزدیک جن کے سپرد اب ان مدارس کا امتحان وغیرہ رکھا گیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر مہتممان شاخہائے مذکور اپنے اپنے مدارس کے چندے سے تھوڑی تھوڑی امداد فرمائیں تو ان مدارس کے امتحان اور نگرانی تعلیم کیلئے ایک گروہ اور مقرر کیا جائے جو ماہوار یا دوسرے مہینے جیسا کہ اتفاق پڑے ان مدارس کا امتحان لیا کرے اور جو کسی قسم کی ابتری یا خرابی دیکھا کرے تو اس کے دور کرنے کی حسب رائے مہتممان تدابیر کیا کرے۔“ (صفحہ ۴۳)

کیرانہ ضلع مظفر نگر میں بھی جہاں کی مشہور ہستی مولانا رحمت اللہ صاحبؒ تھے، مدرسہ عربی جاری کیا گیا اور علاوہ عام چندے کے یہ تجویز بھی کی گئی:

> ”یہاں کے رقبے میں چاہ بکثرت ہیں۔ اگر سر چاہ ایک من غلہ مقرر کیا جائے تو بہتر ہے چنانچہ اس پر اکثر اصحاب راضی ہو گئے۔“ (روئداد دار العلوم دیوبند ۱۲۹۴ھ صفحہ ۶۰)

دارالعلوم دیوبند کی ۱۲۸۵ھ کی روئداد میں حسب ذیل خبر بھی آپ کی نظروں سے گذرے گی:

''نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت نے اجرائے مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقامات مختلفہ دہلی، میرٹھ، خورجہ و بلندشہر و سہارنپور، دکن وغیرہ جاری فرمائے اور دوسری جگہ مثل علیگڑھ وغیرہ اس کارِ خیر کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔''

پھر اسی سال کی روئداد میں ایک یونیورسٹی کے ماتحت شاخوں کی طرح دارالعلوم دیوبند کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے:

''امید کرتے ہیں کہ ہم کو بھی وہاں کے حالات و حساب کتاب سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے مہتمم کرتے ہیں مطلع فرماتے رہیں۔ تاکہ جو عمدہ انتظام ان کے مدارس میں تجویز ہو وہ یہاں بھی جاری کئے جایا کریں اور یہاں سے وہاں اور نتیجہ اس نیک تدبر کا یہ ہوگا کہ انتظام سب جگہ کے قریب قریب یکساں ہو جائیں گے۔''

(روئداد ۱۲۸۵ھ صفحہ ۴۴)

دیکھئے یہ تجویز حضرت قاسم العلوم ہی کے زمانے کی ہے۔ جبکہ دارالعلوم دیوبند کو ابھی جاری ہوئے ۱۲۸۳ھ کے بعد دو تین سال ہوئے ہیں۔ گویا دو تین سال کے اندر ہی قاسم العلوم کے زمانے میں آپ کے ارشادات کے مطابق ہندوستان میں مدارس کا جال بچھا دیا گیا تھا۔ یہی حقیقت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ نے اپنے رسالے ''ہدیہ سنیہ'' میں ظاہر کی ہے۔ دارالعلوم کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وکم من مدارس طبعت علی مثالها و سبحت علی منوالها کل ذالک ببرکات انفاس مولانا قاسم الخیرات. (صفحہ ۳)

''اور کتنے ہی مدارس دارالعلوم دیوبند کی طرح کے جاری کئے گئے اور اس کی طرز پر بنائے گئے اور یہ سب مولانا قاسم الخیرات کے انفاس کی برکتوں کا نتیجہ ہیں۔''

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب لکھتے ہیں:

> "اس مدرسہ دیوبند کو کیونکہ اس چشمہ فیض کے منبع اور اس آب حیات کے مصدر اور اس آفتاب عالمتاب کے مظہر آپ ہی تھے۔ اللہ اللہ اس کارخانہ خیر کی ترقی میں کیسی کیسی ہمتیں لگائیں۔ حق تو یہ ہے اس شمس الاسلام (مولانا محمد قاسم صاحب) ہی کے حسن سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ ملک ہند میں باایں ہمہ ضعف اسلام و اسلامیان علم دین کو کس زور شور سے پھیلایا کہ باید و شاید۔" (روئداد ۱۲۹۷ھ صفحہ ۱۷)

یہ سب مدارس چلتے رہے مگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جو مقبولیت دارالعلوم کو ہوئی وہ کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی حتی کہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

غیر مسلموں کا چندہ:

غیر مسلموں نے بھی اس کیلئے چندے بھیجے۔ روئدادوں سے پتہ چلتا ہے کہ چندہ دینے والوں میں منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہردواری لال، لالہ بیج ناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوا رام سوار جیسے شریف، الطبع اور غیر متعصب ہندوؤں کا نام بھی موجود ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے چندے کے بارے میں یہ بھی دستور العمل میں موجود ہے کہ:

"چندے کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیت مذہب وملت۔"

غیر مسلموں سے کتابیں اور اخبار:

اسی طرح ہندو صاحبان کے مطبعوں نے کتابوں اور اخباروں کا دارالعلوم میں بطور ہدیہ پہنچنا بھی روئدادوں میں موجود ہے۔ منشی نولکشور مطبع اعظم کے مالک نے لغت کی مشہور کتاب قاموس دارالعلوم کو تحفے میں بھیجی۔ جس کو انہوں نے اپنے مطبع میں چھاپا تھا۔ اس سے پہلے مدرسے میں اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ تھا۔ قصبہ بڈھانہ ضلع مظفر نگر کے راؤ امراؤ سنگھ "سفیر بڈھانہ" اخبار نکالتے تھے وہ بھی باقاعدہ دارالعلوم کو بھیجتے تھے۔

(روئداد دارالعلوم ۱۲۸۹ھ/۱۲۹۴ھ)

ہندو طلبہ دارالعلوم میں:

نہ صرف یہ بلکہ دارالعلوم دیوبند میں بعض ہندو طلبہ کے پڑھنے کا بھی روئدادوں میں

ذکر ہے۔ (ملاحظہ ہو روداد ۱۲۹۴ھ صفحہ ۱۳)

دارالعلوم کی شہرت دوسرے ممالک میں:

دارالخلافہ استنبول قسطنطنیہ کے ایک مشہور عالم احمد حمدی آفندی نے حضرت قاسم العلوم کو دارالعلوم کے لئے مشہور کتاب النجوم الدراری فی ارشاد الساری بھیجی اور فارسی زبان میں ایک خط بھی بھیجا۔ سرنامے پر لکھا تھا:

"جناب فضائل مآب مولوی محمد قاسم صاحب، مدرسہ آنحضرت کو منبع فیض عموم است فرستادہ آمد تا یادگار آں بزرگوار بر محل خود باشد۔"

قسطنطنیہ سے ایک عربی اخبار بھی حضرت قاسم العلوم کے زمانے میں آیا کرتا تھا جس کا نام "الجوابیت" تھا۔ ۱۲۹۱ھ کی روئداد میں اس کا ذکر موجود ہے۔ (صفحہ ۵۳)

الغرض:

ہم یہ بیان کر رہے تھے کہ ہندوستان میں عربی مدارس کے بکثرت اجرا کا سہرا بھی حضرت قاسم العلوم کے سر ہے جن کے باعث مسلمانوں میں گھر گھر دین کے چرچے اور دینی تعلیم کے اثرات قائم ہوئے۔ حالانکہ وہ دور عیسائیت کی ہندوستان میں تبلیغ کا سخت خطرناک اور نازک دور تھا یہ حضرت قاسم العلوم ہی کی ذات گرامی کے فیوض تھے جن کی دردمندی سے ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے خاتمے کے بعد اسلام ہندوستان میں محفوظ رہا۔ آج پاکستان اور ہندوستان میں قاسمی دینی یونیورسٹی کے بے شمار فیض یافتہ ہیں جنہوں نے نہ صرف مذکورہ دونوں ملکوں میں بلکہ دیگر ممالک میں بھی یہاں کے پودوں کی قلمیں لگائی ہیں اور جو خوب پھل پھول رہی ہیں یہ ثواب حضرت قاسم ہی کے حصے میں آیا ہے۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

قاسم العلومؒ معلم واستاد کی حیثیت میں

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کا مشغلہ علم وعلم، عبادت وریاضت، ارشاد وتبلیغ، پند وموعظت اور جہاد واجتہاد تھا وہ علم کے اونچے مقام پر پہنچ کر اگر اپنے علوم سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچاتے تو زندگی میں ایک بڑا خلا ہوتا جو محسوس کیا جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آپ جب تعلیم حاصل کرنے کے لئے استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی صاحب نانوتویؒ صدر شعبہ علوم مشرقیہ دہلی کالج کے ہمراہ ۲ محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے ہیں تو اسی وقت سے جہاں متعلم تھے معلم بھی ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے شاگرد عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ:

جب آپ دہلی پہنچے تو مولانا مملوک علی صاحب نے اپنے فرزند ارجمند مولانا محمد یعقوب صاحب کو ان کی شاگردی میں دیا۔ خود مولانا عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> "۲ محرم سنہ ساٹھ کو دہلی پہنچے۔ چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔ مولوی (محمد قاسم) صاحبؒ نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستان والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعطیلات کا پوچھنا ان کے سپرد کیا تھا۔ اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی صیغوں اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا۔" (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۶)

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے قدھے بخاری پڑھی:

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد بظاہر دہلی میں تعلیم دینے کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ البتہ مولانا احمد علی صاحب کے مطبع میں بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کے

حاشئے اور کتابوں کی تصحیح میں مصروف نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد پہلے حج سے واپسی پر ۱۲۷۸ھ میں نانوتے میں مقیم رہے ہیں۔ تو وہاں بھی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو پڑھاتے نظر آتے ہیں۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ”غدر میں دہلی کا تو سب کارخانہ درہم و برہم ہو گیا تھا۔ مولوی محمد احمد علی صاحب کا مطبع گیا گذرا تھا۔ اس زمانے میں سوائے وطن اور کوئی جگہ جانے کی نہ تھی۔ کبھی وطن (نانوتہ) کبھی دیوبند رہتے تھے، اسی وقت میں احقر نے حضرت بخاری قدرے پڑھی۔“ (سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۱۸)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا قاسم العلوم نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو علم حدیث کی سب سے بڑی کتاب کی تعلیم دی اور پڑھنے والی ہستی بھی معمولی ہستی نہیں وہ ہستی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے اولین شیخ الحدیث اور مولانا اشرف علی صاحب کے استاد تھے اتنے بڑے عالم کے استاد ہونے سے ہی معلم کے بے پناہ عالم ہونے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نے پھر صحیح مسلم پڑھی:

پھر جب مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کتب کی خدمات انجام دیتے تھے تو وہاں حضرت قاسم العلوم ذرا آگے بڑھ کر لوگوں کو پڑھانے میں مشغول نظر آتے ہیں اور وہیں میرٹھ میں عارف باللہ کبھی بریلی لکھنو چھوڑ کر آ جاتے ہیں اس زمانے میں آپ نے ان سے صحیح مسلم بھی پڑھی۔ چنانچہ شاگرد اولین لکھتے ہیں:

مولانا محمد یعقوب صاحب نے پھر صحیح مسلم پڑھی:

پھر جب مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کتب کی خدمات انجام دیتے تھے۔ تو وہاں حضرت قاسم العلومؒ ذرا آگے بڑھ کر لوگوں کو پڑھانے میں مشغول نظر آتے ہیں۔ اور وہیں میرٹھ میں عارف باللہ بھی بریلی لکھنو چھوڑ کر آ جاتے ہیں اس زمانے میں آپ نے ان سے صحیح مسلم بھی پڑھی۔ چنانچہ شاگرد اولین لکھتے ہیں:

> ''احقر اس زمانے میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپے خانے میں نوکر ہو گیا۔ منشی جی حج کو گئے تھے اس وقت میں ایک جماعت نے مسلم پڑھی۔ احقر بھی اس میں شریک رہا۔ وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۱)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ میرٹھ کے دوران قیام میں پڑھانے کا سلسلہ زور و شور سے جاری ہو گیا تھا اور اسی زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔ گویا آپ کا پڑھانے کا یہ دور ۱۲۸۳ھ اور اس سے پہلے اور اس کے بعد کا دور ہے۔ جو انگریزی سنہ کے اعتبار سے ۱۸۶۶ء ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء وغیرہ کا زمانہ سمجھئے۔

تدریس کی رفتار میں اور تیزی نیز ہر قسم کی کتب کی تعلیم:

۱۲۸۵ھ کے بعد دوسرے حج سے واپسی پر جب حضرت قاسم العلوم مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں جو میرٹھ ہی میں تھا۔ منشی ممتاز علی کے حج اور قیام عرب کے دوران تصحیح کے کام میں مصروف تھے تو اس وقت قاسم العلوم نے پڑھانے کا سلسلہ اور بھی تیز کر دیا تھا۔ چنانچہ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''منشی جی کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا اس زمانے میں پڑھانا اکثر تھا۔ سب کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے اور اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ نہ کسی نے سنے نہ سمجھے اور عجائب غرائب تحقیقات ہر فن میں بیان فرماتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلے کی بیخ دین تک ہو جاتی تھی۔ آج اس کے فیض تعلیم کا اثر موجود ہے۔ ہر چند ذرہ آفتاب کا کیا نمونہ مگر پھر اسی جمال کا آئینہ ہے اور وہی اس کے حوصلے کے موجب اس میں جلوہ گر ہے۔ جو چاہیں دیکھ لیں اور ان کی تحریرات و تقریرات کو سن لیں۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۱-۲۲)

اس تحریر سے حضرت قاسم العلوم کی میرٹھ میں سلسلہ تدریس کی ایک ایک کڑی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر اوقات پڑھانے میں گذرتی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر قسم کے فن کی کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، منطق و فلسفہ، معانی و ادب وغیرہ گویا تمام درس نظامی کو پڑھایا کئے ہیں۔ اور تعلیم و تدریس بھی ایسی کہ ہر فن میں عجیب و غریب تحقیقات

فرماتے تھے۔ ایسے ایسے مضامین عالیہ سے روشناس کراتے جو ذہنی طور سے قدرت امتیازی خصوصیات کے ساتھ آپ کے دل پر القا کرتی تھی۔ گویا مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ میں ایسے مضامین جو کسی نے کسی سے نہ پڑھے اور نہ دوران تعلیم میں کسی استاد سے سنے۔ مولانا موصوف جو خود تعلیم میں کمال حاصل کر چکے تھے اور اجمیر، بنارس، رڑکی وغیرہ میں پڑھا بھی چکے تھے وہ ان مضامین کو سننے سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں جو قاسم العلوم بیان کیا کرتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جب یہ سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ تو اس وقت وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہیں اور بعد میں آنے والوں کو مطلع کر رہے ہیں کہ ہمارے اندر جو علم ہے وہ بھی ان کے جمال جہاں آرا کا ایک پرتو ہے۔ بہرحال جب پڑھاتے تو معلومات جدیدہ کا ڈھیر لگادیتے تھے۔ بقول شاعر ؎

لگا رہا ہوں مضامین نو کے میں انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینیوں کو

آمد معانی عارف باللہ کی زبانی:

درس ہو یا تقریر مضامین کا دل پر اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ ان کو سمیٹنا اور ترتیب دینا ذہن کو دشوار ہو جاتا تھا۔ عارف باللہ کی زبانی آپ کی آمد کا حال سنئے لکھتے ہیں:

> ”آمد معانی اور مضامین کو ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضی بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۱۶)

بقول غالب ذرا ترمیم کے ساتھ ؎

پُر ہوں میں علم سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

زبان قاسمی سے طلبہ کو پڑھانے کا ذکر اور میرٹھ میں مثنوی کا درس:

جہاں میرٹھ میں آپ دیگر عربی علوم وفنون پڑھاتے تھے وہاں دکان معرفت پر بیٹھ کر طریقت کا سودا بیچتے تھے۔ حضرت عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

''ایک بار مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب مضامین ہوتے۔ ایک صاحب کہ کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے سن کو یوں سمجھے کہ یہ اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ کچھ فیض باطنی دیا جائے۔ درخواست کی کہ کبھی تنہا ملئے۔ آپ نے فرمایا ''مجھے کار چھاپہ خانے کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے وہ صاحب ایک روز آئے، مولانا سبق پڑھا رہے تھے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۱۶)

بہر حال حضرت قاسم العلوم کا فیضان میرٹھ اور دیو بند میں زیادہ تر رہا۔ خود بھی عارف باللہ نے یہاں مسلم شریف پڑھی۔ اپنے آپ کو عارف باللہ نے مولانا محمد قاسم صاحب کا شاگرد لکھا ہے۔ چنانچہ اپنے مرید منشی محمد قاسم صاحب نیانگری کو لکھتے ہیں:

''مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی میرے ہم زلف اور پیر بھائی اور استاد اور استاد بھائی اور ہم وطن اور قریب کے رشتے دار ہیں۔'' (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۵۷)

دیکھئے عارف باللہ صاف طور پر اپنے آپ کو قاسم العلوم کا شاگرد بتا رہے ہیں۔

قاسم العلوم کے دیو بند کے دوسرے ممتاز تلامذہ:

میرٹھ میں جیسا کہ مذکورہ بالا احوال سے معلوم ہوتا ہے آپ کے ہزاروں ہی شاگرد تھے اور وہاں آپ نے کئی سال مطبع ہاشمی اور مطبع مجتبائی میں تصحیح کتب کا کام کیا۔ اور بہت سے طلبہ کو پڑھایا اور دار العلوم دیو بند کا انتظام بھی دیو بند آ کر کرتے رہے۔ لیکن چند سال کے بعد پھر دیو بند ہی کو اپنا مستقر بنا لیا۔

دار العلوم دیو بند میں مدرسے کی طرف سے تو نہیں البتہ اپنے طور پر بلا معاوضہ خاص خاص طلبہ کو درس دیتے تھے۔ ان خصوصی طلبہ میں سے بھی اخص طلبہ کا ذکر خود عارف باللہ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''جناب مولوی (محمد قاسمؒ) صاحب سے بہت سے لوگوں کو نسبت شاگردی ہے مگر عمدہ ان میں سے ایک مولوی محمود حسن صاحب فرزند اکبر جناب مولوی ذوالفقار علی صاحب دیو بندی ہیں۔ اکثر کتابیں مدرسہ دیو بند میں پڑھیں۔ حدیث مولوی (محمد قاسم) صاحب کی خدمت میں حاصل کی اور تکمیل وہاں ہوئی۔ مدرسہ دیو بند کی طرف سے ان

(مولانا محمود الحسن شیخ الہند اسیر مالٹا) کو دستار فضیلت اول بار بندھی۔

دوسرے (مولانا محمد قاسم صاحب کے) شاگرد مولوی فخر الحسن گنگوہی ہیں۔ اور رنگی مزاج میں مولانا کے قدم بقدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں۔ انہوں نے بھی مدرسہ دیوبند میں تحصیل کی ہے۔ اور اول جناب مولوی رشید احمد صاحب سے تحصیل کی تھی۔

تیسرے مولوی احمد حسن امروہوی ان سے مولانا کو کمال محبت تھی۔ نہایت عمدہ ذہن و ذکا اور اعلیٰ درجے کی عمدہ استعداد ہے اور جناب مولانا سے کمال مناسبت ہے اور ان صاحبوں کے علاوہ مولانا کے بہت شاگرد ہیں۔"

(سوانح قاسمی از عارف باللہ صفحہ ۳۱)

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ان تین شاگردوں کو اخص الخواص کا مقام دیا ہے۔ لیکن ان تینوں خاص تلامذہ کے علاوہ مولانا عبدالعدل صاحب مولانا عبدالعلی صاحب مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری اور مولانا منصور علی صاحب مرادآبادی بھی خواص میں شامل ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ خود عارف باللہ کے صاحبزادہ مولانا علاؤالدین صاحب بھی حضرت قاسم العلوم کے شاگرد تھے اور یہ سلسلہ تعلیم مرض وفات کے سال ۱۲۹۷ھ بلکہ وفات سے ذرا پہلے کا ہے۔ چنانچہ عارف باللہ لکھتے ہیں:

"مولوی احمد علی صاحب کو فالج ہو گیا تھا اس میں (مولانا محمد قاسم صاحب) سہارنپور تشریف لے گئے اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو مظفر نگر سے بلایا تھا۔ اسی روز گئے اور پھر شام کو واپس ریل میں آئے۔ تکان کے سبب طبیعت علیل ہو گئی مگر چند روز کے بعد صحت ہو گئی جب کچھ قوت آئی علاؤالدین بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا۔ بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتیں۔ جب تک کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے تھے اور جب کھانسی کم ہوتی تب بھی ذرا ٹھہر کر بیان فرماتے اور جب شدت ہو جاتی موقوف فرما دیتے۔" (سوانح قاسمی صفحہ ۲۷)

مگر ہائے افسوس دیوبند سے فضیلت کی ڈگری لینے کے سال ہی جوانی میں وہ داغ مفارقت دے گئے۔ حضرت عارف باللہ اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

حالات مولانا علاء الدین صاحب صاحبزادہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ:

> ”شب عید الاضحیٰ ۱۳۰۱ھ بوقت نواخت یازدہ فرزندم مولوی حافظ علاؤ الدین بعارضہ ہیضہ اسہال و قے بعد شدت مرض تا دہ روز انتقال نمود۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تولد او در نانوتہ بماہ صفر ۱۲۷۸ھ شدہ۔ دریں عمر بست و چار سال حفظ قرآن نمود و کتب درسیہ تمام کردہ۔ از مدرسہ دیوبند برسم دستار بندی کہ علامت فضل و کمال بود معزز شدہ درہمیں سال در دیوبند بریاض رضواں و در تکیہ شیخ لطف اللہ بجانب شرق بر چبوترہ زیریں مدفون شد۔“ (بیاض یعقوبی صفحہ ۱۵۲)

> عید الاضحیٰ ۱۳۰۱ھ کی رات میں گیارہ بجے میرا فرزند مولوی حافظ علاء الدین قے دست یعنی مرض ہیضہ میں دس روز تک سخت مرض کے باعث انتقال کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس کی پیدائش نانوتے میں ماہ صفر ۱۲۷۸ھ میں ہوئی۔ اس چوبیس سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور درسی کتابیں ختم کیں۔ مدرسہ دیوبند سے دستار بندی کی عزت سے جو کہ فضل و کمال کی علامت ہے۔ معزز ہو کر اسی سال دیوبند میں ریاض رضوان اور شیخ لطف اللہ صاحب کے قبرستان میں مشرقی جانب نیچے کے چبوترے میں مدفون ہوا۔

آپ نے علوم کی تقسیم و تعلیم زیادہ تر میرٹھ میں چند سال جاری رکھی اور بعد ازاں میرٹھ چھوڑنے کے بعد مستقل طور پر دیوبند میں قیام کے دوران طلبہ کو پڑھایا مگر مدرسے کے احاطے میں یا مدرسے کی طرف سے مقید ہو کر کبھی نہیں پڑھایا۔ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

> ”نہ دار العلوم کے احاطے میں کبھی بیٹھ کر پڑھایا نہ اس کے انتظامات کے سلسلے میں رسمی طور پر کبھی کوئی عہدہ قبول فرمایا۔“ (سیاسی مقالہ مولانا محمد طیب صفحہ ۱۴)

قاسم العلومؒ کی درسگاہ چھتے کی مسجد:

جب آپ نے دار العلوم کے احاطے میں تعلیم نہیں دی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر

آپ کہاں پڑھاتے تھے۔ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

> ’’حضرت کی درسگاہ اور تربیت گاہ اور جائے قیام چھتے کی مسجد کا ایک حجرہ تھا جو اب تک محفوظ ہے۔ اسی میں روز و شب گذارتے تھے اور اسی میں علمی افاضہ اور باطنی توجہات کا بازار گرم تھا۔‘‘ (سیاسی مقالہ صفحہ ۱۳)

حضرت قاری محمد طیب صاحب کچھ اور شاگردوں کا بھی نشان دیتے ہیں۔ اپنے سیاسی مقالے میں لکھتے ہیں:

> ’’شاگرد اپنے لئے مخصوص منتخب فرمائے تھے بلکہ منجانب اللہ ان کیلئے مخصوص کر دیئے گئے تھے جو بجائے خود ذکی مستعد، طالب حق اور علم و دین میں فنائیت کے جذبات رکھتے تھے۔ جیسے حضرت اقدس مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دار العلوم دیوبند، حضرت اقدس مولانا احمد حسن محدث امروہوی، حضرت اقدس مولانا عبد العلی صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محی الدین مراد آبادی، قاضی ریاست بھوپال، مولانا عبد الحق صاحب پور قاضوی وغیرہ وغیرہ۔‘‘

حکیم مولوی رحیم اللہ صاحب بجنوری

انہی میں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں حکیم مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوری بہت فاضل، قابل شاگرد تھے اور ساتھ ہی حافظ مولانا محمد صدیق مراد آبادی کو بھی شامل کر لیجئے۔ جو حضرت قاسم العلومؒ کے مرید بھی تھے اور شاگرد بھی۔ حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری نے اپنی ایک تحریر میں خود اپنی شاگردی اور قاسم العلوم کے استاذ ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ”الی ہذا المقام قدتمت النمیقۃ العالیۃ لاستاذنا العلام خاتم الاذکیاء قاسم العلوم علی العلماء فی تحقیق المرکب والاجزاء و بیان حقیقۃ السماع والغناء۔“

(تعارف مکتوب قاسمی بزبان عربی از حکیم صاحب صفحہ ۴)

> اس مقام پر ہمارے استاذ علامہ خاتم الاذکیا قاسم العلوم علی العلما کا مکتوب تحقیق مرکب واجزا اور ”سماع وغنا“ کے بیان کی حقیقت میں ختم ہوا۔

دیکھئے استاد ہونے کے علاوہ حکیم صاحب نے مولانا کو قاسم العلومؒ کہا ہے۔ مولانا منصور علی خان مراد آبادی لکھتے ہیں:

> ”مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) نے پڑھایا۔ حضرت اس زمانے میں نانوتہ ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ مولوی محی الدین خان صاحب مراد آبادی اور مولوی عبد العلی صاحب میرٹھی اور حکیم مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا۔“ (مذہب منصور صفحہ ۱۸۶)

مولانا حکیم اللہ صاحب بجنوری حضرت قاسم العلوم سے بخاری بھی پڑھتے تھے جیسا کہ مولانا محمد طاہر صاحب برادر خرد مولانا محمد طیب صاحب کی یادداشت میں ہے۔ اور طاہر صاحب نے براہ راست مولانا رحیم اللہ صاحب بجنوری سے سنا تھا۔ حکیم رحیم اللہ صاحب نے

فرمایا کہ:

> ’’جب میں مولانا محمد قاسم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو بخاری کا درس دیا کرتے تھے۔ میں بھی اس میں شریک ہو گیا ایک دن اتفاقاً مجھے وضو نہ تھا اور سبق میں جا کر بیٹھ گیا میں نے دیکھا کہ حضرت ہاتھ سے منع فرما رہے ہیں۔ پھر بلا کر یوں فرمایا کہ میاں بخاری میں تو ایسا نہ چاہئے کہ بلا وضو بھی آدمی بیٹھ جائے۔‘‘ (یادداشت طاہری)

مفتی محمود صاحب نانوتوی نے بقلم خود کچھ یادداشتیں اپنے والد مولوی محمد اسماعیل صاحب سے سن کر حضرت مولانا محمد طیب صاحب کی معرفت اس راقم الحروف کو ارسال کی ہیں۔ ان کے والد صاحب مولوی محمد اسماعیل حضرت قاسم العلومؒ کی مجلس کے مصاحب تھے وہ فرماتے ہیں کہ:

> ’’حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری مولوی عبدالحق خیر آبادی سے رام پور میں پڑھ کر آئے تھے ان کے پاس امتناع نظیر کی کوئی تحریر اپنی یا مولانا عبدالحق خیر آبادی کی تھی۔ حکیم صاحب کا خیال تھا کہ اس تحریر کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ کئی مرتبہ حضرت نانوتوی کو سنانے کے لئے عرض کیا۔ ایک روز بستی سے باہر سیر کو مولانا نکل گئے۔ اور حکیم صاحب سے کہا کہ آج وہ تحریر سنایئے۔ آپ نے تحریر سن کر اس کی تردید میں وہ تقریر فرمائی کہ حکیم صاحب حیران رہ گئے۔ اور وہ تحریر پھاڑ کر نہر میں پھینک دی۔‘‘

حکیم رحیم اللہ صاحب سے قدرے تعارف:

حکیم صاحب میرے ضلع بجنور کے رہنے والے نہایت متقی پرہیز گار عالم و فاضل متجر اور حاذق طبیب اور ولی اللہ تھے۔ بجنور کے جس راستے سے گذر جاتے تھے۔ لوگ دکانوں سے اٹھ اٹھ کر سلام کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ مریضوں کا گھر پر ہجوم تھا۔ لیکن ہر ایک کو اس کی ترتیب سے دیکھتے اور نسخہ لکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک انگریز ڈاکٹر نے ایک حاملہ عورت کے متعلق کہا کہ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا ہے۔ اس لئے ولادت نہیں ہوتی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ نہیں بچہ پیٹ میں سو رہا ہے۔ چنانچہ گرم پانی ٹب میں ڈال کر عورت کو بٹھایا گیا اور بہت جلد ولادت ہو گئی۔ فرمایا بچے نے نیند میں ہاتھوں سے اندر کا حصہ جکڑا ہوا تھا۔ حرارت پہنچی تو جاگ

اٹھا اور ہاتھ چھوڑ دیئے اس لئے ولادت ہوگئی۔ اسی طرح ایک ہیڈ ماسٹر کو جن کے متعلق اطبا نے دق تجویز کی تھی۔ دیکھا تو فرمایا آپ کو بخار نہیں بلکہ تبخیر ہے۔ چنانچہ وہ تندرست ہوگئے اور سکول سے چھٹی لے کر اس لئے چلے تھے کہ گھر جا کر مروں گا تو ٹھیک ہے۔ لیکن دل میں سوچنے لگے کہ لاؤ مرنا تو ہے ہی حکیم صاحب کو بھی نبض دکھاتے چلیں۔

حکیم صاحب تحقیق ضاد میں ایک محققانہ رسالہ لکھا ہے۔ جو میری نظر سے گذرا ہے اور جس کا نام ''الاقتصاد فی الضاد'' ہے۔ اس کا ایک اشتہار قبلہ نما مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ کے آخر میں دیا گیا ہے۔ جس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے:

> ''جامع منقول و معقول ارشد تلامذہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مولانا حکیم محمد رحیم اللہ صاحب بجنوری۔''

رہا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی اور مولانا عبدالعدل کے خصوصی شاگرد ہونے کا معاملہ تو یہ اس طرح صاف واضح ہے کہ جب رڑکی میں دیانند سرستی آیا اور اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی تو اہل رڑکی نے حضرت قاسم العلوم کو بلایا۔ مگر آپ سخت علالت کے باعث نہ جاسکے۔ مولانا فخر الحسن انتصار الاسلام کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''پنڈت جی تو یہی ضد کرتے ہیں کہ سوا ''مولبی کاسم'' کے ہم اور کسی سے گفتگو نہ کریں گے۔ اس پر جناب مولانا مرحوم نے کمترین انام (مولانا فخر الحسن گنگوہی) اور جناب مولوی محمود حسن صاحب اور مولوی حافظ عبدالعدل صاحب سے ارشاد کیا کہ تم خود رڑکی ہو آؤ۔'' (انتصار الاسلام صفحہ ۳)

غرضکہ جب حضرت قاسم العلوم رڑکی تشریف لے گئے تو انہی حضرات کو اپنے ہمراہ لے گئے جن سے ان کی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ سفر و حضر میں ان حضرات کو ساتھ رکھتے تھے۔ یہی حال مولانا احمد حسن صاحب امروہوی کا ہے۔ مولانا عبدالعدل صاحب پھلت کے رہنے والے ہیں۔ جمعیۃ الانصار کی رپورٹ میں ۱۲۹۵ھ میں ثمرۃ التربیت کے اجرا کے سلسلے میں چندہ دہندگان کی فہرست میں مولانا عبدالعدل صاحب کا نام بھی ہے۔ اور مولانا عبدالعلی صاحب کا بھی وہ دار العلوم کے مدرس پنجم تھے۔

ذکر خیر شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا

آپ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بمقام بریلی ہوئی۔ جہاں آپ کے والد محترم مولانا ذوالفقار علی صاحب سب انسپکٹر مدارس مع اہل وعیال مقیم تھے۔ میاں جی منگلوری سے قرآن مجید کا اکثر حصہ پڑھا۔ اور کسی قدر عبداللطیف صاحب سے پڑھا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی انہی سے پڑھیں۔ بعد ازاں فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی عربی کتابیں اپنے چچا مولوی مہتاب علی سے پڑھیں۔ پندرہ سال کی عمر تھی کہ آپ قدوری اور تہذیب پڑھتے تھے۔ کہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو دار العلوم دیوبند کا افتتاح ہوا۔ اور ملا محمود دیوبندی استاد مقرر ہوئے تو ان سے عربی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے ۱۲۸۶ھ میں کتب حدیث صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ سے پڑھیں اور جہاں قاسم العلومؒ جاتے یہ بھی دہلی، میرٹھ، نانوتہ اور دیوبند میں ساتھ رہتے۔ ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۸۷۳ء تک صحاح ستہ اور دیگر فنون کی اعلیٰ کتابوں کی تعلیم قاسم العلوم سے حاصل کر کے فراغت حاصل کی۔ حدیث میں صحاح ستہ اور دیگر کتب کے علاوہ اپنے استاذ محترم کی مصنفہ کتاب آب حیات بھی حرف بحرف پڑھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے خود مولانا محمود حسن صاحب سے سنا انہوں نے فرمایا کہ:

> ”آب حیات میں نے حضرت سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ آب حیات کے کچھ اوراق حضرت نے خود نکال دیئے تھے جنہیں کوئی نہیں سمجھ سکا۔ وہ مولانا محمود حسن کے پاس مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے دیکھے۔“ (ارواح صفحہ ۲۷۷)

شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار اور قاسم العلومؒ کی بلندی نظر:

مولانا محمود حسن صاحب نے امیر خان صاحب سے فرمایا کہ:

”میں نے اس کا التزام کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف دیکھ کر

> حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر ہوتا اور وہ باتیں پوچھتا جو حضرت شاہ صاحب کی کتب میں مشکل ہوتی تھیں۔ لیکن شاہ صاحب کی کتاب میں جو انتہائی جواب ہوتا تھا وہ حضرت نانوتویؒ اول ہی دفعہ میں فرما دیتے تھے۔ بار ہا اس کا تجربہ کیا۔" (ارواح صفحہ ۲۵۱)

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے ۱۹ ذوالقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۴ء کو جلسہ دستار بندی میں سند فراغت اور دستار بندی کی فضیلت حاصل کی۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور مولانا عبدالحق صاحب پُر قاضوی کو بھی اسی سال سند اور دستار فضیلت ملی۔ مولانا محمود حسن صاحب ۱۲۸۸ھ، ۱۲۸۹ھ میں مدرس چہارم بنا دئے گئے۔ اس وت مدرس اول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، مدرس دوم مولانا سید احمد صاحب دہلوی، مدرس سوم ملا محمود صاحب اور مدرس چہارم مولانا محمود حسن صاحب بنائے گئے۔ مولانا عارف باللہ کی وفات کے بعد مدرس سوم قرار دیئے گئے اور مولانا عبدالعلی صاحب مدرس چہارم اور مولانا سید احمد صاحب کے بڑی ملازمت پر چلے جانے کے باعث شیخ الہند مدرس دوم ہوئے ملا محمود کی دو سال بعد وفات کے باعث ۱۳۰۵ھ میں صدر مدرس یعنی شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔

۱۳۰۵ھ سے ۱۳۳۳ھ تک آپ مسلسل اٹھائیس سال شیخ الحدیث اور ۱۲۸۹ھ سے ۱۳۰۵ھ تک مدرس رہے۔ گویا چوالیس سال تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم دی۔ ۱۲۹۴ھ میں اپنے شیخ حضرت قاسم العلوم کے ہمراہ حج کو تشریف لے گئے تھے اور ۱۲۹۵ھ میں واپس تشریف لے آئے تھے۔ ۲۹ شوال ۱۲۳۳ھ میں پھر حرمین الشریفین کی زیارت کو تشریف لے گئے تھے اور وہاں حکومت برطانیہ کے اشارے پر شریف مکہ نے آپ کو گرفتار کر لیا اور انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو جمعہ کے دن بہاء الدین انسپکٹر کی نگرانی میں جدے سے جہاز میں سوار کیے گئے۔ ۲۴ ربیع الاول کو جہاز سوئز پہنچا۔ وہاں سے پہرے میں ۲۴ ربیع الاول کو دو بجے گاڑی قاہرہ (مصر) پہنچی۔ بعد ازاں ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو منگل کے دن مالٹا پہنچائے گئے اور آپ پر مقدمہ چلایا گیا

جس کے نتیجے میں آپ کو مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی میں آپ نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور حاجات بشریہ کے علاوہ عبادت و اذکار میں وقت گذارا۔ کئی سال نظر بند رہے۔ ہندوستان میں حضرت شیخ الہند کی رہائی کے لئے عموماً اور دار العلوم دیوبند میں خصوصاً تحریک جاری رہی اور بالآخر ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے۔ جہاں ہندوستان اور بالخصوص دیوبند کی معزز ہستیوں نے استقبال کیا۔ دہلی ہوتے ہوئے ۱۳ جون ۱۹۲۰ء بروز اتوار نو بجے دیوبند پہنچے۔ اور لاکھوں مشاقین نے دیدار سے شرف حاصل کیا۔

وفات اہلیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ:

واپس ہوئے تو تین ہستیاں مالٹا کی اسیری کے اثنا میں فوت ہو چکی تھیں۔ پہلی ہستی حضرت استاذ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ کی تھی۔ جن سے آپ مل کر گئے تھے اور ان کی تاکید پر واپسی کا وعدہ فرمایا تھا۔ ان کا انتقال آپ کی واپسی سے ڈھائی سال پہلے ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ میں ہو گیا تھا جس کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ حضرت قاسم العلوم کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کا مہینہ اور سال میاں سید اصغر حسین صاحبؒ نے حیات شیخ الہند کے حاشئے میں صفحہ ۳۰ پر درج کیا ہے۔ دوسری ہستی حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی تھی جو شیخ الہند کا انتظار کرتے کرتے انتقال فرما گئے۔ اور تیسری شخصیت مولانا غلام رسول صاحب دار العلوم کے منطق و فلسفہ کے مشہور اور سنیئر استاد کی تھی۔ ان حضرات کے مزارات پر فاتحہ کے لئے گئے۔

آتے ہی تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء کے جمعیۃ العلماء کے سالانہ جلسے کی صدارت کی اور زبردست خطبہ دیا۔ جو مختصر اور جامع تھا۔ علیگڑھ والوں کے اصرار پر علیگڑھ تشریف لے گئے اور جامعہ ملیہ کا افتتاح ہوا۔ کمزوری بیحد تھی اور بیماری بھی۔ وہاں سے دیوبند واپس ہوئے واپسی پر ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خان کی رائے پر دہلی علاج کیلئے تشریف لے گئے۔ آرام سا ہونے لگا لیکن ۱۴ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو تپ و لرزہ نے آگھیرا اور بالآخر ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء بروز منگل دہلی میں انتقال ہو گیا۔ جنازہ دیوبند لایا گیا ہندوستان میں کہرام مچ گیا۔ بیشمار مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ اور اپنے استاد مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مرقد کے قریب دفن کر دیئے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کے کئی شاگرد دنیائے اسلام کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہیں۔ جن میں

۱۔ مولانا محمد انور شاہ صاحب
۲۔ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی
۳۔ مولانا حسین احمد مدنی صاحب
۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحب
۵۔ مفتی کفایت اللہ صاحب
۶۔ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی

نامور ہیں۔

تصنیفات:

آپ کی تصنیفات میں ترجمہ قرآن مجید، حاشیہ مختصر معانی، ایضاح الادلہ، ابواب و تراجم بخاری شریف، جہد المقل وغیرہا ہیں۔

تحریک جمعیۃ الانصار:

آپ کے زمانے میں دار العلوم دیوبند میں رمضان ۱۳۲۷ھ میں جمعیۃ الانصار کی بنیاد پڑی۔ جمعیۃ الانصار میں دراصل آپ ہی کا دل و دماغ کام کر رہا تھا اور بظاہر مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کا عمل تھا کہ وہ سیکرٹری تھے۔ اس جمعیت کے یوں تو کئی اجلاس ہوئے لیکن اپریل ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ کو مراد آباد میں اور ۱۹۱۲ء ۱۳۳۰ھ میں میرٹھ میں اور بعد ازاں ۱۹۱۳ء میں شملے کے اجلاس نہایت مہتمم بالشان تھے ان جلسوں سے ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا۔ حکومت برطانیہ چونک پڑی اور اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ ادھر جنگ بلقان ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۴ء میں شیخ الہند کی طرف سے ترکوں کی امداد اور انگریزوں کی مخالفت نے بھی انگریزوں کو بدظن کر دیا۔ دار العلوم کے طلباء، مدرسین اور خود شیخ الہند چندے کیلئے نکل کھڑے ہوئے اور ترکوں کی انگریزوں کے خلاف بھرپور مدد کی اور اسی دور کے ساتھ مولانا عبید اللہ کو کابل بھیجنا یہ باتیں شیخ الہند کی انقلابی سرگرمیوں کا پتہ دیتی ہیں جو ریشمی رومال کی تحریک سے مشہور ہیں۔ جن کا مقصد انگریزوں کی حکومت کا تختہ الٹنا تھا ان حالات کی بنا پر لیفٹیننٹ کرنل جیمس نے لنڈن کی پارلیمنٹ میں دار العلوم دیوبند کو بند کر دینے کا سوال اٹھایا۔ مسٹر مانٹیگو وزیر

ہند نے دارالعلوم کے متعلق تقریر کی اور بتایا کہ جب سے شیخ الہند کو گرفتار کر کے مالٹا بھیجا گیا ہے جب سے دارالعلوم میں روز بروز سکون ہے۔

پارلیمنٹ میں مسٹر جیمس کی اس تحریک اور مانٹیگو کے جواب پر تفصیلی طور پر الخلیل بجنور مورخہ ۲۰ رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کے ایڈیٹوریل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاہم دارالعلوم بند نہ ہوسکا۔ وہ الحمد اللہ آج بھی قائم ہے اور ہندوستان سے انگریزوں کا بستر گول ہوگیا۔ مگر صد افسوس اس بات پر ہے کہ جمعیۃ الانصار بھی جنگ بلقان کی پریشانیوں میں ۱۹۱۳ء کے شملے کے اجلاس کے بعد گم ہوکر رہ گئی کہ پھر ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔ البتہ یہ انجمن دہلی کو ۱۳۳۱ھ مطابق ۱۹۱۳ء میں نظارۃ المعارف کے نام سے منتقل ہوگئی۔ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند کے حکم سے مولانا عبید اللہ کابل اور خود شیخ الہند مکہ محترمہ چلے گئے۔

بہرحال شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا دور دارالعلوم میں نہایت انقلاب انگیز اور فکر آفرین تھا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگردوں میں آپ سب سے زیادہ آسمان علم و سیاست پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ اپنے استاذ سے انتہا درجے کا عشق تھا۔ ۱۲۹۶ھ کے رمضان کے بعد بیمار ہوکر حضرت قاسم العلوم پالکی میں دیوبند آرہے تھے۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی پالکی میں تھے۔ شیخ الہند راستے میں ایک ہرٹ سے استاذ محترم کے لئے گیہوں کے کٹے ہوئے کھیت میں کودوڑ کر پانی لائے تو پاؤں زخمی ہوگئے۔ اور پھر کہاروں کے ساتھ دوڑتے ہوئے دیوبند پہنچے۔ پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ دیوبند پہنچے تو حضرت قاسم العلوم نے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کو بہت دعائیں دیں۔

مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ

آپ حضرت عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ کی اولاد میں سے تھے ابتدائی تعلیم گنگوہ میں حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں آکر داخل ہوگئے۔ آپ نے ۱۲۸۹ھ میں علوم وفنون کی تکمیل دیوبند سے کی، مگر دستار فضیلت آپ کے سر پر ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۴ء کو دیوبند کی جامع مسجد میں جلسہ تقسیم انعام میں باندھی گئی۔ اسی سال حضرت شیخ الہند، مولانا عبدالحق پورقاضوی، مولوی فتح محمد صاحب تھانوی، مولوی عبداللہ جلال آبادی کے دستار فضیلت باندھی گئی (رپورٹ مدرسہ ۱۲۹۰ھ) بعدازاں آپ نے مختلف جگہ ملازمت کی۔ مثلاً نگینہ ضلع بجنور کے عربی مدرسے میں جیسا کہ گذشتہ قاسمی مکتوب سے ظاہر ہے۔ ۱۲۹۵ھ میں آپ نواب عظیم علی خان صاحب رئیس خورجہ کے پاس تیس روپیہ پر ملازم تھے۔ (رپورٹ موتمر الانصار مرادآباد) ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جن طلبہ نے "ثمرۃ التربیت" کی انجمن بنائے جانے کی درخواست کی ان میں مولانا فخر الحسن صاحب بھی شریک تھے اور مولانا محمود حسن صاحب بھی۔ آپ کے نام کے آگے ثمرۃ التربیت میں سات روپیہ آٹھ آنے سالانہ کا چندہ جمعیۃ الانصار کی رپورٹ صفحہ ۴۶ پر جو جلسہ مرادآباد سے متعلق ہے، درج ہے اور خورجے میں نواب صاحب کی ملازمت کا سال بھی اسی رپورٹ میں درج ہے۔ مدرسہ دہلی میں بھی آپ مدرس رہے ہیں جیسا کہ قاسم العلوم کے مکتوب نہم صفحہ ۱ سے ظاہر ہے۔

شاگردی کا اقرار:

انتصار الاسلام کے دیباچے میں مولانا فخر الحسن صاحب تحریر فرماتے ہیں؛

> ”جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم نے شاگرد و معتقد بہت چھوڑے ہیں، بندہ بھی ایک ادنیٰ شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ سب میں ادنیٰ ہے۔ لیکن اس انتساب کو اپنا فخر جانتا ہے، بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است۔“

مولانا فخر الحسن صاحب بحیثیت مقرر:

مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کو یہ فخر رہا ہے کہ انہوں نے اپنے استاد حضرت قاسم العلومؒ کے ساتھ جابجا مناظروں میں شرکت کی ہے اور استاذ محترم کے حکم سے تقریریں بھی کی ہیں۔ رجب ۱۲۹۵ھ میں دیانند سے مناظرے کے لئے جب حضرت قاسم العلومؒ رڑکی تشریف لے گئے ہیں تو مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا عبدالعدل صاحب اور مولانا محمود حسن بھی ہمراہ تھے۔ جب پنڈت دیانند حضرت قاسم العلومؒ کے سامنے نہ آیا تو آپ نے شاگردوں سے فرمایا کہ پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب علی الاعلان بیان کردو۔ مولانا فخر الحسن صاحب انتصار الاسلام کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ”بندے نے اس کی تعمیل کردی یعنی پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب برسر بازار کئی روز تک بیان کئے اور پنڈت جی کے مذہب جدید پر بہت سے اعتراض کئے اور بہت سی غیرت دلائی۔“ (صفحہ ۶)

انہی مولانا فخر الحسن صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب کی بھی رڑکی میں تین دن تک تقریریں ہوتی رہیں۔

تصنیفات قاسمی کی اشاعت اور ترویج میں مساعی جمیلہ:

مولانا فخر الحسن صاحب اپنے استاد قاسم العلوم کی کتابوں کی اشاعت اور مناظروں اور تقریروں کی طباعت میں بھی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ چنانچہ حجۃ الاسلام مصنفہ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> ”کمترین فخر الحسن عفا اللہ عنہ خدمت میں ناظرین رسالہ ہذا (حجۃ الاسلام) کے عرض پرواز ہے کہ ۱۲۹۴ھ میں جو جلسہ شاہجہان پور میں ہوا تھا اس میں جو تقریر جناب

> مولانا و مرشد نانوتوی محمد قاسم صاحب مدظلہم نے اہل جلسہ کے سامنے درباب اثبات توحید و رسالت و حقانیت دین اسلام بدلائل عقلیہ بیان کی تھی۔ چونکہ وہ تقریر ہر اہل اسلام کیلئے موجب تسکین قلب ہے۔ اس لئے اس کا طبع کرنا ضرور جانا۔“

(حجۃ الاسلام صفحہ۲ مطبوعہ مجتبائی دہلی)

رسالہ حجۃ الاسلام دراصل حضرت قاسم العلومؒ لکھ کر اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ یہ ۱۲۹۴ھ کے شاہجہان پور کے جلسے میں تقریر کے طور پر لکھی گئی لیکن اس کی طباعت کیلئے سب سے پہلا قدم مولانا فخر الحسن نے اٹھایا۔

حجۃ الاسلام کی اشاعت:

مولانا فخر الحسن صاحب نے جس رسالے کا ذکر کیا ہے وہ حجۃ الاسلام ہے اور مولانا فخر الحسن صاحب نے ہی اس کا نام حجۃ الاسلام رکھا۔ مگر اس تحریر کو جلسے میں پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ بہر حال رسالہ حجۃ الاسلام بھی مولانا فخر الحسن کی کوشش سے مطبع مجتبائی دہلی میں چھپا تھا۔ مطبع قاسمی دیوبند سے جو پہلا ایڈیشن رسالہ ”حجۃ الاسلام“ کا چھپا ہے۔ اس کے دیباچے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب لکھتے ہیں:

> ”مولانا مولوی فخر الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام حجۃ الاسلام تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا۔“

انتصار الاسلام کی اشاعت:

۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں رڑکی میں حضرت قاسم العلومؒ نے پنڈت دیانند سرستی کے اسلام پر اعتراضات کے جو جوابات لکھے تھے۔ ان کو بھی مولانا فخر الحسن صاحب نے ہی شائع کیا اور اس رسالے کا نام بھی انتصار الاسلام رکھا۔ اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ”کمترین فخر الحسن عفی اللہ عنہ خدمات عالیہ میں ناظرین رسالہ ہذا کی عرض پرواز ہے کہ یہ رسالہ جس کا نام انتصار الاسلام کمترین نے رکھا ہے۔ مصنفہ جناب آیت من آیات اللہ حجۃ اللہ فی الارض، سلطان الاذکیا صوفی، صافی، غازی، حاجی حافظ مولوی محمد قاسم

صاحب مرحوم و مغفور طالب اللہ ثراہ کا ہے۔" (صفحہ۲)

اس عبارت میں جہاں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو صوفی، صافی اور حاجی لکھا ہے وہاں غازی بھی لکھا ہے جو جہاد شاملی اور تھانہ بھون کے جہاد کی طرف اشارہ کرتا ہے اور جو حضرت قاسم العلوم کے جہاد میں شامل ہونے کی مستند دلیل ہے۔

مباحثہ شاہجہان پور کی اشاعت:

موضع چاندا پور ضلع شاہجہان پور میں ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں جو تحقیقات مذاہب کے سلسلے میں جلسہ ہوا تھا اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے شرکت فرمائی تھی تو اس جلسے کی پوری کیفیت منشی محمد حیات مہتمم مطبع ضیائی میرٹھ نے لکھ کر شائع کی تھی۔ لکھتے ہیں:

> "مولوی محمد قاسم صاحب نے ارادہ کیا اور ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو بعد عشا بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے۔" (میلہ خداشناسی صفحہ ۳۔۴)

لیکن اسی موضع چاندا پور ضلع شاہجہانپور میں جب اگلے سال ۱۹، ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو جلسہ ہوا تو اس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے حقانیت اسلام پر جو تقریریں کیں، اور عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیا اس کو بھی مولانا فخر الحسن صاحب نے "مباحثہ شاہجہانپور" کے نام سے شائع کیا۔ مقدمے میں لکھتے ہیں:

> "میلہ خداشناسی واقع شاہجہان پور میں جو علمائے اسلام و ہنود اور عیسائیوں کا مباحثہ ہوا۔ اس کی کیفیت ناچیز کمترین انام فخر الحسن نام اہل نظر کے روبرو پیش کرتا ہے۔"

(صفحہ نمبر ۳)

سوانح قاسمی:

یہ سب کارنامے مولانا فخر الحسن صاحب کے ہیں۔ جنہوں نے اپنے استاذ کی تقریروں، مناظروں کو مرتب کیا۔ اور چھپوانے کی کوششیں کیں۔ تمام شاگردوں میں حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ کے کارناموں کو انہوں نے ہی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ اور حضرت قاسم

العلوم رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد بہترین سوانح عمری لکھی جس کا ذکر انتصار الاسلام کے دیباچے میں بایں عبارت فرماتے ہیں:

> ”بندے نے جناب مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) مرحوم کی سوانح عمری لکھی ہے اور عجائب واقعات گذرے ہیں اور جو جو کارنمایاں مولانا مرحوم نے کئے ہیں۔ ان کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ اور بہت سے متفرق واقعات علمی وعملی جن سے جناب مولانا کا یکتائے روزگار ہونا علوم ظاہری وباطنی میں ظاہر ہوتا ہے۔ مشرح مرقوم کئے ہیں اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ جناب مولانا مغفور کیا کیا چیزیں اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں اور غرض اس جمع و تفصیل سے یہ ہے کہ شاید کوئی کمر ہمت باندھے اور اپنے مقدور کے مطابق ایسے امور کے اجرا میں کوش کرے اور مضامین عالیہ سے خود نفع اٹھائے اور اوروں کو پہنچائے۔ یہ سوانح عمری لائق دیدے۔ شاید ایسی عجیب چیز بھی اس زمانے میں اور کوئی ہو۔ یہ سوانح عمری چونکہ ایک کتاب ہوگئی ہے۔ اس لئے بالفعل شائع ہونا اس کا ذرا دشوار ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو اس کا بھی دارا جائے گا۔“ (انتصار الاسلام صفحہ ۹)

ردعقائد سرسید بسلسلہ عدم وجود جسمانی فرشتگان وجنات:

مولانا فخر الحسن صاحب کی حسب ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک رسالہ ان خیالات باطلہ کے رد میں بھی لکھا تھا۔ جو سرسید نے اپنی تفسیر میں جنات اور فرشتوں کے خارجی حقیقی وجود کے انکار کے متعلق ظاہر کئے ہیں مولانا فخر الحسن صاحب انتصار الاسلام کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ”جناب خان (سرسید) صاحب بہادر نے جو سورہ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے، اس میں شیطان اور تمام جن اور فرشتوں اور دوزخ وبہشت کے وجود حقیقی خارجی کا انکار کیا ہے اور معجزات انبیاء کی تاویلیں کی ہیں۔ اس کا جواب بندے نے لکھا ہے جو قریب الاختتام ہے اگر خدا کو منظور ہوا اور اس کے طبع کا سامان ہوا تو وہ بھی عنقریب طبع ہو کر ناظرین کے ملاحظے میں گذرے گا۔“ (انتصار صفحہ ۸)

مگر ہمیں معلوم نہیں۔ یہ رسالہ چھپا بھی ہے یا نہیں۔ اور یہ پایہ تکمیل کو پہنچا بھی تھا یا

نہیں پہنچا تھا۔

غرض کہ حضرت قاسم العلومؒ کے مضامین عالیہ اور علمی تبرکات کو شائع کرنے میں جس قدر مولانا فخر الحسن صاحب پیش پیش تھے۔ اتنا کوئی بھی نہ تھا۔ چنانچہ انتصار الاسلام کے ابتدا میں لکھتے ہیں:

> ”جناب مولانا کی وہ تحریریں جو زیر طبع اب تک نہیں آئیں اور وہ کوئی سو جز ہوں گے ان کے شائع کرنے پر بندے نے کمر ہمت باندھی تو ہے۔ خداوند کریم مدد کرے۔ آمین۔“

مگر مولانا فخر الحسن صاحب نے مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی جو سوانح عمری لکھنے کا اوپر ذکر کیا ہے۔ افسوس چند اوراق کے سوا وہ ضائع ہوگئی۔ یہ ایسا عجیب خزانہ تھا جس پر تا قیامت روئیں تو اس کے ضائع ہونے کا کفارہ ادا نہیں ہوسکتا۔ واحسرتا، وامصیبتا، واویلا۔ خود مولانا فخر الحسن صاحبؒ کو اپنے استاذ کی اس سوانح عمری پر ناز تھا۔ چنانچہ یہ کتاب چھپنے بھی نہ پائی تھی کہ ان کا انتقال تقریباً ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں ہوگیا۔

بہر حال یہ ہیں مولانا فخر الحسن صاحب جنہوں نے استاد کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔

ذکر خیر مولانا احمد حسن صاحب امروہوی

مولانا احمد حسن صاحب ابن اکبر حسین ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں امروہہ ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے سیدوں کے اعلیٰ خاندان سے تھے۔ نہایت حسین وجمیل، خوبصورت اور وجیہہ۔ گھر کے مالدار اور صاحب حیثیت تھے۔ شروع میں مولوی رافت علی، مولوی کریم بخش نخشی، مولوی محمد حسین جعفری سے عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ان کے بڑے اساتذہ میں حکیم امجد علی خان، مولانا احمد علی سہارنپوری، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور مولانا عبدالقیوم بھوپالی وغیرہ شامل ہیں۔ مگر آخر میں حدیث حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھی اور بعض دیگر کتب بھی ان سے پڑھیں اور انہی کے ہو رہے۔ (تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۴۶۷) چنانچہ آپ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ جیسا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لکھا ہے کہ:

> ”مولوی احمد حسن امروہوی ان سے مولانا کو کمال محبت تھی۔ نہایت عمدہ ذہن وذکا اور اعلیٰ درجے کی عمدہ استعداد۔“ (صفحہ ۳۱)

خود حضرت قاسم العلومؒ اپنے استاد ہونے اور ان کی شاگردی کا اپنی کتاب ”مصابیح التراویح“ کے دیباچے میں اس طرح اظہار فرماتے ہیں:

> ”در ۱۲۸۸ھ...... دراواخر رمضان شریف مجموعہ کمالات سلالہ سادات عزیز من مولوی سید احمد حسن امروہی کہ باراقم ربط استناد دارند خطے فرستادند۔“

اس عبارت سے مولانا احمد حسن کا خاندان سادات اور امروہے کی سکونت اور عزیز اور ربط استناد یعنی شاگردی کا ہونا ثابت ہے۔ اپنے مکتوب بنام مولانا احمد حسن میں ان کے خط کا دیر سے آنے کا شکوہ اور مسرت کا اظہار ان لفظوں میں فرماتے ہیں:

> ''مکتوب آں عزیز نمی آمد و نگرانہائم می افزود۔ اکنوں پس از دیر رقیمہ آن عزیز رسید و ذریعہ شادمانیہا شد۔''

آں عزیز کا خط نہیں آتا تھا اور میرا انتظار بڑھتا جارہا تھا۔ اب دیر کے بعد آں عزیز کا خط پہنچا اور خوشیوں کا ذریعہ بنا۔

مجموعہ مکتوبات قاسم العلوم کے دسویں خط بنام مولانا فخر الحسن میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''من ندانم از طرف شما مولوی احمد حسن و مولوی محمود حسن بدلم چہ نہادہ اند اکثر موکشاں بکار پردازی شما می کشند۔'' (قاسم العلوم مکتوب دہم صفحہ ۱۹)

میں نہیں جانتا کہ تمہاری اور مولوی احمد حسن اور مولوی محمود حسن کی طرف سے میرے دل میں کیا ڈالدیا ہے کہ تمہارے کام انجام دینے کیلئے بال پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں۔

مولانا احمد حسن صاحب عظیم المرتبہ عالم، علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر اور علوم باطنی میں اپنے استاد کے جانشین تھے۔ نہایت خوش تقریر، بہترین خطیب اور واعظ۔

ملازمت:

مختلف مدارس مثلاً مدرسہ عربی شاہی جامع مسجد مرادآباد، گلاوٹھی ضلع بلند شہر اور خواجہ ضلع بلند شہر اور سنبھل و دہلی کے عربی مدرسوں میں ملازم رہے ۱۳۰۱ھ مابق ۸۴-۱۸۸۳ء میں تا وفات وطن میں قیام کیا اور مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں درس دیا۔ حضرت قاسم العلومؒ کے صاحبزادے مولانا حافظ محمد احمد صاحب گلاوٹھی میں مولانا احمد حسن صاحب کے پاس رہ کر ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے نگینے کے عربی مدرسے میں بھی آپ پڑھایا کئے ہیں۔

خورجہ ضلع بلند شہر میں آپ کی ملازمت کے سلسلے میں امیر الروایات کی روایت یہ ہے:

> ''مولوی احمد حسن صاحب امروہوی اس زمانے میں خورجے میں مدرس تھے۔ مولانا نانوتوی (مولانا محمد قاسم صاحب) بھی خورجے میں تشریف لے آئے اور مولوی عبدالرحمٰن صاحب مورچہ والوں کے مکان پر قیام فرمایا۔''

(حکایات اولیاء حصہ امیر الروایات صفحہ ۳۴۷)

ظاہر ہے کہ شاگرد پر خاص چشم لطف کے باعث ہی تو قاسم العلومؒ خورجہ تشریف لے

گئے۔ مدرسہ شاہی مراد آباد کے بارے میں امیر شاہ خان سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

> ”جناب مولوی احمد حسن صاحب امروہوی مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں مدرس تھے۔ مولانا نانوتویؒ کے انتقال کے بعد مولوی محمد یعقوب صاحب ہر سال جا کر امتحان لیا کرتے تھے۔“ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۳۵)

پھر جیسا کہ مولانا فخر الحسن صاحب کے حالات میں گذرا مولانا احمد حسن صاحب اپنے استاذ محترم کے ہمراہ مباحثہ شاہجہانپور ۱۲۹۳ھ و ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء و ۱۸۷۷ء میں ساتھ ساتھ ہیں۔

رامپور اسٹیٹ ضلع مراد آباد میں رفاقت:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیو بند متوفی ۱۹۳۰ء سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

> ”منشی حمید الدین سنبھلی فرماتے تھے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ سے ملنے کیلئے رامپور تشریف لے گئے۔ ساتھ مولانا احمد حسن صاحب (امروہوی) اور منشی حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہما تھے۔ ریل نہ تھی مراد آباد سے اس طرح چلے کہ خود حضرت پا پیادہ ہو لئے۔ منشی صاحب کی بندوق اپنے کندھے پر رکھ لی اور پھر منشی حمید الدین صاحب کو سواری پر بٹھا دیا۔ جس نے پوچھا کہ کون ہیں فرما دیتے کہ منشی حمید الدین صاحب رئیس سنبھلی ہیں۔ گویا کہ اپنے آپ کو ایک ملازم کی حیثیت سے ظاہر کیا۔“ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۸)

ظاہر ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب رامپور میں ہمراہ ہیں ادھر سیرت قاسمی ملاحظہ کیجئے اور آج کل کے گندم نما جو فروش صاحب جبہ و دستار خود نما اور خود پرست علماء و صوفیا کو دیکھو جو ہر جگہ اپنی پرستش کے خواہش مند رہتے ہیں۔ مگر مولانا خود پیدل ہیں دوسروں کو سواری پر مجبور کر کے بٹھاتے ہیں خود مجاہدانہ رنگ ہے اور پا پیادہ بلکہ اپنے آپ کو ملازم ظاہر کرتے ہیں اللہ رے عجز و انکساری۔

مولانا احمد حسن صاحب اور ان کی خوش لباسی:

حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ مولانا احمد حسن صاحب نے فرمایا کہ:

> ”چونکہ میں خوش لباس تھا تو مولانا کے یہاں ایک بار ایک شخص گاڑھے کا تھان لایا۔ مولانا نے قبول فرمالیا۔ درزی کو بلایا ایک انگرکھا اپنے لئے اور ایک میرے لئے سلوایا۔ میں نے پہنا نہیں تو بار بار پوچھا۔ آخر کار جب میں نے دیکھا کہ مولانا نہیں مانیں گے تو مجبوراً میں نے اس کو پہنا اسی طرح ایک جولاہے کے یہاں دعوت قبول فرمانے پر حضرت نانوتوی پر شروع شروع ایام حاضری میں مولانا احمد حسن صاحب نے ناک بھوں چڑھائی پھر جو دعوت کرنے کیلئے آتا تو یہ شرط کرتے کہ احمد حسن صاحب کی دعوت کرو تو منظور ہے۔ جب میرے دل سے یہ ناگواری نکل گئی تو میری دعوت کی شرط ترک کردی۔“ (ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۲۹۱)

دیکھئے مولانا احمد حسن صاحب کی اصلاح اور ان کے لئے انگرکھا سلوانا اور دعوت میں ساتھ رکھنا یہ دلی شفقت کا ثبوت ہے۔

مولانا احمد حسن صاحب پر روحانی تصرف:

حضرت قاسم العلومؒ ۱۸۷۶ء میں جب شاہجہانپور کے مباحثے میں تشریف لے گئے اور آپ کی تقریروں میں لوگ جوق در جوق شامل ہوئے۔ اور بعض دفتر کے لوگ تقریر نہ سن سکنے کے باعث دوبارہ تقریر سننے کا شوق ظاہر کرنے لگے۔ تو آپ نے مولانا احمد حسن صاحب کو فرمایا کہ میری تقریر آپ سنا دیں مولانا احمد حسن صاحب بہت گھبرائے۔ مگر مولانا کا حکم تھا اس لئے تقریر شروع کی۔ روایات الطیب میں مولانا احمد حسن صاحب سے خود منقول ہے کہ:

> ”میں نے (مولانا نانوتوی کی) تقریر بیان کی مگر پھر مجھ کو تقریر کے دوران میں کچھ خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مگر تقریر کے بعد لوگوں نے بیان کیا کہ من و عن وہی تقریر تھی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمائی تھی۔ بقول غالب ؎

دیکھئے تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا میرے دل میں ہے

مقام حیرت ہے کہ شاگرد کی زبان پر استاد اور استاد بھی ولی اللہ کس طرح بول رہا ہے کہ شاگرد کو خود ہوش نہیں کہ اس نے تقریر میں کیا کہا اور سننے والوں نے کہا کہ بالکل وہی تقریر ہے۔

مولانا احمد حسن صاحبؒ کو قاسم العلومؒ سے مناسبت:

مولانا احمد حسن صاحبؒ کو اپنے استاد سے بہت مناسبت تھی خود قاسم العلومؒ نے فرمایا۔ جیسا کہ مولانا اشرف علی صاحب سے منقول ہے کہ:

> ''مولوی احمد حسن کے دل و دماغ ذکاوت و ذہانت کو میری طبیعت سے خاص مناسبت ہے۔'' (قصص ماہ جمادی ۵۷ھ)

مولانا احمد حسن صاحب جمعیۃ الانصار کے پہلے جلسہ مراد آباد میں بحیثیت صدر جلسہ:

جمعیۃ الانصار کا ذکر ہم نے ابھی مذکورہ صفحات میں کیا ہے۔ اس کے اس جلسے میں جو اپریل ۱۹۱۱ء میں بمقام مراد آباد منعقد ہوا۔ اجلاس اول کی آپ نے صدارت فرمائی ہے اور اسی صبح کے اجلاس اول میں ۱۴/ اپریل ۱۹۱۱ء کو مولانا احمد حسن صاحبؒ کی لکھی ہوئی تقریر مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے پڑھ کر سنائی تھی۔ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

> ''اس تقریر میں مولانا مولوی سید احمد حسن صاحب نے دار العلوم دیوبند کے قیام اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی مدرسہ کے دلچسپ خیالات بیان کئے اور مدرسہ دیوبند اور جمعیۃ الانصار کے قیام کے متعلق بہت سے اکابر علماء کی آرا کا اقتباس دیا۔ بعض ان اعتراضات کا بھی ذکر ہے جو بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمعیۃ الانصار اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے لیکن یہ بات ہرگز صحیح نہیں۔''

(رپورٹ جلسہ مراد آباد صفحہ الف ۳۴)

یہ تو مولانا احمد حسن صاحب کی لکھی ہوئی تقریر تھی مگر اسی اجلاس کے آخر میں سامعین کے اصرار پر آپ نے ایک گھنٹہ تک تقریر فرمائی۔ مولانا عبید اللہ صاحب لکھتے ہیں:

> ”حضرت مولانا مولوی احمد حسن صاحبؒ صدر جلسہ نے تقریباً ایک گھنٹے وعظ بیان فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ خداوند تعالیٰ کے قہر سے طرح طرح مصائب اور بیماریاں ہم پر نازل ہو رہی ہیں۔ یہ تمام ہماری ان بداعمالیوں کا نتیجہ ہے جو ہم لوگ اس کے پاک دین و مذہب میں خرابیاں پیدا کرتے اور اس میں طرح طرح کے شکوک ڈالتے ہیں۔“

(رپورٹ موتمر الانصار مراد آباد صفحہ ۵۳)

> ”یہ جلسہ تو ۱۳۲۹ھ میں منعقد ہوا تھا۔ مگر دار العلوم دیوبند کی ایک اصلاح نصاب تعلیم کی میٹنگ میں بھی مولانا احمد حسن صاحب موجود ہیں۔ جو ۱۲/۱۱ محرم ۱۲۲۸ھ کو منعقد ہوئی تھی۔ اس اجلاس میں شرکت کرنے والوں میں مولانا اشرف علی صاحب کے دستخطوں کے بعد العبد کے نیچے مولانا احمد حسن صاحب امروہی کے چوتھے دستخط ہیں۔“

(رپورٹ صفحہ ۵۷)

تصنیفات:

مولانا احمد حسن صاحب کے مضامین کا ایک مجموعہ ”افادات احمدیہ“ کے نام سے چھپا ہوا ہے۔ بقیہ تصنیفات کا کوئی علم نہیں ان کے صاحبزادے مولانا سید محمد کی طرف سے ایک اعلان رسالہ القاسم دیوبند ماہ رمضان ۱۳۳۰ھ کے صفحہ ۳۲ پر ہمارے سامنے موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

> ”میرا قصد ہے کہ اپنے والد مغفور مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی کی جملہ تصانیف کو طبع کرواؤں اور ان بے بہا موتیوں کو مخفی نہ رہنے دوں۔ جن حضرات کے پاس آپ کی تصنیفات میں سے کوئی کتاب یا رسالہ یا کوئی تحریر ہو براہ کرم اس کو بندے کے پاس بھیج دیں کہ تصنیفات میں داخل کرلی جائے۔“

(بندہ سید محمد بن مولانا سید احمد حسن امروہی)

وفات مولانا احمد حسن:

مولانا احمد حسن صاحب امروہوی اپنے وعظ اور علم و فضل کے باعث ہندوستان بھر میں مشہور ہو گئے تھے۔ بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب آپ کا انتقال ٣٠ ربیع الاول ١٣٣٠ھ مطابق ١٩١٢ء کو امروہہ میں ہوا۔ گویا جمعیۃ الانصار کے پہلے جلسے کی صدارت کے اگلے سال ہی انتقال فرما گئے۔ متعلقین، واقفین، احباب و اقربا کے دلوں پر کوہ غم گر پڑا۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے دل کا غم اشعار میں نکالا ہے کہ کل گیارہ اشعار میں سے چند اشعار یہ ہیں

گم ہوئی ہے آج صد حسرت ہمارے ہاتھ سے
حضرت قاسم نشانی دے گئے تھے اپنی جو
جب شبیہ قاسمی سے بھی ہوئے محروم ہم
تم ہی بتلا دو کہ پھر ہم کیا کریں اے دوستو
لوگ کہتے ہیں چلے علامہ احمد حسن
اور میں کہتا ہوں وفات قاسمی ہی ہو تو ہو
کامل و اکمل سبھی موجود ہیں پر اس کو کیا
جو کہ مشتاق ادائے قاسم خیرات ہو
اپنی اپنی جائے پر قائم ہیں سب اہل کمال
پر جگہ استاد کی خالی پڑی ہے دیکھ لو
ہاں جنونِ اتحاد قاسمی میں بارہا
تم کو ہم کہتے تھے سن اور آپ کو کہتے تھے تو
مجمع حسرت قرین داد و غم میں، میں بھی تھا
فکر میں تاریخ کے سب نے کیا جب سر فرو

بادل پُر یاس آئی کان میں میرے صدا
حک ہوئی تصویر قاسم صفحہ دنیا سے لو

١٣ ھ ٣٠

حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری نے قطعہ تاریخ جو لکھا ہے اس کے بارہ اشعار میں سے چند اشعار یہ ہیں:

زبدہ اصحاب فیض قاسم اسرار دیں
آنکہ بودہ آیتے زایات رب ذوالمنن
جامع شرع و طریقت کاشف اسرار حق
در علوم عقلی و نقلی امام اہل فن
از ربیع الاول، آخر روز، روز آخرش
بود کہ بربست ناگہ رخت ازیں دار محن
سن ترحیلش دریں حالت دل بیتاب بست
تابماند یاد سال نقل آں فخر زمن

گفت ہاتف بالیقین از روئے بخشائش بخواں   جنت علیا قرار مولوی احمد حسن
۲۸/۳۰   ھ   ۱۳

استاذ محترم مولانا سراج احمد صاحب مرحوم سابق مدرس دار العلوم دیوبند نے قطعہ تاریخ لکھا جس کے بیس اشعار میں سے چند اشعار یہ ہیں:

حضرت قاسم کی کھو بیٹھے نشانی آج ہم   ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور ملتا نہیں اس کا نشاں
چشم مشتاق جمال قاسمی حیراں ہے   ہوگئی تصویر قاسم آج نظروں سے نہاں
مولوی احمد حسن صاحب نے پائی ہے وفات   آج امروہہ سے آئی ہے خبر یہ ناگہاں
صدمہ ہجر شبیہ قاسم علم و ہدیٰ   ہے مصیبت سے مصیبت یا الٰہی الاماں
ماہتاب مستنیر آفتاب قاسمی   آج نظروں سے ہماری ہوگیا ہے ہے نہاں
تھا بیاں میں آپ کی طرز ادائے قاسمی   یاد آتا ہے ہمیں رہ رہ کے وہ طرز بیاں
دنگ رہ جاتے تھے ان کی بزم میں اہل کمال   تھی روانی آپ کی تقریر کی بحر رواں
عالم تصویر ہوتی تھی دم تقریر بزم   ہے کہاں اب آپ سا جادو بیاں شیریں زباں
صبر کرائے عاشق ناز وادائے قاسمی   مصرع تاریخ پڑھ اب اے سراج نوحہ خواں
یوں سروش غیب نے مجھ سے کہا از روئے لطف   اُدْخِلَ الْخُلد آپ کا ہے سن رحلت بیگماں
۱۳۳۰ھ

یہ سب اشعار صاف بتاتے ہیں کہ حضرت مولانا احمد حسن صاحبؒ صحیح معنی میں کیا علوم فنون، فضل وکمال، تقریر ووعظ اور کیا صورت وشکل میں اپنے استاد قاسم العلومؒ کی مانند وشبیہ تھے مذکورہ بالا قطعات تاریخ رسالہ القاسم جمادی الاول ۱۳۳۰ھ میں طبع ہوئے ہیں۔

لطیفہ:

آخر میں ہم ایک بالکل صحیح اور یقینی دلچسپ واقعہ پیش کرتے ہیں جو نانوتے میں پیش آیا۔ ان دنوں مولانا احمد حسن صاحبؒ اور مولانا محمود حسن صاحب نانوتے ہی میں حضرت کے پاس تھے اور پڑھتے تھے۔ یہ واقعہ مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی سے معلوم ہوا ہے اور ان سے ان کے والد مولوی حافظ محمد اسماعیل صاحب نے بیان کیا جنہوں نے قاسم العلومؒ کو دیکھا ہے۔

لطیفہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی دیوبند تشریف لائے۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے پاس بیٹھک میں ٹھہرا کرتے تھے کہ حافظ صاحب کے استاد تھے۔ شیخ الہند بخاری پڑھا کر ملنے کیلئے آئے اور رخصت ہو گئے۔ مولانا احمد حسن صاحب نے طلبہ سے جو حاضر تھے فرمایا کہ:

> ”یہ تمہارے بڑے مولانا بڑے حضرت تھے ایک دفعہ تو طالب علمی کے زمانے میں مجھ پر قیامت ہی برپا کر دی تھی۔“

فرمایا:

> ”ایک دفعہ نانوتے میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب تو حجرے میں آرام فرما رہے تھے اور طلبہ مسجد میں طالب علمانہ انداز میں مذاقیہ باتیں کر رہے تھے مجھے مولانا محمود حسن نے کچھ کہا سنا تو میں ان کو پکڑنے کیلئے اٹھا تو یہ مسجد سے باہر بھاگ گئے۔ میں نے دور تک ان کا پیچھا کیا مگر یہ دور نکل گئے اور ہاتھ نہ آئے۔ کچھ تاخیر سے ناکام واپس لوٹا تو باہر سے میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ روبقبلہ ہو کر وضو فرما رہے تھے میں سمجھا مولانا محمود حسن ہیں۔ پشت دروازے کی طرف تھی۔ تو میں نے مسجد سے باہر جوتے نکال کر نہایت آہستہ دبے پاؤں پہنچ کر پیچھے سے ایک دم اوپر کو اٹھا کر کہا کہ بتلا کہاں پھینکوں تو فوراً آواز آئی کہ آخر قصور۔ یہ لفظ سن کر میری روح نکل گئی وہ حضرت نانوتوی تھے۔ پھر میں آہستہ سے حضرت کو بٹھا کر وہاں سے بھاگا مسجد افغاناں میں پہنچا۔ عصر تک وہیں رہا۔ ادھر حضرت پوچھتے میر صاحب کہاں گئے۔ آخر مولانا محمد منیر صاحب وہاں گئے جن کو لوگ چچا چچا کہا کرتے تھے جا کر مجھ سے کہا کہ مولانا کئی دفعہ یاد کر چکے ہیں۔ میرا ہاتھ انہوں نے پکڑا اور حضرت کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن میری آنکھیں ندامت سے زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ مگر حضرت قاسم العلومؒ نے مزاح مزاح میں میری تسلی فرمائی ورنہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کبھی حضرت کو اپنی صورت نہ دکھاؤں گا۔“ (تحریر مفتی محمود صاحب نانوتوی)

مولانا منصور علی مرادآبادی وحیدرآبادی

مولانا منصور علی صاحب مرادآباد کے رہنے والے تھے اور بعد ازاں حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہ بھی حضرت قاسم العلومؒ کی شاگردی میں رہے۔ ان کی مصنفہ کتاب "مذہب منصور" قاسم العلوم سے ان کی شاگردی پر کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مجھ کو ملا جلال (منطق کی کتاب) اول سے آخر تک (مولانا قاسم العلومؒ) نے پڑھایا۔" (مذہب منصور صفحہ ۱۸۶)

وہی مولانا منصور علی یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت اس زمانے میں نانوتے ہی میں تشریف رکھتے تھے اور:

> "مولوی محی الدین خان صاحب مرادآبادی اور مولوی عبدالعلی صاحب میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ بجنوری حاضر تھے۔ میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا۔"

اس تحریر میں بھی تین حضرات کا ذکر ہے۔ جن میں سے ایک مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری بھی ہیں۔

حضرت قاسم العلومؒ اپنے سب شاگردوں سے بے حد محبت فرماتے تھے۔ اور شاگرد بھی جان دینے کیلئے تیار تھے۔ مولانا منصور علی صاحب اپنے استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ان کی سی نزاکت اور دلبری کسی معشوق میں بھی نہ دیکھی۔ ان کا ذرا التفات اگرچہ جلالی ہو دافع بلیات تھا۔ وہ سرتاپا اکسیر اور کندن تھے۔ اور ان کا لطف اور التفات جمالی مفرح القلوب اور کفایہ منصوری تھا۔" (مذہب منصور صفحہ ۱۹۸)

مولانا منصور بھی حضرت قاسم العلوم کے بڑے عاشق شاگرد تھے۔ شاگرد کا عشق بھی

یونہی نہیں تھا بلکہ انہوں نے قاسم العلومؒ کے علمی جلوے دیکھے تھے اور خود مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کو ان کا مداح پایا تھا۔ مولانا منصور علی صاحب اپنی کتاب ''مذہب منصور'' میں لکھتے ہیں:

> ''ایسے نکات حدیث، وقت مدرس کے (حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے) بیان کئے کہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم مجمع عام طلبہ فارغ التحصیل کے روبرو ان توجیہات مولانا مرحوم کو بیان فرما کر مولانا (محمد قاسم) صاحب کی بڑی تعریف کیا کرتے۔''

(مذہب منصور صفحہ ۱۸۲)

اور ادھر استاد کو شاگردوں کا یہ پاس کہ ان کو وسیلہ مغفرت سمجھتے ہیں۔ مجموعہ قاسم العلوم کے خط نمبر ۱۰ میں مولانا فخر الحسن کے نام ایک مضمون ارسال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''زیرِ قلم کشیدہ نزد آں عزیز رسانم شاید بدائے یادم کنند۔ اے عزیز! دست ایں افتادہ باید گرفت بار گناہانم ندانم کجا برد۔''

اور اس سے زیادہ اور کیا غضب ہوگا کہ ارواح ثلاثہ میں مولانا احمد حسن صاحب امروہوی کی زبانی یہ روایت ہے کہ:

> ''جس (طالب علم) کے اندر (مولانا) تواضع دیکھتے تھے تو اس کے جوتے اٹھالیا کرتے تھے۔'' (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۰۶)

مولانا عبدالعلی صاحبؒ

مولانا عبدالعلی صاحبؒ عبداللہ پور ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ بڑے قابل اور فاضل تھے۔ انہوں نے حضرت قاسم العلومؒ کی شاگردی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت نانوتویؒ میرٹھ میں پڑھاتے تھے جب سے ہی شاگردی میں داخل ہوئے۔ فراغت کے بعد کئی جگہ پڑھاتے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً جب شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ۱۲۹۴ھ میں اپنے استاد کے ہمراہ حج کو تشریف لے گئے ہیں اور وہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے تو مولانا عبدالعلی صاحب نے چھ ماہ دارالعلوم دیوبند میں ان کی جگہ ان کی غیر حاضری میں تعلیم دی۔ حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب حیات شیخ الہند میں لکھتے ہیں:

> ''مدرسے میں حضرت مولانا (محمود حسن صاحب) کی جگہ تقریباً چھ ماہ تک مولانا عبدالعلی صاحب نے کام کیا۔'' (صفحہ ۱۵)

یہی مولانا عبدالعلی صاحب دارالعلوم دیوبند میں مدرس پنجم بن کر ۱۲۹۵ھ میں پڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی طلبہ کی انجمن ثمرۃ التربیت میں چندہ دینے والوں کی جو فہرست موتمر الانصار مراد آباد کی رپورٹ صفحہ ۴۶ پر درج ہے۔ اس میں چندہ دہندگان کی فہرست میں مولانا عبدالعلی صاحب کا بارہواں نمبر ہے۔ اور آپ کی تنخواہ دارالعلوم میں اس وقت بارہ روپیہ تھی۔ اور سالانہ چندہ کی مقدار تین روپیہ درج ہے اور نام کے آگے لکھا ہے ''مدرس پنجم ہذا (یعنی دارالعلوم دیوبند)'' حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی وفات کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی صدر مدرس بنائے گئے اور ملا محمود صاحب مدرس دوم، مولانا شیخ الہند مدرس سوم اور مولانا عبدالعلی صاحب کو مدرس چہارم بنایا گیا۔ لیکن جب مولانا سید احمد صاحب ۱۳۰۵ھ میں بڑی تنخواہ پر بھوپال چلے گئے تو شیخ الہند مدرس اول اور مولانا عبدالعلی

صاحب مدرس دوم ہوئے۔ ملا محمود صاحب کا انتقال ۱۳۰۵ھ میں ہو چکا تھا۔ بعد ازاں مولانا عبدالعلی صاحب مظاہر العلوم میں مولانا محمد مظہر صاحب کے انتقال کے بعد قائم مقام مدرس اول ہو گئے۔ لیکن پھر آپ مراد آباد چلے گئے اور وہاں کے مدرسے میں مدرس اول ہوئے اور یہاں استعفا بھیج دیا۔ ۱۳۱۴ھ میں پھر آپ دار العلوم دیو بند میں آ گئے۔

جب مظاہر العلوم کے ممبران مولانا خلیل احمد صاحب کے جو اس وقت مظاہر العلوم میں صدر مدرس تھے سخت مخالف ہو گئے تھے اور ان کو برخاست بھی کر دیا تھا تو ان کی جگہ مظاہر العلوم کی صدر مدرسی کیلئے پھر مولانا عبدالعلی صاحب کو بلوالیا گیا تھا مگر مولانا خلیل احمد صاحب اپنی جگہ رہے۔ اور مولانا عبدالعلی صاحب کو سمجھا بجھا کر روک دیا گیا۔ (حیات شیخ الہند صفحہ ۱۹ تذکرۃ الخلیل صفحہ ۱۱۱ و ۱۱۹) آخر میں جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی جلد اول میں لکھا ہے۔ آپ مدرسہ عبدالرب دہلی میں صدر مدرس ہو گئے تھے اور محدث دہلوی کہلائے۔

الحاصل:

حضرت قاسم العلومؒ کے یوں تو بہت سے شاگرد تھے مگر ان میں سے خصوصی شاگرد یہی چند حضرات یعنی مولانا محمود حسن صاحب، مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا احمد حسن صاحب، مولانا عبدالعلی صاحب، مولانا عبدالعدل صاحب، مولانا محی الدین صاحب مراد آبادی قاضی ریاست بھوپال، مولانا عبدالحق صاحب ساکن پر قاضی تھے آپ کے مجموعہ رسائل قاسم العلومؒ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی فدا حسین صاحب کوئی صاحب پٹنہ بہار کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مولانا کو عریضہ لکھا کہ میں آپ سے تعلیم حدیث حاصل کرنے کا شائق ہوں آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

> ”شوق علم حدیث مبارک باد۔ مگر ایں قدر مسافت طویلہ قطع کردن آں ہم پیش ایں ہیچمدان رسیدن قرین مصلحت نیست۔ عالم آباد است، غالباً رجرادشاں بسیارے از اہل کمال باشند ورنہ کلکتہ بہ نسبت دہلی و اطراف آں از آنجا نزدیک باشد بخدمت مخدوم العلماء مطاع الفضلا حضرت استاذی مولوی احمد علی صاحب باید شتافت۔“

علم حدیث کا شوق مبارک ہو۔ مگر اس قدر طویل سفر طے کر کے اس ناچیز کے پاس

> پہنچنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ دنیا آباد ہے غالباً آپ کے اطراف میں بہت سے اہل کمال ہوں گے ورنہ کلکتہ بہ نسبت دہلی اور اس کے گرد و نواح کے وہاں سے نزدیک ہے۔ میرے استاذ مخدوم العلماء، مطاع الفضلا مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں دوڑ جاؤ۔

حضرت قاسم العلومؒ کا یہ دور پہلے حج کے بعد منشی ممتاز علی کے دہلی میں مطبع منتقل ہو جانے کے بعد کا دور معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے دہلی کا اس میں ذکر آیا ہے۔ اس زمانے میں مولانا احمد علی صاحب میرٹھ کے لال کرتی والے تاجروں کی طرف سے کلکتے میں چمڑے کے کاروبار کی وکالت کرتے تھے اس لئے ان کو اپنے استاد علیہ الرحمۃ سے حدیث پڑھنے کا مشورہ دیا گیا حضرت شاہ عبدالغنی کے کہیں کہیں ذکر کے بعد اس خط میں اپنے دوسرے استاد مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کا ذکر یہاں قاسم العلومؒ کے قلم سے ہوا ہے۔

مولوی محمد اسماعیل صاحب رئیس علیگڑھی

مولانا مناظر احسن گیلانی نے علیگڑھ کے ایک رئیس مولوی محمد اسماعیل (۱) کی شاگردی کا بھی سوانح قاسمی جلد اول میں ذکر کیا ہے اور انہوں نے یہ واقعہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب شیروانی سے سنا ہے کہ مولوی محمد اسماعیل صاحب رئیس علیگڑھ نے مولانا قاسم العلومؒ کو لکھا کہ میرا دل حدیث پڑھنے کو چاہتا ہے عدیم الفرصتی کے باعث کہیں جا کر پڑھنا دشوار ہے۔ مولانا کا جواب گیلانی صاحب نے بروایت شیروانی صاحب یہ لکھا ہے:

> ”اور کسی عالم کو اپنے کاموں سے فرصت کہاں ہے جو آپ کے پاس جانے پر راضی ہو سکتے ہوں البتہ ایک بیکار آدمی خود یہ فقیر ہے۔ حکم ہو تو بندہ ہی حاضر ہو کر آپ کی خدمت کی سعادت حاصل کرے۔“ (سوانح قاسمی جلد اول صفحہ ۴۳۸)

مولوی محمد اسماعیل کو اور کیا چاہئے تھا۔ کنواں پیاسے کے پاس آنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ بہر حال آپ نے علیگڑھ مقیم رہ کر پندرہ روپیہ ماہوار پر خود تنخواہ مقرر کر کے انہیں تعلیم دی۔ مولوی محمد اسماعیل پندرہ روپیہ کی قلیل تنخواہ پر شرمندہ نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک روز اثنائے درس میں حضرت قاسم العلوم والخیرات نے ان سے فرمایا۔ مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں:

> ”میاں اسماعیل جو رقم اب تک تم دیتے تھے اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔ وہ خوش ہوئے کہ شاید کچھ اضافے کی منظوری عطا فرمائی جائے گی۔ لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی پندرہ روپیہ جو تم دیتے تھے۔ ان میں دس تو میں اپنے

---

(۱) مولوی محمد اسماعیل صاحب متوفی ۱۲۷۵ھ مولانا عبدالسبحان صاحب علیگڑھی کے فرزند تھے۔ جو ۱۸۵۷ء میں شہید ہو گئے تھے۔ مولوی محمد اسماعیل کو پڑھانے کا زمانہ میرٹھ کے قیام کا زمانہ ہے۔ (سوانح مولانا محمد احسن صفحہ ۲۱۵)

گھر والوں کو دیا کرتا تھا اور پانچ روپیہ (غالباً) والدہ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ کل خط آیا ہے کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے پانچ کی ضرورت اب باقی نہیں رہی آئندہ بجائے پندرہ کے دس ہی روپیہ دیا کرنا۔ مولوی محمد اسماعیل ششدر و حیران تھے کہتے جاتے تھے کہ حضرت مجھ پر اب کوئی بار نہیں لیکن ادھر سے اصرار تھا کہ غیر ضروری روپیہ کا بار اپنے سر بلا وجہ کیوں لوں۔''

(حاشیہ سوانح قاسمی گیلانی جلد اول صفحہ ۴۲۶)

علیگڑھ پڑھانے اور وہاں قیام کا ثبوت مولانا فخر الحسن صاحب کے نام قاسم العلومؒ کے دسویں خط سے ملتا ہے۔ کہ حضرت ان کو لکھتے ہیں:

''در اوائل عشرہ ماہ گذشتہ پس از ردو کد بسیار انجام کار رفتن کول تا اختتام بخاری و صحیح مسلم قرار یافتہ بود۔ امروز یاز دہم است غالباً کہ اینجا رسیدہ ام غالباً بتقریب نکاح مولوی محمود حسن تا بدیو بند قدم رنجہ فرمایند۔ افسوس کہ کول از راہ بیک سو افتادہ است۔''

(قاسم العلوم صفحہ ۱۹)

آگے چل کر مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''غالباً مولوی فخر الحسن صاحب اس زمانے میں نگینہ کے عربی مدرسہ میں مدرس تھے۔ ظاہر ہے کہ نگینہ سے دیو بند جانے والوں کیلئے کول یکسو افتادہ است کے سوا اور صورت بھی کیا تھی۔''

مگر کہاں علیگڑھ مولوی گیلانی کو یہاں سہو ہوا معلوم ہوتا ہے بلکہ مولانا فخر الحسن صاحب نواب عظیم خان صاحب کے یہاں خورجے میں بھی پڑھاتے تھے۔ اس لئے خورجے سے دیو بند کی سفر کی صورت میں یہ کہنا ''افسوس کہ کول از راہ بیکسو افتادہ'' درست ہوگا۔

مولانا حافظ محمد احمد صاحب فرزند قاسمی کا باپ سے تلمذ

مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی کی یادداشت میں حسب ذیل ایک تاریخی حقیقت ملتی ہے۔ جس سے حضرت قاسم العلوم کا اپنے فرزند اکبر مولانا حافظ محمد احمد صاحب کو کافیہ عربی نحو کی مشہور کتاب کا بطور افتتاح پڑھانا ثابت ہوتا ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> ''حضرت نانوتوی کے خلف الرشید (مولانا حافظ محمد احمد صاحب) فرماتے تھے کہ حضرت نے مجھے حضرت (مولانا احمد حسن صاحب) امروہوی کی خدمت میں تعلیم کے لئے بھیج دیا تھا۔ انہی دنوں میں حضرت نانوتوی کا امروہہ تشریف لے جانا ہوا۔ اس روز میرا کافیہ شروع ہونے والا تھا۔ حضرت امروہی نے فرمایا کہ ''کافیہ'' کی بسم اللہ حضرت سے ہو جائے۔ چنانچہ کتاب سامنے آئی۔ عبارت پڑھی گئی۔ اہل علم حاضر تھے۔ فرمایا اچھی کتاب سامنے لے کر آئے جس میں نہ اللہ کی حمد اور نہ رسول ﷺ کی ثنا۔ اس کے بعد بہت دیر تک اسی سلسلے میں تقریر فرمائی جو نکات اور لطائف سے لبریز تھی۔ بس یہ ایک سبق خلف الرشید نے حضرت سے پڑھا ہے۔''

الغرض حضرت قاسم العلومؒ والخیرات کے خاص شاگردوں کی یہ ایک مختصر سی تعداد تھی۔ لیکن ایک اور ہستی جس نے نہ تو قاسم العلومؒ کو دیکھا ہی ہے اور نہ ان سے براہ راست تعلیم ہی حاصل کی ہے۔ لیکن علوم قاسمیہ پر اکابر کے خیال کے مطابق ان کو بڑا عبور ہے اور جس قدر انہوں نے علوم و معارف قاسمیہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور جا بجا اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کے علوم کی اشاعت کی ہے اس قدر متقدمین اور متاخرین میں کسی نے نہیں کی اور وہ علامہ شبیر احمد صاحبؒ عثمانی ہیں۔

زبانِ قاسمیؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

اگر آپ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا پورا لٹریچر پڑھیں گے تو اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ علوم قاسمیہ کے سب سے بڑے حامل اور علمبردار وہی ہیں۔ بلکہ ہم اس کہنے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں سمجھتے کہ جس طرح حاجی امداد اللہ صاحب کے فرمانے کے مطابق کہ:

> ''اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد قاسم صاحب کو میری زبان بنایا ہے۔''

اسی طرح اگر ہم یہ کہیں کہ:

> ''اللہ تعالیٰ نے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ترجمان قاسم اور زبان قاسم بنایا تھا تو بالکل صحیح ہوگا۔''

ہم نے علامہ عثمانی کے ترجمان قاسمؒ ہونے کے بارے میں اپنی کتاب ''تجلیات عثمانی'' میں سیر حاصل بحث کی ہے وہاں ملاحظہ کی جائے لیکن یہاں مختصر طور پر صرف ایک تاریخی حقیقت کو اس مقصد کے لئے پیش کرنا کافی ہوگا۔ جب ۲۶ رمضان ۱۳۲۷ھ کو بعد نماز عشاء جمعیۃ الانصار نے دارالعلوم دیوبند میں جنم لیا اور اس کے ماتحت مختلف شعبے یعنی

۱۔ تکمیل التعلیم ۲۔ نظام التعلیم ۳۔ الارشاد

۴۔ التالیف والاشاعت ۵۔ جلسہ علمیہ

قائم کئے گئے تو انہی شعبوں میں درجہ تکمیل کے نصاب میں حضرت قاسم العلومؒ اور شاہ ولی اللہؒ وغیرہما کی تصنیفات کو پڑھائے جانے کی تجویزیں بھی ۱۲/۱۱ محرم ۱۳۲۸ھ کے اجلاس میں پاس ہوئیں اس اصلاح نصاب کی مجلس میں جن حضرات نے شرکت کی اس میں:

۱۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ۲۔ مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہوی

۳۔ مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی
۴۔ مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری
۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ
۶۔ مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ
۷۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ
۸۔ مولانا صدیق احمد صاحبؒ انبیٹھوی
۹۔ مولانا محمد احمد صاحبؒ مہتمم
۱۰۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ
۱۱۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحبؒ چاندپوری
۱۲۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امروہوی
۱۳۔ مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی
۱۴۔ مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی

وغیرہم تھے۔

نصاب کی تجویزوں کے بعد ۱۳ محرم ۱۳۲۸ھ کو ایک اور نشست ہوئی جس میں مذکورہ بالا حضرات تھے۔ اس مجلس میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی تصنیفات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب سے فرمایا:

> ’’مولوی شبیر احمد صاحب مدرس اول مدرسہ فتحپوری دہلی کو چونکہ مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم کی کتابوں سے ایک خاص مناسبت حاصل ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا عمامہ ان کو دوں۔ آپ اس امر کا اعلان فرمادیں۔ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب نے حضرت مولانا (اشرف علی صاحب) کی اس قدر افزائی کا اعلان فرمایا۔ اس کے بعد سلطان العلما (مولانا محمود حسن صاحب) مدظلہم سے اجازت لیکر مولانا اشرف علی صاحب عم فیضہم نے اپنا عمامہ مولوی شبیر احمد صاحب کے سر پر رکھا۔‘‘

(روئداد موتمر الانصار مرادآباد صفحہ ۵۹)

اس تاریخی یادگار مجلس پر نظر ڈالئے جس میں اونچے درجے کے تمام اکابر کی موجودگی میں حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے علامہ عثمانیؒ کی اس خصوصی شان کا اعلان کرتے ہوئے کہ ان کو حضرت قاسم العلومؒ کے علوم سے خاص مناسبت ہے ان کے سر پر اپنا عمامہ رکھ کر علوم قاسمی سے مناسبت کی مہر لگادی۔ اس لئے ہمارا یہ کہنا کہ ’’علوم قاسمی‘‘ کے صحیح وارث، قاسم العلوم کی زبان اور ان کے ترجمان علامہ عثمانی تھے۔ کوئی مبالغہ آرائی اور غلط بیانی نہیں ہے۔

یہ تو قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کا حال تھا۔ لیکن یہی شاگرد کیوں منتخب کئے تھے۔ اس کی وجہ ذرا سنئے۔

علوم میں بلند پروازی:

یہ شاگردوں کا انتخاب اور صدائے عام سے پرہیز اس لئے تھا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے مرکز تعلیم بنا کر کچھ خاص طلبہ کو مختلف رنگوں میں رنگنا چاہتے تھے۔ یعنی وہی رنگ جو دربار نبوی میں تھا کہ بعض اصحاب مسند علم وفقہ اور حکمت واسرار میں کمال رکھتے تھے تو بعض پر علم کے ساتھ جہاد کا رنگ غالب تھا۔ پھر چونکہ قاسم العلوم کی علمی پرواز بہت بلند تھی اس لئے جب تک طلبہ بھی بلند پرواز نہ ہوں ان سے استفادہ مشکل تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ عثمانی نے براہ راست مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنا ہے انہوں نے فرمایا:

> ''ایک دفعہ میں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا اس وقت حضرت مولانا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرے میں تھے اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی۔ مولانا نے اس مسئلے پر تقریر شروع کی لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس جن کو میں قطعاً نہیں سمجھ سکا۔ میں نے کہا کہ کچھ نازل ہو کر تقریر فرمائیے میں قطعاً نہیں سمجھا تو پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل (آسان) تھی جس کے لفظ مانوس تھے مگر معانی قطعاً بلند اور غیر مانوس جن کو میں نہیں سمجھا۔ تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں سمجھا کچھ اور نازل ہو تو فرمائیے پھر اس سے اتر کر اور نازل (آسان) تقریر فرمائی۔ جو کچھ قریب الفہم آ گئی تھی مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی دوسرے وقت پوچھئے گا۔''

(ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۹۷)

دراصل حضرت قاسم العلومؒ کے دل پر فیضان ربانی ہوتا تھا اور وہ چشموں کی صورت میں قلب قاسمی سے ابل پڑتا تھا۔ قاسم العلوم پر معانی کا اس قدر نزول ہوتا تھا کہ علوم سمندر کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اور کثرت معانی واسرار کے جلووں کا دل پر اس قدر ظہور ہوتا تھا کہ ان اسرار کو سمیٹنا ان کے لئے دشوار ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتنی ہی مرتبہ تقریر کرتے کرتے

رک جاتے تھے۔ اور جب پوچھا جاتا کہ آپ اثنائے تقریر میں کیوں رک جاتے ہیں تو فرماتے تھے کہ دل پر مضامین اتنے وارد ہوتے ہیں کہ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ کس کو بیان کروں اور کس کو بیان نہ کرو۔ (اروح ثلاثہ بروایت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا وہ واقعہ بھی یاد کیجئے جب حضرت قاسم العلوم نے میرٹھ سے ان پر توجہ دی اور وہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔ عارف باللہ کے الفاظ یہ ہیں:

> ''آج صبح کی نماز میں سورہ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر سے گذرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے مگر وہ دریا جیسا کہ ایک دم آیا ویسا ہی نکلا چلا گیا۔'' (ارواح صفحہ ۲۸۳)

آگے چل کر عارف باللہ فرماتے ہیں کہ:

> ''اللہ اکبر، جس شخص کی توجہ کا یہ اثر ہے کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں اور تحمل دشوار ہو جائے تو خود اس شخص کے قلب کی وسعت وقوت کا کیا حال ہوگا جس میں خود وہ ہی سمائے ہوئے ہوں۔'' (ارواح صفحہ ۲۸۳)

حضرت قاسم العلومؒ کا دل جہاں علوم کا سمندر تھا وہاں ان کا دماغ اس قدر بلند پرواز تھا کہ آسمان علم سے مضامین کے بے شمار تارے توڑ کر لاتا تھا۔ اور اس وقت ان کا بول ملار اعلیٰ سے جا ملتا تھا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مولانا محمد یعقوب صاحب کا ایک قول بیان فرمایا کہ:

> ''ایک مرتبہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک مضمون نیا بیان کیا کسی نے حاضرین میں سے کہا کہ یہ مضمون تو ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی بیان فرمایا تھا ارشاد فرمایا کہ جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں سے ہی وہ فرماتے تھے مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کی برابر کھلتا تھا اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے (سوراخ) کی برابر کھلتا ہے۔'' (قصص الاکابر صفحہ ۲۹)

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا کہ:

> ''مولانا محمد قاسم صاحب تو کتاب سے کچھ کہتے ہی نہ تھے اس فہم خداداد سے کہتے تھے

جس کی نسبت وارد ہے

من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں سمجھ عنایت فرما دیتا ہے

تعلیم و تدریس اقلیدس:

ہم حضرت قاسم العلومؒ کے معارف، دقیقہ سنجی، نکتہ رسی اور ان کے علوم کی گہرائیوں پر بحث کر رہے تھے اور ہمارا یہ مقصد تھا کہ ایسے عظیم الشان عالم سے پڑھنے کے لئے تلامذہ بھی قابل درکار ہیں۔ جیسا کہ ان کے شاگرد تھے۔

ہم نے گذشتہ اوراق میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی زبانی میرٹھ میں قاسم العلومؒ کے ہر قسم کے مضامین حدیث، تفسیر، فقہ، منطق و فلسفہ، مثنوی مولانا رومی کی تعلیم دینے کا ذکر کیا ہے جہاں مولانا قاسم العلومؒ نے یہ سب علوم و فنون کا طلبہ کو درس دیا ہے وہاں اقلیدس کا درس بھی دیا ہے۔ اقلیدس پڑھانے کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

> ''حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے چند دن اقلیدس کا درس بھی دیا ہے۔ چھتے میں جب اقلیدس پڑھاتے تھے اور شکل کھینچنے کی ضرورت پڑتی تھی تو وہیں چٹائی کا کونہ اٹھا کر اور زمین پر انگلی سے شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے۔ نہ پرکار تھی نہ اوزار تھے۔''

(ارواح صفحہ ۲۷۴)

ریاضی و اقلیدس میں ماہرانہ نظر:

حضرت قاسم العلومؒ کو جہاں دیگر علوم عربیہ میں کامل دسترس تھی وہاں حساب اور اقلیدس میں بھی کمال حاصل تھا۔ حسابی مہارت کے متعلق قاسم العلومؒ کا حیرت انگیز کارنامہ جو دہلی کالج میں عہد طالبعلمی میں ظہور میں آیا۔ ہم بیان کر چکے ہیں لیکن ایک بار اور سن لیجئے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو

> فرمایا کہ ان کے حال سے متعرض نہ ہو جو میں ان کو پڑھا لوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کر لیا۔ از بسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا۔ طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی یہ کب عاری تھے۔ ہر بات کا جواب باصواب تھا۔ آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا۔“

(سوانح قاسمی صفحہ ۸)

اندازہ لگائیے کہ کسی سے پڑھے بغیر اقلیدس اور تمام حساب پر عبور کر لینا کتنی بڑی بات ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے ارواح ثلاثہ میں صاف تائیدی روایت موجود ہے کہ رام چندر نے جو عربی کالج کا ریاضی کا استاد تھا اس نے منشی ذکاء اللہ کو بعض مشکل سوالات سکھا کر بھیجے تھے لیکن مولانا نے سب کو حل کر کے رکھ دیا بلکہ مولانا حبیب الرحمٰن کی روایت یہ بھی ہے کہ:

> ”مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے بھی بعض سوالات کئے لیکن منشی ذکاء اللہ کو جواب نہیں آیا۔“ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۲)

رام چندر نے بعض مشکل سوالات کے ذریعہ مولانا کو زچ کرنا چاہا تھا کہ حضرت قاسم العلومؒ نے رام چندر سے حساب پڑھنا گوارا نہ کیا تھا۔

قاسم العلومؒ کی اقلیدس اور علم ہندسہ میں انتہائی بصیرت کے سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی وہ روایت بھی یہاں لکھنا نہایت ضروری ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

> ”ایک انگریز مہندس (اقلیدس داں) نے اشتہار دیا تھا کہ اگر کوئی شخص مثلث کے زاویہ کو تین حصوں میں دلیل سے ثابت اور منقسم کر دے تو ڈیڑھ لاکھ روپے انعام ہے۔ مظفر نگر کے منصف صاحب بھی فن ریاضی اور ہندسہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ انہوں نے اس پر دلائل قائم کئے اور اپنے زعم میں اس کو ثابت کر دیا۔ لیکن میرٹھ پہنچے۔ اور وہاں کے کسی حاکم اعلیٰ کو وہ دلائل دکھائے اس نے کہا کہ بالکل صحیح ہیں۔ آپ اس کا

اعلان کریں۔ ضرور آپ اس انعام کے مستحق ہوں گے لیکن ان کے دل میں کوئی اطمینان پیدا نہ ہوتا تھا وہ چاہتے تھے کہ اگر اس پر مولانا ایک نظر ڈال دیں تو مجھے اطمینان ہو جائے۔ مولانا (محمد قاسم صاحب) کا مظفر نگر آنا ہوا ان منصف صاحب نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے جو حضرت مولانا کے خاص لوگوں میں سے تھے کہا کہ کوئی ایسا بھی وقت میسر آ سکتا ہے کہ میں مولانا کو یہ تحریر دکھا دوں۔ انہوں نے کوشش کی مگر وقت نہ نکل سکا۔ یہاں تک کہ روانگی کا وقت آ گیا اسٹیشن پر تشریف لے آئے لیکن گاڑی دس بیس منٹ لیٹ تھی۔ اس وقت فوراً ان منصف صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اب میری تحریر سنوا دو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا اور بعد منظوری منصف صاحب نے وہ تحریر سنائی۔ اس کو سرسری حضرت نے سنا۔ سب سے آخر میں فرمایا کہ سب صحیح ہے۔ مگر دلیل کا فلاں مقدمہ نظری ہے۔ حالانکہ اقلیدس کی تمام دلائل کی انتہا بدیہی مقدمات پر ہوتی ہے اور اسی لئے اس کے تمام دلائل قطعی سمجھے جاتے ہیں چونکہ وہ صاحب فن تھے۔ فوراً سمجھ گئے اور وہاں سے واپس ہوئے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے بطور مذاق فرمایا کہ تمہیں کیا مصیبت پیش آئی تھی کہ مولانا کو یہ تحریر سنائی اور اپنی ساری کاوش دماغ کو غلط ثابت کر دیا۔ تم اعلان کر دیتے۔ اشتہار دینے والے کیا سمجھتے۔ لیکن یہ ان کی دیانت تھی کہ جب ان کی تحریر میں غلطی نکل آئی تو پھر انہوں نے اس کی اشاعت نہ کی۔ اگرچہ وہ ایسی غلطی تھی کہ عموماً اس کا سمجھنا دشوار تھا۔“

(ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۷۳)

اس سے حضرت قاسم العلوم کی اقلیدس میں مجتہدانہ شان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے چھتے کی مسجد میں اقلیدس کا پڑھایا جانا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ ہاں تاریخی حقائق میں اقلیدس کا درس دینا بھی حیات قاسمی کا ایک تاریخی جز ہے۔

آخری دور کے شاگرد

مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسر امروہوی

(پیدائش ۱۲۷۷ھ وفات ۲۳ جمادی الاخری ۱۳۶۷ھ)

ہم نے گذشتہ اوراق میں حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے ان تلامذہ اور شاگردوں کا ذکر کیا ہے جو یا تو آپ کے ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ مثلاً حضرت عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور یا وہ صاحبان جو آپ سے اگلی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے مولانا احمد حسن صاحبؒ، مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا فخر الحسن صاحبؒ وغیرہم لیکن آپ کے شاگردوں میں ایک اور شاگرد رشید بھی تھے جو آپ کے آخری دور کے شاگردوں میں سے ہیں اور وہ ہیں جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہوی جنہوں نے حضرت قاسم العلوم کی عمر کے آخر حصے میں آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

مختصر سوانح زندگی:

مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد کا نام مولانا عنایت اللہ صاحب تھا جو اپنے آبائی وطن سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی سے گذرتا ہوا حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔

آپ کے والد نے اپنے وطن سندیلہ کو چھوڑ کر بمبئی کو اپنا وطن بنا لیا تھا کہ وہ ریاست بھوپال کی طرف سے بمبئی میں محافظ حجاج تھے۔ اور وہیں ۱۳۰۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

پیدائش تعلیم:

مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفسر بمبئی میں ۱۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا عبداللہ صاحب اور چھوٹے بھائی حافظ عبدالرحیم صاحب تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب اپنی ہمشیرہ کے ہمراہ پانچ چھ سال کی عمر میں مکہ محترمہ چلے گئے۔ وہاں حافظ عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے ہم نام سے قرآن کریم حفظ کیا۔ جو نگینہ ضلع بجنور (یو۔ پی) ہندوستان کے ساکن تھے۔ آپ نے پہلی محراب مسجد حرام میں سنائی۔ ۱۲۹۰ھ میں بمبئی واپس آئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۲۹۲ھ سے ۱۲۹۷ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔

حضرت قاسم العلومؒ سے شرف تلمذ:

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے حضرت قاسم العلومؒ سے ترمذی پڑھی۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی زبانی سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ:

> ''میں جب دیوبند پڑھنے کے لئے آیا ہوں تو وہاں شروع میں میری طبیعت نہیں لگی۔ میں رویا کرتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم تھے۔ انہوں نے اپنی فراست سے کام لیا اور مجھ کو ہم عمروں میں کھیلنے کی اجازت دیدی۔ اس طرح میری طبیعت بہلی۔ (کچھ عرصہ بعد) میں نے مولانا نانوتوی سے ترمذی شروع کی۔ ایک ایک حدیث پر ایسی تقریر فرماتے تھے کہ سننے والے کو حیرت ہوتی تھی۔ اس وقت تو سب باتیں سمجھ میں آجاتیں تھیں۔ پھر کسی سے اس تقریر کو دریافت کرو تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی تھی۔''

(دارالعلوم رمضان ۱۳۷۱ھ صفحہ ۳۴ کالم نمبر ۲۱)

یہ وہ زمانہ معلوم ہوتا ہے جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا حافظ علاؤالدین صاحب کی درخواست پر ترمذی شریف شروع کرائی گئی تھی۔ آپ کے وصال کے بعد دیوبند سے مرادآباد آ گئے۔ اور مولانا سید احمد حسنؒ صاحب شبیہ سے جوان دنوں مرادآباد میں شاہی مسجد کے مدرسے میں مدرس تھے تعلیم حاصل کی۔

مولانا احمد حسن صاحبؒ:

کے حالات گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں جو صحیح معنی میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے جانشین اور استاذ کے علوم وفنون اور تقریر کے مظہر تھے۔ آپ نے سنبھل مراد آباد، گلاوٹھی خورجہ ضلع بلند شہر اور امروہہ کے مدارس کے علاوہ دو ماہ دارالعلوم دیوبند میں بھی تعلیم دی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت قاسم العلوم کے ایما سے امروہہ ضلع مراد آباد کی جامع مسجد میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ قائم کیا گیا تھا اور مولانا احمد حسن صاحب شاہی مسجد مراد آباد کے مدرسے کو جو حضرت نانوتوی کے ایما پر ۱۲۹۶ھ میں قائم ہوا تھا اور جس کا نام مدرسہ الغربا مشہور بمدرسہ شاہی مراد آباد تھا۔ رمضان ۱۳۰۳ھ میں سات سال کے بعد مستعفی ہوکر اپنے وطن امروہہ کے مدرسے میں تشریف لے آئے تھے۔ اس کے چند سال بعد مجلس شوریٰ نے ان کو دارالعلوم دیوبند میں بلالیا تھا۔ مولانا نسیم احمد فریدی اپنے مضمون مطبوعہ دارالعلوم جمادی الاول ۱۳۷۳ھ میں مولانا احمد حسن صاحبؒ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> ”مدرسہ امروہہ کے چند سال بعد دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے حضرت (مولانا احمد حسن صاحب) محدث امروہی کو دارالعلوم دیوبند بلالیا تھا۔ حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن صاحب) کو اور آپ کو برابر درجے پر رکھا گیا۔ البتہ حضرت مولانا امروہی کی تنخواہ قدرے زیادہ رکھی گئی۔ حضرت مولانا امروہی وہاں پر غالباً دو ماہ سے زائد نہیں رہے۔ اس زمانے میں مولانا قمرالدین صاحب سہسپوری جنہوں نے سند فراغ امروہہ سے حاصل کی ہے دارالعلوم میں تعلیم پا رہے تھے۔ ان کی زبانی دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا امروہی کے پہلے درس کا حال سنئے۔
>
> بیضاوی، شمس بازغہ، صدرا وغیرہ کتب حضرت مولانا امروہوی کے سپرد کی گئیں۔ سب سے پہلے صدرا پڑھنے والوں کو آواز دی گئی۔ اس کتاب میں تین پنجابی طالب علم شامل تھے جن میں ایک مولوی نورالزمان پنجابی دوسرے مولوی عبدالحلیم تیسرے ایک اور ذی استعداد پنجابی طالب علم تھے، سبق کے بعد تینوں یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ معقولات تو دیوبندیوں کے پاس ہے۔ مولانا قمرالدین صاحب بیان کرتے ہیں کہ

حضرت مولانا (احمد حسن صاحبؒ) کو دیو بند میں ایک دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا کہ مولوی نادر شاہ خان صاحب وکیل مہتمم مدرسہ امروہہ دیو بند پہنچے۔ ان سے بعض اشخاص نے دریافت کیا کہ کیسے تشریف لائے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا کہ ایک باغ ہم نے لگایا تھا جب وہ بار آور ہوا تو اس کا باغبان چلا گیا۔ اب وہ باغ خراب ہو چلا۔ چنانچہ سب (ممبران مدرسہ) نے مشورہ کر کے طے کیا کہ چونکہ مدرسہ امروہہ کا قائم رکھنا بھی ضروری ہے اس لئے مولانا کو امروہہ واپس بھیج دیا جائے۔ مولانا دوبارہ اپنے مدرسے میں تشریف لے آئے۔

(مولانا احمد حسن صاحبؒ) دارالعلوم میں نودرہ کی کسی درسگاہ میں پڑھایا کرتے تھے۔" (دارالعلوم رسالہ دیو بند جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ صفحہ ۴۲۔۴۳)

ہم گذشتہ اوراق میں لکھ آئے ہیں کہ مولانا احمد حسن صاحب اپنے زمانے کے زبردست مفسر، محدث، معقولی اور مقرر تھے۔ ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور بقول مولانا مظہر الحق صاحب چاٹگامی جو ۱۳۰۵ھ میں کانپور کے مدرسے سے امروہہ پڑھنے کیلئے پہنچے وہ اپنے مکتوب نمبر ۱۱ میں لکھتے ہیں:

"قریب بست روز بانقضا رسید کہ بندہ از شہر کانپور نقل نمودہ بقصبہ امروہہ آمدہ بعالی جناب فخر علمائے زمین مولانا سید احمد حسن صاحب دام نوالہم کتاب جلالین شریف، ترمذی شریف، ہدایہ اخیرین، مقامات حریری درس دارد۔"

(انشائے مظہر صفحہ ۹ مطبوعہ قیومی پریس کانپور)

تقریباً بیس روز گذرنے کو آئے کہ بندہ شہر کانپور سے منتقل ہو کر فخر علمائے زمین مولانا سید احمد صاحب کی خدمت میں امروہہ آ گیا ہے۔ اور جلالین، ترمذی، ہدایہ اخیرین اور مقامات حریری کے اسباق پڑھ رہا ہے۔

مولانا احمد حسن صاحب آخری عمر تک مدرسہ امروہہ میں پڑھاتے رہے اور افغانستان تک کے طلبہ بھی آپ کی خدمت میں آنے لگے تھے۔

وفات:

ایسی ہستیاں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اپنے تعزیتی مضمون مطبوعہ القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''مولانا (احمد حسن صاحب) کی تقریر، تحریر، ذہانت، تبحر، اخلاق اور علوم عقلیہ اور نقلیہ میں کامل دستگاہ ضرب المثل تھی اور سب سے زیادہ قابل قدر اور ممتاز کمال مولانا کا یہ تھا کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے دقیق اور غامض علوم کو ان ہی کے لب ولہجہ اور طرز ادا میں نہایت صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان فرماتے تھے۔''

مولانا احمد حسن صاحب کا انتقال شب ۲۹ ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹ مارچ ۱۹۱۲ء کو بعد نماز عشاء امروہہ میں ہوا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن مولانا محمد قاسم صاحب نے نمازہ جنازہ پڑھائی۔ جو ان دنوں امروہہ تشریف لے گئے ہوئے تھے اور جامع مسجد امروہہ کے صحن کے جنوبی گوشے میں آپ دفن کر دیئے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

پھر مولانا عبد الرحمٰن صاحب مفسر کی طرف:

ہم دراصل حضرت قاسم العلوم کے آخری دور کے شاگرد مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب کا ذکر خیر کر رہے تھے کہ درمیان میں ان کے استاذ مولانا احمد حسن صاحب کا ذکر خیر آ گیا۔ چنانچہ ہم پھر مولانا مفسر کی طرف چلتے ہیں۔

مولانا عبد الرحمٰن صاحب مفسر نے حضرت قاسم العلوم کی وفات کے بعد مولانا احمد حسن صاحب سے معقولات اور منقولات کی کتابیں پڑھیں اور ۱۳۰۱ھ میں امروہہ سے سند فراغ حاصل کی۔

علاوہ ازیں گنگوہ میں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حدیث پڑھی تھی اور بھوپال میں قاضی محمد ایوب صاحب اور حسین بن محسن یمنی خزرجی سے بھی سند حدیث حاصل کی۔ گنگوہ میں حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ہمدرس

تھے۔ فراغت کے بعد مولانا عبدالرحمٰن صاحب چند سال مدرسہ شاہی مرادآباد میں اور بعد ازاں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں اپنے استاذ مولانا احمد حسن صاحب کی جگہ ان کی وفات کے بعد پڑھاتے رہے۔ شیخ الحدیث والتفسیر رہے۔ البتہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے ڈابھیل میں اور کچھ ماہ ریاست مینڈھو میں اور کچھ عرصہ دیوبند میں مولانا مدنی کی گرفتاری کے بعد غالباً ۹۴۲ء میں تعلیم دیتے رہے۔ اور بالآخر مدرسہ امروہہ میں تشریف لے آئے اور آخر وقت تک مدرسہ امروہہ میں رہے اور پھر ۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۷ھ کو بوقت صبح انتقال فرمایا اور اپنے استاذ کے بالکل قریب جامع مسجد میں دفن کیے گئے۔

کل شیء ھالک الا وجھہ

یہ تھے حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے آخری دور کے شاگرد جن کو تلامیذ قاسمی کی ایک کڑی کہنا چاہیے۔

روایات قاسمی:

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے حضرت قاسم العلوم کے متعلق کچھ روایات بھی بیان کی ہیں جن سے قاسم العلوم کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ایک بخاری شریف کے حواشی کا ذکر ہے جس سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا کہ:

> "میرٹھ میں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری نے بخاری کے تحشیہ کا کام مولانا نانوتوی کے سپرد کر دیا تھا۔ اس پر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ایک لڑکے کے سپرد اتنا بڑا کام کر دیا ہے۔ یہ کیا حاشیہ لکھیں گے۔ اس کی اطلاع جب مولانا احمد علی صاحب کو ہوئی تو انہوں نے معترضین سے فرمایا کہ تم لوگ بخاری کے جتنے مشکل مقامات ہوں ان پر نشان لگا لو پھر ان سے دریافت کر لو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان مقامات کا حاشیہ منگوا کر دیکھا یا تو مولانا نانوتوی نے جو جو احتمالات پیدا کر کے ان کے جوابات دیئے تھے وہ احتمالات اور شبہات ان حضرات کے احتمالات سے بھی زیادہ تھے۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ مولانا کے تبحر علمی کو مان گئے۔"

اس روایت سے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی اس روایت کی تائید ہوتی ہے

کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کے آخری پانچ چھ پاروں کا حاشیہ حضرت قاسم العلومؒ سے لکھوایا تھا جیسا کہ اکثر اساتذہ شاگردوں سے کام لیا کرتے ہیں۔ اس روایت کا یہ جز کہ:

> ”تم لوگ بخاری کے جتنے مشکل مقامات ہوں ان پر نشان لگالو پھر ان سے دریافت کرلو چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔“

روایت یعقوبی میں یہ الفاظ نہیں ہیں لیکن درایۃً یہ روایت صحیح ہو سکتی ہے لیکن روایت کا یہ حصہ کہ بخاری کے تمام مشکل مقامات کا حاشیہ دکھایا۔ غلط ہے کیونکہ تمام بخاری کا حاشیہ حضرت قاسم العلومؒ نے تحریر نہیں فرمایا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی روایت جو اپنے مضمون میں مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے نقل کی ہے۔ تو اس کے اول میں ”میرٹھ“ تحریر ہے یعنی میرٹھ کے دورانِ قیام میں حاشیہ لکھا یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ یہ واقعہ دہلی کا ہے جہاں حضرت مولانا احمد علی صاحب کا ایک چھاپہ خانہ تھا۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ اس روایت سے حاشیہ بخاری لکھنے کی تائید ہوتی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہوی حضرت نانوتوی کے سلسلہ بیعت میں:

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امروہوی سے یہ روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ:

> ”مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) نانوتوی ایک دن مکان کے اندر سے مٹھائی لے کر آئے اور مجھ کو دی۔ عادت اس طرح کی نہ تھی۔ آج یہ نئی بات دیکھ کر میں نے عرض کیا۔ یہ مٹھائی کیسی ہے فرمایا کہ ایک شخص بیعت ہوا ہے اس کی مٹھائی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضور مجھ کو بھی اس شرف سے محروم نہ فرمائیں بیعت کرلیں۔ فرمایا بیعت کا تعلق اصل میں تو عقیدت اور محبت سے ہے۔ اور تم کو یہ بات حاصل ہے۔ رسمی بیعت کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا جاؤ میں نے بیعت کرلیا۔ (مولانا

> عبدالرحمٰن صاحبؒ) فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس طرح زبانی بیعت مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) سے حاصل ہے۔" (رسالہ دارالعلوم رمضان ۱۳۷۱ھ صفحہ ۳۴)

عورتوں کا حضرت نانوتوی سے بیعت کرنا:

مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہوی سے مولانا نسیم احمد صاحب فریدی یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ:

> "مولانا (نانوتویؒ) بہت کم بیعت فرماتے تھے لیکن عورتوں کو بیعت سے منع نہیں فرمایا کرتے تھے۔ جب وہ بیعت ہونے کی درخواست کرتی تھیں تو بے تامل اور بے اصرار بیعت فرمالیا کرتے تھے۔" (دارالعلوم رمضان ۱۳۷۱ھ صفحہ ۳۴)

عورتوں کو جلد بیعت کر لینے کی وجہ ایک تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کا دین اور عبادت کی طرف مائل ہونا اور برائیوں سے توبہ کرنا غنیمت ہے۔ اس لئے ان کو موقع عنایت فرما دیتے۔ نیز مستورات کو پیروں کی بیعت کے لئے ادھر ادھر پھرنا مشکل تھا۔ اس لئے بھی اصرار نہ فرماتے ہوں گے۔ لیکن کسی اور تحقیق میں عورتوں کے بیعت کرنے کا ذکر نظر سے نہیں گذرا اگرچہ درایتاً مستبعد نہیں۔ کیونکہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب صاحب سے عورتیں بیعت تھیں۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے عہد طالبعلمی میں دارالعلوم کی عمومی حالت:

مولانا نسیم احمد صاحب نے حسب ذیل روایات بھی مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کی زبانی سن کر اپنے مضمون میں تحریر کی ہیں۔ فرمایا کہ:

> ۱۔ "جس زمانے (۱۲۹۲ھ سے ۱۲۹۷ھ) کے درمیان میں دیوبند گیا تھا اس زمانے میں مولانا محمد یعقوبؒ صاحب صدر مدرس مولانا سید احمد صاحبؒ دہلوی۔ ملا محمود صاحبؒ، مولانا منفعت علی صاحبؒ مدرس تھے اور مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم تھے۔"
>
> ۲۔ "میں نے ان (مولانا نانوتوی) سے ترمذی دیوبند میں پڑھی۔ اس کی صورت یہ

ہوئی کہ مولانا بیمار ہوگئے تھے اور اس وجہ سے دیوبند ہی میں رہنے لگے تھے۔ اور زیادہ عرصے تک رہے اس دوران میں ترمذی شروع کرادی۔ میں بھی شریک ہوگیا۔ میں ترمذی کی قرأت زیادہ تر کرتا تھا۔ ایک حدیث میں بے خیالی سے یتجر (بالتشدید) کو یتجر (بغیر تشدید) پڑھ گیا۔ مولانا نے ایک خاص انداز سے باآواز بلند فرمایا ”یتجر“ وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔“

مدرسہ اسلامیہ امروہہ کا آغاز:

۳۔ ”مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد مولانا نانوتوی کے ایما سے رکھی گئی ہے۔ حکیم عبدالصمد صاحب مرحوم نے (جو کہ حضرت شاہ عبدالہادی قدس سرہ کی اولاد سے تھے) بیان کیا تھا کہ جب مولانا نانوتوی امروہہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تمہارے یہاں سے تو فیض کا چشمہ جاری ہوا ہے۔ اب بھی تم کو اجراء فیض کا انتظام کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسی زمانے میں مشورہ کر کے ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی گئی جو مختلف محلوں میں رہا۔ آخر میں جب مولانا (احمد حسن صاحبؒ) امروہی شاہی مدرسہ مراد آباد سے چلے آئے تو اہل امروہہ نے ان کو یہیں روک لیا اور مدرسہ جامع مسجد میں قائم ہوگیا۔“

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کا طلبہ کو صبح کی نماز کیلئے جگانا:

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ:

”مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی (مہتمم دارالعلوم دیوبند) صبح کے وقت طلبہ کو نماز کیلئے یہ کہہ کر اٹھایا کرتے تھے۔ خفتو! اٹھو خفتن مصدر فارسی سے مشتق بنا کر۔“

(رسالہ دارالعلوم رمضان ۱۳۷۱ھ صفحہ ۳۵)

کچھ بیعت نانوتویؒ کے متعلق مزید معلومات

مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ مفسر کی روایت سے معلوم ہوا کہ وہ بھی حضرت مولانا نانوتویؒ سے زبانی طور پر بیعت کر چکے تھے اس لئے خاص مریدین اور مسترشدین کی وہ فہرست جو ہم نے گذشتہ اوراق میں تحریر کی ہے۔ ان میں مولانا امروہوی مفسر کو بھی سمجھنا چاہئے۔

ملا عنایت اللہ صاحب سہارنپوری تھانیدار مرید حضرت قاسم العلومؒ:

حضرت قاسم العلوم کے مریدین میں ایک اور نام کا بھی ہمیں علم ہوا جن کا تذکرہ مولانا سید حکیم عبدالحئی صاحبؒ مصنف ”گل رعنا“ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ”سفرنامہ اطراف دہلی“ میں موجود ہے۔ وہ اپنے وطن سے بزرگانِ دین اور دینی آثار کو دیکھنے نکلے تھے۔ دیوبند سے رڑکی، کلیر شریف ہوتے ہوئے سہارنپور پہنچے۔ اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

> ”روز سہ شنبہ (منگل) نہم شعبان (۱۳۱۲ھ) پانچ بجے (شام) وہاں (کلیر شریف) سے سہارنپور روانہ ہوئے۔ بعد مغرب کے سہارنپور پہنچے۔ وہاں سے سیدھے چوک میں ملا عنایت اللہ صاحب کے مکان پر آئے۔ یہ بزرگ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے مرید ہیں خاص سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور مدت تک رائے بریلی میں تھانہ دار رہ چکے ہیں۔ ہمیشہ بالتزام جمعہ کی نماز تکیہ (ضلع رائے بریلی) میں پڑھتے تھے۔ بہت بڑے صالح اور نیک بخت ہیں۔ کبھی رشوت نہیں لی۔ اور کسی قسم کی اپنے دانست میں بددیانتی نہیں کی۔“ (دہلی اور اس کے اطراف صفحہ ۱۲۴)

اس سفرنامے سے حضرت نانوتویؒ کے ایک اور مرید کا پتہ چل گیا جو تھانہ دار رہ کر پکے مسلمان، دیانتدار سب انسپکٹر پولیس ہوتے ہوئے ملا عنایت اللہ کہلائے۔ یہ فیض قاسمی کا نتیجہ تھا۔

مولانا حافظ تجمل حسین صاحب بہاری:

اس موقع پر ہم ایک اور جاں نثار مرید کا بھی ذکر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ تا معلومات میں اضافہ ہو کہ مولانا حافظ تجمل حسین صاحب بہاری جو علمائے دیو بند کے نزدیک جانے پہچانے ہیں اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنے ملفوظات میں بھی ذکر کیا ہے۔ ان ہی حافظ صاحب نے کمالات رحمانیہ بھی تصنیف فرمائی ہے۔ جس میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کی زبانی اس روایت کا اس کتاب میں اظہار کیا ہے کہ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب مادر زاد ولی تھے۔ یہ مولانا تجمل حسین صاحب بھی حضرت قاسم العلومؒ کے مرید تھے۔ اور بے حد عقیدتمند جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فرزند کا نام مولانا محمد قاسم صاحب کے نام پر ''محمد قاسم'' رکھا تھا۔

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد سوم صفحہ ۱۸۶)

حکیم مشتاق احمد صاحب دیو بندی:

حکیم مشتاق احمد صاحب جن کا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے۔ وہ نہ صرف عاشق قاسم تھے بلکہ وہ مرید بھی تھے۔ ان کا مریدی کا ذکر مولانا منصور علی مراد آبادی مذہب منصور میں لکھتے ہیں:

> ''ایک صاحب مولانا صاحب کے پاس (نانوتے میں چند روز مقیم رہے۔ وہ روزمرہ شکار کو جاتے اور وہ چار تیتر اور مور کسی حکمت سے پکڑ لاتے ہم سب (مولانا رحم اللہ بجنوری، مولانا محی الدین مراد آبادی، مولانا عبدالعلی میرٹھی وغیرہم) ہر روز اس کا گوشت کھاتے۔ نہایت مزے دار ہوتا تھا۔ ایک مہینے کے بعد مجھ کو خون کا پیشاب چند سوراخوں سے آنے لگا۔ مولانا صاحب کے ہمراہ دیو بند پہنچا۔ حافظ کلو صاحب کی بیٹھک میں مولانا صاحب نے مجھے بھجوا دیا کہ وہاں آرام رہے گا۔ اور حکیم مشتاق احمد صاحب کا علاج کرایا جو مولانا کے مرید مخلص تھے۔'' (مذہب منصور جلد دوم)

مولانا سید احمد صاحب دہلوی مرید قاسمی:

جہاں قاسم العلومؒ کے مریدین میں آپ کے شاگردوں میں مولانا محمود حسن

صاحب، مولانا احمد حسن صاحب وغیرہما تھے، وہاں مولانا سید احمد صاحب دہلوی جو مولانا محمد یعقوب صاحب کے زمانے میں مدرس دوم اور پھر مدرس اول رہے وہ حساب کے امام تھے۔ وہ بھی قاسمی مریدین میں۔ سے تھے۔ مولانا منصور علی خان صاحب اپنا چشم دید واقعہ لکھتے ہیں:

> ''ریاضی میں بھی مولانا (محمد قاسم) صاحب کو نہایت کمال حاصل تھا۔ میرے روبرو جناب مولوی سید احمد صاحب مدرس دیوبند نے جو بڑے ذکی ریاضی داں مشہور تھے۔ چند سوالات مشکل کئے۔ اور کہا مدت سے مجھ کو ان میں شبہہ ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کی تقریر سن کر ان کا پورا اطمینان ہو گیا اور مرید خاص بن گئے۔''

(مذہب منصور حصہ دوم)

پھر مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی طرف:

ہاں تو ذکر جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب امروہویؒ کا ہو رہا تھا۔ اور اسی ضمن میں آپ کی حضرت نانوتوی سے زبانی بیعت کا ذکر آ گیا اور ہوتے ہوتے پھر ملا عنایت اللہ صاحب سہارنپوری اور حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی کا حضرت قاسم العلومؒ سے بیعت ہونا بھی زیر تحقیق آ گیا۔

بہر حال حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب اپنے دور کے بہت بڑے مفسر، محدث، جامع معقول اور منقول عالم تھے۔ اور چوٹی کے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس ناچیز راقم الحروف نے ان کی زیارت کی ہے۔

مولانا خلیل الرحمٰن صاحب شاگرد قاسمیؒ:

جب ماہ ربیع الاول و ربیع الثانی و جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ وغیرہا ۱۲۹۲ھ میں حضرت قاسم العلوم منشی ممتاز علی کے کتب خانے میں بمقام دہلی تصحیح کتب کا کام انجام دیتے تھے۔ اسی دور میں کچھ عرصہ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی بھی دہلی کے مدرسہ عبدالرب میں (بروایت امیر شاہ خان صاحب مرحوم) صدر مدرس تھے۔ تو اس دور میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب امروہوی نے مولانا احمد حسن صاحب سے مدرسہ عبدالرب میں تعلیم پائی۔ مولانا احمد حسن صاحبؒ نے ان کو سند فراغت عطا فرمائی اور اپنے دستخط اس طرح فرمائے:

”کتبہ وحررہ احقر الزمن احمد حسن حسینی عفی عنہ
فی المدرسۃ العربیہ الواقعۃ فی الدھلی“

اسی سند کے آخر میں حضرت قاسم العلوم نے حسبِ ذیل تحریر اپنے دست مبارک سے لکھی ہے جو یہ ہے:

”بندہ کمترین محمد قاسم ہم می گوید کہ مولوی خلیل الرحمٰن از من چند سبق صحیح مسلم شریف خواندہ انداز سیماوحال اوشاں صلاح عیان است بشرط مرقوم بالا کہ جناب مولوی احمد حسن صاحب مدظلہ رقم فرمودہ اند من ہم اجازت درس حدیث وتفسیر میدہم خداوند کریم مبارک فرماید ودر علم شاں برکت دہد آمین ثم آمین یارب العالمین۔“

العبد محمد قاسم عفی عنہ

بندہ کمترین محمد قاسم بھی کہتا ہے کہ مولوی خلیل الرحمٰن (امروہوی) نے مجھ سے صحیح مسلم شریف کے چند سبق پڑھے ہیں۔ ان کی پیشانی سے نیکی ٹپکتی ہے۔ مرقوم بالا شرط کے ساتھ کہ جناب مولوی احمد حسن صاحب نے لکھی ہے میں بھی حدیث وتفسیر کے درس دینے کی ان کو اجازت دیتا ہوں۔ خداوند کریم مبارک کرے اور ان کے علم میں برکت ڈالدے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین۔

العبد محمد قاسم عفی عنہ

اس قاسمی تحریر سے صاف واضح ہے کہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب امروہوی بھی قاسم العلومؒ کے شاگرد تھے۔ اور انہوں نے صحیح مسلم کے چند اسباق پڑھے تھے۔ اصل سند جس پر یہ تحریر ہے مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہوی کے پاس ہے جیسا کہا نہوں نے مضمون میں ظاہر کیا ہے کہ ”اصل سند میرے پاس موجود ہے۔“

(رسالہ دار العلوم دیوبند ربیع الاول ۱۳۷۳ھ صفحہ ۳۷)

مولانا شاہ عبدالغنی صاحبؒ پھلاودی شاگرد قاسم العلومؒ:

مولانا شاہ سید عبدالغنی صاحب بھی ایک جید عالم، درویش صفت پھلاودہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے حضرت قاسم العلوم کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت تھے۔ حضرت قاسم العلوم کے بعد انہوں نے مولانا احمد حسن صاحبؒ

امروہوی سے علوم کی تکمیل کی۔ بعدازاں مدرسہ شاہی مرادآباد میں جہاں حضرت امروہویؒ صدر مدرس تھے۔ آپ بھی مدرس ہوگئے۔ ۱۳۰۳ھ میں مولانا امروہویؒ کے استعفیٰ کے بعد مولانا عبدالغنی صاحبؒ بھی مولانا امروہویؒ کے ہمراہ امروہہ آگئے اور کئی سال مدرس رہے لیکن خرابی صحت کے باعث امروہہ چھوڑ کر اپنے وطن میں مقیم ہوگئے۔ مگر اپنے استاد امروہوی سے غایت قلبی تعلق تھا۔ مولانا نسیم احمد فریدی لکھتے ہیں:

> ''مولانا پھلاودی کو حضرت قاسم العلوم سے بھی نسبت خاص حاصل تھی۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مولانا نانوتوی سے کس مقام پر اور کب تک تعلیم حاصل کی۔ غالباً ۱۲۹۷ھ تک یہ پھلاودے کا درویش مولانا نانوتویؒ کے دامن سے وابستہ رہتا ہے۔ بعدہ مولانا امروہی کے پاس مرادآباد آکر تکمیل کرتا ہے۔
>
> پھلاودہ میں مولانا نانوتویؒ کے بھی بہت سے خطوط نہایت حفاظت وصیانت کے ساتھ ایک جزدان میں رکھے ہوئے ہیں۔ حضرت نانوتوی اپنے اس صوفی منش شاگرد کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے القاب سے یاد فرماتے ہیں، مولوی عبدالغنی (مولانا پھلاودی کے پوتے) نے مجھے بتلایا کہ مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودی سفر میں بھی مولانا نانوتوی کے ساتھ رہے ہیں اور ان کی تقاریر کو ضبط کیا ہے، ان (مولانا پھلاودیؒ) کے کتب خانے میں حضرت نانوتوی کے کیا کیا نایاب اور کمیاب علمی آثار ہیں۔
>
> مولانا پھلاودی بلند پایہ درویش، بڑے جید عالم، بہترین ادیب، اردو، فارسی، عربی کے باکمال شاعر تھے۔ حافظ کلام اللہ ہونے کی رعایت سے حافظ تخلص تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی خاص مہارت تھی۔ خط نہایت پاکیزہ اور اپنے دونوں استادوں سے ملتا جلتا تھا۔ ۱۳۵۲ھ (مطابق ۱۹۳۴ء) میں انتقال فرمایا۔''

(رسالہ دارالعلوم دیوبند ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ صفحہ ۲۳ تا ۲۵)

حضرت قاسم العلوم کے نومسلم شاگرد مولانا سعید بن سردار کھڑک سنگھ (پنجابی):

مولانا ابوالاثر عبدالسلام صاحب مولف کتاب ''مشائخ بنارس'' نے اپنی کتاب میں

بنارس کے مشہور مولانا سعید نومسلم کے متعلق جو کہ سردار کھڑک سنگھ (پنجابی) کے بیٹے تھے۔ خبر دی ہے کہ وہ مشرف باسلام ہو کر علوم اسلامیہ کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے۔ مولانا عبدالسلام لکھتے ہیں:

> ”بعد قبول اسلام دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد قاسم (صاحبؒ) نانوتوی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں اور تمام علوم وہیں حاصل کیے۔“ (مشائخ بنارس صفحہ ۱۰۱)

مطلب یہ ہے کہ مولانا سعید صاحب دارالعلوم میں داخل ہو کر درس نظامیہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے اور جو حدیث کی تحصیل کا وقت آیا تو حضرت قاسم العلوم کے درس حدیث میں بیٹھتے رہے جیسا کہ حضرت قاسم العلوم خارج میں خاص خاص طلبہ کو حدیث کی کتاب پڑھایا کرتے تھے یہ بھی ان خصوصی طلبہ کے ساتھ شامل ہو جاتے ہوں گے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ مولانا سعید ذی استعداد اور اعلیٰ پائے کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی قاسمی شاگردوں میں:

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم نے بھی حضرت قاسم العلوم سے کچھ اسباق پڑھے ہیں۔ چنانچہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب بن مولانا محمد قاسم صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں:

> ”آپ (مولانا محمد احمد صاحب نے اپنے والد ماجد حضرت قاسم العلوم والخیرات قدس سرہ سے بھی چند سبق مختصر معانی کے پڑھے ہیں، آخر میں حضرت قاسم الخیرات کا ارادہ یہ تھا کہ آپ کو خود تعلیم دیں مگر اسی سال مولانا کی وفات ہوگئی اور یہ خیال مکنون پورا نہ ہوا۔
>
> جناب مہتمم (حافظ محمد احمد) صاحب کی بدولت مجھ احقر کو بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کے یہاں چند سبق پڑھ کر بلاواسطہ تلامیذ کے سلسلے میں داخل ہوا۔“

(فرنگیوں کا جال حالات دارالعلوم از مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صفحہ ۱۸۳)

آخر میں ہم حضرت قاسم العلوم کی مخصوص علمی اولاد کا ایک شجرہ پیش کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہے۔ اگرچہ ہم ابتدائے کتاب میں بھی ایک شجرہ پیش کر چکے ہیں۔

قاسم العلوم والخیرات والبرکات

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند اور ان کی خصوصی علمی اولاد

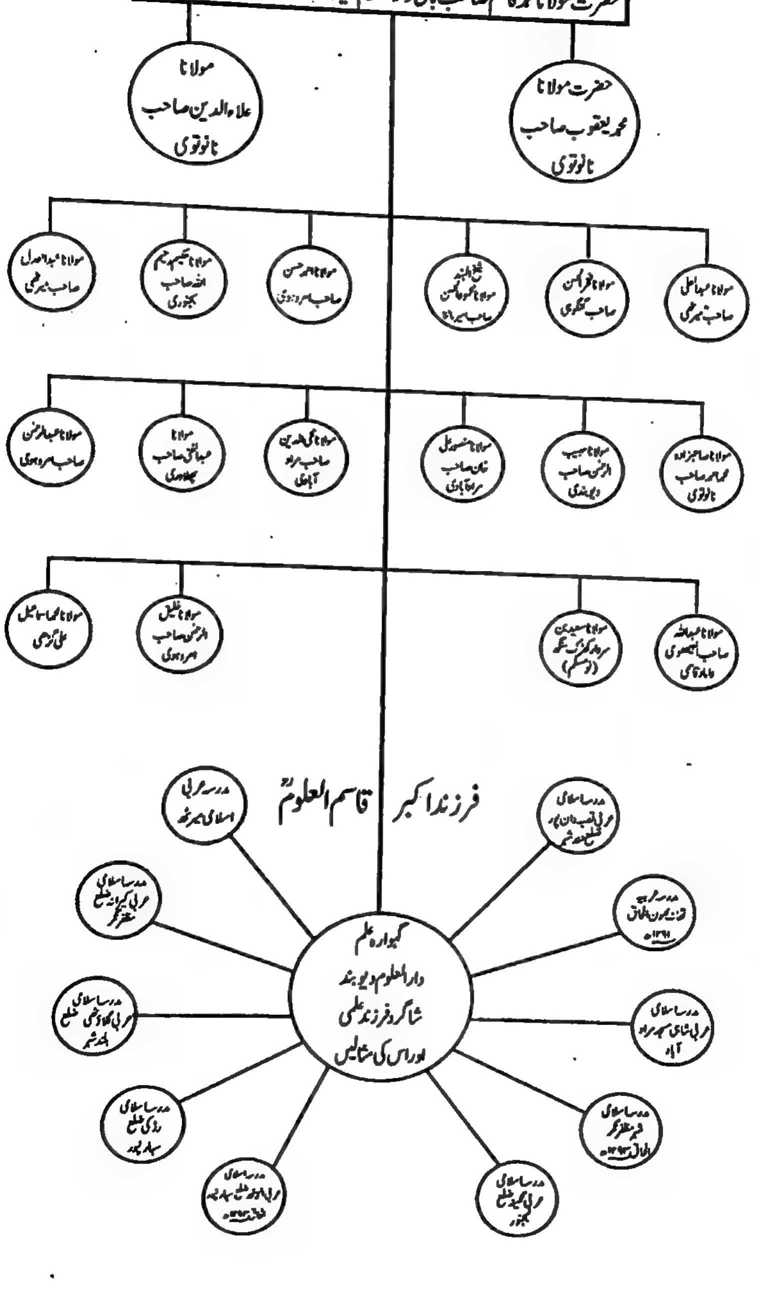
حضرت مولانا
محمد یعقوب صاحب
نانوتوی
مولانا
علاء الدین صاحب
نانوتوی
مولانا عبد العلی صاحب میرٹھی
مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی
شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا
مولانا احمد حسن صاحب امروہوی
مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری
مولانا عبد العدل صاحب میرٹھی
مولانا صاحبزادہ محمد احمد صاحب نانوتوی
مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی
مولانا منصور علی خان صاحب مرادآبادی
مولانا محی الدین صاحب مراد آبادی
مولانا عبد الحق صاحب پھلاودی
مولانا عبد الرحمن صاحب امروہوی
مولانا عبد اللہ صاحب انبیٹھوی داماد قاسمی
مولانا سعید [illegible] (دسکم)
مولانا خلیل الرحمن صاحب امروہوی
مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی
فرزند اکبر قاسم العلومؒ
گہوارہ علم
دار العلوم دیوبند
شاگرد فرزند علمی
اور اس کی مثالیں
مدرسہ عربی اسلامی میرٹھ
مدرسہ اسلامی عربی [illegible] ضلع [illegible]
مدرسہ عربیہ [illegible] ۱۲۹۱ھ
مدرسہ اسلامی عربی شاہی مسجد مراد آباد
مدرسہ اسلامی شہر مظفر نگر [illegible] ۱۲۹۳ھ
مدرسہ اسلامی عربی [illegible] ضلع بجنور
مدرسہ اسلامی عربی [illegible] ضلع سہارنپور [illegible] ۱۲۹۳ھ
مدرسہ اسلامی رڑکی ضلع سہارنپور
مدرسہ اسلامی عربی گلاؤٹھی ضلع بلند شہر
مدرسہ اسلامی عربی کیرانہ ضلع مظفر نگر

آٹھواں باب:

اصلاح امت مسلمہ
لسانی، قلمی اور عملی جہاد

ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا پیکر، اسلام اور مسلمانوں کے اندرونی اور بیرونی فتنوں کا استیصال کرنے والا۔ انیسویں صدی کا مجاہد اعظم، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا مصلح حضرت مولانا محمد قاسم نور اللہ مرقدہ

۱۔ تحریک نکاح بیوگان ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء

حضرت قاسم العلوم نے اپنے علوم وفنون سے جو شمعیں روشن کیں اور ان سے آگے چل کر جو روشنیاں ہوئیں اور آج تک ان کے روشن کردہ آفتاب سے یعنی دارالعلوم دیوبند سے جو بڑے بڑے ستارے روشن ہوئے ان کی روشنی آج ہند و پاک سے نکل کر دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی حقانیت اور مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس جیسا دینی اور خالص مذہبی ادارہ دنیا میں کہیں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملے گا۔ جو اتنا مشہور، اتنا ہر دل عزیز، اتنا جاذب، اتنا ممتاز اور روحانیت کا اتنا بڑا گہوارہ ہو۔ جامع ازہر مصر یقیناً عربی کا بہت بڑا دارالعلوم ہے لیکن وہاں تقویٰ، طہارت اور تزکیہ نفس کے قمقمے آپ جگمگاتے نہ دیکھیں گے۔

دارالعلوم دیوبند نے صرف علماء ہی پیدا نہیں کئے بلکہ یہاں کی درسگاہ سے معرفت وولایت کے بڑے بڑے اونچے مینار بھی روشن ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مادر دارالعلوم دیوبند صرف مولانا محمود حسن صاحبؒ اسیر مالٹا، مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہوی، مولانا اشرف علی ضاحبؒ تھانوی، مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ کشمیری، مولانا حسین احمد صاحبؒ مدنی، مولانا شبیر احمد صاحبؒ عثمانی، مولانا عبید اللہ صاحبؒ سندھی پیدا کر کے ہی بانجھ ہوجاتی تو تب بھی دنیا کی زمین کے دامن پر علم کے ایسے ذخار سمندر دنیائے اسلام کو سیراب کرنے کے لئے کافی تھے۔ اگر آپ محتاط طور پر مطالعہ کریں گے تو علوم وعقائد اسلامی کا ٹھوس اور سنجیدہ امتزاج جو یہاں کے علماء میں پائیں گے وہ کہیں اور کسی جگہ آپ کی نظروں کے لئے عنقا ہوگا۔ یہ سب آفتاب قاسمی کے چند نمونے ہیں۔ اب آپ سمجھ لیجئے کہ وہ چند خاص قابل ہستیاں جو اپنی شاگردی کے لئے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے منتخب کی تھیں اگر ان میں قابل جوہر نہ ہوتا تو ان کے پاس کون آتا۔ لہٰذا ایک سے ہزاروں دیدہ ور مبصر اور ہزاروں ہزار علمائے دانشمند نے جنم لیا اور پھر دنیا کے اطراف وجوانب میں فہمیدہ اور سنجیدہ طبقات انسانی میں فضلائے قاسمی کی مانگ اور کھپت ہے عوام سے ہمیں بحث نہیں اور عوام میں بھی جنہیں فطرت نے سلامتی بخشی ہے۔ وہ بھی اسی چشمہ شیریں سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ بہرحال ؎

ہر کجا چشمہ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

اس چشمہ علم کو محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء میں جاری کر کے قاسم العلوم نے اصلاح امت کی طرف بھی اسی سال سے قدم بڑھایا کہ اسلام کا اصل مقصد دعوت الی اللہ اور احیاء سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

سورہ والعصر کا پیکر قاسم العلوم:

سورہ عصر میں چار امور کو انسان کیلئے خسران سے بچنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

۱۔ ایمان ۲۔ عمل صالح

۳۔ تواصی بالحق (حق کی تبلیغ اور ترویج حق کی وصیت)

۴۔ تواصی بالصبر (تبلیغ حق میں مصائب و مشکلات پر صبر اور صبر کی تلقین)

قاسم العلوم اس سورت کے چاروں اصول پر عمل پیرا ہو کر دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے ہیں کہ خسران کا کوئی شمہ اور ذرہ ان کے دامن ہستی سے لگا باقی نہیں رہا۔

۱۔ ایمان میں وہ کامل مومن تھے۔

۲۔ عمل میں وہ ولی اللہ تھے جن کے متعلق فرمایا گیا

الا ان اولیآ اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون

ترجمہ: ہاں یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ غم

۳۔ تواصی بالحق یعنی حق کی وصیت کرتے کرتے وہ خدا سے جا ملے۔

۴۔ تواصی بالصبر یعنی دین کی تبلیغ اور اسلام کی حقانیت کیلئے خود بھی مشکلات کا مقابلہ کیا اور ایک خاص جماعت اپنے شاگردوں اور معتقدین کی ایسی چھوڑ گئے جو تواصی بالصبر کا پیکر تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں خالص اسلام کیلئے اور مسلمان بادشاہوں کی ہندوستان میں روایات باقی رکھنے کیلئے تاکہ مسلمانوں کے اقتدار کے باعث ہندوستان میں اسلام بے کس نہ رہ جائے تلوار اٹھائی اور اللہ کیلئے جہاد کیا۔ علم کے دریا بہائے، نہریں نکالیں اور ان سے دلوں کے کھیتوں کی آبیاری کی ہم اپنے اس یقین کی تائید میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب معاصر قاسمی مہتمم دیوبند کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جو پیش نظر ہے۔

> ”حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مدت العمر اسلام اور اہل اسلام کی خیر خواہی میں رہے۔“ (روئداد دار العلوم دیوبند ۱۲۹۷ھ)

۱۔ نکاح بیوگاں کی تحریک ۱۲۸۳ھ:

نکاح بیوگاں دراصل احیاء سنت کے سلسلے کی ایک نہایت اہم کڑی تھی۔ جس کو زندہ کر کے آپ نے وہ مقام حاصل کیا جس کے متعلق فرمایا گیا ہے:

من سن سنة فسنة فله اجرها واجر من عمل بها

ترجمہ: جس نے کسی سنت حسنہ کو رواج دیا تو اس کو اس سنت کے اجراء کا بھی اجر ملے گا اور جو اس پر عمل کرے گا اس کا بھی ثواب اس کو ملے گا۔

حضرت قاسم العلوم نے اپنے ماحول پر نظر ڈالی اور نکاح بیوگان کیلئے کمر باندھی جس کا اجراء ماحول کی کٹھن بندھنوں اور جکڑی ہوئی سماجی قدروں میں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس سنت کے قاسمی جذبہ جہاد کے پس منظر میں ہمیں قدرے عورت پر انفرادی اور سماجی مظالم اور رواج کی ستم رانیوں کا جائزہ لینا ہوگا اور پھر ہم معلوم کر سکیں گے کہ نکاح بیوگاں کی سنت کا اجراء کس قدر دشوار گذار اور کٹھن منزل تھی۔

عورت کے وجود اور اس کی شخصیت کے مختلف مناظر:

عورت کو جس قدر سماج کے رسم و رواج نے نشانہ جور و جفا اور ہدف ظلم و ستم بنایا اتنا انفرادیت اور شخصی محدود کردار نے اس کو ایذا نہیں پہنچائی۔

قدرت نے عورت کو مرد کی تسکین خاطر اور اس کے جمالیات سے مرد کو لطف اندوز ہونے کیلئے بنایا تھا۔ اس کی شکل و صورت، اس کا جسم، اس کی حرکات و سکنات، اس کی زیب و زینت، اس کی نشست و برخاست، اس کی رفتار و گفتار، جمالیات کا ایک دلفزاء چمن ہے۔ جس کے گلہائے رنگا رنگ قدرت کی آیات ہیں۔ یہ جنس لطیف مرد کے ذوق نظر اور شوق قلب کی تسکین ہے جس کو دوسرے لفظوں میں جنت نگاہ اور فردوس دل کہئے تو بجا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے خاص حکیمانہ انداز میں تخلیق عورت کی اس طرح وضاحت کی:

> ومن ایتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنو و جعل بینکم مودۃ ورحمۃ. ان فی ذالک لایت لقوم یتفکرون. (روم پارہ ۲۱)
>
> اللہ کی آیتوں میں سے یہ بھی ہے کہ تمہارے نفسوں ہی سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان عورتوں سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان اس نے محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ اللہ کی اس قدرت میں مفکرین کے لئے کتنی ہی نشانیاں مضمر ہیں۔

دیکھئے قرآن تخلیق عورت کا فلسفہ تسکین اور محبت بتلاتا ہے لیکن قابیل اور ہابیل کے زمانے سے لے کر اب تک عورت کو کیا مقام دیا گیا اور اس پر کیا کیا دور گذرے اس سرگذشت کو تاریخ اقوام کے اوراق آپ کو بتائیں گے۔

ایام جاہلیت میں عورت کا مقام عربوں کی نظر میں:

انسانیت میں عورت کی ابتدائی تاریخ کو چھوڑ کر ملک عرب کے لوگ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بقول مولانا حالی ؂

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب وہ شوہر کے تیور کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو باہر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

موجودہ یورپ میں عورت کا مقام:

لیکن اس کے برعکس موجودہ یورپ عورت کو مرد سے زیادہ اونچا مقام دیتا ہے۔ اور اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عورت کو اب اس مقولے سے یاد کیا جاتا ہے کہ LADIES ARE FIRST (یعنی عورت مقدم ہے) مجلسوں، ہوٹلوں، پارکوں، سینماؤں، تھیٹروں، گھروں اور میدانوں میں ہر جگہ یورپ نے اس کو آگے رکھا اور مرد کی قدر و منزلت عورتوں کے سامنے کم کر دی۔ بلکہ عورت کو اس مقام پر پہنچا دیا گیا کہ اس کی پوجا تک کرنے لگے۔ یورپ میں عورت اس بات پر بھی مرد کو طلاق دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے کہ مجھے اپنے شوہر کی طرز تبسم پسند نہیں یا سوتے وقت اس کے سانس میں تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ عورت کو مرد پر حاوی بنا دیا گیا ہے۔ اور کون سی جگہ ہے جہاں فلم سٹارز کی تصویریں گھروں اور دکانوں کی رونق بن کر نہیں رہ گئیں۔ یہ سب کچھ یورپ کی کورانہ تقلید کا نتیجہ ہوا۔ یورپ کے انگریزی قانون میں عورت کو باپ کی جائیداد کا حصہ نہیں ملتا بلکہ بڑے لڑکے کو بعض قوانین کی رو سے تمام جائیداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے۔

ہندو مذہب اور عورت:

ہندو مذہب میں عورت کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ وقعت نہیں دی گئی۔ خاص ایام میں اس کو چوڑھیوں اور بھنگنوں سے بدتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کو باپ کی وراثت میں

کوئی حصہ نہیں۔ غرضکہ ہندو مذہب عورت کو ذلت اور محرومی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔ اور کبھی سر ابھارنے کا موقع نہیں دیتا۔ خاوند کی موت پر سماج اس کو بھی چتا میں جلا ڈالنے کا حکم دیتی ہے۔

اسلام اور عورت:

دنیا میں عورت کی شخصیت اور اس کے حقوق کو جس قدر بے دردی سے پامال کیا جا رہا تھا۔ اسلام نے ان کو بحال کیا۔ اور زندگی میں عورت کا جو صحیح مقام تھا وہ اس کو دلایا۔

۱۔ اس کو باپ کی جائیداد کا وارث بنایا اور اس میں سے اس کا حصہ دلایا۔

۲۔ مردوں کو بے شک ان پر قوامون (حاکم) بنایا لیکن ساتھ ساتھ حکم دیا کہ

عاشرو هن بالمعروف

عورتوں کے ساتھ شرافت اور نیکی کے ساتھ زندگی گذارو

۳۔ غرض بحیثیت بیوی اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا گیا۔

۴۔ بحیثیت مادر عورت کے متعلق کہا گیا کہ اس کے قدموں میں جنت ہے اور جب سرور کائنات ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا حق کس کا ہے تو فرمایا کہ تیری ماں کا تین دفعہ دریافت کرنے پر یہی ارشاد فرمایا کہ تیری ماں کا اور چوتھی مرتبہ باپ کا حق جتایا۔

۵۔ خصوصی ایام میں اس کے ساتھ اکل و شرب، نشست و برخاست میں کوئی مضائقہ نہیں رکھا۔

۶۔ اس کو اپنی چیزوں پر ملکیت کا حق دیا گیا۔ اور شادی کے بعد ہندو عورت کی طرح کہ شادی کے بعد اس کے تمام مقبوضات مرد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں ایسا نہیں کیا گیا بلکہ شادی کے بعد بھی مسلمان عورت اپنی تمام املاک کی مالک برقرار رکھی گئی۔

۷۔ ہندو عورت شادی کے بعد مرد کا جز بن جاتی ہے لیکن مسلمان عورت اپنے شوہر کی نہ مملوکہ ہوتی ہے نہ اس کا جز ہوتی ہے۔ ہاں اس کی رفیقہ حیات ہوتی ہے۔

۸۔ عورت کو مرد کے طلاق کے مقابلے میں خلع کا حق دیا گیا لیکن ہندو عورت کے لئے

مرد سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔

نکاح بیوگان ہندو مذہب میں سخت پاپ ہے:

ہندوؤں اور ہندو سماج میں ایک بڑا ستم جو عورتوں پر روا رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے مرنے پر عورت کو بھی جلا دیا جاتا تھا۔ کس قدر روح فرسا اور سنسنی خیز ہے یہ بات کہ ادھر مردہ شوہر کی لاش کو لکڑیوں میں رکھ کر مٹی کا تیل چھڑکا جا رہا ہے اور دیا سلائی دکھانے کی دیر ہے اور ادھر زندہ نوجوان بیوی کو لکڑیوں کے درمیان بٹھا کر اور مٹی کا تیل لکڑیوں پر چھڑک کر دیا سلائی دکھانے کی تیاری ہے شوہر قدرت کا مارا ہوا جلایا جا رہا ہے اور زندہ عورت کے سامنے عنقریب سماج کے ہاتھوں جلا دیئے جانے کا بھیانک منظر درپیش ہے۔ وامصیبتا، واویلا۔ اس لئے زندہ جلا دینے اور زندہ در گور کر دینے کا المناک منظر عرب اور ہندوستان میں مشترک تھا۔ اسلام کا یہ احسان کبھی فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے لڑکیوں کے زندہ در گور کرنے کی رسم اور ستم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اور ہندوستان میں ایک مسلمان بادشاہ اکبر کے عہد میں اسلام کے صدقے میں ستی کی رسم کو مٹا کر فراموش کرا دیا گیا۔

مگر ستی کر دینے اور ہندو عورت کو شوہر کے ساتھ جلا دینے سے بھی زیادہ روح فرسا منظر ہندو سماج میں بیوہ عورتوں کے دوسرے نکاح پر قدغن ہے۔ جس عورت کو مرد کے ساتھ جلا دیا گیا راکھ ہو جانے پر اس کے تمام دکھ درد ایک دفعہ ختم ہو گئے مگر اس کو تاوفات نکاح ثانی سے محروم و محفوظ رکھ کر اس کو ہمیشہ کیلئے آگ کے شعلوں میں جھلسا جاتا اور انگاروں پر لٹایا جاتا ہے۔

یاللعجب کتنا غضب ہے کہ جو لڑکی شادی کے ایک روز بعد ہی بیوہ ہو گئی ہے اس کو بھی ہندو سماج شادی کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام اور نکاح بیوگان:

لیکن اسلام نکاح بیوگان کا شدت سے حامی ہے اسلام لڑکی کے بیوہ ہونے پر عدت کے بعد دوسرے نکاح کو معیوب نہیں سمجھتا۔ نظریہ اسلامی یہ ہے کہ جس طرح ایک لڑکی پہلی دفعہ نکاح کر کے فطرت کے تقاضے کو پورا کرنے کا حق رکھتی ہے وہ جوانی کے ایام میں بیوہ ہو کر بھی

اسی طرح اپنے اندر جوانی کے فطری تقاضوں سے دوچار ہے۔ پھر اس کے ان شدید فطری تقاضوں اور جوانی کی امنگوں کو دبا دینا کسی صحیح مذہب اور صالح سماج کی صحت اور سلامتی کے خلاف ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں بیوہ عورت پر ظلم و ستم کے مترادف ہے۔

فطرت کی نفسیات کے نازک تقاضوں سے ایک نفسیاتی تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک وہ کسی ذائقے سے نا آشنا ہوتا ہے اس وقت تک کسی درجے میں اس کو تسلی دے کر بہلایا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی چیز سے لذت آشنا ہونے کے بعد جب کہ نفسیاتی تقاضے شدید اور سخت ہو جاتے ہیں اس وقت ان کو دبانا فطرت سے جنگ کرنا ہے جس کا نتیجہ اغلباً اخلاقی برائیوں پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔

شیخ سعدی جو اخلاق کے مضمون کے اسکالر اور فلسفی ہیں یا بالفاظ دیگر نفسیات کے ماہر حکیم ہیں۔ انہوں نے جوانی کی اٹھتی ہوئی امنگوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر جو فلسفیانہ بات کہی ہے وہ ہزاروں حکمتوں کی ایک حکمت ہے۔ وہ گلستاں کے باب پنجم در عشق و جوانی میں لکھتے ہیں:

"در ایام جوانی آنچہ کہ افتد تو دانی"

پس جوانی کے زمانے کو وہ جوان بیوہ خوب جانتی ہے کہ اس پر کیا گذر رہی ہے اور سماج اسے کس اخلاقی ہلاکت کے گڑھے میں لے جا رہی ہے۔ اس لئے جو مذہب عورت کو ستی کرنے سے بچا کر اور بیوہ عورت کے دوسرے نکاح کی حمایت کر کے عورت پر انتہا درجے کا کرم کرتا ہے وہ مذہب اسلام ہے جس نے عورت کے ڈوبتے ہوئے سفینہ حیات کو ساحل مراد تک لگایا اور اعلان کیا:

وانکحوا الایامی منکم

ترجمہ: تم اپنی بیوہ عورتوں کا نکاح کر دیا کرو۔

پھر بیوائیں ایسے حکم اور ایسے مذہب سے اپنا دل کیوں نہ ٹھنڈا کریں گی۔ جوان کے بجھے ہوئے دلوں کے چراغوں کو دوبارہ روشن کرتا ہے جن کو معلوم ہے وہ جانتے ہیں اور جن کو معلوم نہیں وہ جان لیں کہ پیغمبر اسلام آنحضور علیہا الصلوٰۃ والسلام نے ایک حضرت عائشہؓ کے سوا

تمام بیوہ عورتوں سے نکاح فرمائے ہیں جو دنیائے انسانیت پر کرم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ولادت کے تقاضے:

واقفین حقیقت جانتے ہیں کہ عورت میں ایسے مادے موجود ہیں کہ وہ چالیس سال تک اولاد پیدا کرنے کی عموماً صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے جسم میں بچوں کو ولادت اور غذا دینے کے مادے موجود ہوتے ہیں۔ ان موالید اور مادوں کے جمع ہو جانے سے اس کی جسمانی صحت مندانہ مشین کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے بیوہ جوان عورتوں کو نکاح ثانی سے روک کر ان کو بیماریوں اور جسمانی عدم توازن کے سپرد کرنا ہے۔ ذرا قرآن کریم کے اس فلسفیانہ نکتے پر اب غور کیجئے۔ فرماتے ہیں:

نساء کم حرث لکم

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں

پس جس طرح ایک کاشت کار اور مزارع اپنی زمین کو غلے کے محاصل اور اس کے آلات و وسائل کو عمل میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح سماجی بے راہ روی کا نکاح بیوگاں کے بغیر فطرت سلیمہ کے تقاضوں کو کچلنا اور بے کار ڈال دینا ہے۔ جب جنس نسوانی حرث قرار دی گئی تو عمل حراثت اس پر جاری کرنا لازم ہے۔ اسی طرح زمین مزروعہ کو بعذر حصول غذا زیر حراثت لانا ضروری ہے۔ اور انسان کی ضرورت نے ابتدائے آفرینش سے اب تک

الضرورۃ ام الاختراع

ترجمہ: ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

ضبطِ تولید اور برتھ کنٹرول:

یہاں سے ضبطِ تولید اور برتھ کنٹرول کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ توالد اور تناسل کے ساتھ ساتھ ابتدائے آفرینش کی طرح خدا کی وسیع و عریض زمین کو کام میں لانے کی طرف بھی انسان کے ترقی پذیر جذبہ کو بکثرت زراعت کی طرف قدرت پھیر دے گی اور ضبط تولید جو نکاح بیوگان پر قدغن لگانے کی طرح کا ایک عمل ہے ختم ہو جائے گا۔

اللہ پر بے اعتمادی:

جو لوگ غلے اور غذائی پیداوار کی طرف سے خدا پر ایمان لانے کے باوجود گھبراتے ہیں وہ دراصل ایمان کی کمزوری اور خدا پر بے اعتمادی سے دوچار ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ وعدہ کرلیا ہے:

وفی السمآء رزقکم وما توعدون وما من دابۃ الا علی اللہ رزقھا

ترجمہ: تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے کوئی بھی زمین پر چلنے والا ایسا نہیں مگر اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔

تو پھر رزق کی کمی سے خوفزدہ ہو کر برتھ کنٹرول اور ضبط تولید کی تجویزوں پر دوڑنا درست نہیں۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقکم وایاھم ان قتلھم کان خطا کبیرا

ترجمہ: تم اپنے بچوں کو افلاس کے باعث قتل مت کرو تمہیں اور ان کو تو ہم رزق دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کا قتل سخت گناہ ہے۔

نکاح بیوگان کے نظریئے میں مسلمانوں کی عددی ترقی:

آج دنیا میں قوموں کی اکثریت پر بہت کچھ فیصلوں کو موقوف کردیا گیا ہے۔ جہاں جس قوم کی کثرت ہے وہاں اقتصادی، مذہبی اور سیاسی غلبہ، تفوق اور بالادستی حاصل ہے۔ جس قوم میں نکاح بیوگان پر پابندی لگادی جاتی ہے۔ اس قوم کی مردم شماری گھٹتی چلی جاتی ہے اور مردم شماری کے گھٹنے سے اس قوم کو سیاسی حیثیت سے نقصان ہوتا ہے۔

پاکستان کا وجود:

مسلمانوں میں نکاح بیوگان اور چار تک شادیوں کے رواج کے باعث ان کی ہر جگہ کثرت ہو جاتی اور ہوسکتی ہے۔ پاکستان۔ کے علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت کا راز بھی اس فارمولے میں مضمر ہے۔

ہندوستان کے ہندوؤں کی بوکھلاہٹ:

حال ہی میں بھارت کے بعض ذمہ داروں اور متعصب ہندو جن سنگھیوں کا یہ نظریہ اور تجویز پڑھنے کا اخباروں میں اتفاق ہوا کہ انہوں نے بھارت میں مسلمانوں کی روز افزوں آبادی پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس وقت بھارت میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ متعصب ہندو لیڈروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں کئی شادیوں کے رواج پر پابندی نہ ہونے کے باعث مزید کثرت کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا ان پر قانوناً تعداد ازدواج کے خلاف پابندی لگادی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوؤں کو نکاح بیوگان کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے جس کے عدم رواج کے باعث ان کی نسل اور کثرت میں دن بدن کمی ہو رہی ہے۔

نکاح بیوگان پر قاسم العلوم کا جہاد لسانی مسلمانوں اور عورتوں کی فتح عظیم ہے:

ہندوؤں کی سماج میں نکاح بیوگان کی سخت ممانعت کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہ جراثیم اپنی شدت سے پھیلے جو مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور معاشرے کو گھن کی طرح کھانے لگے۔ ہندوستان کے شرفاء اور اونچی ذات کے مسلمانوں میں تو قریب قریب عملی طور پر نکاح بیوگان کو ہندوؤں کی طرح سخت پاپ، معیوب اور گناہِ عظیم خیال کیا جاتا تھا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

> ’’پھلت ۔ کے ایک عالم باعمل مولانا وحید الدین مرحوم تھے۔ وعظ ان کا عام طور پر مقبول تھا۔ خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اصلاحی باتیں عموماً لوگ مان لیتے تھے۔ ایک دن دیوبند ہی میں وعظ کہتے ہوئے مولوی وحید الدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلے کا بھی ذکر چھیڑ دیا، ایک رئیس شیخ زادے صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، اور ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹتے ہوئے

بولے کہ ”بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو۔“ (سوانح مخطوطہ صفحہ ۴۰)

اس غلط تصور اور عمل کو توڑنے کیلئے علمائے ربانی میدانِ عمل میں اترتے رہے ہیں۔ خاندان ولی اللہ کے ایک سرگرم عمل مجاہد حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح بیوگان کی مہم کو بڑی ہمت سے جاری کیا۔ اور اپنی جوان بیوہ بیٹی کو بیاہ دیا۔ ان کے بعد مختلف علاقے کے علماء نے اس طرف توجہ کی ضلع سہارنپور اور مظفرنگر اور یو۔ پی کے اضلاع میں بھی ہزاروں مسلمان بیوائیں اپنے والدین کے گھروں میں سڑ سڑ کر مرجاتی تھیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کو دوسرا اسماعیل شہید کہا جائے۔ تو زیادہ موزوں ہوگا۔ قاسم العلوم نے اپنے اطراف وجوانب میں نکاح بیوگان کی مہم کو چلایا۔ آپ کے سامنے مولانا مظفر حسینؒ صاحب کاندھلوی کا بھی نمونہ تھا کہ انہوں نے بھی اس طرف خاص توجہ کی تھی۔ اور حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی۔ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

> ”بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اولاً ان ہی سے ہوئی اور والد مرحوم (مولانا مملوک علی صاحبؒ) نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا۔ ان دونوں بزرگواروں کے قدم بہ قدم حضرت مولانا (محمد قاسم صاحب) نے اس کو پورا شائع کیا۔“ (سوانح قاسمی)

مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ منشی فضل حق صاحب دیوبندی مصنف سوانح مخطوطہ نکاح بیوگان کی کوششوں کے متعلق مولانا محمد قاسم صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”نکاح ثانی بیوگان کو ایسا برا اور سخت عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا تو مارنے مرنے کو مستعد ہوجاتے تھے۔ اول اول لوگوں کے کانوں میں جونئی بات پڑی تو چونکے اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ اور بعض بعض نے (مولانا محمد قاسم صاحب کے) خلاف میں منصوبے گانٹھے۔“

مگر الحمد للہ حکمت قاسمی رنگ لائے بغیر نہ رہی اور پھر کیا ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی مردوں میں کامیابی کے بعد جو نکاح ثانی بیوگان پر مرنے مارنے کو تیار ہوجاتے تھے

عورتوں تک میں تقریروں کے ذریعے اجراء سنت کی تبلیغ میں کامیاب ہونے کے بارے میں سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ''نوبت یہاں تک پہنچی کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے اور بیواؤں کے کانوں تک مضامین نکاح ثانی پہنچنے لگے۔ کوئی بیوہ اور وارث بیوہ ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے فضائل نہ پہنچے ہوں۔''

نتائج تبلیغ قاسمی بسلسلہ نکاح بیوگان:

حضرت قاسم العلوم کی اس جدوجہد کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ نکاح بیوگاں کے سلسلے میں جو بیوہ عورتوں اور مردوں میں نفرت اور غصے کی آگ بھڑکی ہوئی تھی وہ فرو ہوگئی۔ اور پھر دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بیوگان کے نکاح بھی ہونے لگے۔ چنانچہ دیوان جی حاجی محمد یٰسین صاحب جو قاسم العلوم کے جان نثار بھائی، معتقد اور مرید تھے۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھی۔ ان کو نکاح ثانی کے لئے آمادہ کرلیا اور وہ خوشی سے مان گئے۔ دراصل اصلاح پہلے اپنے ہی گھر سے ہوئی ہے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''اول میاں محمد یٰسین صاحب کی بیوہ ہمشیرہ کا نکاح ثانی ہوا۔'' (اور پھر قاسم العلوم کی کوشش نے حاجی یٰسین صاحب کی) ایک بھانجی بیوہ کا نکاح ثانی بھی کرایا۔''

اسی اثنا میں جب قاسم العلوم نکاح بیوگان کی سنت کے اجراء میں سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے کہ حضرت قاسم العلومؒ کی بڑی ہمشیرہ مسماۃ امینہ جن کا ذکر ہم نے ابتدائی اوراق میں کیا ہے بیوہ ہوگئیں۔ عمر بھی کافی تھی۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ نکاح ثانی کی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر کیا ہوا استاذ محترم مولانا محمد طیب صاحب اپنے دادا مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت نانوتوی (مولانا محمد قاسم صاحب) رحمۃ اللہ علیہ (دیوبند کے) دیوان میں نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں شیوخ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے حضرت انداز سے سمجھ گئے اور بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کریں گے فرمایا کہ آپ ذرا

ٹھہریں مجھے ایک ضرورت پیش آ گئی ہے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت وعظ کی چوکی سے اترے اور گھر میں تشریف لے گئے۔ مجلس اپنی جگہ جمع رہی گھر میں پہنچ کر اپنی بیوہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں۔ اور کافی ضعیف ہو چکی تھیں۔ پیر پکڑ کر لجاجت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیاء سنت کے قابل ہو سکتا ہوں۔ بہن نے گھبرا کر کہا کہ بھائی ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑ دو میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول ﷺ کے احیاء کا سبب بنوں؟ فرمایا کہ آپ نکاح فرما لیں، اس پر بہن نے کہا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں، سر سفید ہو چکا ہے۔ نکاح کی عمر نہیں ہے۔ فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیاء کے لئے ہوگا، کسی طبعی ضرورت کی بناء پر نہیں۔ اس پر بہن راضی ہو گئیں۔ اسی وقت گھر میں ہی حضرت نے (اپنی بہن کا شیخ نیاز احمد سے) نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا۔ وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہوئے ہی تھے۔ پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ تو نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے ہوں۔ اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بیوہ بہن بیٹھی ہوئی ہے۔ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں۔ ان کے نکاح کے گواہ تو اس مجلس میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس پر تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے۔ اور یہ تحریک نہایت قوت سے آگے چلی۔" (حاشیہ سوانح قاسمی از گیلانی صفحہ ۱۴۱ جلد دوم)

قاسم العلوم نے اپنی بہن کے نکاح ثانی کا نمونہ پیش کر کے مسلمانوں کی سماج کو خاص تاثر بخشا۔ کیونکہ جب انسان اپنے قول کی خود عملی تفسیر بن جاتا ہے تو نفسیاتی نقطہ نگاہ سے دوسروں پر ضرور اثر ہوتا ہے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق لکھتے ہیں کہ:

"پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح (ثانی) ہونے لگے جیسے کنواری لڑکیوں کے یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہو گیا مگر جو روگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو نکٹی اور

شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دور ہو گیا اور عیب نہ رہا۔" (سوانح مخطوطہ صفحہ ۴۴)

ہم کتاب کے آغاز میں شجرہ شیخ اسد علی والد قاسم العلومؒ کے ضمن میں بی بی امینہ ہمشیرہ قاسم العلوم پر نوٹ لکھ چکے ہیں۔ محترمہ امینہ کی پہلی شادی دیوبند میں شیخ احمد صاحب دیوبندی سے ہوئی تھی۔ شیخ احمد کے انتقال کے بعد امینہ صاحبہ کی دوسری شادی شیخ احمد صاحب دیوبندی سے ہوئی جس سے بی بی امینہ کے بطن سے دولڑکے شیخ رفیق احمد اور ایک لڑکی صفیہ پیدا ہوئی تھی۔

محترمہ امینہ کا نکاح ثانی شیخ اسد علی صاحب کی زندگی میں:

قاسم العلومؒ کی ہمشیرہ محترمہ کا جب عقد ثانی ہوا ہے تو اس وقت مولانا کے والد محترم شیخ اسد علی صاحب زندہ تھے۔ چنانچہ جب اس عقد ثانی کی اطلاع مکہ محترمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو پہنچی ہے تو انہوں نے حضرت قاسم العلوم کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

> "از کمترین خلائق مسمی بامداد اللہ عفا اللہ عنہ بخدمت بابرکت عالم عامل عزیزم مولوی محمد قاسم و مولوی محمد یعقوب صاحب دام شغلکم باللہ۔ بعد سلام مسنون و اشتیاق مشحون مشہود رائے عزیز باد۔ مکتوب مع پارچہ کھیس یکے مورخہ ۲۶ جمادی الثانی و دیگر مورخہ ۲۲ شوال رسیدند۔ از مندرجہ آں ہا آگاہی یافتم۔ از انتقال عزیز شیخ احمد دیوبندی مرحوم رنج گردید۔ خداوند تعالیٰ مغفرتش کند برائے او طواف و دعائے مغفرت کردہ شد قبول بادو نیز از دریافت نکاح ثانی عزیزہ ام ہمشیرہ مولوی محمد قاسم بحسن تدبیر و سعی مولوی صاحب (محمد قاسم) موصوف و آں عزیز خیلے فرحت ہا اندوختم کہ بقلم نے گنجد و بے اختیار دعائے خیر بحق آں عزیزاں وغیرہ و نہال احمد برخوردار ضیاء احمد از تہ دل برآمی آید۔"

(مرقومات امدادیہ صفحہ ۲۴۷)

کمترین خلائق (بلکہ افضل ترین خلائق وقت) امداد اللہ عفا اللہ عنہ کی طرف سے عالم باعمل عزیزم مولوی محمد قاسمؒ و مولوی محمد یعقوب صاحب دام شغلکم باللہ کی خدمت میں بعد سلام مسنون و اشتیاق مشحون مشہود رائے عزیزاں ہو۔ مکتوب مع کھیس مورخہ ۲۶ جمادی الثانی اور دوسرا خط مورخہ ۲۲ شوال پہنچا۔ ان کے مضامین سے مطلع ہوا۔ عزیز

> شیخ احمد دیوبندی مرحوم کے انتقال سے رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے۔ اس کیلئے طواف اور دعائے مغفرت کی گئی۔ قبول ہو۔ اور ہمشیرہ مولوی محمد قاسم صاحب کے نکاح ثانی کی ماں کے اور تمہارے حسن تدبر اور سعی سے مجھے بہت سی خوشیاں حاصل ہوئیں کہ احاطہ قلم سے باہر ہیں۔ اور تم دونوں اور (شیخ) نہال احمد اور برخودار ضیاء احمد کے حق میں بے اختیار دعائیں دل کی گہرائی سے نکل رہی ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؒ قبلہ کے مکتوب گرامی کے آغاز ہی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی ان کی ہمشیرہ کے نکاح ثانی کے بارے میں حسن تدبیر اور سعی اور محترمہ امینہ کے پہلے خاوند شیخ احمد کے انتقال اور امینہ صاحبہ کے دوسرے نکاح کی تاریخی دستاویزات ملتی ہیں۔ یہ بھی کہ اس نکاح میں اصل کوشش تو حضرت قاسم العلومؒ ہی کی ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی جو تحریک قاسم العلوم لے کر اٹھے ہیں اس میں مولانا محمد یعقوب صاحب عارف باللہ اور شیخ نہال احمد بھی شامل ہیں۔ برخوردار ضیاء احمد مولانا محمد قاسم صاحب کی ان ہی بہن امینہ صاحبہ کا لڑکا ہے جو پہلے خاوند احمد صاحب سے پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی اپنے ماموں مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے ساتھ اپنی والدہ کے نکاح ثانی میں متفق ہے۔ اسی لئے ان کے راضی ہونے پر حاجی صاحب ضیاء احمد صاحب کیلئے دعائیں دے رہے ہیں۔ اور نکاح ثانی پر بیٹے کا اس دور میں راضی ہوجانا حیرت سے خالی نہیں۔

آگے چل کر اسی مکتوب میں حاجی صاحبؒ مولانا محمد قاسم صاحب ضیا اور شیخ اسد مولانا کے والد کو مبارکباد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’بخدمت عزیز جانم مولوی قاسم صاحب مکرر آنکہ بہ ہمشیرہ خود و برخوردار ضیاء احمد را بعد سلام و دعائے خیر گفتہ دہند کہ ایں احقر را ازیں عمل خیر شما بسیار فرحت رونمود خدائے تعالیٰ جزائے خیر دہد از تمام نعمائے دینی و دنیوی مشرف کناد‘‘

> اپنی جان سے عزیز مولوی محمد قاسم صاحب کی خدمت میں مکرر لکھتا ہوں کہ اپنی ہمشیرہ اور برخوردار ضیاء احمد کو سلام و دعا کے بعد کہیں کہ اس احقر کو تمہارے اس (نکاح ثانی کے) نیک کام سے بہت خوشی ہوئی۔ خدائے تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور دینی اور

دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کرے۔ (یعنی نماز روزے کی توفیق اور اولاد دے)

"بخدمت بھائی صاحب مکرم و معظم شیخ اسد علی صاحب سلمہ بعد سلام نیاز مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آں جناب را توفیق اتباع سنت نبوی ﷺ دہاد۔ امید قوی است کہ ہمیں عمل خیر وسیلہ نجات جناب شود، عجب نیست و شکر کنند کہ خدا تعالیٰ شمارا یک ولی کامل عطا فرمودہ کہ ببرکت انفاس او ایں چنیں اعمال نیک و رضامندی اللہ و رسول بظہور آمد والا۔"

بخدمت بھائی صاحب مکرم و معظم جناب شیخ اسد علی صاحب سلمہ کو بعد سلام نیاز کے مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آں جناب کو سنت نبوی ﷺ کے اتباع کی توفیق دے۔ پختہ امید ہے کہ اگر یہی نیک کام آپ کی نجات کا ذریعہ بن جائے تو تعجب کیا ہے۔ اور شکر کریں کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں ایک ولی کامل (بیٹا) عنایت فرمایا۔ کہ اس کے لمحات زندگی کی برکت سے اس جیسے اللہ اور رسول ﷺ کی خوشنودی کے کام ظہور میں آئے ورنہ:

"ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند"

یہ ہمیشہ کی دولت ہر شخص کو نہیں دیتے۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کو اللہ تعالیٰ انوار سے بھر دے کہ انہوں نے ہمیں اپنے اس گرامی نامے میں کتنی ہی کچھ معلومات فراہم کر دیں جو حسب ذیل ہیں:

١۔ حضرت قاسم العلومؒ نے دو خط حاجی صاحب کو روانہ فرمائے ہیں۔ پہلا خط ٢٦ جمادی الاخریٰ کو لکھا ہے جس میں انہوں نے اپنے بہنوئی احمد صاحب کے انتقال کی خبر دی ہے جن کی مغفرت کیلئے حاجی صاحب نے دعا بھی کی اور ایصال ثواب کیلئے طواف خانہ کعبہ بھی کیا۔

٢۔ قاسم العلومؒ نے جو دوسرا مکتوب حاجی صاحب کو روانہ فرمایا ہے۔ وہ ٢٤ شوال کو لکھا ہے جس میں اپنی ہمشیرہ امینہ کے عقد ثانی کی اطلاع دی ہے۔

٣۔ مولانا قاسم العلومؒ نے اپنی ہمشیرہ کے عقد ثانی میں بڑی کوشش اور تدبیر سے کام لے کر اپنے والد صاحب اپنی ہمشیرہ، ہمشیرہ کے لڑکے ضیاء احمد اور شیخ نہال احمد کو جوان کے

بہنوئی کے بھائی ہوتے ہیں۔ سب کو منا کر یہ کام کیا ہے۔ والد صاحب کے مان جانے پر حاجی صاحب نے ان کو مبارک باد دی ہے اور اس سنت کے اتباع پر جنت کی خوشخبری دی ہے کیونکہ یہ کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضامندی کا ہوا ہے اور جب اللہ راضی ہو جائے تو اس کا عوض جنت ہے۔ پھر حاجی صاحب نے مولانا کی ہمشیرہ اور ان کے لڑکے کو بھی اس کام پر راضی ہو جانے پر دعائے خیر دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بہت مشکل اور سنگین تھا۔ کیونکہ شیخ برادری کو راہِ راست پر لے آنا معمولی بات نہ تھی۔ شیخ نہال احمد صاحب خود دیوبند کے اعلیٰ درجے کے رئیسوں میں سے تھے۔ جو گذرتی باراتوں کو ٹھہرا کر کھانا کھلایا کرتے تھے۔ بہر حال یہ چاروں صاحبان یعنی والد صاحب، ہمشیرہ صاحبہ، بھانجا ضیاء اور حضرت کی ہمشیرہ کے گھر اور خاندان کا سردار جن کو قاسم العلوم کے ذمہ منانا تھا سب راضی ہو گئے۔

۴۔ مولانا محمد قاسم صاحب کے بہنوئی کا ماہ انتقال:

چوتھی بات جو حاجی صاحب کے گرامی نامے سے معلوم ہوتی ہے وہ حضرت قاسم العلوم کے بہنوئی شیخ احمد کے انتقال کے ماہ وفات کی خبر ہے۔ قاسم العلوم نے جو حاجی صاحب کو دو خط لکھے ہیں ان دونوں خطوط میں تین ماہ اور اٹھائیس دن کا فاصلہ ہے۔ عدت کے چار ماہ اور دس دن نکال کر کر تحقیق اور وجدان سے معلوم ہوتا ہے کہ قاسم العلوم کے بہنوئی کا انتقال جمادی الاخریٰ کے پہلے ہفتے میں یا زیادہ سے زیادہ جمادی الاولیٰ میں ہوا ہے۔ جن کے انتقال کے کچھ دنوں کے بعد مولانا نے اپنے مرشد کو ان کی وفات کی اطلاع دی ہے۔ دوسرے خط میں جو ۲۴ شوال کو لکھا ہے جو حجاج کے حج کی روانگی کا زمانہ ہے۔ اس میں نکاح کی اطلاع دی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ عدت کے اثنا میں ہی ان کو اپنی ہمشیرہ کے نکاح ثانی کی فکر پڑ گئی تھی کیونکہ سوانح مخطوطہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ قاسم العلوم نکاح بیوگان کی تحریک اس زمانے میں چلا رہے تھے۔ لیکن یہ کون سا دور تھا جب قاسم العلوم نے نکاح بیوگان کی تحریک چلائی۔ اور مولانا کے بہنوئی اور ان کی ہمشیرہ کے عقد ثانی کا کون سا سال تھا۔ سو جزائے خیر دے۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے اسی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”عزیزم جانم چہار خط شمار و مورخہ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ بروقت آمدن از مدینہ منورہ

وصول یافتم و یک مورخہ ۲۱ شوال و دیگر مرقومہ ۴ ذی قعدہ رسید۔ از مطالعہ آن ہا مسرت ہا اندوختم دار جواب ہر ایک علیحدہ علیحدہ بسبب بے قابو بودن دست معذورم معاف دارند۔" (مرقومات امدادیہ)

مجھے جان کے برابر عزیز تمہارے چار خط پہنچے دو جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ میں مدینہ منورہ سے مکہ محترمہ کو واپسی پر اور ایک ۲۱ شوال کو اور دوسرا ۴ ذی قعدہ کو پہنچا۔ ان کے مطالعہ سے بڑی خوشیاں نصیب ہوئیں۔ ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ جواب دینے سے ہاتھ میں رعشہ کی وجہ سے معذور ہوں معاف کرنا۔

تحریک نکاح بیوگان ۱۲۸۳ھ:

مذکورہ عبارت کو پڑھ کر واضح ہوا کہ قاسم العلوم کے بہنوئی کا انتقال جمادی الاولیٰ ۱۲۸۳ھ میں زیادہ سے زیادہ جمادی الاخریٰ کے پہلے ہفتے میں ہوا۔ اور آپ کی ہمشیرہ کا نکاح ثانی شوال ۱۲۸۳ھ میں عدت کے گذرنے کے فوراً بعد ہوا ہے۔ جبکہ تحریک زوروں پر تھی۔ لہٰذا واضح ہوا کہ نکاح بیوگان کی تحریک ۱۲۸۳ھ میں جب شروع ہوئی جب کہ حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ اور ہم بدلائل بیان کر چکے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے مدرسے کی تجویز اور اس کے حل وعقد کے تمام انتظامات اندرونی طور پر حضرت قاسم العلوم ہی کی جانب سے تھے۔

بنیاد دارالعلوم دیوبند ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء:

ہم دارالعلوم دیوبند پر بحث کے دوران میں یہ لکھ آئے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو جمعرات کے دن ہوا۔ گویا قاسم العلوم نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد کے ساتھ ساتھ ہی دیوبند ضلع سہارنپور، مظفرنگر اور دیگر اضلاع بلکہ صوبوں میں تحریک نکاح بیوگان کا آغاز کر دیا تھا۔ اور چونکہ دارالعلوم دیوبند کی وجہ سے اب بار بار دیوبند آنا ہوتا تھا۔ اور اس کے لئے بھی کہ وہاں سسرال تھی۔ دیوبند کو اصلاح کا مرکز بنالیا گیا تھا اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بھی دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس کی

حیثیت سے مولانا محمد قاسم صاحب نے بلا لیا تھا۔ اور ان کی سسرال بھی دیوبند میں تھی۔ کیونکہ دونوں حضرات ہم زلف تھے۔ لہٰذا عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب بھی اس تحریک میں شریک ہوگئے تھے۔

حضرت قاسم العلوم کی اس تحریک کا دور دور تک اثر پڑا۔ آپ کے ایک خاص مرید حافظ تجمل حسین صاحب جو موضع وسنہ کے رہنے والے تھے اور جن کے نام آپ کا مکتوب گرامی بھی ہے۔ انہوں نے اپنی جوان بیوہ بیٹی کا نکاح کیا۔ بہرحال حضرت مولانا کی یہ کوشش جو اصلاح امت میں نکاح بیوگان سے متعلق تھی یہ خاطر خواہ کامیاب ہوئی۔

اصلاح امت کا دوسرا اقدام

۲۔ غم و شادی کی فضول رسموں کی اصلاح

ہندوستان میں مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ رہنے سہنے سے مختلف قسم کی احمقانہ ہندوانہ رسمیں پیدا ہو گئی تھیں۔ سہرا، کنگنا، منڈھا، چوتھی اور دسیوں قسموں کے رواج مسلمانوں میں سرایت کر چکے تھے۔ اور انہوں نے ایسی جڑ پکڑ لی تھی کہ ان کا استیصال بہت دشوار ہو گیا تھا۔

ماتمی صورت میں بھی ماتم والوں کے یہاں بار بار آمد و رفت اور ان کو زیر بار کرنا، سماج کی رسموں سے مجبور ہو کر شادی و غم میں فضول خرچیوں میں روپیہ اٹھانا یہ سب امور جس معاشرے پر گذرتے ہیں وہی ان باتوں کو خوب جانتے ہیں۔

ایک غریب مزدور پر جس کو باپ کی موت نے نڈھال کر دیا ہے۔ تعزیت والوں کا اس کے گھر روزانہ سماج کی رسموں سے مجبور لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ آج تجہیز و تکفین کے اخراجات کل کو فاتحہ، پھر دسواں، پھر چہلم، پھر برسی کا طاقت سے باہر بار زندہ کو مردہ کر چھوڑتا ہے۔ یہی حال شادی میں برادری کو کھانا کھلانا، گلگلوں اور پوریوں کا تقسیم کرنا، کھانڈ کچھالیوں کا لڑکی والوں کے یہاں بھیجنا، جہیز کی حوصلہ شکن تیاریاں یہ وہ سب امور ہیں جن سے معاشرے میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ضلع سہارنپور اور مظفرنگر اور ان کے اطراف و جوانب سب ہی اس کی لپیٹ میں تھے۔

حضرت قاسم العلوم نے اپنے ماحول کی تطہیر کی آپ گذشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہیں کہ قاسم العلوم نے اپنی لڑکی کو ان ہی کپڑوں میں سسرال بھیج دیا تھا جو وہ پہنے ہوئے تھی۔ خود

اپنی شادی میں بیوی کا زیور اس کی اجازت سے دو دفعہ ترکوں کی جنگ میں چندے میں دے دیا تھا۔ جس شخص کا خود عمل یہ ہو اس کے لئے معاشرے کی اصلاح ناگزیر ہو جاتی ہے۔

بہر حال آپ نے اہل دیوبند کو جہاں آپ کی سسرال تھی۔ اور یہاں کے شیخ زادوں میں کیا کچھ رسمیں نہ تھیں۔ ان کی اصلاح شروع کی۔ اور مواعظ حسنہ سے ان کے اندر ان بری غیر اسلامی رسموں کا استیصال کیا۔ اور سادگی کی راہ پر ڈال دیا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ایک ایسے عہد کا ذکر کیا ہے جو دیوبند کے مسلمانوں نے حضرت قاسم العلوم کے سامنے لکھ کر پیش کیا تھا۔ اور اس پر ان کے دستخط تھے۔ اس میں ان امور پر عہد کیا گیا تھا کہ:

> ''شادی میں جو مسرفانہ رسمیں مقرر ہیں اور ان کی پابندی سے بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے بالکل موقوف کر دی جائیں گی۔ اسی طرح بیمار پرسی کے سلسلے میں عورتیں جو مریض کی عیادت کو جاتی ہیں۔ اور اس میں بیمار اور تیمار دار دونوں کو (فضول رسموں کے باعث) تکلیف ہوتی ہے اس رسمی دستور کو توڑ دیں گے۔''

یعنی مزاج پرسی کا ایک ایسا طریقہ ہو جس میں سنت کے مطابق مناسب اوقات میں خاص خاص احباب اور اقربا یا جو بھی جائیں مزاج پرسی کریں اور روانہ ہو جائیں۔ ہاں بھائی بہنیں جو دور دراز جگہ سفر کر کے آئیں وہ حالات کے ماتحت غربت و امارت کے حالات کے مناسب آئیں اور ٹھہریں۔ اسی عہد میں بقول مصنف سوانح مخطوطہ یہ بات بھی تھی لکھتے ہیں:

> ''مستورات کے لباس میں جو اسراف ہو رہا ہے اس کی اصلاح کی جائے۔''

چنانچہ ان تجویزوں نے عملی جامہ پہنا۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''شادیوں میں بھی فضول خرچی اکثر موقوف ہو گئی اور رسوم کی پابندی بالکل نہ رہی۔ سب کے رسوم بہت کم ہو گئے۔ اکثر جگہ سے سوم، دسواں، بیسواں اور چہلم موقوف ہو گیا۔ ایصالِ ثواب میت کا پورا پورا طریقہ شرع شریف کے موافق ہو گیا۔''

مطلب یہ ہے کہ حسب حیثیت شرع کے مطابق ایصالِ ثواب کے جو طریقے ہیں وہ باقی رہ گئے اور فضول رسموں کو توڑ دیا گیا۔ فضول رسمیں یہ کہ برادری کے لوگ اکٹھے ہوتے پلاؤ زردہ اڑاتے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے اور روانہ ہو جاتے۔

جہاد عملی

اصلاح امت کا تیسرا اقدام

۳۔ وراثت میں لڑکیوں کی حق رسی

ہم نے ابھی گذشتہ سطور میں کہا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سی رسمیں ہندوؤں کے ساتھ اختلاط اور ان کے معاشرے سے آئیں۔ ان ہی میں سے عورتوں کو مورث کی جائیداد اور مملوکہ چیزوں میں سے حصہ نہ دینے کا رواج بھی تھا۔ حضرت قاسم العلوم جب دہلی سے تعلیم سے فراغت حاصل کر کے تشریف لائے تو اپنی برادری اور خود اپنے گھر میں بھی یہ بات دیکھی ابتدائے کتاب میں ہم نے اس پر قلم فرسائی کی ہے۔ کہ آپ کو خود اپنی جدی جائیداد میں عورتوں کی حق تلفیوں کا سخت احساس ہوا تو گھر سے اصلاح کا اقدام اٹھایا اور خود دستِ مبارک سے جن جن کے حصے نکلتے تھے۔ فرائض نکال کر اور ساری زمین میں جہاں جہاں سے حصوں کی شاخیں نکلتی تھیں ان کے حقوق متعین کر دیئے اور ان کی پیداوار اہل حق کو دی جانے لگی۔ آپ کے والد محترم نے کہا بھی کہ میرا بیٹا تو گھر کھوؤ ہے تو آپ نے فرمایا کہ اس زمین کا وارث آخر میں ہی ہوں گا۔ لہٰذا جب میں ہی نہیں چاہتا تو آپ کو میری خاطر یہ حق تلفی کیوں پسند ہے۔

آپ کو لڑکیوں کے حقوق وفرائض کا بہت احساس تھا۔ اسی لئے آپ نے فرمایا تھا کہ جلال آباد کی جائیدادوں کی بیع وشرا ناجائز ہے۔ کیونکہ عورتوں کی ملکیت اور حقوق ہونے کے باعث ان کی اجازت اور رضامندی کے بغیر یہ درست نہیں۔

جہاد لسانی و عملی

اصلاح امت کا چوتھا اقدام

۴۔ تعزیہ داری اور ماتم کا دیوبند سے استیصال

اندرونی اصلاحات میں آپ نے سنیوں سے تعزیہ داری اور شیعوں کی طرح ماتم کرنے کی سخت اور غلط رسم کا بھی حتی المقدور استیصال کیا۔ تعزیہ داری کی ابتداء ہندوستان میں تیمور کے زمانے سے ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ محبت اہل بیت کے جذبے سے سرشار سنیوں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا کچھ تو واقعات کی صحیح صورت سے ناواقفیت، کچھ دین سے بے خبری، کچھ جذبات کی اشتعال انگیزی، کچھ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جان گداز واقعات شہادت کا تاثر کچھ مرثیہ خوانوں کے سوز نے سنیوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ نانوتے میں سنیوں اور شیعوں کی باہمی قریبی رشتہ داریاں تھیں اور حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنتی سیاست کا بہاؤ سنیوں کو شیعیت میں بہا کر لے جا رہا تھا۔ سلطنت مغلیہ کے محلوں میں بھی شیعہ سنی اقتدار کی کش مکش تھی۔ محلوں کے اثرات کا امراء اور وزیر پر اثر، ان اثرات کا رعایا پر مختلف اوقات میں زور اور دباؤ اور ساتھ ساتھ لالچ یہ مجملاً وہ امور تھے جن کے باعث یو۔ پی اور اودھ کے اضلاع میں شیعوں کے افکار اور اعمال و اعتقادات نے پر پرزے نکالے تھے۔ اور سنی بھی اس سیلاب میں بہہ رہے تھے۔ "بزم آخر" نامی کتاب کے مصنف جنہوں نے خود لال قلعہ میں اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گذارا ہے۔ عالمگیر بادشاہ کے بعد بہادر شاہ اول کے حالات میں لکھتے

ہیں:

> ''اکثر سلاطین (شاہی خاندان کے لوگ) قلعہ میں تعزیہ داری کرتے تھے۔ فقیر پیک بنتے تھے۔ کوئی نشانچی کوئی نقیب بنتا تھا۔ کوئی تاشہ، کوئی ڈھول، کوئی جھانجھ تعزیوں کے آگے بجاتا تھا۔ کوئی مرثیے پڑھتا تھا۔ مرثیہ خوانوں کو درگاہ میں چار طشتریاں، چکنی ڈلیاں، بھنے ہوئے خربوزے کے بیج اور دھنئے کی ملا کرتی تھیں۔ بڑے دھوم سے علم اٹھاتے تھے۔'' (بزم آخر صفحہ ۴۴)

شیعوں کے ساتھ ساتھ سنیوں کا بھی تعزیہ سازی میں بہت بڑا حصہ تھا۔ بلکہ بعض مقامات پر جہاں شیعوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ وہاں پر خالص سنیوں کا جوش جنوں تعزیہ سازی میں پیش پیش تھا۔ خود راقم الحروف کے وطن شیر کوٹ ضلع بجنور میں میرے طفلی کے زمانے میں بیسیوں تعزیئے نکلتے تھے جو تقریباً سب سنی ہی نکالتے تھے۔ ہمارے محلے اور قرب سے خود تین تعزیئے نکلتے تھے۔ کپی شاہ فقیر کا ترائین سے، رجو شاہ گورکن فقیر کا بالکل راقم الحروف کے مکان کے قریب سے اور ہمارے مکان کے عقب سے نکما شاہ کا، عموماً نکما شاہ اونچے والے اور مستان شاہ کے دو تعزیوں کے مقابلے ایک خاص چوک پر ہوتے تھے۔ اور جو اونچا ہوتا تھا۔ وہ قاعدے کے اعتبار سے سب سے آگے رہتا تھا۔ یہ سخت مقابلہ میں نے کئی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

الحمد اللہ ولا فخر محلے میں میرے والد احمد حسن صاحب مرحوم اور تایا مظہر الحسن صاحب مرحوم مقتدر ہستیاں سمجھی جاتی تھیں بلکہ تمام شہر کے روسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس لئے محلے کے تعزیئے مثلاً رجو شاہ اور کپی شاہ ہمارے مکان پر سلامی دینے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور انعام لیا کرتے تھے۔ چونکہ ہم لوگ زمیندار تھے۔ اس لئے گاؤں کے ہلیارے اور محلے کے بھنگی اور کہاروں کی ہولیاں بھی مکان پر آیا کرتی تھیں۔ اور انعام میں گڑ کی بھیلی جو ڈھائی سیر ہوا کرتی تھی۔ دی جایا کرتی تھی۔ اسی طرح میمن بھنیڑے قصبے کے بھنڈ تلے سالانہ حق لینے آیا کرتے تھے۔ محلے کے لوگوں کے فیصلے ہمارے گھر ہوا کرتے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ کیونکہ کانگریسی حکومت میں زمیندارے ہی ختم ہو گئے۔ ہاں تو شیر کوٹ میں شان سے

تعزیئے نکلتے تھے۔ لیکن اب تقسیم ہند کے بعد بھارت کی حکومت نے مسلم لیگ کے بعض ممبروں سے انتقام لینے کے لئے گولی چلادی۔ جب سے شیر کوٹ کی تعزیہ داری بند ہوگئی ہے۔ فالحمد اللہ

بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ عرض یہ کررہا تھا کہ ہندوستان میں تعزیہ سازی اور ماتم داری کا بڑا زور شور تھا۔ اکثر اوقات ہندوؤں سے تعزیئے نکالنے کے مواقع پر فسادات بھی ہونا عام تھا۔ اور کفر و اسلام کا مقابلہ سمجھتے ہوئے سنی ان فسادات میں پورے زور سے مقابل آتے تھے۔ اور پھر کچھ حکومت برطانیہ کی بھی ریشہ دوانیاں ہوا کرتی تھیں۔ غرض تعزیہ داری کی بدعت جڑ پکڑ گئی تھی۔ دیوبند میں بھی تعزیہ داری کا چرچا تھا۔ اور خود شیخ زادوں میں جو قاسم العلوم کے بعض رشتہ دار بھی تھے۔ تعزیہ داری ہوتی تھی۔ قاسم العلوم کے خاندان کے لوگوں میں کتنے ہی شیعہ تھے۔ اور اکثر قصبات میں لوگوں پر حُب علی اور اہل بیت کے خصوصی جذبات کے باعث رفض غالب تھا۔

دیوان محمد یٰسین عرف اللہ دیا کا تائب ہونا:

پہلے ذکر آچکا ہے کہ دیوان محمد یٰسین عرف اللہ دیا جو حضرت کے رشتہ دار تھے اور عاشق زار بھی جو بعد میں حضرت قاسم العلوم سے بیعت کرکے ہر قسم کی بدعات سے توبہ کرکے صاحب حال درویش ہوچکے تھے۔ ان کے یہاں خود تعزیہ داری ہوتی تھی۔ بلکہ ان کے محلے کی مسجد جو محل کی مسجد کہلاتی تھی اس میں بھی تعزیہ رکھا جاتا تھا اور محرم میں اس مسجد سے تعزیہ اٹھتا تھا۔

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"ان (دیوان جی) کے ہاں کی تعزیہ داری مشہور تھی۔" (صفحہ ۴۲)

بہرحال تاثیر صحبت قاسمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول مولانا محمد طیب صاحب، دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلے کی اسی مسجد سے تعزیہ بند کرنے کا بانگ دہلی اعلان کیا کہ:

"اس سال اس مسجد سے تعزیہ نہیں اٹھے گا۔" (سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۴۷ جلد دوم)

مدتوں کی تعزیہ پرستی کے بعد اعلان سے شیعہ گھرانوں اور سنیوں میں بھی سخت ہیجان برپا ہوا۔ اور سب نے متفقہ طور پر کہا کہ:

"سر قلم ہو جائیں گے مگر تعزیہ اٹھے گا۔"

دیوان محمد یٰسین کی زبان سے بھی جوشِ تقابل میں یہ جملہ نکل گیا کہ:

اگر گذرا تو میری لاش پر سے گذرے گا۔

بقول مولانا محمد طیب صاحب شیخ برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہو گئی۔ اس کی خبر حضرت قاسم العلوم کو پہنچی اور آپ کو معلوم ہوا کہ شہر دیوبند میں ہنگامہ بپا ہونے والا ہے۔ تو ایک مجلس میں جس میں برادری کے شیوخ اور دیوان جی بھی موجود تھے۔ آپ نے دیوان جی سے فرمایا کہ بندہ خدا اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے تو ذکر کر لیا تھا۔ پھر اسی مجلس میں فرمایا:

"لیکن اگر خیر کہلا دیا گیا ہے تو دوسرا سر قاسم کا لگا ہوا ہے۔"

اس کے نتیجے میں شہر کے پیشہ ور لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ شیخ زادوں نے دیوان محمد یٰسین کے مقابلے میں آنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور حضرت قاسم العلوم نے بھی اپنا سر پیش کر دیا ہے تو قاسمی عقیدت مند بھی شیخ زادوں کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے بلکہ شیخ زادوں میں بھی دو جماعتیں ہو گئیں جن میں سے اکثریت قاسم العلوم کے ساتھ ہو گئی۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ:

"مسجد محل سے تعزیہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ (بلکہ) شہر کی جن جن سنی مسجدوں میں سے تعزیئے اٹھتے تھے وہ سب ختم ہو گئے۔"

(سوانح قاسمی گیلانی جلد دوم صفحہ ۷۵۔۷۶۔۷۷)

اس حقیقت کی تائید سوانح مخطوطہ کے مصنف کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

لکھتے ہیں:

"انہوں نے (دیوان جی نے) اس "تعزیہ داری" کا استیصال کامل کر دیا ہے۔ آفریں بادبریں ہمت مردانہ تو۔" (سوانح مخطوطہ صفحہ ۲۲)

اندرونی خلفشار یعنی شیعیت:

جیسا کہ ہم نے ابھی واضح کیا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ میں امراء کی شیعیت کے اثرات سے بہت سے سنی بھی شیعہ ہو گئے تھے۔ اس لئے اسلام کے اس اندرونی فتنے کا دفاع جس قدر بھی ہو سکتا تھا۔ حضرت قاسم العلوم نے کیا۔ ہدیۃ الشیعہ کئی سو صفحوں کی کتاب لکھنے میں جو قاسم

العلوم نے دیدہ ریزی کی وہ شیعت کے خلاف پورا قلمی جہاد ہے۔ اسی طرح آبِ حیات بھی دراصل فتنۂ شیعیت کی اصلاح کیلئے لکھی گئی۔ اس کتاب میں قاسم العلوم نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ جو باغ فدک کے بارے میں شیعہ صاحبان کرتے ہیں۔ اجوبہ اربعین کا موضوع اور مقصد بھی شیعوں کے اعتراضات کا جواب دینا ہے۔ کتنے ہی خطوط میں اسی اندرونی خلفشار کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اورالاجوبۃ الکاملہ لکھ کر شیعہ فرقے کا رد کیا ہے۔ کہیں میرٹھ میں نواب محمد علی خان کے مکان پر مولوی حامد حسین شیعی سے باغ فدک اور دیگر شیعہ سنی اختلافی مسائل کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے مکتوب بنام حکیم ضیاء الدین صاحب ساکن رام پور منہاران میں لکھتے ہیں:

> ”بے عمامہ دار و مال چناں کہ عادت من است بر مکانے کہ مولوی عابد حسین صاحب لکھنوی شیعی فروکش بودند رفتم۔“
>
> پگڑی اور رومال کے بغیر جیسا کہ میری عادت ہے۔ اس مکان پر جہاں مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی شیعی ٹھہرے ہوئے تھے، میں گیا۔“

کہیں شیعوں کے معتقدات کے بارے میں فتویٰ پوچھنے والوں کا قاسم العلوم جواب لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ ”فیوض قاسمیہ“ مجموعہ مکتوبات کا پہلا خط اسی تفصیل میں ہے۔ کہیں سنیوں اور شیعوں دونوں کو یزید کی خلافت کے خلاف تحریری تحقیقات پیش کر رہے ہیں۔ غرض کہیں تقریر اور کہیں عملی جہاد کا ثبوت دے رہے ہیں جن کے خاطر خواہ اثرات بھی نمودار ہوئے جن میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں۔

شیعوں کا تائب ہونا۔ مولانا عبدالغنی صاحب پھلاودی کی ایک معتبر روایت:

مولانا محمد طیب صاحب لکھتے ہیں کہ مجھ سے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاڈر ضلع میرٹھ نے بیان کیا اور انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ ساکن پھلاودہ ضلع میرٹھ سے سنا جو کہ قاسم العلوم کے شاگرد اور بڑے جید عالم تھے جن کا ذکر ابھی

شاگردوں کی فہرست میں گذرا ہے۔ مولانا عبدالغنی صاحبؒ نے فرمایا کہ:

"جب حضرت نانوتویؒ مباحثہ شاہجہانپور کے لئے روانہ ہوئے تو شاہجہانپور کے قریب کسی گاؤں کے چند سنیوں نے (جو مقامی شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے بے بس تھے۔ کیونکہ زمیندارہ شیعوں ہی کا تھا) حضرت کو لکھا کہ جاتے یا آتے وقت حضرت والا اس گاؤں کو اپنے قدم سے عزت بخشیں اور ہمیں کچھ پند و نصیحت فرمادیں۔ حضرت والا نے بخوشدلی ان کی دعوت منظور فرمالی اور جاتے یا آتے ہوئے اس گاؤں اترے۔ شیعوں میں اس سے کھلبلی مچی۔ فکر یہ تھی کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے وعظ کا اثر شیعوں پر ہو جائے۔ اور شیعہ ذباؤ کی تنظیم ٹوٹ جائے۔ تو انہوں نے ان متوقعہ اثرات کی کاٹ کیلئے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلائے اور پروگرام یہ طے پایا کہ مجلس وعظ میں چاروں کونوں پر یہ چاروں مجتہد بیٹھ جائیں۔ اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے دس دس اعتراض چاروں پر بانٹ دیئے گئے کہ اثنائے وعظ میں اس طرح کئے جائیں کہ اول فلاں سمت کا مجتہد دس اعتراض کرے۔ اس سے حضرت نمٹیں تو دوسرے کونے پر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کونے کا اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض و جواب میں مبتلا کر کے وقت ختم کر دیا جائے۔ اب غیبی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنیئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات لے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن اور منشرح ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کرلی۔"

(حاشیہ سوانح قاسمی گیلانی از مولانا محمد طیب صاحب جلد دوم صفحہ نمبر ۷۰۔۷۱)

اس روایت کے راوی بے حد ثقہ ہیں۔ اس لئے روایت کے صحیح ہونے میں شبہ کی

گنجائش نہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حضرت تقریر کا لوگوں پر بے حد اثر ہوتا تھا۔ رہا یہ معاملہ کہ شیعہ علما کے اعتراضات کے بغیر ان کے بتائے جوابات دیئے گئے تو یہ اولیاء کیلئے معمولی بات ہے۔

پور قاضی کے شیعوں کا مقابلے سے فرار:

اسی قسم کا ایک واقعہ مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے والد محترم حافظ محمد احمد صاحبؒ سے اور انہوں نے دیوان محمد یٰسین صاحبؒ سے سنا کہ پور قاضی کے روافض نے مولانا کو اپنی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔ حضرت نے فرمایا کہ منظور ہے مگر اس شرط سے کہ جب آپ لوگ مجلس میں کہ سن چکیں گے تو ہم بھی کچھ کہیں گے۔ وہ اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور وہیں کچھ گفتگو کرتے ہوئے ان روافض نے کہا کہ اگر آپ بیداری میں ہم کو حضرت علیؓ کی زیارت کرادیں اور حضور اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادین کہ آپ سچ کہہ رہے ہیں تو ہم اہل سنت والجماعت میں داخل ہوجاوین گے۔ فرمایا کہ تم سب اس پر پختہ رہو میں بیداری میں زیارت کرانے کو تیار ہوں۔ مگر روافض کچھ کچے ہوگئے۔ (ارواح ثلثہ صفحہ ۲۸۲)

پور قاضی کے شیعوں کا سنیت کی طرف رجوع:

دوسری روایت مولانا محمد طاہر صاحب مرحوم سے اسی پور قاضی کے متعلق مولانا گیلانی نے سوانح قاسمی میں درج کی ہے جس کے بعض اجزاء اوپر کی روایت میں درج نہیں ہیں۔ اور اس میں شیعوں کی مجلس میں حلوے کو قبول کرنا وغیرہ ہے۔ ہم اس روایت کے بعض اجزاء کو درایت کے خلاف سمجھتے ہوئے چھوڑتے ہیں۔ آخری حصے کو لیتے ہیں۔ مولانا محمد طاہر صاحب برادر خرد جناب مولانا محمد طیب صاحب نے اپنے والد حافظ محمد احمد صاحبؒ سے سنا۔ انہوں نے فرمایا کہ:

> ''اسی (پور قاضی کے شیعوں کی) مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہوکر رسول اللہ ﷺ کی مشہور وصیت
>
> ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی

”میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی اولاد“

پر ایک مفصل ومبسوط تقریر فرمائی۔ سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لئے حضرت والا نے فرمایا علم وعمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ علم کیلئے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حرمت پاک میں نسلی مناسبت کی وجہ سے عمل کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہونی چاہئے۔“

غرضکہ حضرت قاسم العلوم نے ان کی مجلس میں تبلیغی تقریر فرما کر لسانی جہاد کا مظاہرہ کیا ہے۔ مولانا محمد طاہر مذکورہ روایت بیان فرما کر کہتے ہیں کہ والد صاحب نے بیان کیا کہ:

”اس وعظ کے بعد سے لوگوں نے توبہ کی۔“

اسی قسم کا کچھ واقعہ راقم الحروف کو کپور تھلے میں پیش آیا۔ ہوا یہ کہ رندھیر کالج کپور تھلہ میں جب میں پروفیسر تھا تو وہاں کی لائبریری میں ایک وقت میں ولایت علی صاحب بی۔اے کپور تھلہ لائبریرین تھے۔ اور عقیدۃً شیعہ تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے شبلی کے الفاروق کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت عمر جیسی جلیل القدر ہستی کو برا کہنا بے حد حماقت ہے۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے محلے میں جہاں شیعہ رہتے ہیں تقریر کریں۔ میں نے کہا مبادا فساد ہو جائے انہوں نے کہا اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ چنانچہ میں نے ان کے ”پہاڑی دروازہ“ محلے میں شیعوں کے مجمع میں صحابہؓ کے فضائل وحضرت عمر کے کارناموں اور حضرت علی کے مناقب اور خلفائے ثلثہ سے ان کے باہمی دوستانہ تعلقات پر مبسوط تقریر کی۔ الحمدللہ سب نے غور سے سنی اور کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور میں تقریر کر کے چلا آیا۔ سمجھ دار غیر متعصب شیعوں نے تقریر کو پسند کیا اور متعصبوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ فالحمدللہ میں نے سنت قاسمی پر عمل کیا۔ غرض یہ ہے کہ قاسم العلومؒ نے اس فرقے کی اصلاح میں جس قدر بھی قلمی اور لسانی جہاد ہو سکتا تھا کیا اور ایک بہت بڑا ذخیرہ اس مکتبہ فکر کی اصلاح کیلئے چھوڑ گئے۔

اصلاح امت مسلمہ کا چوتھا اقدام

۴۔ اہل حدیث کو فہمائش

۴۔ قلمی اور لسانی جہاد

ہندوستان و پاکستان میں ایک خاص نکتہ خیال ہے جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ قرآن و سنت سے آگے اور کسی کی تقلید جائز نہیں۔ وہ ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل کے مقلدین کو یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی تقلید، سنت رسول اللہ ﷺ کی وحدت کے منافی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تقلید صرف حضور پُر نور ﷺ کی ہونی چاہئے اور بس۔ اور جو صاحبان ائمہ اربعہ کی تقلید کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

اہل علم اہل حدیث ان چاروں ائمہ کے متعلق احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ لیکن عوام میں ایک متعصب طبقہ ایسا ہے جو امام ابوحنیفہؒ پر سب و شتم اور بے ادبی سے نہیں چوکتا۔ بہر حال میں نے اہل حدیث سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ کسی ایک امام کی تقلید میں محصور اور محدود رہنے کو جامد تقلید کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ میں سے جس کسی کا اجتہادی قول مناسب اور درست ہو اس کو قبول کر لینا چاہئے۔ واللہ اعلم بالصواب ان کے مکتبہ فکر کے اور کیا خیالات ہیں۔

ایک وقت تھا جب اس فرقے کو دوسرے بعض فرقے کے مسلمان اپنی مسجدوں میں نماز پڑھنے سے ابا کرتے تھے۔ اور کوئی پڑھ لے تو اس جگہ کو پانی سے دھویا جاتا تھا۔ اب اگرچہ

دھونے دھلانے کا شدید زور بظاہر کم ہو گیا ہے مگر ان دو خاص فرقوں میں ایک دوسرے پر کفر و شرک کے تیر و خنجر اور چھری کٹارے اب بھی چلتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو دونوں افراط و تفریط کے مستثنیات کے ساتھ مسلمان نظر آتے ہیں۔ علمائے دیوبند کی جماعت ایسی معتدلانہ روش رکھتی ہے کہ وہ دونوں کو مسلمان سمجھتی ہے اور دونوں میں سے کسی کو کافر نہیں کہتی۔

بہر حال مسلمانوں میں ائمہ کی تقلید کرنے والے کہتے ہیں کہ ہم میں اتنی علمی قوت نہیں کہ قرآن و سنت کے اشاروں اور مطالب کو سمجھ سکیں اس لئے تقویٰ، طہارت، پاکیزگی نفس سے متصف، علوم شرعیہ اور ان کے معاونین علوم کے ماہر قرآن و سنت کو مجتہدانہ انداز میں سمجھ کر جو بتاتے ہیں۔ ان کے علمی اعتماد اور ان کے بے مثل تقویٰ کے سبب ہم ان کی قرآن و سنت سے نکالی ہوئی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ ان کے اقوال و اعمال قرآن و سنت کے احکام کے سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم ان کی تقلید نہیں کرتے بلکہ قرآن و سنت کی ہی تقلید کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی کرنے والے حضرات جن کو مقلدین کہتے ہیں اور غیر مقلدین یعنی اہل حدیث کے درمیان موٹے موٹے اختلافات میں سے ایک تراویح کی تعداد میں اختلاف ہے۔ اہل حدیث صاحبان کہتے ہیں کہ تراویح کی آٹھ رکعت ہیں زیادہ بدعت ہیں یا کیا؟

حنفی کہتے ہیں کہ سنت رسول اللہ ﷺ کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنت رسول اللہ ﷺ میں سے بیس رکعت تراویح کو اپنے مجتہدانہ زور کے ماتحت ترجیح دی۔ اور تمام صحابہ نے اس پر اتفاق کر لیا۔ چاروں ائمہؒ نے بھی اپنے اجتہاد میں اسی کو برقرار رکھا۔ لہٰذا بیس کا متفقہ اور اجماعی فیصلہ درست ہے۔ اور یہی فیصلہ ٹھیک ہے۔

حضرت قاسم العلوم اور تراویح

حضرت قاسم العلوم نے مسلمانوں کے اس مکتبہ فکر کے ساتھ افہام و تفہیم کے روابط قائم کئے اور تراویح کے بیس ہونے کے اجماع و اتفاق صحابہؓ و ائمہؒ و صلحاؒ و علماؒ کے ضمن میں عقلی اور نقلی حیثیت سے مضامین لکھ کر ثابت کیا کہ جمہور امت نے حضرت عمرؓ کے اس طریقے کو رسول

اللہ ﷺ کی سنت قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس مکتبہ فکر کو اس باب میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے تراویح کے بیس رکعات ہونے پر قلمی جہاد کیا اور ایک بہترین رسالہ ''مصابیح التراویح'' کے نام سے تحریر فرمایا اور ان تمام فیصلوں پر جو اس کے خلاف کیے گئے ہیں۔ رد فرمایا اور اس میں اور بہت سے حدیثی مسائل کو حل کیا۔ جو مطالعہ کر کے کسی خاص فیصلے پر متفق ہو جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم ان مباحث کو حضرت قاسم العلوم کے علمی مباحث کے ماتحت ''انوار قاسمی'' جلد دوم میں انشاءاللہ تفصیل سے پیش کر رہے ہیں۔

دوسرا مسئلہ اس مکتبہ فکر سے قرأت خلف الامام (امام کے پیچھے قیام کی صورت میں سورہ فاتحہ پڑھنے) کے بارے میں اختلافی مسئلہ ہے۔

قاسم العلوم نے ایک مختصر رسالہ ''الدلیل المحکم علی قراۃ الفاتحہ للموتم'' تحریر فرمایا اور اس کے آخر میں ایک خط میاں جی گھیسا صاحب کے نام ہے جس میں تقلید اور آٹھ رکعت تراویح پر بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور رسالہ توثیق الکلام در مبحث خلف الامام تحریر فرمایا جس میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کے نہ پڑھنے پر بحث کی گئی ہے اور اس کی حقانیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ غرضکہ اس میں خاص مکتبہ فکر کے بارے میں بھی حضرت قاسم العلوم بہت کچھ مواد اپنی تحریروں میں جمع کر گئے ہیں جن کا منشاء نہایت مصلحانہ انداز میں اصلاح ہے۔

حضرت قاسم العلوم کی اختلافی مسائل میں نیک نیتی دوسرے مکاتب فکر کے لوگوں پر واضح تھی اور وہ خود اس کا اقرار کرتے تھے۔ اور متفقہ مسائل میں قاسم العلوم سے استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے مختلف مسائل میں قاسم العلوم سے باوجود اہل حدیث ہونے کے استفادہ کیا ہے۔ اور دیوبند میں جا کر ملاقات بھی کی ہے۔ اور مختلف مسائل پر گفتگوئیں کر کے استفادہ کیا ہے۔ کہتے ہم یہ ہیں کہ دوسرے مکتبہ ہائے فکر کے علماء بھی حضرت قاسم العلوم کا علمی و عملی لوہا مانتے تھے۔ اور ان کا احترام کرتے تھے۔

اصلاحِ امتِ مسلمہ کا پانچواں اقدام

مکتبہ فکر بریلی کے لئے فہمائشی جدوجہد

قلمی اور لسانی جہاد

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانے سے لے کر آج تک علمائے امت میں بہت سے علمی مسائل میں اختلافات رہے ہیں جو اپنی جگہ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔ اگر اختلاف برائے تحقیق ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ اختلاف برائے اختلاف ایک مذموم فعل ہے۔ صحابہ، ائمہ اور دیگر علماء میں تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ لہٰذا علمائے خیر کا اختلاف بھی جبکہ وہ نیک نیتی پر مبنی ہو برا نہیں ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک خاص اختلافی کڑی علمائے دیوبند اور بریلی کے درمیان ہے۔ یہ اختلاف جزئی اختلاف ہے۔ ہم اثنائے کتاب میں اس پر مفصل بحث کر چکے ہیں۔ جہاں ہم نے علمائے دیوبند کے عقائد سے بحث کی ہے۔

حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کو جن مسائل میں بھی علمائے بریلی سے اختلاف رہا ہے وہ ان کی نیک نیتی پر مبنی تھا جس میں ہوائے نفسانی اور ضد کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں ہے۔ ابتدائے کتاب میں ہم نے حضرت قاسم العلومؒ کے متعلق سرسید کا نقطہ نگاہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے حضرت قاسم العلوم کے متعلق اپنا تجربہ پیش کیا ہے اور انہوں نے صاف الفاظ میں ان کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کا اختلاف اللہ کے لئے ہوتا تھا۔ ان کی دوستی اور دشمنی

اللہ اور اس کے رسول کے لئے تھی۔

حضرت قاسم العلوم نے سنت اور بدعت کی حقیقت پر بصیرت افروز تحریری اور تقریری آثار اور یادگاریں چھوڑی ہیں۔ انہوں نے حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری کو ایک خط میں ''سنت و بدعت'' کی تحقیق میں جو نہایت محققانہ خط لکھا ہے وہ ان کی میانہ روی اور اعتدال پسندی کا بین ثبوت ہے۔ اسی طرح علم غیب کے مسئلے پر انہوں نے جو گہر افشانی کی ہے وہ مولوی عبداللطیف صاحب کے مکتوب میں پڑھیے جو فیوضِ قاسمیہ میں درج ہے۔

قاسم العلوم نے امکان و امتناع نظیر پر اپنے ایک مکتوب میں جو روشنی ڈالی ہے وہ علمی اور سنجیدہ حلقوں کے لئے تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ ہم ان مسائل کے بارے میں جلد دوم میں بحث کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت قاسم العلوم کے دور میں مولانا عبدالسمیع صاحب رامپوری (منہاران ضلع سہارنپور) مصنف حمد باری و انوار ساطعہ بریلوی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو مولانا عبدالسمیع کے خیالات قاسم العلومؒ کے متعلق برے نہ تھے۔ وجہ یہ تھی کہ قاسم العلوم کا رویہ ذاتی طور پر اس مکتبہ فکر کے علماء اور عوام کے ساتھ متشددانہ نہ تھا۔ یاد ہوگا کہ آپ کے پاس ایک دفعہ ایک بدعتی درویش جو اسی مکتبہ فکر سے متعلق تھے آئے۔ آپ نے ان کی بڑی عزت کی۔ یہ روایت ارواح ثلاثہ اور جمیل الکلام میں موجود ہے۔ بہرحال مولانا عبدالسمیع صاحب رام پوری ان کا احترام کرتے تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ملفوظات میں فرماتے ہیں:

> ''ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب میرٹھ تشریف لائے تو بعض لوگوں نے پوچھا کہ آپ مولود نہیں کرتے اور مولوی عبدالسمیع صاحب کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ:
>
> من احب شیئا اکثر ذکرہ
>
> جو شخص کسی سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے۔
>
> معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور اقدس ﷺ سے محبت زیادہ ہے۔ دعا کرو مجھے بھی زیادہ ہو جائے۔ مولوی عبدالسمیع صاحب خود مجھ سے کہتے تھے بھلا ایسے شخص سے کوئی کیا

> نزاع کرتے دیکھئے باوجود اختلاف مسلک کے کیسی خصوصیت کی باتیں ایک دوسرے کے لئے کرتے تھے۔ ان لوگوں کے دل کتنے صاف تھے۔"

(جمیل الکلام صفحہ ۴۸۔۴۹)

دیکھئے قاسم العلوم کا جواب کہ مولوی عبد السمیع صاحب کو سرکار دو عالم ﷺ سے چونکہ زیادہ محبت ہے۔ لہٰذا وہ میلاد کرتے ہیں اور مجھے زیادہ محبت نہیں۔ یہ فرما کر بحث کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ شخص چونکہ اہل علم نہ تھا اس کے لئے یہی جواب موزوں تھا۔ بہرحال قاسم العلوم اختلافی مسائل میں کسی بھی مکتبہ خیال کے آدمی کو حقارت آمیز الفاظ یا برائی سے یاد کرنے کے قطعاً روادار نہ تھے۔ جمیل الکلام اور امیر الروایات میں یہ روایت بالکل صحیح اور یقینی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ نے فرمایا:

> "مولانا فضل رسول صاحب بدایونی کو بعض لوگ ان کی بعض بدعات کی وجہ سے "فصل رسول" (صاد غیر منقوط سے جدائی کے معنی میں) کہہ دیتے تھے۔ امیر شاہ خان صاحب نے بیان کیا ہے کہ خورجہ میں ایک دفعہ ان ہی کے منہ سے "فصل رسول" نکل گیا۔ مولانا نے فرمایا کیا ان کا نام فصل رسول ہی ہے۔ عرض کیا نہیں۔ فرمایا پھر یہ کیوں کہا۔ کیا اس کو بھول گئے:

ولا تنابزوا بالالقاب

لوگوں کو برے القاب سے مت پکارا کرو۔"

دیکھئے یہ ہے حضرت قاسم العلوم کا اخلاق۔ اور اسی اخلاق کے باعث ہر مکتبہ کے اکابر ان کا احترام کرتے تھے۔ ہم ان کے مختلف مکتبہ ہائے فکر سے اختلافی مسائل کا انوار قاسمی جلد دوم میں جو آپ کی خالص علمی سوانح ہوگی ذکر کر رہے ہیں وہاں علمی نکتہ آرائیاں اور دقیق مباحث ملاحظہ فرمایئے۔

اصلاح امت مسلمہ کا چھٹا اقدام

۶۔ سرسید بانی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو

فہمائشی اور اصلاحی خطوط۔

سرسید ہندوپاک میں مسلمانوں کے متقدمین پیشواؤں اور لیڈروں میں سے ہیں۔ وہ مسلم قوم کے بے حد ہمدرد اور مفکر انسان تھے۔ ان کی زندگی کے ہمارے نزدیک دو دور ہیں۔ ایک دور وہ ہے جبکہ وہ کمپنی اور حکومت برطانیہ کے نمک خوار وفادار ملازم تھے۔ دوسرا دور وہ ہے جو پنشن کے بعد کا دور ہوتا ہے جو تمام مسلمانوں کی خدمت اور بالخصوص علیگڑھ تحریک، اردو کی ترویج وترقی اور مسلمان قوم کو حکومت کی زبان انگریزی کی تعلیم کا انتظام کرنے میں گذرا۔ یہ قومی ہمدردی اور مسلمانوں کا درد جو ان کے دل میں تھا۔ اس کو متاخرین میں سب نے ہی سراہا ہے۔ خود حضرت قاسم العلوم سرسید کے ایک خط کے جواب میں جو انہوں نے پیر جی محمد عارف صاحب کو لکھا ہے اور اپنے عقائد بیان کئے ہیں اور پیر جی محمد عارف صاحب نے وہ خط مولانا محمد قاسم صاحب کو روانہ فرمادیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

> ''پیر جی صاحب یہ گمنام کبھی کسی سے نہیں الجھتا اور الجھے بھی تو کیوں کر الجھے۔ وہ کون سی خوبی ہے جس پر کمر باندھ کر لڑنے کو تیار ہو۔ ایسی کیا ضرورت ہے کہ اپنے عمدہ مشاغل کو چھوڑ کر اس نفسانفسی میں پھنسوں۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے۔ مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن کر ان کا شاکی اور

> ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔ مجھ کو ان کی کمال دانش سے یہ امید تھی کہ میرے اس رنج کو ثمرہ محبت سمجھ کر تہہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے۔ بایں خیال کہ:
>
> گاہ باشد کہ کودک ناداں
> بہ غلط بر ہدف زند تیرے
>
> اس طرف کو دل لگائیں گے مگر ان کی اس تحریر کو دیکھ کر دل سرد ہو گیا۔ یہ یقین ہو گیا کہ کوئی کچھ کہو وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ ان کے انداز تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔ اس لئے جی میں یہ آتا ہے کہ قلم ہاتھ سے ڈال دیجئے۔ مگر کیا کروں آپ کا تقاضا جدا جان کو کھائے جاتا ہے اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ارشاد جدا ہی ڈراتا ہے۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل جب بے کہے نہ بنی تو قلم کو روک روک کر کچھ مختصر ایک بار عرض کر دینا مناسب جانا اور جی میں یہ ٹھانا کہ ہرچہ باد پھر قلم نہ اٹھانا۔ کہیں مدلل اور کہیں بے دلیل ایک بار تو اپنے مافی الضمیر کو لکھ کر روانہ کرائیے۔ اگر سید صاحب نے انصاف فرمایا تو پھر بھی دیکھا جائے گا ورنہ اپنے حق میں جابر نہیں جو مجبوری کا اندیشہ ہو۔ بہرحال بترتیب اصول مسطورہ سید صاحب یہ معروضات عرض ہیں۔" (تصفیۃ العقائد صفحہ ٦)

اب قاری اس عبارت سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم جھگڑوں سے خواہ وہ دین کے ہوں اور خواہ دنیا کے بیزار نظر آتے ہیں۔ لیکن اصلاح امت کا کام چونکہ پیغمبرانہ ہے۔ اس لئے اس سے غافل نہ ہو کر سید صاحب کو جو اصلاحی خط لکھ چکے ہیں وہ لکھنا ضروری تھا۔ وہ خط اصلاح احوال کے لئے تھا۔ کیونکہ خود مولانا حالی نے سرسید کے معتقدات کے سلسلے میں حیات جاوید میں تنقید کی ہے۔ یہ اصلاحی خط لکھ کر پیر جی عارف صاحب کو بھیجا ہے اور ان کے پندرہ اصول پر محققانہ کلام کیا ہے۔ جس اصول کو قاسم العلومؒ نے غلط سمجھا ہے اس پر فاضلانہ انداز میں فہمائش کی ہے اور منصفانہ طرز میں تردید کی ہے پھر پیر جی عارف صاحب کو لکھتے ہیں:

"مگر کچھ آپ کا اصرار اور کچھ مولانا محمد یعقوب صاحب کا ارشاد کچھ جناب سید صاحب کے اخلاق والطاف کی شہرت، نظر بریں دردمندی و محبت اسلام نے جو ہمت والوں اور خیر خواہان عالم کے ساتھ زیادہ ہونی چاہئے رہنے نہ دیا۔ پرسوں یہ خط ملا تھا بعد ظہر جواب شروع کیا تھا۔ اوقات مختلفہ میں لکھ کر اس وقت مابین ظہر و عصر تمام کیا۔ پر یہ سوچتا ہوں کہ یارب اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میرے تغیر و تبدیل والحاق و تغلیط صحیح سے دیکھئے سید صاحب راضی ہوتے ہیں یا ناخوش ہو کر درپے تردید، قلم اٹھاتے ہیں۔ مگر میں نے بھی ٹھان رکھی ہے۔ کہ ایسے جھگڑے میں پڑ کر اپنی اوقات خراب نہ کیجئے۔ ہاں اگر آثار انصاف پرستی جناب سید صاحب کی طرف سے نمایاں ہوئے اور بحکم

امرھم شوریٰ بینھم

(مسلمانوں کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے)

اپنے خیالات سابقہ و حال میں مجھ سے بھی مشورہ کریں گے تو انشاء اللہ حسب ارشاد المستشار موتمن مشورہ خیر سے دریغ نہ کروں گا۔ مگر جب اپنی حیثیت اور ان کی وجاہت پر غور کرتا ہوں تو خیال ایک آرزوئے خام نظر آتا ہے اور خود مجھ کو اپنے اس جنون پر ہنسی آتی ہے۔ خیر ہرچہ بادا باد اب تو آپ کی خدمت میں اس مسودہ ہی کو ارسال کرتا ہوں۔ پر بنظر مصلحت چند در چند یہ گذارش ہے کہ آپ بہت جلد ان اوراق کی نقل کرا کر مقابلہ کر کے نقل کو جناب سید صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیں۔ اور اس اصل کو بجنسہٖ بہت جلد میرے پاس واپس بھیج دیں۔ اور میری طرف سے بعد سلام یہ گذارش کر بھیجیں کہ اگر اثنائے تحریر میں کوئی کلمہ مخالف طبع بوجہ جہل و غفلت مجھ سے سرزد ہو گیا ہو تو معاف فرمائیں کہ ہم قصباتی انداز گفتگو سے خوب واقف نہیں۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"زیادہ حکمت بلقمان آموختن است

اللہ یھدینا وایاکم الی سواء الصراط واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔"

قاسم العلومؒ کا یہ مکتوب گرامی جب جناب سرسید صاحب کو پہنچا تو انہوں نے ایک طویل خط قاسم العلوم کو براہِ راست بھیجا جس میں مختلف خیالات کے علاوہ زمینوں اور آسمانوں کے بارے میں اور اس کے اندر دروازوں کے ہونے میں شبہات قائم کئے تھے۔ اس بات پر بھی شبہ تھا کہ ہر ایک آسمان کے درمیان دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کی مسافت کا فاصلہ فہم سے باہر ہے۔ اس لئے جس حدیث میں ایسا مذکور ہے وہ صحیح نہیں۔ غرض خود آسمانوں کے وجود اور ان کے فاصلوں کے بارے میں سید صاحب نے شبہات پیش کئے تھے۔ ان کے نزدیک سماء جو آسمان کے معنی میں ہے۔ اس کے کچھ اور ہی معنی ہیں۔ اس خط کے جواب میں قاسم العلوم نے پورا محققانہ جواب لکھا ہے۔ آغاز خط میں لکھتے ہیں:

> ”بعالی خدمت جناب سید احمد خان صاحب عافاہ اللہ وایای فی الدینا ولآخرۃ کمترین ہیچدان محمد قاسم بعد سلام مسنون گذارش پرداز ہے کہ کل دوشنبہ (پیر) کے دن دیوبند سے آپ کا وہ عنایت نامہ جس میں تیرہ سوال متعلق زمین و آسمان تھے۔ اس ہیچدان کے پاس پہنچا۔ اور باعثِ حیرت ہوا۔ وجہ سوال دیر تک سوچی کچھ میں نہیں آئی۔ تس پر آپ جیسے عاقل و فہیم و واقف کار کلام اللہ و حدیث کی طرف سے ان سوالوں کا آنا اور بھی تعجب انگیز ہے۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ کیوں اس جھگڑے میں پڑیئے اور اپنے اوقات کو خراب کرائیے پر آپ کی عنایتوں کی مکافات تھوڑی بہت ضروری سمجھ کر جواب سوالات بہ تفصیل تو نہیں لکھتا ہاں بتقریب جواب خط کچھ اشارے کئے جاتا ہوں۔“

(تصفیہ العقائد)

ان عبارتوں سے حضرت قاسم العلوم کے اصلاحی عزائم آشکار ہیں۔ آپ نے سرسید کے پندرہ اصول کے جواب میں بعض اصول سے اختلافی فہمائش کی تھی ان کے متعلق سرسید نے کچھ نہیں لکھا بلکہ ایک خط زمین و آسمان کے بارے میں لکھ کر بھیجا۔ قاسم العلوم حیرانی میں ہیں کہ آخر ان امور کے لکھنے کی کیا ضرورت پیش آئی مگر بات واضح ہے وہ اس فلسفیانہ سوال سے قاسم العلوم کی ان معلومات کو چھیڑنا چاہتے ہیں کہ جن کا جواب سرسید کو مل گیا۔ بہر حال قاسم العلوم کا کام تبلیغ اور ہدایت و اصلاح تھا وہ کر دیا۔

”بر رسولاں بلاغ باشد و بس۔“

سر سید سے خط و کتابت کا زمانہ ١٢٨٦ھ/١٨٦٦ء:

یہ خط و کتابت سر سید اور قاسم العلوم کے درمیان اس وقت ہوئی جب مولانا مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میرٹھ میں تصحیح کتب کا کام فرماتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے قاسم العلوم کے مطبع ہاشمی میں مشاغل کی نشان دہی اور سن کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''١٢٨٥ھ میں مولانا (محمد قاسم صاحب) کو حج کی پھر سوجھی۔ چند رفقا کو ساتھ لے کر حج کر آئے۔ اور منشی ممتاز علی صاحب بھی اسی سال بقصد قیام عرب کو گئے مگر ایک سال بعد واپس آئے۔ پھر مولوی صاحب دہلی گئے۔ منشی جی کا چھاپہ خانہ دہلی میں ہوا۔ منشی جی کے پیچھے میرٹھ میں مولوی محمد ہاشم صاحب کے مطبع میں کام کیا۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ٢١)

صاف واضح ہوتا ہے کہ مطبع ہاشمی میرٹھ کا کام ١٢٨٦ھ میں رہا ہے۔ اب قاسم العلوم کی وہ عبارت لیجیے جس میں انہوں نے پیر جی عارف کو لکھا ہے:

''مجموعۂ عنایات پیر جی محمد عارف صاحب السلام ؑم۔ آج بندہ درگاہ دلی سے میرٹھ واپس آیا تو مولوی محمد قاسم صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کا عنایت نامہ جو آیا رکھا تھا عنایت فرمایا۔ کھولا تو آپ کا خط اور جناب سید احمد خان کی ایک بڑی تحریر اندر سے نکلی (تصفیۃ العقائد صفحہ ٥) لہٰذا سر سید صاحب سے خط و کتابت کا سال ١٢٨٦ھ ثابت ہوتا ہے۔''

مولانا محمد حسین بٹالوی صاحب اہل حدیث کے خط کے جواب میں قاسم العلوم لکھتے ہیں:

''امروز روز چارم است کہ بروز دوشنبہ گرامی نامہ نزدم دریں شہر میرٹھ رسید۔ خواستہ بودم کہ بجرد ورود باتتثال امر سامی پر پردازم دہر چہ بذہن من رسد نوشتہ برسانم اما خطی از جانب سید احمد خان صدر الصدور بنارس مشتمل بر سیزدہ سوال متعلق بکیفیت زمین و آسمان پیشتر از نامہ گرامی رسیدہ بنادہ بود۔ اول تحریر جوابش نظر بمصلحتاء چند مناسب دیدم۔''

(قاسم العلوم نمبر ٣ مکتوب ہفتم نمبر ١)

آج چوتھا دن ہے کہ پیر کے دن آپ کا گرامی نامہ میرے پاس اس میرٹھ شہر میں پہنچا۔

> میں نے چاہا تھا کہ خط کے آتے ہی آپ کے حکم کی تعمیل کروں اور جو کچھ میرے ذہن میں آئے لکھ کر بھیج دوں لیکن ایک خط سید احمد صاحب خان صدر الصدور بنارس کا زمین و آسمان کی کیفیت کے بارے میں تیرہ سوالات پر مشتمل آپ کے خط سے پہلے ملا تھا۔ اس لئے چند مصلحتوں کی بناء پر پہلے اس کا جواب دینا مناسب سمجھا۔

اس مکتوب سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کا خط میرٹھ کے دوران قیام میں ملا ہے جو ١٢٨٧ھ کا عرصہ ہے۔ یہ وہ اصلاحی اقدامات ہیں جو قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت ایک عالم ومبلغ اندرونی خرابیوں کی اصلاحات کیلئے کئے۔ اب ہم بیرونی فتنوں کے دفاع کی طرف قارئین کو متوجہ کرتے ہیں جن کے لئے قاسم العلوم نے لسانی قلمی اور قدمی جہاد کئے۔

نواں باب:

دفاع اسلام و مسلمین

ردِ عیسائیت، قلمی، قدمی، مالی اور لسانی جہاد

اندرونی اصلاح کے ساتھ ساتھ حضرت قاسم العلومؒ نے بیرونی حملوں سے بھی اسلام کے حصار کو محفوظ رکھنے کی کمان سنبھالی اور اس اہم فریضے کی ادائی سے بھی قطعاً غافل نہ رہے جو ایک عالم دین پر عائد ہوتا ہے اندرونی اور بیرونی دفاع یوں تو دونوں ہی ایک غیور مسلمان کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں لیکن بیرونی حملوں سے اسلام کے قلعے کی حفاظت اور بھی زیادہ اہم ہے۔

عیسائیت کا ہندوستان میں غلبہ:

مسلمانوں کی یہ حد سے زیادہ بدقسمتی ہے کہ انہوں نے سلطنتِ مغلیہ کے دور میں عیسائیوں اور کمپنی کی سیاسی اور تجارتی چالوں کو نہ سمجھا۔ مسلمانوں نے کیا نہ سمجھا خود مغل حکومت نے انگریزوں کی دسیسہ کاریوں کو نظر انداز کئے رکھا۔ رفتہ رفتہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پرپُرزے نکالے اور تجارتی بھیس میں اپنی فوجی قوت بڑھانی شروع کر دی۔ پھر مسلمان، ہندو، مرہٹوں اور راجاؤں اور نوابوں سے ساز باز شروع کیا۔ رفتہ رفتہ وہ ہندوستان کی سیاست میں غالب

آ گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کو روز بروز زوال ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۰۰ء صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں اچھا خاصا اقتدار ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو انگریزی کمپنی کا خوف اس قدر چھا گیا تھا کہ ان کے خلاف کوئی بات کہنا بھی موت کو مول لینا تھا۔ اور تمام ہندوستان اب کمپنی اور انگریزوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

عیسائیت کی تبلیغ اور مبلغین عیسائی:

ہم ابتداء میں ان معاملات پر کافی روشنی ڈال چکے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے بعد جہاں انگریزوں کی حکومت کے پنجے گڑ گئے وہاں عیسائیت کی تبلیغ بھی زوروں سے ہونے لگی۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی بنا لیا جائے۔ اس مقصد کیلئے کتنے ہی بیرونی اور اندرونی پادری شہر شہر، قصبہ قصبہ تبلیغ کرنے لگے۔ ہندوؤں میں بالخصوص عیسائیت کو فروغ ہونے لگا۔ ادھر عیسائی مسلمانوں کے مذہب پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔ ان پادریوں میں جو ہندوستان میں جگہ جگہ عیسائیت کی تبلیغ کر رہے تھے یا تبلیغ کی سکیمیں بنا رہے تھے۔

۱۔ پادری رابرٹ کلارک
۲۔ پادری عماد الدین پانی پتی
۳۔ پادری کالی چرن چڑ جی
۴۔ اینڈریو گارڈنی
۵۔ پادری وارث الدین
۶۔ ٹامس ہنٹر
۷۔ پادری دینا ناتھ
۸۔ ڈاکٹر جے، سی، آر یونگ
۹۔ پادری جی ایل ٹھاکر داس
۱۰۔ ڈاکٹر تھیوڈور لائٹن پینل
۱۱۔ پادری طالب الدین بی۔ اے
۱۲۔ پادری رام چندر ماسٹر
۱۳۔ پادری نولس
۱۴۔ پادری فنڈز
۱۵۔ پادری اینک وغیرہم تھے۔

علمائے اسلام جنہوں نے عیسائیت کا مقابلہ کیا:

ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی عیسائیت کی تبلیغ میں حصہ لیتی رہی اور بعد میں بھی عیسائیت کا پرچار ہوتا رہا تو علمائے اسلام اور دردمند مسلمانوں نے ان کے رد میں کمر کسی

جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی
۲۔ مولانا آل حسن
۳۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی
۴۔ ڈاکٹر وزیر خان صاحب اکبرآبادی
۵۔ مولانا شرف الحق صاحب صدیقی
۶۔ مولانا محمد علی صاحب مونگیری
۷۔ مولانا ابوالمنصور صاحب دہلوی
۸۔ سرسید
۹۔ حالی
۱۰۔ سید امیر حسن
۱۱۔ مولانا عبدالباری
۱۲۔ مولانا محمد علی تحصیلدار
۱۳۔ مولانا شرر
۱۴۔ حکیم محمد حسن
۱۵۔ حافظ ولی اللہ
۱۶۔ مولوی حکیم عبدالرشید
۱۷۔ سید محمد حامد علی
۱۸۔ مولوی فقیر محمد
۱۹۔ مولانا عبدالوہاب
۲۰۔ مولانا عنایت رسول
۲۱۔ مولوی امان علی احمد آبادی
۲۲۔ مفتی کفایت اللہ صاحب
۲۳۔ مولوی اکرام اللہ اکبرآبادی
۲۴۔ مولوی رحم الٰہی منگلوری
۲۵۔ مولوی سید احمد حسن
۲۶۔ مولوی عبیداللہ صاحب وغیرہم

۱۸۵۷ء سے پہلے مولانا رحمت اللہ کیرانوی مشہور عالم اور مناظر نے عیسائیت کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ان مناظروں میں سے ایک مناظرہ آگرہ میں ۱۰/اپریل ۱۸۵۴ء کو مولانا رحمت اللہ صاحب کا پادری فنڈز سے ہوا اور مولانا نے اس کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اور مولانا رحمت اللہ کے شاگرد مولانا شرف الحق نے ۲۳ ستمبر ۱۸۹۱ء کو دہلی کی مسجد فتحپوری میں لارڈ بشپ جے۔ اے لیفرائے مشن کالج دہلی کو مناظرے میں شکست فاش دی اور اس نے خود شکست تسلیم کر لی ۱۳۰۰ھ تک عیسائیت کے قلعوں کو علما نے مسمار کر دیا۔ بلکہ عیسائیوں کو مسلمان کرنا شروع کر دیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے کئی میموں کو مسلمان کیا۔ ایک سوئٹزر لینڈ کا باشندہ عیسائی یہاں مسلمان ہو گیا۔ غرضکہ عیسائیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ جہاد کے بعد مولانا رحمت اللہ صاحب نے مکہ محترمہ کو ہجرت فرمائی اور پھر حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے یہ کام سنبھالا۔

ردِ عیسائیت میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند کا حصہ:

۱۸۵۷ء میں جہاں حضرت قاسم العلوم نے تلوار سے جہاد کیا وہاں عیسائیوں کے مذہب کے خلاف ۱۸۵۷ء کے بعد قلمی، لسانی اور قدمی جہاد کیا، قلم سے ان کے رد میں کتابیں لکھیں، زبان سے ان کے مذہب کے باطل ہونے پر تقریریں کیں اور قدموں سے پیدل چل چل کر ان مقامات پر پہنچے جہاں عیسائی اپنے ڈھونگ رچاتے پھرتے تھے۔ اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف عیسائیت کو چمکانے کا ارادہ کیا تھا۔ اسی طرح آریاؤں میں پنڈت دیانند کا ناطقہ بند کیا اور ہر جگہ سے اس کو بھگایا۔ اس سلسلے میں ہم آپ کے سامنے قاسم العلومؒ کی بتدریج مجاہدانہ اور مدافعانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) پادری تاراچند سے ۱۲۹۲ھ/۷۳-۱۸۷۲ء میں مناظرہ اور اس کا فرار دار الخلافہ دہلی میں مولانا محمد قاسم صاحب کا نعرہ حق:

حضرت قاسم العلوم بحیثیت مبلغ اسلام کسی معاملے میں اپنے آپ کو پابند نہ رکھتے تھے۔ وہ اللہ کے مجاہد اور مبلغ تھے۔ آج نانوتہ تو کل دیوبند، کچھ دن میرٹھ تو بعض ایام میں دہلی دین کے لئے جہاں ضرورت پڑتی دوڑ جاتے۔ اسی لئے دار العلوم دیوبند کا سب کچھ کرنے کے باوجود بحیثیت مستقل استاذ کام کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھا۔ جہاں جاتے عشاق طالب علم ساتھ ہوتے۔

جس زمانے میں میرٹھ کام کر رہے تھے پڑھاتے بھی تھے اور مختلف مطابع میں تصحیح کتب کا کام بھی کرتے رہے۔ منشی ممتاز علی کے مجتبائی چھاپے خانے میں بھی رہے اور جب وہ مطبع مجتبائی اٹھا کر دہلی لے گئے۔ تو حضرت قاسم العلومؒ بھی دہلی تشریف لے گئے اور منشی ممتاز علی کے یہاں مقیم رہے۔ یہ زمانہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ سے لے کر ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۲۹۲ھ کے درمیان یا کچھ عرصہ اول اور کچھ عرصہ بعد کا ہے۔ جو تقریباً چار پانچ ماہ کا عرصہ ہے۔ جس

میں آپ کا دہلی میں قیام رہا ہے۔ منشی ممتاز علی صاحب قاسم العلوم کے اشتہار میں لکھتے ہیں:

> ’’حسن اتفاق سے مولانا دہلی میں کیوں نہ تشریف لے آئیں اور غریب خانے پر ہی کیوں نہ قیام فرمائیں۔‘‘

اور اسی عرصے میں آپ نے قاسم العلوم کے مختلف حصص کی جو منشی ممتاز علی صاحب نے چھپوائے تھے۔ تصحیح کی ہے۔ مکتوب اول کے ٹائیٹل کی عبارت یہ ہے:

> ’’از رسائل قاسم العلوم کہ مشتمل بر دو مکتوبات است بتصحیح و تنقیح مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی بتاریخ پانزدہم ماہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ در مطبع مجتبائی از طباع یافتہ۔‘‘

قاسم العلوم کے رسائل میں سے جو دو خطوں پر مشتمل ہیں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی تصحیح اور تنقیح کے ساتھ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو مطبع مجتبائی دہلی میں طبع ہوئے۔

پادری تاراچند کا تعارف:

تاراچند دہلی کے مشہور مذہبی پادریوں میں سے تھا اور عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم تھا۔ ۸ مارچ ۱۸۲۸ء کے مناظرے میں تاراچند کے مکان پر پادری عمادالدین سے مسلمان طالب علم محمد عمر کی باتوں کا جواب بن نہ پڑا تو تاراچند پادری نے مسلمانوں سے کہا جو اس وقت محمد عمر کے ساتھ تھے کہ:

> ’’آپ لوگ ملاقات کرنے آئے ہیں یا مباحثہ کرنے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ عمادالدین اور تاراچند دونوں کو اس مناظرے میں محمد عمر طالب علم کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی۔

مولانا محمد قاسم صاحب اور تاراچند:

حضرت قاسم العلوم کا تاراچند سے مباحثے کا معاملہ اس مناظرے کے پانچویں سال بعد ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں ہوا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب ”سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا بیان:

"اسی زمانے کے درمیان (میرٹھ سے دہلی تشریف لے جانے کے عرصے) میں دہلی میں پادریوں (عماد الدین اور تاراچند وغیرہما) کے وعظ کا چرچا تھا اور مسلمانوں میں سے بعضے بے چارے اپنی ہمت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ کرتا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو اور جہاں وہ لوگ بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو۔ آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی (محمد قاسمؒ) صاحب بے کسی صورت وشکل بنائے اور اپنا نام چھپا جا موجود ہوئے۔ ایک پادری تاراچند نام تھا اس سے گفتگو ہوئی آخر وہ بند ہوا اور گفتگو سے بھاگا۔" (سوانح قاسمی)

مولوی منصور علی سے دہلی میں ملاقات:

اسی زمانے سے مولوی منصور علی صاحب دہلوی (مشہور مناظر) سے جو فن مناظرہ اہل کتاب میں یکتا ہیں ملاقات ہوئی۔ مولوی منصور علی صاحب بائبل کے گویا حافظ ہیں اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہے۔ اب ان ہی کے شاگرد بمقابلہ پادریوں کے دہلی میں وعظ کہا کرتے ہیں۔ (سوانح قاسمی)

قاسم العلوم کی فتح:

یہ عیسائی پادری سے پہلا معرکہ تھا جو گفتگو کے طور پر پیش آیا۔ تاراچند کو شکست ہوئی بند ہو گیا کا لفظ بتاتا ہے۔ کہ حضرت قاسم العلوم کی باتوں کا جواب نہ دے سکا بلکہ گفتگو سے بھاگ کھڑا ہوا یہ مناظرہ اس حیثیت سے دہلی والوں کے لئے خصوصیت اور اہمیت کا حامل تھا۔ کہ پادریوں نے دہلی میں اودھم مچا رکھا تھا اور چوکڑیاں بھرتے پھرتے تھے۔ عموماً اس زمانے کے مناظرے پھکو بازی ڈھٹائی اور جہالت پر مبنی ہوتے تھے لیکن قاسم العلوم سے علمی باتیں ہوئیں اور وہ خاموش ہو گیا۔

حضرت قاسم العلوم نے جب ان پادریوں کو یہ ڈھٹائیاں اور کلیلیں دیکھیں تو رہا نہ گیا۔ عموماً جہاں حضرت قاسم العلوم قیام پذیر ہوتے تھے شاگرد بھی ہمراہ ہوتے تھے اور درس و تدریس کا سلسلہ وہیں جاری ہو جاتا تھا۔

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زدہ بارگاہ ساخت

بہرحال شائقین علم اور عشاق شاگرد بھی خانہ بدوشوں کی طرح ہمراہ ہوتے۔ قاسم العلوم کے مکتوبات حصہ چہارم میں تین مکتوبات مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی کے نام ہیں۔ مکتوب نہم کے آغاز میں لکھا ہے:

''بجواب خط مولوی فخر الحسن صاحب مدرس مدرسہ دہلی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام مدرس کی حیثیت سے دہلی میں بھی رہا ہے۔ بہرحال قاسم العلوم کے خطوط ضروری نہیں کہ دہلی کے قیام میں لکھے گئے ہیں بلکہ پہلے لکھے گئے ہیں اور ان پر نظر ثانی دہلی کے دوران قیام میں ہوئی ہے۔ میں عرض یہ کر رہا ہوں کہ قاسم العلوم نے پہلے تو اپنے شاگردوں کو عیسائیوں کے جواب کے لئے فرمایا کیونکہ ان کو اس مقصد کیلئے مناسب سمجھا لیکن جب شاگردوں کے جوابات کا سلسلہ عیسائیوں کے مقابلے میں چل نکلا تو حضرت قاسم العلوم تک نوبت پہنچی اور اس طرح دہلی کی فضا میں اسلام اور عیسائیت علمائے اسلام اور پادریوں کے مناظرے اور مقابلے کی ٹھن گئی۔ حضرت قاسم العلوم نے اپنے آپ کو گمناموں کی طرح مناظرے میں پیش کیا اور ایسا پیش کیا کہ تارا چند مقابلہ نہ کر سکا۔ جواب سے عاجز ہو کر خاموش ہو گیا اور اس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی میں رہ کر پڑھنے والا یہ طالب علم دہلی کے مناظرے میں کامیاب ہو کر چکا اور دہلی میں فتح و نصرت کا پھریرا اڑاتا ہوا نظر ہوا۔ اور پھر کھلا کہ یہ مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔ چنانچہ مولوی منصور علی صاحب دہلوی سے اسی مناظرے کے ضمن میں ملاقات ہوئی۔

مباحثہ شاہجہانپور سال اول

قاسم العلوم کا عیسائیوں سے دوسرا مناظرہ

۱۔ مقام مناظرہ:

برلب دریائے گرا موضع سرہانگ پور متصل چاندا پور ضلع شاہجہان پور۔

۲۔ تاریخ وسنہ:

۷/۸ مئی ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ

۳۔ بانی مناظرہ:

پیارے لال کبیر پنتھی زمیندار چاندا پور

۴۔ مقصد مناظرہ:

سچے مذہب کی تلاش

۵۔ مناظرین اسلام:

۱۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ
۲۔ مولانا ابوالمنصور دہلوی
۳۔ مرزا موحد جالندھری
۴۔ مولوی احمد علی دہلوی
۵۔ میر حیدر علی دہلوی
۶۔ مولوی نعمان بن لقمان

۷۔ مولوی رنگین بریلوی ۸۔ مولانا احمد حسن امروہوی

۶۔ پادری مناظرین:

۱۔ پادری نولس ماسٹر شاہجہانپور سکول ۲۔ پادری مولا داد خان دیسی پادری
۳۔ پادری اینک، اور دیگر پادری صاحبان ۴۔ ماسٹر جوئل کرسچین شریک جلسہ

۷۔ پنڈت مناظرین ومقررین:

۱۔ پیارے لال کبیر پنتھی اور چار اور ہندو صاحبان
۲۔ پانچ آریہ صاحبان کے مناظرین

۸۔ مہتمم ومنتظم جلسہ:

مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں بن مولوی عبداللہ بن مولوی نظام الدین بن مولوی مجد الدین عرف مولوی مدن (متوفی ۱۲۲۸ھ) رئیس شاہجہانپور، آنریری مجسٹریٹ۔

۹۔ گفتگوئے مذہبی کا انجام:

مسلمانوں کی مولانا محمد قاسم صاحب کے ذریعہ فتح۔

مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی مدرس بریلی کالج نے مولانا محمد قاسم صاحب کو مناظرہ شاہجہانپور میں شرکت کی دعوت کا خط لکھا۔

نانوتے سے دیوبند کو پاپیادہ روانگی ۴ مئی کو دہلی میں تار کی آمد:

اس خط کے پہنچتے ہی مولوی (محمد قاسم) صاحب اپنے وطن (نانوتہ) سے (غالباً یکم مئی کو) پاپیادہ روانہ ہوئے اور دیوبند میں ایک شب قیام کر کے آگے کا راستہ لیا۔ مظفرنگر اور میرٹھ میں ایک ایک شب رہ کر دہلی پہنچے۔ (مولوی محمد منیر صاحب نے بحوالہ مولوی عبدالحئی صاحب انسپکٹر پولیس شاہجہانپور بے اطمینانی جلسہ کہ نہ ہوگا لکھ بھیجا اس لئے پھر لکھا گیا تو اس کے جواب میں) ۴ مئی کو اول تو ایک تار برقی آیا جس کا مضمون قریب شام یہ معلوم ہوا کہ

"ضرور ہی آؤ" اور اس کے بعد خط پہنچا کہ، آپ آئیں اور مولوی سید ابوالمنصور (ناصر الدین علی دہلوی متوفی ۱۳۲۰ھ) کو ساتھ لائیں۔ کیونکہ پادری نول (نولس) صاحب کو جو بڑے لسان اور مقرر ہیں یہ دعویٰ ہے کہ بمقابلہ دین عیسوی، دین محمدی ﷺ کی کچھ حقیقت نہیں۔ اس پر

دہلی سے قاسم العلوم کی ۵ مئی ۱۸۷۶ء کو بعد عشا روانگی اور ۶ مئی بروز شنبہ بعد عصر شاہجہانپور میں ورود:

مولوی محمد قاسم صاحب نے (دہلی سے روانگی کا) ارادہ کیا اور ۵ مئی کو بعد عشاء بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند ضلع سہارنپور و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور (ہر سہ شاگردان قاسمی) ریل پر پہنچے۔ ادھر سے حسب وعدہ مولوی سید ابوالمنصور صاحب دہلوی امامِ فنِ مناظرہ اہل کتاب بمعیت مولوی سید احمد علی صاحب دہلوی و میر حیدر علی صاحب دہلوی تشریف لائے اور رل مل کر ۱۱ بجے (شب) کی ریل میں سوار ہو کر روز (اگلی سطر سے رابطہ مضمون)

سرائے شاہجہانپور میں ارادہ قیام:

شنبہ ۶ مئی کو بعد عصر شاہجہانپور پہنچے۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے (اپنے) آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرائے میں گذر کرلو۔ علی الصباح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔ غرض مولوی صاحب سب ساتھیوں کو چھوڑ کر مولوی محمود حسن صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر چپکے سے شہر کو ہو لئے۔ قصہ مختصر رات کو ایک سرائے میں آرام فرمایا مگر ایک دو شخص کو خبر ہو ہی گئی۔ قریب دو بجے (شنبہ و یک شنبہ کی درمیانی) رات کے سرائے میں جا کر مولوی (محمد قاسمؒ) صاحب کو جا گھیرا۔ پس از اصرار ناچار مولوی صاحب ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔

صبح ۷ مئی ۱۸۷۶ء پا پیادہ قاسم العلوم کی چاندا پور کو شاہجہانپور سے روانگی:

بالجملہ مولوی (محمد قاسم) صاحب صبح کو نماز پڑھ کر پیادہ پا ہی (شاہجہانپور سے)

چاند اپور میں جا چمکے۔ خیمے پہلے سے قائم ہو گئے تھے۔ اور مولوی محمد طاہر صاحب عرف موتی میاں رئیس شاہجہانپور جو مولوی مدن صاحب کی اولاد میں سے ہیں جو مشاہیر علماء ہند میں سے تھے اور بالفعل عہدہ آنریری مجسٹریٹی پر ممتاز تھے۔ سرکار کی طرف سے مہتمم مقرر ہوئے تھے۔ اور ایک خیمہ عظیم و وسیع میں یہ مجلس منعقد ہوئی۔ اس طرح کہ بیچ میں ایک میز رکھی گئی اور اس کے دونوں جانب آمنے سامنے کرسیاں وغیرہ بچھ گئیں۔ ایک طرف پادریان عیسائی اور مقابلے میں علمائے اہل اسلام بیٹھ گئے اور بین الصفین میز کے سامنے موتی میاں صاحب کاغذ و قلمدان لے کر بیٹھ گئے اور قواعد مناظرہ لکھے۔ (میلہ خداشناسی صفحہ ۲، ۳، ۴)

میلہ خداشناسی میں قاسم العلوم کی پہلی غلغلہ انداز تقریر ۷ مئی ۱۸۷۶ء:

میلہ خداشناسی کے پہلے دن ۷ مئی ۱۸۷۶ء کو صبح کے بعد جو شرطیں طے ہو رہی تھیں ان میں قاسم العلوم نے ۱۵ منٹ کی بجائے زیادہ بڑھانے کا اصرار کیا۔ اور دو روز کی بجائے تین دن مناظرے کیلئے مقرر کرنے کو فرمایا۔ اگرچہ فریقین میں مسلمان، عیسائی اور ہندو تھے لیکن اصل گفتگو مسلمانوں اور عیسائیوں میں مقصود تھی۔ پیارے لال پنتھی کی مختصر سی تحریر اور پادری نولس کی تقریر کے بعد، مولوی نعمان خان کی نوک جھونک اور مولانا احمد حسن صاحب کے عیسائیوں پر اعتراض کے بعد ایک دیسی پادری نے کہا کہ جہاں عام ہوتا ہے وہاں خاص بھی ہوتا ہے لہٰذا جہاں تین ہوں وہاں ایک بھی ہوتا ہے اور کہا کہ اتنی بات تو ''تہذیب'' (منطق کی کتاب) میں بھی ہے۔ قاسم العلوم نے فرمایا:

''آپ کی تہذیب دانی بھی ابھی کوئی دم میں معلوم ہوئی جاتی ہے۔'' (میلہ صفحہ ۸)

مولوی احمد علی صاحب وکیل کی پادری پر جرح اور مولانا ابوالمنصور کی گرفت کے بعد تقریباً گیارہ بجے دن کے حضرت قاسم العلوم نے ایک زبردست تقریر پندرہ منٹ فرمائی جس میں اسلام کے عقائد اور حقانیت پر مدلل بیان فرما کر سامعین کو حیران کر دیا۔ لیکن یہ تقریر ناتمام تھی کہ پندرہ منٹ گذر گئے۔

یہ جلسہ ۹ بجے صبح سے دو بجے تک رہا۔ نمازِ ظہر کے بعد کھانا تناول کیا گیا اور جلسہ مناظرے کے متعلق مسلمانوں کی آپس کی تقریروں پر تبصرے ہوتے رہے۔ آج کی کارروائی

ختم ہو گئی۔

میلہ خدا شناسی میں قاسم العلوم کی تجویز اور میلہ خدا شناسی میں ۷ مئی کو عصر سے مغرب تک علمائے اسلام کی تبلیغی تقریریں:

جب قاسم العلوم نے پادریوں کے دم خم کو دیکھ لیا تو فرمایا کہ:

> ”الحمد اللہ اب ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔ مجمع پادریوں میں کوئی اس قابل نہیں معلوم ہوتا کہ جس سے بظاہر کوئی اندیشہ خاطر پیدا ہو۔“

بعدہ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے واعظین کو فرمایا کہ:

> ”میلے میں متفرق ہو کر وعظ بیان کرنا چاہئے چنانچہ واعظین نے (بجز مولوی منصور علی صاحب کے) علی الاعلان منادی اسلام وابطال عیسائیت کرنا شروع کیا اور قبل مغرب تک تمام میلے میں عجب کیفیت رہی اور عنایت ایزدی سے کوئی پادری مقابل نہ ہوا۔ خدا معلوم کہاں جان چرائے پڑے رہے۔“ (میلہ خدا شناسی صفحہ ۲۰)

الغرض حضرت قاسم العلوم کی تجویز پر تمام واعظین نے خوب خوب اسلام کی تبلیغ میں تقریریں کیں اور اسلام کی خوب خوب منادی کی اور یہ کارنامہ قاسم العلوم کے حصے میں آیا کہ وہی بڑھ چڑھ کر سب سے میلے پر چھائے رہے۔

میلہ خدا شناسی میں ۸ مئی کو صبح کے وقت ۹ بجے سے پہلے قاسم العلومؒ اور علمائے اسلام کے مواعظ:

اگلے روز ۹ بجے سے پہلے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور رفقائے مجلس مناظرہ میں پہنچ گئے۔ اور باقاعدہ جلسے کی کارروائی سے پہلے موقع پا کر حسب تجویز مولانا محمد قاسم صاحب سب نے متفرق ہو کر لوگوں میں اسلام کی تبلیغ اور منادی کی اور پھر باقاعدہ نو بجے سے جلسہ شروع ہوا۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی دوسری تقریر ۸ مئی ۱۸۷۶ء کو نو بجے صبح:

ردوکد کے بعد طے ہوا کہ مولانا محمد قاسم صاحب ہی آج پہلے اپنی تقریر شروع فرمائیں چنانچہ آپ نے کل کی تقریر کو مکمل فرمایا اور بقیہ اسلام کے عقائد اور اخلاق حسنہ محمدی ﷺ پر زبردست تقریر فرمائی جس سے تمام عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں سناٹا چھا گیا۔ مگر ایک مناظرانہ بات بھی تقریر سے پہلے فرمائی اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں سے مطالبہ ہوا کہ ہمارے کل کے اعتراضوں کے جوابات دیئے جائیں لیکن پادریوں نے کل کی بات کل کے ساتھ کہہ کر ٹال دیا تو قاسم العلوم نے اتمام حجت کے طور پر فرمایا:

> ''صاحبو! کل کے ہمارے اعتراضوں کا جواب پادری صاحب عنایت نہیں فرماتے ہم کو پادری صاحب کے انصاف سے یہ توقع نہ تھی مگر جب نہیں مانتے تو کیا کیجئے۔ بمجبوری ہم صبر کرتے ہیں اور تازہ گفتگو کی اجازت دیتے ہیں۔ ادھر (جلسے کے منصف و مہتمم) موتی میاں صاحب سے (مولانا محمد قاسم صاحب نے) یہ کہا کہ آپ اس بات کو لکھ لیجئے۔'' (میلہ صفحہ ۲۲) یہ قاسم العلوم کی صاف فتح ہے۔ انوار)

بہرحال یہ دوسری تقریر ۹ بجے کے بعد ۸ مئی کو ہوئی جو ضرورت رسالت اور افضلیت خیر البشر ﷺ پر قاسم العلوم نے فرمائی۔

قاسم العلوم کی دوسری تقریر کا اثر:

میلہ خداشناسی کے رپورٹر قاسم العلوم کی دوسری تقریر کے بعد کا اہل جلسہ پر اثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کر مولوی صاحب کی جانب تک رہا تھا۔ کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت، پادریوں کی یہ حالت کہ ششدر بے حس و حرکت۔'' (میلہ خداشناسی صفحہ ۲۵)

حضرت قاسم العلوم نے تقریر ختم کرتے ہوئے فرمایا:

''صاحبو تنگی وقت سے معذور ہوں ورنہ انشاء اللہ شام کر دیتا۔ جو کچھ کہا دریا میں ایک

> قطرہ سمجھئے۔ موتی میاں صاحب نے پکار کر کہا صاحبو! سن لو جو کچھ بیان ہوا یہ دریا میں کا ایک قطرہ ہے۔" (میلہ صفحہ ۲۶)

۳۔ قاسم العلوم کی میلہ خدا شناسی میں تیسری تقریر رد تثلیث پر فاضلانہ بیان:

۸ مئی کے صبح کے جلسے میں پادری نولس نے حضرت قاسم العلوم کے بعد تقریر کی اور تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث پر تقریر کی اور پندرہ منٹ کے بجائے تیس منٹ تک خوب زور لگایا کہ کچھ لاج رہ جائے۔ اس موقع پر خلاف اصول پادری نولس نے مزید وقت کی اجازت مانگی۔ قاسم العلوم نے دندناتے ہوئے فرمایا کہ:

> "پادری صاحب ہم آپ کی طرح نہیں کہ اجازت ہی نہ دیں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے۔ آپ پندرہ منٹ کی جگہ بیس منٹ بیان کریں۔ پچیس منٹ بیان کریں، تیس منٹ بیان کریں۔ آپ (اس سے بڑھ کر) حسب دلخواہ بیان کریں۔ ہم انشاء اللہ سب کا جواب دیں گے، تیس منٹ جب ہو چکے تب (پادری صاحب) چپکے ہوئے۔" (میلہ صفحہ ۲۷)

قاسم العلوم کی وسعت ظرفی اور مناظرانہ تدبیر دیکھئے۔ پادری کو خوب وقت دیا تا کہ انہیں بھی اتنا ہی ملے چنانچہ پادری نولس کی تثلیث میں توحید اور توحید میں تثلیث کی تقریر پر قاسم العلوم نے تیس منٹ تک ڈائس پر آ کر وہ جوابی تقریر فرمائی کہ پادری کی تقریر کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور تثلیث کی دھجیاں اڑا ڈالیں۔ اور فرمایا کہ تثلیث اور توحید دو متضاد چیزیں ہیں جو ہرگز جمع نہیں ہو سکتیں۔ الحمد اللہ کہ قاسم العلوم سب پر اس تقریر میں بھی چھا گئے۔

۴۔ قاسم العلوم کی میلہ خدا شناسی میں تیس منٹ کی چوتھی تقریر مسئلہ تقدیر پر اعتراضات کا محققانہ جواب:

اسی جلسہ میں ۸ مئی کی صبح کو اپنی تقریر میں نولس پادری نے تقدیر کے مسئلے میں اسلام پر اعتراضات کئے تھے۔ حضرت قاسم العلوم نے پادری اینک کو جس نے جواب نہ آ سکنے کا طعنہ

مسلمانوں کو دیا تھا۔ اور جو ایک دیسی پادری تھا للکارتے ہوئے اور پادری نولس کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے مسئلہ تقدیر کی حقیقت اور واقعیت پر زبردست تقریر فرمائی اور مثالوں سے تقدیر کی صداقت ثابت فرمائی جس پر سب خاموش ہو گئے اور آگے کوئی نہ بول سکا۔

ایک اور نامعلوم بڑا پادری اٹھا اور اس نے منطق کی کچھ غلط تلفظ کے ساتھ اصطلاحیں استعمال کیں اور مطلک (مطلق) اور مکید (مقید) بول رہا تھا اور منطق کے مشکل ہونے کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ تو اسی موقع پر قاسم العلوم نے فرمایا تھا:

> "تم نے منطق جاننے والے دیکھے ہی نہیں۔ تم منطق کی باتوں کے سمجھنے کو کہتے ہو۔ بفضلِ الٰہی اب بھی ایسے ایسے آدمی (اپنی طرف اشارہ کر کے فرمایا) موجود ہیں جو منطق کو نئے سر سے ایجاد کر دیں۔" (میلہ صفحہ ۳۷۔۳۸)

میلہ خداشناسی کا اختتام مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور اسلام کی سربلندی اور پادریوں کی شکست:

یہ مناظرے کا جلسہ شاہجہانپور کے ڈپٹی کمشنر یعنی کلکٹر "رابرٹ جارج گری" شاہجہانپور کی اجازت، تائید بلکہ سازش سے کرایا گیا تھا۔ پادری نولس انگریز نژاد پادری شاہجہانپور کے مشن سکول میں ماسٹر تھا اور شاہجہانپور کے ضلع میں عیسائیت کی تبلیغ بھی کیا کرتا تھا۔ چاندا پور میں بھی تبلیغ کرتا پیارے لال کبیر پنتھی کے پاس اس کا آنا جانا ہوا۔ پنتھی صاحب پادری سے متاثر ہونے لگے۔ پنتھی صاحب کے دوستوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ ہمارے ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں۔ تو انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ ایک جلسہ اپنی مملوکہ زمین اور باغات موضع سربانگ پور ملحق سوانہ چاندا پور بلب دریائے گزا کرایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے یہ جلسہ طلب کیا۔ پتہ یہ چلتا ہے کہ اس میں عیسائیوں کی سازش سے ہندو اور مسلمانوں کا اختلاف پیدا کر کے تماشہ دیکھنا اور عیسائیت کا پرچار کرنا تھا لیکن کیا ہوا جب یہ جلسہ دو دن ہو کر ختم ہو گیا تو سنئے پھر کیا ہوا۔ پیارے لال صاحب پر عیسائیوں کے مذہب کی قلعی کھل گئی۔ رپورٹر لکھتے ہیں:

"(۸ مئی ۱۸۷۶ء کو دو بجے کے قریب) میلا برخاست ہوا باہر آتے ہی مولوی محمد قاسم

صاحب کے گرد ایک ہجوم تھا۔ ہندو مسلمان سب گھیرے کھڑے تھے۔ مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی سو تھی مگر ہنود بھی بہت خوش تھے۔ آپس میں کہتے تھے۔ نیلی لنگی والے مولوی صاحب (مراد مولانا محمد قاسم صاحب) نے پادریوں کو خوب مات دی۔"

(میلہ صفحہ ۳۷)

پادریوں کا اعتراف شکست:

جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کر بولے۔ اگرچہ دشمن اپنی شکست کا اعتراف نہیں کیا کرتا لیکن جب دشمن بھی شکست کا اعتراف کر لے تو پھر فتح مبین پر فیصلہ کی مہر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ تمام ماحول پر مسلمانوں کی فتح کا پھریرا اڑتا نظر آتا تھا۔ پادریوں نے خود اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ اس جلسے کے رپورٹر مولوی محمد ہاشم اور منشی محمد حیات لکھتے ہیں کہ:

> "تھوڑی دیر کے بعد (جلسے سے) موتی میاں صاحب نے آکر فرمایا کہ پادری کہتے تھے کہ گو یہ صاحب یعنی مولوی محمد قاسم صاحب ہمارے خلاف کہتے تھے پر انصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی تقریریں اور ایسے مضامین ہم نے نہ سنے تھے۔ اور ادھر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا پادری باہم کہتے تھے آج ہم مغلوب ہو گئے۔" (میلہ صفحہ ۳۸)

پادری نولس کو قبول اسلام کی دعوت اور قاسم العلوم کا ادائی حق تبلیغ:

یوں تو قاسم العلوم نے اسلام کی کئی مرتبہ عام منادی اس جلسے میں کر دی جو عیسائیوں اور ہندوؤں سب کیلئے عام تھی لیکن کچھ خصوصی حق ادا کرنا ضروری تھا اس لئے پادری نولس کو خاص طور پر تبلیغ کرنے کے لئے آپ اس کے پاس گئے۔ رپورٹر لکھتے ہیں:

> "مولوی محمد قاسم صاحب نے موتی میاں صاحب سے کہا یوں جی چاہتا ہے کہ پادری نولس صاحب تنہائی میں ملئے اور دعوت اسلام کیجئے۔ انہوں نے پادری صاحب سے کہا ہمارے مولوی صاحب آپ سے تنہا ملنا چاہتے ہیں۔ پادری صاحب نے فرمایا بہتر ہے۔ اس کے بعد مولوی محمد قاسم صاحبؒ پادری صاحب کے خیمے میں گئے اور ان کا بیان ہے کہ میں نے پادری صاحب سے یہ کہا کہ ہم آپ کے اخلاق سے بہت خوش

ہوئے اور چونکہ اخلاق باعث محبت ہو جاتے ہیں اور محبت باعث خیر خواہی ہو جایا کرتی ہے تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ دو کلمے آپ کی خیر خواہی کے آپ سے کہیں اور آپ سنیں۔

پادری صاحب نے کہا کہئے۔ مولوی صاحب نے کہا:

''دین عیسوی سے توبہ کیجئے اور دین محمدی اختیار کیجئے دنیا چند روز ہے اور عذاب آخرت بہت سخت ہے۔''

پادری صاحب نے کہا بے شک اور یہ کہہ کر چپ ہو رہے۔

مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے کہا اگر ہنوز آپ کو تامل ہے تو اللہ سے دعا کیجئے کہ حق واضح کر دے۔ اگر آپ اخلاص سے دعا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ضرور حق کو روشن کرے گا۔ پادری صاحب نے کہا میں روز دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے دل کو روشن کر دے۔ مولوی محمد قاسم نے کہا یوں دعا کیجئے کہ ان مذہبوں میں سے جو مذہب حق ہو وہ روشن ہو جائے اور حق و باطل متمیز ہو جائے۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا۔ اور میں آپ کی اس بات کو یاد رکھوں گا۔'' (میلہ صفحہ ۳۹)

اس سے اندازہ لگایئے کہ بجائے اس کے کہ پادری صاحب یہ کہتے کہ ہمارا مذہب سچا ہے اس لئے مذہب اسلام قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن اس نے شکریہ ادا کیا اور غور کرنے کو کہا جس کے معنی صاف ہیں کہ وہ بھی دل میں اسلام کی صداقت کا قائل ہو گیا تھا۔ رہی ہدایت سو وہ اللہ کے قبضے کی بات ہے۔

ہندوؤں کی زبانی قاسم العلوم کی فتح و نصرت کی کہانی:

عیسائیوں نے حضرت قاسم العلوم کے مقابلے میں شکست کا صاف اعتراف کر لیا۔

اب رپورٹروں کی زبانی ہندوؤں نے جو تاثر لیا وہ سنئے۔ لکھتے ہیں:

''میلہ برخاست ہوا۔ اہل اسلام وہاں سے روانہ ہوئے تو میلے کے ہندو وغیرہ مناظر ان اہل اسلام کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتلاتے تھے کہ یہ ہیں تھوڑی دور چلے تھے کہ گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا۔ پاؤں میں کھڑاؤں، سر پر لمبے

لمبے بال، برہنہ سر، ہاتھ میں دست پناہ، دو چار معتقد اس کے ساتھ۔ مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا ”جے مولبی ہے“ (یہ مولوی ہے جس نے پادریوں کو شکست دی) اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب نے نظر ادھر کو پلٹی تو اس نے جو دیکھا مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے التفات سے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ اس نے جو دیکھا مولوی التفات سے جواب دیتا ہے تو وہاں سے دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیباں سے کہا تھام دے۔ اس نے اوروں کو آواز دے کر کہا تھم جاؤ۔ القصہ گاڑیاں تھم گئیں۔ جوگی صاحب بولے:

”تم نے بڑا کام کیا۔“

مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا:

”میں نے کیا کیا پرمیشر نے کیا۔“

اس نے کہا سچ کہتے ہو۔ پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا:

”جب تم نے بولی ماری تو ہم نے دیکھا اس کا یعنی پادری (نولس) کا اتنا سریر (جسم) سوکھ گیا تھا یا یوں گھٹ گیا تھا۔“

مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا تم کہاں تھے خیمے کے باہر تھے۔ جوگی نے کہا ہم بھی خیمے کے اندر تھے۔ پھر مولوی صاحب ممدوح نے فرمایا آپ کا نام کیا ہے۔ اس نے کہا جانکی داس۔ مولوی صاحب نے فرمایا:

”آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آئے۔“

اس نے کہا ہم تو تمہارے بیٹا بیٹی ہیں۔ یہ کہا اور سلام کر کے چل دیا۔“ (میلہ صفحہ ۲۹)

نولس پادری کی شکست ماسٹر جوئل عیسائی کی زبانی:

سید ظہور الدین صاحب ساکن شاہجہانپور امروہہ میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب سے کہتے تھے:

”ماسٹر جوئل جو مدرسہ انگریزی شاہجہانپور میں مدرس ہیں کہتے تھے کہ مسلمانوں میں ایک عالم (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کو) دیکھا۔ ایک اور پادری سے سید (ظہور

الدین) کہتے تھے میں نے پوچھا تم اس روز کچھ نہ بولے۔ انہوں (ماسٹر جوئل) نے کہا ہم کیا کہتے مولوی (محمد قاسم) صاحب نے کون سی بات چھوڑ دی تھی۔ ہمارے پادری نولس ہی کو جواب نہ آیا۔" (میلہ صفحہ ۴۰)

پادری اینک کا اقرار شکست اور قاسم العلوم سے تاثر:

مولوی عبدالوہاب صاحب ساکن بریلی نے پادری اینک سے مباحثہ کا حال پوچھا تو اس نے بے ساختہ کہا۔ رپورٹر لکھتے ہیں:

"کیا پوچھتے ہو ہم کو بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا اور بہت سے علمائے اسلام سے اتفاق گفتگو ہوا پر نہ یہ تقریریں سنیں نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دبلا سا آدمی میلے سے کپڑے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کچھ عالم ہیں۔ ہم جی میں کہتے تھے کہ یہ کیا بیان کریں گے یہ تو ہم نہیں کر سکتے (کہ مصلحت کے خلاف تھا) کہ وہ حق کہتے تھے پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص (مولانا محمد قاسم صاحب) کی تقریر پر ایمان لے آتے۔ اور پھر یہ کہا کہ تقدیر کے مسئلے کو پادری جب چھیڑا کرتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں رہتی۔ پادری نولس صاحب نے لاچار ہو کر یہ باتیں شروع کی تھیں۔ پر اس شخص نے ایسا ان سب کو اڑایا کہ پتا نہ لگنے دیا۔" (میلہ صفحہ ۴۰)

قاسم العلوم اوتار ہوں تو ہوں کھتریوں نے کہا:

مولوی محمد احسنؒ صاحب (نانوتوی پروفیسر بریلی کالج) سے بریلی میں رمضان خان صاحب جو اکثر ان کے مکان کے قریب مسجد میں اذان کہا کرتے ہیں۔ مسجد ہی میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے کہ:

"مولوی صاحب تو اوتار ہو گئے۔"

کھتریوں میں کچھ آدمی شاہجہانپور سے آئے ہیں۔ کیفیت مباحثہ کچھ اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ:

"مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی میلے سے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی

> ہوئی بیان کرنے کھڑا ہوا۔ ایسی تقریریں بیان کیں کہ پادریوں کو جواب نہ آیا۔ کوئی اوتار ہوں تو ہوں۔" (میلہ خداشناسی صفحہ ۴۰)

یہ تو ان اپنے اور غیروں کے بیانات ہیں جو جلسے میں اپنی آنکھوں سے قاسم العلوم کی کامرانیاں دیکھ چکے تھے۔ اب ذرا اخبار خیرخواہ عالم مورخہ ۱۹ مئی ۱۸۷۶ء بحوالہ تاریخ صفحات اردو جلد دوم حصہ اول صفحہ ۴۱۱ و ۴۴۲ بھی ملاحظہ کیجئے لکھتا ہے:

> "۸ مئی سنہ حال (۱۸۷۶ء) کے جلسے میں مولانا محمد قاسم صاحب نے درس دیا۔ اور فضائل اسلام بیان کئے۔ پادری (نولس) صاحب نے تثلیث کا بیان عجیب طور سے ادا کیا کہ ایک خط میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں۔ طول، عرض، عمق۔ سو تثلیث ہر طرح ثابت ہے۔ مولوی (محمد قاسم) صاحب نے اس (کی تقریر) کا رد، اسی وقت کر دیا۔ پھر پادری صاحب اور مولوی صاحب تقریر کے معاملے میں بحث کرتے رہے۔ اس میں جلسہ برخاست ہو گیا۔ تمام قرب و جوار اور چاروں طرف شور و غل مچ گیا کہ مسلمان جیت گئے۔ جہاں ایک عالم اسلام کا کھڑا ہوتا اس کے اردگرد ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ اول روز کے جلسے میں (۷ مئی ۱۸۷۶ء کو) جو اعتراضات اہل اسلام کے تھے ان کا جواب عیسائیوں نے کچھ نہ دیا۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کے جوابات حرف بحرف دیئے اور فتح یاب ہوئے۔"

(اخبار خیرخواہ عالم مورخہ ۱۹ مئی ۱۸۷۶ء)

شاہجہانپور کے اس مناظرے کے سب حالات سامنے آ گئے۔ اخبار خیرخواہ عالم نے ایک بات بڑے پتے کی درج کی ہے کہ شور مچ گیا کہ "مسلمان جیت گئے۔"

اب ہم تبرک کے طور پر عارف باللہ کے الفاظ میں شاہجہانپور کے اس مباحثۂ اول کا حال تحریر کرتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں۔

مباحثہ شاہجہانپور عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے الفاظ میں:

> ’’اتفاقات تقدیر سے ۱۲۹۳ھ (مطابق ۱۸۷۶ء) میں چاندا پور ضلع شاہجہانپور میں کوئی تعلقہ دار (زمیندار) ہے۔ پیارے لال۔ اصل ہندو کبیر پنتھی ہے۔ اس کو شاید میل نصرانیت کی طرف ہوا۔ اس نے ہندو پنڈت اور پادری نصاریٰ اور عالم مسلمانوں کو جمع کرنا چاہا کہ باہم ایک گفتگو ہو اور تحقیق مذہبی کا ایک میلہ قائم کیا اور میلہ خدا شناسی اس کا نام رکھا بریلی اور وہاں کے اطراف کے لوگوں نے مولوی صاحب کو اطلاع کی۔ مولوی صاحب نے سامان سفر درست کیا اور روانہ ہوئے۔ اور دہلی سے مولوی منصور علی صاحب کو بلوایا اور یہاں سے بعضے اور لوگ ساتھ روانہ ہوئے۔ شاہجہانپور پہنچے۔ اور وہاں سے اس گاؤں میں پہنچے۔ اول گفتگو کے باب میں اور اس کے وقت مقرر کرنے میں ایک بحث رہی پھر آخر گفتگو ہوئی۔ طرزِ گفتگو کی نہ تھی۔ بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا۔ ہر چند وقت مقید تھا مگر مولوی (محمد قاسم) صاحب نے ابطال تثلیث و شرک اور اثبات توحید ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ مخالف و موافق مان گئے۔ کیفیت اس جلسے کی چھپی ہوئی ہے جو کوئی چاہے دیکھ لے۔ مولانا کی تقریر اس میں مندرج ہے۔ آخر میں حسب عادت پادریوں نے بحث تقدیر پیش کی۔ پادری جب عاجز آتے ہیں۔ یہی مسئلہ پیش کیا کرتے ہیں۔ مولانا نے اس مشکل مسئلہ کو ایسا بیان فرمایا کہ ہر عام و خاص کی سمجھ میں بخوبی آ گیا۔‘‘ (سوانح قاسمی صفحہ ۲۲۔۲۳)

اگلے سال ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ میں یہی میلہ خدا شناسی پھر منعقد ہوا جس کی تفصیلات ہم آگے پیش کرتے ہیں۔

مباحثہ شاہجہانپور سال دوم

۱۹۔۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ

پار سال کی طرح منشی پیارے لال نے پھر مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے علماء پادریوں اور پنڈتوں کو دعوت دی اور اشتہار بھیجے۔ اب کی بار ۱۹۔۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۴ھ کو یہ میلہ خداشناسی منعقد ہوا۔ اس سال کے مباحثے کی پوری رپورٹ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی تلمیذ قاسم العلوم نے مباحثہ شاہجہانپور کے نام سے چھپوائی۔ وہ خود بھی اس میں شامل ہوئے تھے اور پار سال بھی گئے تھے لکھتے ہیں:

> ”یہ بھی شہرت ہوئی کہ اب کے بڑے بڑے نامی گرامی پنڈت اور پادری وہاں آئیں گے۔“ (مباحثہ شاہجہانپور صفحہ ۴)

۱۷ مارچ ۱۸۷۷ء کو شاہجہانپور میں ورود قاسمی:

بقول مولانا فخر الحسن، حضرت قاسم العلوم مولوی ابوالمنصور دہلوی اور دس بارہ اور بھی ان کے ساتھ کچھ شوقین، کچھ مناظرین دلی سے شاہجہانپور کو روانہ ہوئے۔ ۱۷ مارچ (۱۸۷۷ء) کو یہ سب صاحب تین بجے شاہجہانپور میں ریل سے اترے۔ اور مولوی حفیظ اللہ خان صاحب استقبال کے واسطے ریل پر کھڑے تھے۔

مولانا عبدالغفور صاحب کے مکان پر قیام:

سب کو مولانا عبدالغفور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے مکان پر لے گئے اور وہ مہمان نوازی کی کہ کیا کہئے۔ ۱۸ مارچ کو آرام کیا۔ ۱۹ مارچ کو مناظرین اہل اسلام آخر رات سے اٹھ کر میدان مباحثہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مولانا فخر الحسن لکھتے ہیں:

قاسم العلوم پا پیادہ میدانِ مباحثہ کی طرف:

> ''اور سب صاحب سوار مولوی محمد قاسم صاحب پا پیادہ (موضع سربا نگ پور متصل سوانہ چاندا پور ضلع شاہجہانپور) طلوع آفتاب سے کچھ بعد جا پہنچے۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے ندی پر استنجے سے فراغت حاصل کر کے وضو کیا۔ اور نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ کیونکہ مولوی صاحب دلی سے برابر یہی ہر شخص سے فرماتے آتے تھے کہ اس بے نیاز سے دعا کرو کہ کلمہ حق غالب آئے۔'' (مباحثہ شاہجہانپور صفحہ ۵)

بقول مولانا فخر الحسن صاحب شرائط طے کرنے کیلئے مسلمانوں میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور مولوی عبدالمجید صاحب، عیسائیوں میں سے پادری نولس اور پادری واکر اور ہندوؤں کی طرف سے پنڈت دیانند سرستی؛ اور منشی اندر من مراد آبادی مقرر ہوئے۔

غیر مسلموں کی کمزوری:

حق جس کے ساتھ ہو اس کو طاقت ہوتی ہے لیکن باطل قدم قدم پر گھبراتا ہے۔ شرائط میں بھی ایسا ہی ہوا۔ طرہ یہ کہ جس بات کو پادری نولس کہتا تھا۔ ہندو بھی اسی کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔

قاسم العلوم کی فتح، پادریوں کی ہٹ دھرمی پر پیارے لال کا اعتراف:

پادریوں کی پہلی شکست شرائط سے ٹال مٹول تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ آپ لوگوں کی رائے میں جو آتا ہے وہی کرتے ہیں۔ ہم سے مشورہ کرنا فضول ہے۔ تین گھنٹے سے ہم مغز مار رہے ہیں آپ ایک نہیں سنتے۔ اب جو آپ کی رائے میں آئے سو کیجئے ہم ہر طرح گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ موتی میاں نے پیارے لال صاحب سے ترش رو ہو کر کہا میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا۔ اس کے کیا معنی کہ مسلمان جو کہتے ہیں ان کے کہنے پر التفات بھی نہیں کرتے اور پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کرتے ہو۔ یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔ اس کے بعد منشی پیارے لال مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس آئے اور کہا پادری میری بھی نہیں سنتے۔ پادری

صاحب بڑے ہٹ دھرم ہیں۔ البتہ آپ سے مجھ کو توقع ہے۔ مولانا نے دو دن کی بجائے تیسرا دن مناظرے کیلئے بڑھانے کی تجویز کی کیونکہ نصف دن بے کار گذر گیا۔ اور تیس منٹ تقریر کیلئے۔

مسلمانوں کی دوسری فتح اور قاسم العلوم کی جرأت ایمانی:

منشی پیارے لال نے پانچ سوال دیئے کہ پہلے ان کا جواب دیا جائے آدمیوں کا ہجوم بہت زیادہ ہو گیا اس لئے شامیانے سے باہر میدان میں فرش ہوا۔ کرسیوں پر مناظرین اور منتظم جلسہ اور حاضرین فرش پر لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔

سوالات یہ تھے:

۱۔ دنیا کو پرمیشر نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟
۲۔ پرمیشر عادل ہے اور رحیم ہے دونوں کس طرح؟
۳۔ پرمیشر کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟
۴۔ وید اور بائبل اور قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے میں کیا دلیل ہے؟
۵۔ نجات کیا چیز ہے اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

پنڈتوں سے جوابات کو کہا گیا تو وہ پہلو تہی کرنے لگے۔ جب انہوں نے نہ مانا تو پادری نولس نے مولانا محمد قاسم صاحب سے کہا کہ آپ جوابات دیں۔ مگر انصاف اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ہم بعد میں جواب دیں کہ ہمارا دین سب سے پچھلا ہے۔ پھر پادری صاحب نے دیانند جی سے کہا۔ انہوں نے کہ جب سب کہہ لیں گے تو کہوں گا۔ اسی رد و کد میں چار بج گئے۔ پادری صاحب نے پھر مولانا محمد قاسم صاحب سے کہا کہ آپ جو وعظ کل کو کہیں گے آج کہہ ڈالئے۔ کل کو پنڈت جی سوالوں کے جواب دیں گے۔

مولانا نے فرمایا کہ مجھے تو سوالوں کے جوابات دینے میں آج بھی کوئی عذر نہیں آپ خود ایک دوسرے پر حوالہ کرتے ہیں اور نہ کوئی وعظ کی حامی بھرتا ہے۔ اچھا ٹھہریئے ہم نماز عصر پڑھ لیں۔ آج وعظ کی ابتدا بھی ہم کرتے ہیں اور کل صبح کے سوالات کے جوابات بھی ہم دیں گے۔ (انتصار صفحہ ۹۰۸)

۱۔ ۱۹ مارچ بعد عصر میلہ خدا شناسی میں قاسم العلوم کا پہلا غلغلہ انگیز وعظ:

’’عصر کے بعد نماز پڑھ کر آپ نے (ایک گھنٹے تک) ایسا زور و شور کا وعظ کہا کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا۔ اور ہر شخص پر ایک سکتے کا عالم تھا۔‘‘ (انتصار صفحہ ۹)

۱۹ مارچ بعد عصر کے وعظ کے عنوانات:

آپ نے

۱۔ خدا تعالیٰ کے وجود
۲۔ خدا تعالیٰ کی وحدانیت
۳۔ بندوں کے لئے خدا کی اطاعت کا واجب ہونا
۴۔ نبوت کی ضرورت
۵۔ نبوت کے علامات اور صفات
۶۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت
۷۔ ختم نبوت
۸۔ پیغمبر آخر الزمان کے ظہور کے بعد انہیں کے اتباع میں نجات ہے۔

ان آٹھ عنوانات پر وہ زبردست تقریر کی۔ کہ توحید کے ماتحت، تثلیث اور رام چندر اور کرشن کی خدائی کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے۔ تقریر کے دوران دلائل سے ثابت کرتے ہوئے پادریوں، پنڈتوں، عیسائیوں اور عام ہندوؤں میں ببانگ دہل ان الفاظ میں آپ نے منادی فرمائی اور حق تبلیغ ادا فرمایا کہ:

’’ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اس زمانے میں سوائے اتباع محمدی ﷺ اور کسی طرح نجات نہیں ہو سکتی۔ اس زمانے میں (پیغمبر اسلام کی نبوت کے دعوے کے بعد قیامت تک) یہ دین سب کے حق میں واجب الاتباع ہے۔‘‘ (مباحثہ صفحہ ۳۱)

۲۔ قاسم العلوم کی دوسری تقریر پادری محی الدین پشاوری کے اعتراضات کے جواب میں:

پادری محی الدین پشاوری نے قاسم العلومؒ کی تقریر پر تو کوئی اعتراض نہیں کیا البتہ

خارجی طور پر چار اعتراض کئے۔

اول یہ کہ عصمت انبیاء غلط ہے۔

دوم قرآن کریم سے معجزے کا ثبوت نہیں دیا گیا۔

نمبر تین یہ کہ آپ کہتے ہیں کہ ہر گروہ میں نبی آنا چاہئے تو پیغمبر اسلام سے پہلے عرب میں کون پیغمبر آیا۔

چوتھے یہ کہ:

کما صلیت علی ابراھیم

سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

ان اعتراضات کے جواب میں عصر کے بعد ہی مولانا محمد قاسم صاحب نے وہ داندان شکن جواب دیئے کہ مجمع محوِ حیرت ہو گیا۔ تقریر فرما رہے تھے کہ پادری نولس نے کہا کہ دس منٹ ہو چکے ہیں اور بیٹھتے ہوئے فرمایا:

قاسم العلومؒ: تنگی وقت سے مجبور ہوں ورنہ جواب اعتراض رابع موجود ہے۔ آپ ایک ایک اعتراض کرتے جایئے اور جواب لیتے جایئے۔ بہت سے اعتراض اکٹھے ہو جاتے ہیں تو بہ وجہ تنگی وقت جواب میں دقت پڑتی ہے۔ کیونکہ اعتراض میں تو کچھ دیر نہیں لگتی۔ البتہ جواب کے لئے زمانہ واسع چاہئے۔

پادری محی الدین: حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زنا اور بت پرستی کا بیان گو قرآن میں نہیں پر بائبل یعنی تورات و انجیل و زبور میں یہ افسانے موجود ہیں اور قرآن میں بائبل کی تصدیق موجود ہے۔

قاسم العلومؒ: قرآن شریف میں بے شک تورات و انجیل کی تصدیق ہے مگر اس تورات و انجیل کی تصدیق ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس تورات و انجیل کا مذکور نہیں جو آپ صاحبوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ اس میں تحریف یعنی تغیر و تبدل

واقع ہو چکی ہے۔

پادری محی الدین: جھلا کر آپ تحریف ثابت کر دیں۔

امام ابو المنصور: فلاں جگہ یہ عبارت ہے اور فلاں فلاں پادری نے لکھا ہے کہ پرانی انجیل میں یہ عبارت نہیں۔

پادری محی الدین: یہ تحریف نہیں کمی بیشی ہے۔

قاسم العلوم: تحریف نہیں کمی بیشی ہے۔ تب بھی ہمارا مطلب ہاتھ سے نہیں جاتا کہ تورات و انجیل قابل اعتبار نہیں۔

پادری نولس: (اقرار تحریف کرتے ہوئے بولے) بے شک بائبل میں یہ فقرہ الحاقی ہے۔

قاسم العلوم: تو بائبل سے نکال ڈالئے اور عقیدہ تثلیث سے توبہ کیجئے۔

پادری جان ٹامسن: ہم کو اس مضمون (تثلیث) کی تعلیم اور طریقے سے ہوئی ہے۔

قاسم العلومؒ: (پادری نولس سے خطاب کرتے ہوئے) اگر ایک پیالے پانی میں ایک قطرہ پیشاب گر جائے تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک بنا دیتا ہے۔

دوسری مثال: اگر کوئی شخص حسن میں یوسف ثانی ہو، مگر اس کی ایک آنکھ کانی ہو تو اس کا ایک عیب ساری خوبیوں کو خراب کر دے گا۔

تیسری مثال: اگر کسی دستاویز میں ایک جگہ مخدوش ہو تو ساری دستاویز مخدوش ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک یا چند تحریفوں سے ساری بائبل نا قابلِ اعتبار ہو جائے گی۔

قاسم العلوم: شاہجہانپور کے ہندو منصف کی طرف متوجہ ہو کر جو سامنے بیٹھے تھے۔ نولس صاحب سے فرمایا کہ اس مقدمے میں ہمارے آپ کے حکم منصف صاحب ہی رہے۔ کیوں منصف صاحب آپ ہی فرمائیں:

منصف صاحب: تبسم کر کے، دعویٰ ڈسمس، دستاویز مسترد، مدعی اور گواہوں کو چودہ چودہ برس کی قید (یہ بات انہوں نے قریب کے لوگوں سے کہی)

(مباحثہ صفحہ ۴۲۔۴۳۔۴۴)

قاسم العلوم کی فتح اور ہندو منصف کا ذاتی فیصلہ:

اس مکالمے اور مباحثے کے بعد رپورٹر مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی شاہجہانپور کے ہندو منصف صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

> ”مولوی محمد قاسم صاحب نبوت کے متعلق تقریر بیان کر رہے تھے جو میں بھی ان کے وعظ میں پہنچ گیا۔ مجھ کو وہ تقریر بہت پسند آئی۔ اس کے بعد تو انہوں نے پادری کو ایسا ذلیل کیا کہ:
>
> ”غیرت ہو تو منہ نہ دکھائے۔“

اس ۱۹ مارچ ۱۸۷۷ء کی عصر اور مغرب کی اس نشست کے آخر کا حال رپورٹر اس طرح لکھتے ہیں:

مسلمان کامیاب اور پادری لاجواب اور ذلیل ہوئے:

پادری صاحبوں کو جواب نہ آیا اُدھر وقت مغرب بھی آ گیا تھا جلسہ برخاست ہوا۔ دوبار کے بعد پادری محی الدین پھر نہ اٹھے ایک بار کسی قدر آمادہ بھی ہوئے مگر اور پادری گھورنے لگے مولوی منصور علی صاحب نے کہا ان (پادری محی الدین) کو پھر مت کھڑا کرنا نہیں تو پھر اسی طرح فضیحت کرائیں گے۔ رہے ہنود ان میں سے کوئی صاحب اس جلسے میں اول سے آخر تک بولا نہیں خیر وقت غروب آفتاب جلسہ برخاست ہوا۔ اہل اسلام شاداں وفرحاں اپنی فرودگاہ پر آئے۔ (یعنی جیت کر آئے۔ انوار) (مباحثہ صفحہ ۴۴)

۱۹ مارچ ۱۸۷۷ء بعد مغرب قاسم العلوم کی مصروفیت اور جائے قیام پر مذاکرہ:

ایک عالم صاحب اسی روز بعد نماز مغرب آئے اور قاسم العلوم سے

کما صلیت علی ابراهیم

کے بارے میں پوچھنے لگے تو مغرب کے بعد آپ نے اس مسئلہ پر پوری بصیرت سے روشنی ڈالی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی افضلیت پر مدلل تقریر فرمائی کہ اسی اثناء میں پیارے لال آئے۔ اور پادری اسکاٹ کے پہنچ جانے کی اطلاع دی اور یہ کہا:

منشی پیارے لال: پادری اسکاٹ درس کیلئے ایک گھنٹہ کی تجویز کرتے ہیں۔ مجھے پادری نولس نے بھیجا ہے۔

حضرت قاسم العلوم: ہم کو منظور نہیں۔ ہم نے تین گھنٹے تک مغززنی کی...... مگر پادری صاحب نہ مانے...... ہم پادری صاحب کے محکوم نہیں۔ پادری صاحب اس میلے کے حاکم نہیں کہ جو وہ چاہیں سو ہو...... ہم کو ایک گھنٹے سے انکار نہیں پر پادری صاحب کو ذرا شرمانا بھی چاہئے۔ مجھ کو ان کا شرمانا منظور ہے۔ اول ان کو شرما کر پھر اجازت دی جائے گی۔ حضرت قاسم العلوم کی فراست قلبی سے سمجھنے پر کہ وہ تو یہ بھی کہیں گے کہ پادری اسکاٹ بھی حصہ لیں گے۔

منشی پیارے لال: ہاں وہ اس بات کے بھی خواستگار ہیں۔

حضرت قاسم العلومؒ: اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ ان کو سنا دیں۔ باقی جو کچھ ہوگا وقت پر دیکھا جائے گا۔ منشی صاحب آپ نے دیکھا پادری صاحب نے کیسے کیسے حیلے بہانے کئے۔ اور کس کس طرح اہل اسلام کو اظہار مطالب اور اثبات مدعا سے مجبور کرتے ہیں۔ کہیں کہتے ہیں دو روز سے زیادہ مباحثہ نہ ہو۔ کبھی فرماتے ہیں چار منٹ حد نہایت بیس منٹ سے زیادہ درس کے لئے وقت نہ دیا جائے۔ کوئی پادری صاحب سے پوچھے کہ پہلے سے کون اپنے مطالب کو ناپ تول کرلاتا ہے...... جس کے مذہب میں ہزاروں فضائل ہوں وہ اتنے تھوڑے عرصے میں کس طرح بیان کر سکتا ہے۔

پادری نولس کی گھبراہٹ منشی صاحب کا اعتراف:

منشی پیارے لال نے مولانا سے کہا واقعی اتنا ہم کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ پادری

(نولس) صاحب آپ سے گھبراتے ہیں اور ان میں آپ کے مقابلے کی طاقت معلوم نہیں ہوتی۔

قاسم العلوم: ہمیں آپ سے شکایت ہے کہ پادریوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں آپ کے بلائے ہوئے مہمان ہیں۔

قاسم العلوم کی اخلاقی فتح اور پادریوں کی شکست:

پیارے لال: پادری صاحبوں سے ناخوشی کا اندیشہ ہے۔ ڈرتا ہوں ناخوش ہو کر چلے نہ جائیں اور آپ کے اخلاق سے اس بات کا اندیشہ نہیں۔

موتی میاں: مولانا محمد قاسم صاحب سے اپنے خیمے میں فرمانے لگے کہ پنڈت دیانند اور منشی اندرمن آپ کی اور مولانا منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور آپ دونوں صاحبوں کی تقریر اور علم کے بہت مداح تھے۔

موتی میاں کی مہمان نوازی:

پچھلے سال کے میلے پر منشی صاحب نے کتنے سو مہمانوں کی میزبانی کی تھی۔ آج بعد مغرب موتی میاں نے پر تکلف کھانا کھلایا۔ بعد ازاں عشاء کی نماز پڑھی اور سب سو گئے۔

(مباحثہ شاہجہانپور صفحہ ۴۹)

۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء مباحثے کا دوسرا دن

برلب دریائے گرا موضع سربانگ پور ملحقہ سوانہ چاندا پور ضلع شاہجہانپور واقع ہوا آج مباحثہ کا دوسرا دن ہے۔

شرکائے جلسہ علمائے اہل اسلام:

۱۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
۲۔ مولانا امام ابوالمنصور دہلوی
۳۔ مولوی عبدالمجید صاحب

شرکائے جلسہ پادری صاحبان:

۱۔ پادری نولس
۲۔ پادری اسکاٹ
۳۔ پادری محی الدین
۴۔ پادری ٹامس
۵۔ پادری واکر وغیرہم

شرکائے جلسہ پنڈت صاحبان:

۱۔ پنڈت دیانند
۲۔ پنڈت منشی اندرمن مرادآبادی وغیرہم

پہلا اجلاس:

صبح کے وقت ساڑھے سات بجے سے گیارہ بجے تک۔

دوسرا اجلاس:

ایک بجے کے بعد سے چار بجے تک۔

نتیجہ مباحثہ:

پادری بھاگ کھڑے ہوئے اور دو کتابیں بھی چھوڑ گئے۔ رہے پنڈت تو وہ کسی گنتی ہی میں نہ تھے۔

جلسے پر غلبہ:

تمام جلسے پر قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحب کا غلبہ رہا۔

گذشتہ ۱۹ مارچ کے جلسوں میں قاسم العلوم کی تین تقریریں پہلی ابتدائی اور دو جوابی ہو چکی ہیں۔ آج دوسرے دن ۲۰ مارچ کو ساڑھے سات بجے لوگ جمع ہو گئے۔

پادری نولس: مولانا محمد قاسم صاحب سے مخاطب ہو کر۔ وقت وعظ بڑھا دیا جائے اور ہماری طرف سے پادری اسکاٹ درس دیں گے۔

مولانا محمد قاسم صاحب: کل ہم بہ ہزار منت آپ سے اس بات کے خواستگار رہے کہ کم سے کم درس کیلئے ایک گھنٹہ عنایت کیجئے۔ ہماری التماس اور عجز و نیاز پر تو آپ نے نظر نہ فرمائی۔ آج اگر کسی کے کہنے سننے سے اپنا نفع نظر آیا تو آپ ہم سے اسی بات کے خواستگار ہوتے ہیں جس کا ہم سے انکار کر چکے ہیں۔ جو ہو چکا سو ہو چکا اب کیا ہوتا ہے۔ یہ بات وقت تجویز شرائط کے ساتھ گئی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ورنہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم باوجودیکہ رکن مباحثہ ہیں۔ مباحثے کے حساب سے کالعدم ہیں جو کچھ ہوئے آپ ہی ہوئے۔

پادری لونس: آپ پادری اسکاٹ صاحب سے ڈرتے ہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب: میں تو خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ صاحب کا استاد ہوں۔ تو ان میں سے بھی نہ ڈروں۔ بلکہ انشاء اللہ تعالیٰ تمام پادری بھی اکٹھے ہو جائیں تو نہیں ڈرتا۔ مجھ کو فقط یہ جتلانا تھا کہ بات کو مقرر کرا کر کون قائم رہتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔ ہمارا تو یہ قول ہے کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ،

دو گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس کیلئے مقرر کریں جس کو چاہیں درس کیلئے تجویز کریں ہم ہر طرح سے موجود ہیں۔ پر آپ کی طرف سے پادری اسکاٹ صاحب داخل مناظرہ کئے جاتے ہیں تو ہم جناب مولوی صاحب کو شامل کریں گے۔

کل جو سوالات منشی پیارے لال نے پیش کئے اس کے جواب کے لئے کون پہل کرے سب پیچھے ہٹتے تھے۔ قاسم العلوم نے چند بار فرمایا کہ اگر اور صاحب اول کھڑا ہونے سے گھبراتے ہیں تو مجھ کو اجازت ہو میں سب میں اول کھڑا ہوتا ہوں۔

پادریوں کی ایک اور قلابازی:

پھر یہ جھگڑا ہونے لگا کہ پہلے کس مضمون پر تقریر ہو۔ پادریوں نے کہا کہ منشی صاحب کے چوتھے سوال پر گفتگو ہونی چاہئے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا اگر بلحاظ اثبات و تحقیق مذہب ہے اول ذات باری میں گفتگو ہونی چاہئے۔

آخر فیصلہ ہوا کہ اس سوال پر گفتگو ہونی چاہئے کہ:

”خدا نے دنیا کو کب پیدا کیا اور کاہے سے پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا۔“

پادری اسکاٹ کی تقریر:

پادری صاحب نے اوٹ پٹانگ تقریر کی اور کہا کہ خدا نے دنیا کو نیستی سے پیدا کیا۔ اپنی قدرت سے پیدا کیا وغیرہ وغیرہ۔ (مباحثہ شاہجہانپور صفحہ ۳۔۵ سے ۵۴ تک)

مولانا محمد قاسم کی مجلس مباحثہ میں چوتھی تقریر:

مجلس مباحثہ کے رپورٹر مولانا فخر الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ پادری اسکاٹ کی اوٹ پٹانگ تقریر کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب کھڑے ہوئے اور فرمایا:

”پادری صاحب سوال کا مطلب ہی نہ سمجھے۔ سائل کا یہ مطلب ہی نہیں کہ موجود ہونے

سے پہلے معدوم تھا یا نہ تھا یا خدا نے جو عالم کو پیدا کیا تو اس کے بنانے میں قدرت سے یا اور کسی آلہ سے کام لیا۔ اگر یہ مطلب معلوم ہوتا تو البتہ پادری صاحب کا یہ جواب مطابق سوال ہوتا۔ سائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مادہ عالم کیا ہے۔ خداوند عالم نے عالم کو کس مادہ اور کس اصل سے بنایا۔

پادری اسکاٹ کی بھد:

یہ کہہ کر منشی پیارے لال اور لالہ مکتا پرشاد وغیرہم کی طرف متوجہ ہو کر مولانا محمد قاسم صاحب نے سوال کا ارادہ کیا ہی تھا کہ لالہ مکتا پرشاد نے کہا۔ ہاں مولوی صاحب یہی مطلب ہے جو آپ نے بیان کیا۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ جب پادری صاحب مطلب سائل ہی نہ سمجھے تو ان کا جواب سراسر لغو ہو گیا۔ سوال از آسماں جواب از ریسماں اسی کو کہتے ہیں۔ ہاں جواب سوال ہم بیان کرتے ہیں۔ حاضران جلسہ متوجہ ہو کر سنیں۔ اس کے بعد آپ نے تقریر فرمائی جس میں تفصیل سے مذکورہ بالا سوال کا جواب دیا۔

قاسم العلوم کی تقریر اتنی عالمانہ تھی کہ ہندوؤں کی تسلی ہو گئی۔ کیونکہ یہ سوالات انہی کی طرف سے تھے۔

تقریر قاسمی پر مکتا پرشاد کے ریمارکس:

جب مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی فاضلانہ تقریر میں سوال مذکور کا مدلل جواب دیا تو مکتا پرشاد صاحب نے کہا:

"جواب اس کو کہتے ہیں اور جو کچھ کہا بجا کہا۔" (مباحثہ صفحہ ۶۰)

مولانا محمد قاسم صاحب کی پانچویں جوابی تقریر:

پنڈت دیانند نے کہا کہ پرمیشور نے مادے سے پیدا کیا ہے وہ مادہ قدیم ہے۔ البتہ ہم دنیا کو قدیم نہیں کہتے۔ اس پر حضرت مولانا نے جوابی تقریر فرمائی اور مادے کے حادث ہونے کو مدلل طور پر ثابت کیا۔ یہ دس منٹ کی تقریر تھی۔

اس کے بعد پنڈت دیانند نے تقریر کی اور تقریر قاسمی پر اعتراض کیا۔ حضرت قاسم العلوم پھر جواب دینے کو کھڑے ہوئے لیکن پنڈت صاحب نے کہا اب وقت ختم ہو گیا۔ گیارہ بج گئے۔ اب بھوجن کا وقت ہے۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی چھٹی تقریر:

پنڈت جی تو بھاگ گئے۔ منشی پیارے لال اور دیگر صاحبان موجود تھے لہٰذا آپ نے گیارہ بجے کے بعد پھر مختصر سی تقریر کی۔ اور پنڈت صاحب کے اعتراض کا جواب دیا۔

منشی پیارے لال: آپ یہ تقریر پنڈت دیانند کو سنا دیجئے۔ شاید وہ اس پر اور کوئی اعتراض کریں۔

مولانا محمد قاسم صاحب: ہم نے آپ سے ایک گھنٹے کی اجازت لے کر ایک گھنٹے تک اپنے مذہب کے فضائل اور اس کی حقانیت خارج از جلسہ چار بجے کے بعد بیان کئے تھے تو اس کی یہ وجہ ہوئی تھی کہ آپ جلسے میں اتنا وقت نہ دیتے تھے کہ کوئی دل کھول کر فضائل بیان کر سکے جب ہم نے آج آپ کو وقت میں وسعت دیدی تو خارج از جلسہ تکلیف کرنے سے کیا فائدہ؟

پادری لونس: اب تو آپ مہربانی کر کے اس بات کو قبول ہی کر لیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب: بہت بہتر اگر پادری صاحب درس دیں گے تو ہم بھی انشاء اللہ سنیں گے۔

پادری لونس: آپ اعتراض کریں گے۔

مولانا محمد قاسم صاحب: اگر اعتراض کی ضرورت ہوگی تو بے شک اعتراض کریں گے۔

پادری لونس: اعتراض کے لئے آپ کو کتنا وقت چاہئے۔

مولانا محمد قاسم صاحب: وقت کی تحدید کے کیا معنی پہلے سے کون شخص اپنے مطلب کو ناپ تول کر لاتا ہے جو اس کے موافق وقت مقرر کیا جائے۔ وقت اگر مقرر کیا جاتا ہے تو اس اندیشے سے کیا جاتا ہے کہ مبادا کوئی شخص مفت مغز زنی کرنے لگے۔ اگر وقت محدود رکھا جائے گا تو ایسا شخص بے وجہ مغز کھائے گا۔ اور اس کے سوا کسی کو بولنے کی گنجائش نہ ملے گی۔ مگر آپ ہی انصاف سے

فرمائیں کہ میں کون سی بات لغو اور بے ہودہ کہتا ہوں جو آپ میرے لئے وقت کو محدود کرتے ہیں۔

پادری لونس: اچھا آپ کے لئے وقت کی کچھ تحدید نہ سہی مگر دوسرے پادری کے کہنے پر کہ وقت محدود ہونا چاہئے۔

پادری نولس نے کہا اچھا آپ کے لئے بیس منٹ اور اوروں کے لئے دس منٹ۔

موتی میاں: مولانا محمد قاسم صاحب اثنائے طعام میں مخاطب فرما کر کہنے لگے۔

پادری اسکاٹ کی زبان پر قاسم العلوم کی فضیلت کا اقرار:

پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں۔ یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے۔

مولانا فخر الحسنؒ رپورٹر۔ اثنائے جلسہ میں جب مولانا محمد قاسم صاحب کھڑے ہوتے تھے تو تمام جلسے میں ایک سکتے کا عالم ہو جاتا تھا۔ اور جب کسی تقریر سے فارغ ہوتے تھے تو اکثر صاحبوں کی زبان سے صدائے تحسین و آفرین سنائی دیتی تھی۔

غلبہ اہل اسلام:

غرض غلبہ جانب اسلام ایسا نمایاں تھا کہ بجز ناانصاف حاضرین جلسہ میں سے کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ مولانا محمد قاسم صاحب کی عاجزی کا ثمرہ تھا۔ جب سے شاہجہانپور کا ارادہ کیا تھا۔ برابر لوگوں سے دعا کو کہتے تھے۔ (مباحثہ صفحہ ۶۷، ۶۸، ۶۹)

دوسرے دن ۲۰ مارچ کو تیسرا جلسہ

بعد نماز ظہر ایک بجے کے بعد

مولانا محمد قاسم صاحب کا سفرناظرہ بزر قرض:

مولانا محمد قاسم صاحب کی خواہش تھی کہ جلسہ تیسرے دن بھی ہو لیکن نولس صاحب جان چھڑانے کی کوشش میں تھے۔ پہلے روز انہوں نے کہا زیادہ فرصت نہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب: باوجود افلاس و بے سروسامانی قرض دام لے کر اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر ایک مسافت دور دراز قطع کر کے یہاں تک پہنچے پھر اس پر یہ قول ہے کہ ہمیں فرصت نہیں ہم تو جب تک حسب دلخواہ فیصلہ نہ ہو جائے گا نہیں جائیں گے۔

ایک بجے کے بعد اسی جھگڑے میں ڈیڑھ بج گیا کہ گفتگو کس سوال پر ہو۔ پنڈت اور پادری اس بات پر متفق ہو گئے کہ پانچویں سوال پر ہو کہ نجات کیا ہے اور کس طرح حاصل ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے فرمایا چوتھے عنوان پر بھی ہو کہ وید، بائبل اور قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے مگر نجات کے عنوان پر ہی پنڈتوں اور پادریوں کے مطابق فیصلہ ہوا۔ یہ بھی طے پایا کہ جلسہ ساڑھے چار بجے تک جاری رہے۔

تقریر پادری اسکاٹ:

انہوں نے کہا کہ نجات گناہوں سے بچنے کو کہتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ نے دیکھا کہ تمام دنیا گناہوں میں مبتلا ہے تو خود مسیح کی شکل میں آیا اور پھانسی چڑھ کر سب لوگوں کا کفارہ بن گیا۔

تقریر پنڈت دیانند:

پنڈت جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مکت یعنی نجات اس میں ہے کہ آدمی گناہوں سے بچے اور نیک کام کرے۔ خدا مسیح کی شکل میں نہیں آسکتا۔ عیسائی مذہب میں نجات کسی طرح نہیں ہوسکتی۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی میلے میں پانچویں تقریر کہ نجات اسلام میں ہے:

ان دونوں کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ دونوں صاحبان نے نجات کے معنی غلط سمجھے ہیں۔ بلکہ نجات قہر الٰہی اور عذاب الٰہی سے بچ جانے کو کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ گناہ خلاف مرضی الٰہی کو کہتے ہیں اور اس کی مرضی کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس نے اپنے انبیاء کے ذریعہ اپنی مرضی بتائی۔ اور آخری مرضی پیغمبر اسلام کو بتائی۔ لہٰذا پیغمبر اسلام پر ایمان لانے میں نجات ہوگی اور اس کے بغیر نجات ناممکن ہے۔ کیونکہ آپ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

اس مذہب میں کیسے نجات ہوسکتی ہے جس میں تین خدا ہوں یا جس مذہب میں رام چندر اور کرشن کو خدا مانا جاتا ہو۔ عقلائے فرنگ کی عقل پر افسوس ہوتا ہے کہ اتنی موٹی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ خدا تین نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ ایک اور تین متضاد باتیں ہیں۔ بھلا عاقلان فرنگ کو کیا ہوگیا کہ اجتماع نقیضین کو نہیں سمجھ سکتے۔ خدا محتاج نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انسان محتاج ہیں۔

پادری اسکاٹ: جب تک عیسائیوں کی علمداری نہ تھی ہندوستان میں لوٹ، چوری فتنہ و فساد تھا۔ جب سے انگریز آئے ہیں اور عیسائیوں کی عملداری آئی گناہوں میں کمی آگئی۔

مولانا محمد قاسم صاحب: پادری اسکاٹ صاحب کی معقول دانی پر یہ استدلال کمال تعجب انگیز ہے۔ جب سے عیسائی حکومت ہوئی ہے اتنا زنا بڑھ گیا ہے کہ کبھی نہ تھا۔

لندن اور انگلستان کا حال تو پوچھئے ہی نہیں۔ کیا پادری صاحب کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں کہ وہ کیا لکھتے ہیں۔ ہر روز کئی سو حرامی بچے پیدا ہوتے ہیں اور صبح کو راستوں پر پڑے ہوئے ملتے ہیں۔

پادری محی الدین: ہم حضرت عیسیٰ کو انسان کامل اور معبود کامل دونوں کہتے ہیں۔ جہت الوہیت کی وجہ سے تو قدرسیت کے اوصاف ہیں اور جہت انسانیت سے بھوک پیاس وغیرہ۔

مولانا محمد قاسم صاحب: (کی چھٹی تقریر) یہ مہمل بات ہے۔ جس طرح باپ، بیٹا اور بیٹا باپ، بندہ خدا اور خدا بندہ عابد معبود اور معبود عابد نہیں ہوسکتا اسی طرح انسان خدا اور خدا بندہ نہیں ہوسکتا۔ وہ محال ہے تو یہ بھی محال ہے۔

پھر پیشاب پاخانے کے ہونے کی وجہ سے انسان کے ساتھ خدا بھی ناپاک ہوگا۔ کیونکہ ایک ہی ذات میں یہ دونوں باتیں ہونے کے باعث ایک کی نجاست دوسرے کو لگ جائے گی اور خدا گندگی سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔ لہٰذا خدا ایک ہی ہوسکتا ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں۔

اس تقریر کے جواب کا کسی پادری کو حوصلہ نہ ہوا۔ البتہ پادری نولس چیخ چیخ کر اپنے مذہب کے فضائل بیان کرنے لگے جو پہلے بیان کئے تھے اور ان کی تردید بھی ہوچکی تھی۔

ایک پادری: گناہ شیطان کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

پنڈت دیانند: شیطان کوئی چیز نہیں۔ اگر ہوتا تو خدا اس کو باہر نکال دیتا۔

پادری نولس: اگر شیطان نہ ہو تو خدا پر الزام ٹھہرتا ہے کہ وہ گناہ کراتا ہے۔

مولانا محمد قاسم صاحب: مولانا تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے کہ شیطان کے متعلق بیان کریں۔ لیکن پادری بھاگنے لگے۔ حالانکہ ابھی چار بجنے میں بھی کچھ منٹ تھے۔ چنانچہ موتی میاں نے جو جلسے کے حکم تھے۔ فرمایا کہ ابھی تو وقت بھی ہے۔ دوسرے یہ طے پایا تھا کہ جلسہ ساڑھے چار بجے تک رہے گا۔

مسلمانوں کی فتح پادریوں کا فرار اور ان کی شکست:

باوجود اس کے مولانا نے فرمایا کہ ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے لیکن پادری نہ ماننے اور بے ایمانی سے کہنے لگے کہ وقت ختم ہوگیا۔ اور چل دیئے۔ (مباحثہ صفحہ ۸۲)

مباحثے کے رپورٹر مولانا فخر الحسن صاحب لکھتے ہیں:

> "مولانا محمد قاسم صاحب اور موتی میاں صاحب اور اہل اسلام نے ہر چند اصرار کیا کہ زیادہ نہیں دو چار منٹ جو چار بجنے میں باقی ہیں انہیں میں ہم کچھ کہہ لیں گے مگر پادری صاحبوں نے ایک نہ سنی۔ پادریوں کا یہ انکار مسلمانوں کے غلبہ اور عیسائیوں کی شکست کے لئے ایسا ہوگیا جیسا غنیم کا میدان سے بھاگ جانا۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ اس سراسیمگی اور پریشانی میں جو رنج پنہانی کے باعث پادریوں کو لاحق ہوا، پادری لوگ اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے۔ اور ان کے اٹھانے کے بھی ہوش نہ رہے۔ ہندو بھی ان کے ساتھ ہو لئے.......... جب مولانا محمد قاسم صاحب نے یہ دیکھا کہ پادری نہیں مانتے تو فرمایا آپ نہ سنیں تو ہم اپنی طرف سے کہے دیتے ہیں۔ مگر دوسری طرف سے ایک پادری انجیل لے کر کھڑا ہوگیا اور شور کرنا شروع کر دیا کہ جلسہ برخاست ہو جائے۔ مگر اس وقت مولانا محمد قاسم صاحب نماز پڑھ آئے اور پھر نماز سے فارغ ہوتے ہی اس موقع پر پہنچ کر چوکی پر جس پر گفتگو کرنے والے کھڑے ہوا کرتے تھے کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھتے ہی اطراف وجوانب سے لوگ آپہنچے۔ اور تقریر فرمائی۔ آپ نے فرمایا:

مولانا محمد قاسم صاحب کی چار بجے کے بعد میلے میں ساتویں تقریر:

ہم نے ہر چند چاہا کہ پادری صاحب ہماری ایک دو بات سن لیں پر چونکہ اہل اسلام سے عہدہ برآئی کی امید نظر نہ آئی تو انجام کار یہ کام کیا اور اس کے بعد اس قسم کی باتیں فرمائیں کہ اہل جلسہ کو یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ اہل اسلام کے اعتراضوں کا کسی نے جواب نہ دیا۔ اور اہل اسلام نے سب کے اعتراضوں کا جواب ایسا دیا کہ پھر کسی کو جواب نہ آیا۔ اب بروئے انصاف رسول اللہ ﷺ کی رسالت ثابت ہوگئی اور پھر کسی شخص کو بروئے انصاف کوئی عذر باقی

نہیں رہا اور اسی ضمن میں پادری صاحب کی اس تقریر کا جواب دیا جو انہوں نے اعادہ کر کے بیان کی تھی۔

پادری صاحبان کتابیں چھوڑ کر بھاگ گئے:

پادری لوگ گھبراہٹ میں جو دو کتابیں چھوڑ کر چلے گئے تھے جس وقت مولانا محمد قاسم صاحب نے بعد نماز عصر پھر کچھ بیان کرنا شروع کیا تو اس وقت پادری جان ٹامس گھبرائے ہوئے آئے اور کہا کہ ہماری دو کتابیں رہ گئیں۔ حاضرین جلسہ نے کہا کہ:

”پادری صاحب ایسے کیوں گھبرا گئے تھے کہ کتابیں بھی چھوڑ گئے۔“

حالانکہ چار بجے پادری اسکاٹ کو درس دینا تھا مگر ان کی جگہ مولانا محمد قاسم صاحب نے وعظ فرمایا۔ پنڈت دیانند اندرمن بھی چاندا پور کو چل دیئے۔ (مباحثہ صفحہ ۸۳۔۸۴)

مولانا محمد قاسم صاحب کا قیام موتی میاں کے یہاں:

مولانا فخر الحسن صاحب رپورٹر لکھتے ہیں:

> ”اہل اسلام بھی کچھ دن رہے وہاں سے روانہ ہوئے اور حسب خواہش مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں کے یہاں مکان پر فروکش ہوئے۔ یہ ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کی شام تھی۔ صبح ہوئی تو مجلس میں ایک صاحب آئے کہنے لگے کہ منصف صاحب کہتے تھے کہ مولوی محمد قاسم صاحب کی اور میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر نہ معلوم انہوں نے کس طرح پہچان لیا جو بار بار میری طرف اشارہ کر کے یوں کہتے تھے کہ منصف صاحب ہی ہمارے حکم رہے۔“

قاسم العلوم پادری اسکاٹ کی نظر میں:

پادری اسکاٹ بازار میں مولوی عبدالمجید کو مل گئے کہنے لگے۔ مولوی محمد قاسم صاحب مولوی نہیں صوفی مولوی ہیں۔ اور اس قسم کا علم اب اہل اسلام میں نہیں رہا۔ اور کوئی شخص الٰہیات میں اہل اسلام کا ہم پلہ نہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی تجویز پر منشی اندر من کو گفتگو کے لئے دعوت نامہ:

پنڈت اندر من مراد آبادی تو بالکل بولے ہی نہیں۔ البتہ مولوی محمد طاہر نے ان کو لکھا کہ آپ تشریف لائیں۔ تو آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں لیکن انہوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے کئے اور گفتگو کی طرف نہ آئے۔ یہ سن کر دیوبند، میرٹھ، دلی اور خورجے کے لوگ بھی روانہ ہو گئے۔

بہشت کے متعلق موتی میاں کے مکان پر مولانا محمد قاسم صاحب کا آٹھواں بصیرت افروز بیان:

اسی صبح کی مجلس میں کوئی صاحب مولانا محمد قاسم صاحب سے پوچھ بیٹھے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم کو وقت ملے گا تو بہشت کے متعلق بیان کریں گے۔ لہٰذا اب بیان فرما دیجئے۔ اس وقت مولانا محمد قاسم صاحب نے بہشت کے متعلق بصیرت افروز بیان فرمایا۔ اسی ضمن میں شیطان اور ملائکہ کے متعلق بھی روشنی ڈالی۔

مولانا محمد قاسم کے سر پر سرسوتی بول رہی تھی۔ لالہ لیکھراج کا بیان:

مولانا فخر الحسن کی رپورٹ کے مطابق ۲۱ مارچ کو مولانا محمد قاسم صاحب اور دوسرے رفقا جب شاہجہانپور کے بازار میں نکلے تو ہندو دکانداروں کی ان کی طرف انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدراس سہارنپور کو لیکھراج صاحب سہارنپوری نے کہا اور انہوں نے مولانا فخر الحسن صاحب کو بتایا کہ لیکھراج صاحب بھی شاہجہانپور کے مباحثے میں گئے تھے کہتے تھے۔

> ”ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے ان کا حال بیان کیجئے۔ ان کے سر پر تو علم کی سرسوتی (علم کی دیوی) بول رہی تھی۔“

پٹھان جیتے ہندوؤں کا قول:

شاہجہانپور کے ہندو جو مجلس مباحثہ میں شریک ہوئے تھے انہوں نے شاہجہانپور کے راستے میں بعض گاؤں کے ہندوں سے کہا:

"پٹھان جیتے۔"

ان کا مطلب یہ تھا کہ شاہجہانپور میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ اکثر پٹھان تھے اس لئے انہوں نے پٹھانوں کی جیت کا فیصلہ سنایا۔ (مباحثہ صفحہ ۸۸)

۲۱ مارچ کو واپسی:

ان آثار سے اور ہندو اور عیسائیوں کے اعتراف سے ثابت ہو گیا کہ حضرت قاسم العلومؒ اسلام کی فتح کا پھریرا لہراتے ہوئے ۲۱ مارچ کو روانہ ہو کر واپس پہنچے اور اس طرح اسلام کی صداقت کی منادی غیر مسلم لوگوں میں کر کے اپنے فرض تبلیغ سے سبکدوش ہوئے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> "اگلے سال یعنی ۱۲۹۴ھ (مطابق ۱۸۷۷ء) میں پھر اس جلسے کی خبر ہوئی (جو پارسال چاندا پور میں ہوا تھا) پھر مولانا (محمد قاسم صاحب) تشریف لے گئے۔ اس سال میں مجمع ہنود میں ایک بہت بڑے پنڈت دیانند سرستی نامور تھے۔ ہر چند نو ایجاد مذہب انکا توحید اور انکار بت پرستی میں اور عام ہنود کی نسبت جداگانہ ہے مگر بید کے ایمان اور بعضے اور مسائل جیسے آہ گون (تناسخ) وغیرہ میں برابر ہیں۔ تقریر اس شخص کی اکثر الفاظ سنسکرت کے ساتھ ملی ہوئی تھی اس لئے دشواری ہوئی۔ مگر مولوی محمد علی صاحب جو بمقابلہ مذہب ہنود مشہود ہیں انہوں نے کچھ اس کا جواب کہا۔ پھر مولانا (محمد قاسم) نے بحث وجود اور توحید کا ذکر کیا اور ایسا بیان کیا کہ حاضرین کو سوائے سکوت، اس کے استماع کے اور کام نہ تھا۔ پھر کچھ گفتگو (انجیل میں) تحریف کی ہوئی یہ بھی بحمد اللہ تعالیٰ الزام تحریف کا ان کے اقرار سے ثابت ہوا حتی کہ پادری لوگ عین جلسے میں سے ایسے بے سروپا بھاگے کہ ٹھکانا نہ معلوم ہوا۔ اپنی بعض کتابیں بھی بھول

گئے۔ اس جلسے سے جناب (مولانا محمد قاسم صاحب) کامیاب واپس آئے۔ اور نصرت دین اسلام کہ تابقیام قیامت منصور رہے گا ان کی ذات سے پوری ظاہر ہوئی۔ اوران دوسال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص کس پایہ کا ہے اور فضل الٰہی کی کیا صورت ہوا کرتی ہے۔ ”جز بتائید آسمانی نیست۔“ کا نقشہ ظاہر ہوگیا حتی کہ پادری بھی بول اٹھے کہ اگر تقریر پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر خوش ایسی لطیف اور دل میں اثر کرنے والی ہے کہ اس پر ایمان لائے مگر ایمان جس کے نصیب میں ہے وہی اس سے مشرف ہوتا ہے۔ ورنہ حق واضح ہے۔ کیفیت اس میلے کی وہاں سے آکر مرتب ہوگئی تھی مگر اتفاق طبع کا نہ ہوسکا اب امید ہے کہ ختم ہو کر مشتہر ہو (چنانچہ چھپ کر کبھی کی شائع ہوگئی) اور سب صاحب اس سے مستفید ہوں اس وقت میں یہ سنا تھا کہ غالباً حاجت کسی تحریر کے پیش کرنے کی بھی ہوگی۔ اس پر مولوی صاحب نے وہیں بیٹھ کر کچھ تحریر کیا تھا اور اس کا نام حجۃ الاسلام رکھا ہے۔ وہ کتاب طبع ہوگئی ہے۔“

(صفحہ ۲۳۔۲۴)

ہم نے بقدر امکان ان دوسالوں کے مذہبی مباحثوں کا تفصیل سے ذکر کر دیا ہے اس کے بعد وہاں اور کوئی مذہبی میلہ منعقد نہیں ہوا۔ اب ہم حضرت قاسم العلوم کے پنڈت دیانند سرتی سے مباحثوں کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ
اور دیانند سرستی

اوائل شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق اگست ۱۸۷۸ء

۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء کے مباحثوں کے بعد حضرت قاسم العلوم نے آریا مذہب کے بانی سرستی کا ناطقہ بند کیا جس سے ۱۸۷۷ء کے مذہبی مباحثے میں شاہجہانپور سے شناسائی حاصل تھی اور اس کی مذہب دانی کا اندازہ بھی خوب کرلیا تھا۔ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں قاسم العلوم حج کو تشریف لے گئے اور مارچ ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۵ھ کو واپس ہوئے بقول عارف باللہ شوال ۱۲۹۴ھ میں تشریف نے لے گئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ میں واپس تشریف لائے۔ جہاز میں واپسی پر سخت بیمار ہوگئے تھے جس کی تفصیلات تیسرے حج میں آچکی ہیں۔ ضیق النفس اور کھانسی کی بیماری آپ کو ٹھہر گئی تھی اور سخت تکلیف رہتی تھی کہ اسی اثناء میں رڑکی میں دیانند سے مناظرے کے لئے تشریف لے گئے۔ رڑکی میں دیانند کی آمد، قاسم العلوم کا مناظرے کیلئے تشریف لے جانا اور دیانند کا پہلو تہی کرنا اس کی تمام تفصیلات انتصار الاسلام مرتبہ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی میں ملیں گی اور مجملاً سوانح قاسمی میں حضرت عارف باللہ نے بھی کچھ نقشہ کھینچا ہے۔

حج سے واپسی پر پانچ ماہ بعد شعبان ۱۲۹۵ھ میں وفات سے ایک سال ۱۱ ماہ پہلے مناظرہ رڑکی:

رڑکی تشریف لے جانے کے متعلق اور دیانند کے فرار کے بارے میں حضرت

عارف باللہ لکھتے ہیں:

> "اسی سال (۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء) شعبان (کے اول) میں رڑکی سے خبر ملی کہ پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشتہر کئے ہیں۔ اہل رڑکی مولانا کو بجز ہوئے کہ آپ تشریف لائیں۔ مولانا باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے اور بہت سے خادم (مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا فخر الحسنؒ صاحب، حاجی محمد عابدؒ صاحب، حکیم مشتاق احمدؒ صاحب، مولانا عبدالعدلؒ صاحب) ساتھ ہوئے اور اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولانا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہوگئی مگر وہ بندہ اللہ کا گفتگو پر پکا نہ ہوا۔ اینڈی بینڈی شرطیں کرتا تھا جس سے عاقلاں خود محاوانند اس کی نیت سمجھ میں آتی تھی۔ آخر غرض وہ چل دیا اور مولانا نے وہاں ایک وعظ کہا اور اس کے اعتراضوں کے جواب ذکر فرمائے پھر واپس دیوبند تشریف لاکر رمضان وطن میں کیا اور اس عرصے میں تحریر اس تقریر کی شروع کی جو اس کے جواب میں فرمائی تھی۔ اس اعتراض اس کا استقبال قبلہ پر تھا کہ یہ بت پرستی ہے۔ اس رسالے کا نام قبلہ نما ہے۔ بہت بڑے حجم کا رسالہ ہے۔" (سوانح قاسمی صفحہ ۲۶)

تفصیلات مناظرہ رڑکی:

مولانا فخر الحسن صاحب نے پوری تفصیل سے رڑکی کی دعوت مناظرہ اور پنڈت دیانند سرستی کے فرار پر، روشنی ڈالی ہے جو سوانح قاسمی کی ایک تاریخی اور یقینی دستاویز ہے اور جس کا ایک حرف بھی چھوڑنا سوانح قاسمی میں تنقیص کے مترادف ہے۔ لکھتے ہیں:

> "پنڈت دیانند سرستی نے رڑکی میں آکر برسر بازار دین اسلام پر طرح طرح کے اعتراض کرنے شروع کئے۔ چونکہ رڑکی (ضلع سہارنپور) میں کوئی اہل علم ایسا نہ تھا کہ پنڈت جی کے فلسفیانہ اعتراضوں کے جواب دے سکے اس لئے پنڈت جی اور ان کے معتقدین اہل ہنود نے میدان خالی پاکر بہت کچھ زبان درازیاں کیں۔
>
> اہل اسلام رڑکی نے پنڈت جی کی زبان درازی کی اطلاع خدمت میں جناب مغفور (مولانا محمد قاسم صاحب) کے کی اور یہ بھی لکھا کہ پنڈت جی فلسفیانہ اعتراض ہر

روز بر سر بازار کرتے ہیں۔ اول تو کوئی اہل علم ایسا نہیں جو فلسفیانہ گفتگو کر سکے۔ اور اگر کبھی کوئی طالب علم یا کوئی فارسی خوان پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب میں کچھ جرأت بھی کرتا ہے تو پنڈت جی اور ان کے معتقد اس کو خاطر میں نہیں لاتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم جاہلوں اور بازاریوں سے گفتگو نہیں کرتے اپنے مذہب کے کسی بڑے عالم کو بلاؤ اس سے گفتگو کریں گے۔

تجویز قاسمی:

انہیں مضمونوں کے متواتر خط آنے لگے۔ یہاں مولانا کی یہ تجویز تھی کہ اپنے شاگردوں میں سے یا مدرسہ دیوبند سے کوئی طالب علم چلا جائے اور پنڈت جی کی کتھا میں کھنڈت ڈال آئے۔ اتنے میں رڑکی سے اور خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ پنڈت جی کہتے ہیں کہ مولبی کاسم (مولوی قاسم) اگر آئیں تو گفتگو کریں گے۔ ورنہ اور کسی سے ہرگز گفتگو نہ کریں گے اور وجہ اس کی غالباً یہ ہوگی کہ پنڈت جی نے سمجھا کہ اب تو معتقدین میں اپنی ہوا بندھ گئی ہے کوئی ایسی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت نہ آئے۔ اور چونکہ مولانا مرحوم بیمار ہیں اس لئے نہ وہ آئیں گے نہ گفتگو ہوگی۔ نہ اپنی ہوا بگڑے گی۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی بیماری کا نقشہ خود ان کے قلم کی زبانی:

الغرض چونکہ جناب مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) کو بخار آتا تھا اور خشک کھانسی کی یہ شدت تھی کہ بات بھی پوری کرنی مشکل ہوتی تھی اور ضعف کی وہ نوبت تھی کہ پچاس سو قدم چلنے سے سانس اکھڑ جاتی تھی۔ اور یہ مرض وضعف بقیہ اس مرض سخت کا تھا جو اسی سال میں مکہ معظمہ سے آتے وقت جہاز میں پیش آیا تھا۔ بناچاری جناب مولانا نے اہل اسلام رڑکی کو یہ لکھ بھیجا کہ بسبب مرض وضعف کے اول تو میرا وہاں تک پہنچنا معلوم اور اگر پہنچا بھی تو گفتگو کے قابل نہیں کھانسی دم لینے ہی نہیں دیتی۔ بات پوری کرنی مشکل ہے۔ اس لئے میں تو مجبور ہوں۔ ہاں یہاں سے دو چار ایسے شخص بھیج سکتا ہوں کہ پنڈت جی کا دم بند کر دیں گے اور ان کی ہوا بگاڑ دیں گے۔

اہل رڑکی کا جواب:

اہل اسلام رڑکی نے بجواب اس خط کے لکھا کہ پنڈت جی تو یہی ضد کرتے ہیں کہ سوا مولبی کاسم کے ہم اور کسی سے گفتگو نہ کریں گے۔

شاگردان قاسمی کی رڑکی کو روانگی:

اس پر جناب مولانا مرحوم نے کمترین انام (مولانا فخر الحسن) اور جناب مولوی محمود حسن صاحب اور مولوی حافظ عبد العدل صاحب سے ارشاد فرمایا کہ تم خود رڑکی ہو آؤ در اصل حال دریافت کرلاؤ۔ اگر پنڈت جی گفتگو کریں تو گفتگو تمام کر آؤ چنانچہ ہم تینوں نے رڑکی جانے کی تیاری کی۔ اور مولوی منظور علی جوالا پوری کو ہمراہ لیا۔ اور جمعرات کے دن قبل از مغرب ہم چاروں یار پا پیادہ رڑکی کو روانہ ہوئے۔ دیوبند کے باغوں میں نماز مغرب پڑھی اور راتوں رات چل کر علی الصباح رڑکی میں داخل ہوئے۔ وہاں کے اہل اسلام سے ملاقات ہوئی۔ جمعہ کی نماز کے بعد ہم چاروں مع چند اشخاص اہل رڑکی پنڈت جی کی کوٹھی پر جو سرحد چھاؤنی میں تھی گئے۔ ہمارے ہمراہیوں میں سے بعضے لوگوں نے کہا کہ پنڈت جی اپنے اعتراضوں کا جواب ان لوگوں سے سن لو۔ یہ لوگ اسی لئے آئے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا میں تو نہیں سنتا نہ مجھے فرصت ہے نہ میں گفتگو کا آرزومند ہوں اور نہ میں نے اشتہار میں مباحثہ کی خواستگاری کی۔ کسی نے میری اطلاع کے بغیر اگر اشتہار چھپاں کر دیا ہو تو مجھے خبر نہیں۔ ہر چند ہم لوگوں نے اصرار کیا مگر پنڈت جی نے نہیں نہیں کے سوا اور کچھ نہ کہا۔ اس ردوبدل میں پنڈت جی کئی بار ایسے لئے گئے کہ دم بخود ہونا پڑا پھر ہم نے پنڈت جی سے یہ دریافت کیا کہ آپ جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب کے ساتھ مباحثہ کرنے کو تو راضی ہیں یا ان سے بھی راضی نہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب سے مناظرہ کی خواہش:

پنڈت جی نے کہا کہ میں خواہ مخواہ متقاضی اس امر کا نہیں ہوں لیکن اگر جناب مولانا

ممدوح تشریف لے آئیں تو مباحثہ کیلئے آمادہ ہوں اور کسی سے تو مباحثہ نہ کروں گا۔ وجہ اس تخصیص کی پوچھی تو کہا میں تمام یورپ میں پھرا ہوں اب تمام پنجاب میں پھر کر آیا ہوں۔ ہر اہل کمال سے مولانا کی تعریف سنی ہے۔

یکتائے روزگار مولانا محمد قاسم دیانند سرستی کا اقرار:

ہر کوئی مولانا کو یکتائے روزگار کہتا ہے اور میں نے بھی مولانا کو شاہجہانپور کے جلسے میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر دل آویز سنی ہے۔ اگر آدمی مباحثہ کرے تو ایسے کامل اور یکتا سے تو کرے جس سے کچھ فائدہ ہو۔ کچھ نتیجہ نکلے۔

الغرض وہاں سے آکر شہر میں رات بسر کی اور علی الصباح دیوبند روانہ ہوئے۔ شام کو (ہفتے کے دن) جناب مولانا کی خدمت میں پہنچے اور جو کچھ سرگذشت تھی وہ عرض کی۔

رڑکی والوں کا خط قاسم العلوم کے نام:

دو تین دن کے بعد پھر اہل اسلام رڑکی کا خط آیا۔ اس میں پھر وہی تشریف آوری مولانا کی تاکید تھی۔ اور پنڈت اور ان کے شاگردوں اور معتقدوں کی زبان درازی کی شکایت تھی۔ جناب مولانا نے ان کے جواب میں یہ لکھا کہ:

مکتوب قاسمی رڑکی کے مسلمانوں کے نام:

آپ صاحب پنڈت جی سے تاریخ مباحثہ کی مقرر کر کے ہمیں اطلاع دیں ہم خود حاضر ہوتے ہیں۔

رڑکی کے مسلمانوں کا جوابی خط:

رڑکی کے مسلمانوں نے جواب میں لکھا کہ پنڈت جی کہتے ہیں کہ مولانا خود ہی آکر تاریخ مقرر کر لیں گے۔ ہم تم لوگوں سے اس باب میں کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔

(انتصار الاسلام)

اوائل شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق اگست ۱۸۷۸ء میں حضرت قاسم العلوم کی رڑکی کو روانگی:

آخر الامر (بقول مولانا فخر الحسن صاحب) جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مع ہم چاروں اور جناب حاجی محمد عابد صاحب وحکیم مشتاق احمد صاحب کے اوائل شعبان میں رڑکی کو روانہ ہوئے۔ گرمی کی وجہ سے رات کو چل کر علی الصباح رڑکی پہنچے۔ اہل اسلام جوق در جوق شادان وفرحاں آ آ کر ملنے لگے۔ مولانا کی آمد کا تمام رڑکی میں شور پڑ گیا۔ شرائط مباحثہ میں تحریری گفتگو شروع ہوگئی۔ جناب مولانا شہر میں فروکش تھے اور پنڈت جی چھاؤنی میں مقیم تھے۔

پنڈت جی کا مناظرے سے گریز:

پنڈت جی نے کئی روز تک بے فائدہ ضد کی۔ میدان مناظرہ میں آنا قبول نہ کیا۔ طرح طرح کے بہانے تراشا کیے۔ آخر الامر تحریر میں بھی گھبرا گئے اور کہلا بھیجا کہ مولوی جی تو بہی کھاتہ لکھ بھیجتے ہیں۔ ہم سب (یعنی پنڈت جی اور ان کے معتقد) بانچتے بانچتے تھک جاتے ہیں۔ ہمارے سارے کام بند ہوگئے۔ آج سے ہمارے پاس اور کوئی تحریر نہ آئے۔ ہم ہرگز جواب نہ دیں گے۔

کرنل کا اشتیاق ملاقات:

اسی اثناء میں مولوی احسان اللہ ساکن میرٹھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا کہ ہمارے کرنل جن کی پیشی میں، میں کام کرتا ہوں آپ کی ملاقات کے بہت مشتاق ہیں۔ اور کپتان بھی آپ کی ملاقات کے آرزومند ہیں۔ اور ان کو مذہب کی بابت کچھ پوچھنا ہے۔ جناب مولانا نے فرمایا کہ ہم تو اسی کام کیلئے آئے ہوئے ہیں یہ خوب موقع ہاتھ لگا جب آپ کہیے میں حاضر ہوں۔

مولانا محمد قاسم صاحب کا استقبال:

اگلے روز جناب مولانا مع چند ہمراہیوں کے (رڑکی چھاؤنی کے) کرنل کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ کرنل اور کپتان دونوں نے استقبال کیا۔ مولانا کرسی پر بیٹھ گئے۔

مولانا اور کرنل کی گفتگو:

کرنل: آپ کے علم وفضل کا شہرہ سن کر میں بھی مشتاق ملاقات ہوا۔ سو بارے آج آپ نے مہربانی کی اور پھر یہ پوچھا کہ دنیا میں بہت سے مذہب ہیں اور ہر کوئی اپنے مذہب کو حق کہتا ہے آپ یہ فرمایئے کہ حقیقت میں کون مذہب حق ہے۔

انگریز کرنل اور کپتان کو تبلیغ اسلام:

مولانا محمد قاسم صاحب: مذہب حق جس پر انسان کی نجات موقوف ہے۔ مذہب اسلام ہے۔ اور پھر ایسی ایسی دلیلیں بیان کیں کہ کرنل اور کپتان کرسی پر سے اچھل پڑتے تھے۔

کرنل: جب مذہب اسلام ہی حق ہے تو خدا نے تمام مخلوق کو مسلمان ہی کیوں نہ کر دیا۔

مولانا محمد قاسم صاحب: نے اس کا ایسا کچھ جواب دیا کہ کرنل اور کپتان سن کر حیران رہ گئے۔ اور مولانا کے علم وفضل کی تعریف کرنے لگے۔

کرنل: مینہ نہ برسنے کی وجہ کیا ہے (موسم برسات اس سال خشک تھا) قحط کا اندیشہ تھا۔ اور پھر آپ ہی کہنے لگا کہ ہمارے یورپ کے حکماء اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ آفتاب پرانا ہوگیا، گھس گیا، اس میں گرمی ایسی نہیں رہی کہ جس سے بخارات آسمان کی طرف صعود کر سکیں اور پانی ہو کر زمین پر ٹپک پڑیں۔ (انتصار صفحہ ۳، ۴، ۵)

مولانا: حکمائے یورپ غلط کہتے ہیں۔ بلکہ انسانوں کی شامتِ اعمال سے بارش نہیں ہوتی۔

کرنل اور پنڈت جی:

کرنل صاحب کو یہ معلوم ہی تھا کہ مولانا پنڈت دیانند سے مناظرے کے لئے آئے ہیں۔ اور وہ گریز کررہے ہیں۔ چنانچہ بقول مولانا فخر الحسن صاحب کرنل صاحب نے پنڈت دیانند کو مولانا کی موجودگی میں بلایا اور کہا:

کرنل: تم مولوی جی سے کیوں گفتگو نہیں کرلیتے۔ مجمع عام میں تمہارا کیا نقصان ہے۔

پنڈت جی: مجمع عام میں فساد کا اندیشہ ہے۔

کرنل: اچھا ہماری کوٹھی پر گفتگو ہوجائے ہم فساد کا انتظام کرلیں گے۔

پنڈت جی: ہم تو اپنی ہی کوٹھی پر گفتگو کریں گے اور پھر بھی اگر مجمع عام نہ ہو۔

مولانا محمد قاسم صاحب: لیجئے اب تو مجمع عام نہیں۔ دس بارہ ہی آدمی ہیں۔ اب سہی۔ آپ اعتراض کیجئے ہم جواب دیتے ہیں۔

پنڈت جی: میں تو گفتگو کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔

مولانا: اب ارادہ کرلیجئے۔ ہم آپ کے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں آپ جواب دیجئے یا آپ اعتراض ہم پر کیجئے اور ہم سے جواب لیجئے۔

لیکن پنڈت جی نے ایک نہ مانی۔ شرائط کے باب میں گفتگو رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجلس برخاست ہوئی جناب مولانا بھی اپنی فرودگاہ پر تشریف لائے اور کئی روز تک شرائط میں ردوبدل رہی۔

مولانا محمد قاسم صاحب کا چیلنج:

آخر الامر مولانا نے یہ کہلا بھیجا کہ پنڈت جی کسی جگہ مباحثہ کرلیں۔ برسر بازار کرلیں، عوام میں کرلیں، خواص میں کرلیں، تنہائی میں کرلیں مگر کرلیں۔ پنڈت جی اپنی کوٹھی پر مباحثہ کرنے کو راضی ہوئے اور وہ بھی اس شرط پر کہ دوسو سے زیادہ آدمی نہ ہوں۔

چھاؤنی میں مناظرے کی ممانعت:

مولانا پنڈت جی کی کوٹھی پر جانے کو تیار تھے کہ سرکار کی طرف سے ممانعت ہوگئی کہ چھاؤنی کی حد میں کوئی شخص گفتگو نہ کرنے پائے۔ شہر میں، جنگل میں، جہاں جی چاہے گفتگو کرے۔

پنڈت جی کی بزدلی اور گفتگو سے گریز:

مولانا نے پنڈت جی کو لکھا کہ نہر کے کنارے پر یا عیدگاہ کے میدان میں یا اور کہیں مباحثہ کر لیجئے۔ مگر پنڈت جی کو بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ انہوں نے ایک نہ سنی۔ یہی کہا کہ میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ چونکہ سرکار کی طرف سے ممانعت ہوگئی تھی۔ اس لئے جناب مولانا کوٹھی پر نہ جا سکے۔ اور پنڈت جی کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔

پکارے گلے کہہ دو کہ سامنے آئیں مولانا محمد قاسم صاحب کا اعلان:

ادھر تو یہ قصہ ہوا اور ادھر جناب مولانا نے ہم لوگوں کو حکم دیا کہ بازار میں کھڑے ہو کر پکارے گلے کہہ دو کہ پنڈت جی پہلے تو بہت سی زبان درازیاں کرتے تھے اب وہ زبان درازیاں کہاں گئیں۔ ذرا مردوں کے سامنے آئیں کوٹھی سے باہر نکلیں اور یہ فرمایا کہ پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب علی الاعلان بیان کر دو۔

مولانا فخر الحسن کی بازار میں تقریریں:

چونکہ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہ تھا کہ جناب مولوی محمود حسن صاحب اور مولوی حافظ عبدالعدل صاحب کو تکلیف کرنی پڑتی اس لئے بندے نے اس کی تعمیل کر دی۔ یعنی پنڈت جی کے اعتراضوں کے جواب برسر بازار کئی روز تک بیان کئے اور پنڈت جی کے مذہب جدید پر بہت سے اعتراض کئے اور بہت سی غیرت دلائی۔ اگرچہ مجمع عام میں پنڈت جی کے معتقد شاگرد بھی ہوتے تھے لیکن کسی کو نہ اتنی جرأت ہوئی کہ لب کشا ہو نہ اتنی غیرت آئی کہ پنڈت جی کو کشاں کشاں میدان میں لائے۔ اور اسی مضمون کے اشتہار بازاروں میں چسپاں کر دیئے۔

پنڈت جی کو وعظ میں شرکت کی دعوت:

آخر الامر مولانا نے پنڈت جی کے پاس یہ پیام بھیجا کہ خیر آپ مباحثہ نہیں کرتے نہ کیجئے ہم مجمع عام میں وعظ بیان کریں گے آپ مع شاگردوں اور معتقدوں کے وعظ تو سن لیں لیکن ۔

کب وہ سنتے ہیں کہاں میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

پنڈت دیانند کا رڑکی سے فرار:

پنڈت جی وعظ میں تو کیا آتے رڑکی سے بھی چل دیئے۔ اور ایسے گئے کہ پتہ بھی نہ ملا کہ کدھر گئے۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا برسر بازار رڑکی میں ۲۰، ۲۱، ۲۲ شعبان ۱۲۹۵ھ کو تین روز مسلسل وعظ:

آخرش مولانا نے بنفس نفیس برسر بازار تین روز تک وعظ فرمایا، مسلمان، ہندو، عیسائی اور سب بڑے چھوٹے انگریز جو رڑکی میں تھے ان وعظوں میں شامل تھے۔ ہر قسم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔

عیسائیوں، ہندوؤں اور انگریز افسروں میں اسلام کی منادی:

مولانا نے وہ وہ دلائل مذہب اسلام کے حق ہونے پر بیان فرمائے کہ سب حیران تھے۔ اہل جلسہ پر سکتے کا سا عالم تھا۔ ہر شخص متاثر معلوم ہوتا تھا۔ پنڈت جی کے اعتراضوں کے وہ دندان شکن جواب دیئے کہ مخالف بھی مان گئے۔ توحید و رسالت کے بیان میں تو وہ سماں بندھا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ جس نے سنا وہی جانتا ہوگا۔

مسلمانوں کی نیم بسملی:

جو لوگ اہل اسلام میں سے اس جلسے میں اہل دل تھے وہ تو نیم بسمل ہو گئے تھے۔ مرغ

بسمل کی طرح تڑپتے تھے۔

حوریاں رقص کناں ساغر مستانہ زدند

اسلام لائے بغیر نجات ممکن نہیں مولانا کا اتمامِ حجت:

ان تینوں وعظوں میں جناب مولانا نے تمام اہل مذاہب پر ظاہر کر دیا کہ بغیر اسلام لائے عذاب آخرت سے (جو ہمیشہ کا ہوگا) نجات ممکن نہیں۔ حجت الٰہی سب پر قائم کر دی۔ اور اب بھی اگر کوئی دوزخ کی آگ کو اپنے واسطے پسند کرے تو وہ جانے۔

۲۳ شعبان ۱۲۹۵ھ کو مولانا کی رڑکی سے دیوبند کو روانگی:

الغرض جناب مولانا ۲۳ شعبان (۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء) کو رڑکی سے روانہ ہو کر ایک روز ۲۴ شعبان کو منگلور (ضلع سہارنپور) رہے۔ اور دوسرے روز (بتاریخ ۲۵ شعبان) دیوبند پہنچے۔

۲۸ شعبان ۱۲۹۵ھ کو مولانا نانوتہ اپنے وطن میں:

دو تین روز (۲۵، ۲۶، ۲۷ کو دیوبند) رہ کر نانوتہ رونق افروز ہوئے اور پنڈت جی کے اعتراضوں کے جوابات لکھے۔ جو کل گیارہ تھے۔ خانہ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے پر جو اعتراض ہے اس کا جواب چونکہ بہت شرح و بسط رکھتا ہے۔ اس کو جناب مصنف مرحوم ہی نے ایک جدا رسالہ کر دیا ہے۔ اور اس کا نام ”قبلہ نما“ فرمایا کرتے تھے۔ اور دس اعتراضوں کے جو جوابات ہیں ان کا جدا رسالہ کر دیا تھا مگر اس کا نام کچھ مقرر نہیں فرمایا تھا۔ اس لئے بندے نے اس کا نام انتصار الاسلام رکھا۔ (انتصار الاسلام از صفحہ ۲ تا ۷)

ہم نے یہ مذکورہ بالا تحریر کہیں کہیں کوئی لفظ کی تبدیلی کے ساتھ بعینہٖ مولانا فخر الحسن صاحبؒ کے الفاظ میں پیش کی ہے۔ البتہ ان کی وہ تحریریں جو اہل مباحثہ کی گفتگوئے مسلسل پر مشتمل ہیں ہم نے ان کو مکالمے کی دلچسپ صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ وہی مولانا فخر الحسن صاحب ہی جن کے حالات قاسمی شاگردوں کے ضمن میں ہم

نے پیش کر دیئے ہیں۔ جو فراغت علم کے بعد نگینہ، خورجہ اور دہلی کے مدرسوں میں رہے۔ البتہ خورجے میں وہ پرائیویٹ طور پر نواب صاحب کے ملازم تھے۔

مولانا فخر الحسن صاحب بہت بڑے مصنف اور مقرر بھی تھے۔ ان کی تصنیفات میں جہاں غیر مطبوعہ سوانح قاسمی ہے جو ضائع ہوگئی۔ حاشیہ ابوداؤد شریف بھی ہے۔ جس کا حوالہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے تذکرۃ الخلیل کے صفحہ ۱۹۲ پر دیا ہے۔ کہ مولانا خلیل احمد صاحب بذل المجہود شرح ابوداؤد کے لکھتے وقت جو کتابیں زیر مطالعہ رکھتے تھے ان میں سے چھ ابوداؤد کے نسخے تھے جن میں مولانا فخر الحسن گنگوہی کا حاشیہ کردہ ابوداؤد مطبوعہ اصح المطابع بھی تھا۔ مولانا منصور علی خان صاحب مرادآبادی مذہب منصور میں حضرت قاسم العلوم کے تیسرے حج کے بعد حضرت کی جہاز میں سخت بیماری کے بعد کچھ دنوں مرادآباد ٹھہر کر جب نانوتے پہنچے ہیں تو مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ وغیرہ کی فراغت تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”میں (حج کے بعد ربیع الاول میں) جب وطن (مرادآباد) آیا۔ چند روز قیام کر کے نانوتے پہنچا۔ اس وقت مولانا صاحب کو اچھا تندرست پایا مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا لیکن پہلی سی قوت نہ تھی۔ اس وقت مولانا صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے واسطے مولوی محی الدین احمد خان صاحب مرادآبادی اور مولوی عبد العلی صاحب میرٹھی اور مولوی رحیم اللہ صاحب بجنوری حاضر تھے۔ میں ان کے اسباق کی بھی سماعت کرتا تھا لیکن ان کے فضل و کمال کو کہاں پہنچتا۔ اور ان سے پہلے جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم کی خدمت بابرکت میں مولوی احمد حسن صاحب امروہی اور مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولوی فخر الحسن صاحب گنگوہی وغیرہ میرٹھ میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور کبھی کبھی نانوتہ میں بھی مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔“ (مذہب منصور جلد دوم)

مولانا منصور علی خان مرادآبادی مرحوم بھی رڑکی کے مباحثے میں منگلور سے تشریف لے گئے تھے۔ کیونکہ ۱۲۹۵ھ میں وہ منگلور کے عربی مدرسے میں ملازم تھے۔ جب قاسم العلوم دیوبند سے رڑکی جا رہے تھے تو مولانا فخر الحسن صاحب کو بلانے کے لئے بھیجا۔ لکھتے ہیں:

''منگلور کی مدرسی کے واسطے (مولانا رفیع الدین صاحب) مہتمم نے مولانا (محمد قاسم) صاحب سے مشورہ لیا تو فرمایا کہ ہاپوڑ سے منصور علی کو بلا لو۔ اس کو ضرورت ہے۔ جب خط طلبی کا ہاپوڑ پہنچا میں فوراً آ کر منگلور چلا گیا۔ اور دو مہینے تک رہا۔ مدرسی کی۔ اتنے میں جناب مولانا صاحب مع ہمراہیوں کے رڑکی کو مباحثہ (دیانند) سرتی کیلئے تشریف لائے اور ایک تلمیذ رشید کو منگلور بھیجا کہ اس کو ملنے کے لئے بلا لاؤ۔ میں یہ مژدہ سنتے ہی مولانا فخر الحسن گنگوہی کے ہمراہ چلا گیا۔ سڑک پر بہلی کو ٹھہرا کر فرمایا کہ تم بھی ضرور رڑکی آ جانا۔ حسب الارشاد دو تین روز کے بعد میں بھی رڑکی پہنچا۔''

رڑکی سے واپسی پر منگلور میں دو روز قیام:

''چند روز (تقریباً پندرہ روز) مولانا صاحب رڑکی میں قیام فرما کر منگلور میں میرے پاس دو دن ٹھہرے اور قاضی محمد اسماعیل صاحب وغیرہ نے مہمان نوازی کی خوب داد دی۔'' (مذہب منصور حصہ دوم)

مولانا محمد قاسم صاحب کی دیانند کے تعاقب میں میرٹھ کو روانگی:

رڑکی سے بھاگنے کے بعد دیانند میرٹھ پہنچ گئے۔ مولانا بھی گفتگو کے لئے میرٹھ پہنچے لیکن وہ میرٹھ سے بھی بھاگ گیا۔ حضرت عارف باللہ لکھتے ہیں:

''پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھرا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں ان کے وہی دعوے تھے۔ واقعی جسے شرم نہ ہو جو چاہے کرے۔ اتفاقاً جناب مولوی صاحب بھی ان دنوں میرٹھ کا ارادہ فرما رہے تھے کہ وہاں سے بعضے صاحبوں نے بلانے کے بارے میں تحریک کی۔ غرض مولانا میں ہر چند مرض کے بقیہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی مگر ہمت کر کے پہنچے تو وہ بہانہ وحیلہ کر کے وہاں سے کافور ہو گیا۔ وہاں بھی اس کا جواب مولانا نے ویسے ہی کچھ بیان فرمایا۔ اور پھر کچھ تحریر شروع کی۔ جس کو مولوی عبد العلی صاحب نے بطرز جواب لکھا اور نام ''جواب ترکی بہ ترکی'' رکھا۔ پنڈت کے بعضے معتقدوں نے کچھ تحریر بجواب مولانا بے سروپا لکھی تھی۔ اور کچھ اوٹ پٹانگ مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض کئے

تھے۔ یہ رسالہ اس کے جواب میں ہے۔" (سوانح صفحہ ۲۶)

دیانند کا میرٹھ سے فرار:

حسب تحریر عارف باللہ، دیانند سے بھی بھاگا۔ قاسم العلوم کے ساتھ اسلام کی فتح ہوتی جاتی تھی۔ اور

جاء الحق و زھق الباطل

کی شان کا ظہور ہوتا جاتا تھا۔ عیسائی پادری اور آریہ ہندو کوئی بھی قاسم العلوم کے سامنے نہ ٹھہرتا تھا۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی والد شیخ الہند تحریر فرماتے ہیں:

ولما اتی دیانند حبر الھنود و صندیدھم مدعیاً حقیة معتقداته، باباطیله و مز خرفاته و معترضاً علی الاسلام نجز عبیلاته و ترھاته قائلا تعال و نزال ومنادیا باعلیٰ صوته ھل من مبارز و طالباً للمناظره بل المجادلة من کل غائب و بارز، نھض مولانا (محمد قاسم) ذباً عن جوزة القویم، معرة شبھات اللئیم، و غلق علیه سدد الخلاص ففکر و قدر وافلت وله حصاص فقلت فی ذالک.

اور جب دیانند سرتی آریہ مذہب کا بانی اور عالم اپنے مذہب اور عقائد کی حقانیت کے باوجود اپنے باطل اور فضول سے خیالات کے مدعی بن کر آیا۔ اور اسلام پر اپنے باطل اور لچر خیالات سے اعتراض کرنے لگا اور اپنی بلند آوازی کے ساتھ اس نے چیلنج کیا اور کہا کہ ہے کوئی مقابلہ اور مناظرہ کرنے والا بلکہ ہر موجود اور غیر موجود سے مجادلہ پر آمادہ ہوا تو اس وقت مولانا محمد قاسم صاحب دین اسلام کے دفاع کے لئے اٹھے۔ اور دیانند کے اعتراضات کے پرخچے اڑا دیئے اور اس کے بھاگنے کے راستے بند کر دیئے تو وہ حیران و پریشان ہو کر رہ گیا اور اس کی ہوائیں نکلنی شروع ہو گئیں تو میں نے کہا:

جاء متشدقاً دیانند زھراً   و فخوراً متبختراً مختالا
دیانند شیخیاں بگھارتا ہوا   اکڑتا مکڑتا فخر و غرور سے آیا
وتباھی بزورہ و تناھی   باباطیله و قال محالا

اور اپنے جھوٹ میں سرشار اور   فضول سی محال باتوں کا دعویٰ کرتا ہوا
و دعا للبراز کل نبیه   مسلم حاز عظمة و جلالا
اور اس نے ہر صاحب عظمت و جلال   فہمیدہ مسلمان کو مقابلے کا چیلنج دیا
فتصدی لرده الامجد الاو   حد من قد احاط سحراً حلالا
تو اس کی تردید کے لئے ایک نہایت   لائق و فائق شخص نے اس کا تعاقب کیا
قاسم الخیر قاصم الضیبر طراً   من کسی الذین بهجة و جمالا
جن کا نام محمد قاسم بھلائی کے تقسیم کرنے والے   برائی کی کاٹ کرنے والے اور دین کو رونق بخشنے والے ہیں
ساحب المشرب الهنی و تحقیق   فلا یقتدی بقیل و قالا
جو تحقیق اور سچائی کا راستہ چلتے ہیں   اور فضول کی بحث کے پیچھے نہیں پڑتے
مرجع للرشاد قولا و فعلاً   ملجاء للهدی مالا و حالا
جو قول و فعل سے ہدایت کا مرکز ہیں   اور حال و مستقبل میں ہدایت کا منبع ہیں
ثم لما اعینی السفیه احتیاله   ورأی فیه نکبة و وبالا
پھر جب کہ اس کی تدبیر فیل ہوگئی   اور مناظرہ کرنے میں اس نے مصیبت دیکھی
عند ذکر الشروط قال احتیالا   فکذا لهکذا والا فلا لا
تو اینڈی بینڈی شرطیں کرنے لگا   کہ یہ شرط ہوگی اور وہ ورنہ نہیں نہیں
ویله فر مدبر الم یعقب   وکفی الله المومنین القتالا
کم بخت دم دبا کر مناظرے سے بھاگا   اور مقابلے میں مومنین کیلئے اللہ ہی مددگار ہے
وعلی سید الانام سلام   ماتثیر الصبا سحاباً ثقالا
اور دنیا کے سردار پر سلام ہو   جب تک کہ صبا پانی سے بوجھل بادلوں کو اڑاتی رہے

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے یہ اشعار بھی تواتر مناظرہ کے سلسلے میں اور قاسم العلوم کی کامیابی اور دیانند کے فرار پر ایک سند ہیں جو سوانح کی زینت کے طور پر ہم نے پیش کر دیئے ہیں۔

قاسمی مشن کی تکمیل اور جام عمر لبریز:

حضرت قاسم العلوم جس مقصد کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ پورا ہو گیا۔ ایمان سے متعلق دین اسلام پر جتنے حملے ہو سکتے تھے۔ ان سب کا وہ دفاع کر چکے اور اسلام کی حقانیت کا ڈنکا بجا چکے ہیں۔ لہٰذا مدعائے زندگی پورا ہونے کے بعد اب سفرِ آخرت پر روانہ ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ حافظ محمد احمدؒ صاحب سے روایت کرتے ہوئے مولانا محمد طیب لکھتے ہیں:

> ’’حضرت والد صاحب (حافظ محمد احمدؒ) نے فرمایا کہ جب مباحثہ شاہجہان پور ہو چکا اور حضرت مولانا (محمد قاسم صاحب) نانوتوی مظفر و منصور ہو کر واپس تشریف لے آئے تو مولانا محمد یعقوب صاحب (صاحب کشف) نے فرمایا کہ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا اور وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جھتے میں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت اس کے بندوں پر پوری ہو جائے۔ سو وہ اس میلہ خداشناسی (مباحثہ شاہ جہانپور) میں ہو چکی۔‘‘

(ارواح ثلاثہ روایات الطیب ۲۵۴)

دسواں باب:

محبوبِ حقیقی سے ملاقات کی بنیاد
تیسرے حج کے بقیہ حالات

آخری حج ۱۲۹۷ھ کے بعض حالات:

سفرِ آخرت اور محبوب حقیقی سے ملاقات کی بنیاد آپ کا آخری سفرِ حج تھا۔ اللہ کے لئے سفرِ حج میں سخت بخار کے رفع ہونے کے بعد ساتھ ہی کھانسی کا مستقل مرض جو ضیق النفس کی صورت اختیار کر گیا تھا وہی جان لیوا ثابت ہوا۔ ہم تیسرے حج کے ماتحت آپ کے حالات مفصل لکھ چکے ہیں لیکن بعض اجزا جو رہ گئے تھے وہ مختصر یہ ہیں کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب اور دیگر بہت سے اہل اللہ علماء و صلحا اور شاگردوں کے ساتھ توکل علی اللہ آپ کو بھی لے لیا گیا۔ یہ قافلہ حجاج بمبئی کی راہ سے جدے پہنچا اور وہاں سے مکہ مکرمہ۔ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب اور خود آپ کے مکتوب بنام حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری میں تفصیلات گذر چکی ہیں۔ تاہم مختصراً یہ کہ:

> ”شوال ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں روانہ ہوئے اور ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء کے اول میں پھر اپنے وطن کو واپس ہوئے۔“ (سوانح قاسمی یعقوبی)

حج بدل والد محترم شیخ اسد علی کی طرف سے:

اگر چہ قاسم العلوم اس سے پہلے فرض اور نفلی حج ادا فرما چکے تھے لیکن مولانا حکیم منصور علی خان صاحب آپ کے شاگرد جو اس حج میں رفیق سفر تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب مذہب منصور میں صاف لکھا ہے کہ:

> ”۱۲۹۴ھ میں آخر حج اپنے والد ماجد کی طرف سے کیا تھا۔ میں بھی مولانا صاحب کے ہمراہ علی گڑھ سے بیت اللہ شریف گیا تھا۔“ (مذہب منصور حصہ دوم)

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اپنا ارادہ ان سے ظاہر کیا ہے، جبھی تو وہ اس وثوق سے لکھتے ہیں کہ یہ حج اپنے والد صاحب کی طرف سے کیا تھا۔

تاریخ روانگی:

مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی تذکرۃ الرشید میں لکھتے ہیں کہ حضرت گنگوہی (جو کہ امیر حج تھے):

> ”اپنے مجمع کو ساتھ لے کر بارہویں شوال (۱۲۹۴ھ) کو سہارنپور کے اسٹیشن پر ریل پر سوار ہوئے۔“ (تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۳۰ جلد اول)

فتوحات قاسمی:

مولانا گیلانی نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سے خود سنا انہوں نے فرمایا کہ:

> ”حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ریل پر جس وقت سوار ہوئے اس وقت آپ کے پاس کچھ نہ تھا لیکن جونہی سہارنپور سے گاڑی آگے بڑھی کچھ نہیں معلوم کہ کس نے یہ خبر پھیلا دی کہ فلاں گاڑی سے مولانا نانوتوی سفر حج کیلئے جا رہے ہیں نتیجہ یہ تھا کہ جس قابل ذکر سٹیشن پر بھی گاڑی ٹھہرتی تھی۔ خلق اللہ کا ایک ہجوم اس پر نظر آتا تھا۔ لوگ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے اس ڈبے تک پہنچتے تھے جس میں آپ جلوہ فرما تھے۔ ملاقات و مصافحہ کے بعد ملنے والے عام ہدایا اور تحف کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی استطاعت اور

> ہمت کے مطابق حضرت والا کی خدمت میں رقمیں بھی پیش کرتے چلے جاتے تھے کہتے کہ پھلوں اور مٹھائیوں کا ڈھیر تھا جو جمع ہو گیا تھا۔“

(سوانح قاسمی گیلاتی صفحہ ۲۵ جلد سوم)

اٹاوہ میں کچھ قیام:

واقعات اور تذکرۃ الرشید کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ غازی آباد سے الہ آباد جانے والی گاڑی بدلی گئی۔ تا آنکہ گاڑی اٹاوہ کے سٹیشن پر پہنچی۔ یہاں مولانا محمد مظہر صاحب صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور کے سالے منشی محمد نذیر صاحب تحصیلدار تھے انہوں نے اور نواب ممتاز علی صاحب نے اٹاوہ میں اتار لیا اور سب قافلے کی دعوت کی۔ وہاں سے پھر ریل پر سوار ہوئے تا آنکہ الہ آباد پہنچے۔ الہ آباد سے جبل پور کی ڈاک گاڑی پر بیٹھے کہ جلد پہنچ جائیں۔ بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب بمبئی تک کا کرایہ فی کس پچیس روپیہ پڑا۔ اکثر نماز باجماعت ریلوے سٹیشن پر اتر کر اطمینان سے پڑھی جاتی رہی۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ راستے میں کئی کرامتیں ان حضرات سے ظہور میں آئیں۔

کرامت قاسمی:

بمبئی پہنچنے پر حضرت قاسم العلوم کو جو رقمیں نذرانے میں مختلف سٹیشنوں پر عقیدت مندوں نے پیش کی تھیں۔ جب ان کا شمار کیا گیا تو مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

> ”مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کی زبانی فقیر نے سنا ہے کہ میزان سے مطلع ہونے کے بعد آپ (حضرت قاسم العلوم) نے حکم دیا کہ فلاں فلاں صاحب کو تار دے دیا جائے کہ حج کا ارادہ ہو تو میرے پاس بمبئی پہنچ جائیں۔“

(سوانح قاسمی گیلانی جلد سوم صفحہ ۲۹

بمبئی پہنچ کر خلاف امید بائیس دن قیام کرنا پڑا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”بمبئی پہنچ کر قافلے کو بائیس دن تک ٹھہرنا پڑا۔ جہاز کا انتظار تھا۔ مگر آگبوٹ تھا کہ آنے کا نام نہ لیتا تھا۔ لوگ گھبراتے اور تنگ آجاتے تھے۔“

کرامت قاسمی کا ایک صاف مظاہرہ

بمبئی میں جو بائیس روز حجاج کا قافلہ رہا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت مولونا محمد قاسمؒ صاحب نے جن لوگوں کو حج کے لئے بمبئی پہنچ کر اطلاع دی تھی وہ ابھی نہیں پہنچے تھے، مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ایک دن مولانا محمد یعقوبؒ صاحب (قافلے والوں سے) فرمانے لگے کہ آج معلوم ہوا ہے کہ سارے قافلے کو مولانا محمد قاسمؒ صاحب روک رہے ہیں، ان کے چند رفقاء ومتوسلین ضلع مظفر نگر سے آنے والے ہیں، جب تک وہ نہ آجائیں گے، اس وقت تک نہ جہاز آوے اور نہ جاوے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مظفر نگر کا قافلہ جس دن بمبئی پہنچا اسی دن ایک جرمنی جہاز کا حاجی قاسم نے ٹھیکہ لے کر شام ہی کو ٹکٹ کھول دیا۔ ص ۲۳۵''

دیکھئے صاحب کشف حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو کرامت قاسمی کا پتہ چلا کہ انہوں نے جہاز کو روک رکھا ہے، تو ولی را ولی می شناسد کے مطابق چلا اُٹھے اور راز فاش کر دیا، مگر حضرت گنگوہی اور مولانا رفیع الدین صاحب جیسے حضرات خاموش رہے۔

یا تو حضرت قاسم العلوم سہارنپور سے ریل میں سوار ہوئے ہیں تو اُن کا ٹکٹ حضرت گنگوہی نے خریدا تھا، اور یا اب یہ حال ہے کہ خود ایک قافلے کو اللہ پر توکل کے بھروسے لئے جارہے ہیں، بقول راقم الحروف۔

اکیلا ہوں میں کتنے ساتھی ہیں انور
خدا کے کرم پر لئے جا رہا ہوں

میں تو قاسم ہوں اور اللہ دیتا ہے

غرض جو خدا دیتا تھا وہ ساتھیوں کو دے دیتے تھے، رفقا نے کہا بھی کہ اپنے پاس بھی تو کچھ رہیئے تو بے ساختہ یہ حدیث پڑھی:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰہُ یُعْطِیْ میں تو قاسم ہوں اور اللہ دیتا ہے

مطلب یہ ہے جو دیتا ہے وہ تو دیتا ہی رہتا ہے، لہٰذا میں جو سب اورں کو دے دیتا ہوں مجھے اور ملتا رہتا ہے پھر غم کس بات کا مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> چھتری کا محصول پینتالیس (۴۵) روپیہ اور تنق کا کرایہ پچیس (۲۵) روپیہ تھا، (اور جدے سے مکہ معظمہ دو منزل کا) شبری کے اونٹ کا کرایہ للعہ (چار روپیہ) تھا اور شغدف کا صہ (پانچ روپیہ)'' (تذکرہ ۲۳۵)

مولانا کے خصوصی تلامذہ میں سے مولانا حکیم منصور علی خاں مراد آبادی پھر حیدر آبادی اپنی کتاب ''مذہب منصور'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا (محمد قاسمؒ صاحب) کے ہمراہ علی گڈھ سے بیت اللہ گیا تھا'' (ص ۱۷۹)

عدن اور جدہ میں جہاز کا پہنچنا

مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ سارا قافلہ کچھ اوپر سو حضرات کا تھا، جن میں مولانا محمود حسن (شیخ الہند) حکیم محمد حسن صاحب (ان کے بھائی) اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب ۷/ شوال (۱۲۹۴ھ) کو وطن سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچ گئے تھے، جہاز میں لمبی لمبی صفیں بندھتیں اور با قاعدہ جماعت سے نماز ہوتی، کپتان عیسائی تھا، بلکہ بہت مانوس ہو گیا تھا، حسب قاعدہ اس نے راحت رسانی کا سرٹیفکیٹ مانگا جو خوشی سے دیا گیا، یہ عربی زبان میں تھا جس پر حضرت گنگوہی کے دستخط تھے، کپتان نے اس کو چوما اور آنکھوں سے لگایا، اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا، اور وہ بھی کپتان کو دے دیا گیا تھا، الغرض بقول مولانا عاشق الٰہی یہ قافلہ آٹھ دن میں عدن پہنچا اور ایک دن رات وہاں ٹھہر کر حجاز روانہ ہوا، چوتھے دن جدہ کی بندرگاہ نظر آنے لگی، سارا قافلہ نہایت آرام وراحت کے ساتھ تیرھویں دن بمبئی سے چل کر جدہ آ پہنچا،

مولانا عاشق الٰہی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

حاجی امداد اللہ صاحب کا استقبال کو آنا

''اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو اپنے لاڈلے اور چہیتے پیارے ہندی قافلے کے جدہ سے

روانہ ہونے کی اطلاع مل چکی تھی، باوجود ضعف ونقاہت کے سنت استقبال اور جوش محبت میں شہر سے باہر ملنے کی خواہش پوری کیے بغیر نہ رہ سکے...... جس وقت قافلہ باب مکہ پر پہنچا تو سب نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت پٹکے سے کمر باندھے ہوئے فصیل کے پاس کھڑے تھے...... خدام سواری سے اتر پڑے اور بغلگیر ہوکر خوب دل کھول کر ملے...... اعلیٰ حضرت سارے قافلے کو اپنی رباط (جائے قیام) میں لائے اور وہیں ٹھہرایا، یہ مکان اعلیٰ حضرت کو اسی سال ملا تھا۔

(تذکرہ جلد اول ص ۲۴۷ـ۲۴۸)

مولانا منصور علی خاں صاحب مذہب منصور میں لکھتے ہیں کہ:

"جدہ میں پہنچ کر چند روز قیام کرنا، سواری نہیں ملی۔"

وجہ یہ تھی کہ مولوی احسن ہندی کو حضرت حاجیؒ صاحب نے جدہ بھیج دیا تھا اور تمام انتظامات کرنے کو فرمایا تھا، اس لئے دوسرے معلمین کو اتنے سارے حجاج کے باعث حسد ہوا اور انہوں نے سواریوں کے حصول میں رکاوٹیں ڈالیں تو حضرت قاسم العلوم بقول مولانا منصور صاحب یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

مانگا کریں گے ہم بھی دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اگلے دن شب کے وقت مکہ معظمہ پہنچے، اور مولانا منصور علی خاں جو خود قافلے میں شریک تھے وہ لکھتے ہیں کہ "قریب صبح صادق کے وہاں داخل ہوئے" وجہ یہ تھی کہ سواری کی دقت کی وجہ سے قافلے کو جدے سے مکہ کو دو حصوں میں بھیجا گیا، ایک جماعت اگلے دن شب کو اور ایک جماعت صبح کو پہنچی تھی، اور بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب ۲۰/ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ کو جدہ سے مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے اور انہی کا بیان ہے کہ:

قاسمیؒ ردیف مولانا محمد منیر

"اونٹوں کے سفر میں اکثر حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب کے ردیف (پیچھے) مولوی محمد منیرؒ صاحب نانوتوی تھے" (۲۴۷)

غسل قاسمی دخول مکہ سے پہلے

مولانا منصور علی خاں صاحب لکھتے ہیں:

"مکہ شریف جب آیا تو (حضرت نانوتوی نے) "غسل فرمایا" ذیقعدہ کا ماہ تقریباً ماہ نومبر کی سردیوں میں تھا پانی بھی جو ہمراہ ہوگا سخت ٹھنڈا ہوگا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی صحت اچھی تھی، جب آپ مکہ معظمہ کی حدود میں داخل ہوئے تو "جناب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بطور استقبال کے تشریف لائے۔" (مذہب منصور ۱۷۹)

معلوم ہوا کہ پہلے قافلے کی قیادت حضرت گنگوہی نے کی ہے اور وہ رات کو پہنچے تھے اور قاسم العلوم کے سپرد دوسرے گروہ کی قیادت ہوگی اس لئے دوسرا قافلہ آپ کے ساتھ صبح کو پہنچا اور اسی میں مولانا منصور علی خاں تھے، صبح کو حضرت حاجی صاحب نے تمام حضرات کو کھانا کھلایا۔

حضرت قاسم العلوم کی جائے قیام مکہ معظّمہ میں

آگے چل کر مولانا منصور علی خاں لکھتے ہیں، اور حاجی صاحب کے گھر کے اوپر کی منزل کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"دروازے کے اوپر کے مکان پر مولانا (محمد قاسمؒ) صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے قیام کیا" ص ۱۷۹

مولانا حکیم منصور خاں صاحب یہ بھی لکھتے کہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی اوپر کے بالاخانے پر ملنے کے لئے تشریف لے جاتے، اور جب حاجی صاحب پر دونوں کی نظر پڑتی تو:

"کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے اور نہایت مؤدب دوزانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ جاتے۔"

لطیفہ

ایک روز کمرے میں مولانا نانوتوی نہ تھے، زینے پر چڑھنے کی آہٹ معلوم ہوئی،

ساتھ ہی نیچے سے ڈھول بجنے کی آواز آئی۔ مولانا گنگوہی کی پیٹھ زینے کی طرف تھی چشتیت کے مذاق میں مولانا نانوتوی کے متعلق فرمانے لگے کہ

"اپنے یاروں (یعنی ڈھول) کو بھی ساتھ لائے۔"

دیکھا تو حضرت حاجی صاحب تھے۔ فرمانے لگے نیچے فقیر مانگ رہے ہیں اور ڈھول وہی بجا رہے ہیں۔ مولانا گنگوہی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت حاجی صاحب کے روبرو مؤدب بیٹھ گئے۔ یہ واقعہ مولانا منصور علی خان کے سامنے ہوا تھا۔ انھوں نے حضرت نانوتویؒ کو سنایا تو مسکرانے لگے۔ (مذاہب منصور صفحہ ۱۸۰)

مسئلہ وحدۃ الوجود اور حاجی صاحب:

مولانا منصور علی خان صاحب اپنے مشاہدات میں سے یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> "جب حضرت حاجی صاحب اوپر تشریف لاتے تو تصوف کے عام مسائل میں سے وحدت الوجود پر تقریر فرماتے۔ جناب مولوی محمد مظہر صاحب اس تقریر پر شبہات پیش کرتے۔ ان کا جواب بھی حاجی صاحب نہایت متانت اور آسان طریقے پر ادا کرتے۔ مولانا (نانوتوی) مرحوم کبھی کوئی شبہ بھی بیان نہ کرتے اسی طرح مولانا رشید احمد صاحب بھی خاموش بیٹھے سنا کرتے اور کچھ چون و چرا نہ کرتے۔"

(مذہب منصور صفحہ ۱۸۰)

مکہ معظّمہ کے اشغال:

یہ حضرات عموماً اپنا وقت یا طواف کعبہ میں گذارتے اور یا حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں بسر کرتے۔ حج کے دن قریب تھے اس لئے ۹/ ذی الحجہ ۱۲۹۴ھ کو حج سے اور بعد ازاں ارکان حج سے ۱۲/۱۳ ذی الحجہ تک فارغ ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ کو روانگی:

حج کے بعد یہ مقدس حضرات حکیم ضیاء الدین رامپوری کے سوا مدینہ منورہ کو روانہ ہوئے اور بقول مولانا عاشق الٰہی صاحب بعد حج، سلطانی راستے سے مدینۃ الرسول روانہ

ہوئے۔ (تذکرہ صفحہ ۲۴۹ جلد اول)

مولانا منصور علی خان صاحب لکھتے ہیں:

> ”جب منزل بمنزل، مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا جہاں سے روضہ پاک جناب لولاک ﷺ نظر آتا تھا جناب مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم نے اپنے نعلین اتار کر بغل میں دبالیں اور پابرہنہ چلنا شروع کیا۔ مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے۔“ (مذہب منصور صفحہ ۱۸۱)

یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشق کا نتیجہ اور جسمانی مشقتوں کے عادی ہونے کے باعث پاؤں کے پتھروں سے زخمی ہونے کی پروا نہ کرنے کا جذبہ مجاہدانہ تھا۔ ورنہ خود مولانا منصور نے لکھا ہے کہ میں بھی جوتے نکال کر چلا مگر پاؤں نے جواب دے دیا اور جوتے پہننے پر مجبور کر دیا۔ اللہ اللہ جب مدینۃ النبی ﷺ کا مسافر اپنے دل میں بے شمار جذبات لے کر مدینے کی راہ میں ہوتا ہے اور اس کے تخیلات میں یہ سمایا ہوتا ہے کہ اب گنبد خضرا پر نگاہ محبت پڑنے کا وقت آیا چاہتا ہے تو دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ الٰہی تو گواہ ہے کہ میرا دل ریا سے قطعاً پاک ہو کر یہ لکھنے پر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ یہ راقم الحروف ۹/ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ مطابق ۱۵/ جون ۱۹۵۹ء کو پیر کے دن حج سے مشرف ہو کر جب مدینہ منورہ کی طرف ایک ماہ کے بعد روانہ ہوا اور ۱۴ محرم ۱۳۷۸ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۵۹ء کی رات کے آخری حصے میں مدینہ منورہ میں داخل ہوا تو مکہ سے جدہ اور جدہ سے مدینہ منورہ کے درمیان اس قلبی واردات کو جو دل پر گذریں وہ حسب ذیل اشعار میں میرے قلم سے ٹپک پڑیں۔ بس میں بیٹھا ہوا لکھتا جا رہا تھا۔

سبز گنبد اور شوق دید مدینہ:

مدینے کی جانب چلا جا رہا ہوں   طبیعت میں راحت سی اک پا رہا ہوں
تمنا بر آنے کو ہے اپنے دل کی   تمنا کی دنیا لئے آ رہا ہوں
نظر آنے والا ہے اب سبز گنبد   میں آج اپنے پیارے کے گھر جا رہا ہوں
فدا ان پہ جاں اپنی جا کر کروں گا   کہ جن کے لئے جاں لئے جا رہا ہوں
میں سر اپنا رکھ دوں گا قدموں میں ان کے   بہت اپنے ماضی پہ شرما رہا ہوں

جبیں پر پسینہ ہے، آنکھوں میں آنسو بآبِ ندامت، بہا جارہا ہوں
مجھے بخشوالیں گے رحمت سے اپنی یہ امید لے کر، چلا جارہا ہوں
مرا غنچہ دل ہے کھلنے کو انور
انہیں دیکھ کر جن کا غم کھا رہا ہوں

حضرت قاسم العلوم جو عاشقِ رسول اللہ ﷺ اور ولی کامل تھے وہ ننگے پاؤں دیار حبیب ﷺ کی طرف نہ چلتے تو کون چلتا۔ مولانا منصور صاحب لکھتے ہیں:

مدینہ منورہ میں درود:

> "مولانا (محمد قاسم صاحبؒ) مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تاریک میں اسی طرح چل کر پابرہنہ پہنچ گئے۔" (مذہب منصور حصہ دوم)

لیکن جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ رات ہونے کی وجہ سے باب مدینۃ النبی ﷺ بند تھا اس لئے:

> "قافلے کو مناخہ (اونٹوں کے ٹھہرنے کی جگہ) میں ٹھہرنا پڑا۔ علی الصباح (دروازہ کھلنے پر) حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی) مع دیگر حضرات صلوٰۃ صبح ادا کرنے کے لئے قافلے سے باہر نکلے اور مسجد نبوی کی جانب روانہ ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر روضہ اطہر سرور کائنات ﷺ پر حاضر ہوئے۔ اور بڑے جوق وشوق کے ساتھ صلوٰۃ وسلام عرض کیا۔ اس کے بعد مواجہہ شریف: (حضور ﷺ کے چہرہ انور کے بالمقابل) مراقب ہو کر بیٹھ گئے یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا۔"

(تذکرۃ الرشید جلد اول صفحہ ۲۴۹)

اپنے شیخ الحدیث شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی مہاجر مدینہ کی خدمت میں:

روضہ حضور پر نور ﷺ پر مراقبہ کرنے اور تصور جاناں میں سر جھکائے ہوئے حضرات میں قاسم العلوم بھی یاد میں محو تھے۔ اور بقول غالب ؎

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

مراقبہ اور جمال دوست سے سرشار ہو کر اٹھے اور دل ہی دل میں ہجر و فراق حبیب کے احوال اور حالات کے ذکر سے فارغ ہوئے تو دہلی کے استاذ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کدہ پر پہنچے۔ جس طرح حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیر و مرشد حضرت قاسم العلوم پر مہربان تھے۔ اسی قدر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی جو ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ وہ بھی قاسم العلوم کے شفیق استاد تھے۔ جن سے حضرت قاسم العلوم نے دہلی میں حدیث کی کتابیں پڑھی تھی۔ ہم آپ کے حالات قاسم العلوم کے اساتذہ کے عنوان میں پہلے لکھ چکے ہیں۔ دیکھ کر شاد اور باغ باغ ہو گئے مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”شاہ (عبدالغنیؒ) صاحب کو اس مجمع کے ساتھ جو کچھ تعلق یگانگت تھا اس کا پوچھنا ہی کیا؟ بہت مسرور ہوئے اور عرصے تک حالات پرسی میں مشغول رہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ شاہ صاحب ”نہایت کم گو تھے۔ اکثر اپنی کیفیت میں مستغرق و مستلذ رہتے اور بلا ضرورت ایک بات بھی زبان مبارک سے نہ نکالتے تھے۔ مجمع میں جو اجانب اور ناواقف اصحاب تھے ان سے بھی شاہ صاحب نے اخلاق کریمانہ کے ساتھ مصافحہ فرمایا۔“ (صفحہ ۲۳۹)

اس عبارت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے ان حضرات کی ملاقات ہوئی لیکن مدینہ منورہ میں کہاں قیام فرمایا اس کے متعلق مولانا منصور علی خان صاحب لکھتے ہیں:

> ”مدینہ شریف میں جناب شاہ عبدالغنی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔“

(مذہب منصور صفحہ ۱۸۱)

مدینہ منورہ میں بیس روز قیام اور مقامات مقدسہ سے شرف اندوزی:

حضرت قاسم العلومؒ اور آپ کے دیگر رفقائے حج نے بیس روز مدینہ منورہ میں قیام

فرمایا۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”مدینہ منورہ میں اس مقدس قافلے نے کم وبیش بیس روز قیام کیا۔ مشاہد و مقامات متبرکہ پر حاضر ہو کر کیفیات غریبہ وانوار عجیبہ کی گلچینی فرمائی۔ حضرت شاہ صاحب نے ایک شخص ملا سفر نامی بخاری کو ان حضرات کے حوالے فرما دیا تھا کہ جہاں حاضر ہونا چاہیں وہاں لے جائیں۔ چنانچہ مسجد قبا (مسجد) قبلتین (جس میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا) ابیار سبعہ و جبل احد وغیرہ سب ہی زیارت گاہوں پر حاضری دی اور خوب خوب گلہائے نعم خداوندی سے دامن دل بھرا۔“ (تذکرۃ جلد اول صفحہ ۲۴۰)

قاسم العلوم اور عشق رسول ﷺ:

اولیائے کرام اور علمائے عظام کی اس جماعت کے عظیم الدرجات عالم و ولی حضرت قاسم العلومؒ نے مقاماتِ مقدسہ کی جس رنگ میں زیارت کی وہ سرسری زیارت نہ تھی۔ بلکہ ان مقامات کے انوار و تجلیات سے جس قدر برکات اور رحمتیں حاصل کر سکتے تھے بقدر ظرف انکو اپنے دامن دل میں بھر لیا۔ قیام مدینہ کے دوران میں روضہ اقدس پر حاضری اور درود و سلام کی کیفیت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اس لذت کو تو وہی جانتے ہیں جن کا حال یہ تھا کہ حضور پُر نور ﷺ کے نام نامی کے سننے پر بقول مولانا منصور:

> ”اسم گرامی جناب رسالت مآب ﷺ سن کر (قاسم العلومؒ) کے لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔“ (صفحہ ۱۸۱)

دراصل حضرت قاسم العلوم عشق خدا اور عشق رسول اللہ ﷺ دونوں عشقوں سے سرشار تھے۔ عشق رسول ﷺ کے دعویدار ذرا مولانا محمد قاسم صاحب کے حسب ذیل اشعار پڑھیں جن کے ایک ایک لفظ سے عشق رسول ﷺ کی آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اپنے ایک طویل قصیدہ نعتیہ کے آغاز میں بہار اور چمن پھولوں اور کلیوں، شبنم، پرندوں کے چہچہوں اور بلبلوں کے نغموں، نسیم صبح کی اٹھکھیلیوں کا ذکر کرتے کرتے عشق رسول میں پھر اس طرح جھومتے نظر آتے ہیں۔

ثنا کر اس کی فقط قاسم اور سب کو چھوڑ   کہاں کا سبزہ، کہاں کا چمن، کہاں کی بہار

تو فخر کون و مکاں، زبدہ زمین و زماں امیر لشکر پیغمبراں شہ ابرار
تو آئینہ ہے کمالاتِ کبریائی کا وہ آپ دیکھتے ہیں اپنا جلوہ دیدار
گناہ کیا ہے، اگر کچھ گنہ کئے میں نے تجھے شفیع کہے کون گر نہ ہوں بدکار
یہ سن کے آپ شفیع گناہگاراں ہیں کئے ہیں میں نے اکھٹے گناہ کے انبار
امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا نام شمار
جیوں، تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں مروں تو کھائیں مدینے کے مجھ کو مرغ و مار
جو یہ نصیب نہ ہو اور کہاں نصیب مرے کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کی تیرے قطار
اڑا کے باد، مری مشت خاک کو پس مرگ کرے حضور کے روضے کے آس پاس نثار
دے یہ رتبہ کہاں مشت خاک قاسم کا کہ جائے کوچہ اطہر میں تیرے، بن کے غبار
ہوس نہیں مجھے اس سے بھی کچھ رہی لیکن خدا کی اور تری الفت سے میرا سینہ فگار
وہ تیر غم ہے ترے عشق کا مرے دل میں ہزار پارہ ہو دل، خون دل میں ہوں سرشار
لگے وہ آتش عشق اپنی جان میں جس کی جلادے چرخ ستمگر کو ایک ہی جھونکار
صدائے صور قیامت ہو اپنا اک نالہ بجائے برق ہو اپنی ہی آہ آتش بار
چبھے کچھ ایسے، مرنے نوک خارِ غم دل میں کہ چھوٹے آنکھوں کے رستے سے ایک لہو کی پھوار
وہ آپ رحم کریں گے مگر سنیں تو سہی شکستِ شیشہ دل کی ترے کبھی جھنکار
بس اب درود پڑھ اس پر اور اس کی آل پہ تو جو خوش ہو تجھ سے وہ، اور اس کی عترت اطہار
الٰہی اس پہ، اور اس کی آل پر تو بھیج
وہ رحمتیں کہ عدد کر سکے نہ جس کو شمار

اس نعتیہ قصیدہ کا لکھنے والا قاسم العلومؒ کس قدر عشق رسول کا تیر دل پر کھائے ہوئے نظر آتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اگر قاسمی عشق کے ذروں کو ہم لوگوں پر تقسیم کر دیں تو ہر شخص عشق رسول سے سرشار ہو جائے۔ دعوائے محبت رسول ﷺ کرنے والے ان اشعار سے اندازہ لگائیں مقام ولایت و عشق کا۔

اس لئے مولانا منصورؒ نے جو حضرت قاسم العلوم کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اسم گرامی

جناب رسالت مآب ﷺ سن کر (مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے) لرزہ بدن پر پڑ جاتا تھا اور چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ تعجب کی بات نہیں۔ اس سے نہ صرف ان کا عاشق رسول ﷺ ہونا پایا جاتا ہے بلکہ رسول ﷺ کے ساتھ آپ کی طرف سے ادب کا پورا لحاظ اور مظاہرہ بھی پایا جاتا ہے۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کو واپسی:

الغرض مدینہ منورہ میں حضرت قاسم العلومؒ اور آپ کے رفقاء تقریباً بیس روز قیام کر کے مکہ مکرمہ واپس ہوئے اور حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر ایک ماہ مقیم رہے۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب لکھتے ہیں:

> ”غرض مدینہ منورہ میں تخمیناً بیس یوم قیام فرما کر یہ مقدس مجمع مکہ واپس ہوا۔ اور پھر باطمینان ایک مہینے سے زیادہ مکہ معظمہ میں قیام کیا۔“ (صفحہ ۲۴۱)

حاجی صاحبؒ نے قاسم العلوم کے متعلق کیا فرمایا:

اسی حج کے سفر میں قیام مکہ کے اثناء میں الہامی زبان، ترجمان علم لدنی حضرت حاجی صاحبؒ نے قاسم العلومؒ کے متعلق فرمایا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ”اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولوی (محمد قاسم) صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۱۴۔۱۵)

یہ لکھ کر عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”ہائے افسوس یہ خبر نہ تھی کہ اس کے یہ معنی ہیں اور یہ واقعہ یوں اچانک آجائے گا۔ چند بار شدت مرض ہو کر اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی اب کی بار بھی وہی خیال باندھ رکھا تھا۔ کیا کیجئے جو باتیں رہ گئیں رہ گئیں۔ اب سوائے افسوس کیا ہو سکتا ہے۔ جو تحریریں ناتمام رہ گئیں اب بھلا کون ان کو تمام کر سکتا ہے اور جنہیں کچھ نقصان ہو گیا ان کی تکمیل کی اب کیا صورت ہو سکتی ہے۔“ (سوانح صفحہ ۱۵)

جب قاسم العلومؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحب نے پہلا حج ادا کیا تھا تو اس وقت حاجی صاحب نے فرمایا تھا:

> ''اور خود احقر سے ارشاد فرمایا تھا اول حج میں جب حاضر خدمت ہوا تھا کہ مولوی رشید احمد میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے اور مولوی محمد قاسم صاحب کو فرمایا تھا کہ ایسے لوگ بھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔''

(سوانح صفحہ ۱۴)

مولانا عاشق الٰہی صاحب نے ہی یہ بھی لکھا ہے کہ مکہ معظمہ میں زیادہ قیام کے باعث رفقا گھبرا اٹھے۔ کیونکہ خرچ ختم ہو چلا تھا۔ حضرت گنگوہی سے کسی کو کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس لئے حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا گیا۔ تو حاجی صاحب نے ہندوستان کو روانگی کا مشورہ دیا۔ چنانچہ پھر قصد روانگی فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روس اور ترکی کی جنگ ہو رہی تھی اور اطلاع ملی تھی کہ پلوماروس نے فتح کر لیا۔ پھر ارادہ میں تذبذب ہوا۔ شاید ان حضرات کا ارادہ جہاد میں شرکت کر کے روس سے لڑنے کا ہو۔ جہاد شاملی میں جنہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہو انہیں روس کے خلاف جہاد کرنے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی اور اس قافلے کے ہندوستان سے روانہ ہونے کے وقت لوگوں کو اسی قسم کے شبہات تھے کہ یہ حضرات جہاد کیلئے جا رہے ہیں۔ لیکن حاجی صاحب نے فرمایا:

> ''جاؤ بسم اللہ کرو جو کچھ مقدر تھا ہوا اور جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ الغرض اعلیٰ حضرت کے لاڈلے مسافر رخصت ہو کر جدہ پہنچے اور جہاز جانے کو تیار کھڑا تھا گو تنگی جگہ کی تکلیف تھی مگر یہ کہہ کر اسی کے ٹکٹ لے لئے کہ جب مکہ چھوٹ گیا تو ذرا سی راحت کے انتظار میں جدہ پڑے رہنے سے کیا فائدہ اسی دن شام کو جہاز روانہ ہو گیا اور تمام حضرات تیرھویں دن بخیر و عافیت بمبئی پہنچ گئے اور بمبئی سے گنگوہ۔ الحمد اللہ کہ سارا سفر سہولت و راحت کے ساتھ انجام کو پہنچا۔ البتہ مولانا محمد قاسم صاحب کو علالت لاحق ہوئی جو بظاہر خفیف محسوس ہونے کی وجہ سے سفر کی مزاحم یا رفقا کی پریشان بنانے والی تو نہ ہوئی۔ مگر آہستہ آہستہ بڑھ کر آخر کار وہی بیماری مرض الموت بنی اور تیسرے سال ۱۲۹۷ھ میں جان ہی لے کر گئی۔''

(تذکرۃ الرشید صفحہ ۲۴۱۔ ۲۴۲)

قاسم العلوم کا مرض موت:

مکہ محترمہ سے بمبئی کو واپسی میں حضرت قاسم العلومؒ کی حالت بے حد خراب ہوگئی تھی۔ ہم اس سلسلے میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحریر کردہ سوانح قاسمی سے حج کے عنوان کے ماتحت ہدہ پہنچ کر جو مکہ اور جدہ کے درمیان سڑک پر منزل ہے۔ بخار ہو جانا پھر پہلے ہی جہاز میں سوار ہونے کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ جب یہ حضرات کشتیوں میں سوار ہو کر جہاز میں بیٹھنے کیلئے چلے تو:

> ''اس قدر تیز و تند ہوا چلنے لگی کہ کشتیاں دونوں ادھر ادھر قریب غرق ہو جانے کے جھک جاتی تھیں ہر ایک کا رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ مگر مولانا (محمد قاسم صاحب) مرحوم اپنے حال پر رہے۔'' (مذہب منصور صفحہ ۱۸۲)

ذرا قاسم العلومؒ کے مجاہدانہ اور بے خوف دل کا اندازہ لگائیے۔ بہر حال جہاز میں سوار ہوئے اور دو روز کے بعد قاسم العلوم کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔

بے ہوشی، کھانسی، حد سے زیادہ کمزوری، رفقائے حج کی مولانا کے بارے میں مایوسی، جہاز میں وبائی بیماری کے پھوٹ پڑنے روزانہ ایک دو آدمیوں کے مر جانے، بمبئی تک پہنچنے اور بمبئی سے نانوتہ کا سفر طے کرنے کا حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں وہاں ملاحظہ فرمائیے۔ البتہ جہاز میں قاسم العلوم کی حالت کے بارے میں مولانا منصور علی صاحب کے بیانات قابل درج ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

> ''بار بار (جہاز میں) استفراغ (قے) ہوتا تھا۔ یہ خادم اٹھا کر بٹھاتا، سلفچی میں استفراغ کراتا تھا، صرف صفرا ہی صفرا نکلتا تھا۔ کلی کرا کر پھر لٹا دیتا تھا۔ دن اور رات میں کسی وقت اس قدر سکون نہ تھا کہ اچھی طرح خواب راحت ہو، ذرا دیر ہوئی کہ استفراغ کا تقاضہ ہوا۔ جب نماز کا وقت آتا وہ استفراغ موقوف ہو جاتا اور بیٹھ کر اطمینان سے نماز پڑھتے۔ پھر (نماز کے بعد) وہی دورہ پے در پے شروع ہو جاتا۔ آٹھ روز تک یہی حالت رہی۔'' (مذہب منصور صفحہ ۱۸۵)

حالت اتنی خراب ہوگئی کہ بقول مولانا محمد یعقوب صاحب ''ایک دن نوبت یہ

پہنچی کہ ہم سب مایوس ہو گئے۔" حکیم صاحب مولانا منصور علی نے جہاز میں بڑی خدمت کی۔ لکھتے ہیں کہ:

> "ایک دن مجھ کو کئی رات جاگنے کی وجہ سے زیادہ تھکن اور اضمحلال ہو گیا اس رات کو جناب مولوی محمد منیر صاحب پاس بیٹھے رہے۔" (صفحہ ۱۸۵)

غرض عدن میں قرنطینہ ہونے اور مکلہ حضر موت کی بندرگاہ میں قدرے قیام کے بعد بقول مولانا منصور علی صاحب:

> "جب بمبئی پہنچے تو تے موقوف ہوگئی۔ اٹھنے بیٹھنے لگے ورنہ جہاز میں ہر وقت لیٹے رہتے تھے۔"

بہر حال جب بمبئی پہنچے ہیں تو بہت کمزوری تھی۔ دو تین دن بمبئی قیام کرنے کے بعد نانوتے کو روانہ ہوئے۔

سفرِ حج سے واپسی ربیع الاول ۱۲۹۵ھ مارچ ۱۸۷۸ء:

سفر سے واپسی اور بمبئی میں درود کا زمانہ تقریباً ربیع الاول ۱۲۹۵ھ کا زمانہ تھا۔ اور انگریزی مارچ کا مہینہ ظاہر ہے کہ موسم بہار کا تھا اور مناسب و معتدل سردی کے دن تھے۔ مولانا منصور علی خان لکھتے ہیں۔ نقاہت باقی تھی۔ ریل میں اٹاوہ تک لیٹے ہوئے تشریف لائے۔ میری رانوں پر قدم مبارک رکھ لیا کرتے تھے۔ اٹاوہ سے مجھ کو وطن جانے کی اجازت فرمائی اور چار روپیہ اپنے پاس سے عنایت کئے اور پانچ روپیہ مکہ شریف میں مسجد ابراہیم علیہ السلام کی حد میں مجھ کو لے جا کر عطا فرمائے تھے۔ میں جب وطن (مراد آباد) آیا تو چند روز قیام کر کے نانوتہ پہنچا۔ اس وقت مولانا صاحب کو تندرست پایا۔

بمبئی سے جبل پور کو جاتے ہوئے راستے میں بقول مولانا محمد یعقوب صاحب ہوائیں گرم چلنے لگیں اور جبل پور کے میدانوں میں دوپہر کو لو چلنے لگی اور مولانا کی طبیعت بگڑی لیکن نارنگی، لیموں ساتھ تھے ان کو کھلانے اور پانی پلانے سے طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی۔ بہر حال گھر پہنچ کر طبیعت ٹھیک ہو گئی تھی مگر کھانسی ٹھہر گئی تھی۔

حج سے واپسی پر تقریباً پندرہ روز بعد ملا جلال اور دیگر کتابوں کا درس:

حکیم منصور علی خان صاحب کا بیان آپ نے پڑھ لیا ہے کہ حج سے مراجعت پر چند روز وطن میں قیام کرنے کے بعد نانوتے پہنچے تھے تو حضرت کو تندرست پایا تھا اور ان ہی دنوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”مجھ کو ملا جلال اول سے آخر تک پڑھایا۔ بلکہ دوسرے طلبہ بھی جو پڑھنے لگے تھے۔ ان کو اسباق سے بھی سماعت کرتا تھا۔ لیکن پہلی سی قوت نہ تھی۔“

ضیق النفس اور کھانسی میں برابر دینی خدمات:

۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء سے حج سے واپس ہوتے ہوئے بخار کے ساتھ جو کھانسی شروع ہوئی تھی وہ چلتی ہی رہی اور اس نے عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ لیکن آپ اس اثنا میں بھی دین کی خدمات، دارالعلوم دیوبند کے فروغ اور ترقی میں سعی اور عیسائیوں اور آریوں سے مناظروں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ دیوبند میں طلبہ کو بھی پڑھاتے رہے۔ سائلین اور ان کے علمی شبہات کے تحریری طور پر جوابات بھی دیتے رہے۔ آپ کی کھانسی اور ضیق النفس کے بارے میں حج سے واپسی کے متصل بعد کی حالت کے متعلق خود مولانا محمد یعقوب صاحب سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”کبھی کبھی دورہ سانس کا ہونا، زیادہ بولنا، دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا پھر اس میں بھی کسی قدر تخفیف ہوئی۔“
> (صفحہ ۲۱)

ارواح ثلاثہ میں میر شاہ خان صاحب نے جنہوں نے حضرت قاسم العلوم کی صحبتیں اٹھائی ہیں اور آپ کے ساتھ بھی رہنے کا اتفاق ہوا ہے ان سے حضرت قاسم العلوم کے بارے میں حج کے بعد کی کھانسی سے متعلق حسب ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب قاسم العلوم اپنے شاگرد عزیز شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے مکان پر حج کے بعد مقیم تھے۔ حکیم عبدالسلام جو کسی وقت نواب واجد علی شاہ کے خاص طبیب بھی رہ چکے تھے وہ اور محمد خان صاحب خورجوی اور میر شاہ خان صاحب تینوں حضرات دیوبند آئے۔ اس وقت آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ امیر شاہ خان صاحب روایت کرتے ہیں کہ مولانا کا لباس اس وقت یہ تھا:

''سر پر میلا اور پھٹا ہوا عمامہ تھا جس میں لیرے پڑے ہوئے تھے اور چونکہ سردی کا زمانہ تھا اس لئے ایک دھوتر کی نیلی رنگی ہوئی مرزئی پہنے ہوئے تھے جس میں بند لگے ہوئے تھے اور نیچے نہ کرتا تھا اور نہ انگرکھا تھا۔ اور ایک رزائی اوڑھے ہوئے تھے۔ جو نیلی رنگی ہوئی تھی جس میں مومی کی گوٹ لگی ہوئی تھی جو پھٹی ہوئی تھی اور کہیں بالکل اڑی ہوئی تھی۔ میں نے سلام کر کے مصافحہ کیا۔ اور عرض کیا کہ حکیم عبدالسلام حضور کی زیارت کے لئے آرہے ہیں (یہ ملیح آباد کے رہنے والے مفتی حسین احمد صاحب کے صاحبزادے تھے۔)

حکیم عبدالسلام مولانا محمد قاسم صاحب کے سامنے لکھنؤ کے مناظروں کی کیفیت اور کبھی مرزا حسن علی محدث کے حالات بیان کرتے رہے۔ مگر بقول میر شاہ خان صاحب مولانا خاموش رہے۔ میر شاہ خان صاحب یہ چاہتے تھے کہ حکیم عبدالسلام کے سامنے مولانا کسی مسئلہ میں تقریر فرمائیں کہ ان پر حضرت کی شخصیت روشن ہو۔ لیکن مولانا خاموش ہی رہے۔ یہ عشا کی نماز کے بعد کا واقعہ ہے۔ تیسرے پہر اگلے روز حکیم صاحب نے دارالعلوم دیوبند کی سیر کی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کے درس میں بیٹھے اور یہ سب کچھ دیکھ کر بقول میر شاہ خان صاحب وہ محمد خان صاحب خورجوی سے کہنے لگے:

''مولوی محمد یعقوب صاحب حدیث ایسی پڑھاتے ہیں جیسے میرے والد صاحب پڑھاتے ہیں مگر مرزا حسن علی محدث کی سی نہیں پڑھاتے اور حضرت مولانا (محمد قاسم صاحب) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''پیراں نمی پرند مریداں می پرانند'' جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو مجھے بہت ملال ہوا۔

خدا کی شان کہ اسی روز حکیم مغیث الدین صاحب سہارنپور کے صاحبزادے حکیم مشتاق احمد صاحب مولانا کی خدمت میں آپہنچے اور مولانا سے عرض کیا کہ ایک پادری نے آکر قرآن پر یہ اعتراض کیا کہ قرآن میں توریت وانجیل کی نسبت محرف ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور قرآن ہی میں اس کا بھی اقرار ہے کہ خدا کے کلام کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ قرآن کا صریح تعارض وتناقض بیان ہے۔

یہ سن کر مولانا (محمد قاسم صاحب) کو جوش آگیا اور تقریر جواب شروع کردی اور

> دن کے آٹھ بجے سے کھانے کے وقت تک تقریر فرمائی اور حکیم مشتاق احمد صاحب کھانے کے بعد چلے گئے۔ ظہر کے بعد حکیم عبدالسلام نے پھر یہی مضمون چھیڑ دیا اور مولانا نے ظہر سے عصر تک یہی مضمون بیان فرمایا اور مغرب سے عشا تک یہی مضمون بیان فرمایا اور عشا کے بعد پھر یہی مضمون شروع کر دیا اور حکیم عبدالسلام نہایت شوق سے اس مضمون کو سنتے اور بجا ہے حضور، بجا ہے حضور کہتے رہے۔ جب (رات کے) بارہ بج گئے تب میں نے زور سے کہا کہ حکیم صاحب اٹھئے بہت دیر ہوگئی اور اب مولانا کو آرام کرنے دیجئے تب حکیم عبدالسلام اٹھے اور تقریر ختم ہوئی۔ مولانا کو کھانسی کا مرض تھا مگر آج ایسا اتفاق ہوا کہ اثنائے تقریر میں ایک مرتبہ کھانسی نہ اٹھی اور تقریر کی برجستگی میں ذرا بھی خلل نہ آیا۔ اب تو حکیم صاحب مولانا کے نہایت معتقد ہوگئے اور وہاں سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے اٹھے۔'' (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۲۹ تا ۲۳۳)

اس صحیح اور پختہ روایت سے جہاں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں یہ بھی واضح ہو کر سامنے آیا کہ اس روز مولانا کو کھانسی نہ اٹھی حالانکہ کھانسی کا مرض مستقل تھا۔

کھانسی کے باوجود درس وتدریس:

ایک اور جگہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ مولانا نانوتوی کی کھانسی کا نقشہ اس وقت کا اپنے الفاظ میں کھینچتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''جناب مولوی احمد علی صاحب کو فالج ہو گیا تھا۔ اس میں (مولانا محمد قاسم صاحب) سہارنپور تشریف لے گئے اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب کو مظفر نگر سے بلایا تھا اسی روز گئے اور پھر شام کو واپس میں ریل میں آئے۔ تکان کے سبب طبیعت علیل ہوگئی مگر چند روز کے بعد صحت ہوگئی جب کچھ قوت آئی علاء الدین بندہ زادہ کی استدعا پر کچھ پڑھانا بھی شروع کیا بعد عصر کچھ ترمذی کی ایک دو حدیث ہوتی۔ جب تک کھانسی نہ اٹھتی بیان فرماتے تھے اور جب کھانسی کم ہوتی تب بھی ذرا ٹھہر کر بیان فرماتے اور جب شدت ہو جاتی موقوف فرما دیتے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۷۔۲۸)

یہ ۱۲۹۷ھ کے ابتدائی مہینوں یعنی ربیع الآخر اور جمادی الاولیٰ کا دور معلوم ہوتا

ہے۔ جبکہ کھانسی مولانا کو بالکل چین لینے نہیں دیتی تھی۔

حج سے واپسی کے پانچ ماہ بعد شعبان ۱۲۹۵ھ میں اور وفات سے ایک سال ۱۱ ماہ پہلے دیانند سے مناظرہ:

حج سے واپسی کے بعد کا نقشہ سامنے آچکا ہے کہ بیمار بھی ہیں اور تمام کام بھی انجام دیئے جارہے ہیں اور جیسا کہ ہم مناظروں کے سلسلے میں لکھ آئے ہیں کہ حج سے واپسی کے پانچ ماہ بعد شعبان ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں آپ دیانند سرستی سے مناظرے کیلئے رڑکی اور میرٹھ بھی تشریف لے جاتے رہے ہیں۔

رمضان ۱۲۹۵ھ نانوتہ میں:

چونکہ حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی مرحوم نے جن کا انتقال ۱۳۱۲ھ یا ۱۳۱۳ھ میں ہوا اور جو حضرت قاسم العلوم کے عاشق زار تھے۔ آپ کیلئے اپنی طرف سے ایک مکان آپ کی اہلیہ کے نام خرید کر رجسٹری کرادیا تھا جس میں آج کل جناب مولانا محمد طیب صاحب رہتے ہیں۔ اس لئے حضرت قاسم العلوم نے آبائی وطن نانوتہ کو چھوڑ کر دیوبند قیام اختیار کرلیا تھا۔ یہ واقعہ حقیقت کے خلاف ہے۔ دیوبند میں مکان ہوجانے کے باوجود آپ نے نانوتہ کو خیر باد نہیں فرمایا تھا بلکہ ۱۲۹۵ھ کا رمضان المبارک جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے نانوتہ ہی میں گذارا ہے۔ یہ رمضان رڑکی میں دیانند سے مناظرے کے بعد کا رمضان ہے۔

مشاغل رمضان:

جب آپ رمضان میں نانوتے میں قیام فرماتے تو سفر وغیرہ قطع کردیتے اور عبادت میں مصروف رہتے اور حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جمعہ کو جامع مسجد میں تقریر فرماتے۔ اسی قیام رمضان ۱۲۹۵ھ میں آپ نے قبلہ نما لکھا ہے جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

شوال ۱۲۹۵ھ مناظرہ میرٹھ:

قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رمضان کے بعد پھر شوال میں جب دیانند میرٹھ پہنچا ہے تو حضرت بیماری اور نقاہت کے بعد پھر میرٹھ پہنچے ہیں۔ گویا سخت نقاہت کے عالم میں ہی رڑکی اور پھر میرٹھ کا سفر ہوا اور اتفاق سے خود بھی میرٹھ جا رہے تھے۔ غرض یہ ہے کہ شوال ۱۲۹۵ھ سے شعبان ۱۲۹۶ھ تک دیوبند میں اکثر قیام رہا۔

محرم ۱۲۹۶ھ میں قاسم العلوم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے زیر علاج:

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اپنے مکتوب بنام منشی محمد قاسم صاحب نیانگری مورخہ ۳ صفر ۱۲۹۶ھ میں لکھتے ہیں:

> ''میر امداد علی جو یہاں آئے تھے تو اس زمانے میں طبیعت جناب مولوی محمد قاسم صاحب کی بدرجہ علیل تھی۔ وہ مولوی صاحب سے ملنے کیلئے گئے تھے اور حکیم جناب مولوی رشید احمد صاحب تھے کہ احقر نے جب مولوی صاحب کی طبیعت کا حال پریشان دیکھا تب ان کو بلا لیا تھا۔ اب بحمد اللہ مولوی صاحب بالکل صحیح و سالم ہیں۔ نقاہت اب تلک باقی ہے۔'' (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۰)

ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ میں مظفر نگر برائے علاج:

ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کے پہلے جمعہ کو مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا قاسم العلومؒ کو مظفر نگر دیکھنے کیلئے گئے ہیں۔ اپنے مرید کو لکھتے ہیں:

> ''پہلے جمعہ کو مظفر نگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب کے دیکھنے کو گیا تھا۔ جناب مولوی صاحب کو ان کے ایک مرید (ڈاکٹر عبدالرحمٰن) بنظر علاج وہاں لے گئے ہیں۔ اب طبیعت مولوی صاحب کی اچھی ہے کسی قدر کھانسی باقی ہے۔''

(مکتوب مورخہ ۱۸ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ) (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۲)

رمضان ۱۲۹۶ھ میں قیام نانوتہ:

جب دیوبند وغیرہ میں شعبان تک سال گذر گیا تو ۱۲۹۶ھ کا آخری رمضان بھی گذارنے کے لئے حضرت والا نانوتہ تشریف لائے اور پورا مہینہ یہیں گذارا۔ مفتی محمود صاحب نانوتوی اپنے ایک تحریری بیان میں بنام راقم الحروف لکھتے ہیں:

> ”آپ کا آخری رمضان ۱۲۹۶ھ نانوتہ میں ہوا۔ اس کا ثبوت بہت کافی ہے۔ میرے والد مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت نے جو آخری تقریر نانوتے میں فرمائی جس کے بعد پھر نانوتے میں تقریر کا موقع نہیں ملا۔

نانوتے میں عمر کی آخری تقریر ۱۲۹۶ھ کے رمضان میں:

حضرت نے اس (۱۲۹۶ھ کے) رمضان کے پہلے جمعہ میں

شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن

آیت تلاوت فرما کر طویل مضمون بیان فرما جو رمضان کے تمام جمعوں میں پورا ہوا۔ (والد صاحب) مضمون کو بھی بتلایا کرتے تھے کہ:

مضمون تقریر:

رمضان کے روزے کو حضرت نے سلطان قرار دیا تھا اور تراویح کو وزارت کا منصب دیا اور ماہ مبارک کے تمام حسنات کو حکومت صوم کے حکام اور کارکنان سے تعبیر فرمایا تھا۔ اور اس سلسلے میں آیاتِ قرآنیہ اور احادیث کو اسی مضمون پر عجیب و غریب انداز سے منطبق فرما رہے تھے۔ (بیان مفتی محمود صاحب نانوتوی)

تمام رمضانوں کے مہینے نانوتے میں گذارنا:

آپ کی عمر کا کوئی رمضان تقریباً پندرہ شوال تک کسی دوسرے مقام پر نہیں ہوا۔

(بیان مفتی محمود صاحب)

رمضان ۱۲۹۶ھ کے بعد شوال میں علالت کا سلسلہ:

اسی رمضان (۱۲۹۶ھ) کے بعد حضرت علیل رہے اور غالباً کہیں تشریف نہیں لے گئے مگر تعلیم دینے کا شغل کسی نہ کسی درجے میں ضرور رہا۔ حضرات طلبہ کی موجودگی بھی ثابت ہے۔ اسی دوران میں حضرت کو نانوتے میں دورہ ہوا۔ سب کی رائے یہ ہوئی کہ دیو بند میں علاج معالجہ کی سہولت رہے گی تو آپ کو پالکی میں روانہ کیا گیا۔ تلامیذ میں سے دو کا نام تو مجھے یاد ہے (جو ہمراہ تھے) اور ایک حاجی چھتے کی مسجد والا۔ نام یاد نہیں آتا۔ حضرت (مولانا احمد حسن صاحبؒ) امروہوی فرماتے تھے کہ گرمی کا موقع تھا۔ ایک جگہ پالکی ٹھہری اور حضرت نے جب پانی مانگا۔ مولانا امروہی پالکی میں حضرت کے پاس تھے اور تقریباً تین سو قدم کے فاصلے پر کھیتوں سے اس طرح ہرٹ چل رہا تھا مولانا امروہوی نے اس حاجی کو لوٹا دیا کہ وہاں سے جلد پانی لائے اس نے کہا کہ میں ایک منٹ کیلئے بھی حضرت سے جدا نہیں ہو سکتا تو ہمارے شیخ الہند لوٹا لے کر گیہوں کٹے ہوئے ان کھیتوں میں دوڑ کر پانی لائے فرماتے تھے کہ انکے پاؤں خونم خون ہو گئے۔ اس طرف کہاروں کو ہمارا تقاضہ تھا کہ دھوپ کی تمازت سے پہلے دیو بند پہنچیں۔ اس لئے کہار بہت لپک رہے تھے۔ اور ہمارے حضرت شیخ الہند پا پیادہ پالکی کے ساتھ لگے رہے۔ پوری راہ دوڑتے ہی پوری کی۔ اس کے بعد حضرت نانوتہ نہ آسکے۔ اور یہ مرض، مرض وفات نہ تھا۔ اس سے افاقہ ہو گیا تھا مگر مرض وفات سے اس کا فصل زیادہ نہ تھا۔" (بیان مفتی محمود)

وفات سے نو ماہ پہلے شوال ۱۲۹۶ھ مطابق اپریل ۱۸۷۸ء میں دیو بند آمد اور شفا:

مفتی محمود صاحب نانوتوی اپنے والد صاحب کا بیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس واقعہ سے ہمیں ایک چیز متعین ہو جاتی ہے کہ نانوتہ سے یہ رخصتی ایسے وقت ہوئی جب کہ گیہوں کٹ رہے تھے (بلکہ کٹ چکے تھے اور ان کی جڑیں کھڑی تھیں اور گرمی

شروع ہوگئی تھی۔ گویا اپریل کا ماہ تھا۔ انوار) اور گیہوں کٹنے کا زمانہ عموماً مارچ کے آخر اور اپریل کے شروع میں ہوتا ہے۔ (پھر مفتی محمود لکھتے ہیں)

شیخ الہندؒ کیلئے دعا:

سنا ہے کہ حضرت نانوتوی نے اس روز اس فدائی شاگرد شیخ الہند (مولانا محمود حسن اسیر مالٹا) کیلئے دعا فرمائی تھی۔ دیوبند پہنچ کر اس علالت سے حضرت نے شفا پائی۔ (یعنی دورے سے افاقہ ہوگیا جو ضیق النفس یا دمے کا پڑا تھا۔ اصل مرض کی جڑ موجود تھی۔ انوار)“

مولانا محمد اسماعیل کی دیوبند میں ذیقعدہ ۱۲۹۶ھ میں آمد:

مفتی محمود صاحب اپنے والد صاحب کے بیان کو نقل کرتے ہوئے پھر لکھتے ہیں کہ:

”چند روز کے بعد میرے والد صاحب مزاج پرسی کیلئے دیوبند آئے۔ حضرت کو افاقہ تھا۔“

کیا آپ نے نانوتہ کی سکونت ترک کردی:

اس وقت (دیوبند کی آمد کے موقع پر میرے والد نے) حضرت سے عرض کیا کہ سنا ہے دیوبند میں حضرت نے توطن کے ارادے سے مکان خرید لیا ہے۔ کیا اب نانوتہ کو حضرت نے چھوڑ دیا ہے تو حضرت نے غمگینی کی سی کیفیت میں فرمایا کہ میاں کہیں وطن بھی چھوٹتا ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ نانوتہ چھوڑ دوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میری غیبت (عدم موجودگی) میں میری منشا کے خلاف کچھ مخلصین میں سے (حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی نے) اپنا یہ مکان میرے نام رجسٹری کردیا۔ تم جانتے ہو کہ مجھ سے بے مروتی نہیں ہوسکتی۔ ان کا یہ پُراخلاص عمل تھا جسے رد نہیں کیا جاسکتا تھا۔“

شوال ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء کے بعد دیوبند میں قیام اور معالجہ:

۱۲۹۶ھ کا رمضان بھی جیسا کہ مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا حضرت قاسم العلومؒ نے

نانوتہ میں بسر کیا۔ اسی اثناء میں آپ کو ضیق النفس کے دورے پڑے اور علاج کے لئے آپ دیوبند پالکی میں تشریف لائے۔ آپ کا نانوتے میں یہ قیام غالباً آخری قیام معلوم ہوتا ہے اس کے بعد مستقل طور پر علاج میں مصروف رہے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ زادہ علاء الدین کی درخواست پر گھر پر عصر کے بعد ترمذی پڑھاتے تھے۔

علاج کی طرف خاص توجہ:

حج سے بعد کے عرصے میں بیماری اور علاج کے کئی مرحلے گذرے اور اس عرصے میں مختلف حضرات سے علاج کرایا مگر عارضی آرام ہوتا اور پھر کھانسی کا سلسلہ جاری رہتا۔

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''اور اس (دو سال کے) عرصے میں (اور بالخصوص شعبان ۱۲۹۵ھ کے بعد دیانند سے مناظروں اور گفتگو کے درمیان) چند بار جلد جلد وہی دورہ ہوا اور کئی بار صورت سانس کی سی ہوگئی پھر اللہ جل شانہ نے تخفیف فرمادی۔ یوں خیال تھا کہ اب یہ مرض ٹھہر گیا خیر دورہ ہے۔ ہر چند صحت اور نجات کی امید پوری نہ تھی کیونکہ علاج ہر قسم کے ہوئے صورت آرام کی نہ ہوئی۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۶۔۲۷)

یونانی، ڈاکٹری اور ویدک علاج:

حضرت عارف باللہ مذکورہ عبارت کے بعد اپنے نوشتہ سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یونانی طبیبوں نے ہر قسم کا علاج کیا۔ ڈاکٹروں نے ہر طرح سے تدبیر کی۔ ہندی ادویہ، کشتے، رس وغیرہ دیئے مگر مرض رفع نہ ہوا۔ دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے کہ گاہے کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی اور پھر دورہ سانس کا ہوا۔ اور وہی صورت ضعف کی ہوگئی۔ ایک روز کے مرض میں مدتوں کی طاقت سلب ہو جاتی تھی۔ مولانا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا اسے قبول کیا، جو دوا کھلائی کھالی۔ جو تدبیر

کسی نے کی اس کو کرلیا۔ البتہ مزاج لطیف ونفیس تھا ویسی ہی (نفیس ولطیف) دوا کو پسند فرماتے اور بعد عرض کرنے خدام کے جو دوا ہوتی استعمال فرمالیتے۔ کئی بار مسہل بھی ہوا۔ سردست تخفیف ہوجاتی تھی مگر جڑ مرض کی نہیں جاتی تھی۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۷)

علاج حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی:

حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی جن کا کئی مرتبہ پہلے ذکر آچکا ہے اور جو حضرت کے عاشق زار مرید تھے ان کے علاج کے متعلق عارف باللہ لکھتے ہیں:

''حکیم مشتاق احمد صاحب دیوبندی آخر تک مصروف رہے۔''

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر عبدالرحمٰن کا علاج اور مظفرنگر میں قیام:

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مظفرنگری بھی حضرت قاسم العلوم کے جاں نثار مرید تھے۔ انہوں نے بھی علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر حافظ عبدالرحمٰن صاحب مظفرنگری نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔''

(سوانح صفحہ ۲۷)

وفات سے کچھ عرصہ پہلے:

ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب دیوبند بھی آتے اور قاسم العلومؒ کو انہوں نے مظفرنگر بھی علاج کیلئے رکھا۔ مولانا منصور علی خان صاحب لکھتے ہیں:

''ادھر مولانا صاحب کا مزاج (بقیام مراد آباد مولانا منصور علی) بگڑتا ساز ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے علاج کے واسطے اپنے پاس مظفرنگر میں مولانا صاحب کو رکھا اور بہت خدمت و تیمارداری کی۔ میں مراد آباد سے (کہ وہیں ملازم تھے) قدم بوسی اور عیادت کے واسطے گیا۔ قدرے افاقہ تھا مگر اصل مرض باقی تھا۔ ٹھسکا اور خفیف بخار رہتا تھا۔'' (مذہب منصور حصہ دوم)

بہر حال علاج میں اپنوں اور بیگانوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن تقدیر الٰہی کے سامنے کسی کا بس نہیں چل رہا تھا۔ حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحبان جیسے اولیا کی نہ دعا کام کر رہی ہے اور نہ دوا۔ چنانچہ عارف باللہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کی علاج میں جان توڑ کوشش کے بعد لکھتے ہیں:

> ”مگر تقدیر سے چارہ نہیں اور موت کا کچھ علاج نہیں اور وقت مقدر ٹلتا نہیں اگر دوا اور تدبیر پر کام ہوتا تو بے شک مولانا کو صحت ہوتی۔ وہ دوائیں مولانا کے لئے میسر ہوئیں کہ جو امرا کو بھی شاید بدشواری میسر آ دیں اور ویسا علاج ہوا کہ جو بادشاہوں کو بھی شاید ہی نصیب ہو۔ کہاں طمع اور خوف کی بات اور کہاں عقیدت قلبی۔“

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۷)

سہارنپور کا دوسرا سفر اور مولانا احمد علی صاحب کی عیادت:

گذشتہ صفحات میں آپ نے پڑھا ہے کہ مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کو ربیع الاخر کے ماہ میں فالج نے آدبایا تھا۔ قاسم العلوم ان کو دیکھنے کیلئے گئے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مظفر نگری کو بھی ان کے دکھانے کیلئے بلایا تھا اور اسی روز شام کو واپس آ گئے تھے لیکن بیمار تھے اس لئے تکان ہوگئی تھی۔ مگر چند روز کے بعد صحت ہوگئی تھی اور مولانا محمد یعقوب صاحب کے صاحبزادے علاؤالدین صاحب کو پڑھانا بھی شروع کر دیا تھا مگر جب کھانسی اٹھتی تو رک رک کر پڑھاتے لیکن جب کھانسی قابو سے باہر ہو جاتی تو چھوڑ دیتے تھے۔ اسی اثنا میں سہارنپور کا دوسرا سفر کیا۔

وفات سے بیس دن پہلے ۱۵ ربیع الآخر ۱۲۹۷ھ ۲۷ مارچ ۱۸۸۰ء کو ہفتہ کے روز سہارنپور کو روانگی:

ہمارے حساب سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دوسری دفعہ مولانا احمد علی صاحب کی مزاج پرسی کیلئے وفات سے بیس دن پہلے ۱۵ ربیع الآخر کو ہفتے کے روز سہارنپور تشریف لے

گئے اور مولانا احمد علی صاحب کی خواہش پر دو ہفتے ۲۷ ربیع لآخر مطابق ۱۸ اپریل ۱۸۸۰ء تک سہارنپور مقیم رہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''اسی عرصے میں (دوران تعلیم صاحبزادہ علاء الدینؒ) سہارنپور کا قصد کیا۔ اور جناب مولوی احمد علی صاحب کو تخفیف اصل مرض (فالج) میں ہو گئی تھی۔ مگر بخار اور ضعف شدید تھا۔ مولوی صاحب (احمد علی صاحبؒ مولوی محمد قاسم صاحب کے) ٹھہرنے کے باعث ہوئے۔ دو ہفتہ وہاں قیام فرمایا۔ اور اتنا قیام خلاف عادت تھا۔''

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۸)

وفات سے نو دن پہلے سہارنپور میں درد ذات الجنب یا نمونیہ:

حضرت قاسم العلوم کی مجاہدانہ طبیعت نے استاذ کی عیادت سے ایسی نازک بیماری میں بھی باز نہ رکھا۔ ہر حال میں راضی برضا رہ کر جان ناتواں کی پروانہ کرتے تھے۔ کہ مستقل بیماری یعنی دمے کا وہاں دورہ پڑا اور ساتھ ہی نمونیہ بھی ہو گیا۔ ضیق النفس میں عموماً پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس لئے نمونیہ ہو جانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''وہاں (سہارنپور میں) دورہ ہوا اور ساتھ ہی اس کے ذات الجنب بھی ہوا۔ یہاں دوسرے دن خبر ہوئی۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۸)

اس قسم کا مضمون اپنے مرید صفا کش منشی محمد قاسم نیانگری کو لکھا ہے:

> ''تم نے حال انتقال جناب مولانا محمد قاسم مرحوم کا پوچھا ہے۔ مولوی صاحب سہارنپور تشریف لے گئے تھے کسی قدر طاقت آ گئی تھی۔ وہاں دورہ معمولی صفرا کا ہوا اور اس میں درد ذات الجنب نمونیہ بھی ہوا۔'' (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۵)

وفات سے آٹھ دن پہلے دیوبند کو واپسی:

عارف باللہ اسی صورت حال کے بارے میں سوانح قاسمی میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''یہاں (دیوبند میں مولانا کی بیماری اور ذات الجنب کی) دوسرے دن خبر ہوئی۔ اسی روز حافظ انوار الحق صاحب روانہ ہوئے اور صبح کو مولوی صاحب کو ریل میں لے

آئے۔ مگر آئے کیا کہ سانس نہ آتی تھی۔“ (سوانح صفحہ ۲۸)

چونکہ سانس کا تو مرض تھا ہی مگر اب ضیق النفس کا معاملہ اور سخت ہو گیا۔ سانس نہ آتی تھی کا یہ مطلب ہے کہ بڑی مشکل سے گھٹ گھٹ کر سانس آتی تھی۔ سانس کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ حضرت عارف باللہ اپنے مکتوب بنام منشی محمد قاسم نیانگری کو لکھتے ہیں:

> ”حرکت راہ سے درد (ذات الجنب) نے شدت کی یہاں تک کہ سانس بند ہو گیا۔“

(مکتوبات صفحہ ۱۰۵)

فصد اور جونک سے علاج:

جب سانس کی یہ صورت دیکھی گئی تو پھر اس کی کیا تدبیر کی گئی۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”ناچار فصد لی، درد موقوف ہو گیا۔ پھر کچھ درد کا اثر معلوم ہوا تو اس کے لئے جونک لگوائی گئی۔“ (سوانح صفحہ ۱۸)

فصد کے بعد جو نمونیہ کا درد موقوف ہو گیا تھا۔ وہ درد رات میں پھر لوٹ آیا۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ”رات کو پھر درد نے عود کیا۔ کچھ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ (فصد کے بعد دوسری فصد مناسب نہ تھی اس لئے) جونکیں لگیں۔ درد موقوف ہوا مگر حرارت میں کمی نہ ہوئی۔“

(مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۵)

طبیعت کی بحالی کے تین دن وفات سے چھ دن پہلے:

حضرت عارف باللہ ان جونکوں کے لگنے کے بعد تین دن تک طبیعت کے بحال ہونے کی اطلاع دیتے ہیں یہ تین دن ہمارے حساب سے ہفتہ، اتوار اور پیر کے دن ہیں جو ۲۹، ۳۰ اور یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۰، ۱۱، ۱۲/ اپریل ۱۸۸۰ء کے مطابق نظر آتے ہیں۔ عارف باللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”دو تین دن طبیعت صاف رہی۔ اس عرصے میں دہلی سے کچھ دوائیں مقوی آئی تھیں

ان کا استعمال ہوا۔ کیونکہ ضعف نہایت تھا۔ بات کرنی دشوار تھی۔ اس میں رات کو شدت ہوگئی اور کبھی کبھی غفلت ہوجاتی تھی۔" (سوانح صفحہ ۲۸)

لیکن عارف باللہ مکتوبات میں لکھتے ہیں:

دہلی سے طبیب کی آمد:

"ایک طبیب دہلی سے آئے تھے۔ انہوں نے کوئی مفرح اور کشتہ دیا اس سے کچھ قوت کو نفع ہوا۔" (مکتوبات صفحہ ۱۰۵)

چونکہ کمزوری بے حد تھی اس لئے دہلی سے جو طبیب صاحب آئے تھے وہی اپنے ساتھ دوائیں بھی لیکر آئے تھے۔ جو مفرح تھیں اوران میں کشتہ طاقت بھی استعمال کرایا گیا جن سے کچھ طاقت آئی مگر اس کے باعث حرارت اور بڑھ گئی۔ کوئی تدبیر کارگر نہیں ہورہی تھی۔

الٹی پڑگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

منگل ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۳/ اپریل ۱۸۸۰ء وفات سے دو دن پہلے:

منگل کے روز وفات سے دو دن پہلے وہ جو انتہا درجے کا باہوش وباخبر انسان تھا۔ آج بے ہوش اور بے خبر نظر آرہا ہے۔ تین دن کا سنبھالا لے کر اب وہ سنبھلنے سے باہر ہوچکا ہے۔

عارف باللہ لکھتے ہیں:

"حرارت کو شدت ہوگئی اور کبھی کبھی غفلت ہوجاتی تھی۔ اول ایک ملین دیا تھا۔ رائے ہوئی کہ پھر ملین دیا جائے۔ ملین دیا دو دست ہوکر غفلت کو شدت ہوئی۔"

منگل کی ظہر تک جواب دینا مگر ہوش کا نہ ہونا:

"ظہر کے وقت تک جواب دیتے تھے مگر ہوش نہ تھا۔ یہاں تک کہ نماز کیلئے کہا تو سوائے اچھا کہ اور کچھ نہ کر سکے۔" (سوانح صفحہ ۲۸)

اللہ اللہ وہی شب زندہ دار، وہی شب و روز ذکر اللہ اور یاد الٰہی میں رہنے والا عابد و زاہد جو جہاز میں حج سے واپسی کے وقت بے حد زار و نزار تھا لیکن نماز سے غافل نہ تھا آج منگل کے روز ۲ جمادی الاولیٰ کو ظہر تک جواب دیتے دیتے نیم بے ہوشی سے گذر کر اب بالکل بے ہوش ہو چکا ہے۔ عارف باللہ اپنے مکتوب بنام منشی محمد قاسم میں لکھتے ہیں:

> ''دو پہر کے قریب بے ہوشی نے غلبہ کیا اور دست بند ہو گئے۔ حرارت کی شدت تھی اس وقت شربت وغیرہ دیا۔ نفع نہ کیا بلکہ نفخ ہو گیا اور بے ہوشی ایسی ہوئی کہ نماز ظہر ادا نہ ہو سکی۔ یہ منگل کا دن تھا۔'' (صفحہ ۱۰۵)

انوار، قاسم العلوم جس کے لئے نماز پڑھتے تھے جب انہوں نے ہی بے ہوش کر دیا تو اب نماز کس طرح پڑھیں۔ یہ تو سب ہوش و خرد کا جھگڑا تھا۔ جب وہی نہ رہیں تو نماز کیسی۔

منگل کی شام اور سکوت تمام:

وہی جس کی زبان نے اپنی تقریروں اور وعظوں سے فضاؤں میں گونج پیدا کر رکھی تھی آہ وہ زبان منگل کی شام کو دن کے آخری حصے میں ایسی خاموش ہو گئی کہ بولنے سے قاصر ہے۔ اب اس خاموشی کو گویائی میں کون بدلے اور اس جمود کو گرمی سے کون توڑے۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''آخر روز میں وہ جواب بھی (جو نیم بے ہوشی یا بے ہوشی میں ہوں ہاں سے دیا جا رہا تھا) موقوف ہو گیا۔'' (سوانح صفحہ ۲۸)

حالت نزع کا گمان:

منگل کی شام مکمل بے ہوشی کی شام تھی۔ مایوسیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ حالت نازک ہو چکی تھی۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''منگل کی شام کو حالت نزع کی سی ہو گئی مگر پھر سانس درست ہو گیا۔ یہ دورہ مرض کا تھا۔ رات بھر وہی کیفیت رہی۔'' (مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۶)

تشنج کا اثر:

منگل کی شام بتاریخ ۲ جمادی الاولیٰ ادھر تو زبان بند ہوش مطلق نہ تھا اور ادھر تشنج کی سی کیفیت ہوگئی گویا جان کھینچ رہی ہے۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی۔ اس کو نزع اور یوں جانا کہ اب وقت آخر ہے۔''

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۸

مولانا رفیع الدین صاحب رحؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خطوط اور متوسلین کو اطلاع:

حضرت قاسم العلوم کی نازک حالت دیکھ کر بحیثیت مہتمم دارالعلوم دیوبند کہ دارالعلوم کا سرپرست اور بانی دنیا سے رخصت ہوا چاہتا ہے۔ انہوں نے خصوصی احباب تلامیذ اور متوسلین کو خطوط کے ذریعہ اطلاعات روانہ کیں۔ مولانا حکیم منصور علی خان صاحب مذہب منصور میں لکھتے ہیں:

> ''مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ کے خطوط جابجا پہنچے کہ اب حالت مرض ترقی پر ہے جلد چلے آؤ۔ بندہ بھی خط دیکھتے ہیں دیوبند پہنچا۔'' (مذہب منصور حصہ دوم)

احباب و اقارب کا اجتماع:

> ''سب احباب امروہہ، مراد آباد، میرٹھ، سہارنپور، گنگوہ، نانوتہ وغیرہ سے جمع ہوگئے تھے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۸)

انوار لوگوں کا ہجوم اطراف و جوانب سے اُمڈا چلا آرہا تھا۔ پروانوں کو شمع کے دم توڑنے کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ اس لئے پروانہ وار چلے آرہے تھے اور شمع تھی کہ مدھم ہوتی چلی جارہی تھی ۔

ہائے وہ شمع کہ بجھتی ہی چلی جاتی ہے
اف وہ پروانے کہ سمٹے ہی چلے آتے ہیں

ان پروانوں میں ایک سب سے بڑا خاموش اور عاشق پروانہ جس میں صدیقیت کا عکس جھلک رہا تھا جو بچپن سے رفیق رہا اور وفات تک کیلئے جس نے پیمان وفا باندھا تھا۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی تھے۔ عارف باللہ لکھتے ہیں:

> ''مولوی رشید احمد صاحبؒ گنگوہی سلمہ کو منگل کے روز (۲ جمادی الاولیٰ) کو خبر گئی۔ بدھ کی دوپہر سے پہلے مولوی صاحب تشریف لائے۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۹)

وفات سے ایک دن پہلے بدھ کی رات سے جمعرات کی رات تک:

منگل کی شام ختم ہو چکی ہے۔ رات کے گھمبیر سائے پھیلتے جا رہے ہیں۔ بدھ کی رات نے آ کر ڈیرے ڈالے ہیں اور ان تاریک فضاؤں میں ایک شمع ٹمٹما رہی ہے۔ اس کی دھیمی روشنی میں پروانے تڑپ رہے ہیں کہ یہ شمع کہیں بجھ نہ جائے۔ مسیحا نفس چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ دعاؤں کیلئے دلوں میں اضطراب اور بے قراری کروٹیں لے رہی ہے۔ گنگوہی جیسا قطب الارشاد سرہانے بیٹھا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جیسا سالک و مجذوب ولی اپنی عمر کا بقیہ حصہ قاسم العلوم کو دے رہا ہے لیکن خداوندی اٹل فیصلہ کے باعث کسی کی درخواست بھی قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ پاتی۔ سنو سنو

اذا جآء اجلهم لایستاخرون ساعة ولا یستقدمون

کی آوازیں آ رہی ہیں۔ کارکنان قضاء وقدر کے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ عالم بالا روح قاسمی کے لئے چشم براہ ہے۔ حضرت قاسم دنیا کے سب رفیقوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں۔ سرکار مدینہ ﷺ بھی ان کے انتظار میں ہیں کہ میرا نائب کب آتا ہے۔ قاسم العلوم بے ہوش نہیں ہیں بلکہ محو اشتیاق دیدار رسول اللہ ﷺ ہیں۔

وفات سے ایک دن پہلے ۳ جمادی الاولیٰ کو بدھ کے روز:

وقت گذر رہا ہے۔ یہ لو بدھ کی سحر ہو گئی۔ منگل کی شام سے جو دنیا اور مافیہا سے آنکھیں بند کی تھیں ابھی تک بند ہیں۔ ملاء اعلیٰ سے رشتہ ہے۔ اور عالم لاہوتی کی طرف دھیان ہے، عالم ناسوتی سے بے رخی صاف عیاں ہے۔ خدارا اپنے عشاق کی طرف نگاہ

کھول کر ایک دفعہ تو دیکھ لو۔ یہ رشید احمدؒ، یہ یعقوبؒ، یہ محمود حسنؒ، یہ فخر الحسنؒ کی ٹکٹکی تمہارے چہرے پر بندھی ہے۔ مگر تم ایک آنکھ بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اچھا یہ نہ سہی یہ تمہاری رفیقہ حیات تم سے ایک دفعہ لب ہلا کر بات کرنے کا ارمان دل میں رکھتی ہے۔ یہ تمہارا نور نظر حافظ احمد اور یہ تمہارا نورِ چشم ہاشم تمہاری نگاہ لطف کے بھوکے ہیں۔ کیا اپنی معصوم بچی عائشہ کی طرف بھی نہ دیکھو گے۔

آہ! قاسم چاندا پور کے مناظرے کا میدان تیری یاد میں اشکبار ہے کہ اس قاسم پر آج کیا گذر رہی ہے۔ جس نے اپنی شعلہ مقالیوں سے میری فضاؤں میں حق کی منادی کی تھی۔ پادری نولس، پادری اینک، پنڈت دیانند تک تیری صداقت بیانیوں کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں۔ آج وہ علم کی سرسوتی کس حال میں ہے جو تیرے سر پر بولا کرتی تھی۔ آہ رڑکی کا معمورہ اور اس کا بازار تیری یاد میں بے قرار ہے۔ جس میں تین روز تک تو نے حق کا اعلان کیا تھا۔ ان فرعونوں کے منہ توڑنے کیلئے ابھی تیری ضرورت ہے۔ کھول آنکھیں کھول اور منہ سے بول۔ جب ان سے مناظروں کیلئے تیری ضرورت پڑے گی تو تجھے کہاں سے بلائیں گے۔ کچھ اپنا پتہ ہی بتا دے کہ وہاں تو مل جائے گا۔ خدا کیلئے فقط ایک نگاہِ کرم۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے:

اے میرے دنیا کے رفیقو! تم میں، میں نے اپنی عمر کے ۴۹ سال گذارے ہیں۔ میں اپنے فرائض منصبی کو ادا کر چکا ہوں۔ اب مجھے کسی اور بستی میں جا کر بسنا ہے۔ جہاں کوثر و تسنیم کے چشمے بہتے ہیں۔ جہاں شربت دینار کے بجائے شربت دیدار سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور کی موج دوڑتی ہے۔ مجھے دربار نبی سے بلاوا آیا ہے اور وہ میرے انتظار میں ہیں۔

قاسم العلومؒ کو رسول خدا ﷺ سے رابطہ نہانی:

آپ نے قاسم العلوم کی ولایت کے باب میں پڑھا ہے کہ ان کو عشق الٰہی اور عشق

رسول میں اس مقام پر رسائی حاصل تھی کہ جو مقام کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ عشق رسول ﷺ کے ایک دریائے بے کنار تھے۔ جس کی تہہ میں بڑے بڑے روحانیت کے غواص غوطہ لگا کر نہ پہنچ سکتے تھے۔ جب سرکارِ مدینہ ﷺ کا ذکرِ مبارک ان کے سامنے ہوتا تو سر سے پاؤں تک ان کے جسم کو اہتزاز ہوتا تھا ۔

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے

ان کی زبان سے نکلے ہوئے یہ جملے یاد رکھئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ آنحضور ﷺ مجھے اپنی چادر مبارک میں چھپائے ہوئے ہیں اور کبھی اندر اور کبھی باہر لے جاتے ہیں۔

حضرت قاسم العلوم مقامِ خودی میں:

ہمارے نزدیک قاسم العلومؒ اقبال کے مردِ درویش تھے جن کے متعلق اس نے کہا ہے ۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

وہ حضرت اقبال کے مردِ مومن تھے جس کے متعلق اس نے کہا ہے ۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

یہی وہ مقام ہے جس پر پہنچ کر ایک ولی سے وہ امور ظہور میں آتے ہیں جس میں خدائے کریم بندے کی خوشنودی کا خاص خیال رکھتے اور سب کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

وہ اس حدیث قدسی کے مظہر تھے جس میں کہا گیا ہے کہ:

لایزال عبدی یتقرب الی بالنواقل حتی احبہ فاذا احببتہ فبی یسمع و یبصر

میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرے قریب ہوتا رہتا ہے تا آنکہ وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے پھر وہ میرے ذریعہ سنتا ہے اور میرے ذریعہ دیکھتا ہے۔

تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس کا آلہ فعل بن جاتا ہے۔ جیسا کہ

مارمیت اذ رمیت

میں فرمایا اور جیسا کہ

الحق ینطق علی لسان عمرؓ

حق عمر کی زبان پر بولتا ہے

کا اشارہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر خدا بندے کی خوشنودی کو پیش نظر رکھتا ہے اور یہی خودی کا مقام ہے۔

حضرت قاسم العلوم اسی مقام پر فائز تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس شعر کے مصداق تھے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

وہ آخری حج میں خانہ کعبہ سے لقائے ربی کی تڑپ لے کر آئے تھے اور اس میں تڑپ رہے تھے۔ وہ روضہ نبوی پر وفات سے دو سال پہلے گئے تھے اور ملاقات نبوی ﷺ کا شوق دل میں لے کر آئے تھے۔

بدھ کا پورا دن بے ہوشی میں:

بدھ کے دن ۳ جمادی الاولیٰ کی بے ہوشی نے جس کا آغاز منگل کی شام سے ہوا تھا۔ بدھ کے دن کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اب جمعرات اور بدھ کی درمیانی شب آگئی ہے لیکن وہ عالم بالا کے جلووں میں مدہوش ہیں۔ آج بیماری کا بلیٹن جو مولانا محمد یعقوب صاحب کی طرف سے جاری ہوا ہے یہ ہے:

"بدھ کا تمام دن یہی حالت رہی، زبان بند ہوش مطلقاً مفقود۔"

(مکتوبات صفحہ ۱۰۶)

ہم نے ابھی کہا ہے کہ دنیا سے بے ہوش تھے مگر خدا کی یاد میں مدہوش تھے۔ بدھ کے روز کی روئداد مولانا محمد یعقوب صاحب جہاں بے ہوشی کی دیتے ہیں۔ وہاں یہ بھی لکھتے ہیں۔

ذکر اللہ کے سانس:

"زبان بند ہوش مطلقاً مفقود البتہ سانس کے ساتھ پاس انفاس جاری پاس انفاس کا یہ

مطلب ہے کہ سانس کے ساتھ دل چل رہا تھا اور اللہ اللہ دل سے سانس کے ذریعہ نکل رہا تھا۔“

(مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۶)

آخری شب:

بدھ اور جمعرات کی یہ درمیانی شب قاسم العلوم کی آخری شب ہے جس کے بعد اب اور کوئی رات اس دنیا میں نصیب نہ ہوگی۔ آخری شب وہ زبان حال سے اس طرح گویا تھے ۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

آہ! آج کی رات کا چاند زرد زرد سا نظر آ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا رہی ہے۔ ستارے ٹمٹما رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم جدائی کے احساس سے اشکبار ہیں۔ رات کے بارہ بج گئے۔ اور پھر ایک، دو، تین، چار، پانچ کلاک نے بجادیئے۔ قاسم العلوم اٹھئے۔ رات گذر گئی۔ صبح کی نماز کا وقت ہے مگر وہ تو منگل کی شام سے کچھ ایسے بے ہوش سوئے تھے کہ جمعرات کی صبح کو بھی اٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ اللہ رے ضعف اور مایوسی ۔

کچھ ضعف نے کچھ یاس نے مایوس کیا ہے
اُٹھتی نہیں گردن کی طرف اُف رے نظر بھی

جمعرات کی صبح اور بیماری کی رپورٹ:

جمعرات اور بدھ کے روز کا ایک اور اعلان سنئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”جمعرات کی صبح کو پھر فصد لی۔ سینگیاں لگائیں، اقسام علاج کئے مگر کچھ نفع نہ تھا۔ بدھ کے روز تشنج ہوتا تھا آج صورت اس کی لرزے کی سی ہوگئی۔“

(مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۶)

انوار لمحے گذر رہے ہیں۔ گھڑی کٹ کٹ، کٹ، کٹ کر رہی ہے مسلسل بے خودی کا عالم ہے۔ قاسم العلوم نے کسی لمحہ بھی تو آج جمعرات کی صبح کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا ۔

ہم اسیروں کی ہے اک بادِ صبا پرسان حال
پوچھ جاتی ہے کہ کیا باقی رہا میعاد میں

پروانے شمع کا یہ حال دیکھ کر تڑپ رہے ہیں ۔

نہ پوچھو حال دل کچھ دردمندانِ محبت کا
خدا پر خوب روشن ہے گذر جس طرح کرتے ہیں

مگر قاسم العلومؒ کی روح عالم ارواح اور علیین میں چنے کیلئے بے تاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے انتظار میں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ انتظار میں:

ہم نے گذشتہ اوراق میں لکھا ہے کہ قاسم العلوم کو ذات رسالت مآب سے خاص تعلق تھا تو سنئے اب کیا ہوا۔ تحقیق کی روشنی میں ہم یہ خواب بیان کرنے پر مجبور ہیں اور روایت اور درایت کے اعتبار سے یہ خواب درست ہے حاجی محمد یٰسین صاحب عاشق زار قاسم العلوم نے بیان کیا کہ انہیں دکھایا گیا ہے کیونکہ وہ صاحب کشف تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی ان کو زیارت ہوئی اور منکشف ہوا کہ:

رسول اللہ ﷺ قاسم العلوم کو لینے کے لئے:

"واسطے عیادت مولانا محمد قاسم صاحب کے تشریف لائے ہیں۔"

(سوانح قاسمی گیلانی جلد سوم صفحہ ۱۱۹)

اور میرے ہم ضلع نجیب آباد کے رہنے والے ایک طالب علم مولوی احمد اللہ مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ:

> "مدرسے کے احاطے میں ایک مکلف مکان ہے جس کے اندر ایک مرصع کرسی بچھی ہوئی ہے۔ اس پر سرور کائنات خاتم المرسلین رحمۃ للعالمین ﷺ جلوہ فرما ہیں اور آپ کے اردگرد آپ کے خلفائے اربعہ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ دوسرے طرف ایک پرا ان کو فرشتوں کا بھی نظر آیا۔ مولوی احمد اللہ نے رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض

کیا کہ کیسے تشریف آوری ہوئی۔ ارشاد ہوا:

”مولوی محمد قاسم کو لینے آیا ہوں۔“

سامنے ایک پلنگ پر سوار دیکھا کہ مولانا آئے۔ (اور پھر کیا دیکھا کہ)

”رسول اللہ ﷺ مولانا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے فرمارہے ہیں:

اے حبیب آنے میں کیا دیر ہے۔“

(سوانح قاسمی گیلانی صفحہ ۱۲۰ جلد سوم)

جب حضور پُرنور ﷺ ہی فرمائیں کہ اے حبیب اب کیا دیر ہے تو یہ قاسم العلوم کی روانگی کا فیصلہ شدہ امر ہے کہ انہیں دنیا سے ضرور رخصت ہونا ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے مکان سے اپنے مکان:

علاج کی سہولت کی خاطر مولانا محمد قاسمؒ پر صاحب اپنے پیارے شاگرد مولانا محمود حسن اور اپنے دوست شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے مکان پر تشریف فرما ہیں۔ لیکن اب جب کہ رفقا مایوس ہو چکے ہیں اس لئے آپ کے متعلق رائے یہ ہوئی کہ مکان پر پہنچا دیا جائے تا کہ اپنے بیوی بچوں کے سامنے دنیا سے رخصت ہوں۔ اس مکان کی طرف روانگی کا حال مولانا منصور علی خان جو خود دیوبند پہنچ چکے ہیں لکھتے ہیں:

> ”بندہ بھی خط دیکھتے ہیں دیوبند پہنچا۔ مولوی ذوالفقار علی صاحب مرحوم کے مکان پر بڑا مجمع تھا۔ طرح طرح سے علاج کیا گیا کارگر نہ ہوا۔ جمعرات کو قریب دوپہر کے سب کا مشورہ ہوا کہ مولانا صاحب کو مکان پر لے جانا مناسب ہے۔ چارپائی کو تمام خدام آہستہ آہستہ اٹھائے ہوئے مکان پر لے گئے (جب اپنے مکان پر جو حکیم مشتاق احمد نے ہبہ کیا تھا پہنچ گئے تو)“

پاس انفاس:

بقول مولانا حکیم منصور علی خان صاحب:

”پاس انفاس کی آواز اس زور سے آنے لگی کہ باہر دروازے کے بھی میں نے سنی۔“

(مذہب منصوری جلد دوم)

بے ہوشی ہے مگر دل بیدار ہے۔ جس کی طرف سب کو جانا ہے۔ اس کی یاد میں آخری وقت دل سرشار ہے۔ اب نزع کا عالم ہے۔ زنانہ خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ بیوی بچے اردگرد ہیں۔ عزیز عورتیں آخری منظر کا نقشہ دیکھ رہی ہیں۔ اب کچھ مرد بھی اندر پہنچ گئے ہیں۔ عورتیں ہٹ گئی ہیں۔

مولانا منصور علی خان صاحب لکھتے ہیں:

آخری وقت:

”مولانا رشید احمد صاحب قریب چارپائی کے تشریف رکھتے تھے۔“

(مذہب منصور حصہ دوم)

ملک الموت کی آمد اور قاسم العلوم کی رفت:

لیجئے ملک الموت آ پہنچے۔ آخری لمحے کا انتظار ہے۔ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب بھی مولانا رشید احمد گنگوہی کے ساتھ بر سر پالیں تشریف رکھتے ہیں۔ اور عمر بھر کے ساتھی کو الوداع کہنے کو ہیں لکھتے ہیں:

”اندر اول زنانہ تھیں پھر کچھ آدمی پہنچ گئے تھے۔“ (مکتوبات صفحہ ۱۰۶)

پھر کیا ہوا۔ عارف باللہ آخری اطلاع دیتے ہیں۔

بلغم کا خروج اور روح کی پرواز لمبے سانس کے ساتھ:

”یکا یک بلغم بول کرتے بلغم کی ہوئی اور سانس لمبا ہو کر منقطع ہو گیا۔“

(مکتوبات صفحہ ۱۰۶)

۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء بروز پنجشنبہ تقریباً ۳ بجے بعد ظہر وفات:

آخر موت کا ذائقہ جو سب کو چکھنا ہے وہ قاسم العلوم کو بھی چکھنا پڑا۔ عارف باللہ

سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:

''چوتھی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء) جمعرات کو بعد نماز ظہر اچانک دم آخر ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۸)

ہم بھی جب یہ آخری سطور لکھ رہے ہیں۔ جمعرات کا دن ہے اور پانچ منٹ باقی ہیں۔ یعنی ظہر کے بعد کا وقت ہے۔ صفر کی ۱۷ اور ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۹۶۸ء ہے۔ اللہ کے دین کی خدمت کرتے اپنے اللہ سے جا ملے۔ اور جو فرشتے اللہ کے دین کی خدمت کیلئے دنیا میں چھوڑنے آئے تھے وہ آخرت میں اپنے ساتھ لے گئے۔ اللہ، اللہ، اللہ رہے نام سدا اللہ کا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

تجہیز و تکفین، غسل اور نماز جنازہ:

وفات کے بعد کے حالات اور تجہیز و تکفین کے سلسلے میں پہلے مولانا منصور علی خان کا بیان سن لیجئے۔ لکھتے ہیں:

''ہزار ہا آدمی اطراف و جوانب سے اس وقت چلے آئے اور شریک جنازہ ہوئے۔ مدرسے میں (وہی مدرسہ جس کے وہ بانی تھے) غسل دیا گیا تھا (یہ بھی لکھ دیتے کہ کس نے غسل دیا) جنازے کو بعد عصر کی نماز کے اٹھایا گیا۔ سینکڑوں آدمی جنازے کو اٹھانا چاہتے تھے۔ چارپائی چر چر کرنے لگی۔ حاجی محمد عابد صاحب نے غل مچایا کہ اس قدر ہجوم جنازہ اٹھانے کو سب کے سب مت کرو۔ چارپائی ٹوٹ جائے گی۔ قریب مغرب کے باغ میں جنازہ کو رکھا۔ بعد نماز مغرب کے جب شب جمعہ شروع ہوئی دفن کیا گیا۔'' (نماز جنازہ میں کمبل پوش غیبی آدمیوں کی شرکت کے متعلق مولانا منصور علی لکھتے ہیں)

کمبل پوش فقراء کی جنازے میں شرکت:

بہت آدمی جنازے میں کمبل پوش فقراء موجود تھے۔ بعد دفن کے سب غائب ہوگئے

دوسرے دن سے مخلوق رخصت ہونے لگی۔ میں اور مولوی احمد حسن صاحب اور مرزا نبی بیگ صاحب اور حاجی محمد اکبر صاحب مراد آباد چلے آئے۔ (مذہب منصور حصہ دوم)

انوار یہ جو مولانا منصور علی خان نے کمبل پوش فقراء کا ذکر کیا ہے اور پھر ان کے غائب ہونے کا تو ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ غیبی فرشتے فقراء کی شکل میں جنازے کی شرکت کیلئے آئے ہوں گے اور خاص خاص اولیاء کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلقات تھے۔ منشی فضل حق صاحب سوانح مخطوطہ میں لکھتے ہیں کہ سائیں توکل علی انبالے والے جو ولایت کا مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ:

> ”ایک وسیع شاہراہ ہے اس میں بہت سے نقش قدم معلوم ہوتے ہیں اور چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ شاہ توکل علی صاحب نے پوچھا کہ یہ نشان کس کے قدم کے ہیں۔ (جواب میں) آواز آئی کہ حضرت رسول مقبول ﷺ کی سواری اسی راہ سے گئی ہے اور جملہ صحابہ و تابعین و تبع تابعین بھی اسی راہ سے گئے ہیں۔ شاہ جی کو شوق زیارت سے حضرت ﷺ کا از حد ہوا اور کمال شوق میں بے تحاشا دوڑے کہ جلد تر زیارت سے مشرف ہوں اسی دوادوڑش میں کبھی شاہ جی کا قدم رسول اللہ ﷺ پر پڑا اور کبھی صحابہ کرام اور کبھی تابعین کبھی تبع تابعین پر، اسی حالت میں جو یکا یک (شاہ جی صاحب) کی نظر پھری تو دیکھا کہ ایک اور شخص بھی اسی راستے کو آتا ہے مگر آہستہ آہستہ اور نیچے دیکھتا ہوا۔ شاہ جی کو حیرت ہوئی کہ یہ کیسا کاہل شخص ہے کہ ایسا آہستہ آہستہ سے چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو شوق کم ہے۔ اور اس شخص کے پاس آ کر پوچھا کہ تم کون ہو (جواب دیا کہ میں)
>
> ”محمد قاسم ہوں۔“

شاہ جی نے کہا ”بابا شوق نال بھجیا“ بابا شوق کے ساتھ دوڑ (مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا)

”میں تو نشان قدم رسول مقبول ﷺ پر قدم رکھ کر چلتا ہوں اور جس جگہ قدم خوب

محسوس نہیں ہوتا وہاں تامل کرتا ہوں۔ جب تک خوب یقین نہیں ہو جاتا کہ یہی نشان قدم ہے۔ اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا گو دیر میں پہنچوں مگر قدم بقدم رسول اللہ ﷺ ہی کے چلوں گا۔'' (سوانح مخطوطہ صفحہ ۵۶)

مولانا حکیم منصور علی خان صاحب لکھتے ہیں:

''ایک صاحب نے (خواب میں) دیکھا کہ جامع مسجد مراد آباد میں جناب رسول اللہ ﷺ چادر سفید پر تشریف رکھتے ہیں اور (اس چادر پر صرف) ایک آدمی کی جگہ خالی ہے۔ جنہوں نے یہ خواب دیکھا وہ خالی جگہ پر بیٹھنے لگے (رسول اللہ ﷺ نے) فرمایا یہ جگہ مولوی محمد قاسم کی ہے۔'' (مذہب منصور حصہ دوم)

کتنے ہی حضرات کے خواب ایسے ہیں جو قاسم العلومؒ کی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں قربت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں وہ فنائی الشیخ سے گذر کر فنافی الرسول اور پھر فنافی اللہ کے مقام پر فائز تھے۔ اور ان کی زد میں کائنات آ چکی تھی ؎

تو گردن ہم از حکم داور ہیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

کرامت قاسمی:

کرامت قاسمی کے ضمن میں ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔ جو شخص خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی تسخیر میں کائنات آ جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک مقام قاسمی تسخیر کائنات پر فائز تھا۔ چنانچہ آپ کے نانوتے کے نائی کا ایک عورت کے اغوا کے کیس میں نانوتے کے تھانیدار نے چالان کر دیا تھا۔ آپ نے منشی محمد یٰسین کو تھانیدار کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ:

''اس غریب کو تھانہ دار نے بے قصور پکڑا ہے۔ تم اس سے کہہ دوں کہ یہ ہمارا آدمی ہے اس کو چھوڑ دو۔ ورنہ تم بھی نہ بچو گے۔ اگر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالو گے تو ہمارے ہاتھ میں بھی ہتھکڑی پڑے گی۔'' (مذہب منصور حصہ دوم چشم دید مولانا منصور علی خان)

تھانے دار نے جواب دیا کہ میں روزنامچے میں رپورٹ درج کر چکا ہوں جو کاٹی نہیں جا سکتی۔ تھانیدار نے خود حضرت کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ اگر میں روزنامچے سے نام

کاٹتا ہوں تو میری نوکری جاتی رہے گی۔

قاسم العلوم نے فرمایا:

''اس کا نام کاٹ دو تمہاری نوکری ہرگز نہیں جائے گی۔ چنانچہ اس حجام کو اس نے چھوڑ دیا۔ اور تھانہ دار رہا۔'' (مذہب منصور حصہ دوم چشم دید مولانا منصور علی خان)

مولانا منصور علی صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''منشی محمد یٰسین صاحب کے ذریعہ تھانیدار کو عجب شان جلالی سے فرمایا، اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ مولانا (محمد قاسم) صاحب فرماتے ہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ جس نے وہ حالت دیکھی ہے اس کے یقین میں ذرا شک نہیں۔'' (مذہب منصور حصہ دوم)

ذرا قاسم العلوم کی شان ولایت دیکھئے جو شخص اتنا منکسر المزاج ہو اس کی شانِ جلالی دیکھئے کہ اس زور سے فرماتے تھے کہ یوں ہی ہو کر رہے گا۔

پس جو ایسا ولی کامل ہو جیسا کہ حاجی امداد اللہ صاحب نے فرمایا اس کے جنازے میں شرکت کے لئے غیبی کمبل پوش شرکت نہ کریں گے تو کس کے جنازے میں کریں گے۔

ہم قاسم العلوم کی نماز جنازہ کے بارے میں مولانا منصور علی خاں کے مشاہدات پیش کر رہے تھے۔ لیکن عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے تجہیز و تکفین، نماز جنازہ اور تدفین کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ یہ ہے، لکھتے ہیں:

''قاسم العلوم کی وفات پر ایک قیامت (برپا) ہوگئی گھر میں وسعت نہ تھی (کیونکہ لوگوں کا ہجوم تھا، اس لئے)

دار العلوم میں غسل میت اور وقف قبرستان:

مدرسے میں لا کر رکھا اور بعد غسل و کفن باہر شہر ایک قطعہ زمین کا حکیم مشتاق احمد صاحب (مرید قاسمی) نے خاص قبرستان کیلئے اسی وقت وقف کر دیا۔ وہاں اول مولانا صاحب کو دفن کیا۔

(وہ جگہ جو قبرستان کے لئے وقف کی گئی بیاض یعقوبی میں تقریباً چار بیگہ اس کا رقبہ درج ہے۔ بیاض یعقوبی صفحہ ۱۵۲)

نماز جنازہ قاسم العلوم میانِ عصر و مغرب:

مغرب سے پہلے نماز ہوئی۔ باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی۔ (یعنی موجودہ عمارت دار العلوم میں دار الطلبہ جدید کا میدان یا قبرستان کے ذرا قریب قیاس یہی کہتا ہے)

نماز جنازہ میں ہجوم اور تدفین بعد مغرب:

اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ بعد مغرب دفن کیا اور اس خزانہ خوبی ۱۲۹۷ھ کو سپرد زمین کر دیا اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے۔"

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۸۔۲۹)

دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا مزار مبارک سامنے لوح مزار دکھائی دے رہی ہے

دیوبند میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا مزار مبارک سامنے لوحِ مزار دکھائی دے رہی ہے۔

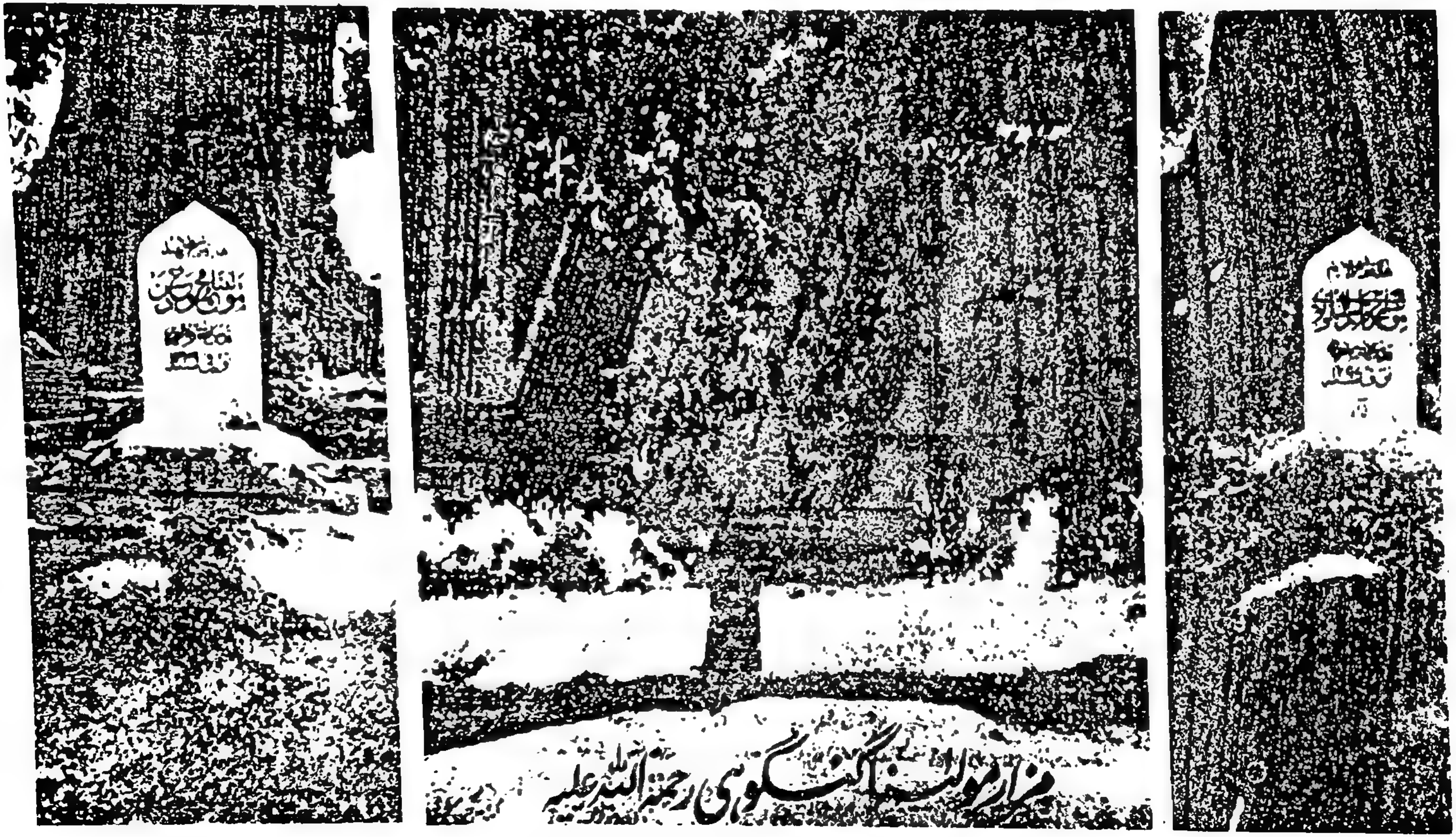
مزار مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

مزار مولانا گنگوہیؒ ۔

غمِ وفات

ایک عالم باعمل، ایک ولی کامل، ایک مفسر و محدث، ایک مجتہد، ایک مجاہد اور ایک متکلم و امامِ زمانہ کا جس قدر غم ہونا چاہئے وہ ہوا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں:

> ”مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم و الم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک ماتم عام تھا۔ ہر چند شور و غوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا نہ تھا کیونکہ ببرکت صحبت مولانا جتنے لوگ تھے حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے تھے۔ مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا نہ سنا۔ اللہ تعالیٰ درجات عالی جنت میں نصیب فرمادے اور جوار خیر میں جگہ دیوے۔“ (سوانح قاسمی صفحہ ۲۹)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا مکتوب بنام مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دار العلوم:

سب سے پہلے ہم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے مکتوب بنام مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے مکہ مکرمہ سے ارسال فرمایا:

> ”از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت بابرکت عزیزؒ ولم مولوی رفیع الدین صاحب دام محبتہ و معرفتہ باللہ تعالیٰ بعد سلام مسنون و دعاء خیر کے معلوم فرمادیں۔ خط تمہارا مورخہ یکم رجب عین انتظاری میں پہنچا۔ اور سب حال وہاں کا معلوم ہوا۔ حال واقعہ جانکاہ (وفات مولانا محمد قاسم صاحب) کا خطوط بمبئی، بھوپال اور میرٹھ وغیرہ سے معلوم ہوا تھا۔ اس صدمے نے فقیر کو ضعیفی میں بہت گرادیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ رضا بقضا بندہ ہیں، اس کی جو چاہے کرے ہم سب کو چاہئے جان دل سے اس کی رضا پر رہیں ہمارے نفع نقصان کو وہ خوب جانتا ہے۔ اس پر سونپ کر اپنے کام میں مصروف رہیں۔ جس سے رضامندی اللہ، رسول ﷺ حاصل ہو۔

> عزیز من جو تم میں بڑے سرپرست مدرسہ کے تھے وہ جنت الفردوس کو سدھارے۔
>
> اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم سب بدل مدرسہ کی بہبودی میں مصروف ہو مگر فقیر نے تم کو لکھ کے داخل ثواب ہونا ہے.......... عزیزم مرحوم کے جو شاگرد اور مرید ہیں اور درست ہیں سب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں کہ
>
> ''عزیزم رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی عمدہ یادگاری مدرسہ ہے اس سے غفلت نہ کریں''

(سوانح قاسمی از گیلانی جلد سوم۔ ۱۵۰ اور ۱۵۱ کے درمیان فوٹو)

بانی دارالعلوم قاسم العلوم:

اس مکتوب سے معلوم ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی اور بڑے سرپرست حضرت قاسم العلوم ہی تھے۔ ورنہ اس وقت جو دیگر حضرات میں سے کوئی بانی ہوتا تو ان کا نام لیا جاتا۔ اور یہ کہ مدرسہ ان کی ہی یادگار ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی پر کیا گذری:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی جو قاسم العلوم کے طالب علمی کے زمانے سے اب تک ہم پیالہ اور ہم نوالہ رہے تھے ان پر کیا گذری، مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولوی رشید احمد گنگوہی سلمہ کو منگل کے روز خبر کی۔ بدھ کی دوپہر سے پہلے مولوی صاحب تشریف لائے اور جمعہ کے روز سہارنپور کو تشریف لے گئے۔ مولوی صاحب کو یہ ایسا صدمہ ہوا ہے کہ اس سے زیادہ کیا متصور ہو مگر ایسے ضابطہ کہ سکوت اور نماز میں اکثر گذرتی رہی۔ مولوی صاحب کی طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی۔ اب یہ صدمہ ہوا۔ سہارنپور پہنچ کر شنبہ کے روز (٦ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/۱۷ اپریل ۱۸۸۰ء) کے روز جناب مولوی احمد علی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ یہ آفت پر آفت اور مصیبت پر مصیبت ہوگئی۔ مگر مولوی صاحب کے صدمہ کے جنب اور مقابلہ میں یہ صدمہ بہت ہی کم ہوگیا۔ ورنہ خدا جانے اس کا کتنا صدمہ ہوتا۔'' (سوانح قاسمی صفحہ ۲۹)

اور امیر شاہ خان صاحب کی روایت میں یہ ہے انہوں نے کہا کہ حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ:

> "مجھے محمود (مولانا گنگوہیؒ کے صاحبزادے) مرحوم کا صدمہ ضرور ہے مگر مولانا (محمد قاسم) کی وفات کے صدمہ کا مقابلہ کوئی صدمہ نہیں کرسکتا۔ (اور بروایت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مولانا گنگوہی نے ایک مجمع میں فرمایا کہ) اگر وہ بات نہ ہوتی تو میں مولانا کے صدمہ کا تحمل نہ کرسکتا اور مرجاتا۔" (وہ بات سے مراد نسبت روحانیت)

(ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۰۶)

حضرت عارف باللہ کا غمِ پنہاں:

عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے مکتوب بنام منشی محمد قاسم صاحب نیانگری میں لکھتے ہیں:

> "میرا حال کیا پوچھتے ہو یہ صدمہ جانکاہ (وفات قاسمی) ایک جہان پر ہے۔ میں تو سخت دل، سخت جان آدمی ہوں کسی کے مرنے کا بہت رنج نہیں ہوتا مگر اتنا غم کسی کا نہیں ہوا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اب زندگی تلخ ہے۔"

(مکتوبات یعقوبی صفحہ ۱۰۶ خط مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ)

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کا غمِ بے پایاں:

مولانا رفیع الدین صاحبؒ مہتمم پر کیا کچھ گذری اور وفات قاسمی اضطراب اور قلق کیا ہوا لکھتے ہیں:

> "یہ واقعہ جانکاہ ایسا نہیں کہ یکا یک زمانہ اور اہل زمانہ بھول جائیں۔ مدت العمر اسلام اور اہل اسلام کی خیر خواہی میں رہے اور تمام عمر عزیز کو اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف فرمایا۔ واقعی ایسے عالی قدر اولولعزم صاحب کمال، خیر خواہ کافہ اہل اسلام کا انتقال فرمانا۔ عموماً گروہ پاک اسلام پر ایک سخت حادثہ ہے۔ خصوصاً اس مدرسہ کو کیونکہ اس چشمہ فیض کا منبع اور اس آب حیات کا مصدر اور اس آفتاب عالمتاب کا مظہر آپ ہی تھے۔"

(روئداد دارالعلوم ۱۲۹۷ھ صفحہ ۲)

بانی دارالعلوم قاسم العلوم:

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کے آخری جملے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت قاسم العلوم ہی تھے۔ یہی بات مولانا منصور علی خان نے مذہب منصور میں کہی ہے کہ اول مولانا مرحوم نے اس مدرسہ دارالعلوم دیوبند کو چندے سے چلایا تھا:

> ”ہندوستان میں اکثر مقامات پر مدارس دینی جناب مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اور مشورہ سے جاری ہیں۔ خصوصاً مدرسہ دیوبند میں اکثر طلبہ علم دین کی تحصیل کر کے اشاعت اسلام میں سعی کیا کرتے ہیں۔ اول مولانا مرحوم نے اس مدرسہ کو چندہ سے قائم کیا تھا اور اب تک بفضلہٖ تعالیٰ خوب ترقی اصلی کر رہا ہے۔“

(مذہب منصور حصہ دوم)

مولانا ذوالفقار علی صاحب پر کوہِ غم گر پڑا:

مولانا ذوالفقار علی صاحب جو آپ کے رفقائے کار میں سے تھے۔ ان کے رنج والم کا اندازہ حسبِ ذیل تحریر سے کیجئے جو ہدیہ سنیہ میں درج ہے لکھتے ہیں:

> نعاء یا اهل الاسلام، یا امة خیر الانام علیه الصلوٰة والسلام، نعاء یا شیوخ الایمان یا عیون الاعیان نعاء یا اولیاء الزمان یا عرفاء الاوان، نعاء یا علماء العصر یا حکماء الدهر، نعاء یا اهل الاحادیث و التفا اسیر یا اهل الفقه والخیر الکثیر نعاء یا ارباب المحابر یا اصحاب المنابر نعاء یا اهل التقویٰ یا اولی الجدویٰ، نعاء یا اهل الشریعة والطریقة والحقیقة، اتدرون ای فیاض فاض وای بحر غاض، وای شمس کسفت واصیة دوحة یبمست، لعمری لقد ذهب رواء الدین وبهاء الیقین و ضیاء الحق وسناء الصدق بذهاب مولانا المولوی محمد القاسم اذ قضی نحبه ولقی

ربه رخانه الشباب واصيب به الاحباب فانالله وانا اليه راجعون

قد كان وان يهد منى فقده
لو لا التاسى بابى القاسم

(ہدیہ سنیہ صفحہ۲)

”خبر مرگ پہنچادو اے مسلمانو، اے خیر الخلائق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے امتیو اے مومنین کاملین، اے بڑے بڑے لوگو خبر مرگ پہنچادو، اے زمانے کے اولیاء اور اے زمانے کے عارفو! خبر مرگ پہنچادو، اور اے علمائے عصر اور اے حکمائے دہر! خبر مرگ پہنچادو، اے محدثو! اے مفسرو! اے فقیہو! اسے خیر کثیر والو موت کی اطلاع دیدو۔ اے مصنفو! اے خطیبو! وفات کی خبر کردو۔ اے پرہیز گارو! اے بخشش والو! رحلت سے باخبر کردو اے شریعت طریقت اور حقیقت والو خبر موت پہنچادو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کون سا فیض رساں گذر گیا اور کونسا سمندر خشک ہوگیا اور کونسا سورج گہن میں آگیا اور کون سا بڑا سایہ دار درخت خشک ہوگیا۔ مجھے اپنے عمر کی قسم دین کی رونق، یقین کی تازگی اور حق کی چمک اور صدق کی دمک مولانا مولوی محمد قاسم صاحب کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے باعث جبکہ ان کا وقت پورا ہوگیا اور اپنے رب سے جاملے جاتی رہی۔ جوانی نے ان سے خیانت کی اور دوستوں پر مصیبت آپڑی۔ پس ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ قریب تھا کہ ان کی موت مجھے ہلاک کردے۔ اگر ابوالقاسم ﷺ کی وفات سے صبر نہ آتا۔“

مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کی بے قراری:

مولانا فخر الحسن گنگوہی نے اپنے استاذِ یگانہ عالم مولانا محمد قاسم صاحب کی یاد میں بایں الفاظ اشک غم بہائے ہیں۔ انتصار الاسلام میں لکھتے ہیں:

”حیف صد ہزار حیف کہ زمانہ ایسے عالم ربانی سے جو اپنے زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا خالی ہوگیا۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ حامی شریعت جو نہ فقط اپنی جان بلکہ پڑوسیوں کی بھی جانیں شریعت کی حمایت میں جھونک دے اس وقت دنیا سے اٹھ جائے۔ ہائے وہ

باغ اسلام کا باغبان کہاں گیا جو اس باغ کی حفاظت کرتا تھا جس سے اس کو رونق تھی۔ ہائے اب اس باغ کی خدمت کون کرے گا۔ اس کی روشیں کون درست کرے گا۔ خس و خاشاک سے صحن چمن دین کس طرح صاف ہوگا۔ ہائے وہ نخل بند گلستانِ اسلام کدھر گیا جو سرو اسلام یعنی صراط مستقیم کی درستی و موزونی کی فکر رکھتا تھا۔ ہائے وہ جاروب کش باغ دیں کہاں گیا جس کی تقریر خس و خاشاک اور نام کیلئے جاروب تھی۔ اب سوائے حسرت و افسوس کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔" (انتصار الاسلام صفحہ ۸)

سرسید مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے تاثرات:

ہم نے جناب سرسید کا مضمون حضرت قاسم العلوم کی وفات سے متعلق آغاز کتاب میں درج کر دیا ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے مگر چند جملے دوبارہ بھی لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ جناب ممدوح (مولانا محمد قاسم صاحبؒ) نے ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کیلئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آوے۔ نہایت رنج اور غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے...... مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس ولی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے بھی زیادہ...... ان کی تمام خصلتیں فرشتوں جیسی تھیں۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہوالا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔

مولوی محمد قاسمؒ اس دنیا میں بے مثل تھے
درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت شخص تھے

(علیگڑھ گزٹ ۲۴/اپریل ۱۸۸۰ء)

بے مثل قاسم العلوم:

سرسید مرحوم نے اپنی تعزیتی مضمون میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو جہاں فرشتہ خصلت کہا ہے وہاں یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس دنیا میں بے مثل تھے۔ دیکھئے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں انہوں نے ان کو بے مثل قرار دیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ سرسید کسی کے متعلق بے جا مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے تھے لیکن اب تک حضرت مولانا کے بارے میں، میں نے دیکھا ہے اس سے بھی میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں بحیثیت جامع الصفات قاسم العلوم بے مثل تھے۔ اس مقام پر پہنچ کر سرسید کی رائے کے بعد مجھے حسب ذیل امیر شاہ خان صاحب کا وہ خواب بیان کرنے کی جرأت ہو رہی ہے جو انہوں نے مولانا کی سخت علالت کے زمانے میں دیکھا تھا کہ ایک اہل اللہ بزرگ کو انہوں نے خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ:

> ’’ہمارے مولانا محمد قاسم صاحب کو اس شدت کی تکلیف مرض کی کیوں ہو رہی ہے۔ انہوں نے تین مرتبہ فرمایا کہ کیا مولوی محمد قاسم صاحب کے مثل کوئی دوسرا شخص بھی ہے؟ پھر خود جواب دیا کہ نہیں ہے۔ میں نے خواب ہی میں عرض کیا کہ اسی وجہ سے تو میں بھی عرض کرتا ہوں کہ باوجودیکہ مولانا بے مثل ہیں پھر ان کو تکلیف کیوں ہے؟ (انہوں نے جواب دیا کہ) مولانا کو کچھ تکلیف نہیں ہے۔ اور نہ کوئی مرض ہے (بلکہ) ایک بہت بڑا معاملہ درپیش ہے۔ اور اسی کی وجہ سے ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بیمار ہیں۔ مولانا نے جناب باری میں یہ درخواست پیش کی ہے کہ مجھ کو جو حضور نے طلب فرمایا ہے تو میں بخوشی حاضر ہوں مگر میری ایک عرض ہے کہ جس خدمت پر یہ بندہ دنیا میں مامور کیا گیا تھا۔ اس خدمت پر بندے کے روبرو دوسرے شخص کو مقرر فرما دیا جائے۔ مولانا کی اس عرضداشت کو جواب اب تک حاصل نہیں ہوا ہے۔‘‘

(سوانح قاسمی گیلانی جلد سوم صفحہ ۱۱۰۔۱۱۱)

ان حقائق سے حضرت قاسم العلوم کی اعلیٰ شخصیت ہمارے سامنے مجسم ہو کر آ جاتی ہے اس لئے ایسے شخص کا غم جس قدر بھی منایا جاتا کم تھا۔ وہ ایسی سیرت کے مالک تھے کہ ایسی سیرت کا مالک انسان دنیا میں کبھی کبھی قدرت بھیجتی ہے۔ آپ کے شاگرد رشید مولانا منصور علی خان صاحب نے آپ کی سیرت و اخلاق اور سراپا کے متعلق مذہب منصور کے دوسرے حصے

میں جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھیے جس سے آپ قاسم العلوم کے بہت قریب آسکیں گے۔ لکھتے ہیں:

قاسمی سراپا:

مولانا منصور علی خان صاحب آپ کے سراپا اور حلیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"رنگ گندمی، چہرہ لمبا، بینی دراز، اٹھی ہوئی، کہیں کہیں کوئی داغ چیچک نمودار تھا۔ اور چہرے کی نورانیت اور رونق اور تقدس دیکھ کر ہر شخص معتقد ہو جاتا تھا۔ میانہ قد، نہ موٹے نہ بالکل لاغر تھے۔ پیشانی پر آثار سجود نمایاں تھے۔"

اخلاق و عادات:

تصوف کے باب میں اگر چہ ہم نے آپ کے اخلاق و عادات پر قدرے روشنی ڈالی ہے۔ تاہم آپ کے شاگرد رشید مولانا منصور علی خان صاحب نے جو کچھ مذہب منصور میں آپ کے کریمانہ اخلاق کے بارے میں تحریر فرمایا ہے اس کو پیش نہ کرنا ناانصافی اور سیرت قاسمی کی تنقیص ہوگی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم صاحب:

"جناب رسول اللہ ﷺ اور اہلبیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس قدر محبت اور اعتقاد رکھتے تھے کہ مدعیوں میں اس قدر نہیں پایا جاتا بلکہ جملہ سادات کی نہایت تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ (عاشق رسول جو تھے) مولانا صاحب کی عادت تھی کہ (نانوتے میں) مسجد کی سہ دری میں (دیوبند میں چھتے کی مسجد میں بیٹھا کرتے تھے اور وہیں (نانوتے میں) مہمانوں کا قیام ہوتا تھا۔ اگر زیادہ مہمان آئے تو اپنے ماموں صاحب کے مکان پر ٹھہرادیا کرتے تھے مہمان نواز جو تھے) میں سب مہمانوں کا بستر اچھایا کرتا تھا۔ ایک دن چند مہمان کھانا کھانے کے واسطے ہاتھ دھونے کو اٹھے۔ میں اور دوسرے صاحب نے ان کے ہاتھ دھلادیئے مگر ایک بڈھا مسکین شکستہ حال رہ گیا۔ اس کے کسی نے ہاتھ نہ دھلائے۔ آخر وہ خود لوٹے کے واسطے جھکا ہی تھا کہ مولانا صاحب نے اس سہ دری سے جھپٹ کر اس قدر جلد وہ لوٹا اٹھالیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں نہایت ادب سے لوٹا پکڑ کر اس بڈھے کے ہاتھ دھلادیئے۔ (منکسر المزاج اور

متواضع جو تھے) اس وقت کی ندامت جس قدر مجھ کو ہوئی ہے بیان نہیں کرسکتا۔ مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ قرض لینے کا اگر کبھی اتفاق ہوتا تو اس کو جلد ادا کردیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "دوستوں کا قرض جلد ادا کردینا چاہئے۔" (حسن المعاملہ تھے) اگر کوئی شخص ادنیٰ شے بھی پیش کرتا اس کو بڑی خوشی سے لے کر خود بھی کھاتے اور دوسرے حاضرین کو بھی کھلاتے۔ (مہمان نواز جو تھے) خوراک ان کی بہت قلیل تھی۔ کبھی غذا کو بہت رغبت اور حرص سے نہیں کھایا۔ (زاہد جو تھے) نہایت چھوٹا لقمہ لیا کرتے تھے اور ہر لقمے پر خواہ کھانے کا ہو یا شیرینی کا بسم اللہ ضرور کہا کرتے۔ (ذاکر جو تھے) اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت دیکھ کر بہت خوش ہوتے (شاکر جو تھے) مگر بقدر نمک چشی کے اس میں سے لیا کرتے باقی سب کو دیدیا کرتے۔ (قاسم جو تھے) نماز جماعت سے ادا کرتے اور تکبیر اولیٰ کو کبھی ترک نہ کرتے (متقی اور نمازی جو تھے) اذان ہوتے ہی نماز کا اہتمام شروع کردیتے۔ (عاشق خدا جو تھے) ہمیشہ تہجد میں قرآن شریف پڑھا کرتے (حافظ قرآن جو تھے) جاہلوں کی نذر و نیاز کا کھانا کبھی نہ کھاتے۔ بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے اور دعا کرکے چلے آتے۔ (عالم جو تھے) مولانا صاحب بہت دیر تک شاہ مکمل صاحب کے مزار پر مراد آباد میں بیٹھے رہے۔ مجھ سے بوجہ سہو و غفلت کے اپنی قدم کی حفاظت نہ ہوسکی۔ میرا پیر مزار شریف سے لگا ہوا دیکھ کر کانپنے لگے۔ تمام بدن لرز رہا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا پیر اٹھا کر فوراً علیحدہ کردیا۔ مجھ کو بڑی شرمندگی اور خجالت ہوئی اور توبہ کی (ولی جو تھے) مولانا صاحب کی عادت تھی کہ جب کوئی جانا چاہیں کبھی اصرار سے نہ روکتے۔ مولانا صاحب کو چھتری لگانے سے نہایت کراہت تھی (مجاہد جو تھے) صرف انگرکھا، پاجامہ ڈھیلا، ٹوپی دوکلیہ پہنا کرتے تھے۔ (سیدھے سادھے جو تھے) سب کے آگے نہیں چلتے تھے۔ برابر ملے جلے رہا کرتے تھے (مساوات انسانیت کے حامی جو تھے) کوئی باہر کا آنے والا اول ان سے مصافحہ نہیں کرتا تھا مگر جس کو اللہ نے فراست دی تھی۔ وہ فوراً پہچان لیتا تھا۔ بچوں سے بہت خوش طبعی کیا کرتے تھے۔ مگر سچی ظرافت آمیز خوش طبعی تھی۔ ایک بچے کو فرمایا۔ اس بیل کی

دم سے اس کو باندھو۔ اس نے کہا میں نہیں جاتا۔ فرمایا بوجھ دونوں طرف برابر ہو جائے گا۔ آگے سر اور گردن ہے پیچھے تو لٹک جا۔ (ظریف جو تھے) یادِ الٰہی سے کسی وقت غافل نہ تھے۔ ہمہ تن ذکر بن گئے (صوفی جو تھے) بایں ہمہ حفظ مراتب اور رعایت حقوق واجتناب بدعات والتزام ضروریات دین ومستحبات وسنن بدرجہ کمال تھا۔ (عالم باعمل جو تھے) کسی امر میں تصنع اور تکلف مطلق نہ تھا۔ اخلاق ایسے ہی تھے کہ آدمی بے اختیار معتقد ہو جاتا تھا۔ (مخلص بے ریا جو تھے) غرض ہر کمال اور دیانت وامانت و تقویٰ ایسا تھا کہ باید وشاید (مرد کامل، متدین، امین اور متقی جو تھے) جو شخص ان کے پاس بیٹھتا کیسا ہی سست اور کاہل ہوتا چست اور کامل بن جاتا۔ (جفاکش جو تھے) نہ کسی دشمن سے دشمنی کرتے اور نہ کسی کو برا کہتے (مومن قانت جو تھے) نہ کسی امیر مالدار کے دروازے پر جا کر خوشامد درآمد کرتے (غنی جو تھے) اپنے کام میں دن رات مشغول رہتے (شاغل جو تھے) کبھی پیسہ یا روپیہ اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ نہ اس کا کسی سے حساب لیتے تھے۔ دس روپیہ سے زیادہ کی کبھی نوکری نہیں کی وہ بھی مہمانوں کے خرچ میں نان بائی کو بھجوا دیا کرتے تھے۔ (زاہد ومہمان نواز جو تھے) نزاع باہمی بالکل پسند خاطر عاطر نہ تھا۔ اتفاق کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔ (نائب رسول جو تھے) ہر شخص کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے اور دلجوئی اور اخلاق سے مسخر کر لیتے۔ (صاحب کشف اور صاحب اخلاق جو تھے) ان کی مسکنت اور غربت یاد کر کے رونا آتا ہے۔ (مسکین اور غریب الطبع جو تھے) وہ کبھی نفسانی خواہش سے کسی پر خفا نہیں ہوتے تھے۔ ان کی رضا اور ناراضی اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے تھی۔ (یہی بات انوار سرسید مرحوم نے بھی کہی ہے) (مولانا بے نفس جو تھے) افسوس کہ اکثر علمائے زمانہ نے جو فلسفی تھے ان کی قدر نہ جانی اور ان کی شہرت معقول ومنقول کی سن کر حسد کرنے لگے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس قدر غناء قلبی عطا کیا تھا کہ دنیا ومافیہا کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے۔ اور صرف سمجھنا ہی نہیں بلکہ سچے زاہد، خدا رسیدہ تھے۔ وہ کسی سے اپنے کمالات وحالات کی داد نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنی شہرت سے بچتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

"آج کل کسی قدر جہالت کا زمانہ ہے کہ ہم بھی علماء میں شمار کیے جاتے ہیں۔"

حالانکہ ان کا ذہن مصنف کتاب اور موجد فن کے ذہن سے بھی فائق تھا۔ (وقت کے امام جو تھے) کبھی ان کے نفس نے اپنا بول بالا سوائے حق تعالیٰ کے نہیں چاہا۔ عاجزی اور انکساری میں ذرا بھی ریا اور بناوٹ نہ تھی۔ (فطری مسکین تھے) باوجود سواری کے اکثر پیدل چلتے تھے۔ اور دوسروں کو اپنی جگہ بٹھا دیا کرتے تھے (مشقت کے عادی جو تھے) ان کی دست بوسی اور قدم بوسی کے واسطے ہاتھ اور پیر کی نزاکت اور خوبصورتی ہی کافی تھی اور ان کیلئے کچھ ایسی موزوں اور دلکش تھی کہ بے اختیار بوسہ دینے (بوسہ لینے) کو جی چاہتا تھا۔ ان کی سی نزاکت اور دلبری کسی معشوق میں بھی نہیں دیکھی۔

ان کا ذرا التفات اگرچہ جلالی ہو دافع بلیات تھا (درویش کامل جو تھے) وہ سرتاپا اکسیر اور کندن تھے۔ ان کا لطف اور التفات جمالی، مفرح القلوب اور کفایہ منصوری تھا۔ وہ سلف اور خلف کاملین کی یادگار اور خدا اور رسول کے جان نثار تھے۔ ان کے اخلاق و افعال وعلوم غائرہ دیکھ کر خدائے تعالیٰ کی قدرت اور حکمت یاد آتی تھی (وہ آیت اللہ جو تھے) ان کے جس قدر اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ اور علم باللہ اور اتباع رسول اللہ ﷺ کا بیان کیا جائے سب شایاں ہے۔ (متبع سنت جو تھے)

مولانا صاحب کی عادت تھی کہ وعظ کے وقت کسی حافظ کو بلا کر فرماتے کہ کوئی آیت یا کوئی رکوع پڑھو۔ جب حافظ پڑھتا اور مولانا صاحب اس کا بیان شروع کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام لغات وتفسیر ابھی اس کے متعلق، دیکھ کر آئے ہیں۔ (علوم کا سمندر جو تھے) پھر یہ کمال تھا کہ حاضرین کے دلوں میں جس قدر شبہات ہوتے تھے مولانا صاحب کے بیان سے ان سب کا جواب ظاہر ہوتا تھا۔ گویا مولانا صاحب کو شبہات کی اطلاع ہو گئی ہے۔ (اللہ کے نور سے دیکھتے تھے)

اتق فراسہ المومن فانہ ینظر بنور اللہ. انوار"

(مذہب منصور از صفحہ ۱۷۸ تا ۱۹۹ جلد دوم مطبوعہ محمد پریس حیدر آباد دکن)

یہ ہیں وہ عینی اور چشم دید واقعات جو حضرت قاسم العلوم کے ایک خصوصی شاگرد نے

اپنے سادہ الفاظ میں بلا مبالغہ بیان کر دیئے ہیں اور جن میں قطعاً شاعری سے کام نہیں لیا گیا۔

یقیناً حضرت والا اپنے عادات و اخلاق اپنی سیرت اور کردار کے اعتبار سے ان جلیل القدر اور عظیم المرتبہ شخصیتوں میں سے تھے جن کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا اور جن کی تمام زندگی رسالتمآب ﷺ کی زندگی کا نمونہ اور پرتو تھی۔

قیامت کے روز جب بہشت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور مختلف دروازوں سے مختلف بہشتی داخل ہوں گے۔ ان میں سے علماء، صلحاء، اولیاء، مجاہدین، حفاظ، مناظرین، مجتہدین، واعظین، مصلحین کے مختلف دروازے ہوں گے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ ان تمام حضرات کے گروہ میں سے ہر جماعت میں شامل ہونے کا حق رکھتے ہیں ان کیلئے یقین ہے کہ جنت کے جس دروازے سے داخل ہونا چاہیں داخل ہو جائیں گے کہ ہر دروازے پر کارکنانِ بہشت اور حضرت رضوان ان کا استقبال کریں گے۔

والحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی ابی القاسم محمد و علی الہ و اصحابہ اجمعین. ربی تقبل منی ھذہ الخدمۃ الحقیرۃ وارحمنی واغفرلی ولوالدی ولاساتذتی ولجمیع المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منھم والاموات انک علی کل شی قدیر.

محمد انوار الحسن شیرکوٹی

مہبط انوار ۱۲۹ اڈی

پیپلز کالونی لائلپور پاکستان

ساڑھے آٹھ بجے صبح

۱۸ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ ۱۵ جون ۱۹۶۸ء بروز ہفتہ

تاریخی مادے اور مرثئے

ایسی جلیل القدر ہستی کی وفات کی تاریخیں ظاہر ہے کہ کتنے ہی عقیدتمندوں اور دوستوں نے لکھی تھیں چنانچہ عارف باللہ مولانا محمد یعقوب صاحب لکھتے ہیں:

کیا چراغ گُل ہوا ۱۲۹۷ھ:

بعد انتقال جناب مولوی صاحب بہت سی تاریخیں اکثر صاحبوں نے نکالیں۔ سب کا یہاں ذکر کرنا طول ہے۔ ان میں دو مادے پسند احقر ہوئے ہیں، ان کو ذکر کرتا ہوں۔ ایک خود احقر نے نکالا ہے

"کیا چراغ گل ہوا۔"

اور اس کو نظم بھی کیا ہے کئی طور پر۔

وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے ۱۲۹۷ھ:

اور دوسرا مادہ نہایت عمدہ بغایت پسندیدہ مولوی فضل الرحمٰن صاحب دیوبند نے بھی نکالا ہے۔

"وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے۔"

مولوی صاحب نے ایک قطعہ نظم بھی فرمایا ہے جس کا یہ ایک مصرعہ ہے۔

رضی اللہ عنہما دائما ۱۲۹۷ھ:

اور دونوں بزرگوں (یعنی مولانا احمد صاحب محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم صاحب) کی وفات کی تاریخ عبدالرحمٰن خان صاحب مالک مطبع نظامی کانپور نے نہایت عمدہ

نکالی ہے۔

"رضی اللہ عنهما دائما."

مصیبت پر آئی مصیبت ۱۲۹۷ھ:

اور احقر نے یہ مادہ بھی نکالا ہے:

"مصیبت پر آئی مصیبت۔"

اور ان مادوں کے علاوہ ایک اور مادہ تاریخی جس کا پچھلے اوراق میں حاشیے پر مولانا محمد یعقوب صاحب نے ذکر کیا ہے یہ ہے:

"ہائے خزانہ خوبی۔"

۱۲۹۷ھ

مادہ تاریخی منظور از مولانا فضل الرحمٰن صاحب:

وہ غم ہے قاسم بزم ہدیٰ کی رحلت کا کہ جرعہ نوش الم جس سے ہر درونہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزم عرفان کا مثال خم فلک جام واژ گونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
ہے حامیان شریعت کو گر غم بے حد تو سالکان طریقت کو اس سے دونہ ہے
کہاں ہے مدرسہ دیں کا حامی برحق کہ ملک علم و عمل اس بغیر سونہ ہے
نہ پوچھ حالِ دل زار تشنگان علوم کہ ان کی زیست ترے ہجر میں چگونہ ہے
کیا ہے شعلہ ہجراں نے گر جگر کو کباب تو آتشِ غم فرقت نے دل کو بھونا ہے
مگر مزار مقدس سے تیرے اے خوشخو ترے فدائیوں کو صبر ایک گونہ ہے
سر الم سے لکھی فضل نے سنین وفات
وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

مرثیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ

از مولانا ذوالفقار علیؒ صاحب دیوبند

مددے سوز دردنم کہ شدم غرق بخوں   رحمے اے گریہ کہ من سوختم از سوز دروں
ایں چہ سورست کہ کردست مرا گرد جنوں   مرگ بشاب کہ از زیست بجانم اکنوں
وقت آنست کہ من جامہ جاں چاک زنم   آتشیں آہ بریں خرگہ افلاک زنم
فلک تفرقہ پرواز چہ کردی ہے ہے   باچنیں غمزدگاں بازچہ کردی ہے ہے
سخت کج باختی کج بازچہ کردی ہے ہے   در بیداد شدہ بازچہ کردی ہے ہے
ساختی بے سروپا بے سرو سامانی را   سوختی ز آتش جاں سوز مسلمانی را
مرشد و ہادی ماشاہ، محمد قاسم   بہ نمائندہ گمراہ، محمد قاسم
بادل روشن و آگاہ، محمد قاسم   رفتہ زیں دار فنا آہ، محمد قاسم
حالیا زیستنم مشکل و مردن مشکل   ہر نفس خوردن زخمی و نخوردن مشکل
تاشدہ از سرما سایہ آن سروراں   روز وشب صبح ومسائیم چو قمری نالاں
دورا زاں جان جہانیم چو جسم بے جاں   مثل آں گلہ کہ رفت از سروے آہ شباں
آہ ازیں فرقت جاوید کہ پایاں نیست   دادازیں زردرواں سوز کہ درمانش نیست
شمع از جمع شد و محفل ما شد تاریک   رفت خور زیر زمین ارض وسما شد تاریک
ہادی مابشد و راہ ہدیٰ شد تاریک   خانہ شرع و طریقت بخدا شد تاریک

بعد ازاں کیست کہ زیشاں غم اسلام خورد
فکر ایتام کند یا غم ناکام خورد

ایک عہد ساز شخصیت

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ

از قلم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم انگلینڈ

بشارت عظمٰی

۲۸ صفر ۱۴۲۱ھ، ۲ جون ۱۹۹۹ء بروز جمعۃ المبارک نماز فجر کے بعد احقر کو خواب میں مفکر اسلام حضرت مولانا علامہ خالد محمود صاحب دامت برکاتہم کی زیارت ہوئی۔ حضرت علامہ صاحب نے احقر سے فرمایا کہ میں نے اپنے والد محترم کے بارے میں ایک مضمون آپ کو بھیجا ہے وہ موصول ہوا یا نہیں؟ احقر نے عرض کیا ابھی تک نہیں ملا۔ فرمایا کہ عنقریب مل جائے گا، اسے ''الخیر'' میں شائع کردیں۔ اس کے بعد احقر کی آنکھ کھل گئی۔ اسی دن گیارہ بجے حضرت علامہ صاحب کے تلمیذ و رفیق خاص جناب حافظ فیض الرحمٰن صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے اور حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی قدس سرہ پر تحریر کردہ حضرت علامہ صاحب کا مضمون احقر کو ''الخیر'' میں اشاعت کے لئے دیا۔ حضرت علامہ صاحب کا حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی قدس سرہ کو خواب میں اپنا والد محترم کہنا علامہ صاحب کی نسبت روحانی کا بلند نشان اور اسلاف کے صحیح جانشین اور ترجمان ہونے کا بیان ہے، جو حضرت موصوف کے لئے یقیناً بشارت عظمٰی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسلاف امت سے صحیح نسبت عطا فرمائیں۔ (محمد ازہر)

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

مردان حق عہد بند نہیں عہد ساز ہوتے ہیں وہ گردوپیش میں نہیں گھرتے حالات کو نیا رخ دیتے ہیں وہ بہاؤ کے رخ نہیں بہتے بہاؤ کے الٹ تیرتے ہیں دنیا سراسر طوفان بن جائے حق کے چراغ نہیں بجھتے ایسے لوگ تاریخ میں عہد ساز شخصیتیں کہلاتے ہیں وہ دنیا کو اثر دیتے ہیں اس سے اثر لیتے نہیں

اگر گیتی سرا سرباد گیرد
چراغ مقبلاں ہر گز نمیرد

بارھویں صدی میں ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور تیرھویں صدی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی عبقری شخصیتیں پورے عالم اسلام میں حجۃ الاسلام تسلیم کی گئی ہیں یہ دونوں حضرات اسلامی علوم کے اسرار و حکم کے بے تاج بادشاہ ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب سے دہلی کی مسند علمی نے شہرت پائی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے دیوبند کی محبت علمی قائم ہوئی۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۲۹۷ھ) نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو آپ نے اپنے اردگرد عجیب مذہبی ماحول پایا ہندو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے خوفزدہ ہو کر اپنے پرانے دھرم (سناتن دھرم) میں ترمیم کر رہے تھے اور ان میں آریہ سماج کے نام سے ایک نئی تحریک اٹھ چکی تھی انگریز حکومت کے زیر سایہ مسلمانوں میں آزاد خیالی اور جدت پسندی تیزی سے سر اٹھا رہی تھی اور معتزلہ نظریات جو ایک مدت سے سرد خانے میں پڑے تھے سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کے زیر اثر پھر سے بال و پر نکال رہے تھے۔ انگلستان فرانس اور بلاد یورپ سے آنے والے عیسائی مشنریوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی چھاپے خانے نئے نئے لگ تھے اور اب پتھروں پر طباعت عام ہونے لگی تھی۔

مسلمانوں پر یہ ایسا وقت آن لگا تھا کہ اسلام کی کشتی کو منجدھار میں کھیلنا اور کنارے تک پہنچانا خاصا مشکل کام تھا اس کے لئے ایک ایسے مرد آہن کی ضرورت تھی جو بیک وقت

چومکھی لڑائی لڑ سکے اور اپنی نظر و فکر میں وہ سر مو محدثین دہلی سے متجاوز نہ ہو محدثین دہلی کی آخری صف کے لوگ مولانا مملوک علی (۱۲۶۷ھ) مولانا عبد الغنی (۱۲۹۶ھ) اور مولانا احمد علی سہارنپوری (۱۲۹۷ھ) وہ حضرات ہیں جن سے حضرت مولانا نانوتوی نے علم دین پایا اور یہ حضرات مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی (۱۲۶۲ھ) کے شاگرد تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی قدیم دینی درسگاہ جامعہ رحیمیہ دہلی کا چراغ انگریزی باد صرصر کے شدید جھٹکوں کی زد میں تھا علم الٰہی میں مقدر ہوا کہ اب یہ علمی مرکزیت حضرت نانوتویؒ کی عبقریت میں ابھرے اور تاریخ گواہ ہے کہ پھر ایسا ہی ہوا۔ شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا۔

مولانا نانوتوی کی متوازی حملوں کے خلاف چومکھی لڑائی:

حضرت مولانا نانوتوی نے آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند کے خلاف ایک عہد ساز کام کیا۔ آریہ مذہب کے اصول ابھی طے نہ ہو پائے تھے کہ آپ نے اس میں اپنی میخیں ٹھونک دیں سر سید احمد خان نے اعتزال کو نئے سرے سے ہوا دی تو آپ نے اس کا بر سر عام نوٹس لیا تصفیۃ العقائد اس کی شہادت ہے مباحثہ شاہجہانپور میں پادری نولس سامنے آیا تو اسے منہ کی کھانی پڑی آپ نے اسلام کی فتح کے جھنڈے اٹھائے اور مسلمانوں کی کامیابی موافق و مخالف سب مان گئے۔ (دیکھئے اخبار خیر خواہ عالم دہلی ۱۹ مئی ۱۸۷۶ء) اگلے سال میلہ خدا شناسی پھر دکھایا گیا اس میں پادری نولس نے اپنے ساتھ پادری اسکاٹ کو بھی بلا لیا مولانا نانوتوی کے ساتھ اس معرکہ میں مولوی محمد بچھرانوی (۱۳۰۵ھ) معین بنے یہاں پھر عیسائیوں کو عبرتناک شکست ہوئی۔

مغلیہ عہد میں ہندوستان کی شیعہ ریاستیں دبی رہتی تھیں لیکن انگریزی عہد میں انہیں بر سر عام اکسانے والے بہت تھے۔ جس طرح محدثین دہلی نے اپنے اپنے وقت میں اس الحاد کے خلاف اصولی کام کیا تھا مولانا نانوتوی نے ہدیۃ الشیعہ اور اجوبہ اربعین لکھ کر حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی یاد تازہ کردی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے اطرافی شاگرد جناب میاں نذیر حسین دہلوی نے تقلید کے خلاف تحریک چلائی اور یہاں سے غیر مقلدین کے طور پر ایک نیا فرقہ وجود میں آیا تو حضرت نانوتوی نے اس نو احداث فرقہ کا بھی

کھلے بندوں نوٹس لیا اور اس کے خلاف رسائل تحریر فرمائے۔

اسلام پر یہ بیرونی اور اندرونی حملے جس تیزی سے اٹھے حضرت نانوتوی نے ترکی بہ ترکی ان سب کو لگام دی آپ کا ایک رسالہ ترکی بہ ترکی اپنے نام سے آپ کے اس علمی ذوق کا پتہ دے رہا ہے کہ آپ فتنوں کو کچلنے کیلئے کسی تقسیم اور تاخیر کے قائل نہ تھے اور آپ کو کسی آزادی فکر اور آزادی عمل کو روکنے میں کسی تیاری کی ضرورت نہ ہوتی تھی ان تمام دینی کاموں میں دو بزرگ ہمیشہ آپ کے سرپرست اور مشیر رہے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی حضرت مولانا مملوک علی کے بیٹے اور دارالعلوم دیوبند کے پہلے شیخ الحدیث تھے۔

ان حضرات کا یہ ذوق مناظرہ اور مخالف نظریات کے بخئے اُدھیرنا کوئی اپنی خانہ ساز کاروائی اور کوئی اپنا شوق تردید نہ تھا بلکہ اللہ کے ہاں آپ کے لئے وہ اجر مقدر تھا جو اللہ نے پہلے دور میں پہلی صف کے مسلمانوں کو عطا فرمایا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن العلاء الحضرمی کہتے ہیں کہ مجھے ایک صحابی نے بتایا کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

انه سيكون في آخر هذه الامة قوم لهم مثل اجور اولهم يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر ويقاتلون اهل الفتن

(دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۵۱۳ للبیہقی)

ترجمہ: اس امت کے آخری دور میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو پہلے لوگوں جیسا اجر ملے گا وہ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ اہل باطل سے مقابلہ کرنے والے بھی ہوں گے۔

یہاں اہل باطل سے مراد وہ اہل فتن ہیں جنہوں نے عقائد و اعمال میں نئی نئی راہیں اختیار کیں خود کو مسلمان کہتے ہوئے وہ ان غلط راہوں پر چل پڑے ان کا اہل باطل سے مقابلہ ضروری نہیں کہ ہاتھوں سے ہی ہو اللہ نے جو زبانیں دیں اور علم عطا فرمایا یہ حضرات ان سے کام لیتے رہے اور مخالف نظریات کی تردید میں ان کے علم کی تلوار ہمیشہ بے نیام رہی۔ دسویں صدی کے مجدد حضرت ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) اس حدیث پر لکھتے ہیں

یقاتلون ای بایدیھم او بالسنتھم اھل الفتن

(مرقات ج ۱۱ ص ۴۶۹)

ترجمہ: وہ اپنے ہاتھوں سے بھی اور اپنی زبانوں سے بھی اہل باطل کا مقابلہ کرتے ہوں گے۔

پھر آپ اہل فتن کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ای من البغاۃ والخوارج والروافض و سائر اھل البدع (ایضاً)

ترجمہ: ان اہل فتن میں اسلام کے باغی خارجی رافضی اور بدعتی سبھی آ جاتے ہیں

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو بھی فتنہ پیدا ہو اس فتنہ کے مقابلہ میں آنے والے اور ان سے بحث و مباحثہ کرنے والے وہ اجر پائیں گے جو اجر پہلے دور کے لوگوں میں (صحابہ اور تابعین کو) ملتا تھا۔

حضرت نانوتوی صدیق فطرت انسان تھے:

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور ﷺ کی رحلت کے بعد اپنے آپ کو نہایت پیچیدہ حالات میں گھرا پایا کہیں مشورہ تھا کہ خلافت انصار میں جائے اور حضور ﷺ کا جانشین انصار میں سے چنا جائے انصار نے اس سلسلہ میں سقیفہ بنی ساعدہ میں ایک بڑا اجتماع بھی بلا لیا تھا خلافت کا مسئلہ طے ہونے کے بعد کہیں یہ مشورہ تھا کہ اسامہ بن زید کی قیادت میں جانے والی شام کی مہم کو کچھ وقت کیلئے روک دیا جائے اور پہلے ان لوگوں سے نپٹا جائے جو زکوٰۃ کی جماعتی حیثیت کے منکر ہیں پھر ختم نبوت کے منکرین بھی اپنے محاذ لگائے ہوئے تھے یمامہ کے لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کے مانتے ہوئے نیا نبی آ سکتا ہے مسیلمہ کذاب کی اذانوں میں برابر حضور کی رسالت کا اقرار کیا جاتا تھا اور وہ لوگ حضور ﷺ کے بعد غیر تشریعی نبوت کے جاری رہنے کے قائل تھے پھر یہ منکرین ختم نبوت بھی کئی محاذوں میں بٹے ہوئے تھے۔

حضرت صدیق اکبر نے ان تمام فتنوں کے مقابل پوری قوت ایمانی سے کسی مصلحت کو آڑے نہ آنے دیا اور آپ نے ان تمام محاذوں کے خلاف جو بھی لڑائی لڑی اور ہر

قدم پر فتح نے آپ کا استقبال کیا اور اللہ کی مدد ہمیشہ آپ کے شامل رہی صدیق فطرت لوگ بہت کم ہوئے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی مصلحت اور اندیشہ اپنے عمل سے نہ روک سکے حضرت نانوتوی اس پہلو سے ایک صدیق فطرت انسان تھے جنہوں نے اسلام پر کئے جانے والے ہر متوازی حملے کا پوری دلجمعی سے مقابلہ کیا آپ حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد میں سے تھے صرف نسباً نہیں نسبۃً بھی آپ انہی کی راہ پر چلے اور تاریخ نے اس کی شہادت محفوظ کر لی ہے۔

حضرت نانوتوی کی ختم نبوت کی تقسیم:

علم الٰہی میں تھا کہ چودھویں صدی ہجری میں ختم نبوت کے اسلامی معنی کے انکار میں ایک الحادی تحریک اٹھے گی ختم نبوت کے تیر سو سال سے یہی معنی سمجھے گئے تھے کہ حضرت خاتم النبیین ﷺ کے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا ملحدین یہ نئے معنی لے کر اٹھے کہ حضور ﷺ کے مرتبہ کا کوئی نبی نہ ہوگا آپ پر تمام مراتب نبوت ختم ہو چکے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے غالب پر شاعری ختم ہے یعنی اس مرتبہ کا کوئی شاعر نہ ہوگا یہ نہیں کہ اب شاعر نہ ہوگا ان دو معنی کو تقابلی مطالعہ میں اس طرح لیجئے۔

۱۔ لا نبی بعدی میں بعدیت زمانی مراد ہے کہ آپ کے بعد اب کوئی نبی پیدا نہ ہوگا۔
۲۔ لا نبی بعدی میں بعدیت مرتبی مراد ہے کہ اب آپ کے مرتبہ کا کوئی نبی نہ ہوگا۔

پہلے معنی تیرہ سو سال سے امت میں متوارث چلے آرہے تھے اور امت پورے تواتر سے اس پر جمع تھی لیکن یہ نئے معنی عام جاہلوں کے لئے زیادہ جاذب اور ظاہری پیرایہ میں حضور ﷺ کی زیادہ شان کا عنوان ہو سکتے تھے اور جذباتی پیرایہ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ معنی زیادہ اچھے ہیں۔

ابھی چودھویں صدی ظہور میں نہ آئی تھی اور نہ یہ دوسرے معنی دنیا میں کہیں عام ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ دوسرے معنی پہلے معنی سے کہیں متصادم نہیں انہیں پہلے معنی کے ساتھ جمع کر لیا جائے اور عقیدہ حضور کی ختم نبوت زمانی اور ختم نبوت مرتبی دونوں کا ہو تو اس سے اسلام کا کوئی اصول نہیں ٹوٹتا نہ

اللہ کی شان دیکھئے کہ ابھی مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ الحادی فتنہ سامنے نہ آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا توڑ پہلے سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے دل میں ڈال دیا آنحضرت ﷺ نے بالکل بجا فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدیم سے سنت رہی ہے کہ ہر پیدا ہونے والے شر سے بچاؤ کی راہ وہ کسی ولی کے دل میں اتار دیتا ہے اور دنیا میں کبھی کوئی ایسی بیماری نہیں آئی مگر یہ کہ اللہ نے اس کا علاج پہلے سے پیدا نہ کر دیا ہو۔

ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت زمانی کے ساتھ جمع کرنے کا استدلال:

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت زمانی کے ساتھ ضم کرنے کی جو الہامی تقریر فرمائی ہے وہ تحذیر الناس میں اس طرح موجود ہے۔ پیش نظر رہنا چاہئے کہ تحذیر مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت سے برسوں پہلے چھپی تھی اور اس سے مرزا غلام احمد قادیانی کا آئندہ اٹھنے والا دجل وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا تھا۔ اگر اس میں کچھ بھی ختم نبوت زمانی کا شائبہ انکار ہوتا تو مرزا غلام احمد اپنی کتابوں میں کہیں تو اس کا ذکر کرتا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے کہیں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت مولانا مرحوم کا تحذیر میں وہ الہامی استدلال یہ ہے۔

بالجملہ رسول اللہ ﷺ وصف نبوت میں موصوف بالذات ہیں اور سوا آپ کے اور انبیاء موصوف بالعرض اس صورت میں اگر رسول اللہ ﷺ کو اول یا اوسط رکھئے تو انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف دین محمدی ہوتا تو اعلیٰ کا ادنیٰ سے منسوخ ہونا لازم آتا اور انبیاء متاخرین کا دین اگر مخالف نہ ہوتا تو یہ بات ضرور ہے کہ انبیاء متاخرین پر وحی آتی اور افاضہ علوم کیا جاتا ورنہ نبوت کے پھر کیا معنی۔ سو اس صورت میں اگر وہی علوم محمدی ہوتے تو بعد وعدہ محکم انا لہ لحافظون ان کی کیا ضرورت تھی اور اگر علوم انبیاء متاخرین علوم محمدی کے علاوہ ہوتے تو اس کتاب کا

تبیانا کل شئی

ہونا غلط ہو جاتا۔ ایسے ہی ختم نبوت بمعنی معروض احقر (ختم نبوت مرتبی) کو تاخرِ زمانی لازم ہے۔ (تحذیر الناس۔ ملخصاً)

اس تقریر میں ان نکات پر خصوصی نظر رہے۔

۱۔ مولانا نانوتوی نے جو دیگر انبیاء کو وصف نبوت سے بالعرض کہا ہے تو یہ

موصوف بالعرض ہونا عارضی کے معنی میں نہیں ہے یہ عرضی کے معنی میں نہ ہے۔ ذاتی سے مراد دائم الثبوت للموضوع ہوتا ہے اور جو دائما نبی نہ تھے بلکہ ایک وقت ایسا آیا جب وہ نبی ہوئے تو ان کی نبوت عرضی ہوگی اس سے اس کے عارضی ہونے کا گمان نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ کسی کو نبوت دے کر اس سے واپس نہیں لیتے یہ اس کریم کی شان کے خلاف ہے۔

حضور ﷺ کے سوا باقی انبیاء کو نبوت حضور ﷺ کے فیضان سے ملی ہے آپ کی روح عالی اس وقت بھی نبوت پر فائز تھی جب آدم میں ابھی روح اور جسد نہ ملے تھے باقی انبیاء اس کے بعد فائز نبوت ہوئے اور آپ کے خاتم النبیین ہونے میں کوئی فرق نہیں آیا آپ دیگر انبیاء کی نبوت کیلئے ایک واسطہ ہیں اور آپ کو نبوت اللہ سے بلاواسطہ ملی ہے۔

شرح مطالع میں ذاتی اور عرضی کے بیان میں پانچواں اور چھٹا نمبر اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

الخامس ان یکون دائم الثبوت للموضوع وما لایدوم ھو العرضی.

السادس ان یحصل لموضوع بلاواسطة وفی مقابله العرضی

پس حضور اکرم ﷺ کے وصف نبوت سے موصوف بالذات ہونے کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ آپ پر کوئی ایسا وقت نہیں گذرا کہ آپ بالفعل نبی نہ ہوں اور پھر نبوت آپ پر عارض ہوئی ہو۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ جب آپ دنیا میں تشریف لائے تو آپ کو اپنی نبوت پر اطلاع ایک مدت کے بعد دی گئی:

ما کنت تدری مالکتاب ولا الایمان ولکن جعلناہ نورا نھدی به من نشاء من عبادنا (پ ۲۵ الشوری ۵۲)

آنحضرت ﷺ کی نبوت ذاتی اور حقیقی تھی اور اس کے اقرار سے دوسرے نبیوں کو نبوت ملی اور اس پر ان سے باقاعدہ میثاق لیا گیا اسے علماء امت کے سامنے لانے والے پہلے مولانا محمد قاسم صاحب نہیں ہیں بلکہ آپ سے مدتوں پہلے شیخ ابو عثمان فرغانی بھی کہہ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت دینے کا اصل شرف آپ ہی کو حاصل تھا دوسرے انبیاء میں آپ سے یہ حقیقت احمد یہ اتری علامہ فاسی نے دلائل الخیرات کی شرح مطالع المسرات میں اسم

ما کنت تدری مالکتاب ولا الایمان ولکن جعلناه نورا نهدی به من نشاء من عبادنا (پ ۲۵ الشوری ۵۲)

آنحضرت ﷺ کی نبوت ذاتی اور حقیقی تھی اور اس کے اقرار سے دوسرے نبیوں کو نبوت ملی اور اس پر ان سے با قاعدہ میثاق لیا گیا اسے علماء امت کے سامنے لانے والے پہلے مولانا محمد قاسم صاحب نہیں ہیں بلکہ آپ سے مدتوں پہلے شیخ ابوعثمان فرغانی بھی کہہ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعوت دینے کا اصل شرف آپ ہی کو حاصل تھا دوسرے انبیاء میں آپ سے یہ حقیقت احمدیہ اتری علامہ فاسی نے دلائل الخیرات کی شرح مطالع المسرات میں اسم داعی کی شرح کرتے ہوئے شیخ ابوعثمان فرغانی سے یہ عبارت نقل کی ہے:

فلم یکن داع حقیقی من الابتداء الی الانتهاء الاهذه الحقیقة الاحمدیه (مطالع المسرات صفحه ۱۰۲ مطبوعه)

ترجمہ: کائنات میں شروع سے آخر تک حقیقی داعی (دعوت الی اللہ کا علمبردار) اس حقیقت احمدیہ کے سوا کوئی نہیں رہا۔

۲۔ ختم نبوت زمانی کی اساس ختم نبوت مرتبی ہے اور یہ اصولاً آپ کو اس وقت بھی حاصل تھی جب میثاق انبیاء میں آپ کیلئے سب نبیوں سے نصرت کا وعدہ لیا جا رہا تھا لیکن ظہور ا یہ حضور ﷺ پر اس وقت کھلی جب سب نبیوں کے دور ہو چکے اور آپ نے اعلان فرما دیا کہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی پیدا نہ ہوگا یہ آپ کے اس ارضی دور میں آپ کی ختم نبوت کا اعلان تھا۔

سو آپ کی ختم نبوت مرتبی کے دو دور ہوئے:

۱۔ ایک وہ جس میں آپ کو میثاق النبیین میں صدر نشین بنایا گیا اور آپ کے بعد دنیا میں نبیوں کی آمد ہوتی رہی۔

۲۔ دوسرا وہ دور جس میں آپ دنیا میں بالفعل مبعوث ہوئے اس بعثت میں آپ کی ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت زمانی لازم ٹھہرائی گئی۔

ختم نبوت مرتبی کو اپنے اس پہلے دور میں غور سے دیکھا جائے تو یہ اس سے مانع نہیں

رہی کہ آپ کے بعد نبی پیدا ہوں بلکہ انبیاء کرام باری باری آتے رہے۔ سو ختم نبوت مرتبی بلاشرط شئی پتہ دیتی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی پیدا ہو تو اس ختم نبوت میں فرق نہ آئے گا لیکن ختم نبوت مرتبی اپنے دوسرے دور میں اس بات کی راہ نہیں کھولتی کہ آپ کے بعد کہیں کوئی اور نبی پیدا ہو اس دور میں اس ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت زمانی لازم ہے۔

۳۔ ختم نبوت زمانی حسیات میں سے ہے زمانے کو ناپا اور تولا جا سکتا ہے اور یہ ماضی اور حال میں منقسم ہے لیکن ختم نبوت مرتبی ایک معنوی حقیقت ہے۔ جو عام لوگوں کے احساس سے بالا ہے عوام حضور ﷺ کو آخری نبوی صرف اس معنی میں سمجھتے ہیں کہ آپ سب نبیوں سے آخر میں تشریف لائے کیونکہ یہ ان کے محسوسات میں سے ہے۔

آخر میں آنا اس میں بظاہر کوئی فضیلت نظر نہیں آتی۔ جمعہ کے دن مسجد میں جو سب سے آخر میں آئے کیا وہ سب نمازیوں میں زیادہ ثواب لے جانے والا سمجھا جائے گا؟ جب ایسا نہیں ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کا دنیا میں سب نبیوں کے بعد تشریف لانا کیا واقعی اس میں کوئی فضیلت نہیں؟ کیوں نہیں۔ یقیناً اس میں آپ کی بڑی فضیلت ہے۔ قرآن کریم میں آپ کو ”خاتم النبیین“ محل مدح میں کہا گیا ہے اور یہ مشرکین کی قدح کے جواب میں ہے جن کے رد میں ختم نبوت کی یہ آیت اتری۔ سو ضروری ہوا کہ وہ درجہ فضیلت معلوم کریں جس کی اساس پر آپ کا آخر زمانہ میں آنا مقدر ٹھہرا وہ وہی وجہ ہے جسے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے الہامی استدلال میں ذکر فرمایا ہے۔

۴۔ حضرت مولانا نانوتویؒ کے اس بیان کی آخری سطر کو پھر ایک بار ملاحظہ کریں۔

ختم نبوت بمعنی معروض کو تاخر زمانی لازم ہے۔

تحذیر الناس میں ختم نبوت زمانی کا یہ اقرار صرف یہیں نہیں بلکہ جگہ جگہ اس کی صراحت موجود ہے آپ صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں

اگر بطور اطلاق یا عموم مجاز اس خاتمیت کو زمانے اور مرتبے سے عام رکھا جائے تو پھر دونوں کا ختم مراد ہوگا یعنی ختم نبوت زمانی بھی اور مرتبی بھی۔

آگے آپ یہ بھی لکھتے ہیں:

سو اگر اطلاق اور عموم ہے تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے ادھر تصریحات نبویہ مثل

انت منی بمنزلة هارون من موسى الا انه لا نبی بعدی او کما قال علیه السلام

بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے اس باب میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون درجہ تواتر کو پہنچ گیا ہے پھر اس پر اجماع یہاں بھی ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجودیکہ الفاظ حدیث مشعر تعداد رکعات متواتر منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور بسند متواتر منقول نہ ہوں سو یہ عموم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی نہیں جیسا ان کا منکر کافر ہوگا ایسا ہی اس کا منکر (ختم نبوت زمانی کا منکر) بھی کافر ہوگا اب دیکھئے اس صورت میں عطف بین الجملتین

ما کان محمد ابا احد من رجالکم

اور

ولکن رسول الله و خاتم النبیین

اور استدراک اور استثناء مذکور بھی بغایت درجہ چسپاں نظر آتا ہے اور خاتمیت بھی بوجہ احسن ثابت ہوتی اور خاتمیت زمانی بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ (تحذیر الناس صفحہ ۹)

اس عبارت میں لفظ خاتمیت زمانی بار بار وارد ہوا ہے غور کیجئے حضرت مولانا نانوتوی خاتمیت مرتبی کے ساتھ اسے (یعنی ختم نبوت زمانی کو) کس کس پیرائے میں جمع فرما رہے ہیں کیا کوئی انصاف پسند عالم ان تصریحات کے ہوتے ہوئے حضرت مولانا کے بارے میں ادنی شبہ بھی کر سکے گا کہ مولانا مرحوم صرف ختم نبوت مرتبی کے قائل تھے ختم نبوت زمانی کے قائل نہ تھے۔ استغفر اللہ

کیا عوام کا عقیدہ ختم نبوت غلط ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت مولانا نانوتویؒ کے نزدیک عوام کا ختم نبوت

زمانی کا عقیدہ غلط ہے؟ ہرگز نہیں آپ اسے مع ایک زائد چیز سے ثابت کرنا چاہتے ہیں ختم نبوت زمانی تو سب کو مسلم ہے اور غور سے دیکھا جائے تو یہ ختم نبوت مرتبی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ختم نبوت مرتبی کا اصول تقاضا کرتا ہے کہ یہ زمانا بھی سب سے آخر میں ہو اور یہ ختم نبوت زمانی کافی ہے جو ختم نبوت مرتبی کو تکمیل بخشتی ہے ہاں ختم نبوت کو صرف زمانی میں محدود کرنا اور ختم نبوت مرتبی کو نہ دیکھنا یہ صرف عوام کی سمجھ ہے اہل فہم و دانش دونوں کو تسلیم کرتے ہیں صرف زمانی کا اقرار کرنا اس میں بالذات کوئی فضیلت نہیں۔ جمعہ کی نماز میں سب سے آخر میں آنے والا کوئی زیادہ ثواب نہیں لے جاتا نہ حضرت علی کے آخری بیٹے حضرت حسن اور حضرت حسین سے افضل تھے۔

ہاں حضور ﷺ کا صف انبیاء میں آخری ہونا اس لئے تھا کہ آپ سب سے اونچے مرتبے کے نبی ہیں اور کئی اور وجوہ ہیں جن کی وجہ سے آپ کو زمانا آخری نبی رکھنا ضروری ٹھہرا ان وجوہات کو حضرت نانوتوی نے اپنے الہامی استدلال میں خوب واضح کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے زمانا آخری ہونے میں گو بالذات فضیلت نہ تھی لیکن بواسطہ دیگر کئی وجوہ کے آپ کا زمانا آخر میں آنا یقیناً آپ کے کئی کمالات کا ترجمان ہے حضرت مولانا نے صرف بالذات فضیلت کی نفی کی تھی بالواسطہ فضیلت کی نہیں مگر افسوس کہ بعض معترضین نے آپ کی عبارت سے لفظ بالذات کو سرے سے اڑا دیا۔ حضرت نانوتوی کی عبارت ملاحظہ ہو۔

عوام کے خیال میں تو رسول اللہ ﷺ کا ختم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابقین کے بعد ہے اور آپ سب سے آخری نبی ہیں مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ تقدم یا تاخر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں پھر مقام مدح میں ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین فرمانا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے بلکہ بناء خاتمیت اور بات ہے جس سے تاخر زمانی اور سد باب خود بخود لازم آجاتا ہے اور فضیلت نبوی دوبالا ہوجاتی ہے۔ (تحذیر صفحہ ۳)

یہاں سد باب مذکور سے مراد جھوٹے مدعیان نبوت کے دعووں کا دروازہ بند کرنا ہے حضرت نانوتوی اسی بحث میں فرماتے ہیں۔

یہ احتمال کہ یہ دین آخری ہے اس لئے سد باب اتباع مدعیان نبوت کیا جو کل جھوٹے

دعوے کر کے خلائق کو گمراہ کریں گے البتہ فی حد ذاتہ قابل لحاظ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳)

اوپر کی عبارت میں لفظ بالذات قابل غور ہے اس میں صاف پایا جاتا ہے کہ یہاں تاخر زمانی کی فضیلت کا مطلق انکار نہیں بالذات فضیلت کی نفی ہے مگر افسوس کہ بریلی کے مولانا احمد رضا خان نے اس کا غلط ترجمہ کر کے علماء عرب کو یہ تاثر دیا کہ حضرت نانوتوی حضور ﷺ کے تاخر زمانی کی فضیلت کے مطلقاً منکر ہیں مولانا احمد رضا خان سے ان کی کتاب حسام الحرمین میں اس کا ترجمہ اس طرح کرایا گیا:

مع انه لافضل فيه اصلا عند اهل العلم

(حسام الحرمین صفحہ ۱۰۰ از احمد رضا خان)

ترجمہ: آپ کے آخری نبی ہونے میں اہل فہم کے ہاں سرے سے کوئی فضیلت نہیں

اور فتاویٰ افریقہ میں ترجمہ یہ کیا ہے

والتاخر الزمانی ليس من الفضل فی شئی

(دیکھئے صفحہ ۵۰)

ختم نبوت کا جو معنی عوام کے ذہن میں ہے حضرت نانوتوی اس کے منکر نہیں بلکہ اس کے مع شئی زاید (ختم نبوت مرتبی) معتقد ہیں اور ختم نبوت زمانی کو ختم نبوت مرتبی کے ساتھ ضم کرتے ہیں۔ آپ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں

درصورتیکہ زمانہ کو حرکت کہا جائے تو اس سے کوئی مقصود بھی ہوگا جس کے آنے پر حرکت منتہی ہو جائے سو حرکت سلسلہ نبوت کیلئے نقطہ ذات محمدی منتہی ہے یہ نقطہ ساق زمانی اور ساق مکانی کیلئے ایسا ہے جیسے نقطہ راس زاویہ تا کہ اشارہ شناسان حقیقت کو معلوم ہو کہ آپ کی نبوت کون و مکان اور زمین زمان کو شامل ہے منجملہ حرکات حرکت سلسلہ نبوت بھی تھی سو بوجہ حصول مقصود اعظم ذات محمدی ﷺ وہ حرکت مبدل بہ سکون ہوئی البتہ اور حرکتیں ابھی باقی ہیں اور زمانہ آخر میں آپ کے ظہور کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ (تحذیر صفحہ ۱۹)

یہاں اس لفظ زمانہ آخر کو بار بار پڑھیں اور مولانا احمد رضا خان کو ان کی دیانت اور مرتبہ علمی کی پوری داد دیں۔

حضرت نانوتوی کی دوسری تالیفات میں اس عقیدہ کی صدائے بازگشت:

حضرت نانوتوی کی دوسری تالیفات میں بھی ختم نبوت زمانی کا بیان نہایت ایمان افروز پیرائے میں ملتا ہے۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں:

۱۔ خاتمیت زمانی سے مجھ کو انکار نہیں بلکہ یہ کہئے کہ منکروں کیلئے گنجائش انکار نہ چھوڑی افضلیت کا اقرار ہے بلکہ اقرار کرنے والوں کے پاؤں جمادئے۔

(جوابات محذورات صفحہ ۵۰)

۲۔ جب حضرت خاتم النبیین ﷺ خاتم مراتب علمیہ اور خاتم مراتب نبوت وحکومت ہوئے تو نہ ان کی تعلیم کے بعد کوئی معلم تعلیم آسمانی لے کر آئے اور نہ ان کے بعد اور کوئی حاکم خدا کی طرف سے حکم نامہ لائے۔ (جواب ترکی بہ ترکی ص ۵۱)

۳۔ آپ کا دین سب نبیوں میں آخری ہے چونکہ دین حکم نامہ خداوندی کا نام ہے تو جس کا دین آخر میں ہوگا وہی شخص سردار ہوگا کیونکہ اس کا دین آخر ہوتا ہے جو سب کا سردار ہوتا ہے۔ (قبلہ نما ص ۱۱)

۴۔ معنی مختار احقر تو مثبت خاتمیت زمانی ہیں۔ (جوابات محذورات صفحہ ۶۸)

۵۔ اپنا دین وایمان ہے کہ بعد رسول اللہ ﷺ کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اسے کافر سمجھتا ہوں۔ (مکتوبات حضرت نانوتی صفحہ ۱۰۳)

مذکورہ عبارات میں دوسرے حوالہ کی عبارت کا یہ حصہ پھر دیکھئے۔

خاتمیت زمانی سے مجھے انکار نہیں بلکہ یہ کہئے کہ منکروں کیلئے گنجائش نہ چھوڑی۔

یہ الفاظ کہ منکروں کیلئے گنجائش نہ چھوڑی بتلاتے ہیں کہ اس وقت انکار ختم نبوت کا فتنہ کہیں اٹھنے والا تھا گو ابھی تک نہ اٹھا تھا اور حضرت نانوتوی بالہام الٰہی ایک بنیاد قائم کر رہے تھے کہ حضور اکرم ﷺ پر نبوت ہر اعتبار سے ختم ہے اور ختم نبوت کی کوئی نئی تاویل مسلمانوں کو

عقیدہ ختم نبوت زمانی سے نہ ہٹا سکے۔

علم الٰہی میں تھا کہ قادیانیوں نے آئندہ دور میں ختم نبوت کو ختم نبوت مرتبی کے معنی میں محدود کر کے ختم نبوت زمانی کا انکار کرنا ہے (اور ایسا ہی ہوا بھی) اللہ تعالیٰ نے پیشتر اس کے کہ مرض پیدا ہو اس کا علاج پہلے ہی ایک مرد مومن کے دل میں اتار دیا اور وہ حضرت نانوتویؒ کی یہ الہامی تقریر ہے جس نے ختم نبوت مرتبی کو ختم نبوت زمانی کے ساتھ جمع کرنے کی وجوہ کھول دیں اور واضح کر دیا کہ ختم نبوت مرتبی کو جس طرح بھی سامنے لائیں اسے ختم نبوت زمانی لازم آئے گی اور ختم نبوت مرتبی ہرگز یہ جائز نہیں کرتی کہ اب اس دور میں کہیں اور نبی پیدا ہو۔

قادیانی مبشر مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ نبوت ۱۹۰۱ء مطابق ۱۳۱۹ھ سے شروع کرتے ہیں اس سے پہلے مرزا غلام احمد مختلف دعاوی کے دور سے گذر رہا تھا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۱۸۸۵ء مطابق ۱۲۹۷ھ میں فوت ہوئے تحذیر الناس اس سے بہت پہلے چھپ چکی تھی حالات کی اس ترتیب پر غور کریں اللہ تعالیٰ نے قادیانیوں کے تمام دعووں کی جڑ کس طرح حضرت نانوتوی کے ہاتھوں کٹوادی قادیانیوں نے ختم نبوت کے جن نئے معنوں کو لے کر اٹھنا تھا اللہ نے انہیں اٹھنے سے پہلے ہی پیوست زمین کر دیا اور ان کا جواب پہلے سے تیار کرا دیا۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہم حضرت نانوتویؒ کو بجا طور پر ایک عہد ساز شخصیت کہہ سکتے ہیں جنہوں نے نبوت اور ختم نبوت کو اس دور فتن میں ایسے دلنشین پیرایہ میں سمجھایا کہ قیامت تک اس باب میں چلنے والے ان سے رہنمائی لیتے رہیں گے اور ختم نبوت پر محنت کرنے والا کوئی طبقہ اور فرد ان سے صرف نظر کر کے آگے نہ چل سکے گا۔

قادیانیوں کے دجل و فریب کا ایک نیا پیرایہ:

ہم حضرت نانوتوی کی تحریرات میں متعدد بار ختم نبوت زمانی کے الفاظ پیچھے ذکر کر آئے ہیں قادیانیوں نے جس طرح قرآن و حدیث میں دجل و فریب کی راہیں اختیار کیں انہوں نے حضرت نانوتوی کی بھی ایک عبارت میں دجل و فریب کی وہی راہ اختیار کی اور دعویٰ

کیا کہ حضرت نانوتوی کے ہاں اس امت میں اور نبی پیدا ہو سکتا ہے اور عبارت وہ پیش کی جو ختم نبوت مرتبی کے بیان میں بلا شرط شئی لکھی تھی اور ضرورت تھی کہ اس سلسلہ میں آپ کی بیان کردہ وجوہ کو جنہیں آپ نے دوسرے مقامات میں بیان کیا۔ ہے ان سب کی رعایت کرتے ہوئے اس عبارت کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی اور اگر پھر بھی وہ اسے نہ سمجھ پاتے تو وہ اسے متشابہات میں لیتے ہوئے اس موضوع پر مولانا کی محکمات کی طرف رجوع کرتے قرآن کریم میں کہا گیا تھا:

اما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ماتشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ و ابتغاء تاویلہ (پ ۳ آلعمران ۷)

ترجمہ: لیکن جن کے دلوں میں روگ ہوتا ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں تا کہ فتنہ قائم کر سکیں اور اس کا مصداق ٹھہرائیں۔

اگر اس کتاب (تحذیر الناس) میں اس امت میں کسی نبوت ملنے کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو مرزا غلام احمد قادیانی اس سے ضرور فائدہ اٹھاتا تو ایسے حوالوں کی ضرورت تھی ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مرزا غلام احمد نے یہ کتاب پڑھی نہ ہوگی لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تحذیر الناس میں ہرگز کوئی ایسا مواد نہ تھا جو کسی آئندہ دعویٰ نبوت کرنے والے کیلئے ذرہ بھی سند جواز بن سکے۔

حضرت نانوتوی کی مندرجہ ذیل عبارت ختم نبوت مرتبی کے بیان میں بلا شرط شئی ہے اس کے لوازم یہاں مذکور نہیں لیکن ملحوظ ضرور ہوں گے قادیانی از راہ دجل و فریب اسے ختم نبوت زمانی کا بیان قرار دیتے ہیں یہ ان کا صریح جھوٹ ہے جس کا دل چاہے اس پوری بحث کو اس کے سیاق میں دیکھ لے۔ حضرت لکھتے ہیں:

> ''ہاں اگر خاتمیت بمعنی اتصاف ذاتی بوصف نبوت لیجئے جیسا کہ اس ہیچمدان نے عرض کیا ہے تو پھر سوائے رسول اللہ ﷺ اور کسی کو افراد مقصودہ بالخلق میں مماثل نبوی نہیں کہہ سکتے بلکہ اس صورت میں فقط انبیاء کے افراد خارجی ہی پر آپ کی فضیلت نہ ہوگی افراد مقدرہ پر بھی آپ کی فضیلت ثابت ہو جائے گی۔'' (تحذیر صفحہ ۲۵)

آپ یہ بھی لکھتے ہیں:

> ”بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی ﷺ کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا۔“ (ایضاً)

حضرت نانوتوی نے اس ختم نبوت مرتبی کو بلا شرط شئی قبول نہیں کیا اسے ان الفاظ میں ان کا عقیدہ قرار دینا خلاف دیانت اور ظلم بالائے ظلم ہے حضرت مرحوم نے ختم نبوت مرتبی کو اپنے ان لوازم سے تسلیم کیا ہے۔

الغرض معنی مختار احقر (ختم نبوت مرتبی کے عقیدہ سے) کوئی عقیدہ (اسلام) باطل نہ ہوا بلکہ وہ رخنہ جو درصورت اختیار تاخر زمانی و انکار و منع خاتمیت مرتبی پڑتا نظر آتا تھا بند ہو گیا پھر تسپر خاتمیت زمانی بھی مداول خاتم النبیین رہی۔ (تحذیر صفحہ ۵۱)

اب اس عبارت کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص پہلی عبارت کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ حضرت نانوتوی یہ بات ختم نبوت زمانی کے بارے میں کہہ رہے ہیں تو ہم سوائے اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ

بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن

یہ نہ کہا جائے کہ دلالت التزامی دلالت مطابقی سے دوسرے درجہ پر ہے کیونکہ مدلول ایک ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں۔ حضرت نانوتوی اس نکتہ کو بھی تحذیر میں پہلے حل کر چکے ہیں آپ لکھتے ہیں:

> ”دلالت التزامی اگر دوبارہ توجہ الی المطلوب مطابقی سے کم ہو مگر دلالت ثبوت اور دلنشینی میں مدلول التزامی مدلول مطابقی سے زیادہ ہوتا ہے اس لئے کہ کسی چیز کی خبر تحقیق اس کے برابر نہیں ہو سکتی کہ اس کی وجہ اور علت بھی بیان کی جائے اگر کسی شخص کو کسی عہدہ پر ممتاز فرما دیں تو اور امیدوار قبل ظہور وجہ ترجیح بیشک غل مچائیں گے مگر بعد وضوح وجہ و علت پھر مجال دم زدن نہیں رہتی۔“ (تحذیر صفحہ ۵۰)

عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ میں نسبت صدیقی کا اثر:

اسلام کے پہلے دور میں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کی جو خدمت حضرت ابوبکر صدیق سے لی اس دور آخر میں اس عقیدہ کے تحفظ کیلئے آپ کے خاندان کے فرزند جلیل

اور اسلام کی حجت مولانا محمد قاسم نانوتوی کو پیشتر اس کے کہ مرزا غلام احمد دعوئ نبوت لے کر اٹھے ختم نبوت مرتبی کے اثبات کیلئے ہندوستان میں پیدا کر دیا تا کہ آئندہ جو ہتھیار قادیانیوں نے ختم نبوت زمانی کے خلاف استعمال کرنا تھا حضرت مرحوم نے اس ہتھیار کو ختم نبوت زمانی کا پہرہ دار بنا دیا یہ ختم نبوت کا اعجاز ہے کہ ابھی اس پر دور ابتلاء نہ آیا تھا کہ اس کا اس غلیظ وغلیظ ایہام سے کلی انخلاء ہو گیا اللہ الحمد والمنۃ۔

شمالی پنجاب میں سیال شریف سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی ایک مشہور گدی ہے اس کے خواجہ قمر الدین سیالویؒ لکھتے ہیں:

> ”میں نے تحذیر الناس کو دیکھا ہے مولانا محمد قاسم صاحب کو اعلیٰ درجہ کا مسلمان سمجھتا ہوں مجھے فخر ہے کہ میری حدیث کی سند میں ان کا نام موجود ہے خاتم النبیین کا معنی بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا کا دماغ پہنچا ہے وہاں تک معترضین کی سمجھ نہیں گئی قضیہ فرضیہ کو قضیہ واقعیہ حقیقیہ سمجھ لیا گیا ہے۔“ (ماخوذ از مقدمہ تحذیر الناس)

سوال یہ ہے کہ تحذیر الناس میں جو کیڑے مولانا احمد رضا خان کو نظر آئے وہ خواجہ قمر الدین اور پیر مہر علی شاہ کو کیوں نظر نہ آئے حالانکہ ان دونوں کا علم خان صاحب کے علم سے کہیں اونچا تھا۔

ہندوستان میں تحفظ دین متین کے لئے مناظروں کی راہ:

ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے مذہبی میلوں میں مناظروں کی راہ کھلی حضرت نانوتوی ان ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں جنہوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں بنیادی کام کیا

۱۔ حضرت مولانا آل حسن مہانی (۱۲۸۷ھ)
۲۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۳۰۸ھ)
۳۔ حضرت مولانا ابوالمنصور سید ناصر الدین دہلوی (۱۳۲۰ھ) مولف نوید جاوید
۴۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی (۱۲۹۷ھ)

یہ حضرات اونچے درجہ کے اہل علم اور مناظر گذرے ہیں۔

حضرت نانوتوی ان حضرات میں اس میں ممتاز رہے کہ آپ نے صرف عیسائی مشنریوں کے خلاف محاذ آرائی نہیں کی جس گروہ کو بھی دین متین کے خلاف مصروف پایا اس کے خلاف زبان وقلم سے خم ٹھونک کر نکلے

۱۔ شیعہ کے بارے میں ۲۔ معتزلہ کے بارے میں
۳۔ اہل بدعت کے بارے میں
۴۔ نوزائیدہ فرقہ غیر مقلدین کے بارے میں
۵۔ انگریز سامراج کے خلاف ۱۸۵۷ء کی تحریک میں

الغرض اصول ہوں یا فروع آپ نے جس کو بھی عقائد اہل السنت والجماعت کے خلاف پایا اس کی پوری جرأت اور قوت عملی سے سرکوبی کی یہ آپ ہی ہیں جنہوں نے دیوبند کو ذوق مناظرہ بخشا ہے۔

آج برصغیر پاک و ہند میں کئی ایسے لوگ ملیں گے جو اپنے آپ کو دیوبندی سمجھتے ہیں اور اپنی دینی مجالس میں اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ دوسرے مذاہب پر تنقید کرنا اور ان سے بحث ومباحثہ میں پڑنا یہ ایک فتنہ ہے اس سے بچنا چاہئے دعوت کے کام میں کوئی بات اختلافی نہیں ہوتی عافیت اسی میں ہے اور اس میں کوئی ذہنی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔

یہ سوچ علماء دیوبند کے مسلک کے قطعاً خلاف ہے۔ حضرت نانوتوی نے ۱۲۹۲ھ میں دہلی کے پادری تاراچند سے مناظرہ کیا چنداپور ضلع شاہجہانپور میں ۱۲۸۳ھ میں میلہ خداشناسی لگایا جس میں ہندوؤں کی طرف سے لال کبیر پنتھی عیسائیوں کی طرف سے انگلینڈ کے پادری نولس اور مسلمانوں کی طرف سے حضرت نانوتوی شامل ہوئے حضرت نانوتوی کے ساتھ شارح موطا مولانا فخر الحسن گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی اور حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوری بھی تھے۔ اگلے سال ۱۲۹۴ھ میں پھر چنداپور میں میلہ شناسی لگا اس میں بھی حضرت نانوتوی نے شرکت فرمائی اور ایسی تقریر فرمائی کہ دیوبند کا نام پوری دنیا میں گونج اٹھا اس سے اگلے سال ۱۲۹۵ھ میں پھر چنداپور میں بڑا زہبی اجتماع ہوا پادری نولس اس مرتبہ اپنے ساتھ پادری ڈائر کو لے کر آیا ہندوؤں کی طرف سے پنڈت دیانند سرستی آئے اور مسلمانوں کی

طرف سے حضرت نانوتوی اس میں شامل ہوئے۔

پنڈت دیانند نے یہاں شکست کھانے کے بعد رڑکی میں مسلمانوں کو جالنکارا حضرت نانوتوی وہاں بھی پہنچ گئے مگر پنڈت دیانند کو مناظرہ کی جرأت نہ ہوئی پھر اگلے سال ۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتویؒ نے وصال فرمایا اور آپ نے اپنے پیچھے مناظروں کی ایک تاریخ چھوڑی جو تاریخ دیوبند کا مایہ ناز سرمایہ ہے۔

آج جو لوگ مذاہب کے تنقیدی مطالعہ اور بحث و مباحثہ کو فتنہ قرار دیتے ہیں وہ دراصل خود علم و تحقیق سے عاری ہوتے ہیں اور اپنی دینی قیادت کے غلط رعب کو باقی رکھنے کیلئے وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اس انداز فکر سے عام مسلمان کس قدر دینی علم اور اپنے مسلک سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

حضرت نانوتوی جب مختلف ادیان و مذاہب سے مناظرے کررہے تھے اس وقت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس دیوبند اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان سب حضرات کے مرشد عالی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی زندہ تھے اور یہ حضرات ہمیشہ حضرت نانوتوی کیلئے دعا گو رہے کسی نے کبھی یہ رائے نہ دی کہ مناظرات میں پڑنا اور باطل کی تردید میں اترنا اور مذہبی بحث میں الجھنا مسلمانوں میں کوئی فتنہ پیدا کرے گا اور مسلمانوں کو صرف عمل کی دعوت دینی چاہئے علم کی نہیں۔ علم سے کچھ نہیں بنتا جب تک عمل ساتھ نہ ہو۔

کیا یہ کہنا درست ہے کہ علم سے کچھ نہیں بنتا:

یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ علم سے کچھ نہیں بنتا جب تک عمل ساتھ نہ ہو اسے یوں کہنا چاہئے کہ آخرت کی پکڑ سے بچنے کے لئے صرف علم کافی نہیں عمل بھی درکار ہے جس نے اسلام کے تقاضوں پر عمل نہ کیا وہ جہنم سے نہ بچ سکے گا گو کچھ ایک مدت کیلئے ہو لیکن یہ جملہ الحاد کسی طرح درست نہیں کہ علم سے کچھ نہیں بنتا جب تک عمل ساتھ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص یہ علم رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور وہی ایک عبادت کے لائق ہے اور حضور اکرم ﷺ اللہ کے سچے اور آخری رسول ہیں تو وہ کبھی نہ کبھی ضرور نجات پائے گا اور جنت میں داخل ہوگا کیا

یہ صرف علم نہیں جس پر وہ نجات کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ہذا ما علیہ اھل السنۃ والجماعۃ

عمل کی ترغیب بیشک مفید ہے اور ہونی چاہئے لیکن نیک اعمال کے انہماک سے جس شخص کے دل میں علم سے نفرت پیدا ہو جائے اور ایسے لوگ پھر علماء سے بدگمان ہونے لگیں اور آپس میں بیٹھے یہاں تک کہہ جائیں کہ علماء نے قرآن وحدیث کے درس دے کر آج تک کیا کر لیا ہے تو یہ راہ یقیناً ایک زندقہ کی راہ ہوگی اور وہ نیک اعمال جن کے گمان میں وہ لوگ علم سے بیزار ہوئے آخرت میں ان کے منہ پر مارے جائیں گے۔ اعاذنا اللہ منھا

اس تفصیل سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ علماء دیوبند نے دین کی نشر واشاعت کیلئے درس وتدریس اور بحث ومناظرہ کی جو محنتیں کیں ہیں وہ بالکل درست تھیں اور دعوت وعمل کی صدا میں یہ کہنا کہ علم سے کچھ نہیں ہوتا ہرگز درست نہیں۔ حضرت نانوتوی نے مناظروں کی جو راہ قائم کی پھر اس پر اپنے اپنے وقت میں دیوبند کے دوسرے اکابر چلے۔

۱۔ مناظر اسلام حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری:

علماء دیوبند کی دوسری صف میں حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری بہت ممتاز شخصیت ہیں آپ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی کے شیخ ومرشد ہیں آپ شرک وبدعت کے مقابلے میں توحید وسنت کے پورے نور کے ساتھ اٹھے اہل بدعت کو قلم اور زبان سے شکستوں پر شکستیں دیں برسرعام مناظرے کیئے آپ کے آخری دور میں دیوبند کی قیادت کا جھنڈا آپ کے ہاتھ میں تھا۔ مولانا احمد رضا خان نے جب علماء دیوبند کے خلاف تکفیری فتنہ برپا کیا تو اس کے جواب میں آپ نے علماء دیوبند کی نمائندگی کی اور المہند علی المفند تالیف فرمائی اور دیگر علماء دیوبند نے اس پر تصدیق کے دستخط کیئے۔ جب پنجاب میں مولانا غلام دستگیر قصوری نے علماء دیوبند کی مخالفت کی تو بہاولپور کے تاریخی مناظرہ میں آپ ہی علماء دیوبند کی طرف سے پیش ہوئے تھے اور مولانا غلام دستگیر قصوری جنہوں نے قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور محدث العصر حضرت مولانا خلیل احمد کے خلاف تقدیس الوکیل عن توھین الرشید والخلیل لکھی تھی حضرت سہارنپوری کے سامنے کھڑے ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس تفصیل سے ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ حضرت نانوتوی نے دین کی نشرو اشاعت کے لئے بحث و مباحثہ تقریرات اور مناظرات کی جو طرح ڈالی حضرت محدث سہارنپوری نے اسے برابر قائم رکھا اس دور میں دیوبند سے انتساب رکھنے والوں میں کہیں ایسے لوگ نہ تھے جو درس و تدریس اور بحث و مباحثہ کو فتنے کی راہیں بتلائیں اور یہ بات عام کہیں کہ علم سے کچھ نہیں ہوتا اور یہ کہ ہمارے بزرگ مناظروں کی راہ کو قطعاً پسند نہیں کرتے معلوم نہیں ان کے وہ کون سے بزرگ ہیں جو اکابر دیوبند کے خلاف یہ زہریلی فضا پیدا کر رہے ہیں کہ انہوں نے اپنے علم سے کیا کر لیا ہے مخالفین کی زبانیں تو ان کے خلاف ابھی تک چل رہی ہیں۔

یاد رہے کہ حضرت محدث سہارنپوری بہاولپور کے مذکورہ مناظروں میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی اجازت سے گئے تھے قومی ذمہ داریوں سے بچنے کیلئے بزرگ بننا اور اپنی تسبیحات سے اور نوافل سے۔ جماعتی کارکنوں پر اثر انداز ہونا کسی طرح درست نہیں۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

> ”بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہئے کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔“ (خطبات شیخ الہند صفحہ ٣٦ طبع لاہور)

٢۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

اقامت سنت کے محاذ پر:

یہ صحیح ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا مزاج اصلاحی اور خانقاہی تھا تاہم جب کبھی احقاق حق اور ابطال باطل کی نوبت آئی آپ کبھی پیچھے نہ رہے آپ

کی کتاب حفظ الایمان کی رگ فاروقی کی قوی شہادت ہے پھر آپ نے اور فرقوں کے خلاف بھی چھوٹے بڑے رسائل لکھے اگر کبھی مناظرے کی بات ہوئی تو آپ اس کے لئے بنفسِ نفیس تیار ہو گئے یہ اس بات کا نشان ہے کہ آپ نے حضرت نانوتوی کو ہمیشہ اپنا بزرگ جانا اور اپنے لئے رہنما مانا ہے۔

۱۳۲۸ھ میں بریلوی علماء نے بلند شہر میں مولانا احمد رضا خان کے فتویٰ تکفیر دربارہ اکابر دیوبند کی تشہیر کی اور یہاں تک کہا کہ علماء دیوبند مناظرہ نہیں کرتے بلند شہر کے جناب عبدالغنی صاحب نے جب یہ اشتہار دیکھے تو انھوں نے نزاع کو ختم کرنے کیلئے مناظرہ کی دعوت قبول کرلی۔ حافظ محمد عظیم بریلوی نے مولانا احمد رضا خان کو بلانے کی ذمہ داری لی اور مجلس برخاست ہوگئی۔

۱۷ شوال ۱۳۲۸ھ کو حافظ محمد عظیم نے جناب عبدالغنی صاحب کو خط لکھا کہ میں مولانا احمد رضا خان کو لانے کیلئے تیار ہوں لیکن علماء دیوبند سے یہ قلمی تحریر منگوایئے کہ وہ مولانا احمد رضا خان سے مناظرہ کریں گے۔ اور اس نے یہ شرط لگائی کہ یہ مناظرہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری۔ مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا اشرف علی تھانوی کریں گے۔ ہم اس وقت یہاں اس مناظرہ کی روائداد نہیں بیان کر رہے ہیں مولانا احمد رضا خان کے فرار کی تفصیل قاصمۃ الظہر فی بلند شہر نامی رسالہ میں موجود ہے۔ بتلانا صرف یہ ہے کہ بریلوی علماء کی طرف سے جو چیلنج دیا گیا ان تینوں بزرگوں نے اسے قبول کیا اور باقاعدہ تحریر کے ذریعہ میدان مناظرہ میں آنے کا اعلان کیا ان حضرات کی تحریر کے الفاظ ملاحظہ کریں۔

فوٹو کا فتویٰ منسوب حضرت مولانا مولوی حافظ رشید احمد صاحب محدث گنگوہی اور بعض عبارات تحذیر الناس و براہین قاطعہ و حفظ الایمان کی وجہ سے جو ہم پر اور ہمارے اساتذہ پر مولوی احمد رضا خان نے الزام و اتہام توہین خداوند عالم جل وعلیٰ شانہ، و توہین جناب سرور عالم ﷺ لگا کر تکفیر کی ہے اور کرائی ہے امور مذکورہ میں خانصاب سے ہم تقریری مناظرہ کرنے کو بالکل مستعد و آمادہ ہیں۔ بقاعدہ الاہم فالاہم ان مسائل کے طے ہونے کے بعد اور بھی جو ان کے اور ہمارے درمیان مسائل مختلفہ ہیں گفتگو کیلئے آمادہ ہیں خانصاب بھی اپنی تحریر مستعدی

مناظرہ کے بارہ میں بھیج دیں۔

خلیل احمد بقلم خود　　　بندہ محمود عفی عنہ　　　اشرف علی عفی عنہ بقلم خود

اس سے پتہ چلتا ہے کہ احقاق حق کیلئے مناظرہ کرنا ہمیشہ سے اہل حق کا طریقہ رہا ہے حکیم الامت حضرت تھانوی کا مولانا احمد رضا خان کے مقابل آنے اور مناظرہ کرنے کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے آپ نے مولانا احمد رضا خان سے مناظرہ کرنے سے کبھی انکار نہیں گیا اس کے برعکس مولانا احمد رضا خان حضرت مولانا سید مرتضٰی حسن صاحب مناظرہ کرنے سے ہمیشہ گریز پا رہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے جامع مسجد وزیر خان لاہور میں ایک بڑے مناظرے کا اہتمام کیا تھا جس میں بریلویوں کی طرف سے مولانا حشمت علی خان اور علماء دیوبند کی طرف سے مولانا محمد منظور نعمانی مناظر تھے مولانا احمد رضا خان اس وقت فوت ہو چکے تھے اور یہ حشمت علی صاحب ہی مظہر رضا کہلاتے تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ مولانا منظور نعمانی حکیم الامت حضرت تھانوی سے نمائندگی کی تحریر لائیں۔

حضرت تھانوی نے مولانا منظور نعمانی کو اپنی نمائندگی کی تحریر دے دی اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ضرورت کے وقت مناظرہ کرنے کو درست سمجھتے تھے اور اپنے عقیدت من علماء کو بھی مناظرے کے ڈھب بتایا کرتے تھے آپ نے ایک موقعہ پر فرمایا اہل بدعت سے جب گفتگو کرو تو فقہ سے کرو اس میں ان کو گنجائش نہیں ملتی قرآن مجید ایک متن ہے جس کے مختلف محامل ہو سکتے ہیں اسی طرح حدیث بھی ذو وجوہ ہو سکتی ہے اس لئے اہل بدعت جب تمسک کریں قرآن و حدیث سے کریں گے مثلاً قیام مولود کے بارے میں تعزروہ وتو قروہ سے کریں گے۔ (کلمۃ الحق صفحہ ۶)

اس میں آپ نے اہل باطل کے ساتھ مناظرہ کی ضرورت بتائی ہے گو حضرت نے اس میں کچھ بنیادی اصول اور شرائط مقرر فرمائے تھے تاہم آپ نے کبھی یہ نہ کہا کہ مناظرہ اہل

حق کا طریقہ نہیں ہے۔

اگر حضرت تھانوی کا مزاج مناظرہ کے خلاف ہوتا اور بوقت ضرورت آپ اس کے قائل نہ ہوتے تو آپ ہی بتائیں کہ حضرت تھانوی کے حلقہ کے حضرات حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری اور شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور حضرت کے خلفاء کرام حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ۔ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سہارنپوری حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کبھی اہل باطل سے مناظرے نہ کرتے۔ یہ حضرات فناء فی الشیخ تھے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شیخ جس عمل کو قابل نفرت جانیں ان کے اجل خلفاء اس میں اتنی سرگرمی دکھائیں سو یہ بات بلا کسی تردد کے کہی جاسکتی ہے کہ حضرت تھانوی قدس سرہ بھی احقاق حق اور ابطال باطل میں پوری جماعت دیوبند کے ساتھ تھے۔

یہ صحیح ہے کہ علماء دیوبند کا مزاج ہمیشہ تعمیری رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے کبھی بھی مناظرہ کرنے کو برا عمل نہیں جانا۔

۳۔ مناظر اسلام حضرت مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری:

آپ شیخ الہند کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے اور معروف و مشہور مناظر تھے دارالعلوم دیوبند کے سالہا سال ناظم تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے ہیں علماء دیوبند میں مولانا احمد رضا خان کے اصل مقابل آپ ہی رہے اور آپ نے خان صاحب کے خلاف تقریباً تیس رسائل لکھے جو شائع ہوچکے ہیں اور آپ بریلی جاکر خان صاحب کو چیلنج کرتے رہے اور انہیں لاجواب کرتے رہے ہیں۔ قادیانیوں کے مقدمہ بہاولپور میں آپ امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کے ساتھ عدالت میں پیش ہوئے اور قادیانیوں کے کفر کو متعدد وجوہ سے ثابت کیا۔ گوجرانوالہ میں اہل حدیث (باصطلاح جدید) کے ساتھ جو معرکے لگے اس میں زیادہ تر آپ ہی احناف کے وکیل رہے اس وقت کے علمی ذخائر اب بھی ماہنامہ العدل کے پرانے فائلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ حضرت مولانا مرحوم کے بعد دیوبند کے دفاع میں مناظر اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اٹھے اور حق یہ ہے کہ آپ نے اپنی خداداد مناظرانہ قوت سے اہل بدعت کو شکستوں پر شکستیں دیں لکھنو کے مولوی حشمت علی ہوں یا لائل پور کے سردار

احمد بار ہا ان کے سامنے ماہئی بے آب کی طرح تڑپے اور زمانہ کے دانشوروں نے کھلے طور پر اقرار کیا کہ دیوبند کسی جدید فرقے کا نام نہیں یہ وہی لوگ ہیں جو قدیم سے اہل السنۃ والجماعۃ کے نام سے چلے آرہے ہیں اور جن لوگوں نے انہیں ایک جدید فرقہ ہونے کا ٹائیٹل دیا وہ اب دم توڑ چکے ہیں۔

رامپور سے نواب صاحب دیوبند سے مناظرہ کی استدعا:

قادیانی مبلغین دعوت ارتداد لئے ریاست رامپور پہنچے تو نواب رامپور نے دیوبند سے استدعا کی کہ ان کے مقابلہ کیلئے رامپور میں مناظر بھیجا جائے حضرت شیخ الہند نے اپنے شاگرد مولانا ثناء اللہ امرتسری کو وہاں بھیجا جنہوں نے قادیانیوں کو عبرتناک شکست دی ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بزرگ حضرت نانوتویؒ کے نقش قدم پر ہر باطل کے مقابلے میں ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں حضرت نانوتوی ایک عہد ساز شخصیت تھے اور آپ کے سلسلہ کا ہر مرکزی عالم درس وتدریس اور بحث وتنقید میں آپ کے نقش پا پر چلا ہے۔

سہارنپور فرنگی محل اور ندوۃ العلماء میں پھیلے اثرات:

مظاہر العلوم سہارنپور میں مناظر اسلام حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ۔ فرنگی محل میں مولانا عین القضاۃ کے شاگرد مناظر اسلام مولانا عبدالشکور لکھنو اور ندوۃ العلماء میں مولانا سید محمد علی مونگیری (۱۳۴۶ھ) حضرت نانوتی کے نقش پا پر چلے۔ بریلی میں مدرسہ اشاعت العلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا غلام یٰسین کے نامور شاگرد مناظر اسلام مولانا خیر محمد جالندھری نے پنجاب میں دفاع کے اس محاذ کو سنبھالا اور اہل بدعت اور اہل حدیث (باصطلاح جدید) سے کامیاب مناظرے کئے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جہاں بھی باطل نے سر اٹھایا حضرت نانوتوی کے علمی اور روحانی فرزند حق کے دفاع میں وہاں پہنچے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ ختم نبوت کے محاذ پر:

حضرت شاہ صاحب کے نامور شاگردوں نے ختم نبوت اور قادیانیت کے محاذ پر جس بے جگری سے کام کیا اس کا ثمرہ پوری دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ یہ پوری دنیا میں جہاں بھی جائیں ان کا تعارف بطور مسلمان نہیں ہوتا اور وہاں کے مسلمان اپنی کسی قومی ضرورت میں بھی انہیں اپنے ساتھ لے چلنے کو تیار نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ ان کی محنت اب زیادہ کالے لوگوں میں ہو رہی ہے جو اردو بہت کم جانتے ہیں اور مرزا غلام احمد کی تحریرات اور ان کے جواب میں علماء دیوبند کی تحریرات تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔

حضرت شاہ صاحب کے شاگردوں میں دیوبند کے شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب۔ دیوبند کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ۔ شیخ الحدیث مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا مناظر حسن گیلانی شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوری شیخ الادب مولانا محمد چراغ (گوجرانوالہ) اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری نے ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت کے خلاف تاریخی جد و جہد کی اور گرانقدر تحریری سرمایہ مہیا کیا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی دفاع صحابہ کے محاذ پر:

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی لکھنو کی تحریک مدح صحابہ میں بالفعل شامل ہوئے پاکستان میں آپ کے شاگردوں نے دفاع صحابہ اور رد شیعیت پر وہ تاریخ ساز کام کیا کہ پاکستان فکری طور پر کسی پیرایہ میں بھی ایران کے ساتھ ہم عقیدہ نہیں ہو سکا حضرت شیخ الاسلام کے یہاں کے شاگردوں میں مناظر اسلام مولانا سید نور الحسن بخاری مہتمم تنظیم اہل سنت پاکستان۔ مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر خدام اہل السنۃ پاکستان حضرت مولانا محمد نافع صاحب منصرم ادارہ تحقیقات محمدی شریف ضلع جھنگ حضرت مولانا عبدالستار تونسوی صدر تنظیم اہل سنت پاکستان نے اس محاذ پر تاریخی کام کیا ہے بنگلہ دیش اور ہندوستان میں اس محاذ پر جو کام ہوا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

اس تاریخی تسلسل پر ایک سرسری نظر ڈالنے والا بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت نانوتوی ایک عہد ساز شخصیت تھے جنہوں نے ادیان و مذاہب کے تقابلی مطالعہ میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو ایک ایسا ذوق تنقید دیا کہ یہاں آئندہ بھی اگر کوئی دینی فتنہ اٹھے تو جتہ

الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عہد ساز شخصیت ان نئے خاکوں میں حق کا رنگ بھرتی رہے گی۔

آج بھی دار العلوم دیوبند میں کئی مناظرین ہیں جو ہندوستان میں اٹھنے والے فتنوں کی سرکوبی کرتے ہیں اور بوقت ضرورت مناظرہ کا چیلنج دیتے بھی ہیں اور اسے قبول بھی کرتے ہیں۔ حق کا دفاع جس طریقے سے بھی ہو باعث اجر و فخر ہے۔

حضرت نانوتوی آزادی ہند کے محاذ پر:

ہندوستان میں بیشتر دینی فتنے انگریزی عہد آنے پر اٹھے تھے اس وقت کے اکابران فتنوں کی جڑ سے ناواقف نہ تھے انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک فیصلہ کن اقدام کا ارادہ کیا انگریزوں نے ہندوستان مسلمانوں سے چھینا تھا اس لئے انگریزوں کی آمد نے جو خلش مسلمانوں کے سینوں میں پیدا کی وہ ہندوستان کی کسی دوسری قوم میں نہ ہو سکتی تھی حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید بالاکوٹ میں سکھوں سے بوجہ ان کے انگریزوں کے حلیف ہونے کی جنگ کا آغاز کر چکے تھے ہندوستان جس پر صدیوں اسلام کا پرچم لہرا چکا اب وہ بدیشی استعمار کے قبضہ میں تھا سو یہ بڑی ذمہ داری مسلمانوں پر آتی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے وہ انگریزوں کے قبضہ سے نکالیں ہندو پہلے سات آٹھ صدیوں سے مسلمانوں کے ماتحت رہے تھے اور انہیں پھر سے مسلمانوں کی عملداری میں جانے میں کوئی نیا اندیشہ نہ تھا اس لئے وہ ۱۸۵۷ء میں مسلم قیادت میں انگریزوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوئے علماء اسلام نے شاملی کے محاذ سے اپنی سیاسی مہم کا آغاز کیا اس میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ بالفعل شامل تھے حضرت نانوتوی کے بعد بدیشی استعمار کو بڑا خطرہ سمجھنے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اس راہ پر چلے۔

حضرت شیخ الہند نے بھی اسلام کے نام سے ہی اپنی سیاسی مہم کا آغاز کیا وہ اسلام کا نعرہ خلافت تھا جس میں ہندوستان کی مسلم آبادی کو وسیع کرنے کا ایک گہرا منصوبہ تھا۔ آپ افغانستان آزاد قبائل ایران اور ترکی کے ساتھ ملا کر ہندوستان کی مسلم آبادی کو ایک وسیع اتحاد میں لانا چاہتے تھے تا ہندوستان کی آزادی کی صورت میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت سے کوئی

خطرہ نہ رہے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنے ۱۹۲۰ء کے خطبہ علی گڑھ میں فرمایا۔

حسن اتفاق سے اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی کثیر التعداد قوم کا مطمح نظر بھی تمہاری ہمدردی اور واقعات پنجاب کی وجہ سے اور خواہش سیلف گورنمنٹ کی وجہ سے ترک موالات مع النصاری ہے اور ابھی حال میں سنا گیا ہے کہ سکھ لیگ نے بھی یہی فیصلہ کرلیا ہے اس موقع کو غنیمت جاننا چاہئے تم اپنی نظر فقط خدا پر رکھو تمہارا دوست اور مددگار صرف وہی ہے البتہ جو قومیں تمہارے اس نیک مقصد میں خود بخود شریک ہو جائیں یا تمہاری تائید اور غم خواری کریں ان سے تم بھی مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرو اور مبرۃ و اقساط (مروت اور حسن سلوک) سے پیش آؤ۔ قرآن کریم (پ ۲۸ الممتحنہ) میں ہے

> لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان اللہ لا یحب المقسطین انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون. (خطبات شیخ الھند صفحہ ۱۲۴ طبع لاھور)

قرآن کریم نے یہاں صریح طور پر کفار کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے (۱) ایک وہ جو تمہارے دین کو مٹانے کے در پے ہوں اور دوسرے وہ (۲) جو تمہارے ساتھ حسن سلوک سے چلیں پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت شیخ الہند نے یہاں مسلمانوں کو اور ہندوؤں کو دو قوموں کی طور پر ذکر فرمایا ہے اور پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ دیکھنا اس اختلاط میں کہیں اپنی اصل کو نہ کھو دینا۔ حضرت نانوتوی۔ حضرت گنگوہی نے ۱۸۵۷ء میں اسی آیت مندرجہ بالا کے پیش نظر انگریزوں اور ہندوؤں سے مختلف برتاؤ روا رکھا حضرت شیخ الہند بھی اسی راہ پر چلے۔ پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاسی جدوجہد بھی یہی رہی۔ گو بعد کے حالات نے ایک دوسری صورت اختیار کرلی تاہم یہ صحیح ہے کہ حضرت نانوتوی اپنی سیاسی فکر میں بھی ایک عہد ساز شخصیت رہے۔

حضرت نانوتوی فقر و تصوف کے بوریہ نشین کے طور پر:

حضرت نانوتوی نے شیخ العرب والعجم عارف باللہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ سے چشتی صابری سلسلہ میں خلعت خلافت پائی آپ اپنے مرشد عالی کی زندگی میں راہی ملک بقاء ہوئے حضرت شیخ نے آپ کی وفات پر جو کلمات کہے ان پر ایک نظر کیجیے۔

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ بخدمت بابرکت عزیزم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب دام محبۃ اللہ

بعد سلام مسنون و دعا خیر آنکہ مکتوب العزیز رسید واز حال پر ملال انتقال مولانا احمد علی صاحب مرحوم دلخت جگرم و پارہ دلم مولوی محمد قاسم صاحب رحمہم اللہ اطلاع داد سابق ہم خبر رسید انا للہ وانا الیہ راجعون افسوس صد افسوس۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خم خانہ را کردند و رفتند
جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر
رہ گئے سایہ کے جوں ہم خاک پر
مرد باہمت ہوئے شہ پر نثار
ہم سے دوں ہیں نفس کے ہاتھوں میں خوار

اب زندگی کا لطف فقیر کے نہیں رہا دعا کرو کہ حق تعالیٰ جلد خاتمہ بخیر کر کے اس دار الحزن سے اٹھا لے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں۔ فقط

آپ کے روحانی مقام کی ایک اور شہادت:

حضرت کے شیخ و مرشد کی آپ کے بارے میں رائے آپ دیکھ چکے ہیں اب آپ حضرت کے بارے میں ایک غیر جانبدارانہ شہادت بھی ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا حکیم ابوالبرکات میر سید دائم علی (۱۳۲۵ھ) عظیم آباد صوبہ بہار کے رہنے والے خیر آبادی سلسلہ کے ایک نامور بزرگ تھے پھر آپ ٹونک چلے آئے۔ مولانا عبداللہ ٹونکی (۱۹۲۰ء) آپ کے شاگرد ہیں۔ مولانا حکیم سید دائم علی کے پوتے حکیم محمود احمد برکاتی کراچی میں لیاقت آباد میں مقیم ہیں۔ آپ نے اپنے والد مولانا سید حکیم برکات احمد پر ایک کتاب اسی

نام سے لکھی ہے اور اسے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں ہے کہ آپ کے والد مولانا حکیم برکات احمد صاحب نے فرمایا والد ماجد (مولانا حکیم دائم علی) مولانا محمد قاسم کے خواجہ تاش تھے اس لئے ایک بار مجھے ان سے ملانے کے لئے دیوبند لے گئے جب ہم پہنچے تو مولانا چھتہ کی مسجد میں سو رہے تھے مگر اس حالت میں بھی ان کا قلب ذاکر تھا اور ذکر بھی بالجہر کر رہا تھا۔

(مولانا حکیم سید برکات احمد صفحہ ۱۸۵ شائع کردہ برکات اکیڈمی کراچی)

اس سے پہلے آپ نے اپنے مسلک کے بارے میں لکھا ہے۔

میں نے ایک بار مولانا معین الدین اجمیری کے تلمیذ رشید مولانا نجم الحسن خیر آبادی سے اس سلسلہ میں سوال کیا تھا تو مولانا نے جواب میں لکھا تھا کہ مولانا عبدالحق خیر آبادی اور ان کے تلامذہ کا مسلک اعتدال پسندی تھا۔ مولانا عبدالحق کے جید تلامذہ مولانا عبدالعزیز مولانا برکات احمد، مولانا نادر الدین، مولانا فضل حق رام پوری، مولانا ہدایت علی بریلوی اور مولانا ماجد علی وغیرہ سے کسی (مخالفین) کی تکفیر ثابت نہیں۔ (صفحہ ۱۸۴)

آپ نے اپنے مسلک اعتدال کو اس طرح بھی بیان کیا ہے۔

برکاتی اور خیر آبادی درسگاہیں دیوبندی و بریلوی مذہب کے علماء کی درسگاہوں کے یکسر مختلف نظر آتی تھیں۔ مولانا معین الدین اجمیری نے ایک استفتاء کے جواب میں کہ کیا حضرات (شاہ محمد اسماعیل شہید اور مولانا قاسم، مولانا رشید احمد) کافر ہیں؟ تحریر فرمایا۔

یہ حضرات مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے پیشوا ہیں۔ (براۃ الابرار صفحہ ۲۰۷)

مولانا برکات احمد نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے روحانی مقام پر جو کھلی شہادت دی ہے اسے ہم بجا طور پر ایک غیر جانبدار شہادت کہہ سکتے ہیں۔

ان تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مرحوم ایک عہد ساز شخصیت تھے اور ایک عجیب شان جامعیت کے مالک تھے یہاں ہم بوجہ اختصار آپ کی تفسیر و حدیث کی خدمات کا کچھ ذکر نہیں کر سکے تاہم اتنی بات کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص آپ کی تصنیفات سے آپ کے تفسیری نکات کو یکجا جمع کرے تو عصر جدید میں علوم قرآن کی ایک اور بڑی خدمت سامنے آئے گی آپ کے علم حدیث کے ذوق کیلئے یہ جان لینا کافی رہے گا کہ صحیح بخاری کے آخری پانچ

پاروں پر آپ کے حواشی جو حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے پچیس پاروں کے حواشی کے ساتھ چھپے ہوئے ملتے ہیں آپ کی علمی عبقریت اور فکری بصیرت پر ایک روشن برہان ہیں۔

صدر الصدور دہلی مفتی صدرالدین کے شاگرد مولانا فقیر محمد جہلمی دیوبندی نہ تھے۔ نہ اس وقت اس نام سے کوئی گروہ اہل علم معروف تھا۔ آپ نے تیرھویں صدی کے علما کے ذیل میں حضرت مولانا محمد قاسم کا بھی ذکر کیا ہے اس میں آپ نے حضرت نانوتوی سے نقل کیا ہے۔

بایام طالب علمی میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ میں سے ہزاروں نہریں نکل کر جاری ہو رہی ہیں۔ جناب والد صاحب سے ذکر کیا انہوں نے فرمایا کہ تم سے علم دین کا فیض جاری ہوگا۔

(حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۹۲ طبع اول ۱۳۲۴ھ نولکشور لکھنو)

مولانا جہلمی آپ کے عجیب و غریب علوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس طرح کے مضامین بیان فرماتے کہ نہ کسی نے سنے نہ سمجھے اور عجائب و غرائب تحقیقات ہر فن میں کرتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ و بن تک ہو جاتی تھی۔ پادری تارا چند کو آپ نے مباحثہ میں ساکت کیا...... مباحث روشن نفس آپ کی تاریخ وفات ہے ۱۲۹۷ھ

ولقد جاء فی العل العافر کم ....

زمانہ صدیوں اس عہد ساز شخصیت کے علوم و کمالات سے متمتع اور مستنیر رہے گا یہی وہ لوگ ہیں جو عہد بناتے ہیں اور پھر قومیں ان کے پیچھے چلتی ہیں۔

(ماہنامہ الخیر ملتان، جولائی/اگست ۲۰۰۰ء)

وفات نبی ﷺ اور حضرت نانوتویؒ

منکرین حیاۃ النبی ﷺ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر بہتان لگاتے ہیں کہ آپؒ وفات نبی ﷺ کے منکر ہیں (العیاذ باللہ) حالانکہ یہ سفید بلکہ کالا کذب ہے، ۱۹۵۸ء سے پہلے کسی کو یہ خیال نہ آیا، مماتی فتنے کے ظہور کے بعد اس قسم کی بولیاں بولی جانے لگیں، دراصل حضرت نانوتویؒ آسمان علم پر جہاں پرواز کر رہے تھے وہاں تک ہر ایک کی رسائی کہاں؟ حضرت نانوتویؒ کا کیفیت وفات میں تفرد ضرور ہے اور اپنی اس تحقیق پر وہ کسی کو مجبور بھی نہیں کرتے، وفات کے منکر قطعاً نہیں، آپؒ فرماتے ہیں:

حسب ہدایت کل نفس ذائقہ الموت اور انک میت وانھم میتون

تمام انبیاء کرام علیہم السلام خاص کر سرور انام ﷺ کی نسبت موت کا اعتقاد بھی ضروری ہے (لطائف قاسمی صفحہ ۴) اور فرماتے ہیں:

''آپ کی ﷺ وفات اور آپ ﷺ کا انتقال ہزاروں آدمیوں نے دیکھا۔''

(آب حیات صفحہ ۳۵)

اور یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:

''القصہ حیات جسمانی انبیاء علیہم السلام کا بعد موت بھی اقرار ضروری ہے۔''

(اجوبہ اربعین صفحہ ۳۰۰)

دور حاضر کے معتزلہ یعنی مماتی حضرات کو حضرتؒ کی اس عبارت سے دھوکا ہوا ہے:

''ارواح انبیاء کرام ﷺ کا اخراج نہیں ہوتا۔''

(جمال قاسمی صفحہ ۱۵)

حضرتؒ اپنے ذوق کے مطابق فرماتے ہیں کہ آنجناب ﷺ کی روح مبارک کو نکالا نہیں گیا یعنی خروج نہیں ہوا بلکہ جسد اطہر کے تمام اطراف و جوانب سے سمیٹ کر قلب اطہر میں یکجا کر دیا گیا مگر دل کی حرکت باقی نہ رہی، دیکھنے والوں کو وجود مبارک بالکل بے حس نظر آیا اور جب تدفین ہوگئی تو دوبارہ قلب مبارک میں جمع شدہ روح مبارک کو سارے جسم میں پھیلا دیا گیا اور پھر اپنی اس تحقیق انیق کے بعد واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

> ''عقیدہ تو یہی ہے اور میں جانتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی رہے گا مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا۔'' (لطائف قاسمیہ صفحہ ۵)

مماتیوں کا ایک دھوکہ:

قارئین کرام! حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اپنی وجدانی رائے کو ''ارواح انبیاء کا اخراج نہیں ہوتا'' کے متعلق فرماتے ہیں کہ میری تحقیق پر ہی عقیدہ کا دارومدار نہیں، میں اپنی اس رائے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا، اس عبارت سے مماتی دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو حضرت نانوتویؒ مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں، بزرگوں کی ایک آدھ عبارت پر اپنا اختراعی حاشیہ چڑھا کر پیش کرنا یہ کوئی اشاعت ''توحید والسنۃ نہیں بلکہ تلبیس وفتنہ'' ہے، اسے کہتے ہیں

الا من خطف الخطفة

شیطان بھی آسمان سے ایک آدھ بات چوری کرتا ہے پھر سو جھوٹ اپنے پاس ملا کر شیطنت کو پھیلاتا ہے، مماتی حضرات اس شیطانی حرکت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

الا من خطف الخطفة کی چند مثالیں:

امام اہل سنت محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب مدظلہم نے مسئلہ حیات پر ''تسکین الصدور، سماع موتی، المسلک المنصور اور الشہاب المبین'' وغیرہ مستقل کتب لکھی ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں مگر مماتی ان کا نام تک نہیں لیں گے، ہاں ''احسن الکلام'' ج ۲ صفحہ ۱۹ پر آدھی سطر کہ ''روحیں آسمان پر ہیں'' کو خوب اچھالیں گے کہ حضرت شیخ مدظلہ کا عقیدہ ہے کہ روح آسمان پر ہے اور مردہ قبر میں ہے تو حیات کیسے ہوئی؟ اور کہاں سے

آئی؟ لاحول ولاقوۃ الا باللہ

''اشرف الجواب'' حضرت تھانویؒ کی خودنوشت نہیں، افادات ہیں جن کو منشی علی محمد صاحبؒ ٹوبہ ٹیک سنگھ والوں نے ترتیب دیا ہے، اس میں مندرجہ ذیل عبارات ہیں:

۱۔ درود حضور علی السلام پر پہنچتا ہے۔ (صفحہ ۱۳۳)

۲۔ حضورﷺ قبر میں زندہ ہیں۔ (صفحہ ۱۷۹)

۳۔ شیخ احمد رفائیؒ کیلئے حضور علیہ السلام کا ہاتھ مبارک قبر اطہر سے نکلا۔ (صفحہ ۱۷۹)

۴۔ حضور علیہ السلام کی حیات پر امت کا اتفاق ہے۔

۵۔ آقا علیہ السلام مع تلبیس روح زندہ ہیں۔ (صفحہ ۲۵۸)

۶۔ ازواج مطہرات کا کسی اور سے نکاح اس لئے حرام ہے کہ آپﷺ زندہ ہیں۔ (صفحہ ۲۶۰)

مذکورہ صفحات و عبارات نہ مماتی دیکھیں گے اور نہ دکھائیں گے البتہ ایک عبارت پر خوب اودھم مچائیں گے

''جسم مثالی ہے، قبر مثالی ہے'' اعاذنا اللہ منھم

بالکل اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی آب حیات یا مسئلہ حیات پر واضح عبارات جو ''اجوبہ اربعین'' یا ''ہدایۃ الشیعہ'' میں موجود ہیں انہیں بالکل پسند نہیں، البتہ کیفیت وفات میں جو آپ کی رائے ہے اس کو اپنی جہالت، حماقت، شقاوت اور سفاہت کے دبیز پردوں میں چھپا کر واویلا کریں گے کہ حضرتؒ وفات نبیﷺ کے منکر ہیں، استغفر اللہ العظیم۔ یہ بے بصیرت لوگ اکابر کی عبارات کو سمجھنے سے خود قاصر ہیں الزام اہل حق کو دیتے ہیں، اکبر الہ آبادی نے شاید اس لئے فرمایا تھا کہ۔

شعر پڑھ سکتا نہیں اور مجھ کو کہتا ہے غلط
خود زبان معترض ہی خارج از تقطیع ہے

(ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نومبر ۲۰۰۶ء)